# شاخِ زرّیں

## جلد اوّل

مُصنّف

(سر) جیمس جارج فریزر

ترجمہ

سیّد ذاکر اعجاز

مجلس ترقّیِ اَدَب

۲ کلب روڈ، لاہور

# شاخِ زرّیں

## جلد اوّل

مُصنّف

(سر) جیمس جارج فریزر

سحر اور مذہب کے روابط کا مُطالعہ

اصل کتاب کے مطالب

اختصار کردہ

ترجمہ

سیّد ذاکر اعجاز

مجلس ترقیِ اَدَب

۲ کلب روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : جنوری ۱۹۶۵ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع : شفیق پریس ، لاہـــور

مہتمم : ایس - ایم - شفیق

# فہرست مضامین


| | عنوان | صفحہ |
|---|---|---|
| | فہرست مضامین | ا تا د |
| | **تعارف** : از آغا عبدالحمید | ہ تا ع |
| | **دیباچۂ مصنف** | ۳ تا ۷ |
| **پہلا باب** : | **بن کا بادشاہ** | ۹ |
| | (۱) دائنا اور وربیس .... | ۹ |
| | (۲) ارتمیس اور ہیپولیٹس .... | ۲۱ |
| | (۳) خلاصۂ کلام ... | ۲۳ |
| **دوسرا باب** : | **مذہبی بادشاہ** ... | ۲۷ |
| **تیسرا باب** : | **سحر مشارک** ... | ۳۲ |
| | (۱) اصول سحر .... ... | ۳۲ |
| | (۲) سحر بالمثل یا صوری سحر ... | ۳۵ |
| | (۳) سحر متعدی .... ... | ۸۳ |
| | (۴) ساحری کا ارتقاء ... .... | ۹۸ |
| **چوتھا باب** : | **سحر اور مذہب** ... | ۱۰۵ |
| **پانچواں باب** : | **سحری موسمیات** ... | ۱۲۷ |
| | (۱) پیشہ ور ساحر ... ... | ۱۲۷ |
| | (۲) سحر اور ضبط بارش ... | ۱۳۱ |
| | (۳) سحر اور ضبط آفتاب ... | ۱۶۰ |
| | (۴) سحر اور ضبط ہوا ... | ۱۶۵ |

| | عنوان | صفحہ |
|---|---|---|
| چھٹا باب : | ساحر شاہی .... | ۱۷۱ |
| ساتواں باب : | خدا انسان کے روپ میں ... | ۱۸۶ |
| آٹھواں باب : | شاہان مظاہر فطرت ... | ۲۱۷ |
| نواں باب : | شجر پرستی ... | ۲۲۴ |
| | (۱) شجری روحیں ... .... | ۲۲۴ |
| | (۲) شجری روحوں کی برکتیں ... | ۲۴۰ |
| دسواں باب : | جدید یورپ میں شجر پرستی کے آثار | ۲۴۶ |
| گیارھواں باب : | نباتات پر جنس کا اثر ... | ۲۰۶ |
| بارھواں باب : | مقدس بیاہ ... | ۲۸۴ |
| | (۱) دائنا بارور کرنے والی دیوی کی حیثیت سے | ۲۸۴ |
| | (۲) دیوی دیوتاؤں کا بیاہ ... | ۲۸۸ |
| تیرھواں باب : | روم اور البا کے بادشاہ | ۲۹۸ |
| | (۱) نوما اور ایجیریا ... | ۲۹۸ |
| | (۲) بادشاہ جوپیٹر کے روپ میں .... | ۳۰۱ |
| چودھواں باب : | لاطیم میں تخت و تاج کی وراثت | ۳۰۹ |
| پندرھواں باب : | بلوط کی پرستش .... | ۳۲۳ |
| سولھواں باب : | دائنا اور دائنس .... | ۳۲۹ |
| سترھواں باب : | بار کج کلاہی ... | ۳۴۱ |
| | (۱) بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں سے متعلق امتناعات ... | ۳۴۱ |
| | (۲) دینی اور دنیوی اختیارات کی علیحدگی ... | ۳۵۵ |
| اٹھارھواں باب : | روح کے جوکھم ... | ۳۶۱ |
| | (۱) روح کا بالشتیا ... ... | ۳۶۱ |
| | (۲) روح کی غیر حاضری اور باز طلبی | ۳۶۴ |
| | (۳) روح سایہ اور عکس کی حیثیت سے | ۳۸۳ |
| نیسواں باب : | افعال کی تحریم ... | ۳۹۲ |
| | (۱) پردیسیوں کے ساتھ میل جول پر امتناع | ۳۹۲ |

| عنوان | | صفحہ |
|---|---|---|
| (۲) خورو نوش پر امتناع | ... | ۳۹۹ |
| (۲) منہ دکھانے پر امتناع | ... | ۴۰۱ |
| (۳) گھر چھوڑنے پر امتناع | ... | ۴۰۲ |
| (۵) کھانا چھوڑنے پر امتناع | ... | ۴۰۳ |
| **بیسواں باب : اشخاص کی تحریم** | ... | ۴۰۷ |
| (۱) سرداروں اور بادشاھوں کی تحریم | | ۴۰۷ |
| (۲) سوگوار اشخاص کی تحریم | ... | ۴۱۳ |
| (۳) ماھواری اور زچگی کے ایام میں عورتوں کی تحریم | ... ... | ۴۱۶ |
| (۴) سپاھیوں کی تحریم | .... | ۴۲۱ |
| (۵) مردم کشوں کی تحریم | ... | ۴۲۵ |
| (۶) شکاریوں اور ماھی گیروں کی تحریم | | ۴۳۳ |
| **اکیسواں باب : اشیاء کی تحریم** | ... | ۴۳۷ |
| (۱) امتناع کا مفھوم | ... | ۴۳۷ |
| (۲) لوھے کی تحریم ... | ... | ۴۳۸ |
| (۳) تیز ھتھیاروں کی تحریم | ... | ۴۵۳ |
| (۴) خون کی تحریم ... | ... | ۴۵۵ |
| (۵) سر کی تحریم ... | ... | ۴۶۰ |
| (۶) بالوں کی تحریم ... | ... | ۴۶۳ |
| (۷) حجامت کی رسمیں | ... | ۴۶۵ |
| (۸) کٹے ھوئے بالوں اور ناخنوں کا ٹھکانے لگانا | | ۴۶۶ |
| (۹) تھوک کی تحریم | ... | ۴۷۳ |
| (۱۰) غذاؤں کی تحریم | ... | ۴۷۵ |
| (۱۱) گرھوں اور انگوٹھیوں کی تحریم | | ۴۷۶ |
| **بائیسواں باب : الفاظ کی تحریم** | ... | ۷۸۳ |
| (۱) شخصی ناموں کی تحریم | .... | ۴۸۷ |
| (۲) اقربا کے ناموں کی تحریم | .... | ۴۹۵ |

| عنوان | | صفحہ |
|---|---|---|
| | (۳) مردوں کے ناموں کی تحریم ... | ۵۰۰ |
| | (۴) بادشاہوں اور دوسرے مقدس لوگوں کے ناموں کی تحریم ... ... | ۵۰۹ |
| | (۵) دیوتاؤں کے ناموں کی تحریم ... | ۵۱۳ |
| **تیئیسواں باب :** | **ہم پر وحشی کا احسان** ... | ۵۲۰ |
| **چوبیسواں باب :** | **شاہ کشی** ... | ۵۲۳ |
| | (۱) دیوتاؤں کی موت ... | ۵۲۳ |
| | (۲) قویٰ کے انحطاط کے سبب بادشاہوں کا قتل | ۵۲۵ |
| | (۳) مقررہ میعاد کے اختتام پر بادشاہوں کا قتل | ۵۳۲ |
| **پچیسواں باب :** | **عارضی بادشاہ** ... | ۵۵۹ |
| **چھبیسواں باب :** | **شاہ زادے کا قتل** ... | ۵۷۰ |
| **ستائیسواں باب :** | **روح کی وراثت** ... | ۵۷۸ |
| **اٹھائیسواں باب :** | **شجری روح کا قتل** ... | ۵۸۳ |
| | (۱) سفید عید کے بہروپیے .... | ۵۸۳ |
| | (۲) کارنیول کا جنازہ ... | ۵۹۳ |
| | (۳) دفع موت ... ... | ۶۰۳ |
| | (۴) گرمی کی واپسی ... | ۶۱۱ |
| | (۵) گرمی اور جاڑے کی لڑائی ... | ۶۲۱ |
| | (۶) کاستر بونکو کی موت اور نیا جنم | ۶۲۳ |
| | (۷) نباتات کی موت اور نئی زندگی .... | ۶۲۶ |
| | (۸) ہندوستانی رسموں کی نظیر ... | ۶۲۷ |
| | (۹) طلسمی بہار .... ... | ۶۲۹ |

# تعارف

از

## آغا عبدالحمید، ڈائریکٹر سول سروس اکیڈمی، لاہور

انسانیات کے علم میں پچھلے سو سال میں جو انقلاب آیا ہے اس میں سر جیمز جارج فریزر کی تصنیفات کو بہت بڑا دخل ہے۔ انسانیات کا علم بہت پرانا ہے اور اس موضوع پر ہر بڑی تہذیب میں کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس علم کو ایک جدا علم بنانا اور ایک منظم طریقے سے وہ شہادت جمع کرنا جس سے کچھ بنیادی اصول وضع کیے جاسکیں زیادہ تر اٹھارویں اور انیسویں صدی کا کام ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زیادہ تر کام انیسویں صدی میں کیا گیا۔ سر جیمز فریزر پہلے مصنف تھے جنھوں نے دنیا کے مذاہب کا مطالعہ اس نظر سے کیا کہ ان کے عقائد اور ان کی رسموں کو سچا یا جھوٹا ثابت کرنے کی بجائے سامنے رکھ کر یہ دیکھا جائے کہ ان میں کون کون سی چیزیں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں تاکہ یہ دریافت ہو سکے کہ مذہب کے متعلق انسانی فکر کا ارتقاء کیسے ہوا۔

سر جیمز فریزر یکم جنوری ۱۸۵۴ء کو گلاسگو کے شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈینیل فریزر (Daniel Frazer) فریزر اور گرین نامی کمپنی میں کام کرتے تھے اور کمپنی کے بڑے حصہ دار تھے۔ یہ کمپنی ڈینیل فریزر کے بڑے بھائی نے ۱۸۳۰ء میں قائم کی تھی۔ وہ ۱۹۰۰ء میں فوت ہوئے اور ۱۸۹۸ء تک جب وہ ریٹائر ہوئے کمپنی کی

باگ دوڑ سنبھالے رہے ۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ جھیل گیر (Gare) کے کنارے رومور (Rowmore) میں رہتے تھے جو ڈمبارٹن شائر (Dumbartonshire) میں واقع ہے ۔

سر جیمز فریزر کی والدہ گلاسگو کے ایک امیر سوداگر گھرانے کی صاحب زادی تھیں ، جو اپنی شیرینیٔ طبع اور مضبوط ارادے کی وجہ سے ممتاز تھیں ۔ میاں بیوی دونوں مذہب کے شدت سے پیرو تھے اور ان کی زندگی پابند طہارت و مناجات تھی ۔ والد کو انگریزی ادب میں گہری دل چسپی تھی چناں چہ انھوں نے کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ اپنے کتب خانے میں فراہم کیا تھا ۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو کتابیں لکھی بھی تھیں ۔

ابھی جیمز فریزر کم سن ہی تھے کہ ان کے والد نے ہیلنز برگ (Helensburgh) میں ایک گھر خریدا ۔ یہ خوب صورت شہر جھیل گیر کے کنارے دریائے کلائڈ (Clyde) کے دھانے پر واقع ہے ۔ ہمارے مصنف نے جو دن اس علاقے میں بسر کیے ان کی یاد ان کے لیے ہمیشہ باعث راحت رہی ۔ اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں : ''آج کی رات لندن کے دبے ہوئے شور میں جو میرے کانوں میں گونج رہا ہے ، میں گزرے ہوئے زمانے کے مسلسل منظر پر نظر دوڑاتا ہوں اور سمندر کے کنارے اس چھوٹے سفید شہر کو پھر دیکھتا ہوں جس کے پیچھے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سورج کی گرم شعاؤں سے منور ہو رہی ہیں ۔ میں پھر ان گھنٹیوں کی دھیمی موسیقی سنتا ہوں جو شام کو بجتی تھیں اور جن کے متعلق ہمیں بچپن میں بتایا جاتا تھا کہ گو اب تم ان کی آواز پر کان نہیں دھرتے لیکن ان کو اپنے بڑھاپے میں یاد کرو گے ۔ خلیج کے پار بڑھتے ہوئے سایوں میں دل کش روزن ایتھ (Roseneath) واقع ہے جو درختوں سے گھرا ہوا ہے ۔ جھیل کے سیاہ فام نیلے اور ساکن پانی کے دوسری طرف شام کے دھندلکے میں جھیل گیر کی چھوٹی پہاڑیاں دمکتی ہوئی نظر آتی ہیں اور ان کے اوپر جھیل لانگ کے عظیم پہاڑ ڈوبتے سورج کی کرنوں میں اپنے سر بلند کیے ہوئے ہیں ۔''

جیمز فریزر کی دو بہنیں اور ایک بھائی تھا ۔ ان سب کی پرورش خالص مذہبی ماحول میں ہوئی تھی ۔ روزانہ عبادت ایک مستقل معمول تھا ۔ ان کے والد ہر روز انجیل کی تلاوت کرتے اور گھر کے تمام لوگ اور نوکر دو زانو ہو کر سنتے تھے ۔ اتوار کا دن ان تمام پابندیوں کے ساتھ منایا جاتا تھا جو سکاٹ لینڈ سے مخصوص تھیں ۔ سوائے گرجا جانے کے دن بھر گھر سے نکلنا منع تھا ۔ تمام بچے شام کو مل کر اپنی والدہ کے سامنے حمد و ثنا گاتے تھے ۔ بچوں کو مکمل مذہبی تعلیم دی گئی تھی اور عبادت باقاعدگی سے کرنے پر بہت زور تھا ۔ یہ پر قواعد تربیت سر جیمز فریزر کے لیے کبھی بوجھ ثابت نہ ہوئی نہ ان تمام پابندیوں نے کبھی ان کو تھکایا ۔ آخری عمر تک ان کے دل میں اپنے والدین کی پابندیٔ مذہب کے لیے ایک گہرا جذبۂ قدر و عقیدت قائم رہا ۔

ہیلیزبرگ میں نوجوان جیمز فریزر کو پہلے سپرنگ فیلڈ اکیڈمی (Springfield Academy) اور بعد میں لارچ فیلڈ اکیڈمی (Larch field Academy) میں تعلیم دی گئی ۔ وہاں انھوں نے یونانی اور لاطینی زبانیں سیکھیں ، کلاسیکی ادب سے ایسی دل چسپی پیدا ہوئی جو ساری عمر قائم رہی ۔ قاعدے کے مطابق ان کو بھی فریزر اور گرین کمپنی میں داخل ہونا چاہیے تھا تاکہ والد کے ریٹائر ہونے پر سارا کام سنبھال سکیں لیکن والد نے جب دیکھا کہ بچے کو تعلیم کا شوق ہے تو مجبور نہ کیا ۔ چناں چہ جیمز فریزر نے ۱۸۶۹ء میں گلاسگو یونیورسٹی سے میٹریکولیشن پاس کر لیا ۔ وہ لکھتے ہیں ''آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے میں یونیورسٹی میں داخل ہوا تو ماسٹر آف آرٹس (Master of Arts) کا نصاب آج سے بہت مختلف تھا ۔ اس وقت لڑکوں کو یہ اجازت نہ تھی کہ اپنی مرضی کے مضمون چنیں ۔ ہر ایک کو ایک ہی فہرست کے مضامین میں امتحان پاس کرنا ہوتا تھا ۔ اس فہرست میں یونانی ، لاطینی ، ریاضی ، طبیعیات ، منطق ، مافوق الطبیعیات ، اصول اخلاق اور انگریزی ادب شامل تھے ۔ یہ ایک پر مغز اور کشادہ دل سکیم تھی ۔ اگر لڑکوں پر جو کم عمر تھے چھوڑ دیا جاتا کہ

مضامین کا انتخاب وہ خود کریں تو وہ اس سے بہتر سکیم نہ بنا سکتے ۔ کم از کم میں شکر گزار ہوں کہ سولہ سال کی عمر میں من مانی کرنا مجھ پر نہ چھوڑا گیا بلکہ یہ کام تجربہ کار اہل علم کے ذمے تھا کہ وہ مجھے شاہ راہ تعلیم پر گام زن ہونے کے اصول بتائیں ۔''

گلاسگو یونیورسٹی میں وہ جارج رامزے (George Ramsay) سے بہت متاثر ہوئے جو لاطینی کے پروفیسر تھے ۔ وہ ادب میں ذوق سلیم رکھتے تھے ۔ ان کے برتاؤ میں ایک کشش تھی جس کے زیر اثر فریزر ہمیشہ کے لیے کلاسیکی عہد کے دل دادہ ہو گئے ۔ فریزر چاہتے تھے کہ بیلی ایل کالج آکسفورڈ (Balliol College Oxford) میں داخلے کے لیے مقابلے کا امتحان دیں ، لیکن ان کے والد کے خیال میں آکسفورڈ میں مذہبی آزادی ضرورت سے زیادہ تھی اس لیے انھیں ٹرینٹی کالج کیمرج (Trinity College Cambridge) میں جانا پڑا جہاں انھوں نے مقابلے کے امتحان میں وظیفہ حاصل کیا ۔ البر اوتیں (Albert Houtin) مارچ ۱۹۲۳ء کے رسالہ لاروس مین سؤایل (Larouse Mensuel) میں لکھتے ہیں : ''ان کے والد نے اپنی رائے میں انھیں مذہبی آزادی سے بچا دیا لیکن پابند مذہب باپ بھی ہر خطرے کو پہلے سے نہیں دیکھ سکتا ۔ کیمرج میں داخلے کے چند سال بعد وہاں ولیم رابرٹ سن سمتھ (William Robertson Smith) آ پہنچے جو اتنے آزاد خیال تھے کہ گرجا سے خارج کر دیے گئے تھے ۔ وہ مشرق زبانوں کے ماہر تھے ۔ جیمز ان کے شاگرد اور دوست بن گئے اور جب ان کے زیر اثر کتابیں لکھنی شروع کیں تو ان کے والد جو عمر رسیدگی کی وجہ سے اچھی طرح پڑھ نہیں سکتے تھے ، اسی بات سے خوش تھے کہ ان کا بیٹا ایک مشہور عالم بن گیا ہے ۔'' ان کے والد چاہتے تھے کہ جیمز قانونی تعلیم حاصل کریں ۔ چناں چہ انھوں نے ۱۸۸۱ء مین بیرسٹری کا امتحان پاس کیا ، اگرچہ وکالت عمر بھر نہیں کی ۔ یہ قانونی تعلیم ان کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئی کیوں کہ ان کا بڑا کام یہ تھا کہ ابتدائی زندگی کے متعلق جو شواھد ماھرین نے جمع کیے تھے ان کو ٹھیک طور سے پرکھ سکیں ۔

انسانیات سے انھیں پہلے پہل ٹائلر (Tyler) کی شہرہ آفاق کتاب ابتدائی تہذیب پڑھ کر دل چسپی ہوئی ۔ یہ دل چسپی سمتھ (Smith) کی دوستی کی بدولت اور زیادہ گہری ہو گئی ۔ فریزر کی رائے میں سمتھ سے زیادہ عظیم ہستی سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی ۔

یہ کہنا شاید غلط نہیں ہوگا کہ انیسویں صدی میں علمی دنیا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ نہ تھا کہ انھوں نے نئے حقائق دریافت کیے (اگرچہ یہ بھی بے شمار تھے) بلکہ یہ کہ انھوں نے ان حقائق کو پرکھنے اور ان کی ترجمانی کرنے کے لیے بنیادی اصول وضع کیے۔ اس کے لیے جس طریق سے کام لیا جاتا تھا وہ تقابلی یا بالموازنہ ضابطہ کہلاتا تھا ۔ اس ضابطے کی مدد سے فرانز بوپ (Franz Bop) نے ثابت کیا تھا کہ ہند یورپی زبانوں کا مخرج ایک ہی ہے ۔ اسی ضابطے کو قانون پر حاوی کرکے سر ہنری مین (Sir Henry Maine) نے انسانی رواج اور دستور کے ماخذ پر روشنی ڈالی تھی ۔ ولیم رابرٹ سن (William Robertson) اس لیے مشہور ہیں کہ انھوں نے مختلف مذاہب کا تقابلی موازنے سے مطالعہ کیا تھا ۔ جو قیمتی نتائج انھوں نے حاصل کیے تھے ان کے متعلق سر جیمز فریزر لکھتے ہیں : ''انیسویں صدی سے پہلے محققین کو یہ خیال نہیں آیا کہ دنیا کے مذاہب کا مطالعہ تاریخی نظریے سے کرنا چاہیے ۔ یہ ثابت کرنے کی بجائے کہ کون سا مذہب سچا ہے اور کون سا جھوٹا ، مذاہب کو انسانی شعور کے مظاہر شمار کرکے یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کا ارتقاء کیسے عمل میں آیا ۔ اگر ہم مذاہب کے جھوٹا یا سچا ہونے کو یا مذہبی رسوم کے اچھا یا برا ہونے کو غیر متعلق جان کر ایک طرف کر دیں اور مختلف اقوام کے مذاہب کو سامنے رکھ کر مطالعہ کریں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تفصیلی تفریق کے باوجود ان کے بنیادی اصول ایک دوسرے سے بہت حد تک مشابہ ہیں اور اس سے زیادہ یہ کہ وہ ایک دوسرے پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ بسا اوقات ایک مذہب کی رسوم دوسرے مذاہب کی رسوم اور عبادات کی وجہ تسمیہ عیاں کر دیتی ہیں ۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ

مذاہب کا ارتقاء ایک حد تک سب قوموں میں ایک ہی جیسا ہوا ہے۔ نیز یہ کہ ایک مذہب کی ابتدائی کیفیت اس وقت تک پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی جب تک کہ اس کا مقابلہ دوسرے مذاہب سے نہ کر لیا جائے۔''

رابرٹ سن سمتھ (Robertson Smith) ۱۸۸۱ء سے انسائکلوپیڈیا بریٹانیکا (Encyclopeadia Brittanica) کے ایڈیٹر تھے۔ اپنے دوست فریزر کی دل چسپی کو جانتے ہوئے انھوں نے فریزر سے Taboo یعنی تحریم اور ٹوٹم کے عقیدے پر مضمون لکھوائے جو ۱۸۸۸ء میں انسائکلوپیڈیا کے نویں ایڈیشن میں شائع ہوئے۔ فریزر لکھتے ہیں کہ ''یہ مضمون لکھنے کے لیے میں نے جو تحقیق کی وہ اس تحقیق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جو میں نے انسانیات کے منظم مطالعے کے لیے شروع کی اور خاص طور پر ان قوموں کے رسم و رواج کا مطالعہ جو پس ماندہ ہیں اور جنھیں ہم وحشی کہتے ہیں میں نے اسی وقت شروع کیا۔''

سرجیمز فریزر کی زندگی کے حالات لکھتے وقت ان کی تصنیفات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان کی زندگی کے اہم واقعات انھیں کتابوں کی اشاعت تھے جو آج ہر کتب خانے کی زینت ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی اہم ڈرامائی واقعہ نہیں ہوا۔ انھوں نے ۱۸۹۶ء میں مسز للی گروو (Mrs. Lilly Grove) سے شادی کی جو فرانسیسی تھیں اور بچوں کے لیے فرانسیسی اور انگریزی میں کتابیں لکھتی تھیں۔ لیڈی فریزر ساری عمر ان کے کام میں ان کی مددگار رہیں۔ روزمرہ کی عملی زندگی میں وہ بہت سوجھ بوجھ رکھتی تھیں جن سے ان کے خاوند بالکل عاری تھے۔ سر جیمز فریزر ۱۹۴۱ء میں کیمرج میں فوت ہوئے۔

شاخ زریں ۱۸۹۰ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ وقت کے ساتھ اس میں ترمیم و اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۰۷ سے ۱۹۱۵ تک یہ کتاب بارہ جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کا پورا نام ''شاخ زریں، جادو اور مذہب کا ایک مطالعہ'' ہے۔ فریزر کی چند ایک اہم تصانیف کی فہرست یہ ہے :

(۱) یونان کے بیان میں چھ جلدیں ، ۱۸۹۸ء ۔
(۲) بادشاہت کی ابتدائی تاریخ ، ۱۹۰۵ء ۔
(۳) ٹوٹمزم اور ایکسوگیمی (Totemism and Exogamy) ۔ چار جلدیں ، ۱۹۱۰ء ۔
(۴) حیات جاودانی اور مردوں کی پرستش ، ۱۹۱۳ء ۔
(۵) ولیم کوپر کے خطوط ، دو جلدیں ، ۱۹۱۲ء ۔
(۶) انجیل کے عہد نامہ عتیق میں عام لوگوں کے عقائد اور روایات ، تین جلدیں ، ۱۹۱۸ء ۔
(۷) مظاہر قدرت کی پرستش ۔ ۱۹۲۹ء
(۸) آگ کے ماخذ کے متعلق دیو مالا ۱۹۳۰ء
(۹) قدیم مذہب میں مردوں سے خوف ۱۹۳۳ء

جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے شاخ زریں پہلے پہل دو جلدوں میں ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی ۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۰ء میں تین جلدوں میں شائع ہوا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۵ء تک بارہ جلدوں میں شائع ہوا ۔ اس کی تیرھویں جلد ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی ۔ ۱۹۲۲ء میں اس کا ایک مختصر ایڈیشن ایک جلد میں شائع کیا گیا جس کا ترجمہ آپ کے سامنے ہے ۔

مصنف نے کتاب لکھنے کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ ''واقعات کا دور جو شاخ زریں میں بیان کیا گیا ہے ایک پیچ دار خاکے میں اندھیرے اور روشنی کے گھٹتے بڑھتے کھیل میں اس طویل ارتقا کو سامنے لاتا ہے جس سے انسانی فکر و عمل درجہ بہ درجہ سحر سے مذہب اور مذہب سے سائنس میں تبدیل ہوئے ۔ ایک حد تک یہ انسانیت کی ایک رزمیہ نظم ہے ۔ اس انسانیت کی جس نے سحر سے ابتدا کرکے اپنی پختہ عمر میں سائنس پر قابو پا لیا ہے جو اس کے لیے شاید موت کا باعث ہو ، کیوں کہ جس دیو نے آج کا انسانی فکر پیدا کیا ہے وہ انسانیت کو فنا کی دھمکی دیتا ہے حالاں کہ انسانیت کا انحصار اپنی ترقی اور آسودگی کے لیے اسی فکر پر ہے ۔

''شاخ زریں کا تمام تر تعلق گزشتہ زمانے سے ہے ۔ مقدس بادشاہ کی اپنی رعایا کی بہبود کے لیے قربانی اس کے صفحات میں تفصیل سے مطالعہ کی گئی ہے ۔ یہ واقعہ جو عیسائی دینیات میں بہت اہمیت رکھتا ہے اداس انسانی تاریخ کا ایک اشارتی خلاصہ ہے ۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں : ''موجودہ تحقیق سے عیاں ہوا ہے کہ بعض ظاہری فرق ضرور ہیں لیکن انسانی دماغ نے فلسفۂ حیات پہلے پہل بیان کرنے کی جو کوششیں کی ہیں ان میں ایک بنیادی مشابہت ہے ۔ اس لیے اگر ہم یہ ثابت کر سکیں کہ نیمی کے پجاری کی وحشیانہ رسم اور جگہ بھی موجود تھی ، اگر ہم یہ دکھا سکیں کہ ان رسوم کا محرک ایک ہی ہے ، گو رسموں کی شکل مختلف ہے اور یہ کہ یہ محرکات کلاسیکی دور میں موجود تھے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عہد قدیم میں نیمی کے پجاری کی رسم کا محرک بھی یہی تھا ۔''

نیمی میں دائنا کے پجاری کو جو جنگل کا بادشاہ بھی تھا اپنے پیش رو کو قتل کیوں کرنا پڑتا تھا اور اس سے پہلے مقدس درخت کی شاخ کیوں توڑنی پڑتی تھی ۔ انھیں دو سوالوں کے جواب تلاش کرنے کے لیے شاخ زریں لکھی گئی ہے ۔ وحشی قبیلوں میں جہاں یہ عقیدہ ہو کہ ان کی بہبود کا انحصار سحر آمیز رسوم کی ادائیگی پر ہے ، ساحر بہت با اختیار ہو جاتا ہے ۔ اس کی حیثیت قبیلے کے سردار یا بادشاہ کی ہو جاتی ہے ۔ یہاں مصنف ضمناً ایک بڑی کام کی بات یہ کہہ گئے ہیں ''اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تہذیب کے ارتقاء کے اس دور میں طاقت ان لوگوں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے جو سب سے زیادہ تیز دماغ اور بے ایمان ہوتے ہیں ۔ جو نقصان وہ اپنی دھوکا دہی سے پہنچاتے ہیں اگر اس کا مقابلہ اس فائدے سے کریں جو اپنی عقل مندی سے پہنچاتے ہیں تو شاید یہ ثابت ہو کہ فائدہ نقصان سے زیادہ ہوتا ہے ۔ دنیا میں ایمان دار مگر بے وقوف حاکموں نے عقل مند مگر بے ایمان حاکموں سے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا ہے ۔ جب ایک عقل مند عیار اپنی خواہشات پوری کر لیتا ہے تو وہ اکثر اپنا تجربہ ، اپنی عقل اور اپنا اثاثہ قوم کی خدمت میں صرف کرتا ہے ۔''

جب انسانی فکر ترقی کرتا ہوا سحر سے مذہب تک پہنچا تو یہ عیاں ہوا کہ انسان سے بڑی ایک طاقت ہے جو کل زندگی پر حاوی ہے اور جس کو خوش کرنا لازمی ہے۔ اس سلسلے میں مقدس بادشاہ وجود میں آئے جن کے متعلق یقین کیا جاتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے مختلف تھے اور زیادہ طاقت رکھتے تھے۔ ان بادشاہوں کو قتل اس لیے کیا جاتا تھا کہ بڑھاپے، بیماری یا جسمانی کم زوری سے ان کی روح بھی کم زور ہو جائے گی اور اس سے قدرت کے کام میں خلل واقع ہوگا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قربانی سے دیوتا خوش ہوتے ہیں اور قربانی کرنے والوں کو ہر طرح کی آسودگی بہم پہنچاتے ہیں۔ وحشی قوموں میں یہ رواج بھی تھا کہ گناہ اور مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے سال میں ایک مرتبہ طرح طرح کی رسوم ادا کی جائیں۔ کچھ عرصے کے بعد دونوں قسم کی رسوم آپس میں مل گئیں۔ پہلے پہل تو مقدس بادشاہ کو اس لیے قتل کیا جاتا تھا کہ اس کی اندرونی زندگی بڑھاپے کے زوال سے بچ جائے؛ اب یہ ہوا کہ اس کے ساتھ ہی صدقے کا بکرا بھی بنا دیا گیا۔ کیوں کہ جب اس کو قتل کرنا لازم ہی ٹھہرا تو ساتھ ہی ایک پنتھ دو کاج قبیلے کے تمام گناہ اس کے سر کیوں نہ تھوپ دیے جائیں۔

شاخ زریں دیو مالا اور مذہبی رسوم کا ایسا مطالعہ ہے جس نے علم الانسان، قدیم تاریخ اور یورپ اور ایشیا کے عوام کے عقائد، قصے کہانیوں اور رواجوں سے پورا فائدہ حاصل کیا ہے۔ جس مواد کو مصنف نے منظم کیا اور پرکھا ہے وہ دوسروں کا جمع کیا ہوا ہے اور اس میں کہیں کہیں غلطیاں بھی ہیں، لیکن مذہب کے متعلق ان کے نظریات از حد دل چسپ ہیں اور عوام کے عقائد اور رواجات کے متعلق ان کا کام حیرت انگیز ہے۔

سر جیمز فریزر اپنے وقت کے سب سے بڑے عالموں میں سے تھے۔ وہ یونانی، لاطینی، عبرانی، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی، جرمن اور ڈچ زبانیں جانتے تھے۔ وہ دن میں کم از کم بارہ گھنٹے کام کرتے تھے

اور بعض دن اس سے بھی زیادہ ۔ وہ اتوار یا کسی اور تہوار کو چھٹی نہیں مناتے تھے ۔ کیمرج ، لندن اور دوسرے مشہور کتب خانوں سے تو مستفید ہوتے ہی تھے ، اس کے ساتھ ان کی اپنی لائبریری میں بھی تیس ہزار کتابیں تھیں ۔ وہ نئی شہادت ملنے پر اپنے نظریے کو بدلنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ۔ اپنے آپ کو گرگٹ سے تشبیہ دیتے تھے جو ضرورت کے مطابق رنگ بدل لیتا ہے ۔ چناں چہ انھوں نے جن نظریات کو شاخ زریں کے پہلے ایڈیشن میں پیش کیا وہ تیسرے ایڈیشن میں بدل گئے ہیں ۔

سر جیمز فریزر ایک مشہور صاحب طرز نثر نگار ہیں ۔ ان کی نثر بہت اعلیٰ درجے کی ہے ۔ ان کی کتابوں کی خالص ادبی حیثیت ان کی علمی حیثیت سے کسی طرح کم نہیں ۔ شاخ زریں کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں نہ صرف ایک مشہور عالم کی پچاس سال کی محنت کا نچوڑ ہے بلکہ خالص ادبی نقطۂ نظر سے اس میں ایک دل لبھا لینے والی چاشنی اور رنگینی بھی ہے ۔

شاخ زریں کا موجودہ فکر پر جو اثر ہوا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے ۔ اس کتاب کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ڈارون اور فرائڈ کی تصنیفات کو حاصل ہے ۔ ایک نقاد لکھتا ہے : ''جب آئندہ نسلیں ہمارے عہد کا جائزہ لیں گی تو سر جیمز فریزر کی تصنیفات کو دیکھتے ہوئے یہ نہ کہہ سکیں گی کہ اس عہد میں در اصل کوئی تخلیقی کام نہیں ہوا ۔ بلا شبہ یہ ایک ایسی تصنیف ہے جو عہد پارینہ کو ایک منظم اور قابل فہم طریقے سے پیش کرتی ہے ، جس میں نظریات ایک انسائیکلوپیڈیا کی شکل میں فراہم کیے گئے ہیں ۔ اشپینگلر (Spengler) کا قول ہے کہ جب کسی تمدن میں تخلیقی صلاحیت کم ہو جاتی ہے تو اس قسم کی کتابیں مرتب کی جاتی ہیں ۔ یہ کہنا در اصل اس کتاب کی قیمت کو بہت کم کرنا ہے ۔ جب سائنس فریزر کی تخلیقی دور رسی سے غیر منظم اور منتشر مواد کو

یک جا کرتا ہے تو نتیجہ اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا کسی بڑے آرٹ کی تخلیق کا۔۔۔اس مصنف نے جس قدر لکھا ہے، اور اس میں شاخ زریں بھی شامل ہے جو دو جلدوں سے بڑھتے بڑھتے بارہ بلکہ تیرہ جلدوں تک پہنچ گئی تو لامحالہ ان کی محنت کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی ایک صفحے کا جائزہ لیا جائے اور یہ نظر آئے کہ اس میں ایک درجن کتابوں سے جو کم از کم پانچ چھ زبانوں میں ہیں مواد لیا گیا ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ وہ کون سا معجزہ ہے جو فریزر کے سال میں کام کے لحاظ سے بارہ کی بجائے چوبیس مہینے بنا دیتا ہے۔

''ان سے پہلے عالموں نے شاید اتنی ہی محنت کی ہو لیکن فریزر میں کالائل کے قول کے مطابق مشقت اٹھانے کے لیے نہ تھکنے والی ہمت ہے۔ وہ جس جرأت سے نظریات قائم کرتے ہیں اس سے ان کا شمار بڑے بڑے علمی رہ نماؤں میں ہو سکتا ہے۔ ان کے فکر میں اتنی وسعت ہے کہ جب وہ اپنے کام میں مواد کو خرد بینی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ دماغی لچک ان میں کس قدر زیادہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایک بڑے ادیب بھی ہیں۔ یہ کچھ کم نہیں کہ ان کی عبارت ہمیشہ شفاف اور ان کا ہر فقرہ بے عیب ہوتا ہے بلکہ بڑی بات یہ ہے کہ ان میں ہر طرح کی عبارت بے تکلفی سے لکھنے کی صلاحیت ہے۔

''انھوں نے اپنے عہد کی صرف یہی خدمت نہیں کی کہ ایک ایسے سائنس کی بنیاد رکھی جو مذہب کے ماخذ واضح کرتا ہے بلکہ جو نتائج انھوں نے تحقیق سے اخذ کیے وہ ہماری تہذیب کا ایک ایسا اہم جزو بن گئے ہیں جیسے ڈارون کا نظریۂ ارتقا۔ انسانی دماغ کو فوق الفطرت کے بے پناہ خوف سے آزاد کرنے کے لیے جو کش مکش ایک عرصے سے جاری تھی اس کو سب سے زیادہ مدد فریزر کے کام سے ملی ہے۔''

# شاخ زرین

# دیباچۂ مصنف

اس تالیف کا اصل مقصد اس عجیب و غریب دستور پر روشنی ڈالنا ہے ، جس کی رو سے اریشیا میں دائنا (Diana) کے پجاری کی جانشینی عمل میں آتی تھی ۔ کوئی تیس سال اُدھر کی بات ہے میں نے پہلے پہل جب اس مسئلے کو چھیڑا تو میرا خیال تھا کہ اس کا حل مختصر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ، لیکن مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ جب تک عام نوعیت کے سوالات سے بحث نہ کی جائے ، اس دستور کا قرین قیاس ہونا تو درکنار اسے کوئی سمجھ بھی نہیں پائے گا ۔ ان سوالات میں کچھ تو ایسے ہیں جنھیں اس سے پہلے کسی نے چھوا بھی نہیں ۔ چناں چہ بعد کی اشاعتوں میں یہ اور اسی قبیل کی دوسری بحثیں برابر بڑھتی چلی گئیں اور تحقیق نے مختلف رخ اختیار کر لیے ، یہاں تک کہ اصل کتاب دو سے بارہ جلدوں تک پھیل گئی ۔ اس اثناء میں اکثر یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ کتاب مختصر صورت میں شائع کی جائے ۔ یہ تلخیص اسی خواہش کو پورا کرنے اور اس کے پڑھنے والوں کا دائرہ وسیع کرنے کی ایک کوشش ہے ۔ اختصار سے جہاں کتاب کی ضخامت میں معتدبہ کمی ہو گئی ہے ، وہاں میری یہ بھی کوشش رہی ہے کہ اس میں اصل کے بنیادی اصول اور ان اصول کی خاطر خواہ توضیح کے لیے کافی شواہد آ جائیں ۔ اس میں زبان بھی بڑی حد تک اصل کتاب ہی کی باقی رکھی گئی ہے ، اگرچہ کہیں کہیں تشریح و توضیح کو مختصر کر دیا گیا ہے ۔ متن کا زیادہ سے زیادہ حصہ شامل کرنے کی غرض سے مجھ کو حاشیوں اور اسناد و مآخذ کے تمام حوالوں سے

ہاتھ دھونا پڑا ، لہذا جو قاری کسی خاص بات کی تحقیق کرنا چاہے ، اسے اصل کتاب سے رجوع کرنا چاہیے ، جس میں جملہ شواہد اور کتابوں کی ایک مکمل فہرست شامل ہے ۔

تلخیص میں میں نے نہ تو کسی نئی بات کا اضافہ کیا ہے اور نہ اپنے ان نظریوں میں ترمیم کی ہے جو میں اس کتاب کی پچھلی اشاعت میں پیش کر چکا ہوں ، کیوں کہ اس دوران میں جو بھی شہادت میرے علم میں آئی ، اس سے یا تو میرے اخذ کردہ نتائج کی تصدیق ہوئی ہے یا پرانے اصول کی توضیح میں تازہ مثالیں بہم پہنچی ہیں ۔ مثال کے طور پر اس دستور کے اہم سوال ہی کو لیجیے جس کے بہ موجب بادشاہوں کو یا تو ایک مقررہ مدت کے ختم ہونے پر یا جب کبھی ان کی صحت اور قویٰ جواب دینے لگتے ، قتل کر دیا جاتا تھا ۔ درمیانی عرصے میں ان شہادتوں کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا ہے ، جن سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ شاہ کشی کی اس جیسی رسم کئی ملکوں میں جاری تھی ۔ اس قسم کی محدود بادشاہت کی ایک نمایاں مثال جنوبی روس کے خزریوں کی قدیم سلطنت سے ملتی ہے ، جنھوں نے ازمنۂ وسطیٰ میں بڑی طاقت حاصل کر لی تھی ۔ ان کے ہاں بادشاہ ایک خاص میعاد کے ختم ہونے پر کسی آسمانی آفت جیسے خشک سالی ، کال یا جنگ میں شکست کی صورت میں قتل کے مستوجب ہو جاتے تھے کیوں کہ اس سے ان کی فطری قوتوں کی ناکامی ظاہر ہوتی تھی ۔ خزر میں شاہ کشی کے دستور سے متعلق شواہد جو قدیم عرب سیاحوں کے بیانات سے ماخوذ ہیں ، میں نے اپنی ایک اور تالیف میں مدوّن کیے ہیں[1] ۔ اس کے علاوہ افریقہ سے بھی شاہ کشی کی متعدد مثالیں ملی ہیں ۔ ان میں غالباً سب سے زیادہ قابل توجہ وہ رسم ہے جو کبھی بنیورو (وسطی افریقہ کی ایک ریاست) میں ادا کی جاتی تھی ۔ اس میں ہر سال کسی خاص قبیلے سے ایک مصنوعی بادشاہ منتخب کیا جاتا تھا ، جسے متوفی بادشاہ کا روپ بھرنا ہوتا تھا ۔ وہ مؤخر الذکر کی بیوہ عورتوں

(۱) J. G. Frazer "The Killing of Khazar Kings", *Folklore*, XXVIII, (1917), pp. 382-407.

کے ساتھ صحبت کرتا اور ہفتہ بھر حکومت کرنے کے بعد گلا گھونٹ کر مار دیا جاتا تھا[۱] ۔ یہ رسم بابل قدیم کے ساکیا والے تیوہار سے قریبی مشابہت رکھتی تھی ، جس میں ایک نقلی بادشاہ کو شاہی خلعت پہنائی جاتی اور اسے اصلی بادشاہ کی لونڈیوں کے ساتھ داد عیش دینے کی اجازت ہوتی ، اس طرح اس کی حکومت کے پانچ دن گزرنے کے بعد اسے برہنہ کرکے کوڑے لگائے جاتے اور موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ۔ اس تیوہار پر بعض اشوری کتبوں[۲] سے تازہ روشنی پڑی ہے ، اس سے اس تیوہار کے بارے میں میری اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ سال نو کے جشن کے طور پر منایا جاتا تھا اور اسی نے یہودیوں کے تیوہار پیورم (جو ہامانی سازش کی یادگار تھا) کو جنم دیا تھا[۳] ۔ اریشیا کے پروہت راج سے ملتی جلتی دوسری مثالیں جو حال ہی میں منظر عام پر آئی ہیں ، افریقی پجاریوں اور بادشاہوں کی ہیں ، جنھیں سات یا دو سال ختم ہونے پر قتل کر دیا جاتا تھا اور اس میعاد کے دوران میں اس کا بھی امکان رہتا تھا کہ کوئی قوی آدمی حملہ کرکے انھیں ہلاک

---

(۱) Rev. J. Roscoe, *The Soul of Central Africa* (London 1922) p. 200.

مقابلے کے لیے دیکھیے :

J. G. Frazer, "The Meckie Ethnological Expedition to Central Africa", *Man*, XX. (1920) p. 181.

(۲) H. Timmern, *Tum babylonischen Neugahrsfest* (Leipzig 1918).

مقابلے کے لیے دیکھیے :

A. H. Sayce, in *Journal of the Royal Asiatic Society* July, 1921, pp. 440-442.

(۳) *The Golden Bough*, Part VI. The Scapegoat, pp. 354 rqq ; 412 rqq.

کر ڈالے اور پجاری کے منصب یا سلطنت پر قابض ہو جائے[1]۔

مذہبی رسموں کی ایسی اور اسی طرح کی دوسری مثالوں کے پیش نظر اریشیا میں دائنا کے پجاری والے دستور کی منفرد حیثیت کو تسلیم کرنا اب ممکن نہیں رہا ۔ یہ دستور اس عام رواج کی ایک واضح مثال ہے جس کی اس وقت تک سب سے زیادہ اور مشابہ صورتیں افریقہ میں پائی گئی ہیں ۔ یہ واقعات کسی حد تک اٹلی پر افریقہ کے ابتدائی اثرات بلکہ جنوبی یورپ میں افریقی آبادی کے وجود کی نشان دہی کرتے ہیں ، کہا نہیں جا سکتا ۔ تاریخ کے آغاز سے قبل ان دونوں براعظموں کے درمیان جو تعلقات تھے وہ ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں اور ان کی تحقیق ہو رہی ہے ۔

میں نے مذکورہ بالا رواج کی وضاحت میں جو کچھ کہا ہے اس کی صحت یا عدم صحت کا سوال مستقبل پر چھوڑ دینا چاہیے ۔ اگر اس سے بہتر کوئی اور توضیح پیش کی جا سکے تو مجھے اپنی رائے ترک کرنے میں کبھی تامل نہ ہوگا ۔ اس دوران میں اپنی کتاب کی اس تلخیص کو قارئین کے اندازے کے لیے پیش کرتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ اس کے نفس مضمون کے بارے میں ایک غلط فہمی کے خلاف پیش بندی کر دوں ۔ اس کا ازالہ کرنے کی میں اس سے پہلے بھی کوشش کر چکا ہوں لیکن وہ ابھی تک دور نہ ہو سکی ۔ اگر موجودہ تالیف میں میں نے درختوں کی پرستش سے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے تو اس کا سبب یقیناً یہ نہیں کہ تاریخ مذہب میں اس کی اہمیت کے متعلق میں نے مبالغے سے کام لیا ہے ، چہ جائیکہ میرا مدعا اس کی بناء پر ضمنیات کا ایک مکمل نظام اخذ کرنا ہو ۔ اس کا سبب محض یہ ہے کہ ایک ایسے پجاری کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش میں جسے بادشاہ کا لقب حاصل تھا اور جسے اپنے اس منصب کا مستحق قرار

---

(۱) P. Amaury Talbot, in *Journal of the African Society*, July 1916, pp. 309 rq., ; id., in *Folklore*, XXVI, (1916) pp. 79 rq. ; H. R. Palmer in *Journal of the African Society*, July 1912, pp. 403, 407 rq.

پانے کے لیے منجملہ اور چیزوں کے نیمی کے مقدس شجر زار میں ایک درخت کی ڈالی توڑنی شرط تھی جو ''شاخ زریں'' کہلاتی تھی ، میں اس موضوع کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا ۔ لیکن میں مذہب کے ارتقاء میں درختوں کی تقدیس کو سب سے اہم ہرگز نہیں سمجھتا ، بلکہ میری رائے میں یہ چیز قطعی طور پر دوسرے عوامل ، خاص کر متوفی انسانوں کے خوف کے تابع تھی ، اور مجھے یقین ہے کہ ابتدائی مذہب کی تشکیل میں جو سب سے بڑی طاقت کار فرما تھی وہ یہی خوف تھا ۔ امید ہے کہ اس واضح تردید کے بعد مجھ کو ضمنیات کے ایک ایسے نظام کو شامل کرنے کا قصور وار نہیں ٹھہرایا جائے گا جو میری رائے میں باطل ہی نہیں ، بلکہ مضحکہ خیز اور لغو ہے ۔ لیکن میں غلطی کے رجحان سے اچھی طرح واقف ہوں اور اس لیے مجھے اس کی توقع نہیں کہ ایک غلطی کے ازالے سے دوسری یا اسی غلطی کے اعادے کا سد باب کر سکوں ۔ اس سلسلے میں میرا تو تکیہ بس قارئین کی دیانت و ذہانت پر ہے کہ میں نے جو کچھ تصریح کر دی ہے اس کی روشنی میں وہ میری رایوں سے متعلق اس قسم کی سخت غلط فہمی کو خود دور کر لیں گے ۔

جے ۔ جی ۔ فریزر

۱ ۔ برک کورٹ ، ٹیمپل
لندن ، جون ۱۹۲۲ء

پہلا باب

# بن کا بادشاہ

(۱) دائنا اور وریبس (Diana and Virbius)—ٹرنر کی شاخ زریں والی تصویر سے کون واقف نہیں ، اس تصویر کا سین اس تخیل کی ضو سے جس میں ٹرنر کا ملکوتی ذہن زمین کے دلکش سے دلکش منظر فطرت کو نور سے معمور کرکے اس میں ایک نیا حسن پیدا کر دیتا تھا ، نیمی کے چھوٹے سے بن کی اس جھیل کا ایک خواب کا سا عالم پیش کرتا ہے جسے قدیم زمانے کے لوگ ''دائنا کا آئینہ'' کہا کرتے تھے ۔ کوئی شخص جس نے کوہ البن کی سر سبز گودی میں اس جھیل کے پانی کا سکون دیکھا ہے ، اسے کبھی نہیں بھلا سکتا ۔ اس کے کنارے دو گاؤں خوابیدہ نظر آتے ہیں ، جن سے اطالیہ کی خصوصیات نمایاں ہیں ، اور ویسا ہی ایک اطالوی محل ہے ، جس کے تختہ بہ تختہ باغ ڈھلان ڈھلان جھیل تک اترتے چلے آئے ہیں ، لیکن ان سے اس منظر کے سکوت بلکہ فضائے تنہائی میں بھی کوئی خلل نہیں پڑتا ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دائنا خود اب تک اس ساحل کی تنہائیوں میں محو خرام نہیں ، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بن اب تک اس دیوی کا مرجع نہیں ؟

زمانۂ قدیم میں یہ صحرائی خطہ ایک عجیب و غریب اور مسلسل المیے کا منظر تھا ۔ جھیل کے شمالی کنارے ، عین اُن کھڑی چٹانوں کے

نیچے جن پر موضع نیمی واقع ہے ، دائنا نیمورینسس یا بن کی دیوی دائنا کا مقدس شجر زار اور معبد کھڑا تھا ۔ یہ جھیل اور شجر زار کبھی کبھی اریشیا کی جھیل اور شجر زار بھی کہلاتے تھے ، لیکن اصل قصبۂ اریشیا (موجودہ لارچا) تین میل پرے کوہ البا کے دامن میں واقع تھا اور اس کے اور جھیل کے درمیان جو پہاڑ پر ایک پیالہ نما جوف میں ہے ، ڈھلان حائل تھی ۔ اس مقدس شجر زار میں ایک خاص درخت پیدا ہوتا تھا جس کے آس پاس دن میں کسی وقت اور غالباً رات کو دیر تک ایک وحشت ناک پیکر چکر کاٹتا دکھائی دیتا تھا ۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہوتی اور وہ دائیں بائیں یوں دیکھتا چلتا تھا جیسے ہر دم اسے کسی دشمن کے آن پڑنے کا خطرہ ہو ۔ یہ ایک پجاری اور قاتل تھا اور جس شخص کی جستجو میں وہ یوں سرگرداں رہتا تھا وہ معبد کے دستور کے بہ موجب اسے قتل کرنے اور اس کی جگہ خود پجاری کا منصب سنبھالنے والا تھا ۔ قاعدہ یہ تھا کہ امیدوار پجاری کو اس منصب پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے پیش رو کو قتل کرنا پڑتا تھا اور اسے قتل کر چکنے کے بعد جب تک اول الذکر سے زیادہ قوی اور چالاک آدمی خود اسے ہلاک نہ کر ڈالے ، وہ اپنے عہدے پر بہ دستور فائز رہتا تھا ۔

اس مخدوش منصب کا حامل بادشاہ کہلاتا تھا ، لیکن جو درد سر اور بے آرامی اس بادشاہ کے تاج کے ساتھ وابستہ تھی ، اس سے کبھی کسی تاج دار کو واسطہ نہیں پڑا ۔ برس کے بارہ مہینے ، گرمی سردی ہر موسم میں اسے چوکس رہنا پڑتا تھا ، اور جب کبھی اسے مصیبت کی نیند میسر آتی ، اس کی جان جوکھوں میں ہوتی ۔ اپنی حفاظت میں ذرا سی غفلت ، قویٰ کا ذرا سا اضمحلال ، تیغ زنی کی مہارت میں ذرا سی کمی بھی اسے خطرے میں ڈال دیتی تھی ۔ سفید بالوں کا نکلنا تو اس کے حق میں قیامت تھا ، جن سے اس کی موت کے پروانے پر مہر تصدیق لگ جاتی تھی ۔ اس بد نصیب کو دیکھنے سے مندر کے نیک اور پرہیزگار زائروں کی نظر میں فطرت کا وہ منظر حسین اس طرح تاریک ہو جاتا تھا جیسے سورج پر بادل آنے سے دن میں

اندھیرا چھا جاتا ہے ۔ اٹلی کے آسمان کے نیلگوں رنگ ، گرمیوں میں بن کی چتکبری چھاؤں اور دھوپ میں موجوں کی چمک سے اس کے چہرے کی درشتی اور نحوست کو کوئی مناسبت نہ تھی ۔ ذرا اس بن کے اس منظر کا تصور کیجیے جو خزاں کی کسی طوفانی رات ، جب پت جھڑ اپنے عروج پر ہو اور ہوائیں گزرتے ہوئے سال کا نوحہ گا رہی ہوں ، کسی شب گرفتہ راہی نے دیکھا ہو ۔ اس منظر کی جو تصویر ہمارے ذہن میں ابھرتی ہے وہ بڑی تاریک تصویر ہے ، جس کی فضا سرود غم سے معمور ہے ۔ اس میں آسمان پر گھٹا اور طوفان ، ہوا میں درختوں کی شاخوں کی آہ و زاری ، پاؤں تلے خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اور جھیل کے کنارے سرد پانی کے تموج کے بالمقابل جنگل کا سیاہ اور کٹا پھٹا پس منظر نظر آتا ہے ، اور پیش منظر میں ایک پیکر غم کبھی جھٹ پٹے اور کبھی اندھیرے میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر چلتا دکھائی دیتا ہے ۔ جب کبھی چاند بادل کی نقاب الٹ کر الجھی ہوئی ٹہنیوں میں سے اسے جھانکتا ہے تو اس کے کندھے پر فولاد کا ایک ٹکڑا چمکتا جاتا ہے ۔

یونان اور روما کے کلاسیکی عہد میں پجاری کے منصب سے متعلق اس عجیب دستور کی کوئی نظیر نہیں ملتی اور اس لیے عہد مذکور کی روشنی میں اس کی توضیح نہیں کی جا سکتی ۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے ہمیں قدیم تر زمانے کی طرف رجوع کرنا چاہیے ۔ اس بات سے تو شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ یہ رسم دور جاہلیت کی نشانی ہے اور روما کے عصر شہنشاہیت کے متمدن معاشرے میں اس کا وجود اس طرح نمایاں نظر آتا ہے جیسے گھاس کے کسی ترشے ہوئے تختے سے کوئی پرانی چٹان ابھر آئی ہو ۔ اصل میں اس رسم کی وحشیانہ خصوصیت ہی سے اس کی صحیح توضیح کی امید بندھتی ہے ، کیوں کہ انسان کی قدیم تاریخ کی جدید تحقیق سے اس امر کا انکشاف ہوا ہے کہ انسان کے ابتدائی فلسفۂ زندگی کی تشکیل میں سطحی اختلافات کے ساتھ ساتھ بنیادی مشابہت پائی جاتی ہے ۔ لہٰذا اگر ہم یہ بتا سکیں کہ اس جیسی وحشیانہ رسم کا وجود دوسرے مقامات پر بھی رہا ہے ،

اگر ہم اس کے بنیادی محرکات کا پتا چلا سکیں ، اگر ہم یہ ثابت کر سکیں کہ یہ محرکات انسانی معاشرے میں وسیع بلکہ شاید عالم گیر پیمانے پر کارفرما رہے ہیں اور ان سے مختلف حالات میں دوسری ایسی مختلف النوع رسمیں پیدا ہوئیں جن کی اساس ایک سی ہے اور آخر میں ہم اگر یہ بتا سکیں کہ فی الحقیقت وہ یہی محرکات تھے جو اپنی پیدا کردہ رسموں کے ساتھ کلاسیکی عہد میں بھی کار فرما تھے تو ہم قطعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکیں گے کہ قدیم تر زمانے میں انھی محرکات نے نیمی کے پجاری والے دستور کو جنم دیا تھا۔ کسی صریح شہادت کی عدم موجودگی میں اس استنباط کو قطعیت حاصل نہیں ہو سکتی ، لیکن وہ جس حد تک مذکورہ بالا شرائط کے مطابق ہوگا ، اسی قدر صحیح ہوگا۔ ہماری اس تالیف کا مقصد ان شرائط کو پورا کرتے ہوئے نیمی کے مندر کی رسم تولیت کی ایسی توضیح پیش کرنا ہے جو قرین صحت ہو۔

میں اپنے اس کام کا آغاز ان چند واقعات و روایات سے کرتا ہوں جو اس موضوع پر ہم تک پہنچے ہیں۔ ایک کہانی کے مطابق نیمی میں دائنا کی پرستش کی بناء یونانی سورما آریسٹز (Orestes) کے ہاتھوں پڑی جو تاری خرسون (کریمیا) کے تھاؤز (Thaos) نامی بادشاہ کو قتل کرنے کے بعد اپنی بہن کے ساتھ اٹلی فرار ہو گیا ، اور اپنے ساتھ تنکوں کے گٹھے میں چھپا کر تاریوں [تارس (Tauris) کے رہنے والے ، یہ قدیم ملک قریم یا کریمیا میں واقع تھا] کی دیوی دائنا کی مورتی لیتا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی ہڈیاں اریشیا سے روم پہنچائی گئیں اور زراعت کے دیوتا ساٹرن کے مندر کے سامنے کوہ ٹارپی کی ڈھلان پر امن کی دیوی کے مندر کے برابر دفن کی گئیں۔ اس خونی رسم سے جو تاریوں کی دیوی دائنا سے منسوب تھی ، کلاسیکی علم و ادب کے قاری ناواقف نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہر وہ اجنبی جو ساحل تارس پر وارد ہوتا ، دائنا کی قربان گاہ میں بھینٹ چڑھا دیا جاتا۔ لیکن اٹلی پہنچ کر اس رسم کی شدت میں کمی آ گئی۔ نیمی کے معبد کے اندر ایک خاص درخت اگتا تھا ، جس کی ڈالی

توڑنی ممنوع تھی ۔ صرف ایک مفرور غلام ھی کو اس کی اجازت تھی کہ بن پڑے تو اس کی کوئی ڈالی توڑ ڈالے ۔ اس میں کامیابی سے وہ اس بات کا مستحق قرار پاتا تھا کہ تنہا پجاری سے مقابلہ کرے ۔ اگر وہ اپنے حریف کو قتل کر ڈالتا تو اس کی جگہ بن کے بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرنے لگتا ۔ پرانے زمانے کے لوگوں کے نزدیک یہی منحوس ڈالی وہ ''شاخ زریں'' تھی جو سبیل [(Sibyl) ایک بوڑھی کاھنہ جو قدیم داستانوں کے بہ موجب سینکڑوں برس زندہ رھی ، اس کا مسکن متعدد غار تھے اور یونان ، ایشیائے کوچک اور روما کے لوگ ھنگامی حالات میں اس سے رجوع کرتے تھے ۔ وہ اپنی پشین گوئیاں پتوں پر لکھ کر غار کے باھر پھینک دیا کرتی تھی] کے کہنے سے اینی آس [(Aeneas) ، ایشیائے کوچک کے مشہور شہر ٹرائے یا ٹروجا کا ایک سورما شہزادہ جو اٹلی چلا گیا تھا ۔ اسی کی اولاد نے رومی سلطنت کی بنا ڈالی تھی] نے عالم ارواح کے پر خطر سفر پر روانہ ھونے سے پہلے توڑی تھی ۔ کہا جاتا تھا کہ غلام کا مفرور ھونا اوریسٹیز کے مزار کا آئینہ دار ھے اور پجاری سے اس کا مقابلہ ان انسانی قربانیوں کی یاد گار ، جو کبھی تارس میں دائنا کو پیش کی جاتی تھیں ۔ شمشیر کے زور سے پجاری کی جانشینی کا دستور روما کے عہد شہنشاھیت تک جاری رھا ۔ چناں چہ سنکی شہنشاہ کالی جولا (Gaius Caesar Caligula ، شہنشاہ روم ۳۷—۴۱ء) کے دل میں یہ خیال آیا کہ نیمی کے پجاری کو اپنا عہدہ سنبھالے بہت مدت ہو گئی ، لہذا اس نے کرائے کے ایک قوی غنڈے کو اس کے قتل پر لگا دیا اور ایک یونانی سیاح جس نے انطونیوں کے عہد میں اٹلی کا سفر کیا تھا ، بیان کرتا ھے کہ پجاری کا منصب اس وقت تک بھی دو حریفوں کے مقابلے میں فتح یابی کا صلہ تھا ۔

دائنا کی جو پرستش نیمی میں ہوتی تھی ، اس کی کچھ نمایاں خصوصیات کا تعین اب بھی ممکن ھے ۔ ان چیزوں سے جو اس کی نذر چڑھائی جاتی تھیں اور جو مقام مذکور پر پائی گئی ھیں ، اس بات کا پتا چلتا ھے کہ اسے خاص طور پر ایک شکارن ، نیز مردوں اور

عورتوں کو اولاد عطا کرنے والی اور زچگی میں عورتوں کی مشکل آسان کرنے والی دیوی تصور کیا جاتا تھا ۔ اس کے علاوہ اس کی پوجا میں آگ کی اہمیت سب سے زیادہ تھی، کیوں کہ اس دیوی کے سالانہ تیوہار میں ، جو تیرہ اگست کو انتہائے گرما میں منایا جاتا تھا ، اس کا مقدس شجر زار ان گنت شعلوں سے جگمگا اٹھتا تھا ، جن کی سرخ روشنی جھیل سے منعکس ہوتی تھی ، اور اٹلی کے طول و عرض میں یہ دن مقدس رسموں کے ساتھ ہر گھر کے چولھے پر منایا جاتا تھا ۔ کانسی کے بنے ہوئے جو مجسمے مندر کی حدود میں پائے گئے ہیں ، ان میں خود اس دیوی کو اپنے آٹھے ہوئے داہنے ہاتھ میں مشعل لیے دکھایا گیا ہے ، اور بامراد عورتیں اپنی منتیں بڑھانے کے لیے ہاروں کے تاج پہنے اور ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں پکڑے نظر آتی ہیں ۔ کسی نامعلوم شخص نے نیمی کی ایک چھوٹی سی تبرک گاہ میں شہنشاہ کلاڈیس اور اس کے اہل و عیال کی جان کی سلامتی کے لیے ایک شمع فروزاں نذر کی تھی اور نخل زار میں جو پختہ مٹی کے چراغ پائے گئے ہیں وہ شاید اسی مقصد سے کم تر اشخاص کے لیے پیش کیے گئے ہوں ۔ اگر بات یہی ہے تو کیتھولک کلیساؤں میں شمعیں نذر کرنے کا دستور واضح ہو جاتا ہے ۔ مزید برایں ، نیمی میں دائنا کا لقب وستا یعنی آتش دان کی دیوی تھا ۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے معبد میں آگ ہمیشہ جلتی رہتی تھی ۔ مندر کے شمال مشرقی گوشے میں ایک مدور وسیع بنیاد ہے ، جو تین سیڑھیوں پر اٹھائی گئی ہے اور جس میں رنگا رنگ فرش کے نشانات ہیں ۔ غالباً یہ رومی دار العدل میں وستا کے گول مندر کی طرح وستا کی حیثیت میں دائنا کے کسی گول مندر کا پایہ تھی ۔ اس مقام پر مقدس آگ کی نگہداشت وستائی کنواریاں کرتی ہوں گی ، کیوں کہ اس جگہ پختہ مٹی کا بنا ہوا ایک وستائی دوشیزہ کا سر ملا ہے ؛ نیز آگ کی پرستش جسے کنواری راہبات ہمیشہ جلائے رکھتی تھیں ، لاطینی عہد میں اول سے آخر تک عام رہی ہو گی ۔ اس کے علاوہ ، اس دیوی کے سالانہ تیوہار میں شکاری کتوں کو تاج پہنائے جاتے تھے اور درندوں کو ہراساں نہیں کیا جاتا تھا ۔ جواں سال لوگوں

کو پاک ہونے کے لیے اس دیوی کے اعزاز میں ایک خاص رسم ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس میں شراب لائی جاتی تھی اور کھانے میں ایک بزغالہ، گرم گرم کیک جو پتوں پر پیش کیے جاتے تھے اور درختوں پر لگے ہوئے سیب کے خوشے ہوتے تھے۔

لیکن نیمی کے شجر زار میں اکیلی دائنا ہی کی خدائی نہ تھی۔ اس دیر صحرائی میں اس سے چھوٹے دو اور معبود اس کے شریک تھے۔ ان میں ایک اس شفاف پانی کی پری اجیریا (Egeria) تھی جس کے دل کش آبشار بسالتی چٹانوں سے ابل ابل کر ایک مقام لے مولے پر جھیل میں گرا کرتے تھے، کیوں کہ یہیں موجودہ قریۂ نیمی کی پن چکیاں نصب تھیں۔ اووڈ (Ovid پہلی صدی قبل مسیح کا مشہور رومی شاعر) نے سنگ ریزوں پر بہتے ہوئے اس چشمے کی چھل چھلاہٹ کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے اکثر اس کا پانی پیا ہے۔ اجیریا کے بارے میں عام عقیدہ یہ تھا کہ دائنا کی طرح وہ بھی عورتوں کی زچگی آسان کرتی ہے، اس لیے اس پر عورتوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ ایک روایت کے بہ موجب وہ روم کے دانش مند بادشاہ نوما (Numa Pompilius بانیٔ روم، رمولس کا امن پسند اور خدا ترس جانشین) کی بیوی یا محبوبہ تھی۔ نوما اس شجر زار کی خلوتوں میں اس کے ساتھ رہا اور اس نے رومیوں کو جو قانون عطا کیے تھے وہ اسی دیوی کے وصل کا فیضان تھے۔ پلوٹارک (Plutarch، پہلی صدی عیسوی کا یونانی سوانح نگار اور فلسفی) اس روایت کا شمار انسانوں سے دیوبوں کے عشق کی ان داستانوں میں کرتا ہے جن میں سیبلی (Cybele، دیوتاؤں کی ماتا اور زرخیزی کی دیوی جس کی پرستش کا آغاز ایشیائے کوچک کے ایک قدیم ملک فریجیا سے ہوا تھا) اور مون (Moon، چاند کی دیوی جسے بعد میں دائنا کے مماثل سمجھا جانے لگا) کی خوب رو نوجوانوں اتیس (Attis) اور اندمین (Endymion) سے محبت کی مثالیں ملتی ہیں (کلاسیکی اساطیر کے بہ موجب یہ دونوں حسین چرواہے تھے)۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان عاشق و معشوق کے ملاپ کی جگہ نیمی میں نہیں

تھی بلکہ وہ شہر روم کے آبریز کاپنیائی دروازے (Porta Copena) کے باہر ایک شجر زار میں ملا کرتے تھے ، جہاں اجیریا کا ایک اور چشمہ ایک تاریک غار سے ابلتا تھا ۔ روم کی وستائی راہبات ہر روز وستا کے مندر کو دھونے کے لیے اس چشمے سے مٹی کی صراحیوں میں پانی بھرتیں اور انھیں اپنے سروں پر اٹھا کر لے جاتی تھیں ۔ جوی نل (Juvenal ، عظیم رومی طنز نگار جو پہلی صدی عیسوی اور دوسری کے اوائل میں گزرا ہے) کے زمانے میں اس قدرتی چٹان کے ارد گرد جس کی کھوہ میں سے یہ سوتا پھوٹتا تھا ، سنگ مرمر کی چار دیواری کھینچ دی گئی تھی اور اس مقدس غار کو مفلس یہودیوں کی ٹولیوں نے نجس کر ڈالا تھا ، جو شجر زار میں جپسیوں کی طرح بسا دیے گئے تھے ۔ لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ اصل اجیریا اس چشمہ سے عبارت تھی جو نیمی کی جھیل میں بہہ نکلتا تھا اور جن لوگوں نے کوہ البا سے اتر کر دریائے ٹائی بر کے کناروں کو آباد کیا وہ اپنے ساتھ اس جل پری کو بھی لیتے گئے ، جہاں انھیں روم کے دروازوں کے باہر اس کا ایک اور مسکن مل گیا ۔ حماموں کے کھنڈر ، نیز پختہ مٹی کے بنے ہوئے مختلف انسانی اعضاء کے مجسمے جو اس کی عبادت گاہ کی حدود میں پائے گئے ہیں ، یہ بتاتے ہیں کہ اجیریا کا جل دوا کے طور پر بیماروں کو دیا جاتا تھا ۔ ان بیماروں نے ایک رسم کی پیروی میں جو آج بھی یورپ کے مختلف حصوں میں ادا کی جاتی ہے ، اپنے علیل اعضا کی ترشی ہوئی شبیہیں اجیریا کی نذر چڑھا کر اپنی صحت و شفاء کی مرادیں مانگی ہوں گی اور اس کا شکر ادا کیا ہو گا ۔ آج بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چشمے کے جل کی دوائی خصوصیات باقی ہیں ۔

نیمی میں دائنا کا دوسرا شریک وربیس تھا ۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ وہ اصل میں یونان کا نوجوان اور حسین و پاک باز سورما ہپولیٹس (Hippolytus) تھا ، جس نے کیران نامی سنتور (Centaur chiron ، یونانی صنمیات کی رو سے سنتور یونان کے ضلع تھیسلی کی ایک مخلوق تھے ، جن کا جسم آدھا گھوڑے اور آدھا آدمی کا تھا ۔ ان میں کیران کی حیثیت سب سے نمایاں تھی ، اس لیے کہ وہ طب ،

موسیقی اور قادر اندازی کا ماہر اور بہت سے یونانی سورماؤں کا استاد تھا) سے شکار کا فن سیکھا ۔ وہ اپنا سارا وقت جنگل میں درندوں کا تعاقب کرتے گزارتا تھا اور اس شغل میں کنواری شکارن ارتمیس (Artemis ، دائنا کا یونانی نام) اس کی اکیلی رفیق ہوتی ۔ اس دیوی کی بے لوث صحبت پر اسے کچھ ایسا ناز تھا کہ اس نے عورتوں کی محبت کو ٹھکرا دیا اور یہی چیز اس کی تباہی کا سبب بن گئی ۔ افرودیتی (Aphrodite ، یونانی صنمیات کی رو سے اس دیوی کا تعلق حسن و عشق کے جنسی پہلو اور مرد و زن کے حیاتیاتی رشتے سے ہے) نے ، جسے ہیپولیٹس کی محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا ، اپنے جوش انتقام میں اس کی سوتیلی ماں فیڈرا (Phaedra) کے دل میں اس کی محبت پیدا کر دی ، اور جب ہیپولیٹس نے اس کی ہوس ناک اداؤں کا جواب حقارت سے دیا تو اس نے اس کے خلاف اس کے باپ تھیسیوس (Theseus) کے کان بھر دیے اور اس پر بہتان لگایا ، جس پر یقین کر لیا گیا اور تھیسیوس نے اپنے باپ پوسائی ڈون (Poseidon ، یونانی دیومالا میں پانی اور سمندر کا دیوتا) سے التجا کی کہ وہ اس ظلم کا انتقام لے ۔ چناں چہ ایک دن ہیپولیٹس اپنے بہان میں سوار خلیج سارونو (اٹلی میں ایک خلیج) کے کنارے سے گزر رہا تھا تو سمندر کے دیوتا نے موجوں میں سے ایک مست بیل بھیج دیا ۔ اس سے گھوڑے بھڑک گئے اور ہیپولیٹس کو گاڑی سے پھینک کر اسے اپنے سموں سے ایسا گھسیٹا کہ اس کا کام تمام ہوگیا ۔ لیکن دائنا نے ہیپولیٹس کی محبت میں حکیم ایسلیپیس (Aesculapius ، کیوان کا ایک شاگرد) کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس خوب رو شہسوار کو پھر سے زندہ کر دے ۔ ایک فانی انسان کے اس طرح موت کی سرحدوں سے لوٹ آنے پر جوپیٹر (دیوتاؤں کے دیوتا زیوس کا رومی نام) غضب ناک ہو گیا اور خود اس حکیم کو جس نے اس کی خدائی میں مداخلت کی جسارت کی تھی ، عالم اسفل میں پھینک دیا ، مگر اپنے محبوب کو دائنا نے اس دیوتا کے قہر سے بچانے کے لیے گہرے بادل میں چھپا دیا ، اس کی عمر بڑھا کر اس کا حلیہ بدل ڈالا اور پھر اسے دور نیمی کی گھاٹیوں میں لے گئی اور وہاں اسے

جل پری اجیریا کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اٹلی کے اس جنگل کے اندر وربیس کے نام سے تنہائی اور گم نامی کی زندگی بسر کرے ۔ اس جنگل میں اس نے بادشاہت کی اور اسی میں اس نے دائنا کی ایک عبادت گاہ بنائی ۔ وربیس نامی اس کا ایک خوب صورت بیٹا تھا ، جس نے اپنے باپ کے انجام سے بے پروا ، اینی آس اور اہل ٹرائے سے لاطینیوں کی جنگ میں ان کی مدد کے لیے غضب ناک جنگی گھوڑے بھیجے تھے ۔ وربیس کی پرستش نہ صرف نیمی میں بلکہ اور جگہوں پر بھی ہوتی تھی ، چناں چہ پتا چلا ہے کہ کیمپینیا (Campania ، اٹلی کا ایک علاقہ جس میں لاطیم کے شہر شامل تھے) میں اس کی عبادت کے لیے ایک خاص پجاری وقف تھا ۔ گھوڑوں کو اریشیائی شجر زار سے نکال دیا گیا تھا ، اس لیے کہ گھوڑوں ہی نے ہیپولیٹس کو ہلاک کیا تھا ۔ وربیس کے بت کو چھونا خلاف قانون تھا ۔ کچھ لوگ اسے سورج دیوتا خیال کرتے تھے ۔ لیکن سرویس (Servius ، پانچویں صدی کا ایک لاطینی عالم) کا کہنا ہے کہ اس دیوتا کا دائنا سے وہی تعلق تھا جو اتیس کا دیوتاؤں کی ماتا سبیلی سے ، ارکتھونیس (روایت کے بہ موجب یہ ایک قدیم یونانی بادشاہ تھا ، جس نے ایتھنا یا منروا کی پرستش کی بنیاد ڈالی) کا منروا (Minerva ، عقل و دانش ، جنگ ، صنعت و حرفت وغیرہ کی رومی دیوی) سے اور ایڈونس (Adonis ، قبرص کا حسین شہزادہ ، جس کا نام بعد میں بہار و خزاں کی علامت بن گیا اور جس کی شام اور یونان و روم میں پرستش ہونے لگی) کا وینس (Venus ، یونانی دیوی افرودیتی کا رومی نام) سے تھا ۔ اس تعلق کی نوعیت جو کچھ تھی اس سے آگے بحث کی جائے گی ۔ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس داستانی کردار کی طویل اور گوناں گوں نشو و نما میں بڑا تسلسل اور ہم آہنگی نظر آتی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ رومی تقویم کے ولی ہیپولیٹس اسی نام کے یونانی سورما کے سوا کوئی اور نہیں ، کیوں کہ ان ولی کو بھی گھوڑوں نے اگست کی تیرھویں تاریخ ، جو دائنا کے اپنے تیوہار کا دن ہے ، گھسیٹ کر مار ڈالا تھا اور انھیں دو مرتبہ کفر کی حالت میں مرنے کے بعد مسیحی ولی کی حیثیت سے زندگی بخشی گئی ۔

ہمیں یہ تسلیم کرنے کے لیے کسی بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں کہ نیمی کے شجر زار میں دائنا کی پرستش والی رسم کی توضیح میں جو قصے بیان کیے گئے ہیں ، انھیں تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں ۔ یہ صریحی طور پر ان کثیرالتعداد اساطیر کے زمرے میں آتے ہیں جو کسی قسم کی مذہبی رسوم کے آغاز کی تاویل کے لیے گھڑے گئے ہوں ، اور ان کی بنیاد اس کے سواء کچھ نہیں کہ رسم مذکور اور کسی غیر ملکی رسم کے درمیان حقیقی یا فرضی مشابہت پائی جاتی ہے ۔ حقیقت میں ان نیمی والے قصے کہانیوں کا تناقض بالکل عیاں ہے ، اس لیے کہ ان میں دائنا کی پرستش کی بناء ڈالنے کا سہرا کبھی آریسٹیز کے سر رکھا جاتا ہے اور کبھی ہیپولیٹس کے ۔ اس قسم کے قصے کہانیوں کی افادیت بس اس قدر ہے کہ ان سے ایک تقابلی معیار بہم پہنچتا ہے ، جس سے دائنا کی پرستش کی توضیح میں مدد ملتی ہے ۔ نیز وہ ضمنی طور پر اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اس دیوی کی پرستش قدیم سے ہوتی چلی آتی تھی ، کیوں کہ ان کی روشنی میں زیر بحث رسم کی اصل پر اس عہد کہن کی تاریکی چھائی نظر آتی ہے جس کی فقط کہانیاں ہی کہانیاں ہم تک پہنچتی ہیں ۔ اس دوسری صورت میں یہ نیمی والے قصے غالباً اس روایت سے زیادہ قابل اعتبار ہیں جو بہ ظاہر تاریخی معلوم ہوتی ہے اور جس کی تصدیق کیتوئے اکبر [Marcus Porcius Cato (۲۳۳ ق ۔ م تا ۱۴۹ ق ۔ م) رومی محب وطن اور Origines کا مصنف ، اور غالباً پہلا رومی نثر نگار ۔ یہ ہیلینی تہذیب کا سخت مخالف تھا] نے کی ہے ؛ اس کے بہ موجب اس مقدس شجر زار کو ایجیریس بے بیس یا لے ویس ٹسکولمی نامی کسی لاطینی آمر نے ٹسکولم ، اریشیا ، لانوویم ، لارنیٹم ، کورا ، ٹائی بر ، پومیشیا اور آرڈیا (لاطیم کے شہر) کے لوگوں کی جانب سے دائنا کے لیے وقف کیا تھا ۔ مذکورہ بالا روایت سے حقیقت میں عبادت گاہ نیمی کی قدامت کا ثبوت ملتا ہے ، اس لیے کہ اس کی رو سے ۴۹۰ ق ۔ م سے پہلے اس کی بنیاد پڑ چکی تھی ۔ اسی سال پومیشیا رومیوں کے ہاتھوں برباد ہوا تھا ، جس کے بعد تاریخ کے صفحات اس کے ذکر سے خالی ہو گئے ۔ لیکن یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ لاطینی

بلاد متحدہ نے جن کے مہذب و متمدن ہونے میں شک کی گنجائش نہیں ، جان بوجھ کر اریشیائی پجاری کی جانشینی کے سے وحشیانہ دستور کا آغاز کیا ہوگا ۔ یہ دستور اس عہد سے چلا آ رہا ہوگا جس کی یاد بھی انسانی ذہن سے محو ہو چکی ہے اور جب اٹلی والوں کو اپنے کسی تاریخی دور کے ابتدائی مراحل ترقی تک پہنچنے کے لیے بھی ہنوز ایک زمانہ درکار تھا ۔ ایک اور کہانی سے روایت مذکور کی تردید ہوتی ہے ۔ اس کہانی کے مطابق عبادت گاہ نیمی کا بانی کوئی مینی اس ایجیریس تھا ، جس کی وجہ سے یہ مثل مشہور ہوئی کہ ''اریشیا میں متعدد مینی آئی (مینی ، اس کی جمع) ہیں'' ۔ اس مثل کی توجیہ میں کچھ لوگ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ مینی اس ایجیریس ایک ایسے شخص کا نام تھا ، جس سے ایک طویل اور ممتاز سلسلۂ نسب چلا تھا ، اور کچھ لوگ اس کی تعبیر یہ کرتے تھے کہ اریشیا بہت سے بد ہیئت اور بد شکل لوگوں کا مسکن تھا ، اور ان کا یہ نام لفظ مینیا سے ماخوذ تھا ، جس کے معنی بھوت یا ہوا کے ہیں اور جس سے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے ۔ ایک رومی طنز نگار کے ہاں یہ نام ان بھکاریوں کے مثالی نمونے کے لیے استعمال ہوا ہے جو اریشیائی پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر زائروں کی گھات میں لگے رہتے تھے ۔ آراء کے یہ اختلافات اور وہ فرق جو اریشیائی مینی اس ایجیریس اور ٹسکولمی ایجیریس لے ویس کے درمیان پایا جاتا ہے ، نیز ان دونوں ناموں کی داستانی ایجیریا سے مشابہت ، ان سب کی بناء پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ نیمی میں دائنا کی پرستش کی بناء آغاز تاریخ سے بہت پہلے پڑ چکی تھی ۔ تاہم اس روایت سے جو کیتو قلم بند کر گیا ہے ، ایسے ضمنی شواہد ہاتھ آتے ہیں اور اس کی صداقت کا ضامن ایسا محترم شخص ہے کہ اسے لغو سمجھ کر خارج از بحث نہیں کیا جا سکتا ، بلکہ یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ روایت در اصل قدیم زمانے میں عبادت گاہ نیمی کی اس مرمت یا تعمیر نو کی طرف اشارہ کرتی ہے جو لاطیم کی ریاست ہائے متحدہ کی جانب سے عمل میں آئی تھی ۔

بہر کیف اس سے اس رائے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ شجر زار نیمی شروع سے اگر سارے اتحاد لاطینی کا نہیں تو کم از کم اٹلی کے قدیم ترین شہروں کا معبد ضرور رہا تھا ۔

(۲) ارتمیس اور ہیپولیٹس — میں کہہ آیا ہوں کہ آریسٹیز اور ہیپولیٹس سے متعلق اریشیائی قصے کہانیاں گو تاریخی مواد کی حیثیت سے کسی کام کے نہیں ، لیکن جہاں تک اُن سے نیمی میں دائنا کی پرستش کا دوسری عبادت گاہوں کے رسوم و اساطیر سے موازنہ کرکے اس رسم پرستش کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ، اُن کی کچھ نہ کچھ قدر و قیمت ضرور ہے ۔ یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ وربیس اور بن کے بادشاہ کی توجیہ کرنے کے لیے ان قصوں کے گھڑنے والوں کی نظر انتخاب آریسٹیز اور ہیپولیٹس ہی پر کیوں پڑی ؟ جہاں تک آریسٹیز کا تعلق ہے ، جواب واضح ہے ۔ اس یونانی سورما اور خون کی پیاسی دائنا کے بت کو ان میں اس لیے ٹھونسا گیا کہ اریشیائی مندر کی تولیت کے سفاکانہ دستور کی تفہیم ہو سکے ۔ لیکن ہیپولیٹس کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے ۔ جس صورت سے اُس کی موت واقع ہوئی ، اُس سے گھوڑوں کے شجر زار نیمی سے نکالے جانے کا ایک سبب تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے ۔ لیکن اُس سے یہ گتھی نہیں سلجھتی کہ ہیپولیٹس اور وربیس کو ایک کیوں سمجھ لیا گیا ۔ لہذا ہیپولیٹس کی پرستش نیز اس کی ذات سے متعلق قصہ یا اسطور کی چھان بین کرکے اس مسئلے کی مزید تحقیق ضروری ہے ۔

اس کے آبائی وطن ٹروئے زن (آرگولس ، یونان کا ایک قدیم شہر) میں اس کی ایک مشہور عبادت گاہ تھی ۔ یہ مقام اُس حسین خلیج کے کنارے واقع تھا ، جس کے تقریباً چاروں طرف خشکی ہے ۔ آج اس کے ذرخیز کنارے کی پٹی پر ناہموار پہاڑیوں کے دامن میں لیموں اور نارنگی کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں ، جن سے لمبے لمبے سرو باغ ہیسپریڈیز (یونانی صنمیات کی رو سے یہ ایک باغ تھا جو

آسمانوں کی دیوی ہیرا کو زمین کی دیوی جے نے اس کی شادی پر نذر کیا تھا ۔ اس باغ کے ''سیب ھائے زرین'' کی حفاظت پر تین پریاں مامور تھیں) کے درختوں کی چوٹیوں کی طرح سر نکالے کھڑے ھیں ۔ اس نیلگوں خلیج اور کھلے سمندر کے درمیان سمندر کے دیوتا پوسائی ڈون کا جزیرہ ایک بند کی طرح ابھر آیا ھے ، جس کی چوٹیوں کو صنوبر کے سر سبز درختوں نے ڈھانک رکھا ھے ۔ اس دل کش ساحل پر ھیپولیٹس کی پوجا ھوتی تھی ۔ اس کی عبادت گاہ میں ایک مندر کھڑا تھا ، جس میں اس کی ایک قدیم مورتی رکھی تھی ۔ اس کی پرستش کی رسوم ادا کرنے پر تمام عمر کے لیے ایک پجاری مامور رہتا تھا ۔ ھر سال اس کی یاترا ھوتی تھی جس میں قربانیاں دی جاتیں اور کنواریاں اپنی گریہ و زاری اور نوحہ خوانی سے ھر سال اس کی جواں مرگی کا سوگ مناتیں ۔ لڑکے اور لڑکیاں شادیوں سے قبل اس کے مندر میں اپنے گیسو نذر چڑھاتے ۔ اس کی قبر ٹروئے زن میں موجود تھی لیکن کوئی اس کا پتا نہیں دیتا تھا ۔ ھیپولیٹس کے بارے میں ایک رائے ، جو بہ ظاھر نہایت معقول معلوم ھوتی ھے ، یہ پیش کی گئی ھے کہ یہ حسین سورما بھی جو ارتمیس کا محبوب تھا ، جس کی شمع حیات عین عنفوان شباب میں بجھ گئی اور جس کا ھر سال کنواریاں سوگ مناتی تھیں ، کسی دیوی کے آن عشاق خاکی میں ایک تھا ، جن کی مثالیں قدیم مذھب میں بہ کثرت ملتی ھیں ، اور جن کا سب سے معروف نمونہ ایڈونس ھے ۔ کہا جاتا ھے کہ ھیپولیٹس کے عشق میں ارتمیس اور فیڈرا کی رقابت در اصل ایڈونس کے عشق میں ناموں کی تبدیلی کے ساتھ افرودیتی اور پراسپرین (یا پرسے خونی—زیوس کی بیٹی ڈیمیٹر کے بطن سے ، عالم اسفل کے دیوتا پلوٹو کی ملکہ اور فصلوں کی دیوی) کی رقابت کی ایک محاکاتی صورت ھے ، کیوں کہ فیڈرا افرودیتی کی محض ایک ھم زاد ھے ۔ اس نظریے سے غالباً ھیپولیٹس یا ارتمیس کے ساتھ تو بے انصافی نہیں ھوتی ، اس لیے کہ ارتمیس اصل میں ، سرسبزی و زرخیزی کی ایک بڑی دیوی تھی ، اور قدیم مذھب کے اصول کے بہ موجب جس کا کام فطرت کو بار آور

کرنا ہو ، خود اس کا اپنا کوئی نہ کوئی رفیق نرینہ ہونا لازمی ہے ۔ لہذا اس نظریے کی رو سے ہیپولیٹس ٹروے زن میں ارتمیس کا رفیق تھا اور ٹرویزنی نوجوان اور کنواریاں جو اپنے کٹے ہوئے گیسو اس پر نذر چڑھاتے تھے ، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس دیوی سے ہیپولیٹس کا رشتہ اتحاد مضبوط ہو اور اس طرح زمین ، مویشی اور بنی نوع انسان کی ثمروری کو تقویت پہنچے ۔ اس نظریے کی تصدیق کسی حد تک اس بات سے ہوتی ہے کہ ٹروے زن ہیپولیٹس کی عبادت گاہ کی حدود کے اندر ڈیمیا اور آکسیشیا نام کی دو نسائی قوتوں کی پرستش ہوتی تھی ۔ ان قوتوں کا زمین کی زرخیزی سے جو تعلق تھا اس کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ۔ جب ایپی ڈارس (ایک جزیرہ جو ٹروے زن کے قریب واقع تھا) میں کال پڑا تو ایک پیشین گوئی کی تعمیل میں لوگوں نے زیتون کی مقدس لکڑی پر ڈیمیا اور آکسیشیا کی شبیہیں کھودیں اور انھیں بتوں کی طرح کھڑا کر دیا ۔ ان کا یہ کرنا ہی تھا کہ زمین پھر سے پھل پھول لانے لگی ۔ اس کے علاوہ ٹروے زن میں بھی ، ہیپولیٹس کے معبد کی حدود کے اندر ان دیویوں کے نام پر ، جنھیں اہل ٹروے زن کنواریاں کہتے تھے ، سنگ باری کی ایک عجیب رسم ادا کی جاتی تھی اور یہ ثابت کرنا چنداں دشوار نہیں کہ اور بہت سے ملکوں میں اسی قسم کی رسمیں جاری رہی ہیں ، جن کا مقصد صریح یہ تھا کہ زمین سے وافر فصل حاصل کی جائے ۔ جواں مرگ ہیپولیٹس کے المیے میں دوسرے حسین نوجوانوں کی اسی قسم کی داستانوں کی مشابہت نظر آئے گی جنھوں نے ان دیویوں سے عشق ناپائدار کی سرخوشی کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں ۔ یہ بد نصیب عاشق غالباً سب کے سب محض فرضی اشخاص نہ تھے ، اور وہ قصص و روایات جو بنفشۂ ارغوان کی رعنائی ، شقائق نعمان کے قرمزی داغ یا آتش گل کو انھی شہیدان محبت کے لہو کا رہین منت بتاتے ہیں ، حسن و شباب کی بہار چند روزہ کی محض شاعرانہ تصویریں نہیں ہیں ۔ ان میں انسان اور فطرت کی

زندگی کے رشتے کا بڑا گہرا فلسفہ ملتا ہے ، ایسا دل گداز فلسفہ جو ایک الم ناک دستور کا موجب بن گیا ۔ یہ فلسفہ اور دستور کیا تھے ؟ یہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہو گا ۔

(۳) خلاصۂ کلام — اب ہمارے لیے یہ سمجھنا شاید ممکن ہو کہ قدیم زمانے کے لوگوں کو یہ خیال کیسے پیدا ہوا کہ ارتمیس کا شوہر ہیپولیٹس اور وربیس جس کا سرویس کے بیان کے بہ موجب دائنا سے وہی تعلق تھا جو ایڈونس کا وینس سے یا ارتمیس کا دیوتاؤں کی ماتا سے ، ایک ہی شخصیت کے دو مختلف نام ہیں ۔ وجہ یہ تھی کہ دائنا ارتمیس کی طرح سرسبزی و زرخیزی کی ایک عام دیوی تھی اور وضع حمل اس کا خاص کام تھا ۔ اس حیثیت سے اسے اپنی مماثل یونانی دیوی کی طرح ایک مرد ساتھی کی ضرورت تھی ۔ اگر سرویس کا بیان درست ہے تو اس کا یہ ساتھی وربیس تھا ۔ وربیس کی ذات ، مقدس شجر زار کی عبادت گاہ کے بانی اور نیمی کے پہلے بادشاہ کی حیثیت سے صریحی طور پر آن پجاریوں کے سلسلے کے داستانی پیش رو یا نمونۂ اولین سے عبارت ہے جنھوں نے بادشاہوں کے لقب سے دائنا کی پرستش کے فرائض انجام دیے اور جو وربیس کی مانند یکے بعد دیگرے ہلاک کر دیے گئے ۔ لہذا یہ قیاس بے جا نہیں کہ ان پجاریوں کا بھی دائنا سے وہی تعلق تھا جو وربیس کا تھا ۔ مختصر یہ کہ بن کے آدم زاد بادشاہ کی ملکہ خود بن کی دیوی دائنا تھی ۔ اگر وہ شجر مقدس ، جس کی حفاظت اس کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا ، اس دیوی کا خاص مظہر تصور کیا جاتا تھا ، جو قرین قیاس معلوم ہوتا ہے ، تو اس کا پجاری نہ صرف اس کی پرستش کرتا ہوگا بلکہ اس سے اپنی بیوی کی طرح ہم آغوش ہوتا ہوگا ۔ یہ قیاس بے معنی نہیں ، اس لیے کہ پلینی (۲۳ تا ۷۹ء Historia Naturalis کا مصنف) کے عہد میں بھی ایک رومی امیر کوہ البا پر ایک اور دائنائی شجر زار میں بیچ (Beech ، سفیدے کی قسم کا

ایک اونچا درخت جس کی چھال چکنی اور پتیاں چمک دار ہوتی ہیں) کے ایک درخت کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتا تھا۔ وہ اس درخت سے چمٹتا، اسے چومتا، اس کے سائے میں لیٹتا اور اس کے تنے پر شراب انڈیلتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس درخت کو بن کی دیوی تصور کرتا تھا۔ درختوں سے مردوں اور عورتوں کے بیاہ کی رسم ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک میں ابھی تک جاری ہے۔ لہذا اگر وہ لاطیم قدیم میں ادا کی جاتی تھی تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مجموعی حیثیت سے شواہد کا ایک بار اور جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نیمی کے مقدس شجر زار میں دائنا کی پرستش کو بڑی اہمیت حاصل رہی، اور یہ رسم اس عہد قدیم سے چلی آتی تھی جس کی یاد بھی انسان کے ذہن سے محو ہو چکی ہے؛ اس کا احترام جنگلوں اور صحرائی مخلوق، نیز غالباً مویشی اور زمین کی پیداوار کی دیوی کی حیثیت سے کیا جاتا تھا؛ اس کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ عورتوں اور مردوں کو اولاد بخشتی ہے اور وضع حمل میں ماؤں کی مدد کرتی ہے؛ اس کی مقدس آگ، جس کی نگہداشت پر باعفت کنواریاں لگی رہتی تھیں، عبادت گاہ کے اندر ایک گول مندر میں سدا جلتی رہتی تھی؛ ایجیریا نامی ایک جل پری اس سے وابستہ تھی جو درد زہ میں عورتوں کی مدد کرکے اس کا ایک منصب پورا کرتی تھی اور جس کے متعلق ایک عام خیال یہ تھا کہ مقدس شجر زار میں ایک رومی بادشاہ کو اس کا لطف صحبت حاصل رہا؛ نیز بن کی دیوی دائنا کا بھی وربیس نامی ایک مرد ساتھی تھا، جس کا تعلق اس سے وہی تھا جو ایڈونس کا وینس سے یا ارتمیس کا سبیلی سے تھا اور آخر میں یہ کہ تاریخی زمانوں میں اس اساطیری وربیس کی نمائندگی ان پجاریوں کے سلسلے نے کی جو بن کے بادشاہ کہلاتے اور اپنے جانشینوں کی تلواروں سے باقاعدہ ہلاک ہوتے تھے اور جن کی زندگیاں شجر زار میں ایک خاص درخت سے

وابستہ تھیں ، کیوں کہ جب تک اس درخت کو کوئی ضرر نہ پہنچتا ، یہ بھی حملے سے محفوظ رہتے ۔

ظاہر ہے کہ یہ نتائج جو ہم نے اخذ کیے ہیں وہ بجائے خود نیمی والے پجاری کی جانشینی کے اس انوکھے دستور کی توجیہ و تشریح کے لیے کافی نہیں ، لیکن شاید اپنے جائزے کا دائرہ وسیع کرنے سے ہم پر یہ کھلے کہ انھی میں بنیادی طور پر زیر بحث مسئلے کا حل موجود ہے ۔ لہذا اب ہمیں اس وسیع تر جائزے کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، جو نہایت طویل یا دقت طلب ہوگا ، لیکن ساتھ ہی اس میں آن بحر نوردوں کے سفر کی دل کشی اور دل آویزی بھی ہوگی جو نئے ملکوں کی تلاش میں نکلے ہوں ۔ اس سفر میں ہم بہت سے عجیب ملکوں کی سیر کریں گے اور ان سے بھی زیادہ عجیب رسمیں دیکھیں گے ۔ تو پھر آئیے ہوا موافق ہے ، لنگر اٹھائیں اور کچھ عرصے کے لیے ساحل اٹلی کو خیر باد کہیں ۔

دوسرا باب

# مذہبی بادشاہ

ہم نے جن سوالات کا جواب دینے کا بیڑا اٹھایا ہے ، وہ اصل میں دو ہیں : ایک تو یہ کہ وہ کیا وجہ تھی جس کی بناء پر نیمی میں دائنا کے پجاری یعنی بن کے بادشاہ کے لیے اپنے پیش رو کا قتل کرنا ضروری تھا ؟ دوسرے ، ایسا کرنے سے پہلے اسے ایک خاص درخت کی ڈالی کیوں توڑنی پڑتی تھی جسے قدیم زمانے کے لوگ ورجل کی شاخ زریں [رومی شاعر ورجل اپنے رزمیہ (Aeneid) میں کہتا ہے کہ سبیل کاہنہ کے کہنے سے اینی اس نے عالم ارواح کے پر خطر سفر پر روانہ ہونے سے پہلے شاخ زریں توڑی تھی ، جو ایک خاص شجر کی ڈالی تھی ۔ دیکھیے اینیڈ VI] سے تعبیر کرتے تھے ؟

اس ضمن میں سب سے پہلے اس پجاری کا شاہی لقب غور طلب ہے ۔ اسے بن کا بادشاہ کس لیے کہا جاتا تھا ؟ اس کا عہدہ بادشاہت سے کیوں عبارت تھا ؟

شاہی لقب سے مذہبی فرائض کی وابستگی قدیم اٹلی اور یونان میں ایک عام چیز تھی ۔ روم اور لاطینی شہروں میں ایک پجاری تھا جو شاہ قربانی یا شاہ رسوم مقدسہ کہلاتا تھا اور اسی طرح اس کی بیوی کا لقب ملکۂ رسوم مقدسہ تھا ۔ ایتھنز کی جمہوری ریاست میں میجسٹریٹ دوم کو جو ہر سال بدلتا رہتا تھا ، بادشاہ کہا جاتا تھا ، اور اس کی بیوی کو ملکہ ۔ ان دونوں کے فرائض کی نوعیت مذہبی

تھی ۔ بہت سی دوسری یونانی جمہوریتوں میں اسی قسم کے لقبی بادشاہ ہوتے تھے جن کے فرائض بھی ، جہاں تک پتا چلا ہے ، مذہبی ہی تھے اور ان فرائض کا محور ریاست کا معبد عام تھا ۔ بعض یونانی ریاستوں میں بہ یک وقت ایسے کئی لقبی بادشاہ مامور تھے ۔ روم کی روایت کے بہ موجب وہاں ملوکیت کے خاتمے کے بعد ان قربانی کی رسموں کے لیے ، جو پہلے بادشاہ ادا کیا کرتے تھے ، شاہ قربانی مقرر کیا گیا ۔ ان مذہبی بادشاہوں کی اصل کے متعلق اہل یونان کا بھی یہی خیال تھا ۔ یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے اور اس کی تصدیق اسپارٹا (یونان کی ایک قدیم ریاست جو اپنی چند شخصی حکومت اور نظم و ضبط کے لحاظ سے ایتھنز کے بالکل برعکس تھی) کی مثال سے ہوتی ہے جو خالص یونانی قسم کی ریاست کا واحد نمونہ تھی اور جس نے تاریخی ادوار میں اپنا شاہی طرز حکومت قائم رکھا ۔ اس ریاست میں بادشاہ دیوتاؤں کے اخلاف کی حیثیت سے قربانی کی تمام رسمیں بہ نفس نفیس ادا کیا کرتے تھے ۔ اس ریاست کے دو بادشاہ تھے ، ایک لے سے ڈومنی زیوس [زیوس (Zeus) یونانیوں کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا دیوتا ، زیوس لے سے ڈومنی کا تعلق صرف ریاست اسپارٹا سے تھا] کا پجاری تھا اور دوسرا آسمانی زیوس کا ۔

مذہبی فرائض اور شاہی اقتدار کے اس امتزاج سے سبھی واقف ہیں ۔ مثال کے طور پر ایشیائے کوچک مختلف عظیم مذاہب کے ان دارالمالک کا مرکز تھا جو ہزارہا مقدس غلاموں کا مسکن تھے اور جن پر ایسے مہا پجاری حکومت کرتے تھے جنھیں ازمنۂ وسطیٰ کے رومی پاپاؤں کی طرح دینی اور دنیوی دونوں قسم کے اختیارات حاصل تھے ۔ انھی شہروں میں دوزیلا اور پیسی نس تھے ۔ اس کے علاوہ عہد بت پرستی میں قدیم تیوتانی (جرمن) بادشاہوں کی یہی حیثیت رہی ہو گی اور انھیں مہا پجاریوں کے اختیارات حاصل ہوں گے ۔ چین کے خاقان قومی قربانیوں کی رسوم میں پیشوائی کے فرائض انجام دیتے تھے ، جن کی تفصیلات کے قواعد و ضوابط مذہبی رسم ناموں میں درج تھے ۔ شاہ مدغاسکر بھی اپنی قلم رو کا پیشوائے اعظم تھا ۔ نئے سال

کے بڑے تیوہار میں جب سلطنت کی فلاح و بہبود کی غرض سے بیل کی قربانی دی جاتی تھی تو بادشاہ اس موقع پر پوجا پاٹ اور شکرانہ ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوتا اور اس کے خادم اس کے سامنے بیل کو ذبح کرتے۔ مشرقی افریقہ کے گلاؤں (ایک قدیم حبشی قوم جس نے غالباً آں حضرت کی دعوت اسلام قبول نہ کی اور اسی بناء پر اپنے اس نام سے مشہور ہو گئی۔ یہ ابھی تک کفر و بت پرستی میں مبتلا ہے) کی ان ملوکی ریاستوں میں جو ابھی تک آزاد چلی آتی ہیں، بادشاہ پہاڑ کی چوٹیوں پر قربانیاں دیتا ہے اور اسی کی نگرانی میں انسانی قربانی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ نیز روایت کے جھٹ پٹے میں دینی و دنیوی اقتدار اور شاہی و مذہبی فرائض کا ایسا ہی امتزاج وسطی امریکہ کے اس فرحت بخش خطے کے بادشاہوں کے ہاں نظر آتا ہے، جس کا دارالحکومت اب گرم سیر جنگل کی جھاڑ جھنکاڑ میں دبا پڑا ہے اور جس کی نشان دہی پالینکے (Palenque، میکسیکو میں ایک مقام) کے شان دار اور پر اسرار کھنڈر کرتے ہیں۔

لیکن ہمارے محض یہ کہہ دینے سے کہ قدیم زمانے کے بادشاہ بالعموم مذہبی بادشاہوں کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے منصب کے مذہبی پہلو کا حق ہرگز ادا نہیں ہوتا۔ ان دنوں وہ آسمانی طاقت جو بادشاہ کی محافظ تصور کی جاتی تھی، کوئی بے معنی چیز نہ تھی، بلکہ ایک ایسے عقیدے کی آئینہ دار تھی جو سوچ سمجھ کر قبول کیا گیا تھا۔ بہت سی صورتوں میں بادشاہوں کے تقدس کی بناء محض ان کی مذہبی پیشوائی یعنی شفیعانہ حیثیت نہ تھی، بلکہ ان کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ خود دیوتا ہیں اور اپنی رعایا اور پرستاروں پر ان برکتوں کے نازل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، جو عام طور پر انسان کی دسترس سے باہر سمجھی جاتی ہیں، اور جو ضرورت کے وقت عبادت اور قربانی کے ذریعے صرف فوق‌الفطرت اور غیر مرئی طاقتوں سے طلب کی جاتی ہیں۔ چناں چہ بادشاہوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ وقت پر مینہ برسائیں، دھوپ نکالیں، فصلوں کی نشو و نما کریں وغیرہ وغیرہ۔ یہ توقع جو ہمیں نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے، قدیم

انداز فکر کے عین مطابق ہے ۔ ترقی یافتہ لوگوں کے نزدیک فطرت اور مافوق الفطرت کے درمیان جو فرق ہے وہ وحشی کے تصور میں مشکل سے آتا ہے ۔ اس کی دانست میں دنیا کا چلن بڑی حد تک فوق الفطرت عوامل ، یعنی شخصی قسم کی ایسی ہستیوں کی کارسازی ہے جن کا عمل آن ہی مہیجات و محرکات کا رہین منت ہے جو خود اس کے اپنے عمل کی تہ میں کارفرما ہوں اور جنھیں خود اس کی طرح بیم و رجا اور رحم کے جذبات کو چھیڑ کر ابھارا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں جس کا تصور یہ ہو ، اسے ایسا نظر آتا ہے کہ اس کے اختیار کی کوئی حد نہیں اور وہ ہر طرح فطرت کو اپنے رستے پر لگا سکتا ہے ؛ گویا اس کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ دیوتاؤں سے پوجا پاٹ ، وعدوں یا دھمکیوں کے ذریعے خوش گوار موسم اور وافر فصل حاصل کرے اور ، جیسا کہ بعض صورتوں میں اس کا عقیدہ ہے ، جو کہیں کوئی دیوتا خود اس کی ذات میں حلول کر آئے تو پھر اسے کسی برتر ہستی سے رجوع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ وحشی اپنے آپ کو ان تمام قوتوں کا حامل سمجھتا ہے جو اس کی اور اس کے ہم جنس بنی آدم کی بھلائی اور خوش حالی کے لیے ضروری ہیں ۔

کسی انسانی خدا تک پہنچنے کی ایک صورت تو یہ تھی ۔ لیکن اس کی ایک صورت اور بھی ہے ۔ عالم کے اس نظریے کے ساتھ ساتھ کہ اس میں روحانی قوتیں جاری و ساری ہیں ، وحشی کے ہاں ایک تصور جو غالباً اس سے بھی پرانا ہے ، اور ملتا ہے ۔ اس میں ہمیں قانون فطرت کے جدید تصور یا اس نظریے کا ہیولیٰ نظر آ جائے گا کہ فطرت واقعات کے ایک ایسے سلسلے سے عبارت ہے جو کسی شخصی عامل کی مداخلت کے بغیر مقررہ نظم و ترتیب کے ساتھ ظہور میں آتا رہتا ہے ۔ جدید نظریے کا یہ بنیادی عنصر جادو کی اس قسم میں شامل ہے جسے سحر مشارک (Sympathetic magic) کہا جا سکتا ہے اور جس کا توہمات کے اکثر نظاموں میں بڑا حصہ ہے ۔ ابتدائی معاشرے میں ہمیں بادشاہ اکثر ساحر اور مذہبی رہنما ہر دو حیثیت میں نظر آتا ہے ، بلکہ حقیقت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا

اقتدار اکثر و بیشتر سفلی یا علوی عملیات میں اس کی مہارت کا مرہون منت رہا ہے ۔ اس لیے بادشاہت کے ارتقاء اور اس منصب کا جو تقدس وحشی اور غیر مہذب اقوام کی نظر میں رہا ہے ، اسے سمجھنے کے لیے لازمی ہے کہ سحر کے اصول سے کچھ نہ کچھ واقفیت بہم پہنچائی جائے اور تمام عہدوں اور ملکوں میں انسانی ذہن پر اس نظام کی جو غیر معمولی گرفت رہی ہے ، اس کا ایک تصور قائم کیا جائے ۔ لہذا میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں ۔

تیسرا باب

# سحر مشارکی

(۱) سحر کے اصول — اگر ہم فکر کے ان عناصر کا تجزیہ کریں جو سحر کی بنیاد ہیں تو ان سب سے غالباً دو اصول مرتب ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ مثل سے مثل پیدا ہوتا ہے یا یہ کہ نتائج اسباب کے مشابہ ہوتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ وہ چیزیں جو کبھی باہم مربوط رہی ہوں، علیحدہ ہونے کے بعد بھی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ اول الذکر اصول کو قانون تماثل کہا جا سکتا ہے اور اس دوسرے اصول کو قانون اتصال یا قانون تعدی۔ ان میں پہلے اصول یعنی قانون تماثل سے ساحر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ محض کسی واقعے کی نقل اس کا باعث بن سکتی ہے۔ دوسرے اصول کی بناء پر وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ وہ کسی شے پر جو بھی عمل کرے گا اس کا بعینہ وہی اثر اس شخص پر مرتب ہوگا جس کے جسم سے وہ شے لگی رہی ہو، قطع نظر اس کے کہ وہ کبھی اس کا جزو بدن تھی یا نہیں۔ وہ افسوں جو قانون تماثل پر مبنی ہوں سحر بالمثل یا مثلی یا صوری سحر کے نام سے موسوم کیے جا سکتے ہیں اور وہ افسوں جو قانون اتصال یا تعدی پر مبنی ہوں، سحر متعدی کے نام سے۔ جادو کی پہلی قسم کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے سحر بالمثل یا مثلی سحر کی اصطلاح شاید بہتر رہے گی، اس لیے

کہ دوسرے لفظ صوری میں جو اس غرض سے استعمال کیا جا سکتا ہے ، کسی نقل اتارنے والے شعوری عامل کا مفہوم نہ سہی ، اس کی طرف اشارہ ضرور موجود ہے اور ساحر کے عمل میں اس کا یہ عقیدہ مقدر ہوتا ہے کہ وہ جن اصول سے کام لے رہا ہو وہی فطرت کے بے جان مظاہر میں بھی کارفرما ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں ، وہ یہ مانے ہوتا ہے کہ تماثل اور اتصال کے قانون ہمہ گیر ہیں اور صرف انسانی افعال ہی پر منطبق نہیں ہوتے ۔ مختصر یہ کہ سحر آئین فطرت کے ایک مصنوعی نظام اور عمل کے ایک باطل معیار سے عبارت ہے ۔ اس کی حیثیت ایک پر فریب سائنس کی بھی ہے اور ایک ناقص فن کی بھی ۔ اسے فطری آئین کے نظام کی حیثیت سے دیکھا جائے ، یعنی ان ضوابط کے اظہار سے تعبیر کیا جائے جن کے بموجب عالم میں واقعات کے تسلسل کا تعین ہوتا ہے تو اسے نظری سحر کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے ، اور ایسی ہدایات کا مجموعہ سمجھا جائے جن پر آدمی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کاربند ہوتے ہوں تو اسے عملی سحر کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ وحشی ساحر سحر کے صرف عملی پہلو سے واقف ہوتا ہے ۔ وہ اس ذہنی عمل کا کبھی تجزیہ نہیں کرتا جس پر اس کی جادوگری مبنی ہو ، ان اصول پر غور کرنے کی زحمت کبھی نہیں کرتا جو اس کے افعال میں مضمر ہوتے ہیں ۔ عوام‌الناس کی طرح وہ منطق کو نادانستہ قبول کر لیتا ہے اور اسے اس کا کوئی شعور نہیں ہوتا ۔ وہ جس طرح غذا ہضم کرتا ہے اسی طرح غور و فکر کرتا ہے اور اسے مطلق خبر نہیں ہوتی کہ ان دو کاموں کے لیے کیا کیا عضوی اور عقلی عمل لازمی ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ اس کی نظر میں سحر ہمیشہ فن تک محدود رہتا ہے (جس کا زور عمل پر ہوتا ہے) اور سائنس کی حیثیت کبھی اختیار نہیں کرتا ۔ یہ کام فلسفے کے طالب علم کا ہے کہ وہ اس سلسلۂ فکر کا کھوج لگائے جو فن سحر کی تہ میں کارفرما ہے ، وہ دو چار اصل تار کھینچ نکالے جن سے یہ چند در چند نمونہ

تیار ہوا ہے ، یعنی اس کے مجرد اصول کو عملی الجھنوں سے نکال لانے۔ خلاصہ یہ کہ وہ اُس جعلی سائنس کا پتا چلائے جس پر اس جھوٹے فن کا پردہ پڑا ہوا ہے۔

ساحر کی منطق کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے ، اگر وہ صحیح ہے تو اس کے دونوں کلیے خیالات کے تلازم کو بے جا منطبق کرنے کے دو مختلف نتیجے ثابت ہوں گے۔ سحر بالمثل مماثلت کی بناء پر خیالات کے تلازم سے پیدا ہوا ہے اور سحر متعدی مقارنت یا اتصال کی بناء پر۔ سحر بالمثل غلطی سے یہ فرض کر لیتا ہے کہ وہ چیزیں جو ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں ، ایک ہی ہیں اور سحر متعدی یہ کہ وہ چیزیں جو باہم مربوط و متصل رہی ہوں ، ہمیشہ مربوط و متصل رہتی ہیں۔ لیکن عملی طور پر یہ دونوں قسم کے جادو گھلے ملے ہوتے ہیں ، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مثلی سحر کے طریقے پر جداگانہ عمل ہو سکتا ہے ، اور سحر متعدی کے عمل میں عموماً مثل یا نقل کے اصول کا میل پایا جاتا ہے۔ سحر کے ان دونوں طریقوں کو اس طرح کلیے کی صورت میں پیش کرنے سے یہ شاید مشکل معلوم ہوں ، لیکن اگر خاص مثالوں کے ذریعے ان کی توضیح کر دی جائے تو ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ فکر کے یہ دونوں سلسلے حقیقت میں نہایت سہل اور سادہ ہیں ، اور یہ ہونا بھی چاہیے ، اس لیے کہ ان کی عملی صورت سے وحشی بلکہ ہر جگہ جاہل اور ضعیف العقل لوگوں کے خام ذہن آشنا ہوتے ہیں ، گو یہ ان کے اصولی رخ تک نہیں پہنچ پاتے۔ سحر کی یہ جو دو قسمیں مذکور ہوئی ہیں ، انھیں مجموعی حیثیت سے سحر مشارک کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے ، کیوں کہ ان دونوں کے دونوں میں یہ امر مسلم ہے کہ چیزیں ایک چھپے ہوئے احساس مشترک کی وساطت سے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں ، اس طرح کہ ایک چیز کی تحریک دوسری چیز میں ایک قسم کے غیر مرئی ایتھر کے ذریعے پہنچتی ہے اور یہ ایتھر اس سے مختلف نہیں

ہوتا جو بعینہ ایسے ہی مقصد کے لیے یعنی اس امر کی توضیح میں جدید سائنس کے بنیادی مفروضے کی حیثیت رکھتا ہے کہ چیزیں فضا کے وسیلے سے جو بہ ظاہر خالی معلوم ہوتی ہے، ایک دوسرے کو کس طرح متاثر کرتی ہیں۔

سہولت کی غرض سے سحر کی مذکورہ بالا شاخوں کو ان کے بنیادی اصول کے بموجب حسب ذیل نقشے کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے:

## سحر مشارکہ

قانون مشارکت

| سحر بالمثل یا مثلی سحر (قانون تماثل) | سحر متعدی (قانون اتصال) |
|---|---|

اب سحر مشارک کی ان دو بڑی شاخوں یعنی سحر بالمثل یا سحر متعدی کی توضیح کی جائے گی اور اس کا آغاز سحر بالمثل کی مثالوں سے کیا جائے گا۔

### (۲) سحر بالمثل یا صوری سحر

سحر بالمثل — مثل سے مثل پیدا ہونے والے اصول کے بہ موجب جادو کا جو طریقہ متعدد ادوار و اقوام میں سب سے زیادہ آزمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی دشمن کو ضرر پہنچانے یا تباہ کرنے کے لیے اس کی شبیہ کو ضرر پہنچایا یا تباہ کیا جاتا ہے۔ اس عمل کی بناء یہ عقیدہ ہے کہ شبیہ کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہی اس شخص کو بھی پہنچتی ہے اور یہ کہ شبیہ برباد کر دی جائے تو موخرالذکر کی موت لازمی ہے۔ اس سحری عمل کی بہت سی مثالوں میں سے صرف چند اس کے عالم گیر رواج اور حیرت انگیز استمرار کے ثبوت کے لیے کافی ہوں گی۔ اس سے ہزارہا سال قبل

ہندوستان ، بابل ، مصر نیز یونان و روما کے جادوگر واقف تھے اور اسی سے آج بھی آسٹریلیا ، افریقہ اور اسکاٹ لینڈ کے عیار اور کینہ ور وحشی کام لیتے ہیں ۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ شمالی امریکہ کے ریڈ انڈینوں کے اعتقاد کے بہ موجب ریت ، راکھ یا چکنی مٹی پر کسی شخص کی تصویر کھینچ کے یا کسی چیز کو اس کا جسم تصور کرکے اس میں کوئی نوک دار لکڑی چبھونے یا اسے کوئی اور نقصان پہنچانے سے شخص مذکور کو بعینہ یہی تکلیف پہنچتی ہے ۔ مثلاً اوجب وے (یا چپی وے) نسل کا ریڈ انڈین جب کسی کا برا چاہتا ہے تو وہ اس کا ایک چوبی بت تیار کرتا ہے اور پھر اس کے سر یا دل میں سوئی چبھوتا ہے یا اسے اپنے تیر کا نشانہ بناتا ہے ۔ اس کا عقیدہ ہے کہ بت کے جسم میں جہاں بھی سوئی دھنسے گی یا تیر کھبے گا وہیں اس کا دشمن بھی شدید کرب محسوس کرے گا ۔ لیکن اگر اسے اپنے دشمن کا سرے سے خاتمہ کرنا مقصود ہو تو وہ اس پتلے کو کچھ افسوں پڑھتے ہوئے جلا ڈالتا ہے یا دفن کر دیتا ہے ۔ پیرو (جنوبی امریکہ کی ایک ریاست) کے باشندے چربی میں اناج کے دانے ملا کر ان اشخاص کے پتلے تیار کرتے جن سے انھیں نفرت یا خطرہ ہوتا ، اور ان پتلوں کو اس راستے پر لے جا کر جلا دیتے تھے جس سے ان کے دشمن کا گزر ہو ۔ یہ عمل ان کے ہاں دشمن کی 'جان سوزی' کہلاتا تھا ۔

ایسا ہی ایک ملایائی افسوں بھی ہے ۔ جس شخص پر جادو کرنا مقصود ہو اس کے جسم کی تمام چیزیں یعنی ناخن ، بال ، تھوک وغیرہ لو ، ان سب کو موم میں ملا کر اس کی ایک پتلی تیار کرو ، پھر سات راتوں تک اسے آگ پر تپاؤ اور ساتھ ہی یہ پڑھتے جاؤ :

''یہ موم نہیں جسے میں جلاتا ہوں

یہ فلاں شخص کا جگر ، دل اور تلی ہے جسے میں جلاتا ہوں''۔

یہ عمل سات دفعہ کرنے کے بعد اس پتلے کو جلا دیا جائے تو دشمن کا کام تمام ہو جائے گا ۔ اس افسوں میں مثلی اور متعدی دونوں قسم کے سحر کے اصول کا امتزاج صاف نظر آتا ہے ، اس لیے کہ دشمن

کی اس شبیہ میں وہ چیزیں شامل ہوتی ہیں جو کبھی اس کے جسم سے مربوط تھیں ، یعنی اس کے ناخن ، بال ، تھوک وغیرہ ۔ ملایا کے ایک اور افسوں میں جو اوجب دینے والے عمل کے اور بھی مشابہ ہے ، شہد کے خالی چھتے کی موم سے قدم بھر لمبی ایک لاش تیار کی جاتی ہے جس کی آنکھیں چھیدنے سے دشمن اندھا ہو جائے ، پیٹ چھیدنے سے بیمار پڑ جائے ، سر چھیدنے سے اسے درد سر ہو جائے ، سینہ چھیدنے سے اس کے سینے میں تکلیف ہو جائے اور اگر اس کا قصہ ایک ہی دفعہ پاک کرنا مقصود ہو تو اس لاش کو سر کے بل جلا دیا جائے اور کفن پہنا کر اس پر اس طرح فاتحہ پڑھی جائے جیسے واقعی کوئی مر گیا ہو ۔ پھر اس لاش کو اس راستے کے بیچوں بیچ گاڑ دیا جائے جس سے دشمن کا گزرنا یقینی ہو ۔ لیکن ساتھ ہی مندرجہ ذیل الفاظ کہنے ضروری ہیں تاکہ دشمن کا خون عمل کرنے والے کے سر نہ ہو :

''اس کا دفن کرنے والا میں نہیں ہوں
اس کے دفن کرنے والے جبریل ہیں''

اس طرح دشمن کے قتل کی ذمہ داری حضرت جبریل کے کندھوں پر ہو گی ، جو عمل کرنے والے سے کہیں زیادہ اسے برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں ۔

جہاں سحر بالمثل یا صوری سحر' جس میں شبیہوں کا ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے ، عام طور پر اس غرض سے کیا گیا ہے کہ دنیا کو ناپسندیدہ اشخاص کے وجود سے پاک کیا جائے ، وہاں کبھی کبھی اس کے عمل میں نیک ارادوں کو بھی دخل رہا ہے ، یعنی اس سے وضع حمل ، کی تکلیف کم کرنے اور بانجھ عورتوں کو بامراد کرنے کے لیے بھی کام لیا گیا ہے ۔ چناں چہ سوماٹرا کے باتکوں کے ہاں بانجھ عورت ، جسے ماں بننے کی تمنا ہو ، بچے کا ایک پتلا تیار کرے گی اور اسے اپنی گود میں لے گی تاکہ اس کے ہاں بچہ پیدا ہو ۔ جزائر بابو (مشرق بعید) میں جب کسی عورت کو بچے کی خواہش ہوتی ہے تو وہ ایک کثیرالاولاد شخص کو اپنے گھر بلاتی ہے تاکہ وہ اس کی طرف سے بچے کے لیے

'اپولیرو' یعنی آفتاب کی روح سے پرارتھنا کرے ۔ اس عمل میں سرخ رنگ کی روئی کی ایک گڑیا بنائی جاتی ہے جسے وہ عورت اپنی بغل میں اس طرح اٹھائے رہتی ہے جیسے وہ اسے دودھ پلا رہی ہو ۔ پھر شخص مذکور ایک مرغی لیتا ہے اور اسے عورت کے سر پر ٹانگوں سے پکڑے یہ الفاظ کہتا ہے ''اے اپولیروا! اس مرغی کو کام میں لا ، ایک بچہ نازل کردے ، ایک بچہ ڈال دے ، میں تجھ سے التجا کرتا ہوں ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ میرے ہاتھوں اور گود میں بچہ گرے!'' پھر وہ عورت سے دریافت کرتا ہے کہ آیا بچہ آگیا یا نہیں ۔ عورت اس کا جواب اثبات میں دیتی ہے ۔ اس کے بعد وہ شخص عورت کے شوہر کے سر پر مرغی تھامے کچھ بڑبڑاتا ہے اور آخر میں مرغی کو مار کے گھر میں ایسی جگہ ڈال دیتا ہے جہاں قربانی دی جاتی ہو اور اس کے ساتھ کچھ پان کے پتے بھی رکھ دیتا ہے ۔ جب یہ رسم پوری ہو جاتی ہے تو گاؤں میں یہ خبر پھیل جاتی ہے کہ اس عورت کے ہاں سچ مچ بچہ پیدا ہوگیا ہے ، اور اس کی سہیلیاں مبارک باد کے لیے آپہنچتی ہیں ۔ یہاں بچے کی پیدائش کا ڈھونگ محض ایک سحری رسم ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ نقل کے ذریعے اس بات کا یقین کر لیا جائے کہ بچہ ضرور پیدا ہوگا ، لیکن ساتھ ہی اس میں بھینٹ اور پرارتھنا کے ذریعے سحر کی تاثیر میں اضافے کی کوشش بھی شامل ہے ، بہ الفاظ دیگر ، یہاں سحر میں مذہب آملا ہے اور اس کی تقویت کا باعث بنا ہے ۔

بورنیو کے بعض دائکوں (بورنیو کے اصلی باشندے جنھوں نے غالباً آج تک کسی تہذیب کا اثر قبول نہیں کیا) کے ہاں جب کوئی عورت شدید درد زہ میں مبتلا ہو تو ایک جادوگر کو بلایا جاتا ہے جو زچہ کو ہلا جلا کر معقول طریقے سے وضع حمل میں سہولت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اسی دوران میں ایک اور جادوگر یہی مقصد حاصل کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتا رہتا ہے جو قطعاً خلاف عقل ہوتی ہیں ۔ وہ اصل میں اپنے آپ پر زچہ کی سی کیفیت طاری کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ ایک بڑا پتھر

کپڑے میں لپیٹ کر اُس کے پیٹ سے اس طرح باندھ دیا جاتا ہے جیسے رحم میں بچہ ہو ، اور زچہ خانے میں سے اس کا ساتھی اسے بہ آواز بلند ہدایتیں دیتا ہے ، جن کے مطابق وہ اصل بچے کے ساتھ ساتھ اس مصنوعی بچے کو اپنے جسم پر حرکت دیتا رہتا ہے اور یہ عمل بچے کی ولادت تک جاری رہتا ہے ۔

اسی اصول تصنع کی بناء پر ، جو بچوں کے لیے بڑی دل کشی رکھتا ہے ، دوسری قوموں نے وضع حمل کی نقل کے ذریعے بچوں کو گود لینے کا دستور پیدا کر لیا ، بلکہ اُن کے ہاں یہی ذریعہ ایسے آدمیوں کو جلانے کی بھی ایک صورت بن گیا جنھیں مردہ سمجھ لیا گیا ہو ۔ اگر کوئی شخص کسی ایسے لڑکے بلکہ سن رسیدہ ڈاڑھی مونچھ والے آدمی کو جننے کا ڈھونگ کرے جس کی رگوں میں اُس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ ہو تو وہ لڑکا یا آدمی جاہلی قانون اور فلسفے کے بہ موجب ہر اعتبار سے اُس کا بیٹا بن جاتا ہے ۔ چناں چہ ڈایوڈورس (Siculus Diodorus ، ایک یونانی مورخ جو پہلی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے) کا بیان ہے کہ زیوس نے اپنی حاسد بیوی ہیرا (آسمانوں کی ملکہ اور عورتوں کی مخصوص دیوی ، جس کی امتیازی خصوصیت رشک و حسد ہے) کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ہرکلیز (یونانی سورما اور زیوس کا بیٹا جو میسینا کی حسین شاہزادی آلکمینا (Alcmena) کے بطن سے پیدا ہوا ، اس کی بارہ مشقتیں یورپ میں ضرب المثل ہیں) کو اپنا بیٹا بنا لے تو ہیرا بستر پر لیٹ گئی اور اپنے لباس میں سے اسے اس طرح زمین پر گرا دیا جیسے سچ مچ اس کی زچگی ہوئی ہو ۔ نیز مورخ مذکور کہتا ہے کہ خود اس کے عہد میں یورپ کی غیر مہذب قوموں کے ہاں بچوں کو متبنیٰ کرنے کا یہی طریقہ رائج تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ اہل بلغاریہ اور باسنی ترک آج بھی یہی کیا کرتے ہیں ۔ ان کے ہاں عورت اس لڑکے کو جس کی تبنیت مقصود ہو ، اپنے کپڑوں میں سے کھسکا دیتی ہے یا کھینچ نکالتی ہے ۔ اس کے بعد وہ لڑکا ہمیشہ اُس کا بیٹا مانا جاتا ہے اور اپنے منہ بولے ماں باپ کی جائداد کا وارث بن جاتا ہے ۔

ساراواک (برٹش بورنیو) کے براونوں میں کوئی عورت کسی بالغ مرد یا عورت کو بیٹا یا بیٹی بنانا چاہے تو بہت سے آدمیوں کی دعوت کی جاتی ہے۔ ماں بننے والی عورت سب کے سامنے ایک اونچی نشست پر جا بیٹھتی ہے، اور اس کا منہ بولا بیٹا یا بیٹی پشت کی طرف سے رینگتا ہوا اس کی دونوں ٹانگوں میں سے نکل جاتا ہے، اور جوں ہی وہ سامنے آتا ہے اسے کھجور کے مہکتے ہوئے پھول مالے جاتے ہیں اور اس عورت سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد منہ بولے ماں بیٹے یا بیٹی اس طرح بندھے بندھے جھومتے ہوئے گھر کے آخری حصے تک جاتے ہیں اور پھر تماشائیوں کے سامنے لوٹ آتے ہیں۔ بچے کی پیدائش کے اس دل چسپ سوانگ کے بعد ان دونوں میں جو رشتہ قائم ہوتا ہے وہ حقیقی رشتے سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اور اس بچے کے ساتھ جو زیادتی ہو وہ اس سے زیادہ سنگین جرم متصور ہوگی جو اصلی بچے کے ساتھ کی جائے۔ یونان قدیم میں جس شخص کے متعلق غلطی سے یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ وہ فوت ہو چکا ہے، اور جس کی غیر موجودگی میں تجہیز و تکفین کے تمام مراسم ادا کر دیے جاتے، اس کو جب تک اس کے دوبارہ پیدا ہونے کی رسم نہ ادا ہو جاتی، سوسائٹی مردہ تصور کرتی۔ ایسے شخص کو حیات نو بخشنے کے لیے کسی عورت کی گود میں ڈال دیا جاتا اور اس کے بعد نہلایا جاتا، پھر نوزائیدہ بچے کی طرح کپڑے میں لپیٹ کر دایہ کے سپرد کر دیا جاتا۔ جب تک یہ رسم پابندی کے ساتھ ادا نہ ہو چکتی وہ زندوں میں آزادانہ اٹھ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ انھی حالات میں ہندوستان کے قدیم دستور کے بہ موجب اس شخص کو جو مردہ سمجھ لیا گیا ہو اپنی واپسی کے بعد پہلی رات تیل اور پانی سے بھرے ایک ٹب میں گزارنی پڑتی۔ اس میں وہ ہاتھ سکیڑے چپ چاپ یوں بیٹھا رہتا جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ، اور رات بھر اس پر وہ تمام مذہبی رسوم ادا کی جاتیں جو حاملہ عورت کے لیے مخصوص تھیں۔ اگلے دن صبح وہ ٹب سے باہر نکلتا اور اسے ان تمام مراسم سے از سر نو گزرنا پڑتا جس

میں وہ اپنے آغاز شباب سے حصہ لیتا چلا آیا ہو ، خاص کر وہ کوئی عورت بیاہ لاتا یا اپنی سابقہ بیوی سے معمولی رسوم کے ساتھ دوبارہ بیاہ کرتا ۔

مثلی سحر کا دوسرا فلاحی مصرف بیماری کا علاج یا روک تھام ہے ۔ پرانے زمانے کے ہندوؤں میں یرقان کے علاج کے لیے ایک پیچیدہ رسم ادا کی جاتی تھی ، جو اسی سحر پر مبنی تھی ۔ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ زرد رنگ آڑ کر زرد مخلوق یا زرد اشیاء میں جا ملے ، خاص کر سورج میں جس سے اس کا تعلق ہے اور مریض کے لیے کسی ایسے سرچشمۂ حیات و توانائی سے ، یعنی سرخ بیل سے ، سرخ رنگ حاصل کیا جائے جو صحت کی علامت ہے ۔ اس غرض سے ایک پجاری یہ منتر پڑھا کرتا تھا : ''تیرے دل کی تکلیف اور یرقان سورج پر چلا جائے ، ہم تجھ پر سرخ رنگ چڑھاتے ہیں ، ہم تجھے سرخ رنگ میں ڈبوتے ہیں تاکہ تیری عمر دراز ہو ۔ یہ شخص ضرر سے محفوظ رہے اور اسے زرد رنگ سے نجات مل جائے ! ہم تجھے گایوں کا روپ اور طاقت دیتے ہیں ، جن کی دیوی روہنی ہے اور جو خود بھی سرخ (روہنیہ) ہے ۔ ہم تیرا یرقان طوطوں اور گلدموں میں منتقل کرتے ہیں ، ہم تیرا یرقان زرد دھوبن (ایک قسم کی چڑیا) میں منتقل کرتے ہیں ۔'' یہ افسوں پڑھتے ہوئے پجاری مریض کی زردی دور کرنے اور اس میں صحت کی سرخی پیدا کرنے کے لیے اسے پانی میں سرخ بیل کے بال ملا کر دیتا کہ وہ اسے گھونٹ گھونٹ پی جائے ، اس بیل کی پشت پر پانی انڈیل کر مریض کو پلاتا ، اسے سرخ بیل کی کھال پر بٹھاتا اور کھال کا ایک ٹکڑا اس سے باندھ دیتا ۔ پھر اس غرض سے کہ مریض کی زردی بالکل جاتی رہے اور اس کے چہرے پر آب آئے وہ یہ عمل اور کرتا تھا کہ اس پر سر سے پاؤں تک ہلدی اور کرکم کا لیپ ملتا ، اسے ایک پلنگ پر لٹاتا جس کے پائے سے تین ایسے پرندے ، یعنی طوطا ، گلدم اور دھوبن ڈوری سے باندھ دیتا جن کا رنگ زردی مائل ہوتا ہے ۔ پھر مریض پر پانی ڈال کر وہ زرد لیپ چڑیوں پر بہا دیتا ، جس کے ساتھ گویا یرقان بھی یقینی

طور پر ان چڑیوں میں منتقل ہو جاتا ۔ اس کے بعد مریض کی رنگت میں کامل صحت کی سرخی پیدا کرنے کی غرض سے وہ سرخ بیل کے کچھ بال طلائی ورق میں لپیٹ کر مریض کی کھال پر چپکا دیتا ۔ قدیم زمانے کے یونانیوں اور رومیوں کا خیال تھا کہ یرقان کا مریض کسی پلاور یا تغدری (ایک قسم کا سنہری پرندہ) کی طرف نظر بھر کر دیکھ لے اور یہ پرندہ بھی اسے دیکھتا رہے تو اس کا مرض جاتا رہتا ہے ۔ پلوٹارک کا کہنا ہے کہ ''اس پرندے کی سرشت کچھ ایسی ہے کہ یہ روگ مریض کی نگاہوں سے چشمے کی طرح نکلتا ہے اور اس میں جذب ہو جاتا ہے ۔'' پرندوں کے شوقین تغدری کو ایسی متاع بے بہا سمجھتے تھے کہ وہ جب اسے فروخت کرنے کے لیے لے جاتے تو بڑی احتیاط سے اس کی آنکھیں ڈھانک لیتے تاکہ کسی یرقان کے مریض کی اس پر نگاہ نہ پڑ جائے اور اس طرح وہ مفت میں اچھا نہ ہو جائے ۔ اس پرندے کی یہ خوبی اس کے رنگ میں نہ تھی بلکہ اس کی بڑی بڑی سنہری آنکھ کا جوہر تھی ، جو قدرتی طور پر اس پیلی بیماری کو کھینچ لیتی تھی ۔ پلینی (ایک قدیم رومی مصنف) کسی دوسرے پرندے یا شاید اسی کا ذکر کرتا ہے جسے اہل یونان اپنی زبان میں یرقان کے نام سے موسوم کرتے تھے ، کیوں کہ اگر کوئی یرقان کا مریض اسے دیکھ لیتا تو مرض اس سے رخصت ہو جاتا اور چڑیا کو ہلاک کر ڈالتا ۔ اسی مصنف کے ہاں ایک پتھر کا بھی ذکر ملتا ہے جس کے بارے میں یہ خیال تھا کہ یرقان اس سے جاتا رہتا ہے ، اس لیے کہ اس پتھر کا رنگ یرقان زدہ جسم سے ملتا جلتا تھا ۔

مثلی سحر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے علاج کا تجربہ مریض کی بجائے خود معالج پر کیا جا سکتا ہے اور مریض اپنے معالج کو درد سے تڑپتا دیکھ کر آرام اور سکون محسوس کرنے لگتا ہے ۔ مثلاً فرانس میں پرش کے کسان اس وہم میں مبتلا ہیں کہ شکم کے نیچے کی طرف کھسک جانے سے استفراغ کا دورہ پڑتا ہے ۔ چناں چہ جب کسی پر یہ دورہ پڑے تو جادوگر طبیب بلایا جاتا ہے کہ وہ دوبارہ اس عضو کو صحیح مقام پر بٹھا دے ۔ وہ مریض کی

کیفیت سن کر خود اپنے شکم کو سرکانے کی غرض سے اپنے آپ پر کرب و تشنج کی حالت طاری کر لیتا ہے ۔ اس کوشش کے بعد اپنے شکم کو پھر سے جانے کے لیے پھر اسی طرح درد کا بہانہ کرتا ہے اور ادھر مریض کو افاقہ ہونے لگتا ہے ۔ اس کی فیس پانچ فرینک ہے ۔ اسی طریقے سے دانکوں کے ہاں بھی وہ طلسم گر جو مریض کو دیکھنے کے لیے بلایا گیا ہو ، دم سادھ کے اس طرح لیٹ جائے گا کہ مر گیا ہو ، اور اس کے ساتھ وہ ساری کاروائی کی جائے گی جو کسی میت کے ساتھ کی جاتی ہے ۔ لوگ اسے بورے میں لپیٹ کر مکان کے باہر لے جائیں گے اور زمین پر رکھ دیں گے ۔ تقریباً گھنٹہ بھر کے بعد دوسرے جادوگر اسے کھول کر دوبارہ زندگی بخشیں گے ۔ اس طبیب کے شفا پاتے ہی اصل مریض کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے وہ بھی صحت یاب ہو گیا ۔ رسولی کا ایک علاج جو تھیوڈیشیس اول کے درباری طبیب مارسی لس آف بورڈو نے طب پر اپنی انوکھی تصنیف میں تجویز کیا ہے ، اس کا یہ نسخہ یوں ہے کہ بربینا (وروین) کی جڑی لے کر اسے کاٹ لیا جائے اور پھر اس کا ایک سرا مریض کے گلے سے لٹکا دیا جائے اور دوسرا آگ کے دھوئیں میں ۔ جیسے ہی بربینا دھوئیں میں خشک ہوگی ، رسولی غائب ہو جائے گی ۔ اگر اس کے بعد مریض کسی وقت احسان فراموشی کر جائے تو معالج بربینا کو پانی میں ڈال کر بہ آسانی اس سے انتقام لے سکتا ہے ، اس لیے کہ اس جڑی میں پانی کے پھر جذب ہوتے ہی رسولی عود کر آتی ہے ۔ اسی طبیب حاذق نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ اگر آپ کو پھنسیوں کی شکایت ہو تو آپ شہاب ثاقب کو دیکھتے رہیے اور جوں ہی وہ ٹوٹے ، کسی کپڑے سے یا اس وقت جو بھی چیز آپ کے ہاتھ لگے اس سے اپنی پھنسیوں کو رگڑنا شروع کر دیجیے اور جب تک وہ نظر آتا رہے رگڑتے رہیے ۔ جس طرح وہ ستارا گرے گا اسی طرح پھنسیاں آپ کے جسم سے جھڑ جائیں گی ، لیکن ساتھ ہی اس کا بھی خیال ضرور رکھیے کہ کہیں آپ ننگے ہاتھ سے پھنسیوں کو نہ رگڑ ڈالیں ، ورنہ وہ آپ کے ہاتھ کو لگ جائیں گی ۔

نیز سحر بالمثل اور بالعموم سحر مشارک کا ان تدبیروں میں بڑا دخل ہوتا ہے جو ناتجربہ کار شکاری یا ماہی گیر خوراک کی وافر مقدار حاصل کرنے کی غرض سے اختیار کرتا ہے۔ اس اصول کے مطابق کہ مثل سے مثل پیدا ہوتا ہے، وہ اس چیز کی نقل اتارتے ہیں جو انھیں حاصل کرنی مقصود ہو اور ساتھ ہی بڑی احتیاط سے ایسی چیزوں سے بچتے ہیں جو خطرناک چیزوں سے مشابہت رکھتی ہوں۔

سحر مشارک کے نظریے پر جس باقاعدگی کے ساتھ وسطی آسٹریلیا کے بنجر علاقوں میں عمل ہوتا ہے ویسا کہیں نہیں ہوتا۔ یہاں کے قبیلے بہت سی ٹوٹم وار برادریوں میں بٹے ہوئے ہیں، جن میں ہر ایک کے سپرد یہ فرض ہے کہ وہ سحری رسوم کے ذریعے اپنے ٹوٹم (نشان) والے جانور وغیرہ کی افزائش کریں۔ ان میں بہت سے نشانات یا ٹوٹم خوردنی جانوروں یا پودوں کے ہیں اور رسوم مذکورہ کا عام مقصد یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے ذریعے قبیلے کے لیے غذا اور دوسری ضروریات بہم پہنچائی جائیں۔ یہ بسا اوقات اس صورت کی نقل ہوتی ہیں جو لوگ پیدا کرنا چاہتے ہوں۔ بہ الفاظ دیگر ان کے سحر کی نوعیت صوری ہوتی ہے۔ چناں چہ وارامنگا نام کے قبیلے میں سفید کاکتوا (ایک قسم کا طوطا) والی برادری کا سردار اس پرندے کی شبیہہ پکڑے ہوئے اس کی چیخ کی نقل اتارتا ہے تاکہ سفید کاکتواؤں کی افزائش نسل ہو سکے۔ ارونتا قبیلے میں ایک برادری کا ٹوٹم بھونرے کا کیڑا (بھونرے کی ابتدائی حالت) ہے جو قبیلے کے افراد کی غذا میں شامل ہے۔ اس برادری کے ارکان اپنے اس ٹوٹم کی افزائش کے لیے مختلف رسمیں ادا کرتے ہیں۔ ان میں ایک خاموش تماشے پر مشتمل ہوتی ہے، جس میں اس کیڑے کی مکمل نشو و نما اور اس کے خول میں سے برآمد ہونے کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ ڈالیوں کی ایک تنگ و طویل جھونپڑی بنائی جاتی ہے اور اس میں اس ٹوٹم والے کچھ لوگ جا بیٹھتے ہیں۔ اور اپنے ٹوٹم کی نشو و نما کے مختلف مدارج کے متعلق گیت گاتے ہیں، پھر اس میں بیٹھے بیٹھے کھسکتے ہوئے باہر

نکالتے ہیں اور ساتھ ساتھ کیڑے کے خول میں سے برآمد ہونے کا راگ بھی الاپتے جاتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے اس عمل سے مذکورہ کیڑے کی افزائش نسل ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ ایمو (ایک قسم کا دوڑنے والا مرغ جو آسٹریلا میں پایا جاتا ہے) کی افزائش کے لیے ، جس کی خوراک کی حیثیت سے بڑی اہمیت ہے ، متعلقہ برادری کے لوگ زمین پر اپنے اس مقدس ٹوٹم خاص کر اس کے ان اجزاء کی ایک رنگین تصویر اتارتے ہیں ، جو انہیں سب سے زیادہ مرغوب ہیں ، اور اس تصویر کے چاروں طرف بیٹھ کر راگ الاپتے ہیں ۔ اس کے بعد بھانڈ ایمو کی لمبی گردن اور چھوٹے سر سے ملتی جلتی ٹوپیاں پہنے اس مرغ کی اس طرح نقل اتارتے ہیں جیسے وہ یوں ہی کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا ہو ۔

برطانوی کولمبیا کے انڈینوں کا گزارا زیادہ تر مچھلی پر ہے جو اس ملک کے دریاؤں اور سمندر میں بہ کثرت پائی جاتی ہے ۔ اگر مچھلی اپنے موسم میں نہ آئے اور یہ لوگ بھوکے ہوں تو نوٹکائی ساحر (جزیرۂ نوٹکا کا رہنے والا ، جو برطانوی کولمبیا کے مغربی ساحل کے قریب واقع ہے) تیرتی ہوئی مچھلی کی شبیہ بنا کر اسے پانی میں اس سمت چھوڑ دے گا جدھر سے عموماً مچھلیاں برآمد ہوتی ہوں ۔ اس عمل اور اس کے ساتھ مچھلیوں کو بلانے کی پرارتھنا سے وہ فی الفور چلی آتی ہیں ۔ ابنائے ٹوریس (یہ آسٹریلیا اور پاپوا کے درمیان واقع ہے) کے جزیروں کے باشندے ڈوگانگ (ایک بحری جانور) اور کچھوے پر جادو کرکے مارنے کی غرض سے ان جانوروں کے مجسمے استعمال کرتے ہیں ۔ جزیرۂ سلیبیز کے وسطی علاقے کے ٹوراڈجا قبیلے کا یہ عقیدہ ہے کہ چیزیں اپنی روحانی یا حیاتی قوت سے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں ؛ چناں چہ اس قبیلے کے لوگ ہرن یا جنگلی سور کے جبڑوں کی ہڈیاں اپنے گھروں میں رکھتے ہیں تا کہ وہ ہڈیاں اپنی اندرونی کشش سے اپنی اپنی نوع کے زندہ جانوروں کو شکاری کی راہ پر کھینچ لائیں ۔ جزیرۂ نیاس (یہ جزیرہ سوماٹرا کے مغرب میں واقع ہے) میں جب کوئی جنگلی سور اس گڑھے میں آ گرتا ہے جو اس کے

لیے کھودا گیا ہو ، تو اس کی پیٹھ کو نو عدد جھڑے ہوئے پتوں سے رگڑا جاتا ہے ۔ یہاں کے لوگوں کے عقیدے کے بموجب جس طرح وہ نو پتے جھڑے ہوں اسی طرح گڑھے میں نو عدد جنگلی سور آ گریں گے ۔ شرق الہند کے جزائر سپارویا ، ہارو ایکو اور نو ایسا لاوٹ میں جب کوئی ماہی گیر سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جاتا ہے تو وہ ڈھونڈ کر کسی ایسے درخت کی ایک مضبوط ڈالی توڑ لاتا ہے جس کے پھل میں چڑیوں نے چونچیں مار رکھی ہوں اور اس ڈالی کو اپنے دام کی بڑی بلی کے طور پر استعمال کرتا ہے ۔ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح اس درخت کی کشش سے طائر اس کے پھل کی طرف کھنچ کر آتے ہیں ، اسی طرح اس کی شاخ اپنی کشش سے مچھلی کو جال میں کھینچ لائے گی ۔

برطانوی نیوگنی کے مغربی قبائل کے شکاری ڈوگانگ یا کچھوے کو اپنے نیزے کا نشانہ بنانے کے لیے ایک خاص عمل کرتے ہیں ۔ ایک ننھا سا بھونرا جو ناریل کے درختوں پر بھنبھناتا ہے ، نیزے کے قبضے کے اس روزن میں رکھ دیا جاتا ہے جس میں سنان بٹھائی جاتی ہے ۔ ان قبائلیوں کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے سنان ڈوگانگ یا کچھوے میں اس طرح پیوست ہو جاتی ہے جس طرح وہ بھونرا آدمی کو کاٹتے وقت اس کی کھال سے چمٹ جاتا ہے ۔ جب کمبوڈیا کا شکاری جال بچھاتا ہے اور اس کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا تو وہ اپنے کپڑے اتار پھینکتا ہے اور ننگا دھڑنگا کچھ دور جاتا ہے ۔ پھر جال کی طرف یوں انجان چلا آتا ہے جیسے اسے اس کی خبر نہ ہو اور اپنے آپ کو اس میں پھنسا کر چیخ اٹھتا ہے : ''ہائے غضب ! میں جال میں پھنس گیا !'' اس کے بعد اس جال میں شکار کا آنا یقینی خیال کیا جاتا ہے ۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا ، اسی قسم کا کھیل اسکاٹ لینڈ کی پہاڑیوں میں کھیلا جاتا تھا ۔ ریورنٹ جیمس میکڈانڈ جنھوں نے اب ری اے ، ضلع کیتھرنس (اسکاٹ لینڈ کا ایک ضلع) میں سکونت اختیار کر لی ہے ، بیان کرتے ہیں کہ لڑکپن میں جب وہ اپنے ہم جولیوں کے ساتھ جھیل الائن پر مچھلیوں کے شکار کے لیے جاتے

اور عرصہ تک مچھلی کھاجے کو نہ چھوتی تو ان کے ساتھیوں میں سے کسی ایک کو کشتی سے پانی میں پھینکنے اور پانی میں سے مچھلی کی طرح کھینچنے کا ڈھونگ کیا جاتا ۔ اس کے بعد کشتی جیسے جیسے میٹھے یا کھارے پانی پر چلتی ، ٹراؤٹ (میٹھے پانی کی مچھلی) یا سلاک (کھارے پانی کی مچھلی) چارے پر منہ مارنے لگتی ۔ کیریر قبیلے کا کوئی ریڈانڈین (یہ شمال مغربی امریکہ کے اصلی باشندوں کا ایک قبیلہ ہے) سمور کے شکار پر جانے سے پہلے دس راتوں تک ایک چھوٹی سی لکڑی سے اپنا گلا دبائے آگ کے برابر سوتا ہے ، ظاہر ہے کہ اس کے نتیجے میں اس کے پنجرے کی بلی سمور کی گردن پر گر جاتی ہے ۔ گیلاری قوم میں جو نیوگنی کے مغرب میں جزیرۂ ہلما ہیرا کے ایک شمالی ضلع میں آباد ہے ، یہ مقولہ مشہور ہے کہ جب آپ اپنی بندوق بھریں تو گولی کو اس میں رکھنے سے پہلے اپنے منہ میں ضرور ڈال لیں ، اس لیے کہ ایسا کرنا اس شکار کو کھانے کی دلیل ہے جس کے گولی لگنے والی ہو ۔ اس طرح آپ کا نشانہ کبھی نہیں چوک سکتا ۔ ملائی شکاری جس نے مگرمچھ کے لیے پنجرے میں چارا لگا رکھا ہو اور شکار کا منتظر ہو ، سالن کھانے میں ہمیشہ یہ احتیاط کرتا ہے کہ پہلے چاول کے تین خشک نوالے کھا لیتا ہے ، کیوں کہ اس سے مگرمچھ کے حلق میں چارا آسانی سے اترتا ہے ۔ ساتھ ہی اتنی ہی احتیاط وہ اس بات کی بھی رکھتا ہے کہ سالن میں سے کوئی ہڈی اس کے کھانے میں نہ آئے ، اس لیے کہ اس کا ہڈی کھانا اس بات کی دلیل ہے کہ چارے کی نوک دار سیخ ڈھیلی پڑ جائے گی اور مگرمچھ چارہ سمیت بھاگ نکلے گا ۔ چناں چہ ایسی صورت میں شکاری کی مصلحت اس میں ہوتی ہے کہ وہ اپنا کھانا شروع کرنے سے قبل اپنے سالن کی ہڈیاں کسی اور کو کھلا دے ، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی وقت ہڈی کی خاطر اسے مگرمچھ سے ہاتھ دھونا پڑے ۔

اس آخری دستور میں اُن چیزوں کی ایک مثال ملتی ہے جن سے شکاری اس لیے پرہیز کرتے ہیں کہ کہیں مثلی اصول کے بموجب اُن کی قسمت نہ بگڑ جائے ۔ سحر مشارک کے سلسلے میں یہ بات ملحوظ

رکھنی چاہیے کہ وہ محض ایجابی احکام پر مشتمل نہیں ، بلکہ اس میں بہت سے ممنوعات بھی داخل و شامل ہیں ۔ اُس کے مقتضیات نہ صرف یہ ہیں کہ آپ کو کیا کیا کرنا چاہیے ، بلکہ کون کون سی چیزوں سے احتراز واجب ہے ۔ اُس کے اوامر افسونوں سے عبارت ہیں اور نواہی ٹیبوؤں (امتناعات) سے ۔ حقیقت یہ ہے کہ امتناع کا سارا عقیدہ ، یا بہر کیف اس کا معتدبہ حصہ ، سحر مشارک کے "تماثل و اتصال" والے دونوں قوانین کی محض ایک خاص عملی صورت نظر آتا ہے ۔ اگرچہ ان قوانین کو وحشی ضابطوں کی صورت کبھی نہیں دیتا اور نہ اُن کے ذہن میں مجرداً ان کا کوئی تصور ہوتا ہے ، لیکن وہ اُس کے عقائد میں مقدر ضرور ہوتے ہیں ، جن کی رو سے فطرت کا سارا نظام انھی قوانین کے محور پر گھومتا ہے اور انسان کے ارادے کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا ۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ کوئی خاص روش اختیار کرے تو ان قوانین کی بناء پر چند خاص نتائج برآمد ہونے ناگزیر ہیں ۔ اگر اُسے کسی خاص فعل کے نتائج کے ناپسندیدہ یا خطرناک ہونے کا امکان نظر آئے تو اس ڈر سے کہ کہیں اُسے ایسے فعل کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑ جائے ، وہ خود بخود اُس سے بچنے کی کوشش کرے گا ۔ دوسرے لفظوں میں ، وہ ہر اُس بات سے احتراز کرتا ہے جس سے اُسے اپنے اسباب و نتائج کے غلط تصور کی رو سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو ۔ مختصر یہ کہ وہ اپنے آپ کو ٹیبو کا پابند کر لیتا ہے ۔ لہٰذا اس حد تک ٹیبو عملی سحر کی ایک منفی صورت سے عبارت ہے ۔ ایجابی سحر یا جادو کا حکم یہ ہے کہ فلاں کام کرو تاکہ فلاں فلاں صورت پیدا ہو ۔ سلبی سحر یا ٹیبو کا حکم یہ ہے کہ "فلاں فلاں کام سے بچو ، ورنہ فلاں فلاں مصیبت پیش آئے گی ۔" ایجابی سحر یا جادو کا مقصد کوئی اچھا نتیجہ برآمد کرنا ہے اور منفی سحر یا ٹیبو کا مقصد کسی برے نتیجے سے بچنا ۔ لیکن اچھے اور برے دونوں قسم کے نتائج کے بارے میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ "تماثل اور اتصال کے قوانین کے مطابق پیدا ہوتے ہیں ۔ لیکن حقیقت میں جس طرح کسی سحری رسم کی پابندی سے کوئی نتیجہ حسب دل خواہ برآمد نہیں ہوتا، اُسی طرح کسی ٹیبو یا سحری قسم کے امتناع کی خلاف ورزی

سے کوئی مخدوش صورت پیدا نہیں ہوتی ۔ اگر کسی ٹیبو سے انحراف کا لازمی نتیجہ برائی ہو تو وہ پھر ٹیبو نہیں رہتا بلکہ اخلاق یا فہم عام کا تقاضا بن جاتا ہے ۔ یہ کہنا کہ آگ میں ہاتھ نہ ڈالو ، ٹیبو یا حکم امتناعی نہیں بلکہ اقتضائے فہم عام ہے ، اس لیے کہ اس میں جس فعل سے روکا جا رہا ہے اس کا برا نتیجہ کوئی خیالی چیز نہیں بلکہ لازمی امر ہے ۔ خلاصہ یہ کہ جن منفی احکام کو ٹیبو کہتے ہیں وہ ان ایجابی احکام کی طرح بے بنیاد اور لاحاصل ہیں جو جادو کے نام سے موسوم ہیں ۔ یہ دونوں چیزیں ایک شدید مغالطہ ، یعنی تلازم خیالات کے بارے میں غلط تصور کے متضاد پہلو ہیں ۔ اس مغالطہ کا ایجابی رخ جادو ہے اور سلبی رخ ٹیبو ۔ اگر اس سارے غلط نظام——اس سارے طلسم——کو عملی اور نظری ہر دو حیثیت سے سحر کہا جائے تو ٹیبو یا امتناع کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ عملی سحر کا سلبی پہلو ہے ۔ نقشے کی صورت میں سحر کے ان پہلوؤں کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے :

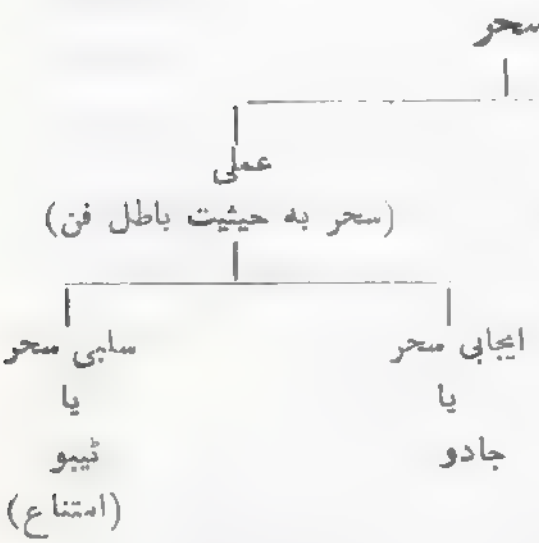


میں نے ٹیبو یا امتناع اور سحر سے اس کے رشتہ کے بارے میں یہ باتیں اس لیے کہی ہیں کہ میں ان ٹیبوؤں یا امتناعوں کی چند مثالیں پیش کرنی چاہتا ہوں جن کے شکاری ، ماہی گیر وغیرہم پابند ہیں ،

نیز میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ سب سحر مشارک کے تحت آتے ہیں اور اسی عام نظریے کی محض عملی صورتیں ہیں ۔ چناں چہ اسکیمو اپنے بچوں کو چڑیا کا پنجہ کھیلنے سے روکتے ہیں ، کیوں کہ اس کھیل میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ بڑے ہو کر کہیں وہ اس کانٹے کی رسی میں اپنی انگلیاں نہ الجھا لیں جس سے وہیل مچھلی کا شکار کیا جاتا ہے ۔ یہاں ظاہر ہے کہ ٹیبو قانون تماثل کے اطلاق سے عبارت ہے جس پر مثلی سحر کی ساری عمارت کھڑی ہے ۔ چڑیا کا پنجہ کھیلتے ہوئے جس طرح بچے کی انگلیاں تاگے میں الجھ جاتی ہیں ، اسی طرح جب وہ جوان ہو کر وہیل کا شکار کھیلے گا تو وہ ہارپون (محولہ بالا کانٹا) کی ستلی میں الجھ جائیں گی ۔ اسی طرح کوہ کارپیتھین (ہنگری) کے ہیوزلوں کے ہاں شکاری کے کھانا کھاتے وقت اس کی بیوی کو چرخہ کاتنے کی ممانعت ہے ۔ اگر اس کی پابندی نہ کی گئی تو شکار چرخی کی مانند گھومنے لگے گا اور شکاری اسے مار نہیں پائے گا ۔ ظاہر ہے کہ اس مثال میں بھی ٹیبو قانون تماثل ہی سے ماخوذ ہے ۔ اسی صورت سے ، قدیم اٹلی کے بیشتر حصوں میں عورتوں کا شاہ راہوں پر چلتے ہوئے سوت کاتنا ، بلکہ اپنے چرخوں کو دکھاتے ہوئے لے جانا ممنوع تھا ، اس لیے کہ عام عقیدے کے بموجب ان کے اس فعل سے فصلوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا ۔ غالباً لوگوں کا خیال یہ تھا کہ چرخے کے گھومنے سے اناج کے پودے بھی بل کھانے لگیں گے اور سیدھے نہ بڑھ سکیں گے ۔ نیز ساکھالین (مشرقی سائبیریا کا ایک علاقہ جو جاپان کے قریب واقع ہے) کی اینو قوم (Aino ، کہا جاتا ہے کہ اہل جاپان کا سلسلۂ نسل اسی قوم سے چلا ہے) میں کسی حاملہ عورت کو زچگی سے قبل دو مہینے کے لیے سوت کاتنے اور رسی بٹنے کی اجازت نہیں ۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے ایسا کرنے سے بچے کی آنتیں ڈور کی مانند الجھ جاتی ہیں ۔ کچھ اسی قسم کے عقیدے کی بناء پر ہندوستان کے ضلع بلاس پور میں جب چودھریوں کا پنچ بیٹھتا ہے تو ان میں کسی کو چرخہ چلانے کی اجازت نہیں ہوتی ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی نے ایسا کیا تو بخت بھی چرخے کی طرح چکر میں پڑ جائے گی اور کسی نتیجے پر

نہیں پہنچے گی - شرق الہند کے بعض جزائر میں شکاری کے ہاں آنے والے ہر شخص کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ گھر میں سیدھا داخل ہو جائے ؛ اسے دروازے پر ہرگز نہیں رکنا چاہیے ، ورنہ شکار بھی اسی طرح دام میں آنے کی بجائے اس کے آگے ٹھہر کر لوٹ جائے گا - اسی وجہ سے وسطی سلیبیز کے ٹوراڈجاؤں کے ہاں اس گھر کی سیڑھیوں پر جس میں کوئی حاملہ عورت ہو ، کسی شخص کو کھڑے ہونے یا ٹھہر ٹھہر کر چلنے کی اجازت نہیں ، کیوں کہ اس سے بچے کی پیدائش میں تاخیر واقع ہوتی ہے ، اور سوماٹرا کے مختلف حصوں میں خود حاملہ عورت کو بھی گھر کے دروازے یا سب سے اونچے زینے پر کھڑے ہونے کی ممانعت ہے - یہ احتیاط انتہا درجے ضروری ہے ، جس کے برتنے میں اس نے غفلت کی تو اس کا خمیازہ اسے شدید درد زہ کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے - ملایا کے آدمی جو کافور کی جستجو میں لگے ہوں ، خشک غذا کھاتے ہیں اور پسا ہوا نمک استعمال نہیں کرتے - اس کا سبب یہ ہے کہ کافور درخت کے تنے کے شگاف کے اندر دانوں کی شکل میں جمع ہوتا ہے - اس سے ملایا کا کافور چیں یہ سمجھتا ہے کہ کافور کی تلاش کے دوران میں پسا ہوا نمک کھانے سے کافور کے باریک ریزے ہاتھ لگیں گے اور نمک کو دانوں کی صورت میں کھانا اس بات کی ضمانت ہے کہ کافور بھی دانوں کی صورت میں ملے گا - بورنیو کے کافور چیں پان کے پتوں میں کھانا کھاتے ہیں اور اپنی مہم کے دوران میں ان پتوں کو اس خوف سے کبھی نہیں دھوتے کہ کہیں کافور درختوں کے شگافوں میں سے گھل کر بہہ نہ جائے - ظاہر ہے کہ ان کے خیال میں کھانے کے برتنوں کو دھونا گویا کافور کے ریزوں کو ان درختوں میں سے بہا دینا ہے جن میں وہ جمع ہوتے ہیں - سیام میں لاؤس کے بہت سے حصوں کی اصل پیداوار لاکھ ہے - یہ ایک قسم کی گوند ہے جو ایک ننھے سے سرخ کیڑے کو درختوں کی تازہ شاخوں سے چپکا کر نکالی جاتی ہے - وہ تمام لوگ جن کا کاروبار اس گوند کے جمع کرنے پر مشتمل ہے ، نہانے سے پرہیز کرتے ہیں ، خاص طور پر سر دھونے سے ، کیوں کہ انہیں اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ان کے

بالوں میں سے جوؤں کے بہہ جانے سے گوند والے کیڑے ڈالیوں سے نہ اکھڑ جائیں ۔ اس کے علاوہ شمالی امریکہ کا بلیک فوٹ انڈین ، جس نے عقاب پکڑنے کے لیے پنجرا لگا رکھا ہو اور اپنے شکار کی گھات میں ہو ، گلاب کی کلیاں کسی صورت میں نہیں کھائے گا ۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتا ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا اور ادھر عقاب پنجرے کے قریب اترا تو جو کلیاں اس کے پیٹ میں ہوں گی ، ان سے عقاب کو کھجلی محسوس ہوگی ، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چارہ نگلنے کی بجائے عقاب بیٹھا محض اپنے آپ کو کھجاتا رہے گا ۔ اسی خیال کے ماتحت جب تک وہ اپنے دام کی دیکھ بھال میں لگا ہو ، ستاری کے استعمال سے محترز رہتا ہے ، اس لیے کہ اگر وہ ستاری سے کھرونچے لگائے تو عقاب اسے نوچ ڈالے گا ؛ یہی نہیں بلکہ جب وہ عقاب کی گھات میں لگا ہو اور گھر پر اس کے بیوی بچے ستاری سے کام لیں تب بھی اس کو اسی مصیبت کا سامنا ہوگا ۔ چناں‌چہ اس خوف سے کہ کہیں اس کا جسم خطرے میں نہ پڑ جائے ، اس کے پیچھے انہیں ستاری کے استعمال کی ممانعت ہوتی ہے ۔

وحشی اقوام جن ٹیبوؤں کی پابند ہیں ان میں سب سے بڑی تعداد ان ممنوعات کی ہے جن کا تعلق اشیائے خور و نوش سے ہے ۔ اس قسم کے متعدد ممنوعات کی بنیاد قانون تماثل پر ہے ، اور اس لیے وہ سلبی سحر کی مثالوں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ وحشی جس طرح کئی جانور اور نباتات اپنے اندر ان کی سی پسندیدہ خصوصیات پیدا کرنے کی غرض سے کھاتا ہے ، اسی طرح وہ بہت سے دوسرے جانوروں اور نباتات سے پرہیز بھی کرتا ہے تا کہ وہ ان کی برائیوں سے محفوظ رہے ۔ اس کا پہلی قسم کے جانور اور نباتات کا کھانا ایجابی سحر کے عمل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا دوسری قسم کے جانوروں اور نباتات سے پرہیز سلبی سحر کے عمل کی ۔ اس قسم کے ایجابی سحر کی بہت سی مثالیں آئیں گی ۔ اس جگہ میں سلبی سحر یا ٹیبو کی چند مثالیں پیش کروں گا ۔ چناں چہ مدغاسکر میں سپاہیوں کے لیے کئی ایک اشیائے خور و نوش ممنوع ہیں ، اس لیے کہ کہیں مثلی سحر کے اصول کے بموجب ان میں وہ بری اور خطرناک خاصیتیں سرایت نہ کر جائیں جو اشیاے مذکور میں پائی جاتی ہیں ۔

اس طرح آنھیں خار پشت کھانے کی اس وجہ سے ممانعت ھے کہ یہ جانور چوکنا ھوتا ھے تو سکڑ کر گولا بن جاتا ھے اور جو لوگ اسے کھاتے ھیں اُن میں بھی سہم کر دبکنے کا رجحان پیدا ھونے کا اندیشہ ھوتا ھے ۔ اس کے علاوہ ان میں کوئی سپاھی بیل کی ٹانگ نہیں کھا سکتا کہ کہیں بیل کی طرح اُس کی ٹانگیں بھی کمزور نہ ھو جائیں اور وہ کوچ کے قابل نہ رھے ۔ نیز سپاھی کے لیے کسی ایسے مرغ کے گوشت سے جو لڑتا ھوا مارا گیا ھو یا کسی ایسے جانور کے گوشت سے جسے نیزا مار کر ھلاک کیا گیا ھو ، اجتناب ضروری ھے ۔ جب وہ محاذ جنگ پر ھو تو اُس کے گھر میں کسی جانور کے نر کو ھلاک کرنے کی سخت ممانعت ھے ۔ ظاھر ھے کہ اگر سپاھی کے کھانے میں اُس مرغ کا گوشت آ گیا جو لڑتا ھوا مارا گیا ھو تو وہ خود میدان جنگ میں مارا جائے گا ۔ اگر اُس نے کسی ایسے جانور کا گوشت کھا لیا جسے نیزے سے مارا گیا ھو تو وہ خود بھی دشمن کے نیزے کا شکار بنے گا ۔ اگر اُس کے پیچھے کوئی نر جانور اُس کے گھر ھلاک کیا گیا تو وہ بھی اُسی طرح اور شاید اُسی لمحے ھلاک ھو جائے گا ۔ اس کے علاوہ مدغاسکری سپاھی کو گردے ھرگز نہیں کھانے چاھئیں ، اس لیے کہ مدغاسکری زبان میں گردے اور گولی دونوں کے لیے ایک ھی لفظ ھے ، لہذا اُس نے گردہ کھایا تو گولی بھی ضرور کھائے گا ۔

امتناع کی بعض مندرجہ بالا مثالوں میں آپ نے غور کیا ھوگا کہ سحر کے متعلق یہ خیال ملتا ھے کہ وہ اپنا اثر فاصلے سے کرتا ھے ۔ چناں چہ شمالی امریکہ کے بلیک فوٹوں میں جب کوئی شکاری عقاب پکڑنے جاتا ھے تو اُس کی بیویوں اور بچوں کو ستاری کے استعمال سے منع کیا جاتا ھے کہ کہیں اُن سے بہت دور اُن کے شوھر اور باپ کو عقاب نہ نوچ ڈالیں ۔ نیز مدغاسکری سپاھی محاذ جنگ پر ھو تو اس کے گھر کسی جانور کے نر کو مارنے کی اجازت نہیں ، کیوں کہ اس میں سپاھی کے ھلاک ھونے کا خطرہ ھوتا ھے ۔ دور افتادہ اشخاص و اشیاء کا ایک دوسرے کو متاثر کرنے پر یہ اعتقاد سحر کا جزو لاینفک ھے ۔ فاصلے سے چیزوں کے

عمل کے بارے میں سائنس کے شکوک خواہ کچھ ہی ہوں ، سحر کے نزدیک اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں : ٹیلی پیتھی پر ایمان اس کا رکن اولین ہے ۔ عصر حاضر کے اس مہذب انسان کو جو اس نظریے کا علم بردار ہو کہ ایک ذہن کے دوسرے ذہن پر اثر انداز ہونے میں بعد مکانی حائل نہیں ہونے پاتا ، وحشی کو اپنا ہم خیال بنانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی ۔ وحشی کا اس نظریے پر مدتوں پہلے سے ایمان رہا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس مسلک پر جس پابندی کے ساتھ کاربند رہا ہے وہ مجھے اس کے مہذب ہم مشرب کے ہاں اب تک نظر نہیں آئی ۔ وحشی کے نزدیک نہ صرف سحری رسوم فاصلے سے اشخاص و اشیاء کو متاثر کر سکتی ہیں بلکہ روز مرہ کے معمولی سے معمولی فعل میں بھی یہی طاقت ہوتی ہے ۔ چناں چہ بعض اہم موقعوں پر اُن لوگوں کے حرکات و سکنات پر سخت اور گوناں گوں پابندیاں عاید ہوتی ہیں جن کی آپس میں دوستی یا رشتے داری ہو اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان پابندیوں سے بے اعتنائی دور افتادہ دوستوں اور عزیزوں کی بد قسمتی بلکہ موت کا موجب بن جاتی ہے ۔ خاص طور پر جب لوگ شکار کے لیے نکلیں یا لڑائی پر ہوں تو اُن کے عزیزوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان شکاریوں یا سپاہیوں کی حفاظت یا کامیابی کی خاطر بعض چیزوں پر عمل کریں اور بعض سے احتراز ۔ میں اب اس سحری ٹیلی پیتھی کے ایجابی اور سلبی ہر دو پہلوؤں کی توضیح میں چند مثالیں پیش کروں گا ۔

لاؤس میں جب ہاتھی کا کوئی شکاری اپنے شکار کے تعاقب میں نکلتا ہے تو اپنی بیوی کو متنبہ کر جاتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے اپنے بال نہ کاٹے اور نہ اپنے جسم پر تیل کی مالش کرے ، اس لیے کہ اگر اس نے اپنے بال کاٹے تو ہاتھی جال پھاڑ دے گا اور جسم پر تیل ملا تو وہ اس میں سے پھسل نکلے گا ۔ کسی دایکی گاؤں کے آدمی سؤر کے شکار کو نکلے ہوں تو ان لوگوں کو جو گاؤں میں رہ جائیں ، تیل یا پانی کو ہاتھ لگانے

کی ممانعت ہوتی ہے ، کیوں کہ اُن کے ایسا کرنے سے شکاریوں کے ہاتھ چکنا جائیں گے اور شکار اُن کے ہاتھ سے پھسل کر نکل جائے گا۔

مشرقی افریقہ میں ہاتھی کے شکاریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر اُن کے پیچھے اُن کی بیویاں بے وفائی کریں تو ہاتھی اپنا پیچھا کرنے والے پر غالب آجائے گا اور اس طرح موخرالذکر یا تو مارا جائے گا یا بری طرح زخمی ہوگا۔ چناں چہ جب کسی شکاری کو اپنی بیوی کی بے راہ روی کی خبر ہوتی ہے تو وہ ہاتھی کا تعاقب چھوڑ دیتا ہے اور گھر لوٹ آتا ہے۔ اگر واگو گو قبیلے کا کوئی شکاری اپنی مہم میں ناکام رہے یا شیر اُس پر حملہ کرے تو وہ اپنی بیوی کی بے عنوانی کو اس کا سبب سمجھتا ہے اور غیض و غضب کی حالت میں اُس کے پاس لوٹ آتا ہے۔ اُس کی مہم کے دوران میں گھر پر اُس کی بیوی پر یہ پابندی عاید ہوتی ہے کہ وہ بیٹھی ہو تو کسی کو اپنے پیچھے سے گزرنے یا اپنے سامنے کھڑا نہ ہونے دے اور بستر پر اوندھی لیٹی رہے۔ بولیویا (جنوبی امریکہ) کی ماکساس نامی قوم کا یہ خیال تھا کہ اگر کسی شکاری کی بیوی اُس کے غائبانہ میں اس سے بے وفائی کرے تو اُس شکاری کو سانپ یا جیگوار (اس درندے کو امریکی شیر بھی کہتے ہیں) کاٹ کھائے گا۔ چناں چہ اگر ایسا کوئی حادثہ پیش آتا تو اُس کی بیوی کو خواہ اُس کا قصور ہو یا نہ ہو ، اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ، بلکہ بسا اوقات اس کی پاداش میں وہ عورت قتل کر دی جاتی۔ بحری اودبلاؤ کا ایلوشیائی شکاری (ایلوشیائی جزیروں کا باشندہ جو الاسکا میں شامل ہیں) سمجھتا ہے کہ اُس کی غیر موجودگی میں گھر پر اُس کی عورت بد راہ ہو جائے یا اُس کی بہن کی عصمت باقی نہ رہے تو وہ ایک جانور بھی نہ مار سکے گا۔

میکسیکو کے ہوکل نام کے ریڈ انڈینوں میں ایک قسم کی ناگ پھنی ، جس کے کھانے سے آدمی پر بے خودی طاری ہو جاتی

ہے ، نیم دیوتا کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس کا پودا ان کے علاقے میں پیدا نہیں ہوتا اور انھیں اسے حاصل کرنے کے لیے تیس دن کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے ۔ اس سفر کے دوران میں گھروں پر آن کی عورتیں بھاگ دوڑ ، بلکہ تیز چلنے سے بھی احتراز کرتی ہیں ۔ اس کے علاوہ وہ بارش ، اچھی فصل وغیرہ جیسی برکتوں کے نزول کے لیے جس کی آن کے شوہروں کی اس مقدس مہم سے توقع وابستہ ہوتی ہے ، کسوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتیں ۔ اس مقصد سے وہ اپنے آپ کو آن تمام قیود کا پابند کر لیتی ہیں جو ان کے شوہروں پر عائد ہوتی ہوں ۔ جب تک ناگ پھنی ہاتھ نہ آجائے اور اس کی خوشی میں جشن نہ منا لیا جائے ، شوہر اور عورتیں دونوں غسل نہیں کرتے ، بہ جز خاص موقعوں کے اور اس میں بھی صرف وہی پانی استعمال کیا جاتا ہے جو مقدس ناگ پھنی والے علاقے سے لایا گیا ہو ۔ نیز اس دوران میں وہ روزے رکھتے ہیں ، نمک سے پرہیز کرتے ہیں اور زہد و پرہیزگاری میں اپنا وقت گزارتے ہیں ۔ جو شخص اس ضابطے کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے بیماری کی صورت میں اس کی سزا ملتی ہے ۔ اس کے علاوہ اس کی اس حرکت سے وہ مقصد خطرے میں پڑ جاتا ہے جس کے حصول میں سب کوشاں ہوں ۔ آن کے لیے ناگ پھنی حاصل کرنا جو آگ کے دیوتا کا گھیا ہے ، تندرستی ، خوش قسمتی اور زندگی کی ضمانت ہے ۔ لیکن چوں کہ آتش پاک سے ناپاک انسان متمتع نہیں ہو سکتے ، لہذا ہر زن و مرد کے لیے لازمی ہے کہ وہ نہ صرف کچھ عرصے کے لیے گناہوں سے بچیں بلکہ اپنے دامن سے پچھلے گناہوں کے داغ دھو ڈالیں ۔ چناں چہ مردوں کے سفر پر روانہ ہونے کے چار دن بعد عورتوں کا ایک اجتماع ہوتا ہے جس میں آتش بزرگ کے حضور اعتراف عشق کی رسم ادا کی جاتی ہے ۔ اس میں انھیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ آنھوں نے لڑکپن سے لے کر اس وقت تک کن کن مردوں سے عاشقی کی ۔ وہ اپنے کسی عاشق کا نام چھپا نہیں سکتیں ۔ اگر آنھوں نے

بسا کیا تو ایک ناگ پھنی بھی آن کے ہاتھ نہ آئے گی ۔ چناں چہ اپنی یاد تازہ کرنے کے لیے آن میں ہر عورت ایک ڈور پر اپنے عشاق کے نام گن گن کر گانٹھیں لگاتی جاتی ہے ، اور پھر اس گنڈے کو اپنے ساتھ مندر میں لے جاتی ہے ، جہاں آگ کے سامنے کھڑی ہو کر یکے بعد دیگرے اُن تمام آدمیوں کے نام لیتی ہے جن کا اُس نے اپنے گنڈے پر شمار کر رکھا ہو ۔ اس اعتراف عشق کے بعد گنڈے کو آگ میں پھینک دیتی ہے اور جب آگ کا دیوتا اسے اپنے شعلوں میں جلا ڈالتا ہے تو اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں اور وہ سکون کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو جاتی ہے ۔ اس کے بعد عورتیں کسی مرد کے اپنے قریب سے گزرنے کی بھی روا دار نہیں ہوتیں ۔ خود وہ لوگ بھی جو ناگ پھنی کی جستجو میں نکلے ہوں ، اسی طرح اپنی خطاؤں کا اعتراف کر لیتے ہیں ۔ ایک ڈور پر گرہ لگا لگا کر وہ اپنی ہر لغزش کا شمار کرتے ہیں ، اور پھر ''پانچوں ہواؤں سے گفتگو'' کر چکنے کے بعد اس زنار معصیت کو اپنے قائد کے حوالے کر دیتے ہیں جسے وہ نذر آتش کر دیتا ہے ۔

ساراوک کے بہت سے دیسی قبائل کا اس بات پر کامل اعتقاد ہے کہ جب مرد جنگل کے اندر کافور کی تلاش میں لگے ہوں اور گھر پر آن کی عورتیں بدکاری کی مرتکب ہوں تو جو کافور آن کے ہاتھ آئے گا وہ سب آڑ جائے گا ۔ مردوں کے لیے بعض درختوں کی گانٹھوں سے اپنی عورتوں کی بد راہی کا پتا چلانا ممکن ہے ، اور کہا جاتا ہے کہ اگلے زمانے میں بہت سی عورتیں محض ان گانٹھوں کی شہادت پر اپنے بد گمان شوہروں کے ہاتھوں ماری گئیں ۔ اس کے علاوہ ان قبائل کے مرد جب کافور چننے جائیں تو عورتوں کے لیے کنگھوں کو ہاتھ لگانا منع ہے ، کیوں کہ ان کے ایسا کرنے سے درختوں کے شگاف کافور کے قیمتی دانوں سے پر ہونے کی بجائے کنگھے کے دندانوں کی طرح خالی ہو جاتے ہیں ۔ جزائر کائی میں جو نیوگنی کے جنوب مغرب میں واقع ہیں ، جب

کوئی کشتی کسی دور دراز بندرگاہ کے سفر پر روانہ ہونے کے لیے سمندر میں ڈالی جاتی ہے تو ساحل کے اُس حصے کو جہاں وہ رکھی رہی ہو، فوراً کھجور کی ڈالیوں سے ڈھانک دیا جاتا ہے اور وہ مقام مقدس بن جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی شخص اُس پر سے گزر نہیں سکتا تاوقتیکہ کشتی لوٹ نہ آئے۔ اگر کشتی کی واپسی سے قبل کوئی شخص اس مقام پر سے چل کر گزرے تو کشتی برباد ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تین چار لڑکیاں اس فرض کے لیے خاص طور پر منتخب کی جاتی ہیں کہ وہ ملاحوں کے دوران سفر میں تمام وقت اُن سے رابطۂ مشارکت قائم رکھیں اور اپنے طرز عمل سے کشتی کی سلامتی اور سفر کی کامیابی میں مدد و معاون ہوں۔ کسی شدید ضرورت کے سوا، انہیں کسی صورت میں اُس جگہ سے ہٹنے کی اجازت نہیں ہوتی جو اُن کے لیے مقرر کی گئی ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ جب تک کشتی کے بارے میں یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ سمندر میں اپنا رستہ طے کر رہی ہے، ان لڑکیوں کو بے حس و حرکت ہاتھ گھٹنوں کے درمیان دبائے بوریوں پر جھکے رہنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے سر دائیں بائیں نہیں گھما سکتیں، نہ کوئی اور حرکت کر سکتی ہیں۔ اگر اُنھوں نے ان قواعد کی خلاف ورزی کی تو کشتی اچھلنے اور غوطے کھانے لگے گی۔ نیز اُنھیں ناریل کے پانی میں ابلے ہوئے چاول جیسی کوئی لیس دار چیز نہیں کھانی چاہیے، اس لیے کہ اس قسم کی غذا کے اثر سے کشتی کے راستے کا پانی لسلسا ہو جائے گا۔ جب یہ سمجھ لیا جائے کہ جہازران اپنی منزل مقصود پر پہنچ چکے ہیں تو یہ پابندیاں کسی قدر نرم کر دی جاتی ہیں، لیکن جب تک کشتی کا سفر ختم نہیں ہو جاتا، ان لڑکیوں کو ڈنک مچھلی جیسی کسی تیز ہڈی یا کانٹے والی مچھلی کا پرہیز ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے کھانے میں جہازرانوں کے زخمی ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

جہاں دور افتادہ دوستوں کے باطنی رشتے کے متعلق یہ عقائد

ہوں ، وہاں کوئی تعجب نہیں جو لوگ اس رشتے سے سب سے بڑھ کر جنگ کی صورت میں فائدہ اٹھائیں ، جو اپنی تمام قہر سامانیوں کے باوجود انسان کے بعض نہایت عمیق اور نازک جذبات کو برانگیختہ کر دیتی ہے ۔ اور اس طرح وطن میں بیٹھے بیٹھے وہ اپنے اُن پیارے عزیزوں کی سلامتی کی تدبیر کریں جن کے محاذ جنگ پر لڑنے اور مارے جانے کا خطرہ ہر دم لگا ہو ۔ چناں چہ اس فطری اور مستحسن مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وطن میں سپاہیوں کے عزیز اور دوست بعض ایسی تدبیریں کرتے ہیں جو اپنی غایت کے اعتبار سے بڑی دل گداز ہیں ، لیکن ان میں جو ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں اُن کے لحاظ سے وہ ہمیں مضحکہ خیز نظر آئیں گی ۔ مثلاً بورنیو کے بعض اضلاع میں جب کوئی دایک دشمن کی گھات میں نکلا ہو کہ اُس کا سر کاٹ لائے (دایکوں کے ہاں دشمن کا سر ٹرافی یا نشان فتح مندی کی حیثیت رکھتا ہے) تو گھر پر اُس کی عورت یا کنواری بہن کا رات دن تلوار باندھے رہنا ضروری ہے ، تاکہ اُس شخص کو ہر وقت اپنے ہتھیار کا خیال رہے ۔ اُس عورت کو دن میں کسی وقت اور رات کو دو بجے سے پہلے سونے کی اجازت نہیں ، مبادا اس کے بھائی یا شوہر پر سوتے میں کوئی دشمن آن پڑے ۔ ساراوک میں بانٹنگ کے بحری دایکوں کے ہاں لڑائی کے دوران میں سپاہیوں پر سخت قواعد عائد ہوتے ہیں جو احکام و امتناعات دونوں پر مشتمل ہیں اور اُن سب کی بنیاد مثلی سحر کے اصول پر ہے ۔ ان میں چند ایک یہ ہیں : عورتوں کو منہ اندھیرے اُٹھنا چاہیے اور اُجالا ہوتے ہی گھروں کی ساری کھڑکیاں کھول دینی چاہئیں ، ورنہ اُن کے شوہر اُن سے دور پڑے سوتے رہیں گے ۔ وہ اپنے بالوں میں تیل نہیں لگا سکتیں اور نہ دن میں نیند لے سکتی ہیں ، ورنہ اُن کے شوہر کوچ میں اونگھنے لگیں گے ۔ انھیں ہر صبح مکئی بھون کر اُس کی کھیلیں برآمدے میں بکھیر دینی چاہئیں ، اس سے اُن کے مردوں میں چستی آجائے گی ۔ گھر کے کمروں میں

تمام صندوق دیوار کے ساتھ قرینے سے جما دینے چاہئیں ، ورنہ اگر کوئی شخص اُن سے ٹکرا جائے تو گھر سے دور اُن کے مرد لڑکھڑا کر گر پڑیں گے اور اس طرح دشمن اُن پر غالب آ جائے گا ۔ اُنھیں ہر کھانے پر تھوڑا سا خشکہ برتن میں چھوڑ کر اُسے الگ رکھ دینا چاہیے ، اس سے اُن کے دور افتادہ شوہروں کے پاس ہر وقت کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ موجود ہوگا اور وہ بھوکے نہیں رہیں گے ۔ اُنھیں اپنے راچھوں پر اتنی دیر کام نہیں کرنا چاہیے کہ بیٹھے بیٹھے اُن کے پاؤں اکڑ جائیں ، ورنہ اُن کے شوہروں کے جوڑوں میں اینٹھن پیدا ہو جائے گی اور وہ پھرتی سے اُٹھنے یا دشمن سے بچ نکلنے کے قابل نہ رہیں گے ۔ چناں چہ مردوں کے جوڑوں کی پھرتی قائم رکھنے کے لیے عورتیں اپنے راچھ چھوڑ چھوڑ کر برآمدوں میں ٹہل لیتی ہیں ۔ نیز اُنھیں اپنے چھروں کو ڈھانکنے کی اجازت نہیں ، ورنہ اُن کے شوہروں کو اونچی اونچی گھاس یا جنگل میں راستہ سجھائی نہیں دے گا ۔ اس کے علاوہ وہ سوئی سے سلائی نہیں کر سکتیں ، ورنہ اُن کے مردوں کے پاؤں اُن نوک دار میخوں پر پڑ جائیں گے جو دشمن نے راستے میں گاڑھ رکھی ہوں ۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے پیچھے اُس سے بے وفائی کرے تو وہ دشمن کے ملک میں مارا جائے گا ۔ چند سال ہوئے ، جب بانٹنگ کے مرد انگریزوں کی طرف سے باغیوں کے ساتھ لڑائی میں مصروف تھے تو یہ اور ایسے ہی اور قواعد تھے جن کی وہاں کی عورتیں پابند تھیں ۔ لیکن افسوس ہے کہ شوہروں کی محبت میں گھر پر اُن کے یہ سارے جتن اُن کے کچھ کام نہ آئے اور سینکڑوں مرد رن میں کھیت رہے ۔

جزیرۂ ٹیمور (شرق الہند) میں یہ دستور ہے کہ وہاں کا بڑا پجاری جنگ کے دوران میں اپنے مندر سے کبھی نہیں نکلتا ۔ اُس کا کھانا اُسے یا تو وہیں پہنچا دیا جاتا ہے یا مندر ہی میں پکتا ہے ۔ اس کے لیے رات دن آگ جلائے رکھنا لازمی ہے اور اگر اُس

کی غلفت سے آگ بجھ گئی تو سپاھیوں پر آفت آجائے گی ، اور جب تک آتش دان ٹھنڈا رھے آنھیں نجات نہ ملے گی ۔ اس کے علاوہ جب تک فوج میدان کارزار میں ھو ، آسے فقط گرم پانی پینا چاھیے ۔ اگر وہ ٹھنڈا پانی پیے تو اس کے ھر گھونٹ پر سپاھی ٹھنڈے پڑتے چلے جائیں گے اور دشمن پر فتح نہ پا سکیں گے ۔ جزائر کائی (شرق الھند) میں سپاھیوں کے رخصت ھونے کے بعد عورتیں اپنے اپنے گھروں میں آجاتی ھیں اور پھلوں اور پتھروں سے بھری چند ٹوکریاں نکالتی ھیں ، پھر ان پھلوں اور پتھروں پر تیل مل کر آنھیں ایک تختے پر رکھ دیتی ھیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بڑبڑاتی جاتی ھیں ''اے سورج دیوتا ، چاند دیوتا! جس طرح ان چکنائی ھوئی چیزوں سے بارش کے قطرے اچٹ جاتے ھیں ، آسی طرح ھمارے شوھروں ، بھائیوں ، منگیتروں اور دوسرے عزیزوں کے جسم سے گولیاں اچٹ جائیں ۔'' اور جوں ھی پہلی گولی چلتی ھے ، ٹوکریاں ایک طرف رکھ دی جاتی ھیں ، اور عورتیں اپنے پنکھے لے لے کر گھروں سے نکل پڑتی ھیں اور آنھیں دشمن کی سمت اٹھا اٹھا کر یہ کہتی جاتی ھیں ''اے سنہری پنکھو ھماری گولیاں نشانے پر لگیں اور دشمن کی چوک جائیں ۔'' اس دستور میں پتھروں پر تیل لگانے کی رسم ، جس کا مقصد یہ ھے کہ ان چکنے پتھروں سے بارش کے قطروں کی طرح گولیاں مردوں کے لگ لگ کے پھسل جائیں ، محض مثلی یا صوری سحر کا ایک نمونہ ھے ۔ لیکن سورج سے جادو میں اثر پیدا کرنے کی پرارتھنا مذھبی چیز ھے اور غالباً بعد میں بڑھائی گئی ھے ۔ ان عورتوں کا اپنے مردوں کی بندوقوں کی گولیوں کو نشانے پر لگانے اور دشمنوں کی بندوقوں کی گولیوں کو نشانے سے پھیرنے کی غرض سے پنکھے گھمانا بھی افسوں معلوم ھوتا ھے ۔

مدغاسکر کے ایک قدیم مورخ کا بیان ھے کہ ''جب تک مرد جنگ میں مصروف ھوں اور میدان جنگ سے لوٹ نہ آئیں ، عورتیں اور لڑکیاں رات دن برابر ناچتی رھتی ھیں ؛ نہ کسی وقت لیٹتی

ھیں اور نہ اپنے گھروں میں کھانا کھاتی ھیں ۔ ھر چند کہ اس دوران میں ان پر نفسانی خواھشات کا غلبہ ھوتا ھے ، لیکن وہ غیر مردوں سے کبھی التفات نہیں کرتیں ۔ ان کو اس بات پر کامل یقین ھے کہ اگر انھوں نے یہ احتیاط نہ کی تو ان کے مرد یا تو مارے جائیں گے یا مجروح ھو جائیں گے ۔ نیز یہ کہ ان کے رقص سے مردوں میں طاقت اور ھمت پیدا ھوتی ھے اور اس کے سبب وہ دشمن پر فتح یاب ھوتے ھیں ۔ چناں چہ جنگ کے زمانے میں وہ بالکل آرام نہیں کرتیں اور بڑی عقیدت سے اس رسم کی پابند رھتی ھیں ۔''

گولڈ کوسٹ (مغربی افریقہ) کے ٹشی زبان بولنے والے قبائل میں ، ان لوگوں کی عورتیں جو فوج کے ساتھ گئے ھوں ، اپنے جسم پر سفیدہ مل کر بہت سارے تعویذ گنڈے پہن لیتی ھیں اور بندوقیں یا ایسی لکڑیاں لگائے ، جو بندوقوں کی طرح تراشی گئی ھوں ، دوڑتی پھرتی ھیں اور ھرے ھرے پاپاوے (ایک پھل جس کی شکل خربوزے سے ملتی جاتی ھے) لے کر چھریوں سے ان کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ھیں جیسے دشمنوں کے سروں کے پرخچے اڑا رھی ھوں ۔ یہ کھیل بلاشبہ محض صوری نوعیت کا ایک افسوں ھے ، جس کا مقصد یہ ھے کہ عورتیں اس خربوزہ نما پھل کے ساتھ جو عمل کرتی ھیں وھی ان کے مرد دشمنوں کے ساتھ کرنے کے قابل ھو سکیں ۔ چند سال ھوئے جب جنگ اشانتی ھو رھی تھی تو مغربی افریقہ کے قصبۂ فرامین میں فٹز جیرلڈ میریٹ صاحب نے عورتوں کا ایک ناچ دیکھا تھا ۔ یہ عورتیں ان آدمیوں کی بیویاں تھیں جو باربرداروں کی حیثیت سے محاذ جنگ پر گئے ھوئے تھے ۔ انھوں نے اپنے جسموں پر سفیدہ مل رکھا تھا اور صرف لہنگے پہنے ھوئے تھیں ۔ ان کی پیشوائی ایک پیر زال ساحرہ کر رھی تھی جس کے جسم پر ایک سفید شمیز تھی ، سر پر سینگ کی طرح سیاہ بالوں کا جوڑا ابھرا ھوا تھا اور سیاہ فام چہرے ، ھاتوں اور ٹانگوں پر جگہ جگہ سفید دائرے اور چاند بنے ھوئے تھے ۔ یہ سب عورتیں ھاتھوں میں لمبے لمبے برش لیے تھیں جو بھینس یا گھوڑے کے دم کے بالوں سے بنائے گئے تھے ۔ وہ ناچتے

ناچتے یہ گاتی جاتی تھیں : ''ہمارے شوہر کہ اشانتی دیس گئے ہوئے ہیں ، اپنے دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالیں ۔''

برطانوی کولمبیا کے تھامپسن نامی ریڈ انڈینوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ ادھر مرد جنگ میں مصروف ہوتے تھے اور ادھر ان کی سب عورتیں مل کر تھوڑے تھوڑے وقفے سے رقص کیا کرتی تھیں ۔ انھیں یقین تھا کہ ان کی اس کاروائی سے مردوں کو اپنی مہم میں ضرور کامیابی نصیب ہوگی ، اور ان کا یہ تماشا محض رقص تک محدود نہ ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ چھریوں سے چھریاں لڑاتی جاتیں ۔ لمبی لمبی نوک دار لکڑیاں آگے کو پھینکتیں یا ایسی لکڑیوں کو جن کے سروں پر آنکڑے لگے ہوتے ، بار بار آگے پیچھے حرکت دیتی جاتیں ۔ لکڑیاں آگے کو پھینکنا دشمنوں میں گھسنے یا انھیں روکنے کی علامت تھا اور انھیں پیچھے کی طرف کھینچنے کا عمل خود اپنے مردوں کو خطرے سے بچانے کی نشانی ۔ لکڑی کے سرے پر جو آنکڑا لگا ہوتا اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ جان بچانے والے ہتھیار کا کام دے ۔ ان کی لکڑیوں کا رخ ہمیشہ دشمن کے ملک کی طرف ہوتا تھا ۔ اس موقع پر وہ اپنے چہروں پر سرخی ملتیں اور ناچتے ناچتے گاتی اور اپنے ہتھیاروں سے التجا بھی کرتی جاتی تھیں کہ وہ ان کے مردوں کو محفوظ رکھیں اور دشمنوں کی کثیر تعداد مارنے میں ان کی مدد کریں ۔ ان میں بعض عورتوں کی لکڑیوں کی نوکوں سے عقاب کے پر چپکے ہوتے تھے ۔ جب ناچ ہو چکتا تو یہ ہتھیار چھپا دیے جاتے تھے ۔ اگر کوئی عورت جس کا شوہر جنگ میں شریک ہو ، یہ سمجھتی کہ اس کو اپنی لکڑی نکالتے وقت اس پر بال یا کھوپری کا ٹکڑا دکھائی دیا ہے تو وہ جان لیتی کہ اس کے شوہر نے کسی دشمن کو ٹھکانے لگا دیا ہے ، اور جو اسے لہو کا دھبا دکھائی دے جاتا تو اسے پتا چل جاتا کہ اس کا شوہر لڑائی میں زخمی ہو گیا ہے یا کام آ گیا ہے ۔ کیلیفورنیا میں قبیلۂ یوکی کے لوگ گھروں سے دور میدان جنگ میں دشمن سے نبرد آزما ہوتے تو ان کی عورتیں سویا نہ کرتیں ، بلکہ ایک دائرے میں متواتر رقص کرتیں اور پودوں کی شاخیں گھما گھما کر گیت گاتیں ۔ ان کا

کہنا تھا کہ وہ اس طرح تمام وقت ناچتی رہیں تو ان کے شوہر تھکیں گے نہیں ۔ جزیرۂ کوئین شارلٹ (شمال مغربی امریکہ) کے ہیڈا نامی ریڈ انڈینوں میں جب مرد لڑائی پر گئے ہوتے تو عورتیں صبح سویرے اٹھتیں اور جنگ کی نقل کرتے ہوئے اپنے بچوں پر آ پڑتیں اور انھیں جھوٹ موٹ غلام بنا لیتیں ۔ خیال یہ تھا کہ عورتوں کے اس فعل سے ان کے مردوں کو اسی طرح دشمن پر جا پڑنے اور اسے گرفتار کرنے میں مدد ملے گی ۔ اگر کوئی شخص جنگ میں مصروف ہوتا اور گھر پر اس کی بیوی بد راہ ہو جاتی تو اس میں اس کے مارے جانے کا خطرہ ہوتا ۔ یہ عورتیں دس راتوں تک اس نقطے کی سیدھ میں اپنے سر کیے پڑی رہتیں جدھر جنگی کشتیاں روانہ ہوئی ہوں ، پھر وہ اپنا رخ بدل لیتی تھیں ، کیوں کہ اس کے بعد سمندر سے کشتیوں کے واپس ہونے کی توقع ہوتی ۔ ماسیٹ (جزائر کوئین شارلٹ) میں ہیڈا عورتیں ، جب تک ان کے شوہر مصروف پیکار ہوتے ، تمام وقت ناچتی اور رزمیہ گیت گاتی رہتی تھیں ، نیز انھیں اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو ایک خاص سلیقے سے رکھنا پڑتا تھا ۔ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اس رسم کی پابندی نہ کرکے عورت اپنے شوہر کو ہلاک کر سکتی ہے ۔ اورینوکو (جنوبی امریکہ) میں کاریبوں (یہ اصل میں جزائر کاریبز ، بحیرۂ کاریبین کے قدیم باشندوں کا نام ہے ۔ کولمبس نے ہسپانوی شہنشاہ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ غرب الہند کے ہائٹی ان 'کاریبالیوں' سے بہت خائف رہتے ہیں ۔ ان کے اسی نام نے آگے چل کر 'کیبی بال' کی صورت اختیار کر لی ، جس کے معنی آدم خور کے ہیں) کی کوئی جمعیت جب لڑائی پر چلی جاتی تھی تو ان کے جو دوست احباب گاؤں میں رہ جاتے تھے وہ ٹھیک اس گھڑی کا اندازہ لگا کر جب ان کے جان باز دشمن پر حملہ آور ہونے کے لیے پیش قدمی کر رہے ہوں ، دو لڑکوں کو ایک چوکی پر لٹا دیتے اور ان کی ننگی پیٹھوں پر کوڑوں سے شدید ضربیں لگاتے ۔ لڑکے یہ ساری اذیت بڑی خوش اعتقادی سے برداشت کر لیتے ، کیوں کہ بچپن سے انھیں یہ تلقین کی جاتی تھی کہ اس تکلیف میں ان کے

صبر و استقامت پر ان کے سپاہیوں کی شجاعت اور فتح و نصرت کا انحصار ہے۔

انسان کو غلط فہمی کی بناء پر جن بہت سے فلاحی کاموں میں مثلی یا صوری سحر سے کام لینے کی سوجھی ہے ، ان میں ایک درختوں اور پودوں سے صحیح موسم میں پھل اور اناج پیدا کرانا ہے۔ چناں چہ تھورینجن (جرمنی) میں سن کا کاشت کار بوائی کے وقت ایک لمبے تھیلے میں جو اس کے کندھوں سے ٹخنوں تک پہنچتا ہے ، السی ڈال کر ڈگ بھرتا ہوا چلتا ہے ، جس سے وہ تھیلا اس کی پشت پر ایک طرف سے دوسری طرف ہلتا رہتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے سن بھی آگ کر اسی طرح ہوا میں لہرائے گا۔ سوماٹرا کے اندرونی علاقے میں چاول بونے والی عورتیں بوائی کے وقت اپنے بال پیٹھ پر کھلے چھوڑ دیتی ہیں ، تاکہ چاول بہ افراط پیدا ہو اور دھان لمبا ہو۔ اسی طرح قدیم میکسیکو میں مکئی کا ''جو لمبے لمبے زلفوں والی دیوی'' کہلاتی تھی ، ایک تیوہار منایا جاتا تھا۔ یہ اس وقت شروع ہوتا جب مکئی بہار پر ہوتی اور اس کے ہرے ہرے بھٹوں سے نکلے ہوئے بال یہ ظاہر کرتے کہ اس کا دانہ بالکل تیار ہے۔ اس موقع پر عورتیں اپنی لمبی لمبی زلفیں کھول دیتیں اور رقص میں ، جو اس تیوہار کی سب سے نمایاں خصوصیت تھا ، انہیں ہلاتی اور اچھالتی جاتیں ، تاکہ اسی صورت سے مکئی کا طرا بکثرت پیدا ہو جس کی مناسبت سے مکئی کا دانہ بھی موٹا موٹا اور چپٹا چپٹا بنے اور اس طرح لوگوں کو اس جنس کی کثیر مقدار میسر آ سکے۔ یورپ کے بہت سے حصوں میں ناچنا اور اچھلنا فصل اگانے کے مانے ہوئے مثلی طریقے ہیں۔ چناں چہ فرانش کونٹے (فرانس) میں لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ جشن کارنیوال میں ناچو تاکہ حشیش اونچی اونچی اگے۔

اس خیال کی توضیح کہ آدمی کسی پودے پر اپنے فعل یا حالت سے مثلی طور پر اثر انداز ہو سکتا ہے ، ایک ملائی عورت کے بیان سے ہو سکتی ہے۔ جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ دھان کاٹتے وقت اس نے اپنے بدن کے بالائی حصے کو برہنہ کس لیے کر رکھا ہے تو اس نے

یہ بتایا کہ اپنے اس فعل سے وہ دھان کے چھلکوں کو باریک کر رہی ہے ، اس لیے کہ وہ موٹے چھلکوں والی دھان کوٹتے کوٹتے تھک جاتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کی دانست میں اس کے جسم پر کپڑے جس قدر کم ہوتے اسی قدر چاول پر چھلکا ہلکا پیدا ہوتا تھا ۔ بویریا اور آسٹریا کے کسان زمین کو زرخیز اور درختوں کو بارور کرنے کے لیے حاملہ عورت کی سحری قوت سے واقف ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ اگر کسی درخت کا پہلا پھل حاملہ عورت کو کھلایا جائے تو آئندہ سال اس پر گھن گھنا کر بار آئے گا ۔ دوسری طرف باگنڈاؤں (وسطی افریقہ کی ایک قوم) کا عقیدہ ہے کہ بانجھ عورت کا اس کے شوہر کے باغ پر سایہ پڑ جاتا ہے ، اور درختوں میں ثمر نہیں پیدا ہوتا ، لہذا بے اولاد عورت کو عموماً طلاق دے دی جاتی ہے ۔ اہل یونان و روم اناج اور دھرتی کی دیوی کو حاملہ عورتوں کی بھینٹ دیا کرتے تھے ، جس کا مقصد یقیناً یہ تھا کہ زمین سر سبز ہو جائے اور اناج افراط سے پیدا ہو ۔ اورینو کو والوں کے ہاں عورتیں شیر خوار بچوں کو گود میں لیے کڑی دھوپ میں بوائی کرتی ہیں ۔ جب ایک کیتھولک پادری نے انھیں اس فعل سے باز رکھنے کی کوشش کی تو ان کے مردوں نے جواب دیا ''قبلہ ! آپ کو ان باتوں سے اس لیے رنج ہوتا ہے کہ آپ انھیں سمجھتے نہیں ۔ عورتیں حمل کی عادی ہوتی ہیں جس کا ہم مردوں کو کوئی تجربہ نہیں ۔ جب وہ بوائی کرتی ہیں تو ایک ایک مکئی کے پودے میں دو دو یا تین تین بھٹے آتے ہیں ، یکا (ایک قسم کا سوسن نما پودا) سے دو دو یا تین تین ٹوکرے پھول اترتا ہے ، اور ہر چیز کی افزائش متناسب ہوتی ۔ بھلا یہ سب کیوں ہوتا ہے ؟ صرف اس لیے کہ عورتوں کو پیدائش کا گُر آتا ہے اور جو بیج وہ بوتی ہیں اسے پھلوانا بھی خوب جانتی ہیں ، لہذا انھیں بوائی کرنے دیجئے ۔ جتنا وہ اس کام کو سمجھتی ہیں ، ہم مرد نہیں سمجھتے ۔''

اس طرح سحر بالمثل کے نظریے کی رو سے کوئی شخص نباتات کو اپنے حال یا عمل کی مناسبت سے بھلے برے دونوں مقاصد کے لیے

متاثر کر سکتا ہے ۔ مثلاً ممنوع عورت کے ہاتھوں پودے بار آور ہو جاتے ہیں اور بانجھ عورت انہیں بانجھ کر دیتی ہے ؛ چناں چہ ذاتی خصوصیات یا اتفاقی حالات کی تخریبی اور متعدی نوعیت کے بارے میں اس عقیدے سے کئی ایک امتناعات یا احتراز سے متعلق دستور وجود میں آ گئے ہیں ۔ لوگ بعض افعال سے اس لیے مجتنب رہتے ہیں کہ زمین کی پیداوار پر اُن کی کسی برائی یا بری حالت کا اثر بالمثل مرتب نہ ہونے پائے ۔ یہ تمام اجتنابی رسوم یا احترازی نوعیت کے دستور سلبی سحر یا ٹیبو کی مثالیں ہیں ۔ مثلاً اس دلیل کی بناء پر کہ انسان کے افعال و کیفیات متعدی ہوتے ہیں ، گلیلاری (نیوگنی کے مغرب میں جزیرہ ملا ملیرا کے باشندے) کہتے ہیں کہ کسی پھل دار پیڑ کے تلے تیر اندازی نہیں کرنی چاہیے ۔ اگر اس امتناع کی پابندی نہ کی گئی تو اس پیڑ سے پھل اس طرح جھڑنے لگیں گے جس طرح تیر زمین پر آ پڑتے ہیں ، اور جب آپ تربوز کھائیں تو اس کا خیال ضرور رکھیے کہ آپ کے تھوکے ہوئے بیج اُن بیجوں میں نہ ملنے پائیں جو بونے کے لیے علیحدہ رکھے گئے ہوں ۔ اگر آپ نے یہ احتیاط نہ برتی اور سب بیج گڈمڈ ہو گئے تو آپ کے جھوٹے بیج آگ تو ضرور اُئیں گے اور پودوں سے کلیاں بھی پھوٹیں گی ، لیکن وہ کلیاں اُسی طرح جھڑتی رہیں گی جس طرح آپ کے منہ سے بیج گرے ہوں ۔ اس طرح اُن بیجوں کا پودا کبھی بار نہیں لائے گا ۔ بعینہ اسی قسم کے طرز استدلال پر بویریائی کسان کے اس عقیدے کی بنیاد ہے کہ اگر اُس نے کسی پھل والے درخت کی قلم زمین پر گرا دی تو اُس قلم کے درخت کا پھل اُسی طرح بے وقت جھڑنے لگے گا ۔ چین کوچین (جنوبی ویٹ نام) کے چام جب دھان کے خشک کھیتوں میں بوائی کر رہے ہوں اور یہ چاہتے ہوں کہ مینہ نہ برسے تو وہ چاول کے خشک نوالے کھائیں گے ، تاکہ چھینٹا پڑ جائے اور اُن کی فصل خراب نہ ہونے پائے ۔

مذکورہ بالا صورتوں میں کسی شخص کے متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے کہ مثلی طور پر نباتات پر اُس کا اثر پڑتا ہے اور اُسی کے جیسے محاسن و معائب اُن میں پیدا ہو جاتے ہیں ۔ لیکن مثلی سحر کے اصول

کے بموجب یہ اثر دو طرفہ ہوتا ہے ، یعنی کوئی پودا آدمی کو اسی طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح آدمی اس پودے کو کر سکتا ہو ۔ سحر ، اور میرے خیال سے طبیعیات میں بھی ، عمل اور رد عمل مساوی اور متقابل ہوتے ہیں ۔ امریکہ کے چیروکی (ممالک متحدہ امریکہ کے قدیم باشندوں کا ایک قبیلہ) ہومیوپیتھک قسم کی عملی نباتات کے ماہر ہوتے ہیں ۔ چناں چہ چیروکنیں اپنے بال مضبوط کرنے کے لیے کیٹ گٹ کے پودے کی جڑوں کے عرق سے سر دھوتی ہیں جو تانت کی طرح اس قدر سخت ہوتی ہیں کہ ہل میں اڑ جائیں تو وہ چل نہ سکے ، اور چیروکی گیند باز اس عرق سے غسل کرتے ہیں تاکہ اُن کے پٹھے سخت ہوں ۔ گیلاریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص زمین پر گرا ہوا پھل کھائے گا ۔ اُس کی ٹانگوں میں ڈگمگاہٹ پیدا ہو جائے گی ؛ نیز یہ کہ ایسی چیز کھانے سے جو بھلا دی گئی ہو (جیسے کوئی شکر قند جو برتن میں رہ گئی ہو ، یا کیلا جو آگ میں چھوٹ گیا ہو) نسیان پیدا ہو جاتا ہے ۔ انھی گیلاریوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر کوئی عورت دوگانہ کیلا کھا لے تو اُس کے ہاں جڑواں بچے پیدا ہوں گے ۔ جنوبی امریکہ کے گوارانی قبیلے کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر کوئی عورت جوار وغیرہ کا جڑا ہوا دانہ کھا لے تو وہ جڑواں بچے جنے گی ۔ ویدی عہد میں اسی اصول کی ایک عجیب عملی صورت وہ افسوں تھا جس کے اثر سے کوئی جلا وطن راجا اپنی گدی دوبارہ حاصل کر سکتا تھا ۔ اُسے کسی ایسی ڈالی کی لکڑی کی آگ پر پکا ہوا کھانا کھانا پڑتا تھا جو کسی کٹے ہوئے درخت کی ٹھنٹھ سے پھوٹی ہو ۔ پنپنے کی جو قوت ایسے درخت سے ظاہر ہوئی ہو ، وہ کچھ عرصے میں آگ سے کھانے اور کھانے سے راجا میں منتقل ہو جاتی ۔ سیڈانیوں (انڈونیشیا میں ایک جزیرے کے رہنے والے) کے خیال کے بموجب اگر کوئی مکان خار دار درخت کی لکڑی سے تعمیر کیا جائے تو اُس میں بسنے والوں کی زندگی بھی کانٹوں کی سیج بن جائے گی ۔

مثلی سحر کی ایک کارآمد شاخ ایسی ہے جس کے عمل میں مردوں کا ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے ۔ چناں چہ جس طرح مردے دیکھ ، سن

یا بول نہیں سکتے اسی طرح مثلی سحر کے اصول کے بموجب مردے کی ہڈی یا کسی ایسی شے کے استعمال سے جس پر موت کا اثر ہو ، لوگوں کو بینائی ، سماعت یا گویائی سے محروم کیا جا سکتا ہے ۔ لہذا گیلاریوں میں کوئی نوجوان جو رات کو اپنی محبوبہ سے اظہار محبت کے لیے نکلا ہو ، اس کے گھر کی چھت کے اس حصے پر کسی قبر کی مٹی لے کر پھیلا دیتا ہے جس کے نیچے اس کے ماں باپ سوتے ہوں ۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس عمل سے ، جب تک وہ اپنی محبوبہ سے محو راز و نیاز ہو ، اس کے ماں باپ جاگنے نہیں پائیں گے ، اس لیے کہ قبر کی مٹی کی تاثیر سے ان پر موت کی نیند طاری ہو جائے گی ۔ جادو کی یہ رسم قدیم زمانے سے متعدد ملکوں کے چوروں کا پسندیدہ طریق کار رہی ہے اور ان کے پیشے سے متعلق کاموں میں بڑی مفید ثابت ہوتی ہے ۔ چناں چہ یورپ کے جنوبی سلافیوں (ہنگری اور یوگوسلاویہ والے) میں نقب زن کسی مکان پر مردے کی ہڈی پھینک کر اپنی کاروائی شروع کرتا ہے ، جس کے ساتھ وہ اپنے دل خراش طنز کا یوں اظہار کرتا ہے ''جس طرح یہ ہڈی جاگ سکتی ہے ، اسی طرح اس گھر کے لوگ بھی جاگ سکتے ہیں ۔'' اس کے بعد گھر کا ایک متنفس بھی اپنی آنکھ کھلی نہیں رکھ سکتا ۔ اسی صورت سے جاوا میں نقب زن کسی قبر کی مٹی لے کر اسے اس گھر کے ارد گرد بکھیر دیتا ہے جس میں اسے ڈاکہ ڈالنا مقصود ہو ۔ اس سے اہل خانہ مدہوش ہو جاتے ہیں ۔ اسی مقصد سے ہندو چور بھی چتا کی راکھ گھر کی دہلیز پر بکھیر دیتا ہے ۔ پیرو کے ریڈ انڈین مردے کی ہڈی کا سفوف بکھیر دیتے ہیں ، اور سلافی چور مردے کے گودے کی نلی نکال کر اس میں چربی بھر دیتے ہیں اور اس طرح جو دیا تیار ہو جاتا ہے اسے روشن کر کے گھر کا طواف کرتے ہیں ۔ ان کا یہ عمل گھر کے مکینوں کو موت کی نیند سلا دیتا ہے ، یا انھی میں سے کوئی نقب زن انسانی ٹانگ کی ہڈی کی نے بنا کر اسے بجانے لگتا ہے ۔ اس کی صدا جو بھی سنتا ہے اس پر غنودگی چھا جاتی ہے ۔ اسی مردم آزار مقصد کے لیے میکسیکو کے وحشی ایسی عورت کی کلائی سے کام لیتے تھے جس کی موت پہلی زچگی میں واقع ہوئی ہو ۔ لیکن یہ

کلائی انھیں کہیں سے چرا کر لانی پڑتی تھی اور اسے وہ اس مکان میں داخل ہونے سے پہلے جسے لوٹنا مقصود ہو ، زمین پر دے مارتے تھے ۔ اس سے گھر کے ہر شخص کو سانپ سونگھ جاتا ؛ بعض تو خراٹے بھر کر سونے لگتے ۔ یورپ میں یہی قوت کسی ایسے شخص کے سوکھے ہوئے مردہ ہاتھ کی خصوصیت سمجھی جاتی تھی جسے سولی دی گئی ہو ۔ اگر کسی ایذا رساں شخص کی چربی ، جسے خود بھی پھانسی کی سزا ملی ہو ، اس مردہ ہاتھ میں بھر کر اس کی موم بتی تیار کی جاتی اور اسے روشن کیا جاتا تو وہ تمام اشخاص جنھیں یہ موم بتی پیش کی جاتی بے حس و حرکت ہو جاتے ۔ ان کے تن بدن سے اس طرح جان نکل جاتی کہ وہ اپنی ایک انگلی کو بھی جنبش نہ دے سکتے ۔ بعض صورتوں میں مذکورہ بالا مردے کا ہاتھ ایک بلکہ کئی موم بتیوں کا کام دیتا ہے اس لیے کہ اس کی تمام انگلیوں میں آگ لگا دی جاتی ہے ، لیکن اگر گھر کا ایک فرد بھی بیدار ہو تو ان میں کوئی نہ کوئی انگلی جل نہیں پائے گی ۔ ان مذموم چراغوں کو صرف دودھ سے بجھایا جا سکتا ہے ۔ اکثر صورتوں میں یہ بھی تجویز کیا جاتا ہے کہ چور کو اپنی موم بتی کسی نوزائیدہ بلکہ ایسے بچے کی انگلی سے تیار کرنی چاہیے جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہو ۔ بعض وقت یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ چور گھر کے ہر فرد کے لیے ایک موم بتی رکھے ۔ اگر اس کے پاس صرف ایک چھوٹی سی موم بتی ہو تو گھر کا کوئی فرد جاگ جائے گا اور وہ گرفتار کر لیا جائے گا ۔ یہ شمعیں ایک دفعہ جلنے لگیں تو سوائے دودھ کے انھیں کوئی چیز گل نہیں کر سکتی ۔ سترھویں صدی میں ڈاکو حاملہ عورتوں کو قتل کر دیا کرتے تھے تاکہ ان کے رحموں میں سے موم بتیاں برآمد کر سکیں ۔ یونان کا قدیم ڈاکو یا نقب زن یہ سمجھتا تھا کہ وہ کسی چتا سے ایک لوکا بھی اپنے ساتھ لے جائے تو گھر کے نگہبان کتے ، خواہ وہ کیسے ہی خون خوار ہوں ، دم نہیں مار سکیں گے اور دم دبا کر بھاگ نکلیں گے ۔ اس کے علاوہ سروی اور بلغاری عورتیں جو گھریلو زندگی کی پابندیوں سے تنگ آ گئی ہوں ، کسی لاش کی آنکھوں پر رکھے ہوئے پیسے اٹھا لائیں گی اور انھیں پانی

یا شراب سے دھوئیں گی ، پھر وہ عرق اپنے شوہروں کو پلا دیں گی ، جن کے حلق سے اترتے ہی وہ اُن مردوں کی طرح جن کی آنکھوں پر سکے رکھے ہوں ، اپنی عورتوں کی لغزشوں کو قطعی نہ دیکھ سکیں گے ۔

اس کے علاوہ جانوروں کے بارے میں اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں کچھ وصف یا خاصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو آدمیوں کے حق میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں ، لہذا ان خاصیتوں کو مثلی یا صوری سحر کے ذریعے مختلف طریقوں سے آدمیوں میں منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ چناں چہ جنوبی افریقہ کے بعض بکوان نیولے کو تعویذ کے طور پر گلے میں ڈالے رکھتے ہیں ، اس خیال سے کہ اس جانور کی بدولت ، جو سخت جان ہوتا ہے ، آنھیں مشکل سے قتل کیا جا سکے گا ۔ بعض دوسرے بکوان اسی مقصد سے ایک خاص کیڑے کو گلے میں ڈال لیتے ہیں ، جس کی اس غرض سے بڑی احتیاط کے ساتھ قطع و برید کی جاتی ہے تاکہ وہ مرنے نہ پائے ۔ نیز بعض اور بکوان سپاہی ایسے بیل کے بال جس کے سینگ نہ ہوں ، اپنے بالوں میں اور مینڈک کی کھال اپنے چغے میں لگا لیتے ہیں ، اس لیے کہ مینڈک پھسل جاتا ہے اور وہ بیل جس کے سینگ نہ ہوں ، مشکل سے ہاتھ آتا ہے ۔ لہذا جس شخص کو جادو کی یہ چیزیں میسر ہوں ، اسے یقین واثق ہوتا ہے کہ اس کا پکڑا جانا اتنا ہی مشکل ہوگا جتنا مینڈک یا بیل کا ۔ نیز جنوبی افریقہ کا سپاہی جو چوہے کے بالوں کا گچھا اپنے گھونگر والے سیاہ گیسوؤں میں گوندھ لیا کرتا ہے ، اس کا سبب صاف ظاہر ہے ؛ ایسا کرنے سے وہ اپنی دانست میں اسی طرح دشمن کے نیزے سے بچ بچ کر نکل جائے گا جس طرح پھرتیلا چوہا ان چیزوں سے جو اس پر پھینکی گئی ہوں ۔ لہذا جب جنگ کا امکان ہوتا ہے تو ان علاقوں میں چوہے کے بالوں کی بڑی مانگ ہوتی ہے ۔ ہندوستان کی ایک قدیم کتاب میں لکھا ہے کہ جب جنگ میں فتح و نصرت کے لیے بھینٹ دی جائے تو قربان گاہ اس زمین کی مٹی سے تیار کی جانی چاہیے جس پر جنگلی سور لوٹتا رہا ہو ، اس لیے کہ اس مٹی میں جنگلی سور کی طاقت جذب ہوگی ۔ گیلاریوں کا خیال ہے کہ یکتارا بجاتے وقت انگلیاں اکڑی ہوئی ہوں تو ایک

لمٹنگی چمگادڑ پکڑ کر اسے بھون لیا جائے اور اس کی راکھ انگلیوں پر ملی جائے ، اس سے انگلیوں میں وہی نرمی یا لچک پیدا ہو جائے گی جو چمگادڑوں کی ٹانگوں میں ہوتی ہے ۔ عرب اپنے مفرور غلام یا لونڈی کو واپس بلانے کے لیے زمین پر ایک طلسمی دائرہ کھینچتا ہے اور اس کے بیچوں بیچ ایک کیل گاڑھ کر اس میں غلام یا لونڈی کے لحاظ سے بھونرے کا ایک نر یا ماہ باندھ دیتا ہے ، جیسے جیسے بھونرا اس کے ارد گرد رینگتا جاتا ہے ، ڈور کیل سے لپٹتی چلی جاتی ہے اور اس طرح ہر گردش پر چکر کے گھٹنے سے بھونرا مرکز کے قریب ہوتا جاتا ہے ۔ اس کی پشت پر خیال یہ ہے کہ مثلی سحر کی بناء پر مفرور غلام یا لونڈی اپنے آقا کی طرف کھنچ آئے گی ۔

برطانوی نیوگنی کے مغربی قبائل میں کوئی شخص سانپ مارنے کے بعد اس کو جلائے گا اور جنگل جاتے وقت اس کی خاک اپنے پاؤں پر ملے گا ، اس لیے کہ ایسا کرنے سے کچھ دنوں تک اسے سانپ نہیں کاٹ پائے گا ۔ اگر یورپ کے جنوبی سلافیوں کے ہاں کوئی شخص سر بازار چوری کی ٹھان لے تو اس کے لیے اسے زیادہ کھکیڑ نہیں اٹھانی پڑتی ۔ وہ ایک اندھی بلی کو جلا کر اس کی راکھ کی ایک چٹکی اس خوردہ فروش پر ڈال دیتا ہے جس سے وہ کسی چیز کی قیمت چکاتا ہو ۔ اس کے بعد وہ ٹھگ خوانچے سے جو چیز چاہے اڑا سکتا ہے اور خوانچے والا اس مردہ بلی کی طرح جس کی خاک اس پر اڑائی گئی ہو ، اندھا ہو کر رہ جاتا ہے ، بلکہ اس کے بعد چور بڑی دلیری سے اس سے پوچھتا ہے ''کیا میں نے اس کی قیمت ادا کر دی ؟'' اور اس فریب خوردہ خوانچے والے کو ہاں کے سوا کوئی جواب بن نہیں پڑتا ۔ ایسی ہی سیدھی سادی اور مؤثر ترکیب سے وسطی آسٹریلیا والے ڈاڑھی بڑھانے کے لیے کام لیتے ہیں ۔ وہ ایک نوک دار ہڈی لے کر اسے اپنی ٹھوڑی میں چبھوتے ہیں ، پھر اسے بڑی احتیاط سے ایک طلسمی لکڑی یا پتھر سے سہلاتے ہیں ، جو ایک قسم کے لمبی موچھوں والے چوہے کی شکل کا ہوتا ہے ۔ چوہے کی لمبی موچھوں کی خاصیت خود بخود اس لکڑی یا پتھر میں سرایت کر جاتی ہے اور اس سے سیدھی ٹھوڑی میں منتقل ہو جاتی ہے

جس پر بہت جلد گھنی داڑھی آگ آتی ہے ۔ قدیم زمانے میں یونانی یہ سمجھتے تھے کہ بلبل کا گوشت کھانے سے جو بیدار رہتا ہے ، آدمی کو نیند نہیں آتی ، کسی چندھے آدمی پر عقاب کا پتا ملا جائے تو اس کی نظر عقاب کی طرح تیز ہو جاتی ہے اور کاگلے کا انڈا کھانے سے سفید بال پھر سے سیاہ ہو جاتے ہیں ۔ اس شخص کو جو اپنی عمر چھپانے کے لیے اس آخری ترکیب سے کام لیتا ، اپنے سال خوردہ گیسوؤں پر کاگلے کا انڈا ملتے ہوئے اس بات کی سخت احتیاط رکھنی پڑتی کہ اس کا منہ تیل سے بھرا رہے ورنہ اس کے بالوں کے ساتھ اس کے دانت بھی اس کالے کوے کی طرح سیاہ ہو جاتے اور انھیں خواہ کتنا ہی رگڑا یا مانجھا جاتا وہ پھر سفید نہ ہو سکتے ۔ یہ بال سیاہ کرنے والی دوا اس قدر تیز ہوتی کہ اس کے استعمال میں بے احتیاطی سے لینے کے دینے پڑ جاتے ۔

میکسیکو کے ہوکل نامی ریڈ انڈین آن خوب صورت نشانات کے دل دادہ ہیں جو سانپ کی پشت پر ہوتے ہیں ۔ چناں چہ ان کے ہاں جب کوئی عورت بنائی یا کشیدہ کاری کرنے لگتی ہے تو اس کا شوہر ایک سانپ پکڑ لاتا ہے اور اسے ایک چری ہوئی لکڑی میں پکڑ لیتا ہے ۔ عورت اس کی پشت کو سر سے لے کر دم تک سہلاتی ہے اور پھر وہی ہاتھ اپنی پیشانی اور آنکھوں پر پھیر لیتی ہے تاکہ وہ بھی سانپ کے نقش و نگار کا سا خوب صورت نمونہ تیار کر سکے ۔

مثلی سحر کے اصول کی رو سے بے جان چیزیں ، نیز درخت اور جانور اپنی اپنی فطرت اور ساحر کے تخریبی یا تعمیری عمل کے بموجب آس پاس کی چیزوں پر اپنا اچھا یا برا اثر ڈال سکتے ہیں ۔ سمرقند کی عورتیں بچے کو چوسنے کے لیے گنا دیتی ہیں اور اس کی ہتھیلی میں سریش لگاتی ہیں تاکہ وہ سن شعور کو پہنچے تو اس کی زبان شیریں ہو اور نقصان پہنچانے والی چیزیں اس کے ہاتھوں سے چپک کر رہ جائیں ۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ ایسی بھیڑ کی اون کا بنا ہوا کپڑا جس کو بھیڑیے نے پھاڑ کھایا ہو ، پہننے والے کی کھال میں خارش پیدا کر دیتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتا ہے ۔ ان کا یہ بھی خیال تھا

کہ وہ پتھر جس پر کسی کتے نے دانت مارا ہو ، شراب میں پڑ جائے تو اس کے پینے والے آپس میں لڑ پڑتے ہیں ۔ سوآب کے عربوں کے ہاں بے اولاد عورت کسی ایسی عورت کی عبا مانگ کر پہن لیتی ہے جس کے بہت سارے بچے ہوں ۔ اسے امید ہوتی ہے کہ ایسا کرنے سے اس عبا والی عورت کی قوت تناسل اس میں سرایت کر جائے گی ۔ مشرقی افریقہ میں سوفالا کے کافروں کا سرکنڈے یا تنکے کی چوٹ سے دم نکلتا تھا ، اور اس پر وہ ڈنڈے یا سریے سے پٹنے کو ترجیح دیتے تھے ، گو اس سے انھیں سخت چوٹیں آتی تھیں ۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کسی شخص کو ایسی چیز سے مارا جائے جو کھوکھلی ہو تو گھل گھل کر اس کا کام تمام ہو جائے گا ۔ مشرقی سمندروں میں ایک قسم کا لمبا سا گھونگا پایا جاتا ہے ، جو جزیرۂ سیلبیز کے بوگینوں کے ہاں 'بوڑھا' (کڈجیوو) کہلاتا ہے ۔ جمعہ کے دن وہ ان بوڑھوں کو الٹا کرکے گھر کی دہلیز پر رکھ دیتے ہیں ۔ ان کے عقیدے کی رو سے جو کوئی اس دہلیز پر قدم رکھے گا اس کی عمر بڑی ہو گی ۔ جب کسی برہمن لڑکے کی دیکشا ہوتی ہے تو اسے ایک پتھر پر پاؤں رکھنا پڑتا ہے ، جس کے ساتھ ساتھ یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں ''اس پتھر پر قدم رکھ اور پتھر کی مانند اٹل ہو جا ۔'' یہی رسم انھی الفاظ کے ساتھ برہمن لڑکی کو اپنے بیاہ کے موقع پر ادا کرنی پڑتی ہے ۔ مدغاسکر میں گردش تقدیر کا انسداد یہ ہے کہ گھر کے کسی مضبوط ستون کی بنیاد کے پاس ایک پتھر گاڑھ دیا جاتا ہے ۔ پتھر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کی عام رسم جزواً اس عقیدے پر مبنی ہے کہ پتھر کی قوت و استحکام سے حلف کی تصدیق ہو جاتی ہے ۔ اس طرح ڈینمارک کا ایک قدیم مورخ سیکسو گرما ٹیکس بیان کرتا ہے کہ قدیم زمانے کے لوگ کسی بادشاہ کا انتخاب کرتے وقت زمین میں نصب شدہ پتھروں پر کھڑے ہو جاتے تھے اور اس پر سے اپنی رائے کا اعلان کرتے ۔ مقصد یہ تھا کہ پتھروں کے ثبات و استحکام سے بادشاہ کے انتخاب کی مستقلی کا سگن دیا جائے ۔

لیکن پتھروں کے بھاری اور ٹھوس ہونے کی بناء پر جہاں یہ

خیال ہے کہ وہ ایک عام سحری قوت رکھتے ہیں ، وہاں خاص پتھروں یا پتھر کی خاص قسموں کے متعلق یہ بھی خیال پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی اپنی وضع اور رنگ کی مناسبت سے مخصوص خوبیوں کے حامل ہیں ۔ مثلاً پیرو کے بعض قدیم لوگ مکئی کی فصل بڑھانے کے لیے چند خاص پتھروں سے کام لیتے تھے ۔ بعض آلو کی پیداوار میں اضافہ اور بعض مویشی کی افزائش نسل کی غرض سے خاص پتھر استعمال کرتے ۔ مکئی کی فصل میں اضافے کے لیے جو پتھر استعمال کیے جاتے تھے ان کی شکل بھٹے جیسی ہوتی اور وہ پتھر جن کے استعمال کی غرض و غایت مویشی کی افزائش نسل تھی بھیڑوں کی وضع کے ہوتے ۔

ملینیشیا کے بعض حصوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ کچھ متبرک پتھر ایسے ہیں جو اپنی شکلوں کی مناسبت سے خارق عادت ہوتے ہیں ۔ چناں چہ آب خوردہ مرجان کا دانہ جو سمندر کے ساحل پر ملتا ہے ، اکثر روٹ پھل (Bread fruit) سے عجیب و غریب مشابہت رکھتا ہے ۔ جزائر بنیکس (آسٹریلیا) میں جس شخص کے ہاتھ اس قسم کے مرجان کا کوئی دانہ لگا ہو وہ اسے اس توقع سے اپنے روٹ پھل کے درخت کی جڑ کے پاس ڈال دے گا کہ اس کے اثر سے درخت میں بہت سا پھل آئے گا ۔ اگر اس کی توقع پوری ہو جائے تو وہ لوگوں سے معقول معاوضہ وصول کر کے ان کے ایسے پتھر لے لیتا ہے جس میں مذکورہ بالا پھل سے مشابہت نسبتاً کم ہو ، اور ان پتھروں کو اپنے دانۂ مرجان کے پاس ڈالے رکھتا ہے تاکہ ان میں اس دانے کا سحری اثر سرایت کر جائے ۔ اسی طرح وہ پتھر جن پر ٹکیاں ٹکیاں سی نقش ہوں ، بڑے پیسے لاتا ہے ۔ اگر کسی شخص کو ایسا کوئی بڑا پتھر مل جاتا جس کے نیچے سے چھوٹے چھوٹے بہت سے پتھر نکلتے ، جیسے کوئی سوریا اپنے جھول میں ہو ، تو اسے یقین ہوتا کہ اس پر پیسے نذر چڑھانے سے سور اس کے ہاتھ آئیں گے ۔ یہ اور ان جیسی دوسری صورتیں ایسی ہیں جن میں میلنیشیا کے لوگوں کے نزدیک خرق عادت پتھر کی کرامت نہیں ، بلکہ اس روح کا معجزہ ہے جو پتھر میں سمائی ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں ، جن کی ایک مثال ابھی ہماری

نظر سے گزری ہے ، پتھر پر نظر چڑھا کر اس کی روح کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ لیکن ایسی روح کا تصور جس کی استمالت ضروری ہو ، سحر کے دائرے سے خارج ہے اور مذہب کے تحت آتا ہے ۔ مندرجہ بالا مثال کی طرح جہاں خالص سحری فکر و عمل کے ساتھ ساتھ ایسا کوئی تصور پایا جائے ، یہ فرض کرنا چاہیے کہ اول الذکر کی حیثیت ابتدائی ہے اور مذہبی تصور بعد کا اضافہ ہے ، کیوں کہ ہمارے یہ سمجھنے کے لیے معقول وجوہ موجود ہیں کہ سحر کو مذہب پر اولیت حاصل ہے ۔ ہم اس نکتے پر آگے چل کر غور کریں گے ۔

قدیم زمانے کے لوگوں کے نزدیک جواہر اپنی سحری خصوصیات کی بدولت بڑی قدر و قیمت رکھتے تھے ، بلکہ اس ضمن میں بڑی دلیلوں کے ساتھ یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ ان بیش قیمت پتھروں کو زیور کے طور پر پہننے سے کہیں پہلے تعویذ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا ۔ اس طرح اہل یونان ایک قسم کے پتھر کو عقیق مشجر کہتے تھے ، اس لیے کہ اس پر درخت جیسے نشان نقش ہوتے تھے ، اور ان کا خیال تھا کہ اگر اس کے دو دانے ہل میں جتی ہوئی بیلوں کی جوڑی کے سینگوں یا گلوں میں باندھ دیے جائیں تو فصل وافر ہو گی ۔ اس کے علاوہ ان کے نزدیک 'سنگ شیر' کی تاثیر بھی مسلم تھی جسے بادۂ انگبیں میں گھول کر پینے سے عورت کی چھاتیوں میں دودھ بھر آتا تھا ۔ اسی مقصد سے 'سنگ شیر' آج بھی یونان میں کریٹ اور میلوس کی عورتیں استعمال کرتی ہیں ، اور البانیہ میں دایائیں اسے پہنتی ہیں تاکہ ان کی چھاتیوں میں دودھ اترتا رہے ۔ نیز اہل یونان کا ایک ایسے پتھر پر اعتقاد تھا جس کی تاثیر سے سانپ کا کاٹا اچھا ہو جاتا تھا اور اسے وہ 'سنگ مار' کہتے تھے ۔ اس کی آزمائش کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ اسے پیس کر اس کا سفوف زخم پر چھڑک دیا جائے ۔ شرابی رنگ کا امیتھسٹ (Amethyst ، ارغوانی رنگ کا یاقوت ، یہ لفظ یونانی کے Amethustos سے ماخوذ ہے ، جس میں A نفی کا سابقہ ہے اور methusko یا Methu بمعنی شراب یا نشہ آور

کویا اس لفظ کی بناء اس قسم کے یاقوت کے بارے میں وہی توہم تھا جس کی طرف یہاں سرجیمس نے اشارہ کیا ہے) اس نام سے جس کے معنے ''جو نشہ میں نہ ہو ، یا ہوشیار'' کے ہیں ، اس لیے موسوم ہے کہ اس کے پہننے والے کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ ہوشیار رہتا ہے۔ اور ایسے ذو بھائیوں کو جو مل جل کر زندگی بسر کرنا چاہتے یہ مشورہ دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ مقناطیس رکھیں۔ ظاہر ہے کہ مقناطیس دونوں بھائیوں میں کشش پیدا کرکے انہیں لڑنے جھگڑنے سے روکتا تھا۔

ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں یہ ہدایت درج ہے کہ آدمی کو پہلی رات غروب آفتاب سے لے کر تارے نکلنے تک اپنی دلہن کے ساتھ چپ چاپ بیٹھا رہنا چاہیے اور جب قطب تارا نمودار ہو تو اسے دلہن کو دکھائے اور اس تارے کو مخاطب کرکے یہ کہتا جائے ''تو محکم ہے ، میں تجھے دیکھ رہا ہوں دھیرج تارے ! اے کہ تو اقبال مند ہے ، میرے ساتھ اپنا رشتہ استوار رکھ !'' پھر اسے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر یہ کہنا چاہیے ''تجھ کو برہسپتی نے مجھے بخشا ہے ، میں کہ تیرا شوہر ہوں ، مجھ سے اولاد حاصل کر اور سو برس تک میرے ساتھ زندگی بسر کر۔'' اس رسم کی تہ میں جو مقصد کارفرما ہے ، وہ یہ ہے کہ اس مستحکم ستارے کے دیر پا اثر سے تقدیر کی گردش اور دنیوی مسرت کی بے ثباتی کے خلاف پیش بندی کی جائے۔ یہی وہ آرزو ہے جس کا اظہار کیٹس اپنے آخری سانیٹ ''The Bright Star'' میں یوں کرتا ہے :

> ''اے درخشاں ستارے ! کاش میں بھی تیری مانند ثابت
> و محکم ہوتا ! لیکن تیری طرح نہیں جو رات کی تاریکی میں
> آسمان پر اکیلا جگمگاتا رہتا ہے''

(اس سانیٹ میں کیٹس نے اپنے محبوب کے وصال کے جاوداں کی آرزو کا اظہار کیا ہے) ۔

ساحلی علاقوں کے رہنے والے سمندر کے مسلسل مد و جزر کے منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور مشارکت و مشابہت کے اُس جاہلی فلسفہ کے بہ موجب ، جو یہاں ہماری بحث کا موضوع ہے ، ان لوگوں کو انسان اور حیوانات و نباتات کی زندگی اور سمندر کے مد و جزر میں ایک نازک رشتہ ، ایک سر بستہ ہم آہنگی کا نظر آنا فطری امر ہے ۔ مد کی حالت اُن کے نزدیک افراط ، خوش حالی اور زندگی کی علامت ہی نہیں بلکہ سر چشمہ بھی ہے اور جزر ان کے لیے نہ صرف ناکامی ، کمزوری اور موت کی قوت بلکہ اُن کی حسرت ناک علامت کی بھی حیثیت رکھتا ہے ۔ بریٹن (فرانس) کے کسان نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ تہ پتیا گھاس چڑھتے پانی میں بونے سے اچھی طرح نمو پاتی ہے ، لیکن اگر اُسے اس وقت بویا جائے جب پانی اُتر رہا ہو یا سمندر جزر کی حالت میں ہو تو وہ کبھی سرسبز نہیں ہونے کی ، اور یہ کہ ایسی گھاس کوئی کھا لے تو اُس کا پیٹ پھٹ جائے گا ۔ اس کسان کی عورت کا خیال ہے کہ بہترین مکھن تیار ہونے کا وقت وہ ہے جب پانی کا رخ بدلنے لگے اور جوار آنا شروع ہو ؛ یہ کہ جب تک چڑھاؤ کا وقت نہ گزر جائے ، رنی میں دودھ سے جھاگ اُٹھتا رہے گا ، نیز جوار کی حالت میں کنویں کا کھینچا ہوا پانی اور گائے کا دوھا ہوا دودھ برتن میں ابل کر آگ میں گر جائے گا ۔ قدیم زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ سیل (دریائی بچھڑا جس کا سمور بڑا قیمتی ہوتا ہے) کی کھال جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی نامعلوم طور پر سمندر سے اپنا رشتہ قائم رکھتی ہے اور اُسے بھاٹے میں سکڑتا دیکھا گیا ہے ۔ ایک اور قدیم عقیدہ ، جو ارسطو سے منسوب کیا جاتا ہے ، یہ ہے کہ مخلوقات ہمیشہ بھاٹے میں مرا کرتی ہیں ۔ اگر پلینی کا بیان درست ہے تو فرانس کے ساحل پر آدمیوں کو واقعی اُسی وقت موت آتی تھی ۔ اس طرح اس عقیدے کی صداقت کا ثبوت تجربے سے ملا تھا ۔ نیز فلاستراتس بڑے وثوق سے کہتا ہے کہ کیڈز (ہسپانیہ) میں جب تک پانی چڑھاؤ پر ہوتا ، مرنے والوں کا دم

نہ نکلتا تھا۔ اسی قسم کا وہم ابھی تک یورپ کے بعض حصوں میں پاتا جاتا ہے۔ ہسپانیہ کے شمالی ساحل کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس شخص کی موت کسی مزمن مرض یا کسی مرض کے شدید حملے سے ہو، اس کی آنکھ اس وقت بند ہوتی ہے جب جزر شروع ہو۔ روایت کے بہ موجب پرتگال، ویلز کے سارے ساحل اور ساحل برٹنی کے بہت سے حصوں میں لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آدمی چڑھتے پانی میں پیدا ہوتے ہیں اور اترتے پانی میں مرتے ہیں۔ انگلستان میں اس توہم کے وجود کی تصدیق ڈکنز مسٹر پیگوٹی (ڈیوڈ کاپر فیلڈ کا ایک کردار) کی زبانی یوں کرتا ہے ''لوگ لب ساحل مر نہیں سکتے جب تک پانی اتر نہ لے، اور جب تک چڑھ نہ آئے پیدا نہیں ہو سکتے۔ جب تک سیلاب نہ آجائے ان کی پیدائش میں کچھ نہ کچھ کسر باقی رہتی ہے۔'' کہا جاتا ہے کہ بھاٹے میں اموات کے واقع ہونے سے متعلق یہ عقیدہ انگلستان کے مشرقی ساحل پر نارتھمبر لینڈ سے لے کر کینٹ تک پایا جاتا ہے۔ شیکسپیر بھی اس سے ضرور باخبر ہوگا، اس لیے کہ اس کے فال اسٹاف کی روح ٹھیک بارہ اور ایک کے درمیان عین بھاٹے کے وقت پرواز کرتی ہے۔ یہی عقیدہ شمالی امریکہ کے مغربی ساحل پر ہیڈاؤں کے ہاں ملتا ہے۔ ان میں جب کوئی نیک آدمی گزرنے لگتا ہے تو اسے اپنے بعض مرے ہوئے دوست ڈونگی میں آتے دکھائی دیتے ہیں، تاکہ عالم ارواح میں اس کا خیر مقدم کریں۔ وہ اس سے کہتے ہیں ''اب ہمارے ساتھ چلو، وہ بھاٹا لگا چاہتا ہے، رخصت کی گھڑی آن پہنچی۔'' نیو ساؤتھ ویلز (جنوب مشرقی آسٹریلیا) میں بندر گاہ اسٹیفنز کے دیسی لوگ اپنے مردوں کو ہمیشہ اس وقت دفن کرتے ہیں جب سمندر چڑھاؤ پر ہو؛ پانی اترتے وقت وہ ہرگز ایسا نہیں کریں گے، کیوں کہ اس میں اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں پانی لوٹتے ہوئے رخصت ہونے والوں کی روحوں کو کسی دور دیس بہا نہ لے جائے۔

اپنی عمر بڑھانے کے لیے اہل چین بعض پیچیدہ قسم کے جادو ٹونے کرتے ہیں۔ ان ٹونوں کے اثر سے ان میں وقت و موسم اور اشخاص و اشیاء کی سحری ماہیت سرایت کر جاتی ہے۔ ان کے خوش آیند اثرات کو کسب کرنے کے لیے جو ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے وہ کفن ہے۔ بہت سے چینی اپنے کفن جیتے جی تیار کرا لیتے ہیں۔ اکثر دور اندیش لوگ انھیں کسی کنواری، لڑکی یا نوجوان عورت سے کٹوا کر سلواتے ہیں، کیوں کہ وہ یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس لڑکی یا عورت کے کئی سال تک زندہ رہنے کا امکان ہے اور اس لیے اس کی قوت حیات کا کچھ حصہ کپڑوں میں نفوذ کر جانا اور اس طرح ان کے کفن پہننے کی گھڑی کا کئی سال کے لیے ٹل جانا یقینی ہے۔ اس کے علاوہ کفن سلوانے کے لیے ان کے نزدیک سب سے اچھا سال وہ ہے جس میں لوند کا مہینہ آئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ چینی کی دانست میں اس سال کفن سلوانے سے جو معمولی سال سے لمبا ہوتا ہے، کفن میں عمر بڑھانے کی غیر معمولی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ چینیوں کے کفن میں ایک چغہ شامل ہوتا ہے جس میں عمر بڑھانے کی یہ قوت پیدا کرنے کے لیے بڑی کھیکڑ اٹھائی جاتی ہے۔ یہ چغہ نہایت گہرے نیلے رنگ کا ایک گاؤن ہوتا ہے جس پر جگہ جگہ سلمے سے لفظ ''درازیٔ عمر'' ٹنکا ہوتا ہے۔ اپنے معمر والدین میں سے کسی کو اس بیش بہا چغے کا تحفہ پیش کرنا جو ''لباس درازیٔ عمر'' کہلاتا ہے، چینیوں کی نظر میں سعادت مندی اور ماں باپ سے محبت کی دلیل ہے۔ چوں کہ اس لباس سے اس کے مالک کی درازیٔ عمر مقصود ہوتی ہے اس لیے وہ اسے اکثر پہنتا رہتا ہے؛ خاص کر خوشی کے موقعوں پر تاکہ اس پر ان سنہری حروف کا پورا پورا اثر ہو جن سے اس کا وہ چغہ جھلملاتا رہتا ہے۔ بالخصوص اپنی سال گرہ پر وہ اسے پہننا کبھی نہیں بھولتا، اس لیے کہ اہل چین کے نزدیک عقل سلیم کی رو سے آدمی اس دن زندگی اور توانائی کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے، تاکہ سال بھر وہ اس دولت سے متمتع ہوتا رہے۔ یہ زرق برق چغہ زیب تن کیے اور اپنی ایک ایک مسام سے اس کی برکتوں کو جذب کرتے ہوئے، اس کا مالک بڑے

اطمینان اور دل جمعی سے دوستوں اور عزیزوں کی مبارک باد قبول کرتا ہے جو بڑے جوش و خروش سے اس شان دار کفن ، نیز اُن بچوں کی سعادت مندی پر تحسین و آفرین کرتے ہیں جنھوں نے اپنے والد کو اس قدر کارآمد تحفہ پیش کیا ہو ۔

مثلی اصول کی ایک اور عملی صورت چینیوں کے اس عقیدے میں نظر آتی ہے کہ کسی بستی کی شکل کا اس کی تقدیر پر گہرا اثر پڑتا ہے اور یہ کہ جس چیز سے کوئی بستی قریبی مشابہت رکھتی ہو ، اس کی خاصیت کے مطابق اس بستی کی تقدیر بدلتی رہتی ہے ۔ چناں چہ بیان کیا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں شہر ٹسیون چوفو پر جس کا نقشہ کارپ (ایک قسم کی مچھلی جو تالابوں میں پائی جاتی ہے)سے ملتا جلتا ہے ، اس کے ہمسایہ شہر ینگ چوفہ والے ، جس کی شکل مچھلی پکڑنے کے جالے سے ملتی جاتی ہے ، چڑھ آتے اور اسے لوٹ لیا کرتے تھے ۔ آخر اول الذکر شہر کے لوگوں نے اپنے بچاؤ کی یہ تدبیر سوچی کہ اس کے اندر مخروطی شکل کے اونچے اونچے مندر تعمیر کر لیے جائیں ۔ اس کے بعد یہ مندر ، جو آج تک ٹسیون چوفو میں کھڑے اپنی بلندی کا منظر پیش کرتے ہیں ، اس شہر پر برابر اپنی برکتیں نازل کرتے رہتے ہیں ، ان کی بدولت خیالی جال بالا ہی بالا رک جاتا ہے اور خیالی کارپ پر گر کر اسے پکڑ نہیں پاتا ۔ کوئی چالیس سال گزرے ، دانایان شنگھائی کو ایک مقامی بغاوت کا سبب معلوم کرنے کے لیے بہت سر کھپانا پڑا ۔ بڑی چھان بین کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ بغاوت کا سبب ایک نئے مندر کی وضع تھی جو تعمیر ہونے کے بعد بد قسمتی سے کچھوے جیسے بد ترین جانور کے مشابہہ ہو گیا تھا ۔ اب انھیں سخت مشکل کا سامنا تھا ؛ ایک طرف مندر کو ڈھانے سے اس کی بے حرمتی ہوتی تھی اور دوسری طرف اسے جوں کا توں قائم رکھنے سے اسی قسم کی یا اس سے بھی بد تر بغاوتوں کا اندیشہ تھا ۔ آخر اس آڑے وقت میں ماہرین رمل کی فراست کام آئی اور انھوں نے اس گتھی کو اس طرح سلجھا کر رکھ دیا کہ مندر کی بے حرمتی بھی نہ ہو اور بغاوتوں کا خطرہ بھی ٹل جائے ۔ انھوں نے مندر کے ان دو کنوؤں کو پاٹ کر جو کچھوے کی آنکھوں کی

مانند تھے ، اس بدنام اور نامراد جانور کو فوراً اندھا کر ڈالا تاکہ وہ آئندہ شر نہ پھیلا سکے۔ بعض وقت کسی برے شگون کو کالعدم کرنے کے لیے مثلی یا صوری سحر سے مدد لی جاتی ہے اور اس غرض سے وہ شگون جھوٹ موٹ پورا کر دیا جاتا ہے ۔ اس طرح اصل مصیبت کے بدلے نقلی مصیبت کے ذریعے تقدیر کو فریب دیا جاتا ہے ۔ مدغاسکر میں تقدیر کو دھوکا دینے کے اس طریقے نے ایک ضابطے کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ یہاں کے لوگوں کے عقیدے کے بہ موجب ہر شخص کا مقسوم اس کی پیدائش کے دن یا ساعت پر مبنی ہوتا ہے ۔ اگر یہ دن یا ساعت منحوس ہو تو گویا اس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکتا ہے ، البتہ قسمت کی خرابی کا مداوا صوری طور پر ممکن ہے اور اس کے مختلف طریقے ہیں ۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص برس کے دوسرے مہینے (فروری) میں پیدا ہو تو اس کے سن بلوغ کو پہنچتے وقت اس کے گھر کو آگ لگ جائے گی ۔ اس مصیبت کی پیش بندی کے لیے کسی کھیت میں چھپر ڈال کر یا باڑا بنا کر اسے جلا ڈالتے ہیں ۔ اس رسم کے خاطر خواہ اثر کے لیے شخص مذکور کی پیدائش کے وقت زچہ و بچہ دونوں کو اس چھپر میں رکھنا چاہیے اور پھر انہیں آگ میں سے جلتی ہوئی مشعلوں کی طرح کھینچ نکالنا چاہیے ۔ اس میں عجلت سے کام لینا ضروری ہے تاکہ ان دونوں کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے ۔ نیز نومبر ، جس میں ترشح ہوتا ہے ، آنسوؤں کا مہینہ ہے اور جو شخص اس مہینے میں جنم لیتا ہے ، اس کی زندگی غم و اندوہ سے پر ہوتی ہے ۔ لیکن غم کے ان بادلوں کو دور کرنے کے لیے جو اس بد نصیب کے مستقبل پر چھائے ہوتے ہیں ، اس کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ کسی پکتی ہنڈیا پر سے چپنی اٹھا کر اسے ادھر اُدھر گھما دے ۔ اس سے جو قطرے ٹپکیں گے ان سے شخص مذکور کی قسمت کا لکھا پورا ہو جائے گا اور اپنی آئندہ زندگی میں اسے اشک فشانی نہیں کرنی پڑے گی ۔ مزید بر ایں اگر کسی ناکتخدا لڑکی کی قسمت میں یہ لکھا ہو کہ اس کے نازائیدہ بچے اس کی آنکھوں کے سامنے خاک میں مل جائیں تو وہ اپنی اس مصیبت کو اس طرح دور کر سکتی ہے کہ دستور کے مطابق وہ ایک ٹڈا مار لاتی ہے اور

اسے ایک دھجی میں کفنا دیتی ہے ۔ اس کے بعد اس پر اس طرح بین کرنے لگتی ہے جیسے ریچل (انیسویں صدی کی ایک مشہور فرانسیسی اداکار) اپنے بچوں کے لیے گریہ و زاری کرتی ہو اور اسے کسی طرح صبر نہ آتا ہو ۔ نیز وہ دس بارہ یا اس بھی زیادہ اور ٹڈے پکڑ لاتی ہے اور ان کے پر اور ٹانگیں نکال کر انھیں مرے ہوئے ٹڈے کے برابر ڈال دیتی ہے ۔ ان اذیت رسیدہ کیڑوں کی بھنبھناہٹ اور ان کے کٹے پھٹے اعضا کی تڑپ کسی میت پر ماتم کرنے والوں کی آہ و بکا کی آئینہ دار ہوتی ہے ۔ مردہ ٹڈے کو دفن کرنے کے بعد وہ لڑکی باقی ٹڈوں کو آخری دم تک اپنا ماتم جاری رکھنے کے لیے وہیں چھوڑ دیتی ہے اور اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو باندھ کر ٹڈے کی قبر سے کسی سوگوار شخص کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے واپس آ جاتی ہے ۔ اس کے بعد وہ اس خیال میں مگن رہتی ہے کہ اس کے بچے اس کے جیتے جی نہیں مریں گے ، کیوں کہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ وہ ان کو دو دو مرتبہ روئے اور دفن کرے ۔ اس کے علاوہ ، اگر کسی شخص کی پیدائش پر قسمت اس سے روٹھی ہوئی ہو اور فلاکت و افلاس نے اسے اپنے لیے جن لیا ہو تو وہ اپنی بگڑی بڑی آسانی سے بنا سکتا ہے ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ڈیڑھ ڈیڑھ پینس کے دو جھوٹے موتی خرید لائے اور انھیں دفن کر ڈالے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح موتی پھینکنا دولت مندوں کے سوا کسی اور کے بس کی بات نہیں ۔

**(۳) سحر متعدی** — اب تک ہماری بحث کا موضوع سحر مشارک کی وہ شاخ تھی جسے سحر بالمثل یا صوری سحر کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے ۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ سحر کی اس قسم کا اصل الاصول یہ ہے کہ مثل سے مثل وجود میں آتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں نتا ئج اپنے اپنے اسباب کے مشابہ ہوتے ہیں ۔ سحر مشارک کی دوسری بڑی شاخ ، جسے میں نے سحر متعدی کہا ہے ، اس تصویر سے پیدا ہوتی ہے کہ ان چیزوں کے درمیان جو باہم مربوط رہی ہوں ، علیحدگی کے بعد بھی احساس کا ایسا رابطہ قائم رہتا ہے کہ ایک چیز پر جو کچھ گزرے گی وہی دوسری چیز کو پیش آئے گی ۔ اس طرح مثلی سحر کی مانند سحر متعدی

گی منطقی اساس بھی خیالات کے تلازم کا غلط تصور ہے ۔ اگر اس کی کوئی طبعی بنیاد ہو سکتی ہے تو وہ بھی سحر بالمثل کی طبعی بنیاد کی طرح ایک قسم کے مادی وسیلے سے عبارت ہے ۔ یہ مادی وسیلہ جدید طبیعیات کے ایتھر سے ملتا جلتا ہے ، اور اس کے متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ دور افتادہ اشیاء کے درمیان ایک رشتۂ اتحاد کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعے ایک شے کے تاثرات دوسری شے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں ۔ سحر متعدی کی سب سے مانوس صورت وہ سحری نسبت یا احساس کا اشتراک ہے جو عام خیال کے بموجب کسی شخص اور اس کے جسم کے منقطع اجزاء جیسے بال یا ناخن میں پایا جاتا ہے ۔ چناں چہ اسی سحری نسبت یا مشارکت کی بناء پر شخص مذکور کے بال یا ناخن جس کسی کے ہاتھ لگیں وہ دور سے اس کے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہے ۔ یہ توہم عالم‌گیر ہے اور بال اور ناخنوں سے متعلق اس کی مثالیں آگے نظر سے گزریں گی ۔

آسٹریلوی قبائل میں یہ دستور عام تھا کہ کسی لڑکے کی مونچھوں کی رسم میں جو بالغ آدمیوں کے حقوق و امتیازات حاصل کرنے سے پہلے ہر مرد پر واجب تھی ، اس کا اگلا دانت توڑ دیا جاتا تھا ۔ یہ راز نہ کھل سکا کہ اس دستور کا سبب کیا تھا ۔ یہاں ہمارا تعلق صرف اس عقیدے سے ہے کہ لڑکے اور اس کے اکھڑے ہوئے دانت کے درمیان ایک رشتۂ مشارکت برابر قائم رہتا ہے ۔ چناں چہ نیو ساؤتھ ویلز کے ان قبائل میں جو دریائے ڈارلنگ کے آس پاس آباد ہیں ، یہ ہوا کرتا تھا کہ لڑکے کے اس دانت کو کسی ندی یا کنوئیں کے قریب درخت کی چھال کے تلے دبا دیا جاتا تھا ۔ لڑکے کی خیریت اس میں تھی کہ وہ چھال سرسبز ہو جائے یا دانت پانی میں گر پڑے ۔ اگر چھال دانت پر سے ہٹ جاتی اور چیونٹیاں اس پر چلنے لگتیں تو یہ خیال کیا جاتا تھا کہ لڑکا کسی منہ کی بیماری میں مبتلا ہو جائے گا ۔ نیو ساؤتھ ویلز کے مرنگ اور دوسرے قبیلوں میں کسی لڑکے کے اکھڑے ہوئے دانت کی نگرانی سب سے پہلے کسی بوڑھے آدمی کے سپرد ہوتی تھی ، پھر وہ ایک سردار سے دوسرے سردار کے پاس پہنچتا اور اس طرح سارے قبیلے میں گھومتا گھامتا لڑکے

گے ماں باپ تک اور آخر میں خود اس لڑکے کے پاس واپس آجاتا۔ لیکن اس گردش کے دوران میں اسے کسی ایسے تھیلے میں رکھنے کی ممانعت تھی جس میں جادو کی چیزیں رکھی ہوں ، کیوں کہ ان کے عقیدے کی رو سے دانت والا لڑکا خطرے میں پڑ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ چند لڑکوں کی مونچھوں میں اس کے دانت نکالے گئے تو ڈاکٹر ہاوٹ آن جہانی نے ان کی حفاظت اپنے ذمے لے لی۔ ڈاکٹر کے پاس ایک تھیلے میں سنگ چینی کے کچھ ٹکڑے رکھے تھے۔ قبیلے کے بڑے بوڑھوں نے ، جنھیں اس بات کی خبر تھی ، ڈاکٹر موصوف سے التجا کی کہ وہ دانتوں کو اس تھیلے میں نہ رکھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ایسا کیا گیا تو ان پتھروں کا جادو دانتوں پر ہو جائے گا اور اس طرح دانت والے لڑکوں کو ضرر پہنچ جائے گا۔ اس رسم کے تقریباً سال بھر بعد قبیلہ مرنگ کا ایک سردار دانت واپس لینے کوئی ڈھائی سو میل کی مسافت طے کرکے ڈاکٹر ہاوٹ کے ہاں پہنچا۔ اس نے یہ بتایا کہ اسے دانت لینے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ دانت والے ایک لڑکے کی صحت خراب ہو گئی ہے اور خیال یہ ہے کہ اس کے دانت کو ضرور کوئی نقصان پہنچا ہے۔ اسے یقین دلایا گیا کہ ان دانتوں کو ایک صندوق میں بالکل علیحدہ رکھا گیا تھا اور انھیں سنگ چینی جیسی کسی ایسی چیز میں ملنے نہیں دیا گیا جس سے ان کے متاثر ہونے کا احتمال ہو۔ وہ شخص ان دانتوں کو لے کر جو بڑی احتیاط سے لپیٹے ہوئے تھے ، واپس چلا گیا۔

بسوتو (جنوبی افریقہ کی ایک قوم) اپنے اکھڑے ہوئے دانتوں کو بڑی احتیاط سے چھپا کر رکھتے ہیں تاکہ وہ اس خیالی مخلوق کے ہاتھ نہ لگنے پائیں جو قبروں میں بسیرا کرتی ہے اور جو اس پر جادو کرکے دانت والے آدمی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ کوئی چالیس سال ہوئے سیکس میں بچوں کے جھڑے ہوئے دانت پھینکے جا رہے تھے تو ایک خادمہ نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ دانت کسی جانور کو مل گئے اور اس نے اسے کتر ڈالا تو بچوں کے نئے دانت اسی جانور کے سے نکلیں گے۔ اس کے ثبوت میں اس نے بوڑھے ماسٹر سائمنز کا نام لیا ، جس کا ایک اوپر کا دانت سور کے دانت

کی طرح لمبا تھا۔ سائمنز یہ دعوے سے کہتا تھا کہ اس کا وہ عیب اس کی ماں کی غفلت کا نتیجہ تھا ، جس نے اس کا ایک جھڑا ہوا دانت سوروں کے چارے کی ناند میں ڈال دیا تھا۔ اسی قسم کے عقیدے سے وہ رواج پیدا ہوئے ہیں جن کا مقصد سحر کے مثلی نظریہ کی رو سے یہ ہے کہ پرانے دانتوں کی جگہ نئے اور بہتر دانت نکلیں۔ چناں چہ دنیا کے متعدد حصوں میں یہ دستور عام ہے کہ لوگ اپنے اکھڑے ہوئے دانت اس جگہ جہاں چوہے یا گھونس کا گزر ہو ، ڈال دیتے ہیں۔ انھیں یہ امید ہوتی ہے کہ اس احساس کے وسیلے سے جو دانت والے اور اس کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کے درمیان ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے ، اس کے دانتوں میں بھی ان دندان آور جانوروں کے دانتوں کی سی مضبوطی اور خوبی پیدا ہو۔ مثلاً جرمنوں میں یہ مقولہ ہر جگہ ضرب المثل ہے کہ دانت نکلواؤ تو اسے چوہے کے بل میں ڈال دو۔ اگر بچے کے دودھ کے دانت چوہے کے بل میں ڈال دیے جائیں تو اس کے دانتوں میں تکلیف نہ ہو گی ، یا آپ چولھے کے پیچھے چلے جائیے اور اپنے دانت کو سر پر سے پیچھے کی طرف پھینکتے ہوئے یہ الفاظ دھرائیے ''اے چوہے مجھے اپنا آہنی دانت دے تو میں تجھے اپنے ہڈی کے دانت دوں گا۔'' اس کے بعد آپ کے دوسرے دانت محفوظ رہیں گے۔ یورپ سے بہت دور بحرالکاہل میں وارا ٹونگا کے مقام پر جب کسی بچے کے دانت نکالے جاتے تھے تو چوہے سے یہ التجا کی جاتی تھی :

''بڑے چوہے ، چھوٹے چوہے ،
یہ رہا میرا پرانا دانت ،
تو مجھے نیا دانت بخش دے''

پھر اس دانت کو گھر کے چھپر پر پھینک دیا جاتا تھا اس لیے کہ بوسیدہ چھپر کو چوہوں کا مسکن سمجھا جاتا تھا۔ ان موقعوں پر چوہوں سے مدد مانگنے کی توجیہ یہ کی جاتی تھی کہ ان وارا ٹونگا والوں کو چوہے سے زیادہ مضبوط دانت والے کسی جانور کا علم نہ تھا۔

عام عقیدے کے بموجب جسم کے جن دوسرے حصوں کا اس سے

الگ ہونے کے بعد بھی رشتۂ مشارک برقرار رہتا ہے وہ ہیں نال اور غشائے جنین (یعنی وہ جھلی جس میں بچہ ملفوف ہوتا ہے) مع آنول کے۔ یہ رشتہ اس قدر گہرا سمجھا جاتا ہے کہ کسی شخص کی نیک بختی یا بد بختی کا دار و مدار گویا تمام زندگی ان میں سے کسی نہ کسی جزو پر ہوتا ہے۔ چناں چہ اگر اس کی نال یا جھلی کو اچھی طرح محفوظ رکھا جائے تو وہ خوب پھلے پھولے گا، لیکن اگر اس جزو کو نقصان پہنچے یا وہ گم ہو جائے تو اس کو مصیبت کا سامنا ہوگا۔ اس طرح مغربی آسٹریلیا کے بعض قبائل میں یہ خیال عام ہے کہ کسی شخص کا اچھا یا برا تیرنا اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی ماں نے اس کی نال پانی میں پھینکی ہے یا نہیں۔ کوئینز لینڈ (آسٹریلیا) کے دریائے پینے فادر کے قرب و جوار میں لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بچے کی روح کا ایک جزو (چوتھی) غشائے جنین میں رہ جاتا ہے، لہذا اس کی نانی اسے لے جا کر ریت میں دبا دیتی ہے اور نشانی کے طور پر اس کے ارد گرد، کسی درخت کی ٹہنیوں کے سرے باندھ کر انھیں دائرے کی شکل میں گاڑھ دیتی ہے۔ لیکن انجیا جو عورتوں کے رحم میں گیلی مٹی کے بچے رکھ کر ان کے حمل ٹھہراتا ہے، اس مقام پر آ پہنچتا ہے اور اس جھلی والی روح کو کسی درخت، چٹان کی کھوہ یا ساحل کے کنارے کسی جھیل میں نکال لے جاتا ہے جو اس کا مسکن ہے۔ یہاں وہ برسوں رکھی رہتی ہے لیکن کبھی نہ کبھی انجیا اسے پھر کسی بچے میں ڈال دیتا ہے اور اس صورت سے وہ دوبارہ جنم لے لیتی ہے۔ جزائر کیرولین (شمالی بحرالکاہل) کے ایک ٹاپو پوناپے کے لوگ نال کو کسی خول میں رکھ کر کچھ اس طرح ٹھکانے لگاتے ہیں کہ بچے میں اس کے ماں باپ کے منتخب کردہ پیشے کی زیادہ سے زیادہ اہلیت پیدا ہو۔ مثال کے طور پر وہ چاہیں کہ ان کا بچہ بڑا ہو کر ایک اچھا چڑھویا بنے تو وہ نال کو کسی درخت پر لٹکا دیں گے۔ جزیرۂ کائی کے رہنے والے نال کو بچے کی جنس کے لحاظ سے اس کا بھائی یا بہن تصور کرتے ہیں اور اسے ایک برتن میں رکھ کر جس میں راکھ بھری ہوتی ہے، کسی درخت کی ٹہنیوں میں جا دیتے ہیں، تاکہ وہ وہاں سے

اپنے ساتھی کی تقدیر کی خبر گیری کرتی رہے ۔ سوماٹرا کے باتکوں اور اسی طرح دوسرے جزائر ہند کے لوگوں میں آنول کو لڑکی کا چھوٹا بھائی یا لڑکی کی چھوٹی بہن سمجھا جاتا ہے اور اسے گھر کے نیچے گاڑھ دیا جاتا ہے ۔ باتکوں کے خیال میں اس سے بچے کی بھلائی وابستہ ہوتی ہے بلکہ حقیقت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے اس انتقال پذیر روح کا مرکز سمجھتے ہیں جس کی کیفیت آگے بیان کی جائے گی ۔ کارو نامی باتکوں کا تو یہاں تک دعویٰ ہے کہ آدمی کی دو روحیں ہوتی ہیں ، جن میں اصلی روح غشائے جنین کے ساتھ گھر کے نیچے رہتی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ یہی وہ روح ہے جو بچے پیدا کرتی ہے ۔

وسطی افریقہ کے باگنڈا لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص دنیا میں اپنا ایک ہم زاد لے کر آتا ہے اور یہ ہم زاد وہ جھلی ہے (غشائے جنین) جس میں ملفوف وہ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے ، اسے وہ لوگ دوسرا بچہ سمجھتے ہیں ۔ ماں اسے لے جا کر کسی کیلے کے درخت کے نیچے دبا آتی ہے اور وہ درخت جب تک اُس کے پھل پک کر کنبے کی ضیافت کا سامان نہ بن جائیں ، مقدس سمجھا جاتا ہے ۔ چرکیوں کے ہاں لڑکی کی نال اوکھلی کے پاس دبائی جاتی ہے تاکہ لڑکی بڑی ہو کر روٹی پکانے کے فن میں ماہر نکلے ، لیکن لڑکے کی نال کو کسی درخت پر ٹانگ دیا جاتا ہے تاکہ وہ شکاری بنے ۔ پیرو کے انکا نامی ریڈانڈینوں کے ہاں نال کو بڑی حفاظت سے رکھا جاتا ہے اور بچہ بیمار ہو تو اسے چوسنے کے لیے دیا جاتا ہے ۔ قدیم زمانے میں میکسیکو والے لڑکے کی نال سپاہیوں کو دیا کرتے تھے کہ وہ اسے لڑائی کے میدان میں دفن کر دیں ؛ اس سے لڑکے میں جنگ کا جزبہ پیدا کرنا مقصود تھا ، لیکن لڑکی کی نال گھر کے چولھے کے پاس دفن کی جاتی تھی ، کیوں کہ اس سے اُن کے نزدیک لڑکی میں گرہستن بننے اور پکانے کا شوق پیدا ہوتا ہے ۔

خود یورپ میں آج بھی بہت سے لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ بچے کا نصیب کم و بیش اُس کی نال (غشائے جنین) سے وابستہ ہوتا ہے ۔

چناں چہ بویریا کے رعائی علاقے میں نال کو کچھ دیر لیٹن کے پرانے ٹکڑے میں لپیٹ کر رکھا جاتا ہے اور پھر اسے لڑکے یا لڑکی کی مناسبت سے کاٹ یا چھید ڈالا جاتا ہے تاکہ لڑکا ہنر مند نکلے اور لڑکی ماہر سوزن کار۔ برلن میں عموماً دائی سوکھی ہوئی نال اس تاکید کے ساتھ بچے کے باپ کے حوالے کرتی ہے کہ وہ اسے احتیاط سے رکھے، اس لیے کہ جب تک وہ محفوظ ہوگی، بچہ پھلتا پھولتا اور تندرست رہے گا۔ باس اور پرش (فرانس) میں لوگ اس بات کی بڑی احتیاط رکھتے ہیں کہ نال پانی یا آگ میں نہ پھنکنے پائے۔ ان کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ اگر ایسا ہوا تو بچہ غرق ہو جائے گا یا جل جائے گا۔

اس طرح دنیا کے متعدد حصوں میں نال اور اس سے بڑھ کر غشائے جنین کو ایک ذی روح چیز، بچے کا بھائی یا بہن یا ایسی مادی شے خیال کیا جاتا ہے جو اس کی محافظ روح کا مسکن ہو۔ نیز عام خیال کے بموجب جو رشتۂ مشارکت کسی شخص اور اس کی نال یا غشائے جنین کے درمیان قائم رہتا ہے اس کی نمایاں مثال غشائے جنین یا نال کو مذکورہ بالا ایسے طریقوں سے ٹھکانے لگانے کے عام دستور سے ملتی ہے جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی شخص کی سیرت و شعار پر زندگی بھر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں، یعنی لڑکا ہو تو ان طریقوں کے اختیار کرنے سے پھرتیلا چڑھویا، قوی تیراک، ماہر شکاری یا بہادر سپاہی نکلے گا اور لڑکی ہو تو سینے اور پکانے کی ماہر۔ اس طرح غشائے جنین یا آنول اور کسی حد تک نال سے متعلق عقائد و رواج انتقال پذیر یا خارجی روح کے اس نظریے اور اس پر مبنی ان رسوم کی عجیب و غریب نظیر پیش کرتے ہیں جو دنیا میں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ لہذا یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ان میں جو مماثلت ملتی ہے وہ محض اتفاق کی بات نہیں، بلکہ غشائے جنین یا آنول اصل میں نظریۂ روح خارجی اور اس نظریے کی بناء پر جو رواج وجود میں آئے ہیں، ان کی ایک طبعی بنیاد ہے (گو ان کی یہی ایک بنیاد نہ سہی)۔ اس موضوع کو ہم نے کسی

آئندہ باب کے لیے اٹھا رکھا ہے۔

نظریۂ سحر متعدی کی ایک عجیب عملی صورت اس تعلق میں نظر آتی ہے جو عام عقیدے کے بموجب کسی زخم خوردہ شخص اور زخم لگانے والے شخص یا چیز کے درمیان پایا جاتا ہے، اور جس کی بناء پر زخم لگنے کے بعد مؤخر الذکر جو کچھ کرتا ہے یا اس کے ساتھ جو کچھ کیا جاتا ہے اس کا ویسا ہی اثر زخمی پر مرتب ہوتا ہے۔ چناں چہ پلینی کا کہنا ہے کہ اگر آپ کے ہاتھوں کوئی شخص زخمی ہوا ہو اور آپ اپنے اس فعل پر نادم ہوں تو اس کی تلافی کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ آپ اپنے اس ہاتھ پر تھوک دیجیے جس سے زخم لگا ہو۔ اس عمل سے فی الفور اس شخص کی تکلیف کم ہو جائے گی۔ ملینیشیا میں اگر کسی شخص کے دوستوں کے ہاتھ وہ تیر لگ جائے جس سے وہ زخمی ہوا ہو تو وہ اسے کسی مرطوب مقام پر یا ٹھنڈے پتوں میں رکھ دیتے ہیں۔ اس سے زخم میں سوجن زیادہ نہیں ہونے پائے گی اور جلد اتر جائے گی۔ اس دوران میں دشمن جس نے تیر مارا ہو، اس کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ زخم کی شدت بڑھے۔ اس غرض سے وہ اور اس کے ساتھی گرم گرم عرق پیتے ہیں اور سوزش پیدا کرنے والے پتے چباتے ہیں، کیوں کہ ایسا کرنے سے زخم میں سوزش ہوگی اور وہ سوج جائے گا۔ اس کے علاوہ جس کمان سے تیر چلایا گیا ہو اسے آگ کے قریب رکھ دیا جاتا ہے تاکہ زخم میں جلن ہو۔ اسی وجہ سے اگر تیر انہیں واپس مل جائے تو اس کی انی کو آگ میں رکھ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی کمان کی تانت بھی ضرور تنی رکھتے ہیں اور گاہے گاہے اسے بجاتے جاتے ہیں تاکہ زخمی کے اعصاب میں اینٹھن اور کزاز کا سا تشنج پیدا ہوتا رہے۔ لیکن کہتا ہے ''یہ امر ہمیشہ سے مسلّم چلا آتا ہے کہ جس ہتھیار کا گھاؤ لگے اس پر مرہم ملنے سے گھاؤ اچھا ہو جاتا ہے۔ معتبر آدمیوں کے بیان کے بہ موجب (گو میں ابھی تک اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں) اس تجربے میں آپ کو حسب ذیل

باتیں ملحوظ رکھنی ہوں گی : اول یہ کہ وہ مرہم جس سے تجربۂ مذکورہ عمل میں آئے ، مختلف اجزاء کا مرکب ہو ۔ ان میں سب سے عجیب اور نایاب ایسے مردے کی کھوپری پر جمی ہوئی کائی ہے جسے دفن نہ کیا گیا ہو اور اس جنگلی سور یا ریچھنی کی چربی جسے بچے دیتے میں مارا گیا ہو ۔'' وہ بیش بہا مرہم جس کی ترکیب میں یہ اور دوسرے اجزاء شامل ہوتے ہیں ، اس فلسفی کے بیان کے بہ موجب زخم پر نہیں بلکہ ہتھیار پر لگایا جاتا ہے ، خواہ وہ زخمی اس عمل سے بالکل بے خبر کہیں دور کیوں نہ پڑا ہوا ہو ۔ وہ کہتا ہے کہ اس نسخے کو یوں آزمایا گیا کہ زخم خوردہ شخص کی لاعلمی میں ہتھیار پر سے مرہم پونچھ دیا گیا ، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذرا سی دیر میں وہ بلبلانے لگا اور جب تک ہتھیار پر دوبارہ مرہم نہ مل دیا گیا اس کی تکلیف کم نہ ہوئی ۔ نیز بیکن ہی کے الفاظ میں ''یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اگر اصل ہتھیار ہاتھ نہ آئے تو اس سے ملتے جلتے کسی آہنی یا چوبی اوزار کو زخم میں اس طرح چبھو دیا جائے کہ اس سے خون جاری ہو جائے اور پھر اس اوزار پر مرہم مل دیا جائے تو مقصد پورا ہو جائے گا ۔'' اس قسم کے علاج معالجے جو بیکن کے نزدیک قابل اعتنا تھے ، انگلستان کی مشرقی کاونٹیوں میں اب بھی ہوتے ہیں ۔ چناں چہ سفولک میں اگر گنڈاسے یا درانتی سے کسی شخص کے خراش آ جائے تو وہ اسے چمکا کے رکھتا ہے ، اور اس پر تیل ملتا ہے تاکہ زخم پکنے نہ پائے ۔ اگر اس کے ہاتھ میں کانٹا چبھ جائے تو وہ اسے نکال کر اس پر تیل یا چکنائی مل دیتا ہے ۔ ایک آدمی جس کے ہاتھ میں باڑھ کاٹتے وقت کانٹا چبھ گیا تھا اور اس کی وجہ سے وہ سوج رہا تھا ، ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچا ۔ جب اس سے کہا گیا کہ اس کے ہاتھ میں پیپ پڑ گئی ہے تو اس نے جواب میں کہا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے ، میں نے تو کانٹا نکال کر اس پر اچھی طرح چکنائی لگا دی تھی!'' اگر کسی گھوڑے کا پاؤں کیل پر پڑنے سے زخمی ہو جائے تو سفولک کا سائیس اس کیل

کو محفوظ رکھتا ہے اور اسے صاف کرکے اس پر چکنائی ملتا ہے تاکہ گھوڑے کا پاؤں پکنے نہ پائے۔ اسی طرح کیمبرج شائر کے مزدوروں کا خیال ہے کہ اگر کسی گھوڑے کے پاؤں میں کیل چبھ جائے تو اس پر تیل یا سور کی چربی مل کر اسے کسی محفوظ مقام پر رکھ دینا چاہیے ورنہ گھوڑے کا زخم اچھا نہ ہوگا۔ چند سال ہوئے ایک گھوڑے کا بازو کسی کھیت کے پھاٹک کے کھمبے میں لگے ہوئے قلابے سے چر گیا۔ اسے دیکھنے کے لیے ایک بیطار کو بلایا گیا۔ وہ کھیت پر پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ زخمی گھوڑے کو تو یوں ہی چھوڑ دیا گیا ہے اور ایک شخص بیرم لیے پھاٹک کے کھمبے سے قلابے نکالنے میں مصروف ہے، تاکہ اس پر چکنائی مل کر اسے الگ رکھ دیا جائے، کیوں کہ اس عمل سے خردمندان کیمبرج کے نزدیک گھوڑے کو جلد شفا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایسیکس کے دیہاتیوں کی رائے میں اگر کسی شخص کے چاقو مارا گیا ہو تو اس کے اچھا ہونے کے لیے یہ انتہا درجے ضروری ہے کہ چاقو پر چکنائی مل کر اسے مریض کے بستر پر رکھ دیا جائے۔ بویریا میں اگر کوئی کلہاڑی سے گھائل ہو جائے تو اسے یہ ترکیب بتائی جاتی ہے کہ لینن کی دھجی پر چربی چپڑ کر اسے کلہاڑی کی دھار پر باندھ دیا جائے اور کلہاڑی کو اس طرح رکھا جائے کہ اس کی دھار اوپر کی طرف ہو۔ جوں جوں اس کی دھار سوکھتی جائے گی گھاؤ مندمل ہوتا جائے گا۔ ہارٹس کی پہاڑیوں (جرمنی) میں رہنے والوں کا قول ہے کہ اگر آپ کے کسی چاقو یا قینچی سے خراش آ جائے تو آپ اس پر چربی ملیے اور اسے خدا، مسیح اور روح القدس کا نام لے کر کسی خشک جگہ رکھ دیجیے۔ اس چاقو یا قینچی کے سوکھنے کے ساتھ ساتھ آپ کا زخم بھر آئے گا۔ جرمنی کے دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ آپ چاقو کو کسی مرطوب جگہ گاڑھ دیجیے۔ جیسے جیسے اس پر زنگ لگتا جائے گا آپ کا زخم مندمل ہوتا جائے گا۔ اور بویریا میں کلہاڑی یا جس چیز سے بھی زخم آئے اس پر لہو مل کر اولتی کے نیچے رکھنے کا

مشورہ دیا جاتا ہے۔

اس انداز فکر کو جو اس طرح ملینیشیا اور امریکہ کی غیر مہذب اقوام کے ساتھ ساتھ جرمن اور انگریز دیہاتیوں میں مقبول ہے، وسطی آسٹریلیا کے وحشیوں نے کچھ اور ترقی دی ہے۔ ان کے خیال کے بہ موجب بعض حالات میں کسی زخمی کے قریبی رشتہ داروں کو اپنے آپ پر چکنائی ملنی، غذا محدود کرنی اور اپنے آپ پر دوسری پابندیاں عائد کرنی لازمی ہیں تاکہ اس شخص کو یقینی طور پر صحت ہو۔ چناں چہ جب کسی بچے کی ختنہ ہوتی ہے تو اس کے زخم کے بھرنے تک اس کی ماں کو اپوسم (ایک قسم کا جانور) ایک خاص قسم کی چھپکلی، کارپیٹ سانپ (آسٹریلیا کا رنگین سانپ) اور کسی قسم کی چکنائی کھانے کی اجازت نہیں، ورنہ بچے کا زخم اچھا ہونے میں دیر لگے گی۔ وہ ہر روز اپنی ان لکڑیوں پر چکنائی ملتی ہے جن سے وہ کھدائی کرتی ہے اور انھیں اپنی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ رات کو وہ انھیں اپنے سرھانے رکھ کر سوتی ہے۔ کوئی شخص اس کی ان لکڑیوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ نیز وہ روز اپنے بدن پر چربی ملتی ہے اس لیے کہ عام عقیدے کی رو سے یہ عمل کسی نہ کسی طرح اس کے بیٹے کی صحت یابی میں ضرور ممد ہوتا ہے۔ اسی اصول پر جرمنی کے کسان نے اپنی اپج سے ایک اور باریکی پیدا کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بویریا کے رہائشی علاقہ اور ہیس کے کسی کاشت کار کے سور کی ٹانگ ٹوٹ جائے تو وہ کرسی کے ایک پائے پر اس طرح پٹیاں اور کھپچیاں باندھ دیتا ہے جیسے وہ مجروح ٹانگ ہو۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک اس کی احتیاط رکھی جاتی ہے کہ کوئی اس کرسی پر بیٹھنے، اسے ہلانے جلانے یا اس سے ٹکرانے نہ پائے، اس لیے کہ ایسا کرنے سے زخمی سور یا بھیڑ کو تکلیف ہوگی اور اس کے زخم کے مندمل ہونے میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اس آخری صورت کا سحر متعدی سے کوئی تعلق نہیں، وہ صریح مثلی سحر کی ایک مثال ہے۔ ظاہر ہے کہ کرسی کے پائے سے جسے مجروح جانور کی ٹانگ سمجھ لیا جاتا ہے، کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اس پر جو پٹیاں باندھی جاتی ہیں وہ

محض عمل جراحی کی نقل ہے ۔

کسی زخم خوردہ آدمی اور اس ہتھیار کے درمیان جس سے اسے چوٹ آئی ہو ، فرضی رشتۂ مشارکت پر جاہل اقوام کے اعتقاد کی بناء غالباً یہ خیال ہے کہ جسم کے خون اور ہتھیار پر لگے ہوئے خون میں احساس کا اشتراک قائم رہتا ہے ۔ کچھ ایسے ہی خیال کی بناء پر نیوگنی سے پرے جزیرہ ٹیومیلو کی پاپوا قوم کے لوگ ان خون آلود پٹیوں کو جو زخموں پر باندھی گئی ہوں ، بڑی احتیاط سے سمندر میں پھینک دیتے ہیں ، کیوں کہ انھیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ اگر وہ دھجیاں کسی دشمن کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ ان پر جادو کر کے ان لوگوں کو نقصان پہنچا دے گا ۔ ایک دفعہ ایک شخص نے جس کے منہ میں زخم تھا اور اس سے لہو بہہ رہا تھا ، علاج کے لیے ایک عیسائی مشن سے رجوع کیا تو اس کی باوفا بیوی نے بڑی محنت سے اس کا سارا لہو اکٹھا کرکے سمندر میں بہا دیا ۔ یہ خیال ہمیں نہایت غیر فطری اور مبالغہ آمیز معلوم ہوگا لیکن اس سے بھی زیادہ غیر فطری اور دور از حقیقت یہ عقیدہ ہے کہ کسی شخص اور اس کے لباس کے درمیان احساس کا ایک سحری رابطہ قائم رہتا ہے اور اس لیے لباس کے ساتھ جو کچھ کیا جائے گا اس کا احساس خود شخص مذکور کو ہوگا خواہ وہ اس وقت کتنی ہی دور کیوں نہ ہو ۔ چناں چہ وکٹوریا (آسٹریلیا) کے واٹجو بالوک نام کے قبیلے میں بعض وقت جادوگر کسی شخص کی اپوسمی پوست (ایک قسم کے جانور کی کھال جو لباس کے طور پر استعمال کی جاتی ہے) لے کر اسے آہستہ آہستہ آگ میں بھونتا تھا جس کے اثر سے پوست کا مالک بیمار پڑ جاتا ۔ اگر جادوگر کو اس سحر کا رد کرنا منظور ہوتا تو وہ پوست کو بیمار کے دوستوں کے حوالے کر دیتا ، اور انھیں یہ ہدایت کرتا کہ وہ اسے پانی میں رکھ کر اس کی آگ دھو ڈالیں ۔ اس عمل سے سحر زدہ شخص ایک تازگی محسوس کرنے لگتا اور شاید اسے صحت ہو جاتی ۔ نیوہیبریڈیز (جزائر جو . ر الکاہل میں واقع ہیں) کے ایک جزیرے میں اگر کوئی شخص اپنے دشمن کی موت کا خواہاں ہو تو وہ کسی

ایسے کپڑے پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جسے اُس کے دشمن کا پسینہ لگا ہو ۔ اگر ایسا کپڑا اُس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اُس کو ایک خاص شجر کے پتوں اور ٹہنیوں سے رگڑتا اور پھر اُس کپڑے سے پتوں اور ٹہنیوں کو باندھ کر اُن کی ایک انگوچھے کی شکل کی گٹھڑی بناتا اور اُسے آہستہ آہستہ جلا ڈالتا ۔ اس گٹھڑی کے جلنے کے ساتھ اُس کا دشمن بیمار پڑ جاتا اور جب وہ جل کر خاک ہو جاتی تو دشمن کا بھی خاتمہ ہو جاتا ۔ تاہم اس آخری صورت میں یہ خیال قرین صحت ہوگا کہ سحری نسبت آدمی اور اُس کے پسینے میں پائی جاتی ہے ، نہ کپڑے میں ۔ لیکن اسی قسم کی دوسری صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ جادوگر کو اپنے شکار پر گرفت حاصل کرنے کے لیے اُس کا صرف لباس کافی ہے ۔ چناں چہ تھیوکرٹیس کے ہاں (تیسری صدی قبل مسیح کا عظیم یونانی شاعر جس سے یورپی ادب میں پیسٹورل شاعری کی روایت چلی ہے) ایک جادوگرنی موم کی پتلی یا ٹکڑا اس غرض سے پگھلاتی ہے کہ اُس کا بےوفا عاشق اُس کی محبت میں گھلتا رہے ۔ اپنی اس کارروائی میں وہ اپنے عاشق کے چغے کی اُس دھجی کو آگ میں ڈالنا نہیں بھولتی جو اس کے گھر میں رہ جاتی ہے ۔ پروشیا میں لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر آپ سے چور نہ پکڑا جائے تو آپ کے لیے سب سے بہتر چارۂ کار یہ ہے کہ بھاگتے میں وہ اپنا جو کپڑا چھوڑ گیا ہو اُسے خوب پیٹیے ۔ اس عقیدے نے عوام کے ذہن میں جڑ پکڑ لی ہے ۔ کوئی اسی (۸۰) سال ہوئے ہیرنیڈ کے نواح میں ایک آدمی شہد چراتا ہوا دیکھا گیا لیکن بھاگ نکلا اور کوٹ پیچھے چھوڑ گیا ۔ جب اُسے پتہ چلا کہ شہد والا اُس کے کوٹ کے پرخچے اڑا رہا ہے تو وہ ایسا گھبرایا کہ بستر پر لیٹ گیا اور راہیٔ ملک عدم ہوا ۔

اس کے علاوہ مشارکت کی بناء پر جادو کسی شخص کے کپڑوں یا منقطع اجزاء کے ذریعے نہیں بلکہ اُس کے جسم کے اُن نشانات کی وساطت سے بھی کیا جا سکتا ہے جو زمین یا ریت پر مرتسم ہوں ۔ خاص طور پر یہ توہم ساری دنیا میں پایا جاتا ہے کہ کسی

شخص کے پاؤں کے نشانات کو ضرر پہنچانے سے اُس کے پاؤں کو گزند پہنچ سکتا ہے۔ چناں چہ جنوب مشرقی آسٹریلیا کے دیسی باشندے سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے پاؤں کے نشانات پر سنگ چینی کے نوک دار ٹکڑے، شیشے کے ریزے، ہڈی یا کوئلہ رکھ کر اُسے لنگڑا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اکثر گٹھیا کے دردوں کا سبب اسی کو سمجھتے ہیں۔ مسٹر ہاوٹ نے ٹاٹنگالنگ نامی قبیلے کے ایک آدمی کو لنگ کرتا دیکھ کر اُس سے اس کا سبب پوچھا۔ اس نے جواب میں کہا ''کسی نے میرے پاؤں میں شیشہ رکھ دیا ہے۔'' اُسے اصل میں گٹھیا کی تکلیف تھی مگر وہ اس وہم میں مبتلا تھا کہ کسی دشمن کو اُس راستے کا پتا چل گیا جس سے وہ گزرا تھا اور اُس دشمن نے اُس کے پاؤں کے نشانات پر شیشے کا ٹکڑا رکھ دیا جس کا اثر اُس کے پاؤں میں سرایت کر گیا۔

اسی قسم کے عمل یورپ کے مختلف حصوں میں رائج ہیں؛ چناں چہ میکلن برگ میں لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر کسی کے نقش پا پر کیل گاڑ دی جائے تو وہ لنگڑا ہو جائے گا۔ بعض صورتوں میں شرط یہ ہوتی ہے کہ اس طرح جو کیل گاڑی جائے وہ کسی تابوت سے نکالی گئی ہو۔ دشمن کو گزند پہنچانے کا ایسا ہی طریقہ فرانس کے بعض علاقوں میں رائج ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک ضعیفہ جو ساحرہ تھی، اسٹو واقع سفولک میں اکثر آتی رہتی تھی۔ اگر کوئی شخص اُس کے پیچھے پیچھے چلتا اور اس کے پاؤں کے نشان پر چاقو یا کیل پیوست کر دیتا تو وہ ایک قدم نہ چل پاتی، تاوقتیکہ اُسے نکال نہ لیا جاتا۔ جنوبی سلافیوں میں اگر کوئی لڑکی کسی کو اپنا دل دے بیٹھی ہو تو وہ اپنے محبوب کے نقش پا کی مٹی کھود لائے گی اور اسے گل دان میں بھر کر اس میں گیندے کا پودا لگا دے گی، جسے سدا بہار سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح اس پودے کی سنہری کلیوں پر جوبن آتا ہے اور سدا قائم رہتا ہے اسی طرح اس کے پیارے کے دل میں اس کی محبت پھلے پھولے گی اور کبھی نہیں مٹے گی۔ اس صورت سے گویا محبت کا جادو محبوب کے دل پر اس کے نقش پا کی خاک

کے ذریعے اثر کرتا ہے ۔ کسی شخص اور اس کے پاؤں کے نشان کے درمیان رشتۂ مشارکت کے اسی تصور پر ڈینمارک میں معاہدہ کرنے کا ایک قدیم دستور مبنی ہے ۔ اس میں فریقین اپنا خون ایک دوسرے کے پاؤں کے نشانات پر چھڑک کر پیمان وفا کرتے ہیں ۔ قدیم زمانے میں اہل یونان اسی قسم کے توہمات میں مبتلا رہے ہوں گے ، چناں چہ ان کا خیال تھا کہ اگر گھوڑا اس راستے پر چلے جس سے بھیڑیا گزرا ہو تو اس کے اعضا سن ہو کر رہ جائیں گے اور ایک مقولے کے بہ موجب ، جو پائی تھا گورس (حکیم فیثا غورث) سے منسوب کیا جاتا تھا ، کسی آدمی کے پاؤں کے نشانات پر کیل یا چاقو گاڑنا ممنوع تھا ۔

یہی بے بنیاد عقیدہ دنیا کے مختلف حصوں میں شکاریوں کا بھی ہے جس کی بناء پر وہ اپنے شکار کا کھوج لگانے کی تدبیریں کرتے ہیں ۔ چناں چہ جرمن شکاری اس راستے پر تابوت سے نکالی ہوئی کیل ٹھونک دیتا ہے جس پر شکار کے گزرنے کے تازہ نشانات ملے ہوں ۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس تدبیر سے شکار بچ کر نکلنے نہیں پائے گا ۔ وکٹوریا کے اصلی باشندے جس جانور کا تعاقب کرتے ہیں اس کے پیچھے راستے پر انگارے بچھا دیتے ہیں ۔ ہاٹن ٹاٹ قبیلے کے شکاری اس جگہ سے جہاں شکار نے اپنے پاؤں کے نشانات چھوڑے ہوں مٹھی بھر خاک لے کر ہوا میں اڑا دیتے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے شکار کو جا لیں گے ۔ تھامپسن نام کے ریڈ انڈین اس راستے پر جس سے زخمی ہرن گزرا ہو ، گنڈے فلیتے رکھ دیا کرتے تھے ۔ اس کے بعد وہ اس دن شکار کا تعاقب غیر ضروری سمجھتے ، اس لیے کہ وہ اس طرح مسحور ہو کر زیادہ دور نہیں جانے پاتا اور جلد مر جاتا ہے ۔ اسی طرح آجبوے نام کے ریڈ انڈینوں کو جو پہلا ریچھ یا ہرن دکھائی دیتا وہ اس کے راستے پر نیر نجات رکھ دیتے ۔ اس کارروائی سے وہ جانور جلد ان کے سامنے آ جاتا ، چاہے اسے تین دن کی مسافت کیوں نہ طے کرنی پڑتی ، اس لیے کہ انِ نیر نجات کے اثر سے دنوں کا فاصلہ گھٹ کر چند گھنٹوں میں

طے ہو جاتا تھا - مغربی افریقہ کے بھیڑ کے شکاری اپنے شکار کے پاؤں کے نشانات پر نوک دار لکڑی چبھو دیتے ہیں تاکہ اسے لنگڑا کرکے جا لیں -

اگرچہ جسم کے نشانات میں سب سے نمایاں چیز نقش پا ہے ، لیکن جادو میں جسم کے صرف اسی ایک نقش پر اکتفا نہیں کی گئی ہے - چناں چہ جنوب مشرقی آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کا یہ اعتقاد تھا کہ لیٹنے سے آدمی کے جسم کا جو نشان پڑتا ہے اس پر سنگ چینی ، شیشے وغیرہ کے ریزے رکھ کر اسے گزند پہنچایا جا سکتا ہے ، کیوں کہ ان تیز اور نوک دار چیزوں کا سحری اثر اس کے جسم میں سرایت کر جاتا ہے اور اس سے درد کے وہ شدید دورے پڑتے ہیں جسے یورپ کا جاہل وجع مفاصل پر محمول کرتا ہے - اس مثال سے پائی تھاگورس کے پیروؤں کا یہ قول سمجھ میں آ جاتا ہے کہ بستر سے اٹھو تو چادر کی شکنیں دور کر دو - یہ دستور محض سحر سے بچاؤ کی ایک قدیم صورت اور اس ضابطۂ عمل کا محض ایک جزو تھا جسے قدماء پائی تھاگورس سے منسوب کرتے تھے ، گو اس حکیم سے بہت پہلے اہل یونان کے غیر مہذب اسلاف اس سے یقیناً واقف تھے -

(۴) ساحری کا ارتقاء — ہم نے سحر مشارک کے اصول کی جو تحقیقات شروع کی تھی وہ مکمل ہو چکی - ان اصول کی توضیح میں پیش کردہ بیشتر مثالیں جادو کے اس عنصر سے ماخوذ ہیں جسے ذاتی سحر کہا جا سکتا ہے، یعنی ان سحری رسوم اور عملیات سے جن کی غرض و غایت افراد کی منفعت یا مضرت ہو - لیکن اس کے علاوہ غیر مہذب معاشرے میں ایسا جادو بھی عام طور پر پایا جاتا ہے جسے سحر عامہ کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے ، یعنی وہ جادو جس سے اجتماعی بھلائی مقصود ہو - جہاں کہیں اجتماعی نوعیت کی ایسی فلاحی رسمیں جاری ہوں ، وہاں ظاہر ہے کہ ساحر محض ایک نجی عامل نہیں رہتا بلکہ کسی حد تک اسے قومی یا پیشہ ورانہ حیثیت حاصل ہوتی ہے - قومی

عاملوں کے اس قسم کے طبقے کی نشو و نما معاشرے کے سیاسی اور مذہبی ارتقاء میں بڑی اہمیت رکھتی ہے ، اس لیے کہ جب قبیلے کی بھلائی ان رسوم کے ادا کیے جانے پر منحصر سمجھ لی جائے تو ساحر کو بڑا اثر ورسوخ اور شہرت حاصل ہو جاتی ہے اور اسے سردار یا بادشاہ کے رتبہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ۔ چناں چہ اس پیشہ کی طرف قبیلے کے بعض قابل ترین اور اولوالعزم افراد کھنچے چلے آتے ہیں ، کیوں کہ وہ ان کی آیندہ عزت ، تمول اور اقتدار کا آئینہ دار ہوتا ہے جو انھیں کسی اور پیشے میں نظر نہیں آتا ۔ جو لوگ ذہین و فطین ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اپنے ناقص العقل ساتھیوں کو بے وقوف بنانا اور ان کے توہمات سے فائدہ اٹھانا کس قدر آسان ہے ۔ بات یہ نہیں کہ ہر جادوگر عیار اور فریبی ہوتا ہے بلکہ وہ دل سے اس بات کا قائل ہوتا ہے کہ وہ واقعی ان تمام محیر العقل قوتوں کا حامل ہے جو اس کے سادہ لوح ساتھی اس کی ذات سے منسوب کرتے ہیں ۔ لیکن وہ جس قدر دانش مند ہوگا اسی قدر اس پر ان غلط فہمیوں کے روشن ہونے کا امکان زیادہ ہوگا جن کی بناء پر کودن لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں ۔ لہذا اس پیشے کو اختیار کرنے والوں میں قابل ترین افراد کا دانستہ فریب سے کام لینا لازمی ہے ، اور یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بدولت معاشرے میں سب سے اونچا مقام حاصل کر لیتے ہیں اور معزز منصب اعلیٰ پر فائز ہو جاتے ہیں ۔ بات در اصل یہ ہے کہ پیشہ ور جادوگر کی جان غضب میں ہوتی ہے اور عام طور پر وہی شخص خطرات سے بچ نکلنے کے قابل ہوتا ہے جو انتہا درجہ ذہین اور صابر ہو ۔ اس ضمن میں یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ساحر کا ہر قول اور ہر دعویٰ بے بنیاد ہوتا ہے اور دانستہ یا نادانستہ فریب کاری کے بغیر سنوایا نہیں جا سکتا ۔ لہذا کسی فریب کار ساحر کی بہ نسبت ایسا ساحر جسے اپنے لاف وگزاف کی صحت پر یقین ہو ، زیادہ خطرے میں ہوتا ہے اور کسی وقت بھی اس کی پول کھل سکتی ہے اور کھیل بگڑ سکتا

ہے ۔ اس قسم کے دیانت دار ساحر کو ہمیشہ یہ امید ہوتی ہے کہ اس کے سحر اور عملیات کا خاطر خواہ نتیجہ ضرور برآمد ہوگا لیکن اس کی یہ امید کبھی پوری نہیں ہوتی ، بلکہ اسے اکثر بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور وہ بھونچکا سا رہ جاتا ہے ۔ اس کے پاس اس ناکامی کی توجیہ کے لیے اپنے فریبی رفیق کار کی طرح کوئی عذر تیار نہیں ہوتا اور قبل اس کے کہ وہ اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نکالے اس کے مایوس اور خشمگیں آقا کے ہاتھوں اس کا سر سلامت نہیں رہتا ۔

معاشرے کے ارتقاء کے اس مرحلے پر عنان اقتدار عموماً ان لوگوں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے جو نہ صرف ذہانت کے اعتبار سے سب پر فوقیت رکھتے ہیں بلکہ بے اصولی اور بد دیانتی میں بھی ان کا کوئی ہم سر نہیں ہوتا ۔ معاشرے کو اس قسم کے لوگوں کے مکر و فریب سے جو نقصان پہنچے ہیں ان کا موازنہ ان کی دانش مندی کی برکتوں سے کیا جائے تو ان کی بھلائی کا پلا بھاری نکلے گا ، کیوں کہ دنیا میں ذہین بدمعاشوں سے کہیں زیادہ دیانت دار احمقوں نے بام عروج پر پہنچ کر شر پھیلایا ہے ۔ ایک دفعہ عقل مند بدمعاش کی ہوس عز و جاہ پوری ہو جائے اور وہ عروج حاصل کر لے تو پھر اس کا کوئی ذاتی مفاد باقی نہیں رہتا اور وہ اکثر اپنی ذہانت ، تجربات اور وسائل خدمت خلق کے لیے بروئے کار لاتا ہے ۔ ایسے بہت سے لوگوں کی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے طاقت حاصل کرنے میں اخلاقی تقاضوں کی کوئی پروا نہیں کی ، لیکن جب انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تو انھی نے اس طاقت سے ، خواہ اس کی نوعیت سیاسی ، اقتصادی یا کچھ ہی رہی ہو ، سب سے زیادہ فلاحی کام لیے ۔ سیاسیات کے میدان کار زار میں دغا باز ، سازشی اور سنگ دل فاتح آخر میں دانا اور کریم النفس حکمران بن جاتا ہے ۔ جب تک وہ جیتا ہے لوگ اسے آنکھوں پر بٹھاتے ہیں ، مرنے پر اس کا سوگ منایا جاتا ہے اور آنے والی نسلیں اس کے گن گاتی ہیں ۔ ایسے ہی دو آدمی جولیس سیزر اور آگسٹس (روم کا پہلا شہنشاہ) تھے ۔ لیکن احمق سدا احمق رہتا ہے اور اس کا اقتدار جس قدر بڑھتا ہے اسی قدر وہ اس کے استعمال سے تباہی مچاتا ہے ۔

انگلستان کی تاریخ میں سب سے بڑی آفت امریکہ کی علحیدگی تھی اور یہ آفت کبھی نہ آتی اگر اس وقت جارج سوم جیسا راست باز بیوقوف بادشاہ نہ ہوتا ۔

اس طرح جہاں تک غیر مہذب معاشرے کی تشکیل میں پیشۂ ساحری کا حصہ رہا ہے ، اس کی بدولت امور عامہ کا انتظام عام حیثیت سے قابل ترین افراد کے تفویض ہو گیا ، اقتدار کئی آدمیوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک آدمی کے ہاتھ میں آ گیا اور جمہوریت یا بڑے بوڑھوں کے چند شخصی راج کی جگہ ملوکیت نے لے لی ۔ غیر مہذب معاشرے پر عموماً سارے بالغ مرد حکومت نہیں کرتے بلکہ چند سن رسیدہ اشخاص کی ایک کونسل یہ کام انجام دیتی ہے ۔ خیر تو یہ تبدیلی خواہ اس کے اسباب اور ابتدائی حکمرانوں کا کردار کچھ ہی رہا ہو ، بہ حیثیت مجموعی بڑی مفید ثابت ہوئی ، اس لیے کہ ملوکیت کا فروغ جہالت کی تاریکی سے بنی نوع انسان کے ابھرنے کی لازمی شرط معلوم ہوتا ہے ۔ جمہوریت پسند وحشی رسم و روایت کا اسیر ہوتا ہے اور معاشرے کو اپنی نشو و نما کے اسی مرحلے پر سب سے زیادہ رکاوٹوں کا سامنا ہوتا ہے اور اس کی ترقی کی رفتار انتہا درجہ سست ہوتی ہے ۔ یہ قدیم تصور کہ وحشت و جہالت آزادی کی معراج ہے ، حقیقت کے بالکل برعکس ہے ۔ وحشی کا اگرچہ کوئی آقا نظر نہیں آتا لیکن اس کے گلے میں ماضی اور اسلاف کی روحوں کا طوق پڑا ہوتا ہے جو مہد سے لحد تک سایہ کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی ہیں اور اس پر بڑے جبر و استبداد سے حکومت کرتی ہیں ۔ اسلاف کے اعمال اس کے نزدیک حق کے معیار کا حکم رکھتے ہیں ، یعنی ایسے غیر مرقوم آئین سے عبارت ہیں جس کی تعمیل میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ذہانت و فطانت کو قدیم رسم و رواج کی تبدیلی کا قطعی موقع نہیں ملتا اور اس شخص کی ذات ، جو انتہائی کودن اور بودا ہو ، دوسروں کے لیے نمونۂ عدایت ہوتی ہے ، جس کے ساتھ وہ شخص بھی ، جو بہترین صلاحیتوں کا

مالک ہو، جہالت کی پستیوں میں کھنچا چلا جاتا ہے۔ اس قسم کے معاشرے کی سطح بے جان اور سپاٹ ہوتی ہے اور اس میں انسان، جہاں تک اس کا بس چلتا ہے، اپنے فطری امتیازات یعنی مزاج و صلاحیت کے لامحدود خلقی اختلافات کو مٹا ڈالتا ہے اور اس طرح ظاہری مساوات پیدا کر لیتا ہے۔ ان تمام لوگوں کو، جنھیں انسانی بھلائی کی لگن ہو، ہر اس چیز کی قدر کرنی چاہیے جو ذہانت کے پروان چڑھنے کے لیے ساز گار حالات پیدا کرنے اور انسان کی فطری صلاحیتوں کی مناسبت سے مدارج اقتدار کے تعین میں ممد و معاون ہو تاکہ معاشرہ اس جمود اور پستی کی حالت سے ترقی کا قدم آگے بڑھا سکے جسے عامی زعماء اور وہ لوگ جو خیال کی رنگینیوں میں کھوئے رہتے ہیں، انسانیت کی معراج یا عہد زریں سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ ارتقائی عوامل حرکت میں آ جاتے ہیں، اور دیر یا سویر ایسا ہو کے رہتا ہے، تو معاشرے کی رفتار ترقی نسبتاً تیز ہو جاتی ہے۔ شخصی حکومت کے قیام سے صرف ایک فرد کے ہاتھوں ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کے لیے اس سے قبل متعدد ادوار ناکافی رہے ہوں۔ ایسا شخص عموماً غیر معمولی عقل اور توانائی لے کے آتا ہے اور موقع سے فائدہ اٹھانے میں قطعی پس و پیش نہیں کرتا۔ کسی جابر حکمران کا تلون بھی وحشی کو رسم و رواج کی قید و بند سے رہا کرنے میں ممد ہوتا ہے۔ جوں ہی ان بوڑھے بوڑھوں کی مجلس شوریٰ درہم برہم ہو جاتی ہے، جو کسی بات پر اتفاق نہیں کر پاتے اور ان کی جگہ زمام حکومت کسی طاقت ور اور باہمت شخص کے ہاتھ میں آ جاتی ہے، ہمسایوں پر قبیلے کا رعب چھا جاتا ہے اور وہ توسیع و تسخیر کا مسلک اختیار کر لیتا ہے جو تاریخ کے ابتدائی ادوار میں عمرانی، صنعتی اور عقلی ترقی کے لیے بسا اوقات بڑا مفید ثابت ہوتا ہے، اس لیے کہ کچھ تو تلوار کے زور سے اور کچھ کمزور قبائل کی رضاکارانہ اطاعت کے سبب معاشرے کا حلقہ اختیار وسیع ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ

سے جلد ھی زر و دولت اور غلام اُس کے قبضے میں آ جاتے ھیں۔ ان دونوں وسیلوں کے سبب بعض طبقوں کو زندگی کی احتیاجات کی طرف سے یک سوئی میسر آ جاتی ھے اور اُنھیں ھر فکر سے آزاد ھو کر اپنے آپ کو علم کے لیے وقف کرنے کا موقع مل جاتا ھے۔ اُن کا یہی اعلیٰ شغل آدمی کی حالت سدھارنے کا سب سے اعلیٰ اور طاقت ور ذریعہ ھے۔

عقل و ذھن کے فروغ کو، جو علم و فن کی نشو و نما اور حریت پسند نظریات کی نشر و اشاعت کی صورت میں رونما ھوتا ھے، صنعتی یا اقتصادی ترقی سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور خود اس ذھنی روشنی کو فتح و ظفر اور ملک گیری سے زبردست تحریک پہنچتی ھے۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ جنگ میں قوموں کی فتح ذھنی طوفان و ھیجان کا پیش خیمہ رھی ھے۔ دنیا کی جن عظیم قوموں نے فتح و نصرت کے جھنڈے بلند کیے، تہذیب و تمدن کے پھیلانے میں عام طور پر اُنھی کا سب سے زیادہ حصہ رھا اور اس طرح امن میں اُنھوں نے اُن زخموں پر مرھم رکھ دیا جو جنگ میں اُن کے ھاتھوں لگے۔ ماضی میں بابل، یونان، روم اور عرب کی تاریخ اس کی شاھد ھے اور شاید ھمارے جیتے جی جاپان میں بھی ایسا ھی علمی جوش و خروش دیکھنے میں آئے۔ نیز تاریخ کے ابتدائی ادوار میں بھی یہ محض اتفاق نہ تھا کہ تہذیب و تمدن کی زبردست ترقی شخصی اور مذھبی حکومت کی رھین منت رھی جس کا ثبوت مصر، بابل اور پیرو سے ملتا ھے، جہاں حکمران اعلیٰ بادشاھت اور خدائی دونوں کا مدعی ھوتا تھا اور اُس کی رعیت ھر دو حیثیت میں اُس کی اطاعت کرتی تھی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ھوگا کہ عمرانی ارتقاء کے اس ابتدائی مرحلے پر مطلق العنان بادشاہ نوع بشر کا سب سے بڑا محسن ھوتا ھے اور کس قدر عجیب بات ھے کہ وھی انفرادی آزادی کا سب سے بڑا علم بردار بھی ھوتا ھے۔ بات در اصل یہ ھے کہ بہترین قسم کی حریت، یعنی فکر کی آزادی اور تعمیر قسمت کی آزادی، جاھلیت کی ظاھری آزادی کے اُس ماحول

سے کہیں زیادہ جس میں افراد کی قسمت پیدائش سے لے کر موت تک روایات کی آہنی گرفت میں ہوتی ہے ، مطلق العنانی اور جبر و استبداد کے دور دورے میں میسر آتی ہے ۔

لہذا جہاں تک اجتماعی حیثیت سے پیشۂ ساحری قابل اور ذہین افراد کے لیے اقتدار اعلیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا ، اس سے نوع انسان کو روایت کی غلامی سے نجات پانے اور وسیع النظری کے ساتھ بہتر قسم کی آزادی حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی ۔ یہ انسانیت کی کچھ کم خدمت نہ تھی اور جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ سحر نے ایک اور صورت سے بھی سائنس کے لیے راہ ہموار کی ہے تو ہم یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ سفلی فن اپنی برائیوں کے باوجود باعث خیر و برکت رہا ہے اور یہ کہ وہ غلطی کی پیداوار ضرور ہے لیکن آزادی اور سچائی کا سرچشمہ بھی ہے ۔

چوتھا باب

# سحر اور مذہب

پچھلے باب میں جو مثالیں جمع کی گئی ہیں وہ سحر مشارک کی اُن دو شاخوں کے عام اصول کی توضیح کے لیے کافی ہوں گی جنھیں ہم نے سحر بالمثل اور سحر متعدی کے نام سے موسوم کیا ہے ۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ سحر کی بعض صورتوں میں روحوں کا وجود و عمل مسلم ہوتا ہے اور یہ کہ عبادت اور قربانی کے ذریعے ان کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ صورتیں مستثنیات میں سے ہیں اور ان میں سحر پر مذہب کا پیوند لگا نظر آتا ہے ۔ جہاں کہیں مشارک سحر خالص اور بے شائبہ ملتا ہے ، اس میں یہ امر مسلم ہوتا ہے کہ فطرت میں شخصی یا روحانی عوامل کی مداخلت کے بغیر اسباب و نتائج کا ایک ناگزیر اور ناقابل تغیر سلسلہ جاری ہے ۔ اس طرح اُس کا بنیادی تصور وہی ہے جو جدید سائنس کا ہے ۔ اس سارے طلسم کی تہہ میں فطرت کے نظم و ترتیب اور اُس کے رجحانات کی ہمہ‌گیری پر ایک مبہم لیکن حقیقی اور راسخ اعتقاد کار فرما ہے ۔ ساحر کو اس میں کوئی شک نہیں ہوتا کہ ہمیشہ ایک سے اسباب سے ایک سے نتائج مرتب ہوتے ہیں اور کسی خاص قسم کے جادو منتر کے ساتھ مقررہ رسم ادا کرنے سے خاطر خواہ نتیجہ ضرور برآمد ہوگا بہ شرطیکہ اُس کے جادو منتر

کو اتفاق سے کوئی اور ساحر اپنے زیادہ مؤثر عمل سے رد نہ کر دے ۔ وہ کسی ایسی طاقت کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا جو اس سے برتر ہو ، کسی ایسی ہستی سے مدد نہیں مانگتا جو محکم اور ثابت قدم نہ ہو ، وہ کسی خدائے ذوالجلال سے مرعوب ہو کر اس کے آگے سر عجز خم نہیں کر دیتا ۔ تاہم اسے اپنی دانست میں جو زبردست قوت حاصل ہوتی ہے وہ مطلق اور غیر محدود نہیں ہوتی ۔ اس طاقت کے لیے اپنے فن کے قواعد و ضوابط کی پابندی شرط ہے جن کو اس کے فہم و تصور کے بہ موجب قوانین فطرت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ ان قواعد سے غفلت اور ان قوانین کی ذرا سی خلاف ورزی سے اس کا کھیل بگڑ جاتا ہے اور جو وہ اناڑی ہو تو اس کی جان کی خیر نہیں ہوتی ۔ وہ اس بات کا مدعی ضرور ہوتا ہے کہ فطرت اس کے قبضہ و اختیار میں ہے لیکن اس کا یہ اختیار آئینی قسم کا ہوتا ہے جس کا دائرہ قطعی محدود اور جس کے استعمال میں قدیم دستور کی پوری پوری پابندی کی جاتی ہے ۔ اس طرح سحر اور سائنس کا تصور عالم بالکل ایک سا ہے ۔ سحر اور سائنس دونوں کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ واقعات کے تسلسل میں نظم و ضبط اور قطعیت ہوتی ہے ، اس لیے کہ وہ ایسے ناقابل تغیر قوانین کے تابع ہوتا ہے جن کے عمل کا صحت و یقین کے ساتھ پہلے سے جاننا اور اندازہ لگانا ممکن ہے ۔ اس مفروضے کی بناء پر فطرت کے معمول میں اتفاق ، حادثہ یا کسی ایسے تغیر کا قطعی شائبہ باقی نہیں رہتا جس کی توجیہ نہ ہو سکے ۔ سحر اور سائنس دونوں سے اس شخص کو ممکنات کی ایک لا محدود دنیا نظر آنے لگتی ہے جس پر اشیاء کے اسباب و علل روشن ہوں اور جو اس گوناں گوں اور پرپیچ کارگہ عالم کے محرکات کی نبض پہچانتا ہو ۔ یہی سبب ہے کہ انسانی ذہن سحر اور سائنس دونوں کی طرف کھنچتا رہا ہے اور ان دونوں سے علم و تحقیق کو زبردست تحریک پہنچی ہے ۔ ان دونوں کی بدولت مستقبل امید و رجا سے کچھ ایسا روشن نظر آتا ہے کہ اہل تجسس اپنی مساعئی نا کام

کے باوجود کشاں کشاں اس کی طرف بڑھے چلے جاتے ہیں ۔ ان دونوں کے فیض سے وہ اس منزل پر جا پہنچتے ہیں جہاں سے انھیں بہت دور مایوسی کے تاریک بادلوں سے پرے ، اپنی خواب آگیں جنت کے جلوے دکھائی دینے لگتے ہیں ۔

سحر کا بنیادی سقم یہ مفروضہ نہیں کہ واقعات ایک ضابطے کے بہ موجب سلسلہ وار ظہور میں آتے ہیں ، بلکہ اس کا یہ سقم ان قوانین کی نوعیت کے متعلق اس کے قطعی غلط تصور میں نظر آتا ہے جن کے مطابق واقعات کے تسلسل کا تعین ہوتا ہے ۔ اگر سحر کی ان مختلف صورتوں کا تجزیہ کیا جائے جن کا گزشتہ صفحات میں جائزہ لیا گیا ہے اور جو نمونے کے طور پر کافی ہیں ، تو جیسا کہ میں بتا آیا ہوں ، وہ سب کی سب فکر کے دو بنیادی اصول یعنی چیزوں کی مماثلت اور زمان و مکان کے وسیلے سے ان کے ربط و اتصال کی بناء پر خیالات کے تلازم کے بے جا اطلاق کا نتیجہ نکلیں گی ۔ چیزوں کی مشابہت کے غلط تصور سے مثلی سحر پیدا ہوتا ہے اور چیزوں کے ارتباط و اتصال کے غلط تصور سے سحر متعدی ۔ تلازم کے اصول اپنی جگہ خوب ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ انسانی ذہن کے عمل کا انحصار انھی پر ہے ۔ ان اصول کے صحیح اطلاق سے سائنس وجود میں آتا ہے اور بے جا اطلاق سے سحر ۔ اس طرح سحر سائنس سے ناجائز تعلق رکھتا ہے ، لہذا یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ سحر ایک قطعی بے بنیاد اور دور از کار چیز ہے ۔ اگر اس میں اصلیت و افادیت ہوتی تو وہ سحر نہ رہتا ، بلکہ سائنس کی حیثیت اختیار کر لیتا ۔ انسان شروع سے ایسے گروں کی ٹوہ میں رہا ہے جن سے مظاہر فطرت راہ پر آ سکیں اور اپنی اس طویل جستجو کے دوران میں اس نے بڑی کاوش سے حکمتوں کا ایک دفتر جمع کر لیا ۔ ان میں کچھ بیش بہا کلیے ہیں اور کچھ نری خرافات ۔ یہی حقیقی یا بیش بہا کلیے عملی سائنس کا تار و پود ہیں جسے ہم آرٹ سے تعبیر کرتے ہیں ، اور خرافات سحر کے اجزائے ترکیبی ۔

یہ تو ہوئی سحر کی سائنس سے قرابت قریبہ۔ اب ہمارے لیے یہ دریافت کرنا رہ جاتا ہے کہ مذہب سے اس کا کیا رشتہ ہے ؟ لیکن اس رشتے کا ہم جو نظریہ قائم کریں گے اس پر مذہب کے بارے میں ہمارے تصور کا اثر پڑنا ضروری ہے ۔ لہذا قبل اس کے کہ کسی کتاب کا مولف مذہب سے سحر کے تعلق کی تحقیق شروع کرے ، اس سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں اپنے تصور کی وضاحت کر دے ۔ مذہب کے بارے میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے وہ دنیا میں شاید ہی کسی اور موضوع پر پایا جاتا ہو ، اس لیے اس کی ایسی کوئی تعریف پیش کرنی نا ممکن ہے جس پر سب کا اتفاق ہو سکے ۔ کوئی مؤلف بس اتنا کر سکتا ہے کہ پہلے اس امر کی وضاحت کر دے کہ مذہب سے اس کی کیا مراد ہے اور پھر لفظ مذہب کو اپنی تالیف میں ہر جگہ اسی مفہوم میں استعمال کرتا چلا جائے ۔ لہذا مذہب سے میری مراد ان فوق البشر قوتوں کی رضا جوئی یا استمالت ہے جن کے متعلق یہ باور کیا جاتا ہے کہ فطرت اور حیات انسانی ان کے دست قدرت میں ہیں اور وہی ان کی راہ معین کرتی ہیں ۔ اس تعریف کی رو سے مذہب کے دو عنصر ہوئے : ایک تو ان فوق البشر قوتوں پر اعتقاد اور دوسرے انہیں راضی یا خوش کرنے کی کوشش۔ ان دونوں میں اعتقاد کو اولیت حاصل ہے ، کیوں کہ کسی ہستئی برتر کی رضا جوئی سے قبل اس کے وجود پر اعتقاد لازمی ہے ، لیکن ساتھ ہی جب تک وہ اعتقاد عملی جامہ نہ پہن لے اسے مذہبی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی اور وہ محض دینیات تک محدود رہتا ہے ۔ سینٹ جیمس نے ٹھیک کہا ہے کہ عقیدہ عمل سے عاری ہو تو بے جان ہوتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں مذہبی آدمی وہ ہے جس کا چال چلن کسی نہ کسی حد تک خدا کے خوف یا محبت کے تابع ہو ، لیکن ساتھ ہی محض ایسا عمل بھی جس میں جزو ایمان شامل نہ ہو ، مذہب نہیں قرار پا سکتا ۔ دو آدمیوں کا طرز عمل یکساں ہو سکتا ہے لیکن ان دونوں کا مذہبی ہونا ضروری نہیں ۔ ان

میں دیانت دار وھی آدمی کہلائے گا جس کے عمل کا محرک خدا کا خوف اور محبت ھو اور اس آدمی کی حیثیت جس کے افعال کی تہہ میں انسان کا خوف یا محبت کارفرما ھو ، بہ لحاظ اس کے کہ اس کا رویہ عام بھلائی کے مطابق ھے یا منافی ، اخلاقی نقطۂ نظر سے اچھی یا بری ھو سکتی ھے ۔ لہذا مذھب کی تشکیل میں اعتقاد اور عمل یا دینیات کی اصطلاح میں ایمان اور اعمال الصالحات دونوں برابر کے شریک ھیں ، اور ان دونوں کے بغیر مذھب کا وجود ممکن نہیں ۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ مذھبی نوعیت کا عمل ھمیشہ رسم کی شکل اختیار کرے ، یعنی ایسے عمل کا قربانی ، دعاء و مناجات یا عبادت کی دوسری صورتوں پر مشتمل ھونا ضروری نہیں ۔ اس کی غرض و غایت خدا کی رضا جوئی ھے ۔ اگر قربانی ، عبادت اور بخورات کے دھوئیں سے زیادہ کار خیر ، رحم و ھمدردی اور نزھت و عفت خدا کی خوشنودی کا موجب ھوں تو رکوع و سجود ، حمد و ثناء اور نذر و نیاز کی بجائے اس کی رضا جوئی کی بہترین صورت یہ ھے کہ انسانی معاملات میں پاکیزگی ، رحم دلی اور فیاضی کا ثبوت دیا جائے ، کیوں کہ ایسا کرنے سے جہاں تک انسان ضعیف البنیان سے ممکن ھو ، وہ اپنے اندر خدائے تعالیٰ کی صفات کاملہ پیدا کر سکے گا ۔ عبرانی انبیاء ، جن کے سینے خدا کے قدس و نیکی کے احساس سے معمور تھے ، مذھب کے اسی اخلاقی پہلو کی متواتر تلقین کرتے رھے ۔ چناں چہ میکاہ نبی (یہ آٹھویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں گزرے ھیں) کا پیام یہ ھے کہ باری تعالیٰ نے انسان کو خیر سے آشنا کرایا اور وہ اس سے انصاف ، رحم دلی اور خشوع و خضوع کے ساتھ اپنی پیروی کا طالب ھے ۔ اس کے بعد مسیحیت نے جس طاقت سے دنیا کو مسخر کیا وہ بڑی حد تک خدا کی اخلاقی ماھیت اور اس کے اتباع سے متعلق انسانی فرض کے اسی اعلیٰ تصور کا نتیجہ تھی ۔ سینٹ جیمس کہتے ھیں کہ خدا کی بے لوث اطاعت یتیموں اور بیواؤں کی دل جوئی اور اپنے آپ کو دنیوی آلائشوں سے پاک رکھنا ھے ۔

لیکن مذھب کا تار و پود چوں کہ ماورائی ھستیوں پر اعتقاد ،

نیز اُن کی رضا جوئی سے بنا ہے اس لیے اُس میں یہ مفروضہ بدیہی حیثیت رکھتا ہے کہ فطرت کے آئین میں رد و بدل ممکن ہے اور یہ کہ ہم اپنی بھلائی کی غرض سے اُن مقتدر ہستیوں کو ، فطرت جن کے قبضہ و قدرت میں ہے ، واقعات کا رخ موڑنے پر آمادہ کر سکتے ہیں ۔ فطرت کی لچک اور تغیر پزیری سے متعلق مذہب کا یہی بنیادی پہلو سحر اور سائنس دونوں کے اصول کی ضد ہے ، جن کے رو سے فطرت کے معمولات اٹل اور قطعی غیر متبدل ہیں اور اُسے نہ منت سماجت اور قائل معقول کرکے اپنے مقررہ رستے سے ہٹایا جا سکتا ہے اور نہ ڈرا دھمکا کر ۔ کائنات کے ان دو متضاد نظریوں کی بناء پر یہ اہم اور نازک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا نظم عالم جن لوگوں کے تابع ہے اُن کی نوعیت شعوری اور شخصی ہے یا غیر شعوری اور غیر شخصی ۔ مذہب جو اپنی عملی حیثیت میں فوق البشر قوتوں کی رضا جوئی سے عبارت ہے ، اس سوال کے اثباتی پہلو کو تسلیم کرتا ہے کیوں کہ کسی ہستی کی استمالت اور رضا جوئی کی کوشش اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک شعوری اور شخصی عامل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اُس کا طرز عمل قطعی طور پر معین نہیں اور اگر اُس کی دل چسپیوں ، فطری تقاضوں اور جذبات سے فائدہ اُٹھانے کی معقول کوشش کی جائے تو وہ راہ پر آ سکتی ہے ۔ بے جان اشیاء یا ایسے اشخاص کی رضا کا طالب کوئی نہیں ہوتا جن کا رویہ خاص حالات میں یقینی ہو ۔ لہذا جہاں تک مذہب کے اس مفروضے کا تعلق ہے کہ عالم کی زمام شعوری عوامل کے ہاتھ میں ہے تو انھیں ترغیب دے کر اپنے مقصد سے پھیرا جا سکتا ہے ، وہ سحر اور سائنس دونوں کا نقیض ہے کیوں کہ یہ دونوں کے دونوں اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ فطرت اپنے معمول میں شخصی قسم کی ہستیوں کے جوش و جزبے یا ترنگ کی بجائے اٹل قوانین کی پابند ہے جن کے عمل میں شعور اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ۔ سائنس میں یہ بات بالکل واضع ہے ، البتہ سحر سے اس کا محض پہلو نکلتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سحر کا روحوں سے اکثر واسطہ رہتا ہے اور یہ روحیں اُسی قسم کے شخصی عوامل کی حیثیت رکھتی ہیں

جن پر مذہب کا ایمان ہے ۔ مگر اصولاً روحوں کے ساتھ اس کا برتاؤ وہی ہوتا ہے جو بے جان اشیاء کے ساتھ ہو ، یعنی مذہب کی طرح ان کی رضا جوئی کی بجائے وہ انھیں دھونس میں رکھتا ہے اور ان پر اپنا زور چلاتا ہے ۔ اس طرح یہ امر سحر کے مسلمات میں داخل و شامل ہے کہ شخصی قسم کے تمام موجودات ، خواہ وہ انسان ہوں یا خدا ، انجام کار انھی غیر شخصی قوتوں کے تابع ہوتی ہیں جو عالم کی تمام اشیاء میں نظم و ضبط قائم رکھتی ہیں ، لیکن با ایں ہمہ وہ آدمی جسے ان شخصی ہستیوں سے کام لینے کا ڈھب آتا ہے ، مناسب رسوم اور جنتر منتر کے ذریعے ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ، مثلاً قدیم زمانے میں مصری ساحر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ بڑے سے بڑے دیوتاؤں کو اپنی مرضی پر چلا سکتے ہیں ، بلکہ وہ ان دیوتاؤں کو یہ دھمکی دیتے تھے کہ اگر وہ ان کا کہنا نہ مانیں گے تو انھیں برباد کر دیا جائے گا ۔ بعض وقت کسی جادو گر کا دعویٰ اتنا بڑا نہ سہی لیکن کم از کم اسے یہ اعلان کرنے میں کوئی باک نہ ہوتا کہ اگر اوسائی رس [Osiris ، مصریوں کا ایک بڑا دیوتا جو گوناں گوں صفات کا حامل تھا ۔ اس نے ایک علم دوست بادشاہ کی حیثیت سے مصر پر حکومت کی اور اپنے بھائی کے ہاتھوں مارا گیا ۔ اس کا مفصل ذکر آگے آئے گا] اس کا حکم بجا نہ لایا تو وہ اس کی ہڈیاں نکال پھینکے گا اور اس کا راز فاش کرکے رکھ دے گا ۔ ہندوستان میں ہندو مت کی تری مورتی یا تثلیث جو برہما (خالق) ، وشنو (حیات و بقا کا دیوتا) اور شیوا (تخریب و فنا اور حیات نو کا دیوتا) پر مشتمل ہے ، آج تک جادوگروں کے تابع چلی آتی ہے جو اپنے منتروں کے ذریعے ان جلیل القدر دیوتاؤں پر کچھ اس طرح اپنا تسلط جما لیتے ہیں کہ انھیں بے عذر اپنے فسوں ساز آقاؤں کے احکام کی تعمیل کرنی پڑتی ہے ۔ ہندوؤں میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ کائنات دیوتاؤں کے تابع ہے ، دیوتا منتروں کے اور منتر برہمنوں کے ، اس لیے برہمن ہمارے دیوتا ہیں ۔

مذہب اور سحر کے اصول کے اسی بنیادی تضاد کے سبب مذہبی

طبقہ اکثر ساحر کی تباہی کے در پے رہا ہے ۔ ساحر کے اپنے فن کے کافی بالذات ہونے پر گھمنڈ ، دیوتاؤں سے اس کی گستاخی اور ہمسری کا دعویٰ ، ان سب چیزوں کو مذہبی طبقے نے جس پر خدائے ذوالجلال کی ہیبت طاری تھی اور جو اس کے آگے سر بہ سجود رہتا تھا ، کفر و زندیقی اور اختیارات خداوندی میں مداخلت بے جا پر محمول کیا ہوگا ۔ لہذا ساحر سے اس کا برگشتہ ہونا لازمی امر تھا ۔ بعض صورتوں میں مذہبی رہنماؤں کی اس دشمنی کو ذاتی اغراض نے بھی ضرور ہوا دی ہوگی کیوں کہ ان کا دعویٰ تھا کہ انسان کے لیے خدا تک پہنچنے اور شفاعت حاصل کرنے کا صحیح وسیلہ انھی کی ذات ہے ، اور ایک ایسے حریف سے ان کے مفادات و احساسات کو صدمہ پہنچنا یقینی تھا جو مراد و شادمانی کی منزل تک پہنچنے کے لیے خدا کی رضا جوئی جیسے مشکل مسلک کی بجائے نسبتاً صحیح اور آسان راستہ دکھاتا ہو ۔

با ایں ہمہ ساحر سے مذہبی رہنما کی یہ معاندت ، جس سے ہم سب واقف ہیں ، تاریخ مذہب میں کچھ زیادہ پرانی چیز نہیں معلوم ہوتی ۔ اس سے پہلے ان دونوں کے فرائض اکثر صورتوں میں مخلوط تھے یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان فرائض کے درمیان کوئی حد امتیاز قائم نہیں ہوئی تھی ۔ اپنا مطلب نکالنے کے لیے انسان دعا اور قربانی کے ذریعے دیوتاؤں اور روحوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسی رسموں اور شبدھوں سے بھی کام لیتا تھا جن سے خود بخود ، خدا یا شیطان کی مدد کے بغیر ، اسے اپنی مراد بر آنے کی امید ہو ۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ہی وقت میں مذہبی اور سحری دونوں قسم کی رسمیں ادا کیا کرتا تھا ، ایک ہی سانس میں وہ دعا اور افسوں دونوں پڑھ جاتا تھا اور اس کے اس فعل میں جو نظری تناقض تھا ، اسے اس کا کوئی علم یا پروا نہ تھی ۔ جائز یا ناجائز جس طریقے سے بھی اس کا کام نکلے ، وہ اس کے نزدیک روا تھا ۔ مذہب اور سحر کے اس امتزاج یا اجتماع ضدین کی مثالیں ملینیشیوں اور دوسری قوموں کے رسم و رواج

میں ہماری نظر سے گزر چکی ہیں۔

یہی صورت جس میں سحر اور مذہب گڈمڈ ہیں ان اقوام میں برابر چلی آتی ہے جو ثقافت کے اونچے مدراج طے کر چکی ہیں۔ وہ قدیم ہندوستان اور مصر میں موجود تھی اور یورپ کے زراعت پیشہ طبقے میں آج بھی نظر آتی ہے۔ قدیم ہندوستان کے متعلق سنسکرت کے ایک ممتاز عالم کا کہنا ہے کہ تاریخ کا وہ ابتدائی عہد جس کے مفصل واقعات ہم تک پہنچے ہیں قربانی کی ایسی رسموں سے بھرا پڑا ہے جن میں جاہلیت کے قدیم ترین زمانے کے جادو کا عنصر موجود ہے۔ مشرق، خاص کر مصر میں، سحر کی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر میسپرو کہتے ہیں کہ ''سحر سے وہ حقارت آمیز تصور وابستہ نہیں کرنا چاہیے جس کی طرف عہد جدید کے انسان کا ذہن لازمی طور پر منتقل ہوتا ہے۔ سحر قدیم مذہب کی بنیاد تھا۔ جب کسی خدا کا ماننے والا اپنے معبود سے مراد مانگتا تو اس کے لیے اپنی کام یابی کی صورت سوائے اس کے اور کوئی نہ تھی کہ وہ اس خدا کو رام کرے اور یہ صرف ان چند رسموں، قربانیوں، دعاؤں اور بھجنوں کے ذریعے ممکن تھا جو خود اس کے خدا نے نازل کی تھیں اور جن کی وجہ سے وہ ان مرادوں کے پورا کرنے پر مجبور تھا جو اس سے مانگی جاتیں۔''

جدید یورپ کے جاہل طبقوں میں تصورات کی یہی بے آہنگی، سحر و مذہب کا یہی امتزاج طرح طرح کے روپ دھارتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس میں کسانوں کی اکثریت کا یہ اعتقاد ہے کہ پادری کے باطنی کمال کے سبب عناصر اربعہ اس کے تابع ہیں۔ چند وظیفے ایسے ہیں جنھیں صرف وہی جانتا ہے اور جن کے پڑھنے کا صرف اسی کو حق حاصل ہے، اگرچہ اس کے لیے اسے بعد میں نجات طلب کرنی ضروری ہو جاتی ہے۔ ان وظیفوں کے ذریعے اس کے لیے یہ ممکن ہے کہ سخت خطرے کی صورت میں فطرت کے ابدی قوانین کا عمل روک یا الٹ دے۔ باد و باراں، طوفان اور اولے اس کے اطاعت گزار ہیں اور آگ بھی اس کے تابع ہے، جس کے بھڑکتے ہوئے شعلے اس کی ایک جنبش لب پر سرد

پڑ جاتے ہیں ۔ مثال کے طور پر فرانس کے کسان اس کے قائل تھے اور شاید ابھی تک ہیں کہ قسیس چند خاص رسوم کے ساتھ عشائے ربانی کی ایک خاص رسم عبادت ادا کرکے اس کے اثر سے مشیت کو زیر کر سکتا ہے ۔ اس میں جو بھی دعا مانگی جاتی ہے خدا اس کے قبول کرنے پر مجبور ہوتا ہے ، خواہ وہ کیسی ہی گستاخانہ کیوں نہ ہو ۔ اس رسم میں ان لوگوں کو بد عقیدگی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا جو بعض شدید قسم کے مصائب سے عاجز آکر اس حربے سے حکومت الٰہی پر یورش کر دیتے ہیں ۔ پادریوں کا وہ طبقہ جو ترک دنیا کے خلاف ہے ، عام طور پر یہ روح القدس والی عشاء ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا ، لیکن راہبوں ، خاص کر کیپوچی طریقے کے درویشوں (۱۵۲۸ء کے نئے قاعدے کے بموجب سینٹ فرانسس آف اسیزی کے پیرو ، ان کا نشان امتیاز کیپوچ یا ایک خاص وضع کی نکیلی ٹوپی ہے) کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ پریشان حال اور مصیبت زدہ لوگوں کی التجاؤں سے پسیج جاتے ہیں ۔ کیتھولک کسانوں کے عقیدے کے بموجب پادری کا اس طرح خدا پر زور چلانا اس استدراج سے قریبی مشابہت رکھتا ہے جو مصر میں قدیم زمانے کے لوگ اپنے ساحروں سے منسوب کرتے تھے ۔ اس عقیدے کی دوسری مثال پرووانس (فرانس) والوں کے ہاں ملتی ہے ۔ یہاں بہت سے گاؤں میں پادری کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ وہ اپنے استدراج سے طوفان روک سکتا ہے لیکن یہ شہرت ہر پادری کو نصیب نہیں ، اور بعض گاؤں میں کسی کلیسائی حلقے کے پادری کا تبادلہ ہوتا ہے تو اس میں رہنے والے یہ معلوم کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں کہ نئے پادری کو یہ استدراج حاصل ہے یا نہیں ۔ چناں چہ جب کبھی کسی طوفان کے آثار نظر آتے ہیں تو وہ آزمائش کے طور پر اسے بلاتے ہیں کہ دم کرکے بادلوں کا خطرہ دور کر دے ۔ اگر اس کا نتیجہ ان کی امیدوں کے مطابق نکلتا ہے تو نئے راعی کو اپنی رعیت کی ہم دردی اور احترام کا یقین ہو جاتا ہے ۔ چند کلیسائی حلقوں میں ، جہاں قسیس کا نائب اس خصوص میں قسیس پر فوقیت رکھتا ہو ، ان دونوں میں اس قدر کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے کہ اسقف موخرالذکر کو کسی اور حلقے میں

منتقل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ گیس کونی (فرانس) کے کسانوں کا خیال ہے کہ شریر آدمی بعض وقت اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے کسی پادری کو گانٹھ کر اس سے ایک خاص دعائے عشائے ربانی پڑھواتے ہیں جو دعائے سینٹ سیکیر (Mass of St. Secaire) کہلاتی ہے ۔ اس عشاء سے بہت کم پادری واقف ہیں اور ان میں بھی بیشتر ایسے نکلیں گے جنھیں کوئی چیز اس کے پڑھنے پر آمادہ نہیں کر سکتی ۔ اس مکروہ اور ہولناک رسم کو ادا کرنے کی جرأت صرف بدکار اور فاسق پادریوں ہی کو ہوتی ہے اور قیامت کے دن انھیں یقیناً اس کا بڑا سخت حساب دینا پڑے گا ۔ کلیسا کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ عہدہ دار تک ، خود آش کا اسقف اعظم بھی ان کا یہ گناہ معاف نہیں کر سکتا ۔ اس کا اختیار اگر کسی کو ہے تو وہ بس ایک پوپ کی ذات ہے ۔ دعائے سینٹ سیکیر کی یہ رسم صرف کسی ایسے شکستہ یا ویران گرجے کے اندر ادا کی جا سکتی ہے جس میں اُلو بولتے ہوں ، جھٹ پٹے میں چمگادڑیں منڈلاتی اور رات کو خانہ بدوش بسیرا کرتے ہوں اور جس کی قربان گاہ کے تلے مینڈک دبکے بیٹھے ہوں ۔ یہاں رات کی تاریکی میں وہ فاجر پادری اپنی داشتہ کو لے کے پہنچتا ہے ۔ گیارہ کے گھنٹے کی آواز پر اس کا عمل شروع ہوتا ہے اور ٹھیک بارہ پر ختم ہو جاتا ہے ۔ اس کارروائی میں اس کی داشتہ نائب پادری کے فرائض انجام دیتی ہے ۔ عشاء کے طور پر سیاہ رنگ کی تکونی روٹی استعمال کی جاتی ہے اور اس میں شراب شامل نہیں ہوتی ۔ اس کی بجائے وہ ایسے کنویں کا پانی پیتا ہے جس میں کسی بے اصطباغ بچے کی لاش پھینکی گئی ہو ۔ نیز وہ اپنے پاؤں سے زمین پر صلیب بناتا ہے اور بہت سی ایسی حرکتیں کرتا ہے جن سے کسی صحیح العقیدہ عیسائی کے ہوش جاتے رہیں ۔ لیکن وہ شخص جس کے لیے یہ رسم دعائیہ ادا کی جاتی ہے آہستہ آہستہ گھلنے لگتا ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ اسے کیا روگ لگ گیا ہے ۔ خود ڈاکٹر بھی دنگ رہ جاتے ہیں ؛ وہ کیا جانیں کہ ان کا مریض دعائے سینٹ سیکیر کے اثر سے آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے ۔

تاہم اگرچہ سحر و مذہب متعدد ملکوں اور عہدوں میں اس

طرح باہم مروج نظر آتے ہیں لیکن کچھ اسباب ایسے موجود ہیں جن کی بناء پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا یہ امتزاج جاہلی عہد کی چیز نہیں۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب انسان اپنے ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو اس کی مادی احتیاجات سے ماوراء تھے، صرف جادو پر یقین اور بھروسہ رکھتا تھا۔ سب سے پہلے سحر اور مذہب کے بنیادی فکر پر غور کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ میں مذہب کو سحر پر اولیت حاصل رہی ہے۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ سحر ذہن انسانی کے نہایت سادہ اور ابتدائی عمل یعنی چیزوں کے تماثل اور اتصال کی بناء پر خیالات کے تلازم کے سبب وجود میں آیا ہے اور اس کے برعکس مذہب کی عمارت اس مفروضے پر کھڑی ہے کہ یہ جہان رنگ و بو ایسے شخصی یا شعوری عوامل کا کرشمہ ہے جو انسان سے افضل و برتر ہیں۔ ظاہر ہے کہ شخصی عوامل کا تصور چیزوں کے بارے میں خیالات کی سطحی یکسانی اور ربط باہم کے شعور سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوگا۔ اور جس نظریے میں یہ امر مسلم ہو کہ فطرت کا عمل مذکورہ بالا عوامل کا رہین منت ہے وہ اس خیال کے مقابلے میں کہ واقعات تماثل و اتصال کے سبب ظہور میں آتے ہیں کہیں زیادہ دقیق اور عسیرالفہم ہوگا اور اس کے سمجھنے کے لیے زیادہ ذہانت اور غور و فکر کی ضرورت ہوگی۔ جانوروں کے ذہن تک میں ان چیزوں کے بارے میں خیالات کا تلازم پایا جاتا ہے جو انھیں ایک جیسی معلوم ہوتی ہوں اور باہم مربوط ملتی ہوں، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکتے۔ لیکن یہ خیال جانوروں سے کون منسوب کرے گا کہ مظاہر فطرت کی تہ میں جانوروں کی ایک کثیر تعداد یا کوئی ایک زبردست اور طاقتور جانور کارفرما ہے؟ غالباً یہ تسلیم کرنا جانوروں کے حق میں بے انصافی نہ ہوگی کہ اس نظریے کی اختراع کا سہرا انسانی ذہن کے سر ہے۔ اس صورت سے اگر سحر براہ راست عقل انسانی کے بنیادی عمل کا نتیجہ ہے اور فی الحقیقت ایک ایسا مغالطہ ہے جس میں انسانی ذہن بے ساختہ مبتلا ہو جاتا ہے اور

دوسری طرف مذہب کی بناء ایک ایسا تصور ہے جو حیوانی شعور سے بالا تر ہے تو ہمارے لیے اس قیاس کا جواز پیدا ہو جاتا ہے کہ نوع انسانی کے ذہنی ارتقاء میں سحر مذہب سے پہلے وجود میں آیا اور یہ کہ انسان نے کسی نازک و حساس، موجی یا تند خو خدا کو بہلانے پھسلانے یا دم دلاسا دینے کی کوشش سے پہلے فطرت کو جادو منتر کے زور سے اپنی خواہشات کے پورا کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ نتیجہ جو ہم نے استخراج کے ذریعے سحر اور مذہب کے بنیادی تصورات سے اخذ کیا ہے، اس کا ثبوت استقرائی طور پر مشاہدے سے بہم پہنچتا ہے۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں جو تحقیق کی رو سے دنیا کی سب سے جاہل اور غیر مہذب قوم ہیں، ساحری عام ہے، اور برخلاف اس کے مافوق قوتوں کی رضا جوئی کی حیثیت سے انہیں مذہب کی ہوا تک نہیں لگی۔ ان کے ہاں تقریباً ہر فرد جادوگر ہے لیکن مذہبی رہنما کا نام و نشان تک بھی نہیں۔ ہر شخص اس وہم میں مبتلا ہے کہ وہ مشارک سحر کے ذریعے دوسرے آدمیوں یا فطرت کے آئین پر اثر انداز ہو سکتا ہے، لیکن کبھی کسی کو اس بات کا خیال بھی نہیں گزرتا کہ دعا و مناجات یا قربانی کے ذریعے دیوتاؤں کو راضی کیا جا سکتا ہے۔

لیکن انسانی معاشرے کی جس انتہائی پس ماندگی کا اس وقت ہمیں علم ہے، اگر اس میں سحر کا وجود اور مذہب کا فقدان سب سے نمایاں نظر آتا ہے تو کیا ہمارا یہ قیاس بجا نہ ہوگا کہ دنیا کی تمام مہذب انسانی نسلیں بھی اپنے اپنے عقلی ارتقاء میں کبھی نہ کبھی اس مرحلے سے گزری ہوں گی، ان میں نذر و نیاز اور دعا و مناجات کے ذریعے فطرت کی زبردست قوتوں سے مراد مانگنے کا خیال پیدا ہونے سے پہلے انہوں نے ان قوتوں کو اپنی مرضی پر چلانے کی کوشش نہیں کی ہوگی؟ دوسرے لفظوں میں جس طرح آدمی کی ثقافت کے مادی ارتقاء میں ہر جگہ ایک حجری دور آیا ہے، اسی طرح اس کے عقلی ارتقاء میں ایک سحری دور نہیں آیا ہوگا؟ اس سوال کا

جواب اثبات میں دینے کے لیے ہمارے پاس معقول وجوہ موجود ہیں۔ ہم جب گرین لینڈ سے لے کر ٹی ایرا ڈیل فواگو (جزیرے جو براعظم امریکہ کے جنوبی سرے پر واقع ہیں) اور اسکاٹ لینڈ سے لے کر سنگاپور تک موجودہ انسانی نسلوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان کے درمیان بھانت بھانت کے مذہبوں کی دیواریں کھڑی نظر آتی ہیں۔ ان کے یہ مذہبی اختلافات محض نسل کے وسیع امتیازات پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ان کا سلسلہ ریاستوں اور مشترکہ سلطنتوں اور اس سے بھی آگے قصبوں، قریوں حتیٰ کہ کنبے کے فرق تک جا پہنچتا ہے، اور انسانی معاشرے کی سطح مذہبی تفرقے سے جگہ جگہ کٹی پھٹی، تڑخی کھرچی نظر آتی ہے۔ لیکن جب ہماری نظر گہرائیوں تک جاتی ہے تو ان اختلافات کی سطح کے نیچے، جن کا اثر معاشرے کے ذہن اور غور و فکر کرنے والے طبقے تک محدود ہے، تو ہمیں وہ ٹھوس تہہ دبی نظر آتی ہے جو ضعیف‌العقل، کمزور، جاہل اور توہم پرست لوگوں کے ذہنی جمود کی آئینہ‌دار ہے اور بد قسمتی سے بنی نوع انسان کی اکثریت انہی لوگوں پر مشتمل ہے۔ انیسویں صدی کا ایک کارنامہ دنیا کے مختلف حصوں میں اس تہہ تک پہنچنا اور ہر جگہ اس کی مماثلت کا پتا چلانا ہے۔ یورپ کے سماج میں آج بھی یہ طبقہ ہمارے پاؤں تلے دبا ہوا ہے اور آسٹریلیا کے دشت و بیابان میں اور ان مقامات پر، جہاں تہذیب کے قدم ابھی پہنچے نہیں ہیں، وہ سطح پر ابھر آتا ہے۔ یہ عالم گیر دھرم، یہ صحیح قسم کا کیتھولک مسلک، سحر کی قوت و تاثیر پر اعتقاد کا نام ہے۔ مذہبی نظام نہ صرف ملک ملک میں الگ الگ ہیں بلکہ ایک ہی ملک میں عہد بعہد مختلف رہے ہیں، لیکن مشارک سحر کے اصول و عمل ہر جگہ اور ہر زمانے میں یکساں رہتے ہیں۔ وہ یورپ کے جاہل اور توہم پرست طبقوں میں وہی کچھ ہے جو ہزاروں سال پہلے مصر اور ہندوستان میں تھا، اور آج بھی ان انتہائی وحشی اقوام میں ہے جو دنیا کے دور دراز گوشوں میں باقی رہ گئی ہیں۔ اگر حق کا معیار فکر و عمل کی یک رنگی و ہمہ گیری

سے عبارت ہے تو یہ گراں قدر منقولہ کیتھولک کلیسا سے کہیں زیادہ سحر پر صادق آتا ہے : '' جو ہر وقت ہے ، ہر جگہ ہے اور جس کو سب مانتے آئے ہیں ۔ ''

یہ امر کہ وحشت و جاہلیت کے ایسے جامد طبقے کا انسان کے مستقبل پر کیا اثر ہوگا جو معاشرے کی سطح کے نیچے برابر چلا آتا ہے اور جس کی حالت میں مذہب اور ثقافت کے ظاہری تغیرات سے ذرا بھی فرق نہیں آیا ، ہماری بحث سے خارج ہے ۔ جو شخص بے لاگ مشاہدے کا عادی ہو اور جس نے اس طبقہ کا گہرا مطالعہ کیا ہو ، اسے تہذیب کے لیے مستقل خطرے کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا ۔ ہم جس سطح پر چل پھر رہے ہیں وہ نہایت نازک اور مہین ہے اور ان قوتوں کی ایک کروٹ سے پھٹ سکتی ہے جو اس کے نیچے خوابیدہ ہیں ۔ کبھی کبھی جو بڑبڑاہٹ سی سنائی دے جاتی ہے یا اچانک نیچے سے ایک آدھ شعلہ سا فضا میں لپک جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ہمارے پاؤں تلے کیا ہو رہا ہے ۔ مہذب طبقہ آئے دن اس قسم کی خبریں پڑھ کر چونک اٹھتا ہے کہ اسکاٹ لینڈ میں ایک عجیب پتلا ملا ہے جس میں کسی ناپسندیدہ زمیندار یا وزیر کو ہلاک کرنے کے لیے سوئیاں چبھو دی گئی ہیں ، یا آئرلینڈ میں کسی عورت کو جادوگرنی سمجھ کر بھون ڈالا گیا یا روس میں ایک لڑکی کو مار کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گیے تاکہ اس کی چربی سے وہ موم بتیاں تیار کی جائیں جن کی روشنی میں چور چھپے چھپے اپنا کام کرتے ہیں ۔ لیکن ترقی و رجعت کی قوتوں میں کس کا پلہ بھاری رہے گا ، آیا اس اقلیت کی تحریک سے جو ذہین اور سنجیدہ لوگوں پر مشتمل ہے ، نوع انسان بام عروج پر پہنچے گی یا جہلا اور توہم پرستوں کا جمود اسے اپنے بوجھ تلے دبا کر رکھ دے گا ؟ یہ ایسے سوال ہیں جن کا تعلق داناؤں ، اخلاق معلموں اور مدبروں سے ہے جن کی عقابی نظر سے مستقبل پوشیدہ نہیں ۔ ان کا جواب ماضی و حال کا ناچیز طالب علم کیا دے سکتا ہے ۔ یہاں ہمارا تعلق صرف اس سوال سے ہے کہ مذہب کے لامتناہی اختلافات و تغیرات کے مقابلے میں سحر پر

انسان کے اعتقاد کی یکسانی ، آفاقیت اور استمرار کی بناء پر یہ فرض کرنا کہاں تک درست ہوگا کہ سحر انسانی ذہن کی ابتدائی اور ناہموار حالت کا مظہر ہے اور اسی منزل سے ہو کر تمام انسانی نسلیں مذہب اور سائنس کی طرف بڑھی ہیں یا بڑھ رہی ہیں ۔

اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے کہ انسان کے ذہنی ارتقاء میں ہر جگہ مذہبی دور سے پہلے ایک سحری دور ضرور آیا ہے تو لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اسباب کیا تھے جن کی بناء پر بنی نوع انسان یا اس کے ایک حصے نے سحر کا مسلک چھوڑ کر اس کی جگہ مذہب کو اختیار کر لیا؟ اس ضمن میں جو حقائق توجیہ کے محتاج ہیں وہ بے شمار ، گوناں گوں اور پیچیدہ ہیں اور ان کے متعلق ہماری معلومات کا ذخیرہ نہایت محدود ہے ۔ اس امر کے پیش نظر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس قدر دقیق مسئلے کے تسلی بخش حل کی امید رکھنی عبث ہے ۔ ہمیں فی الحال جو کچھ معلوم ہے اس کی روشنی میں ہم بس اتنا کر سکتے ہیں کہ اس مسئلے کے متعلق جھجکتے جھجکتے ایسی قیاس آرائی دیں جو بہ ظاہر قرین صحت ہو ۔ لہذا میں بہ احتیاط مناسب یہ رائے پیش کروں گا کہ جب بنی نوع انسان کے غور و فکر کرنے والے طبقے پر آہستہ آہستہ سحر کا بھرم کھلا اور اسے اس بات کا شعور ہوا کہ وہ اصل میں ایک بے بنیاد اور دور از کار چیز ہے تو اس میں فطرت کے صحیح تر نظریے اور ایسے طریقے کی جستجو پیدا ہوئی جس سے فطرت کو راہ پر لایا جاسکے ۔ ایک مرحلے پر سنجیدہ لوگ یہ سمجھنے لگے ہوں گے کہ جادو کی رسموں اور جنتر منتر سے جو نتیجہ مقصود ہوتا ہے اور جس پر عام لوگ اعتقاد رکھتے ہیں وہ حقیقت میں برآمد نہیں ہوتا ۔ جن لوگوں پر یہ بات کھلی ، ان کے لیے وہ ایک عظیم انکشاف سے کم نہ تھی ۔ اس سے ان کے ذہنوں میں ایک انقلاب برپا ہوگیا ہوگا اور ان کا تصور فطرت غالباً بتدریج مگر یک سر بدل گیا ہوگا ۔ اس انکشاف سے انسان کے ذہن میں پہلی مرتبہ اس بات کا شعور پیدا ہوا کہ وہ فطرت کی ان قوتوں کو اپنی مرضی پر چلانے سے قاصر ہے جن کے متعلق وہ یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ

اس کے بس میں ہیں ۔ یہ شعور انسان کی بے علمی اور ضعیف البنیانی کے اعتراف سے کم نہ تھا ۔ اس پر ظاہر ہو گیا کہ اس نے جن چیزوں کو اسباب و علل پر محمول کیا تھا وہ اسباب و علل قطعی نہ تھے ، اور یہ کہ ان خیالی اسباب کے ذریعے اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی جتنی کوششیں کیں وہ سب فضول تھیں ۔ اس کی ساری محنت و مشقت اور اختراعی صلاحیتیں خاک میں مل گئیں ۔ وہ خالی ڈور کو ٹھمکیاں دے رہا تھا اور ایک تنگ دائرے میں چکر کاٹ رہا تھا اور سمجھ یہ رکھا تھا کہ منزل مقصود کی طرف گامزن ہے ۔ بات یہ نہ تھی کہ وہ جن نتائج کے پیدا کرنے میں اپنا خون پسینہ ایک کرتا تھا وہ ظہور میں آنے بند ہوگئے تھے ؛ ان کا سلسلہ برابر جاری تھا لیکن اس میں اس کی کوششوں کو کوئی دخل نہ تھا ۔ بارش زمین کی پیاس برابر بجھا رہی تھی ۔ چاند سورج آسمان پر اپنے اپنے رات دن کے سفر میں اسی طرح مصروف تھے ۔ موسموں کے خاموش جلوس اندھیرے اجالے ، دھوپ چھاؤں میں برابر جاری تھے ۔ آدمی ابھی تک مصیبت پیٹنے اور غم سہنے دنیا میں جوق در جوق چلے آتے تھے اور اس سرائے فانی میں چند روز قیام کرکے اپنے ابدی وطن لوٹ جاتے تھے ۔ ہر چیز در حقیقت پہلے کی طرح ظہور میں آ رہی تھی ۔ پھر بھی اس شخص کو ، جس کی نظر میں پرانے معیار بے کار ہو چکے تھے ، دنیا نئی نئی سی لگ رہی تھی کیوں کہ وہ اس خواب میں زیادہ عرصے تک نہیں رہ سکتا تھا کہ ارض و سماء کی عنان اس کے دست ناتواں میں ہے اور اگر وہ اسے چھوڑ دے تو ان کی گردش رک جائے ۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں کی موت میں اب اسے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں نظر آتا تھا کہ وہ خود اس کے یا اس کے مخالفوں کے سحر کا کرشمہ ہے ۔ اس پر کھل چکا تھا کہ دوست اور دشمن سب کے سب ایک ایسی زبردست قوت کے آگے سرنگوں ہوگئے ہیں جس کے مقابلے میں اس کا اختیار کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ انھوں نے اس تقدیر کی اطاعت قبول کرلی ہے جس پر اس کا کوئی بس نہیں چل سکتا ۔

اس طرح یہ سبکسار ساحل شک و بے یقینی کے بحر طوفاں خیز میں بہہ نکلا اور موجوں کے تھپیڑے کھانے لگا۔ اسے اپنی ذات اور اپنے استدراج پر جو اعتماد تھا وہ جاتا رہا۔ ہمارا یہ سیدھا سادہ اور قدیم فلسفی ایک طلسم پیچ و تاب میں گرفتار ہوگا اور اسے سکون و یقین کی منزل پر پہنچنے سے پہلے ایک دشوار گزار اور پر پیچ وادی طے کرنی پڑی ہوگی۔ سکون و یقین کی یہ منزل اعتقاد و عمل کا وہ نیا نظام تھی جس میں اسے اپنے عقیدوں کا حل اور فطرت پر اپنے اس اقتدار و حکومت کا نعم‌البدل نظر آیا ہوگا جس سے اسے با دل نخواستہ دست بردار ہونا پڑا تھا، قطع نظر اس کے کہ یہ نعم‌البدل نہایت ناقابل اعتماد اور غیر یقینی تھا۔ اگر یہ عظیم‌الشان عالم اس کی یا اس کے ہم جنسوں کی مدد کے بغیر اپنی ایک راہ پر چلا جاتا ہے تو ایسا ہونا ہی چاہیے کیوں کہ اس جیسی مگر اس سے کہیں طاقت ور دوسری ہستیاں موجود ہیں جو ان دیکھی اس عالم کی راہ معین کرتی ہیں اور واقعات کے اس گوناں گوں سلسلے کو وجود میں لاتی ہیں جس کا ظہور وہ اب تک اپنے سحر پر منحصر سمجھے ہوئے تھا۔ اب اس کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ یہی ہستیاں تھیں نہ کہ خود اس کی ذات جن کے حکم سے آندھیاں آتی ہیں، برق لہراتی ہے اور بادل گرجتے ہیں، انہیں نے اس ٹھوس دھرتی کی نیو رکھی اور بے کل سمندر کے اطراف کنارے کھڑے کر دیے، انہیں کی بدولت ہر رات آسمان پر چراغاں ہوتا ہے، انہیں سے پرندوں کو ماس اور درندوں کو شکار ملتا ہے، انہیں کے حکم سے زرخیز زمین اناج اگلتی ہے، اونچے اونچے پہاڑ صحراؤں کا سبز پیرہن زیب تن کرتے ہیں، ابلتے ہوئے چشمے وادیوں میں چٹانوں کے نیچے سے پھوٹتے ہیں اور ہری ہری گھاس خاموش پانی کے کنارے دور دور تک لہلہاتی ہے۔ آدمی کے سانس کی آمد و شد انہیں کے دم کی رہین منت ہے' یا وہی قحط، وبا اور جنگ و جدل کے ذریعے اسے موت کے گھاٹ اتار دیتی ہیں۔ انسان اب انہیں جلیل‌القدر ہستیوں سے رجوع کرنے لگا جو اسے فطرت کے سارے رنگین اور گوناں گوں مظاہر کی تہہ میں کارفرما نظر آتی تھیں۔ اس نے ان ہستیوں

کے حضور بڑے خشوع و خضوع سے اس بات کا اقرار کر لیا کہ اس کا تمام تر دار و مدار انھی کی ان دیکھی طاقت پر ہے اور ان سے گڑ گڑا کر التجا کی کہ وہ اس پر اپنی رحمت ارزاں فرمائیں اور اسے ساری اچھی اچھی چیزیں عطا کریں ، ان خطرات سے مامون رکھیں جو اس کی حیات بے ثبات کو ہر طرف سے لاحق ہوتے ہیں اور آخر میں جب اس کی لافانی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے تو اسے رنج و الم سے دور کسی عالم لطف و مسرت میں پہنچا دیں جہاں وہ خود ان کے اور نیک آدمیوں کی روحوں کے ساتھ ابدی سکون و راحت حاصل کر سکے۔

یہ یا کچھ ایسی ہی صورت خیال میں آتی ہے جس سے نکتہ رس اور دقیقہ سنج ذہن سحر سے مذہب کی طرف منتقل ہوئے ہوں گے۔ ان میں بھی یہ تبدیلی اچانک نہیں پیدا ہو سکی ہو گی۔ غالباً وہ آہستہ آہستہ واقع ہوتی رہی اور اس کے انجام کو پہنچنے میں کئی قرن لگ گئے، کیوں کہ اس چیز کا شعور انسان میں رفتہ رفتہ پیدا ہوا ہوگا کہ اپنی قوت سے فطرت کے آئین میں کوئی غیر معمولی تبدیلی کرنی اس کے امکان میں نہیں۔ اس کی حکومت کا قلع قمع ایک ہی حملہ میں نہیں ہو گیا ہوگا بلکہ اس کا نشۂ جہاں گیری دھیرے دھیرے اترا ہوگا اور اس نے اس علاقے کو جسے وہ اپنے زیرنگیں سمجھتا آیا تھا ، ایک ایک قدم کرکے بڑے حسرت و اندوہ کے ساتھ چھوڑا ہوگا۔ کبھی ہوا ، کبھی مینہ ، کبھی دھوپ اور کبھی بادلوں کی گھن گرج کے بارے میں اسے ماننا پڑا ہوگا کہ ان پر اسے کوئی اختیار نہیں۔ چوں کہ اقلیم فطرت کا ایک ایک حصہ اس کے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس کی قلم رو سمٹتے سمٹتے اس پر زندان کی طرح تنگ ہونے لگی ، اس لیے اسے اپنی بے بسی کا زیادہ سے زیادہ احساس ہوتا گیا اور اس پر روز افزوں ان غیر مرئی ہستیوں کی ہیبت چھاتی گئی جن میں وہ اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتا تھا۔ اس طرح مذہب جو فوق البشر قوتوں کے وجود کو جزوی طور پر تسلیم کرنے سے شروع ہوتا ہے ، عام کے ساتھ ساتھ ترقی کرکے اس اقرار کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ

انسان کا تکیہ قطعاً اور کلیتاً خدا پر ہے ۔ اس کا صنم کدۂ پندار ڈھ جاتا ہے اور وہ ان پُر اسرار اور ان دیکھی قوتوں کے آگے سر بسجدہ ہو کر اسفل السافلین کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ اس حالت میں اس کے نزدیک نیکی کا معیار ان قوتوں کی اطاعت و بندگی ہوتا ہے ۔ لیکن مذہبی احساس کی اس بڑھتی ہوئی شدت ، ہر چیز میں راضی برضا رہنے کے اس آورش سے صرف وہ عالی دماغ لوگ متاثر ہوتے ہیں جن پر کائنات کی بے پایاں وسعتیں اور ان وسعتوں میں انسان کی تنگ مایگی روشن ہوتی ہے ۔ گھٹیا ذہنوں میں اونچے خیالات کی سمائی نہیں ہوتی ۔ وہ اس قدر تنگ نظر ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے سوا کسی چیز کی اہمیت یا بڑائی کا احساس نہیں ہونے پاتا ۔ اس قسم کے ذہن مذہب کی بلندی کو کبھی نہیں پا سکتے ۔ وہ اپنے سے برتر ذہنوں کے دباؤ سے مذہب کے احکام کی ظاہری پابندی اور اس کے اصول کا زبانی اقرار ضرور کر لیتے ہیں ، لیکن ان کے دلوں پر سحری توہمات کے پردے اسی طرح پڑے رہتے ہیں ۔ ان توہمات کو مذہب ناجائز اور حرام تو قرار دے سکتا ہے لیکن جب تک وہ عامۃالناس کے ذہن و مزاج میں رسے بسے ہوتے ہیں ، مذہب ان کی بیخ کنی نہیں کر سکتا ۔

اس بحث سے آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ سحر کا منطقی سقم ذہین اور سنجیدہ لوگوں کی نظر سے اتنے عرصے اوجھل کیسے رہا ؟ وہ اس سے ایسی امیدیں کیوں لگائے رہے جو کبھی بر نہیں آ سکتی تھیں ؟ انہوں نے یہ بھان متی کا کھیل کس دل سے جاری رکھا ؟ انہوں نے اپنی خرافات بڑ ہڑانی چھوڑ کیوں نہیں دی جس کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا ؟ ایسے عقائد پر کس واسطے قائم رہے جو تجربے سے قطعاً غلط ثابت ہو چکے تھے ؟ انہیں ایسے تجربات دہرانے کی ہمت کیسے ہوئی جو پہلے اکثر ناکام ہو چکے تھے ؟ اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ سحر جس مغالطے سے عبارت ہے اس کا پتا چلانا آسان نہ تھا اور اس کی ناکامی ظاہر نہیں ہو پاتی تھی ، اس لیے کہ بہت سی صورتوں میں بلکہ شاید اکثر و بیشتر جس چیز کے لیے کوئی خاص رسم ادا کی جاتی وہ دیر یا سویر واقعی ظہور میں آ جاتی

اور یہ سمجھنے کے لیے غیر معمولی ذہانت درکار تھی کہ خود ان صورتوں میں جو کچھ ظہور میں آیا ہے وہ اس رسم کا لازمی نتیجہ نہیں جس رسم کا مقصد ہوا چلانا ، مینہ برسانا یا دشمن کا کام تمام کرنا ہو ۔ اس کے بعد ایسے کسی ناگزیر واقعے کا کبھی نہ کبھی پیش آنا لازمی امر ہے اور اگر غیر مہذب انسان اس واقعے کو براہ راست مذکورۂ بالا رسم کا نتیجہ اور اس کی تاثیر کا سب سے بڑا ثبوت سمجھتا تھا تو اس کی غلطی قابل در گزر تھی ۔ ان رسموں کا کم از کم معتدل منطقوں میں پورا پورا اثر ہوتا تھا جن کی مدد سے صبح کو آفتاب طلوع کرنا اور بہار میں زمین کو اپنے خواب سرما سے بیدار کرنا مقصود ہوتا ، اس لیے کہ یہاں روز مشرق میں نور کا تڑکا ہوتا ہے اور ہر سال بہار میں زمین پر جوبن آتا ہے ۔ لہذا عہد جاہلیت کا عملی انسان جس کی گھٹی میں قدیم روایات و عقائد پڑے ہوئے تھے ، متشکک اور اصلاح پسند فلسفی کی موشگافیوں پر کان نہ دھرتا ہوگا جو یہ کہنے کی جسارت کرتا کہ طلوع آفتاب یا آمد بہار بعض یومیہ یا سالانہ رسموں کو پابندی کے ساتھ ادا کرنے کا براہ راست نتیجہ نہیں ہو سکتی اور یہ رسمیں کسی وقت ادا نہ بھی کی جائیں یا انہیں قطعاً ترک کر دیا جائے تو شاید سورج اسی طرح نکلتا رہے اور درختوں پر اسی طرح بہار آتی رہے ۔ وحشی ان فلسفیانہ شکوک کو مخرب عقائد اور ایسی خیالی باتیں سمجھ کر غصے اور حقارت سے رد کر دیتا ہوگا جو تجربے کے خلاف ہوں ۔ وہ کہتا ہوگا ''کیا اس سے زیادہ کھلی ہوئی اور کوئی بات ہو سکتی ہے کہ ادھر میں اپنی ٹکے کی موم بتی جلاتا ہوں اور اُدھر آسمان پر آفتاب جگمگانے لگتا ہے ۔ مجھے کوئی بتائے تو سہی کہ جب میں اپنی سبز عبا پہنتا ہوں تو کیا درخت بھی وہی نہیں کرنے لگتے ؟ ان واقعات سے ہر کہ و مہ واقف ہے اور میں ان پر قائم ہوں ۔ میں ایک سیدھا سادہ عملی انسان ہوں اور ان لوگوں میں نہیں ہوں جو حکمت بگھارتے ہیں اور بال کی کھال نکالتے ہیں ۔ افکار و نظریات سب اپنی اپنی جگہ درست سہی اور اگر کسی کو ان سے شغف ہے تو مجھے اس پر قطعی کوئی اعتراض نہیں ،

بہ شرطیکہ کوئی ان پر عمل پیرا نہ ہو۔ میں تو حقائق پر قائم رہوں گا کیوں کہ اسی سے مجھے اپنے صحیح مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔"
اس طرز استدلال کا سقم ہم پر ظاہر ہے اس لیے کہ اس کا تعلق ایسے واقعات سے ہے، جن کے بارے میں عرصہ ہوا ہم ایک قطعی نتیجے پر پہنچ چکے ہیں، لیکن یہی طرز استدلال ایسے معاملات پر منطبق کیا جائے جو برطانوی ایوان میں کسی مباحثے کا موضوع ہوں تو یہ امر متنازعہ فیہ ہے کہ سامعین اس کی صحت و معقولیت کی داد نہ دیں گے اور مقرر کی اعتدال پسندی کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھیں گے۔ ان کی نظر میں اس مقرر کی ذہانت اور ظاہری شان کچھ نہ سہی، لیکن اس کی سنجیدگی اور معاملہ فہمی ضرور قابل قدر ہوگی۔ اگر اس قسم کا طرز استدلال ہمارے نزدیک معقول اور قابل قبول ہو تو اس کے سقم کا غیر مہذب آدمی کی نظر سے چھپا رہنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

پانچواں باب

# سحری موسمیات

**(۱) پیشہ ور ساحر:**—قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم دو قسم کے آدم زاد خداؤں کی بحث کے دوران میں سحر کی الجھنوں سے دو چار ہوئے تھے ۔ اسی تصور کے سہارے ہم ایک بھول بھلیاں میں چکر کاٹتے ہوئے کسی قدر بلند مقام پر نکل آئے ہیں ۔ یہاں ہمارے لیے اس کا موقع ہے کہ کچھ دیر سستاتے ہوئے اس منزل پر ایک سرسری نظر اور ڈال لیں جو ہم سر کر آئے ہیں اور پھر اگلی منزلوں کی طرف بڑھے چلیں جن کے لیے ہمیں اس سے کہیں زیادہ لمبی اور کٹھن چڑھائی طے کرنی ہے ۔

اوپر جو بحث گزر چکی ہے ، اس کی بناء پر دو مختلف انسانی خداؤں میں امتیاز ممکن ہے ۔ ان میں ایک کی نوعیت سحری ہے اور دوسرے کی مذہبی ۔ مذہبی قسم کے انسانی خدا کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ طویل یا مختصر مدت کے لیے جسم انسانی میں متشکل ہوتا ہے اور اس کا لبد خاکی کے وسیلے سے اپنے استدراج کا مظاہرہ کرتا ہے اور غیب کی باتیں بتاتا ہے ۔ اسے ملہم بالغیب اور متشکل قسم کے انسانی خدا کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے ۔ اس خدائے مجازی کی ذات میں انسانی قالب کی حیثیت ایک ایسے مٹی کے برتن کی سی ہے جس میں ربانی اور غیرفانی روح بھری ہو ۔

اس کے برعکس سحری قسم کا انسانی خدا محض ایک انسان ہوتا ہے اور اسے غیر معمولی حد تک وہ طاقت حاصل ہوتی ہے جس کے کسی نہ کسی حد تک بہ‌زعم خود اس جیسے دوسرے انسان بھی حامل ہوتے ہیں ، اس لیے کہ غیر ترقی یافتہ معاشرے میں کوئی فرد بشر ایسا نہیں ہوتا جسے جادو سے تھوڑا بہت مس نہ ہو ۔ اس طرح مذہب والے یا ملہم یا لغیب آدم زاد خدا کی خدائی کا سر چشمہ وہ ذات کبریا ہے جس نے اپنے مقام اعلیٰ و ارفع سے اتر کر اپنے نور کو کسی بھدے سے قالب خاکی میں چھپا لیا ہو ۔ بر خلاف اس کے سحری قسم کے آدم زاد خدا کی غیر معمولی طاقت فطرت سے ایک خاص ربط یا مشارکت کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ وہ محض ایک ایسے ظرف سے عبارت نہیں جس میں روح ربانی سما گئی ہو بلکہ اس کا ہر بن مو روح اور جسم دونوں کے دونوں عالم خارجی سے اس طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ اس کے ہاتھ کے لمس یا سر کی جنبش سے عالم اشیاء کے تار و پود میں اہتزاز پیدا ہو جاتا ہے ۔ دوسری طرف اس کا خدائی جسم ماحول کے ایسے خفیف تغیرات کو شدت سے محسوس کر جاتا ہے جن کا عام انسان پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ لیکن ان دونوں قسم کے خداؤں کے درمیان یہ نظری حد فاصل کتنی ہی واضح کیوں نہ ہو ، عملی طور پر ان میں کوئی بین فرق نظر نہیں آتا ، لہذا آگے جو کچھ کہا جائے گا اس میں ان کے اس نظری امتیاز پر زور نہیں دیا جائے گا ۔

ہم دیکھ آئے ہیں کہ فن سحر سے یا تو انفرادی بھلائی مقصود ہوتی ہے یا اجتماعی ۔ ان دونوں مقاصد کی مناسبت سے اسے ذاتی یا پیشہ ورانہ سحر کہا جا سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ معاشرے میں پیشہ ور ساحر کو بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے اور اگر وہ قابل اور دور اندیش ہو تو اپنی اس حیثیت سے رفتہ رفتہ ترقی کرکے بادشاہت یا سرداری کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے ۔ اس طرح پیشہ ورانہ سحر کی تحقیق سے ابتدائی عہد کی بادشاہت کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے کیوں کہ بظاہر

غیر مہذب سوسائٹی میں بہت سے بادشاہوں اور سرداروں کا اقتدار بڑی حد تک ساحروں کی حیثیت سے ان کی مقبولیت و شہرت کا رہین منت تھا ۔

ان رفاہی مقاصد میں ، جنھیں حاصل کرنے کے لیے سحر سے کام لیا جاتا ہو ، سب سے ضروری خوراک کی معقول مقدار بہم پہنچانا ہے ۔ گزشتہ صفحات میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ خوراک کے فراہم کرنے والے ، یعنی شکاری ، ماہی گیر اور کسان سب کے سب اپنے اپنے کاموں کی انجام دہی میں سحر سے کام لیتے ہیں ۔ لیکن وہ باضابطہ عاملوں کی حیثیت سے ایسا نہیں کرتے ۔ ان کے اس فعل کی نوعیت محض ذاتی ہوتی ہے جس سے ان کے اپنے کنبے کا فائدہ مقصود ہوتا ہے ۔ لیکن جب خود شکاریوں ، ماہی گیروں اور کسانوں کی بجائے ان کی طرف سے پیشہ ور ساحر رسمیں ادا کرنے لگے تو صورت حال بدل جاتی ہے ۔ غیر مہذب معاشرے کا ہر فرد ، جس میں عموماً روزگار کی تفریق نہیں پائی جاتی اور تقسیم محنت کی بناء پر ابھی طبقاتی اختلافات ظاہر نہیں ہوتے ، اپنا ساحر آپ ہوتا ہے ۔ وہ اپنے فائدے اور دشمن کے نقصان کے لیے خود جادو ٹونے کرتا ہے لیکن جب ساحرین کا ایک خاص طبقہ وجود میں آجاتا ہے تو ترقی کا ایک نمایاں قدم آگے بڑھتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں انسان کے عمرانی ارتقاء کے اس مرحلے پر چند خاص آدمیوں کو اس کام کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی فنی مہارت سے ساری جماعت کو مستفیض کریں ، خواہ ان کی مہارت و اختصاص کو دکھ درد کے علاج ، مستقبل کی بائیں بتانے ، موسم کے نظم و ضبط کے لیے بروئے کار لایا جائے یا مفاد عامہ سے متعلق کسی اور مقصد کے لیے ۔ یہ سحر پیشہ طبقہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جو غیر مؤثر اور دور از کار ذرائع اختیار کرتا ہے ، ان کی وجہ سے ہمیں خود اس طبقے کی اہمیت کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر لینی چاہیں ۔ اس انجمن میں ہمیں ایسے لوگ اکٹھے نظر آتے ہیں جو کم از کم جاہلیت کے ابتدائی مراحل طے ہونے کے بعد معاشی جست و خیز

سے الگ تھلگ فطرت کے راز ھائے سربستہ کی تحقیقات کے لیے وقف ھوں ۔ اپنے اس مخصوص کام کو انجام دینے کے لیے یہ لوگ نہ صرف محنت و مشقت اور کمائی کی کھکیڑ سے آزاد ھوتے ھیں بلکہ معاشرہ اس کام میں ان کی پوری پوری حوصلہ افزائی کرتا ھے ۔ اپنے ھم‌قوموں سے زیادہ معلومات رکھنا اور ھر اس چیز سے واقفیت بہم پہنچانا ان کا فرض ھوتا ھے جو فطرت کے ساتھ انسان کی کشمکش میں انسان کی مدد و معاون ھو ؛ جو اس کے مصائب کم کرے اور اس کی عمر بڑھائے اور اسی سے ان کا مفاد بھی وابستہ ھوتا ھے ۔ ادویات و معدنیات کی خاصیتیں ، بارش و خشک سالی اور رعد و برق کے اسباب ، موسم کے تغیرات ، چاند کی مختلف شکلیں ، سورج کے یومیہ اور سالانہ سفر ، ستاروں کی حرکت ، اسرار حیات و ممات ، ان تمام چیزوں نے عصر کہن کے ان فلسفیوں کو نقش حیرت بنا دیا ھوگا اور ان میں ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی لگن پیدا کر دی ھوگی جو ان کے مؤکلوں کو روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے تھے اور جن کی طرف وہ بلا شبہ اپنے آئے دن کے تقاضوں سے ان فلسفیوں کی توجہ مبذول کرتے تھے ، اس لیے کہ یہ مؤکل ان سے یہ توقع رکھتے تھے کہ کارگہ فطرت میں جو زبردست عمل جاری ھے ، وہ نہ صرف ان پر روشن ھے بلکہ اس کا تعین و انضباط بھی انھیں کے دست قدرت میں ھے ۔ شروع شروع میں جو ان کے نشانے خطا ھوتے تھے تو اس کا کوئی چارہ نہ تھا ۔ حق تک پہنچنے کی آھستہ آھستہ اور پیہم کوشش اس بات پر موقوف ھوتی ھے کہ فرضیے مسلسل قائم کیے جائیں ، اور انھیں تجربے کی کسوٹی پر جانچ کر ان فرضیوں کو قبول کیا جائے جو واقعات سے مطابقت رکھتے ھوں اور دوسروں کو رد کر دیا جائے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت کے عمل تسبیب کے متعلق جاھل اور وحشی ساحر کے نظریات ھمیں صریح باطل و مہمل نظر آئیں گے ، تاھم اس کے دور میں انھی نظریوں کو جائز اور معقول فرضیوں کی حیثیت حاصل تھی گو تجربے نے انھیں غلط ثابت کر دیا ۔ تضحیک اور ملامت کے سزاوار وہ نہیں جنھوں نے

یہ سیدھے سادے نظریے قائم کیے بلکہ وہ لوگ ہیں جو بہتر نظریوں کے منظر عام پر آنے کے بعد بھی ان پر اڑے رہے ۔ تلاش حق سے جس طرح ان وحشی جادوگروں کا مفاد وابستہ تھا اس طرح یقیناً کبھی کسی کا نہ رہا تھا ۔ دانائی نہیں تو کم از کم دانائی کی نمائش ان کے لیے انتہا درجہ ضروری تھی ۔ ان کی ایک غلطی بھی پکڑی جاتی تو ان کی جان کے لالے پڑ جاتے ۔ ظاہر ہے کہ انہیں اپنی بے علمی کا پردہ رکھنے کے لیے فریب سے کام لینا پڑتا تھا ۔ یہی چیز ان کے لیے اس بات کی زبردست محرک بن گئی کہ نمائش علم کی جگہ سچا علم حاصل کیا جائے ، اس لیے کہ کسی چیز کے ظاہری علم سے اس کا سچ مچ جاننا بدرجہا بہتر ہوتا ہے ۔ لہذا ہم ساحروں کے لمبے چوڑے اور جھوٹے دعوؤں کے رد کرنے اور نوع انسان کو دھوکے میں رکھنے کے لیے ان کی مذمت کرنے میں لاکھ حق بجانب سہی ، لیکن اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بنیادی طور پر اس طبقے کے وجود میں آنے سے انسانیت کو بہ حیثیت مجموعی بے شمار فائدے پہنچے ۔ وہ نہ صرف ہمارے طبیبوں اور سرجنوں کے پیش رو تھے بلکہ علوم طبیعی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے محققوں اور موجدوں کا سلسلہ ان سے نہ ملتا ہو ۔ انہیں نے اس کام کی داغ بیل ڈالی جو اگلے جگوں ان کے جانشینوں کے ہاتھوں پروان چڑھا اور اس سے فیض کے چشمے جاری ہوگئے ۔ اگر اس کام کی بسم‌اللہ غلط تھی تو اس کا سبب خود ان لوگوں کی نا اہلی یا فریب‌کاری نہ تھی ، بلکہ وہ ناگزیر دشواریاں تھیں جو علم کی راہ میں پیش آیا کرتی ہیں ۔

**(۲) سحر اور ضبط بارش** :— پیشہ ور ساحر کے فلاحی کاموں میں ایک سب سے بڑا کام ضبط موسم ، خاص کر اس بات کا انتظام رکھنا ہے کہ بارش کافی مقدار میں ہوتی رہے ۔ پانی زندگی کے لوازم میں شامل ہے اور اس کے لیے اکثر ملکوں کا دار و مدار بارش پر ہے ۔ یہ نہ ہو تو نباتات پنپ نہ پائیں اور جانور اور انسان مر جائیں ۔ اس لیے غیر مہذب معاشرے میں اس شخص کو جس کا کام مینہ برسانا

ہو ، بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور بسا اوقات بارش کا پانی باقاعدگی کے ساتھ بہم پہنچانے کے لیے ساحروں کا ایک خاص طبقہ موجود ہوتا ہے ۔ یہ ساحر اپنے فرائض منصبی کے بجا لانے میں جن طریقوں سے کام لیتے ہیں وہ مثلی سحر پر مبنی ہوتے ہیں ؛ گو ہر صورت میں ایسا نہیں ہوتا ۔ اگر وہ مینہ برسانا چاہتے ہیں تو چھینٹے اڑا اڑا کر اس کی نقل کرتے ہیں یا بادلوں کا ڈھونگ رچاتے ہیں ۔ اگر انہیں امساک باراں مقصود ہو تو وہ پانی سے گریز کرتے ہیں اور آگ تاپتے ہیں تاکہ خشکی پیدا ہو ۔ جیسا کہ ہر پڑھا لکھا اور سنجیدہ قاری خود سمجھ سکتا ہے ، اس قسم کی کوششیں محض وسطی آسٹریلیا اور مشرقی و جنوبی افریقہ کے بعض حصوں جیسے گرم خطوں کے برہنہ باشندوں تک قطعی محدود نہیں ، جہاں مہینوں مطلع صاف رہتا ہے اور دھوپ کی تپش سے زمین پھنکتی اور العطش کرتی رہتی ہے ، بلکہ وہ ان لوگوں میں بھی عام ہیں یا رہی ہیں جو یورپ کی مرطوب آب و ہوا میں سانس لیتے ہیں اور بادی النظر میں مہذب و متمدن ہیں ۔ ذیل میں ضبط باراں کی ان کوششوں کی وہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو ذاتی اور پیشہ ورانہ ساحری سے اخذ کی گئی ہیں ۔

چنانچہ خشک سالی میں روس کے ایک گاؤں دورپت کے قریب تین آدمی ایک قدیم اور مقدس شجر زار میں صنوبر کے درختوں پر چڑھ جاتے تھے ۔ ان میں ایک ہتوڑی سے ایک کیتلی یا پیپے کو پیٹ پیٹ کر اس سے بادلوں کی سی گھن گرج پیدا کرنے کی کوشش کرتا ، دوسرا دو مشعلوں کو آپس میں لڑاتا جاتا تاکہ ان سے اس طرح شرارے اڑنے لگیں جیسے بجلی کوندتی ہو اور تیسرے آدمی کے پاس ، جو 'بارش گر' کہلاتا ، چھڑیوں کا ایک گٹھا ہوتا جنھیں وہ پانی سے بھرے ایک برتن میں ڈبو ڈبو کر ہر طرف چھینٹے اڑاتا جاتا ۔ خشک سالی سے نجات حاصل کرنے اور مینہ برسانے کی غرض سے موضع پلوسکا کی عورتیں رات کے وقت ننگی اپنے موضع کی سرحدوں تک جاتی ہیں اور زمین پر پانی انڈیل آتی ہیں ۔ نیوگنی کے مغرب میں ایک جزیرے ہاما میرا یا ہیلولو کا جادوگر بارش کے لیے ایک خاص قسم کے درخت کی ڈالی پانی میں بھگو بھگو

کر اس سے ہر طرف چھڑکاؤ کرتا ہے ۔ نیو برٹن (ملینیشیا کا ایک جزیرہ) میں بارش گر ایک قسم کی بیل کے پتے لے کر، جس میں سرخ اور سبز دھاریاں ہوتی ہیں ، انھیں کیلے کے پتے میں لپیٹتا ہے اور اس پلندے کو تر کر کے زمین میں دبا دیتا ہے ، پھر اپنے منہ سے چھینٹے کی سی چھپ چھپ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ شمالی امریکہ کے اوماھا نامی باشندن کے ہاں جب بارش کی قلت سے اناج کی فصل مرجھانے لگتی ہے تو بفیلو (شمالی امریکہ میں ایک مقام کا نام)کی مقدس انجمن کے رکن ایک بڑی سی ناند میں پانی بھر دیتے ہیں اور اس کےگرد چار مرتبہ رقص کرتے ہیں ۔ ان میں ایک کمہر یا پھوار کی نقل اتارنے کے لیے اس ناند کا تھوڑا سا پانی منہ میں لے کر ہوا میں فوارے چھوڑتا ہے ، پھر ناند کو الٹ کر اس کا سارا پانی زمین پر انڈیل دیتا ہے ، اس کے ساتھ ہی وہ ناچنے والے سب گر پڑتے ہیں اور زمین پر بہتا ہوا پانی سڑپ لیتے ہیں ، جس سے ان کے چہرے کیچڑ میں لت پت ہو جاتے ہیں ۔ آخر میں وہ سب کے سب ہوا میں پچکاریاں مار مار کے کمہر کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ۔ اس کاروائی سے ان کی دانست میں فصل برباد نہیں ہونے پاتی ۔ فصل بہار میں شمالی امریکہ کے نیچیزی اپنی فصلوں کے لیے جادوگروں سے سازگار موسم خریدنے کے لیے ایک جگہ اکٹھے ہوتے تھے ۔ اگر انھیں بارش مطلوب ہوتی تو جادو گر روزے رکھتے اور پائپ جن میں پانی بھرا ہوتا ، منہ میں لگا کر رقص کرتے ۔ یہ پائپ سروں پر سے جھرنے کی ٹونٹی کی طرح چھدے ہوتے تھے ۔ مینہ برسانے والا جادوگر پھونک پھونک کر ان چھیدوں میں سے آسمان کے اس حصے کی طرف پانی اڑاتا جدھر بادل سب سے گہرے ہوتے ۔ لیکن اگر اسے مطلع صاف کرنا مقصود ہوتا تو وہ اپنے جھونپڑے کی چھت پر جا چڑھتا اور اپنا پورا زور لگا کر پھونکیں مارتا کہ بادل گزر جائیں ۔ وسطی انگونستان (جنوب مشرقی افریقہ) میں بارش وقت پر نہ ہو تو وہاں کے لوگ ایک عبادت گاہ میں پہنچتے ہیں جو برسات مندر کہلاتی ہے ۔ یہاں وہ گھاس پھوس صاف کر دیتے ہیں اور ان کا پیشوا زمین میں گڑھے ہوئے ایک برتن میں شراب انڈیلتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا ہے ''خدا وند چاؤٹا! آپ

کے دل میں ہمارے لیے رحم نہیں رہا ، آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں ، اس طرح تو ہم مر مٹیں گے ، اپنے بچوں پر کرم کیجیے اور بارش کیجیے، ہم یہ شراب آپ کی نذر کرتے ہیں۔'' پھر وہ سب مل کر بچی ہوئی شراب پی لیتے ہیں جس کے کچھ جرعے بچوں کو بھی دیے جاتے ہیں ۔ اس کے بعد وہ درختوں کی ٹہنیاں لے کر بارش کے لیے ناچتے اور گاتے بجاتے ہیں ، اور جب گاؤں لوٹتے ہیں تو اس کے دوازے پر انہیں پانی سے بھرا ایک برتن ملتا ہے جسے وہاں ایک بڑھیا رکھ جاتی ہے ۔ اس میں وہ ان ڈالیوں کو ڈبو ڈبو کر گھمانے لگتے ہیں تاکہ ہر طرف چھڑکاؤ ہو جائے ۔ اس کاروائی کے بعد بھیگے ہوئے بادلوں کا آن کر مینہ برسانا یقینی ہو جاتا ہے ۔ اس دستور میں مذہب اور سحر کا امتزاج نظر آتا ہے اس لیے کہ جہاں ڈالیوں کے ذریعے ہر سمت چھینٹے اڑانا سحری قسم کی چیز ہے ، وہاں بارش کے لیے پرارتھنا اور شراب کی نذر خالص مذہبی رسم ہے ۔ شمالی آسٹریلیا کے مارا قبیلے کا بارش کار جادوگر کسی جوہڑ پر جاتا ہے اور وہاں اپنا نغمۂ سحر گانے کے بعد اس کا پانی ہاتھوں سے لے لے کر پیتا ہے ، مختلف سمتوں میں کلیاں کرتا ہے، نہاتا ہے اور ادھر ادھر چھینٹے اڑاتا ہے ، پھر چپ چاپ ڈیرے لوٹ آتا ہے ۔ خیال ہے کہ اس کے نتیجے میں بارش ہونے لگتی ہے ۔ عرب مورخ مقریزی کے بیان کے بموجب حضرموت کے القمر نامی بدوی بارش کو روکنے کے لیے ایک خاص طریقے پر عمل کرتے تھے ۔ وہ ریگستان میں سے ایک خاص درخت کی ٹہنی توڑ لاتے اور اس میں آگ لگا دیتے۔ جب اس سے آنچ اٹھنے لگتی تو اس پر پانی چھڑک دیا جاتا ۔ جس طرح پانی اس جلتی لکڑی پر پڑ کر ہوا ہو جاتا تھا اسی طرح بارش کی شدت کم ہو جاتی ۔ کہا جاتا ہے کہ مانی پور کے بعض انگمیوں میں کچھ اسی قسم کی رسم جاری ہے لیکن اس سے ان کا مقصد حضرموتیوں کے بالکل برعکس مینہ کو روکنا نہیں بلکہ برسانا ہے ۔ ان کے ہاں گاؤں کا سردار جلتی ہوئی مشعل لے جا کر ایسے آدمی کی قبر پر رکھ دیتا ہے جس کی موت آگ لگنے سے واقع ہوئی ہو اور اسے پانی ڈال کر بجھا دیتا ہے ، ساتھ ہی بارش کے لیے دعا بھی کرتا جاتا ہے ۔ اس رسم میں پانی سے آگ کا بجھانا بارش کی

تمثیل ہے اور اس کی تاثیر میں اس متوفی شخص کے اثر سے اضافہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ، اس لیے کہ جل کر مرنے کی وجہ سے وہ بارش کے لیے یقیناً بے تاب ہوگا تاکہ اس کے جھلسے ہوئے جسم کو ٹھنڈک پہنچے اور اس کا درد کم ہو ۔

عربوں کے علاوہ دوسری قوموں نے بھی بارش روکنے کے لیے آگ سے کام لیا ہے ۔ چناں چہ نیوبرٹن کے سلکا پتھروں کو خوب آگ میں تپا کر انھیں برستے ہوئے پانی میں رکھ دیتے ہیں یا گرم گرم راکھ ہوا میں اڑاتے ہیں ۔ ان کے خیال کے بموجب اس سے بارش ذرا سی دیر میں تھم جاتی ہے ۔ تلنگوں کے ہاں یہ دستور ہے کہ ایک ننھی سی لڑکی کے ہاتھ میں جلتی ہوئی لکڑی تھما کر اسے برسات میں باہر نکال دیا جاتا ہے کہ لڑکی لکڑی بارش کو دکھائے ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے لگی جھڑی رک جائے گی ۔ نیوساؤتھ ویلز کی بندرگاہ اسٹیفنز کے جادوگر ہوا میں جلتی لکڑیاں اچھال اچھال کر بارش کو ہانکنے کی کوشش کیا کرتے تھے ۔ شمالی آسٹریلیا میں اینولا قبیلے کا کوئی شخص بھی کسی درخت کی تازہ شاخ کو آگ میں تپا کر اپنے اس ہتھیار سے ہوا پر وار کر دے تو بارش رک جاتی ہے ۔

قحط سالی میں وسطی آسٹریلیا کے ڈائری لوگ اپنے ملک کے حال زبوں اور اپنی گرسنگی پر چیخ چیخ کر گریہ و زاری کرتے ہیں ، اور اپنے اجداد کی روحوں سے ، جو ''مر مراؤں'' کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں ، التجا کرتے ہیں کہ وہ انھیں موسلا دھار مینہ برسانے کی طاقت عطا فرمائیں ۔ ان کے عقیدے کے بموجب ابر کی حیثیت ایک جسم کی ہے جس میں ان کی اور ہمسایہ قبیلوں کی رسوم اور ان کے اجداد کی روحوں کے اثر سے مینہ پیدا ہوتا ہے ۔ ابر سے بارش حاصل کرنے کا ان لوگوں کے ہاں یہ طریقہ رائج ہے کہ زمین میں تقریباً بارہ فٹ لمبا اور دس یا آٹھ فٹ چوڑا ایک گڑھا کھود کے اس پر لٹھوں اور ڈالیوں کی ایک مخروطی شکل کی جھونپڑی بنا دی جاتی ہے ۔ اس کے بعد کوئی معمر اور سر برآوردہ شخص ایک نوک دار سنگ چقماق سے دو ایسے جادوگروں کی فصد کھولتا ہے جن کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ انھیں

مرا مراؤں کی طرف سے الہام ہوا ہے اور پھر ان کی کہنیوں کے نیچے سے بہتا ہوا خون قبیلے کے دوسرے لوگوں پر ٹپکایا جاتا ہے جو اس جھونپڑی میں جڑے بیٹھے ہوتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دونوں زخمی جادوگر اپنی مٹھیوں میں رواں بھر بھر کے اسے چاروں طرف بکھیرتے جاتے ہیں ، جس میں سے کچھ ان کے ساتھیوں کے جسم پر چپک کر رہ جاتا ہے اور کچھ ہوا میں اڑنے لگتا ہے ۔ ان لوگوں کے خیال کے بموجب خون بارش کی نمائندگی کرتا ہے اور رؤاں بادلوں کی ، نیز اس رسم کے دوران میں دو بڑے بڑے پتھر جھونپڑی کے بیچوں بیچ رکھ دیے جاتے ہیں ۔ یہ گھٹا کے گھر کے آنے کی علامت اور بارش کا پیش خیمہ ہوتے ہیں ۔ ان پتھروں کو وہ دونوں جادوگر دس پندرہ میل کے فاصلے پر کسی اونچے سے اونچے درخت پر جہاں تک وہ چڑھ سکتے ہوں ، رکھ دیتے ہیں ۔ اس اثناء میں ان کے دوسرے ساتھی کھریا مٹی پیس کر اسے کسی کنوئیں میں پھینک آتے ہیں ۔ اسے ان کے اجداد کی روحیں دیکھ لیتی ہیں اور اسی وقت آسمان پر بادل بھیج دیتی ہیں ۔ آخر میں سب پیر و جوان جھونپڑی کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور مینڈھوں کی طرح جھک جھک کر اس میں سر مارتے ہیں اور ایک طرف سے گھس کر دوسری طرف نکل جاتے ہیں ۔ جب تک کہ اس جھونپڑی کے پرخچے نہیں اڑ جاتے ان کی یہ کار روائی جاری رہتی ہے ۔ لیکن اس میں انہیں اپنے ہاتھ یا بازو استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ، البتہ جب صرف لٹھے رہ جاتے ہیں تو وہ انہیں ہاتھ سے گرا سکتے ہیں ۔ جھونپڑی میں ان آدمیوں کا اپنے سروں کو دھنسانا بادلوں میں چھید کرنے کی علامت ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ دو پتھروں کا درختوں میں بلندی پر لے جا کر رکھنا جو فرضی بادلوں کی حیثیت رکھتے ہیں ، اصلی بادلوں کو آسمان پر اٹھا کر لانے کی ایک صورت ہے ۔ ڈائری لوگوں کا یہ خیال ہے کہ لڑکوں کے حشفے کے غلاف جو ختنہ میں قطع کیے جاتے ہیں ، مینہ پیدا کرنے کی بڑی طاقت رکھتے ہیں ۔ چناں چہ قبیلے کی مجلس اعلیٰ کے پاس ان قلفوں یا غلافوں کا ایک وافر ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے جنھیں کتے اور کارپیٹ سانپ (ایک قسم کا رنگین سانپ جو

آسٹریلیا میں پیدا ہوتا ہے) کی چربی کے ساتھ پروں میں لپیٹ کر بڑی احتیاط سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے ۔ اس پلندے کو عورت کسی صورت میں نہیں دیکھ سکتی ۔ جب بارش کے لیے رسم ادا کرلی جاتی ہے تو استعمال شدہ غلاف کو زمین میں دبا دیا جاتا ہے ، کیوں کہ اس کی قوت ختم ہو جاتی ہے ۔ مینہ برس چکنے کے بعد قبیلے کے بعض لوگ اپنا ایک آپریشن کراتے ہیں جس میں ان کے سینے یا بازو کی کھال پر نوک دار چقماق سے خراش لگائی جاتی ہے ، پھر اسے ایک چپٹی لکڑی سے تھپ تھپایا جاتا ہے تاکہ اس سے خون زیادہ سے زیادہ جاری ہو ۔ نیز اس زخم میں گیرو مل دیا جاتا ہے ۔ اس طرح ان کی کھال پر داغ ابھر آتے ہیں ۔ اس قوم کے لوگ اپنی اس کارروائی کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ مینہ برسنے سے انھیں خوشی ہوتی ہے اور ان کے ابھرے ہوئے داغوں اور مینہ میں ایک ربط ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس عمل جراحت سے انھیں کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوتی ، کیوں کہ آپریشن کرانے والا زخم لگتے وقت ہنستا بولتا رہتا ہے ، بلکہ ننھے ننھے بچے بھی جراح کو گھیرے بڑے صبر سے آپریشن کراتے دیکھے گئے تھے ۔ آپریشن کے بعد وہ سب سینے پھلا پھلا کر یہ راگ الاپتے ہوئے بھاگ گئے کہ بارش آئے اور ان کی چھاتی پیٹے ۔ تاہم جب اگلے دن ان کی کھال اکڑ گئی اور زخم سوج گئے تو ان کی وہ خوشی باقی نہ رہی ۔ جاوا میں جب بارش کی ضرورت ہو تو بعض وقت دو آدمی ایک دوسرے کے قمچیاں مارنی شروع کر دیتے ہیں ، یہاں تک کہ ان کی پیٹھ سے خون جاری ہو جاتا ہے ۔ یہ خون رواں بارش کی علامت ہے ۔ اس کے متعلق یقیناً وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے اثر سے بارش ہونے لگے گی ۔ حبشہ کے ایک ضلع ایگ ہیو کے لوگ مینہ برسانے کی غرض سے ہر سال جنوری میں خونیں لڑائیوں میں مصروف ہو جاتے تھے ۔ چند سال ہوئے شہنشاہ مینیلیک نے اس رسم کی قطعاً ممانعت کر دی تھی مگر اگلے سال جو بارش ہوئی وہ ناکافی تھی ، لوگوں نے ایسا ہلڑ مچایا کہ شہنشاہ کو اپنے حکم میں ترمیم کرنی پڑی اور یہ سفاکانہ رسم سال میں دو دن کے لیے پھر سے جاری ہوگئی

جس مصنف نے اس رسم کا حوالہ دیا ہے اس کی رائے میں ان موقعوں پر کشت و خون کی حیثیت ایک قربانی کی سی ہے جو بارش پر حکومت کرنے والی روحوں کی استمالت کے لیے دی جاتی ہے۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آسٹریلیا اور جاوا والی رسموں کی طرح یہ بھی اصل میں بارش کی تمثیل ہے۔ بعلی اوتار (بعل، فونیقی اور کنعانی اقوام کا سب سے بڑا دیوتا۔ اصل میں اس نام کے متعدد دیوتا تھے جن میں ایک بعل ذیبوب بھی تھا، اسے ملٹن نے اپنی فردوس گم شدہ میں ابلیس کا دست راست بتایا ہے۔) جو مینہ برسانے کے لیے اپنے جسم پر چاقو سے خراش لگا کر خون بہایا کرتے تھے، اسی اصول پر کار بند رہے ہوں گے۔

ایک عام عقیدہ یہ ہے کہ توائم بچے اپنے اندر ایسی سحری قوت رکھتے ہیں کہ فطرت، خاص کر تغیرات موسم، ان کے بس میں ہوتے ہیں۔ اس عجیب توہم میں برطانوی کولمبیا کے بعض قبائل مبتلا ہیں اور اسی وجہ سے انہیں جڑواں بچوں کے والدین پر بعض خاص پابندیاں یا ٹیبو عائد کرنے پڑتے ہیں، گو ان کا مطلب واضح نہیں۔ چنانچہ اسی ملک کے ٹسمشی قبیلے کے اعتقاد کی رو سے کہ موسم کی عنان جڑواں بچوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اس لیے وہ باد و باراں سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ان بچوں کا سانس دھیما کر دیں، نیز ان کا خیال ہے کہ ایسے بچے جو چاہتے ہیں وہ پورا ہو جاتا ہے، اور جس شخص سے انہیں نفرت ہوتی ہے اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں، لہذا اس قبیلے کے لوگ جڑواں بچوں سے خائف رہتے ہیں۔ ان میں یہ قوت بھی ہوتی ہے کہ ان کے بلانے سے سامن اور یولیکن مچھلی چلی آتی ہے؛ چنانچہ ان کے ہاں توام کے لیے جو نام رائج ہے اس کے معنی ''افراط کرنے'' کے ہیں۔ برطانوی کولمبیا کی کواکٹل نامی قوم کے نزدیک جڑواں بچے سامن مچھلی کی بدلی ہوئی صورت ہیں، اس لیے انہیں پانی کے پاس نہیں جانے دیا جاتا کہ کہیں وہ پھر سے سامن مچھلی میں نہ تبدیل ہو جائیں۔ یہ بچے اپنے دست و بازو کی حرکت سے کسی بھی سمت ہوا چلا سکتے ہیں۔ ان کے اثر سے موسم

بدل سکتا ہے اور اگر وہ لکڑی کا ایک لمبا سے جھنجھنا گھما دیں تو بیماری کا بھی علاج ہو جاتا ہے ۔ اسی ملک کی نوٹکا قوم کا بھی اس بات پر اعتقاد ہے کہ جڑواں بچوں کا سامن مچھلی سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے ۔ اس لیے اس قوم میں توام بچوں کو مچھلی کے شکار کی اجازت نہیں اور تازہ مچھلی کھانا تو ایک طرف ان کے لیے اس کا ہاتھ میں لینا بھی منع ہے ، انھیں موسم میں خوشگوار یا ناخوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کی طاقت حاصل ہے ، وہ اپنے چہروں پر کالک مل کر دھو دیں تو بارش ہوسکتی ہے ۔ گویا ان کا یہ عمل سیاہ بادلوں سے بوندا باندی کی علامت ہے ۔ توام بچوں کے بارے میں امریکہ کے تھاملپسن نامی قبیلہ کی طرح شواپ لوگوں کا بھی یہ خیال ہے کہ وہ بھورے ریچھ سے نسبت رکھتے ہیں ۔ چناں چہ ان کے ہاں وہ ''بھورے ریچھ کے بچے'' کہلاتے ہیں اور فوق الفطرت قوتوں کے حامل سمجھے جاتے ہیں ۔ خاص طور پر موسمی تغیرات ان کے اختیار میں ہیں ، خواہ وہ اچھے ہوں یا برے ۔ وہ بالٹی سے ہوا میں پانی اڑا دیں تو بارش ہو جائے ، کسی جریب سے بند لکڑی کی چپٹی سی تختی کو ہلانا شروع کر دیں تو موسم خوشگوار ہو جائے اور صنوبر کی شاخیں ہوا کی طرف نصب کر دیں تو طوفان آ جائے ۔

نیز جنوب مشرقی افریقہ کے بانتو حبشیوں میں ، جو خلیج ڈیلاگوا کے کنارے آباد ہیں ، بارونگا نامی ایک قبیلہ موسمی تغیرات پر توام بچوں کے اثر کا قائل ہے ۔ ایسے بچوں کی ماں اس قبیلے میں ''ٹیلو'' یعنی آسمان کہلاتی ہے اور ایام شیر خواری میں خود انھیں ''آسمان کے بچے'' کہا جاتا ہے ۔ چناں چہ جب لوگ ان طوفانوں کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں جو ستمبر اور اکتوبر میں آیا کرتے ہیں ، جب خشک سالی سے قحط کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں اور زمین ساری متواتر چھ مہینے تک کڑی دھوپ میں تپتے تپتے جھلس جاتی ہے اور ابرنسیاں کے لیے ترستی ہے تو عورتیں بارش کے لیے کچھ رسمیں ادا کرتی ہیں ۔ وہ اپنے سارے کپڑے اتار پھینکتی ہیں اور ان کی جگہ گھاس پھونس کی پٹیاں لپیٹ لیتی ہیں یا ایک خاص قسم کی بیل کے بنے ہوئے گھگرے پہن

لیتی ہیں ۔ اس لباس میں وہ خاص قسم کی آوازیں نکالتی اور عریاں گیت گاتی کنوئیں کنوئیں پھرتی ہیں اور ان میں جو مٹی اور گندگی جمع ہوتی ہے اسے صاف کرتی جاتی ہیں ۔ یہ کنوئیں محض ریت میں کھدے ہوئے سوراخ ہوتے ہیں جن میں کچھ گندا پانی جمع رہتا ہے ۔ اس کے علاوہ ، انھیں اپنی جڑواں بچے جننے والی سہیلی کے ہاں جانا پڑتا ہے اور اسے اس پانی میں نہلانا پڑتا ہے جو وہ اپنے ساتھ صراحیوں میں لے جاتی ہیں ۔ اس کارروائی کے بعد وہ اپنی ہزلیات گاتی اور بڑی بے حیائی سے رقص کرتی وہاں سے روانہ ہو جاتی ہیں ۔ جب یہ برگ پوش عورتیں اپنے گشت پر ہوں تو انھیں کوئی مرد آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا ، اور جو کبھی کسی مرد سے ان کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو وہ اسے مار پیٹ کے اپنے راستے سے ہٹا دیتی ہیں ۔ کنوؤں کی صفائی سے فارغ ہو چکنے کے بعد انھیں مقدس شجر زار میں اپنے آباؤ و اجداد کی قبروں پر پانی ڈالنا پڑتا ہے ۔ ان کے ہاں اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جادوگر کے کہنے سے اپنے قبیلے کے توام بچوں کی قبروں پر پہنچتی ہیں اور انھیں بھگو آتی ہیں ، کیوں کہ ان کے خیال میں، توام بچوں کی قبریں تر رہنی چاہیں ۔ اسی وجہ سے ایسے آدمیوں کو تالاب کے کنارے دفن کیا جاتا ہے ۔ اگر خشک سالی میں بارش کے لیے ان کی کوئی کوشش کارگر نہ ہو تو انھیں یاد آتا ہے کہ فلاں فلاں توائم کو پہاڑی کی ڈھلان پر خشک جگہ دفن کیا گیا تھا ۔ اس وقت جادوگر ان سے کہتا ہے ۔ ''آسمان کا آگ برسانا کوئی تعجب کی بات نہیں ، اس کی لاش نکال لو اور اسے تالاب کے کنارے گاڑھ دو ۔'' اس کے اس حکم کی فوراً تعمیل کر دی جاتی ہے ، کیوں کہ ان کے خیال میں بارش کی بس یہی ایک سبیل ہے ۔

مذکورالصدر واقعات میں چند ایک سے ان قاعدوں کے متعلق پروفیسر اولڈن برگ کی رائے کی پوری تائید ہوتی ہے ، جو سماوید کا کا ایک خاص بھجن سیکھتے وقت کسی برہمن پر عائد ہوتے تھے ۔ یہ وید قدیم بھجنوں پر مشتمل ہے اور اس کے جس بھجن سے یہاں ہمیں بحث ہے ، وہ ''سکوری والا گیت'' کہلاتا ہے ۔ اس گیت کے بارے

میں عقیدہ تھا کہ اس میں اندر کے حربے کی طاقت یعنی گھن گرج سموئی ہوئی ہے ، اور اس خطرناک توانائی کے سبب اس من چلے طالب علم کو جو اس گیت پر عبور حاصل کرنا چاہتا ، دوسرے آدمیوں سے علیحدہ رہنا اور گاؤں چھوڑ کر جنگل میں سکونت اختیار کرنی پڑتی ۔ اس کے اس بن باس کی مدت مختلف پنڈتوں کی رائے کے بموجب ایک سے لے کر بارہ سال تک ہوتی ، جس کے دوران میں اسے بعض اصولوں کی پابندی ضروری ہوتی ۔ ان میں چند اصول یہ تھے کہ دن میں تین مرتبہ اسے پانی چھونا چاہیے ؛ کالے کپڑے پہننے چاہییں ، غذا ایسی کھانی چاہیے جو کالی چیزوں پر مشتمل ہو ، بارش میں اسے آسمان کے نیچے بیٹھا رہنا چاہیے اور ساتھ ہی یہ الفاظ دہرانے چاہیں ''پانی سکوری والا گیت ہے ۔'' بجلی کوندتی تو وہ کہہ اٹھتا ''یہ سکوری والے گیت کی مانند ہے ۔'' بادل کی گرج پر اسے کہنا پڑتا ''یہ پرماتما گرج رہا ہے ۔'' ندی پار کرنے کے لیے اسے پانی میں سے چلنا ضروری تھا ۔ وہ جہاز یا کشتی پر قدم نہیں رکھ سکتا تھا بہ جز اس کے کہ اسے اپنی جان کا خطرہ ہو ، اور اس صورت میں بھی اس کے لیے پانی کو چھونا لازمی تھا ، کیوں کہ مثل مشہور تھی کہ ''پانی میں سکوری والے گیت کی تاثیر ہے ۔'' آخر میں جب اس کو خود اس بھجن کے سیکھنے کی اجازت ملتی تو اسے اس پانی میں اپنے ہاتھ بھگونے پڑتے جو ایک برتن میں بھرا ہوتا اور جس میں مختلف قسم کے بوٹے پڑے ہوتے ۔ جب کوئی شخص یہ تمام مرحلے طے کر لیتا تو کہا جاتا کہ برسات کا دیوتا پرجنیا اس کی خواہش کے بموجب بارش کر دیتا ہے ۔ جیسا کہ پروفیسر اولڈن برگ کا کہنا ہے ، یہ امر بالکل واضح ہے کہ ''ان تمام قواعد سے برہمن کو پانی کی قوتوں سے متحد کرنا مقصود تھا ، تاکہ اسے ایک طرح سے ان قوتوں کا حلیف بنایا جائے اور ان کی دشمنی سے محفوظ رکھا جائے ۔'' سیاہ لباس اور سیاہ غذا کا بھی کچھ یہی مطلب تھا ، اور اس رسم کے پیش نظر جس میں بارش کی سیاہ خاصیت کی مناسبت سے بارش کے لیے سیاہ قربانی دی جاتی ہے ، اس میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ مذکورہ بالا چیزوں میں سیاہ بادلوں

ھی کی طرف اشارہ ھے ۔ ایک اور بارشی طلسم کے بارے میں صاف یہ کہا جاتا ھے کہ ''وہ سیاہ کناری کا سیاہ لباس پہنتا ھے اس لیے کہ یہی برسات کی ماھیت ھے ۔'' لہذا یہ فرض کرنا بے جا نہ ھو گا کہ ویدی دبستانوں کے رسوم و افکار میں ایسے سحری دستور محفوظ چلے آتے ھیں جو نہایت قدیم زمانے کی یادگار ھیں اور جن کا مقصد یہ تھا کہ بارش گر ساحر کو اس کے کار منصبی کی تربیت دے کر اس منصب کے لیے وقف کر دیا جائے۔

یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ھو گا کہ جن صورتوں میں نتیجہ اس کے برعکس مقصود ھوتا ، اگلے وقتوں کی منطق کی رو سے موسمی پنڈت پر بالکل متضاد ضابطہ عمل عائد ھوتا تھا ۔ منطقہ حارہ کے جزیرے جاوا میں جہاں نباتات کی افراط کے سبب بارش کثرت سے ھوتی ھے ، مینہ برسانے والی رسمیں کم یاب ھیں ، لیکن اسے روکنے والی رسمیں بہ کثرت جاری ھیں ۔ جب کسی شخص کو کوئی ضیافت کرنی ھوتی ھے تو وہ موسمی پنڈت کے ھاں جاتا ھے اور اس سے فرمائش کرتا ھے کہ وہ بادلوں کو اوپر ھی اوپر روک دے ۔ اگر پنڈت اپنے استدراج سے کام لینے پر رضامند ھو جائے تو شخص مذکور کے رخصت ھوتے ھی وہ اپنے آپ کو چند قواعد کا پابند کر لیتا ھے جن کی رو سے اسے روزہ رکھنا ضروری ھے اور کسی صورت میں پانی کو چھونے کی اجازت نہیں ۔ ادھر جب تک تقریب جاری رھے میزبان اور اس کے ملازموں کو ، بلا تخصیص مرد و زن ، کپڑے دھونے یا غسل کرنے کی ممانعت ھوتی ھے اور تمام وقت پاک اور پرھیزگار رھنا پڑتا ھے ۔ پنڈت اپنے سونے کے کمرے میں ایک چٹائی پر جا بیٹھتا ھے اور تقریب شروع ھونے سے کچھ دیر پہلے ایک روغنی چراغ کے سامنے یہ پرارتھنا یا منتر پڑھتا ھے ۔ ''دادا جان اور دادی جان سرو کویل ! (اس نام کی کوئی خصوصیت نہیں ھے ، بعض وقت اس کی جگہ دوسرے نام بھی استعمال کیے جاتے ھیں) اپنے دیس لوٹ جاؤ ، تمہارا دیس اکمیت ھے ۔ اپنے پیپے کو رکھ دو اور اسے اچھی طرح بند کر دو تاکہ اس سے ایک بوند بھی نہ ٹپکے۔''

اس کے ساتھ ساتھ وہ بخورات جلاتا اور چھت کی طرف دیکھتا جاتا ہے ۔ اسی طرح ٹوراڈ جاؤں کے ہاں بارشی ساحر جس کا کام مینہ کا خطرہ دور کرنا ہے ، اس چیز کا خاص خیال رکھتا ہے کہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے سے قبل ان کے دوران میں یا بعد اس کے جسم کو پانی نہ لگنے پائے ۔ وہ غسل سے پرہیز کرتا ہے ، ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کھاتا ہے ، کھجور کی شراب کے سوا، کچھ نہیں پیتا اور جب اسے کوئی ندی پار کرنی پڑے تو اس کے لیے ایسا ذریعہ اختیار کرتا ہے کہ اس کے پاؤں پانی سے بچے رہیں ۔ اس تیاری کے بعد وہ گاؤں سے باہر کسی دھان کے کھیت میں اپنے لیے ایک جھونپڑی ڈلواتا ہے ، اس میں تھوڑی سی آگ جلانے رکھتا ہے جو کسی حالت میں نہیں بجھنی چاہیے ۔ اس آگ میں وہ مختلف قسم کی لکڑیاں جلاتا ہے جن کے متعلق خیال ہے کہ ان کی تاثیر سے بادل اڑ جاتے ہیں ، پھر وہ اپنے ہاتھ میں کچھ پتوں اور چھال کا پلندا لیے اس سمت پھونکیں مارتا ہے جدھر سے بارش آنے کا خطرہ ہو ۔ یہ چھال اور پتے اپنی کیمیائی ترکیب کی بجائے محض اپنے ناموں کے سبب ، جن سے کوئی خشک یا بخار بن کر اڑ جانے والی شے مراد ہے ، بادلوں کو روکنے کی خاصیت رکھتے ہیں ۔ اگر ساحر مذکور اپنے کام میں لگا ہو اور اس دوران میں آسمان پر بادل نمودار ہو جائیں تو وہ ہتھیلی میں چونا لے کر ان کی طرف پھونک دیتا ہے ۔ چونا چوں کہ خشک ہوتا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ وہ بھیگے بادلوں کو منتشر کرنے کے لیے تیربہ ہدف چیز ہے ۔ اس کے بعد بارش کی ضرورت ہو تو اس کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ آگ پر پانی چھڑک دے ، فوراً موسلا دھار بارش ہونے لگے گی ۔

یہاں آپ یہ دیکھیں گے کہ کس طرح جاویوں اور ٹوراڈ جاؤں کی مینہ روکنے والی اور ہندوستانیوں کی مینہ برسانے والی رسمیں ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔ ہندوستانی پنڈت کو خاص خاص موقعوں کے علاوہ دن میں باقاعدہ تین مرتبہ پانی چھونے کا حکم ہے ، بر خلاف اس کے جاوی اور ٹوراڈجا جادوگر کو اس کی سخت ممانعت ہے ۔

ہندوستان والا جادوگر جنگل میں سکونت اختیار کرتا ہے اور برسٹے پانی میں بھی اسے سر چھپانے کی اجازت نہیں ، ادھر جاوی اور ٹوراڈجا جادوگر اپنا کام انجام دیتے وقت مکان یا جھونپڑی میں جا بیٹھتا ہے ۔ اول الذکر بارش میں بھیگ کے اور اس کے گن گا کے پانی سے اپنی نسبت و مشارکت ظاہر کرتا ہے اور جاوی یا ٹوراڈجا جادوگر چراغ یا آگ جلا کے بارش کا خطرہ دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ با ایں ہمہ ان تینوں جادوگروں کے عمل کی تہ میں ایک ہی اصول کار فرما ہے ۔ ان میں ہر ایک اپنے آپ پر ایک طفلانہ فریب کے ذریعے موسم کی وہ کیفیت طاری کر لیتا ہے جو اسے حقیقت میں پیدا کرنی مقصود ہوتی ہے ۔ یہ اصل میں وہی پرانا دھوکا ہے کہ نتائج اسباب کے مماثل ہوتے ہیں ، گویا موسم میں رطوبت پیدا کرنا چاہو تو اپنے آپ کو تر کر لو اور خشکی پیدا کرنا چاہو تو اپنے آپ کو خشک رکھو ۔

جنوب مشرقی یورپ میں بارش کرنے کے لیے آج بھی ایسی رسمیں جاری ہیں جو نہ صرف بعینہ اس مذکورہ انداز فکر پر مبنی ہیں بلکہ جزئیات کے اعتبار سے وہ ان رسموں سے بڑی مشابہت رکھتی ہیں جو اسی مقصد سے خلیج ڈیلاگوا والی بارونگا قوم میں ادا کی جاتی ہیں ۔ یونان میں تھیسلی اور مقدونیہ والوں کے ہاں یہ دستور ہے کہ جب عرصے تک بارش نہ ہو تو بچوں کا ایک جلوس آس پاس کے کنوؤں اور چشموں پر بھیجا جاتا ہے ۔ ایک لڑکی پھولوں میں لدی آگے آگے چلتی ہے جسے ہر منزل پر اس کے ساتھی پانی میں بھگو کر شرابور کرتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ایک عمل پڑھتے ہیں جس کا کچھ حصہ یوں ہے :

اے پر پیریا ، شگفتہ و تر !
اس سارے علاقے کو تروتازہ کردے!
جنگل ، پہاڑ ، شاہراہ ،
جہاں جہاں سے تو گزرے ، یہ دعا کرتی جا ،
اے خدا ، اس زمین پر
ابر رحمت بھیج دے

تاکہ کھیتوں میں فصل
اور انگور کی بیل پر بار آئے
دانہ پھولے ، موٹا ہو
اور لوگ یہاں کے سب مالا مال ہو جائیں ۔

اہل سربیا خشک سالی میں ایک لڑکی کو ننگا کرکے اسے ہری گھاس ، جڑی بوٹیوں اور پھولوں میں اس طرح ملبوس کر دیتے ہیں کہ اس کا چہرہ بھی نہیں دکھائی دیتا ۔ وہ اپنے اس بھیس میں ڈڈولا کہلاتی ہے ۔ لڑکیوں کا ایک ہجوم اسے لیے گاؤں میں سے گزرتا ہے ۔ وہ ہر گھر کے سامنے رکتی ہیں اور ان گیتوں میں سے ایک گیت گاتی ہیں جو 'ڈڈولا والے گیت' کہلاتے ہیں ، اور خود ڈڈولا ان کے بیچ میں چکر کھاتی اور ناچتی رہتی ہے ۔ ان میں ایک گیت کچھ اس طرح ہے :

ہم گاؤں سے گزریں ، بادل آسمان سے ،
ہم بادل سے تیز چلیں ، بادل ہم سے تیز
لو! اس دوڑ میں وہ ہم سے آگے نکل گیا ،
اور اناج اور انگور کی بیل کو تر کر ڈالا

ہندوستان کے علاقۂ پونا میں بارش نہ ہو تو لڑکے اپنے کسی ساتھی کو ننگا کرکے پتوں سے ڈھانک دیتے ہیں اور اسے 'بارش کا بادشاہ' کہتے ہیں ، پھر وہ اسے لے کر گاؤں میں گھر گھر پہنچتے ہیں ۔ گھر کا مالک یا اس کی بیوی اس بارش کے بادشاہ پر پانی چھڑکتی ہے اور اسے بہت سی چیزیں کھانے کو دیتی ہے ۔ جب وہ تمام گھروں سے ہو چکتے ہیں تو بارش کے بادشاہ کا لباس اتار دیا جاتا ہے اور سب مل کر وہ ساری چیزیں چٹ کر جاتے ہیں ۔

جنوبی اور مغربی روس میں بارشی افسوں کے طور پر رسم غسل ادا کی جاتی ہے ۔ بعض وقت یہ ہوا ہے کہ پادری کو اس کے حلقے کے لوگوں نے سروس ختم ہونے کے بعد زمین پر گرا کر نہلا ڈالا ، بعض وقت عورتیں کپڑے پہنے پہنے حضرت یحییٰ کے عرس کے دن ہجوم میں غسل کرتی ہیں اور اس کے ساتھ گھاس ڈالیوں اور جڑی بوٹیوں

کے بنے ہوئے ایک پتلے کو ، جو ان پیغمبر کی شبیہ سمجھا جاتا ہے پانی میں غوطے دیتی ہیں ۔ جنوبی روس کے ایک صوبے کورسک میں بارش نہ ہو تو عورتیں کسی راہ چلتے کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیتی ہیں یا اسے سر سے پاؤں تک بھگو دیتی ہیں ۔ آگے چل کر ہم یہ دیکھیں گے کہ کس طرح اجنبی راہ گیر کو اکثر ایک دیوتا یا فطرت کی ایک مجسم قوت تصور کیا جاتا ہے ۔ سرکاری دستاویزات میں درج ہے کہ ۱۷۹۰ء کی خشک سالی میں شیراؤٹز اور ورباؤٹز کے کسانوں نے اپنی عورتوں کو ایک جگہ جمع کرکے زبردستی نہلوایا تاکہ مینہ برسے ۔ بارش کے لیے ایک آرمینی عمل میں پادری کی بیوی کو پانی میں گرا کر شرابور کر دیا جاتا ہے ۔ شمالی افریقہ کے عربوں کے ہاں خشک سالی سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے کسی مذہبی اور پرہیزگار شخص کو اٹھا کر پانی میں پھینک دیا جاتا ہے ۔ شمالی سلیبیز کے ایک صوبے مینا ہاسا میں مذہبی پیشوا ایک بارشی افسون کے طور پر اشنان کرتا ہے ۔ وسطی سلیبیز میں عرصے تک بارش نہ ہو اور دھان سوکھنے لگے تو گاؤں کے بہت سے لوگ ، خاص طور پر نوجوان ، قرب و جوار میں کسی نالے پر پہنچتے ہیں اور شور مچا مچا کر ایک دوسرے پر چھینٹے اڑاتے ہیں یا بانس کی پھنکنیوں سے پچکاریاں مارتے ہیں ۔ نیز کبھی وہ بارش کی سی چھما چھم پیدا کرنے کے لیے پانی میں چھپاکے مارتے ہیں یا اس پر تونبا الٹا رکھ کر انگلیوں سے بجاتے ہیں ۔

بعض صورتوں میں عورتوں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سچ مچ یا جھوٹ موٹ ہل چلائیں تو بارش ہو سکتی ہے ۔ چناں چہ قاف کے علاقہ میں پشاؤں اور کیوسروں کے ہاں ایک رسم ہے جو 'بارش کی جتائی' کے نام سے موسوم ہے اور خشک سالی میں ادا کی جاتی ہے ۔ اس رسم میں لڑکیاں ہل میں جت جاتی ہیں اور اسے کمر کمر پانی تک دریا میں کھینچ لے جاتی ہیں ۔ قلت باراں کی صورت میں آرمینی لڑکیاں اور عورتیں بھی یہی کرتی ہیں ۔ ان میں سب سے سن رسیدہ عورت یا پادری کی بیوی ، پادری کا لباس پہن لیتی ہے اور دوسری عورتیں عام مردوں کا اور پھر ندی کے بہاؤ کے خلاف ہل کو کھینچتی

ہوئی لے جاتی ہیں ۔ قاف کے صوبہ جارجیا میں جب خشک سالی عرصے تک دور نہ تو برجوگ کنواریوں کی جوڑیاں بنا کر ان کے کندھوں پر بیلوں کا جوا رکھ دیا جاتا ہے اور ان کی باگ مذہبی پیشوا تھام لیتا ہے ۔ اس طرح جتی‌جتی وہ دعائیں مانگتی ، چیختی چلاتی ، روتی اور ہنستی ، دریاؤں ، جوہڑوں اور دلدلوں میں سے گزرتی ہیں ۔ ٹرانسلوینیا (رومانیا) کے ایک ضلع میں جب بارش کی قلت سے زمین پیاسی ہوتی ہے تو کچھ لڑکیاں ننگی ہو جاتی ہیں اور ایک عورت کی سرکردگی میں ، جو خود بھی ان کی طرح ننگی ہوتی ہے ، کہیں سے ایک سراون چرا لاتی ہیں اور اسے لے کر کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی کسی نالے پر جا پہنچتی ہیں اور اسے پانی میں ڈال دیتی ہیں ۔ پھر وہ سب اس پر بیٹھ جاتی ہیں اور اس کے ہر کونے پر گھنٹہ بھر تک آگ جلائے رکھتی ہیں جس سے ہلکی ہلکی لو اٹھتی رہتی ہے ۔ اس کے بعد وہ اس اوزار کو پانی میں چھوڑ کو گھر لوٹ آتی ہیں ۔ اسی قسم کا بارشی جادو ہندوستان کے بعض حصوں میں بھی کیا جاتا ہے ۔ یہاں برہنہ عورتیں رات کے وقت کھیت میں ہل چلاتی ہیں اور اس وقت مرد ان سے بالکل دور رہتے ہیں اس لیے کہ ان کی موجودگی سے جادو کا اثر زائل ہو جاتا ہے ۔

بعض وقت اس بارش والے عمل میں مردوں کا ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے ۔ چناں چہ نیو کیلے ڈونیا (جنوبی بحرالکاہل کا ایک جزیرہ) میں بارش گر اپنے جسموں پر کالک مل کر کسی مردے کی ہڈیاں کھود نکالتے تھے ، پھر ان سب کو ایک غار میں لے جا کر جوڑ دیتے ۔ اس طرح ان ہڈیوں کا ایک پنجر بن جاتا ۔ اس پنجر کو کچھ ٹارو کے پتے بچھا کر ان پر ٹانگ دیا جاتا اور پھر اس پر پانی ڈال ڈال کر پتوں پر بہایا جاتا ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مردے کی روح پانی کو جذب کر لیتی ہے اور اسے بارش میں تبدیل کرکے دوبارہ برسا دیتی ہے ۔ اگر عام روایت پر اعتبار کیا جائے تو روس میں لوگوں سے سنا گیا ہے کہ کچھ عرصہ قبل جب کسی ضلع کے باشندوں کو خشک سالی کا سامنا ہوتا تو وہ ایک ایسے شخص کی لاش کھود

نکالتے جو کثرت مے نوشی سے مرا ہو اور اسے قریب کسی جھیل یا دلدل میں غرق کر آتے۔ انھیں یقین تھا کہ اس عمل کے نتیجہ میں ضرور مینہ برستا ہے۔ ۱۸۶۸ء کی طویل خشک سالی کے سبب فصلوں کی تباہی کے ڈر سے ضلع تارا شانسک میں ایک گاؤں کے لوگوں نے یہ کیا کہ ایک مسیحی غیر مقلد کی لاش کھود نکالی جو گزشتہ سال دسمبر میں فوت ہوا تھا۔ پھر ان میں کچھ لوگ اس لاش یا اس کے بچے کھچے حصے سے بارش مانگ مانگ کر اسے پیٹنے لگے اور باقی لوگ چھلنی سے اس پر پانی ڈالتے۔ یہاں چھلنی سے پانی ڈالنے کا عمل چھینٹے کی نقل معلوم ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے ہمارا ذہن ارسٹافنیز کے ایک کردار آسٹریپسیا ڈیز کی طرف منتقل ہوتا ہے جو یہ سمجھتا ہے ہے کہ مینہ زیوس برساتا ہے۔ بعض وقت ٹوراڈجا بارش کے لیے مردوں سے رحم کی التجا کرتے ہیں، چناں چہ ان کے ایک گاؤں کالنگوا میں ایک مشہور سردار کی قبر ہے جو ان کے موجودہ حکمران کا دادا تھا۔ بارش وقت پر نہ ہو تو لوگ اس قبر پر جاتے ہیں اور اس پر یہ کہتے ہوئے پانی ڈالتے ہیں۔ ''دادا جی! ہم پر رحم کرو، اگر تم چاہتے ہو کہ اس سال ہم بھوکوں نہ مریں تو مینہ برسا دو۔'' اس کے بعد ایک بانس میں پانی بھر کر اسے قبر پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس بانس کے نچلے سرے پر ایک باریک سا چھید ہوتا ہے جس سے قطرہ قطرہ قبر پر ٹپکتا رہتا ہے اور جب تک زوردار بارش نہ ہو جائے اس میں بار بار پانی بھرا جاتا ہے۔ یہاں نیو کیلے ڈونیا والے عمل کی طرح مذہب میں سحر کی آمیزش نظر آتی ہے، اس لیے کہ متوفی سردار سے مراد مانگنی خالص مذہبی چیز ہے، لیکن اس کی قبر پر بارش کی نقل کی نوعیت سحری ہے۔ خلیج ڈیلاگوا کے بارونگا لوگوں کے بارشی جادو کی مثال ہماری نظر سے گزر چکی ہے جس میں وہ اپنے آباؤ و اجداد، خاص کر توائم کی قبروں پر پانی ڈال کر انھیں تربہ تر کر دیتے ہیں۔ اور ینوکو (جنوبی امریکہ) کے ریڈ انڈین قبائل میں یہ دستور تھا کہ کسی متوفی شخص کے اعزاء اس کی تدفین کے سال بھر بعد اس کی ہڈیاں کھود نکالتے اور انھیں جلا کر ان کی راکھ

ہوا میں اڑا دیتے ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس راکھ کو وہ متوفی شخص اپنی تجہیز و تکفین کے صلے میں مینہ بنا کر برسا دیتا ہے ۔ اہل چین کا یہ اعتقاد ہے کہ جب تک مردوں کو دفن نہ کیا جائے، ان کی روحوں کو وہی تکلیف پہنچتی ہے جو ایسے زندہ آدمیوں کو پہنچے جنھیں موسم کی شدت میں سر چھپانے کی جگہ میسر نہ ہو ، لہذا یہ مصیبت زدہ روحیں بارش کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں ۔ اس میں اکثر انھیں پوری کام یابی ہوتی ہے اور لوگوں کو خشک سالی کا سامنا ہوتا ہے جو چینیوں کے نزدیک سب سے بڑی مصیبت ہے ، اس لیے کہ فصلوں کی خرابی اور قحط اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ لہذا چینی ارباب اقتدار میں یہ دستور عام رہا ہے کہ وہ خشک سالی کے زمانے میں غیر مدفون مردوں کی خشک ہڈیوں کو گڑوا دیتے ہیں تاکہ انھیں اس عذاب سے نجات حاصل ہو اور ان کی اس کاروائی سے بارش ہونے لگے ۔

اس کے علاوہ ان موسمی جادو ٹونوں میں اکثر جانوروں کا بھی نہایت اہم حصہ ہوتا ہے ۔ شمالی آسٹریلیا کے اینولا قبیلے کے خیال میں ڈالر چڑیا کا بارش سے گہرا تعلق ہے ، چناں چہ ان کے ہاں وہ برساتی چڑیا کہلاتی ہے ۔ وہ شخص جس کا ٹوٹم یہ چڑیا ہو ایک خاص کنڈ پر مینہ برسا سکتا ہے ۔ دستور کے بموجب وہ ایک زندہ سانپ پکڑ لاتا ہے اور اسے کچھ دیر کنڈ میں ڈبوئے رکھنے کے بعد مار کر اس ندی کے کنارے پھینک دیتا ہے جس میں وہ کنڈ واقع ہو ۔ پھر وہ قوس قزح کی سی گھاس کی ایک کمان بنا کر اسے سانپ پر رکھ دیتا ہے ، اس کے بعد بس اس کا اتنا کرنا کافی ہے کہ مرے ہوئے سانپ، اور مصنوعی قوس قزح کے سامنے اپنا راگ الاپ دے ، اس سے دیر یا سویر بارش ہونے لگے گی ۔ اس دستور کی توجیہ میں وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں ایک سانپ ، جو ڈالر چڑیا کا جوڑا تھا ، اس کنڈ میں رہتا تھا اور بارش کرنے کے لیے آسمان کی طرف اپنے منہ سے جھاگ اڑایا کرتا تھا ۔ اس سے قوس قزح نمودار ہو جاتی اور مینہ برسنے لگتا ۔ جاوا کے بہت سے حصوں میں مینہ برسانے کا ایک عام طریقہ

یہ ہے کہ ایک بلی یا بلیوں کے جوڑے کو نہلایا جاتا ہے ۔ بعض وقت لوگ گاتے بجاتے جانوروں کا جلوس نکالتے ہیں ۔ خود بٹاویا میں بھی کبھی کبھی بچے اس مقصد سے ایک بلی کو لیے پھرتے نظر آتے ہیں جسے وہ کسی جوہڑ میں ڈبکی دینے کے بعد چھوڑ دیتے ہیں ۔

مشرقی افریقہ کی ویمبگوے قوم میں جب جادوگر کو مینہ برسانا مقصود ہو تو وہ ایک بھیڑ اور ایک بچھڑے کو دھوپ میں لے جاتا ہے اور انھیں اس جھونپڑے کی چھت پر رکھوا دیتا ہے جس میں قبیلے کے لوگ سب مل جل کر رہتے ہوں ۔ پھر وہ ان جانوروں کا پیٹ چاک کرتا ہے اور ان کی اوجھڑی نکال کر ادھر اُدھر پھینک دیتا ہے ۔ اس کے بعد وہ ایک ظرف میں پانی اور ایک قسم کی دوا ڈالتا ہے ۔ اگر اس کا عمل کارگر ہوا تو یہ سیال ابلنے لگتا ہے اور ساتھ ہی بارش شروع ہو جاتی ہے ۔ برخلاف اس کے اگر اس جادوگر کا منشا بارش کو روکنا ہو تو وہ جھونپڑی کے اندر چلا جاتا ہے اور ایک تونبے میں سنگی بلور تپانے لگتا ہے ۔ واگوگو قبیلہ اپنے اسلاف کی قبروں پر بارش کے لیے سیاہ مرغیوں ، سیاہ بھیڑ اور سیاہ گائے کی بھینٹ چڑھاتا ہے اور ان کا بارش گر سیاہ لباس پہنے رہتا ہے ۔ ماتا بلے (جنوبی افریقہ کا ایک قبیلہ) نام کے قبیلے کے بارش والے جادو میں سیاہ بیل کا خون اور پتا استعمال کیا جاتا ہے ۔ سوماٹرا کے ایک ضلع میں بارش کے لیے گاؤں کی تمام عورتیں نیم برہنہ دریا پر جاتی ہیں اور اس میں اتر کر چلتی اور ایک دوسرے پر چھینٹے اڑاتی ہیں ۔ ایک کالی بلی ندی میں پھینک دی جاتی ہے اور اسے کچھ دیر اس میں تیرایا جاتا ہے اور پھر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ کنارے پر بچ نکلے ۔ ساتھ ہی پیچھے سے عورتیں اس پر چھینٹے اڑاتی جاتی ہیں ۔ آسام کے گارو خشک سالی میں کسی اونچے پہاڑ پر کالی بکری کی قربانی دیتے ہیں ۔ ان تمام صورتوں میں جانور کا رنگ شامل افسوں ہوتا ہے ۔ گویا وہ اپنی سیاہ رنگت کے سبب آسمان پر کالے بادل اُٹھا لائے گا ۔ چناں چہ بکوان شام کے وقت بیل کا پیٹ جلاتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ ''سیاہ دھواں بادل اُٹھا لائے گا اور مینہ برسا دے گا ۔'' جزیرۂ ٹیمور (انڈونیشیا) کے

لوگ بارش کے لیے زمین کی دیوی کو سیاہ اور دھوپ کے لیے سورج دیوتا کو سفید سور کی قربانی دیتے ہیں ۔ انگونی (افریقہ کی ایک قوم) مینہ برسانے کے لیے کالے بیل کی قربانی دیتے ہیں ۔ جاپان کے ایک پہاڑی ضلع میں جب عرصے تک بارش نہ ہو تو گاؤں والے جلوس کی شکل میں پہاڑ پر ایک ندی کی تہہ تک جاتے ہیں جن کی قیادت ایک مذہبی پیشوا کرتا ہے جو اپنے پیچھے ایک کالا کتا لیے چلتا ہے ۔ مقررہ مقام پر پہنچ کر کتے کو ایک پتھر سے باندھ دیا جاتا ہے اور اسے گولیوں اور تیروں کا نشانہ بنایا جاتا ہے ۔ جب چٹانیں اس جانور کے لہو سے داغ داغ ہو جاتی ہیں تو وہ سب اپنے ہتھیار پھینک دیتے ہیں اور ندی کے اژدر دیوتا سے چیخ چیخ کر التجا کرتے ہیں کہ وہ ان داغوں کو دھونے کے لیے فی‌الفور مینہ برسا دے ۔ دستور کی رو سے ان موقعوں پر قربانی کے جانور کا رنگ بادلوں کی علامت کی حیثیت سے سیاہ ہونا چاہیے ، لیکن اگر موسم صاف مقصود ہو تو بالکل سفید ۔

مینڈک کو پانی کے ساتھ جو نسبت ہے ، اس کی وجہ سے اسے بالعموم بارش کا محافظ خیال کیا جاتا ہے اور بارش والے جادو ٹونوں میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اورینوکو کے بعض انڈین ''ٹوڈ' یا ''غوک زہردار'' کو پانی کا مالک یا دیوتا سمجھتے تھے اور اسے مارتے ہوئے ڈرتے تھے ۔ ان کا مینڈکوں کو ایک برتن کے نیچے رکھنا اور خشک سالی میں انھیں چھڑیوں سے پیٹنا مشہور ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ ایمارا نامی ریڈ انڈینوں کے ہاں مینہ برسانے کی غرض سے مینڈکوں اور دوسرے آبی جانوروں کی مورتیاں بنا کر انھیں پہاڑیوں کی چوٹیوں پر رکھ دیا جاتا ہے ۔ برٹش کولمبیا کے تھامپسن نامی ریڈ انڈین اور یورپ میں بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مینڈک مارنے سے بارش ہو جاتی ہے ۔ بارش کے لیے ہندوستان کے صوبۂ متوسطہ میں بعض نیچ قوم کے لوگ نیم کے تازہ پتوں اور ٹہنیوں سے ڈھکی ایک لکڑی سے مینڈک باندھ دیتے ہیں اور یہ گاتے ہوئے اسے در بدر لیے پھرتے ہیں :

"اے مینڈک جلدی پانی کے موتی برسا دے
اور کھیتیوں میں گیہوں اور باجرے کی فصل پکادے"

صوبۂ مدراس میں کاپویا ریڈی نام کے کاشت کاروں کی ایک وسیع برادری ہے ۔ وقت پر بارش نہ ہو تو اس برادری کی عورتیں ایک مینڈک پکڑ لیتی ہیں اور اسے چھاج سے باندھ دیتی ہیں ، پھر اس چھاج پر مرگوسا (نیم کی ایک قسم) کے کچھ پتے رکھ کر یہ گاتی ہوئی گھر گھر پھرتی ہیں :

"مینڈکی خانم کو نہانا ہے ۔ اے بارش کے دیوتا!
کم از کم اس کے لیے ہی تھوڑی سی بارش کر دے ۔"

جس وقت وہ یہ گیت گاتی ہیں ، گھر والی اس مینڈکی پر پانی ڈالتی ہے اور انہیں خیرات دیتی ہے ۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کے اس فعل سے موسلادھار بارش ہونے لگے گی ۔

بعض وقت جب خشک سالی عرصے تک دور نہ ہو تو لوگ مثلی سحر کی بازی گری کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور اپنی دعاؤں کے بے اثر ہونے پر انہیں اس قدر غصہ آتا ہے کہ وہ اس فوق الفطرت ہستی کو ، جس نے مصیبت میں ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہو ، مینہ برسوانے کے لیے دھمکیاں اور گالیاں دیتے ہیں ، بلکہ اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ چناں چہ ایک جاپانی گاؤں میں جب محافظ دیوتا بارش کے لیے لوگوں کی پرارتھنا پر کان نہ دھرتا تو وہ تنگ آ کر اس کا بت گرا دیتے اور چیخ چیخ کر گالیاں بکتے ہوئے اسے سر کے بل دھان کے ایک متعفن کھیت میں پھینک دیتے اور اس سے یہ کہتے "کچھ دن یہاں پڑے تپتے رہو گے تو تمہیں پتا چلے گا کہ اس دھوپ کی شدت میں ہمارے کھیت کس طرح جھلس رہے ہیں ۔" انہی حالات میں سینی گیمبیا (افریقہ) کے فیلوپے قبیلے کے لوگ اپنے فتیشوں (Fetishes) کو بڑی بے حرمتی سے گرا دیتے ہیں اور بارش ہونے تک انہیں لعنت ملامت کرتے ہوئے کھیت کھیت گھسیٹے پھرتے ہیں ۔

اہل چین کے لیے خدا سے بغاوت معمولی بات ہے ۔ چناں چہ امساک باراں میں وہ کاغذ یا لکڑی کا ایک اژدھا تیار کرتے ہیں جو مینہ کے دیوتا کی مورتی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا جلوس نکالتے ہیں ، لیکن اگر ان کی اس کارروائی کے بعد بارش نہ ہو تو وہ اس اژدھے پر لعنت بھیج کر اس کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں ۔ بعض وقت اسے دھمکیاں دی جاتی ہیں اور پیٹا جاتا ہے ۔ بعض وقت علی الاعلان اسے معزول کر دیا جاتا ہے ۔ اس کے برعکس اگر وہ ان کی مراد پوری کر دے تو فرمان شاہی کے ذریعے اسے ترقی دے دی جاتی ہے ۔ اپریل ، ۱۸۸۸ء میں کینٹن کے عمال نے لنگ وانگ دیوتا سے دعا مانگی کہ وہ انھیں اس طوفانی بارش کے غضب سے بچائیں جو کسی طرح رکنے کا نام نہیں لیتی ۔ لیکن لنگ وانگ ٹس سے مس نہ ہوا ۔ اس کی پاداش میں انھوں نے اسے پا ٔ دن تک حوالات میں بند رکھا ۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا ، چناں چہ بارش رک گئی اور ساتھ ہی اس دیوتا کو بھی رہائی مل گئی ۔ اس سے کچھ سال پہلے خشک سالی میں اسی دیوتا لنگ وانگ کو پابہ زنجیر کئی روز تک اس کے مندر کے صحن میں دھوپ میں تپنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تاکہ اسے خود بارش کی ضرورت کا احساس ہو ۔ اسی طرح جب سیام والوں کو بارش مطلوب ہوتی ہے تو وہ اپنے بت کڑی دھوپ میں رکھ دیتے ہیں ۔ اس کے برعکس وہ خشک موسم لانا چاہیں تو ان بتوں کے مندروں کی چھتیں گرا دیتے ہیں تاکہ وہ بارش میں بھیگیں ۔ ان کا خیال ہے کہ دیوتاؤں کو اس طرح تکلیف پہنچائی جائے تو وہ اپنے پوجنے والوں کی مراد پوری کرنے پر مائل ہو جائیں گے ۔

مشرق بعید کی اس موسمیات پر آپ کو ہنسی آتی ہوگی لیکن اس کو کیا کہیے کہ خود مسیحی یورپ نے ہماری زندگی میں بارش کے لیے ٹھیک ایسے ہی طریقوں سے کام لیا ہے ۔ چناں چہ اپریل ۱۸۹۳ء کے آخر میں صقلیہ کے لوگوں کو پانی کی سخت قلت کا سامنا ہوا ۔ چھ مہینے سے بارش بالکل نہیں ہوئی تھی ۔ ہر روز نیلگوں آسمان پر سورج نکلتا اور ڈوب جاتا ۔ پالرمو کے اطراف کانکاڈی اورو کے

سر سبز اور شاندار باغ مرجھائے جاتے تھے، قحط کے آثار نمودار ہو چکے تھے اور لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی تھی ۔ بارش کے لیے ساری جائز تدبیریں بے سود ثابت ہو چکی تھیں ۔ لوگوں نے گلیوں اور کھیتوں میں سے جلوس نکالے۔ مردوں ، عورتوں اور بچوں نے مقدس مجسموں کے آگے پڑ پڑ کر رات بھر تسبیحیں پڑھیں ۔ گرجا گھروں میں شب و روز متبرک شمعیں جلتی رہیں ۔ کھجور کی وہ شاخیں جو عید فسح کا تبرک تھیں، درختوں پر پڑی ٹنگتی رہیں ۔ ایک قدیم رسم کے بموجب اسی عید کے اتوار کی جھاڑی ہوئی خاک کھیتوں میں بکھیر دی گئی ۔ معمولی سال میں اس کوڑے سے فصلیں محفوظ رہتی ہیں لیکن اس سال اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا ۔ نکوشیا میں لوگ برہنہ دست و برہنہ پا مسیح مصلوب کی تصویریں لیے شہر کے تمام حصوں میں پھرتے رہے اور ایک دوسرے پر آہنی کوڑے برسایا کیے لیکن ان میں ایک کی بھی کوشش کارگر نہ ہوئی ۔ خود سینٹ فرانسس آف پالو (اٹلی کے ایک فرانسسکی ولی جو پندرھویں صدی میں گزرے ہیں) جیسے جلیل القدر بزرگ بھی ، جو ہر سال بارش کی صورت میں اپنی کرامت دکھاتے ہیں اور جن کی شبیہ موسم بہار میں باغوں میں سے نکالی جاتی ہے ، اُن کی مدد نہ کر سکے یا نہ کرتے تھے۔ عشائے ربانی والی دعائیں ، رات کی ہفت گانہ عبادتیں ، سماع ، چراغاں ، آتش بازی کوئی چیز اس بزرگ پر اثر نہ کرتی ۔ آخر کار کسانوں کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا ، بیشتر اولیاء خارج البلد کر دیے گئے ۔ پالرمو کے ایک باغ میں سینٹ جوزف کی تصویروں اور مجسموں کا ڈھیر لگا دیا گیا اور وہاں کے لوگوں نے قسم کھا لی کہ جب تک بارش نہ ہوگی وہ اس ولی کو وہیں دھوپ میں ڈالے رکھیں گے ۔ بعض دوسرے ولیوں کے منہ بچوں کی طرح دیوار کی طرف پھیر دیے گئے ۔ کچھ ولیوں کے مجسموں پر سے خوب صورت لباس اتار لیا گیا اور انھیں سخت بے حرمتی سے ان حوضوں میں غوطے دیے گئے جن میں گھوڑوں کو نہلایا اور پانی پلایا جاتا ہے ۔ کالتانی سیتا کے مقام پر حضرت میکائیل کے سنہری پر نوچ لیے گئے اور ان کی جگہ دفتیوں کے پر لگا دیے گئے ۔ ان کا ارغوانی چغہ اتار کر انھیں ایک چیتھڑا لپیٹ دیا گیا ۔ لکاتا

کے ولیٔ محافظ سینٹ انجلو کی اس سے بھی بری گت بنی کیوں کہ انھیں مادر زاد ننگا کرکے یوں ہی چھوڑ دیا گیا ، نیز انھیں خوب گالیاں دی گئیں ، زنجیروں میں جکڑ دیا گیا اور دریا میں غرق کرنے یا سولی پر چڑھانے کی دھمکیاں دی گئیں ، لوگوں کا ہجوم انھیں گھونسے دکھا دکھا کر یہ نعرہ لگاتا تھا ''مینہ یا پھانسی!''

بعض صورتوں میں دیوتاؤں کے جذبۂ رحم کو ابھارا جاتا ہے ۔ جب دھوپ کی شدت سے اناج کی فصلیں سوکھنے لگتی ہیں تو زولو (جنوب مشرقی افریقہ کی ایک قوم) ایک ''آسمانی پرندے'' کو مار کر کسی گڑھے میں پھینک دیتے ہیں ۔ اس چڑیا کی موت پر آسمان کا دل پسیج جاتا ہے اور وہ اس کی میت پر گریہ و زاری کرنے لگتا ہے ۔ انھی کے ہاں عورتیں اپنے بچوں کو گردنوں تک زمین میں دفن کر دیتی ہیں اور وہاں سے کچھ فاصلے پر ہٹ آتی ہیں اور بڑی دیر تک ہائے واویلا مچاتی رہتی ہیں ۔ یہ دیکھ کر آسمان کا دل رحم سے بھر آتا ہے ، پھر وہ اپنے بچوں کو نکال لیتی ہیں ۔ انھیں پورا اطمینان ہوتا ہے کہ اس کے بعد جلد ہی مینہ برسنے لگے گا ۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح وہ اصل میں بارش کے لیے آسمان کے مالک کو پکارتی ہیں ۔ اگر واقعی بارش ہونے لگے تو وہ کہہ اٹھتی ہیں ''لو! اوسانڈو برس رہا ہے'' ۔ خشک سالی میں جزیرۂ ٹینے زف (شمالی افریقہ) کی گوانچ قوم کے لوگ اپنی بھیڑوں کو ایک مقدس میدان میں نکال لے جاتے ہیں اور وہاں پہنچ کر بروں کو ان کی ماؤں سے جدا کر دیتے ہیں تاکہ ان کی دکھ بھری چیخوں سے دیوتا کو ترس آ جائے ۔ کماؤن میں بارش روکنے کا یہ طریقہ رائج ہے کہ کسی کتے کے بائیں کان میں گرم گرم تیل ڈال دیا جاتا ہے ۔ کتا درد سے چلانے لگتا ہے ۔ اس کی چیخیں اندر سن لیتا ہے اور اس پر رحم کھا کے بارش روک دیتا ہے ۔ بعض وقت ٹوراڈجا مینہ برسانے کی یوں کوشش کرتے ہیں : بعض خاص پودوں کے ڈنٹھل پانی میں رکھ دیے جاتے ہیں اور انھیں مخاطب کرکے یہ کہا جاتا ہے ''جاؤ بارش کے لیے پرارتھنا کرو ۔ بارش نہ ہوگی تو تمھیں دوبارہ نہیں لگایا جائے گا اور تم یہیں مر جاؤگے''۔

نیز وہ پانی میں سے کچھ تازہ گھونگے پکڑ کر انھیں ایک ڈور سے باندھ دیتے ھیں اور اس ڈور کو کسی درخت سے لٹکا دیتے ھیں ۔ پھر گھونگوں سے یہ کہتے ھیں ''جاؤ ، بارش کے لیے پرارتھنا کرو ، جب تک بارش نہ ھوگی تمھیں پانی میں واپس نہیں لے جایا جائے گا ۔'' یہ سن کر گھونگے جاتے ھیں اور گریہ و زاری کرتے ھیں ۔ دیوتاؤں کو ان پر رحم آ جاتا ھے اور وہ مینہ برسا دیتے ھیں ۔ تاھم مذکورہ بالا رسمیں سحر سے زیادہ مذھب سے تعلق رکھتی ھیں کیوں کہ ان میں مافوق قوتوں سے التجائے رحم کا عنصر شامل ھے ۔

پتھروں کے متعلق یہ خیال ھے کہ وہ مینہ برسانے کی قوت رکھتے ھیں ، مگر انھیں پانی میں بھگونا یا کسی اور مناسب طریقے سے استعمال کرنا شرط ھے ۔ سموا (بحرالکاھل کا ایک جزیرہ) کے ایک گاؤں میں ایک خاص پتھر تھا جسے بارش کے دیوتا کی نشانی کے طور پر بڑی احتیاط سے محفوظ مقام پر رکھا جاتا تھا ۔ بارش نہ ھوتی تو اس کے پجاری اس پتھر کو جلوس کی شکل میں کسی ندی پر نکال لے جاتے اور اسے اس میں ڈبکیاں دیتے تھے ۔ نیوساؤتھ ویلز کے ٹاٹاتھی قبیلے میں بارشی جادوگر سنگ چینی کا ایک ریزہ توڑ کر منہ میں رکھتا ھے اور پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اسے تھوک دیتا ھے ۔ اس پتھر کا باقی ماندہ ٹکڑا وہ ایمو (ایک پرندہ جو آسٹریلیا میں پایا جاتا ھے) کے پروں میں لپیٹ دیتا ھے اور اسے پروں سمیت اچھی طرح پانی میں تر کرکے نہایت احتیاط سے چھپا دیتا ھے ۔ نیوساؤتھ ویلز کے کیرامن قبیلے کا جادوگر کسی کھاڑی میں اتر جاتا ھے اور ایک گول سے چپٹے پتھر پر پانی ٹپکاتا ھے پھر اسے ڈھانک کر چھپا دیتا ھے ۔ شمال مغربی آسٹریلیا کے بعض قبیلوں میں بارش والا جادوگر زمین کے اس قطعے پر چلا جاتا ھے جو بارشی جادو کے لیے مخصوص ھے ۔ یہاں وہ ریت اور پتھروں کا ایک تودہ تیار کرتا ھے ۔ اس پر اپنا طلسمی پتھر رکھ دیتا ھے ، پھر اپنے منتر الاپتا اس تودے کے گرد گھنٹوں رقص کرتا ھے اور جب وہ تھک کر چور ھو جاتا ھے تو اس کی جگہ اس کا مددگار سنبھال لیتا ھے ۔ اس عجیب و غریب پتھر پر پانی چھڑکا جاتا ھے اور

آگ دھکائی جاتی ہے اور جب تک یہ سارا عمل جاری رہے کسی غیر متعلق شخص کو اس مقام کے قریب جانے کی اجازت نہیں ۔ نیو برٹن کے سلکا بارش کرنا چاہیں تو پتھروں پر خاص قسم کے پھلوں کی راکھ مل کر انھیں سیاہ کرلیتے ہیں اور بعض دوسری قسم کے پودوں اور کلیوں کے ساتھ دھوپ میں رکھ دیتے ہیں ۔ پھر مٹھی بھر ڈالیاں لیتے ہیں اور انھیں پانی میں تر کرنے کے بعد ان پر پتھر لاد دیتے ہیں ۔ اس عمل کے نتیجے میں بارش ہونی ضروری ہے ۔ ریاست مانی پور میں اس بلند پہاڑی پر جو دارالسلطنت کے مشرق کی جانب واقع ہے ، ایک پتھر ہے جسے عام لوگ چھتری سے تشبیہ دیتے ہیں ۔ جب کبھی بارش کی ضرورت ہو تو راجا نیچے سے ایک چشمے کا پانی لے جاتا ہے اور اس پتھر پر چھڑک دیتا ہے ۔ جاپان میں ساگامی کے مقام پر ایک خاص پتھر پر پانی ڈالا جائے تو وہ بارش کھینچ لاتا ہے ۔ جس وقت وسطی افریقہ کے واکونڈیو قبیلے کو بارش مطلوب ہوتی ہے تو وہ واومبا قوم کو اپنا پیغام بھیجتے ہیں ۔ اس خوش نصیب قوم کے پاس جو برفانی پہاڑوں کے دامن میں بستی ہے ، ایک بیش بہا پتھر ہے جو ''سنگ باراں'' کہلاتا ہے ۔ اسے معقول معاوضے کے پیش نظر تیل مل کر ایک پانی سے بھرے ہوئے برتن میں ڈال دیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد بارش کا آنا یقینی ہوتا ہے ۔ اریزونا اور نیو میکسیکو ( ممالک متحدہ امریکہ) کے بے آب وگیاہ بیابانوں میں اپاچی ایک چشمے سے پانی لے جاتے تھے اور اسے ایک بلند چٹان کے کسی خاص نقطے پر پانی پھینک کر مینہ برسانے کی کوشش کرتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے عمل کے بعد جلد ہی بادل اٹھیں گے اور بارش ہونے لگے گی ۔

لیکن اس قسم کی رسمیں افریقہ اور ایشیا کے صحراؤں یا آسٹریلیا اور نئی دنیا کے گرم بیابانوں تک محدود نہیں ۔ یہ یورپ کی سرد آب و ہوا اور دھندلی فضا میں بھی جاری رہی ہیں ۔ بروس لیانڈ (برٹنی) کے رومانی بن میں ایک مشہور فوارہ ہے جو بارنٹن کہلاتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ یہاں مرلن جادوگر (برطانیہ کی آرتھری داستانوں کا ایک ساحر ۔ اس کا قصہ لارڈ ٹینی سن نے اپنی ''اڈلز آف دی کنگ''

کے سلسلے کی ایک نظم میں بیان کیا ہے) آج بھی ایک ہاتھارن کے سائے میں مسحور پڑا سوتا ہے ۔ اساک باراں میں اس فوارے پر برٹین کے کسان جمع ہوتے تھے اور اس سے پیالے میں پانی بھر کر قریب ہی ایک پتھر کی سل پر انڈیل دیتے ۔ کوہ اسٹوڈاؤن (ویلز) پر اونچی اونچی خوف ناک چٹانوں سے گھری ہوئی ایک سنسان وادی کی گھنی جھاڑیوں میں چھوٹی سی جھیل ہے ، جسے ڈلین یا کالی جھیل کہتے ہیں ۔ اس کے اندر پتھر کے زینوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے ۔ اگر کوئی شخص ان پتھروں پر زینہ بہ زینہ قدم رکھتا ہوا اس طرح پانی ڈالتا چلا جائے کہ ان میں وہ آخری پتھر تر ہو جائے جو سرخ قربان گاہ کے نام سے موسوم ہے ، تو گرمی کے موسم میں بھی شاید ہی کبھی ایسا ہو کہ رات ہونے سے پہلے مینہ نہ برسنے لگے ۔ سموائی رسم کی طرح (جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) ان صورتوں میں بھی یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کو مقدس و متبرک چیز سمجھا جاتا ہے ۔ یہ بات اس رسم سے ظاہر ہے جس میں بارش کے لیے کبھی کبھی صلیب کو چشمۂ بارنٹن میں ڈبکی دی جاتی ہے ، اس لیے کہ یہ رسم صریحاً اس قدیم جاہلی دستور کی ایک مسیحی صورت ہے جس میں پتھر پر پانی چھڑکا جاتا ہے ۔ فرانس کے مختلف مقامات پر مینہ برسانے کی غرض سے کسی ولی کے مجسمے کو پانی میں غوطہ دینے کا رواج ہے یا رہا ہے ۔ چناں چہ کومیگنی کی قدیم خانقاہ کے قریب سینٹ ژرویس کا ایک متبرک چشمہ ہے جہاں اس مقام کے باشندے اپنی فصلوں کی ضرورت کے مطابق موسم میں تغیر پیدا کرنے کے لیے جلوس بنا کر آتے ہیں ۔ وہاں ایک طاق سا بنا ہے جس سے یہ چشمہ نکلتا ہے ، اسی میں ان ولی کا ایک قدیم بت رکھا رہتا ہے ۔ شدید خشک سالی میں یہ بت چشمے کی جھیل میں ڈال دیا جاتا ہے ۔ کالو بریریس اور کاپتراس میں سینٹ ژیں اور سینٹ پان کے مجسموں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا کرتا ہے ۔ ناوارے کے کئی گاؤں میں سینٹ پیٹر سے بارش کی دعائیں مانگی جاتی تھیں اور ان میں زور پیدا کرنے کی غرض سے گاؤں والے ولیٔ مذکور کے بت کو جلوس کی شکل میں دریا تک لے جاتے اور وہاں ان سے

تین مرتبہ التجا کی جاتی کہ وہ اپنی ضد چھوڑ دیں اور ان سے جو دعائیں مانگی گئی ہیں انہیں قبول کر لیں ۔ اس پر بھی وہ نہ مانتے تو انہیں دریا میں غوطہ دے دیا جاتا ۔ پادری انہیں اس حرکت سے باز رکھنے کی بھتیری کوشش کرتے اور انہیں سمجھاتے کہ اس بت کو نصیحت اور تنبیہ کرنے سے بھی اچھا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے لیکن ان کی اس عقیدت مندی اور حق گوئی کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوتا ۔ اس کارروائی کے بعد چوبیس گھنٹے میں بارش ہونی یقینی تھی ۔ بارش کے لیے مقدس مجسموں کو غوطے دینے کی بدعت کچھ کیتھولک ممالک ہی تک محدود نہ تھی ۔ منگریلا (روس) میں قلت باراں سے فصلیں خراب ہو رہی ہوں تو لوگ ایک مقدس مجسمے کو روز پانی میں ڈبکیاں دیتے ہیں اور جب تک بارش نہ ہو جائے اپنے اس فعل سے باز نہیں آتے ۔ مشرق بعید میں شان لوگ ( برما کی ایک قوم) مہاتما بدھ کے بتوں کو غسل دیتے ہیں تاکہ مینہ برسے اور فصل برباد نہ ہو ۔ ان تمام رسموں میں اگرچہ تہدید یا سزا کا پہلو نمایاں ہے لیکن بنیادی طور پر ان سب کی حیثیت ایک قسم کے مشارک سحر کی ہے ۔

دوسری قوموں کی طرح اہل یونان و روما بھی ، جب جلوسوں اور دعاؤں کا کوئی اثر نہ ہوتا ، تو سحر کے ذریعہ مینہ برسانے کی کوشش کرتے تھے ۔ آرکیڈیا (یونان کا ایک پہاڑی ضلع) میں جب فصلیں اور درخت دھوپ سے جھلس جاتے تو زیوس کا پجاری کوہ لیکے ایس پر ایک چشمے میں اوک یا بلوط کی شاخ ڈبویا کرتا تھا ۔ پانی کو اس طرح تکلیف پہنچنے سے وہ ابر اٹھاتا اور اس سے مینہ برسنے لگتا ۔ مینہ برسانے کے ایسے ہی دستور کی ایک مثال جزیرہ ہلما ہیرا والی رسم میں ہماری نظر سے گزر چکی ہے ۔ تھیسلی (یونان) میں کرانن کے لوگوں کے پاس کانسی کا ایک رتھ یا بمان تھا جو ایک مندر میں رکھا رہتا تھا ۔ جس وقت انہیں بارش کی ضرورت ہوتی وہ اس بمان کو ہلا دیتے تھے اور اس کے اثر سے چھینٹا پڑ جاتا تھا ۔ بمان کو ہلا کر جو گھڑگھڑاہٹ پیدا کی جاتی تھی ، اس سے غالباً بادلوں کی گھن گرج کی نقل مقصود تھی ۔ اس سے پہلے ہم دیکھ آئے ہیں کہ نقلی گرج چمک

روس اور جاپان میں بارشی جادو کے ایک جزو کی حیثیت رکھتی ہے ۔ ایلیس کا سالمونیس نامی داستانی بادشاہ مصنوعی گرج پیدا کرنے کی غرض سے اپنے یمان کے پیچھے کانسی کی کیتلیاں گھسیٹتا یا اسے کانسی کے پل پر سے چلاتا ہوا لے جاتا تھا اور ساتھ ہی بجلی کی نقل میں جلتی ہوئی شمعیں پھینکتا جاتا تھا ۔ اس بد دین کی خواہش یہ تھی کہ اس صورت سے اس گھن گرج کی نقل اتاری جائے جو گنبد گردوں پر زیوس کی گاڑی کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے ، بلکہ اس نے خود زیوس ہونے کا دعویٰ کر دیا تھا اور اس حیثیت سے قربانیاں طلب کرتا تھا ۔ روم کی شہر پناہ کے باہر مریخ (جنگ کا دیوتا) کے مندر کے قریب ایک خاص پتھر رکھا رہتا تھا جو لاپس مینیلس (سنگ رواں) کہلاتا تھا ، خشک سالی کی صورت میں اس پتھر کو گھسیٹتے ہوئے روم میں لے جایا جاتا تھا ۔ خیال تھا کہ ایسا کرنے سے فی الفور مینہ برسنے لگے گا ۔

(۳) **سحر اور ضبط آفتاب**:—ساحر سمجھتا ہے کہ جس طرح وہ مینہ برسا سکتا ہے ، اسی طرح دھوپ بھی پیدا کر سکتا ہے ؛ نیز غروب آفتاب میں تعجیل و تاخیر اس کے اختیار میں ہے ۔ چنانچہ ریڈانڈینوں کا اوجبوے قبیلہ جو گرہن کو سورج کے بجھنے پر محمول کرتا تھا ، اپنے تیروں کی انیاں آگ میں بجھا کر ہوا میں چلاتا تھا ۔ اسے امید تھی کہ اس صورت سے وہ سورج کو دوبارہ روشن کر دے گا ۔ اسی طرح پیرو کے سنسی بھی گرہن میں سورج کو اپنے جگمگاتے تیروں کا نشانہ بناتے تھے ، لیکن بہ ظاہر اس سے ان کا مقصد فانوس آفتاب کو دوبارہ روشن کرنا نہیں تھا بلکہ وہ اس درندے کو مار بھگانے کی غرض سے ایسا کیا کرتے تھے جو ان کی دانست میں آفتاب سے دست و گریباں تھا ۔ چاند گرہن میں اورینو کو کے بعض قبائل جلتی شمعیں زمین میں گاڑھ دیتے تھے ۔ وہ کہتے تھے کہ اگر چاند گل ہو جائے تو زمین پر جتنی آگ اس کے سامنے ہوگی وہ سب ٹھنڈی پڑ جائے گی ۔ کسوف کے دوران میں کام چاٹکا (روس) والوں کے ہاں

یہ دستور تھا کہ لوگ سب اپنی اپنی جھونپڑیوں میں آگ باہر نکال لیتے اور نیر اعظم سے ملتجی ہوتے کہ وہ پھر اسی آب و تاب سے چمکنے لگے ۔ لیکن ان کی یہ التجا ظاہر کرتی ہے کہ اس رسم کا تعلق سحر سے زیادہ مذہب سے تھا ۔ اس کے برعکس خالص سحری قسم کی رسم وہ تھی جو امریکہ کے چلکوئین انھیں موقعوں پر ادا کیا کرتے تھے ۔ اس میں مرد و زن سب اپنی قبائیں اوپر کو چڑھا لیتے ، جس طرح وہ سفر میں کیا کرتے ہیں اور پھر گرھن کے چھوٹنے تک اپنے عصاؤں کا سہارا لیے ایک دائرے میں اس طرح جھک جھک کر چکر کاٹتے جیسے ان پر بوجھ لدا ہو ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت سے انھیں سورج کو سہارا دینا مقصود تھا ، جو آسمان پر اپنی گردش مدام سے اس قدر تھک جاتا تھا کہ اس کے قدم لڑکھڑائے جاتے تھے ۔ اسی طرح مصر قدیم میں بادشاہ ، جسے آفتاب کے نمائندے کی حیثیت حاصل تھی ، بصد ہیبت و جلال ایک مندر کا طواف کرتا تھا تاکہ آفتاب کسوف یا کسی اور بلا میں گرفتار ہوئے بغیر آسمان کے گرد اپنا روزانہ سفر جاری رکھے ۔ جب وہ خریفی نقطۂ اعتدال سے گزر جاتا تو مصر کے قدیم لوگ ایک تہوار مناتے جو ''میلاد عصائے شمسی'' کہلاتا تھا ۔ چوں کہ اس کے بعد اس کا دور انحطاط شروع ہو جاتا تھا اور اس کی روشنی اور تمازت کم ہونے لگتی ، لہذا ان لوگوں کے خیال میں اسے سہارے کے لیے ایک عصا کی ضرورت تھی ۔ نیو کیلے ڈونیا میں جب کسی جادوگر کو دھوپ کرنی ہوتی ہے تو وہ کچھ پودے اور مرجان قبرستان میں لے جاتا ہے اور اپنے کسی زندہ بچے کے کٹے ہوئے گیسو اور اسلاف کی ہڈیوں میں سے کسی کے دو دانت اور ایک سالم جبڑا ان کے ساتھ رکھ کر ان سب کا ایک بنڈل تیار کر لیتا ہے ۔ پھر وہ اس پہاڑی پر چڑھ جاتا ہے جس کی چوٹی پر سمندر سے ابھرتے ہوئے سورج کی پہلی کرن پڑتی ہے ۔ یہاں وہ ایک چپٹے پتھر پر تین قسم کے پودے اور ان کے برابر ایک ٹہنی شجر مرجان کی رکھ دیتا ہے ، پھر اپنا وہ طلسمی پلندا اس پتھر پر ٹانگ دیتا ہے ۔ اگلے روز وہ اس جگہ واپس آتا ہے اور سمندر سے سورج کے طلوع ہوتے ہی اس پلندے کو

آگ لگا دیتا ہے ۔ جوں ہی اس سے دھوئیں کی لپٹیں اٹھتی ہیں وہ اس پتھر کو مرجان کی خشک شاخ سے رگڑتا ہے ۔ منتر پڑھ کر اپنے اسلاف کی روحوں کو بلاتا ہے اور آفتاب کو مخاطب کرکے کہتا ہے : ''میں یہ اس لیے کرتا ہوں کہ تم بھبک اٹھو اور آسمان پر سارے بادلوں کا صفایا کر دو ۔'' یہی رسم سورج ڈوبتے وقت پھر ادا کی جاتی ہے ۔ اسی جزیرے کے باشندے ایک قرص نما پتھر کے ذریعے ، جس میں سوراخ ہوتا ہے ، خشک سالی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ، جس وقت آفتاب طلوع ہوتا ہے ، جادوگر اپنے ہاتھ میں وہ پتھر اٹھا لیتا ہے اور ایک جلتی ہوئی مشعل اس کے چھید میں ڈال ڈال کر یہ کہتا جاتا ہے : ''میں سورج روشن کرتا ہوں تاکہ وہ بادلوں کا صفایا کر ڈالے اور ہماری زمین کو اس طرح خشک کر دے کہ وہ کچھ نہ پیدا کر سکے ۔'' جزیرۂ بینکس (آسٹریلیا) کے باشندے مصنوعی آفتاب کے ذریعے دھوپ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ وہ ایک گول پتھر لے کر جو واٹ لوا یا سنگ آفتاب کہلاتا ہے ، اس کے اطراف پر سرخ فیتے لپیٹ دیتے ہیں اور کرنوں کے طور پر اس سے اُلو کے پر چپکا دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نیچی آواز میں مقررہ منتر پڑھتے جاتے ہیں ۔ اس کے بعد وہ اپنے مصنوعی آفتاب کو ایک مقدس مقام پر برگدیا کزورینا (یہ درخت آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے) جیسے کسی اونچے پیڑ پر ٹانگ آتے ہیں ۔

خیال ہے کہ برہمن صبح کو جو ارپن کرتا ہے ، طلوع آفتاب اسی کا رہین منت ہے ۔ چناں چہ کہا جاتا ہے : ''اگر وہ یہ ارپن نہ کرے تو سورج کبھی نہ نکلے ۔'' میکسیکو کے قدیم لوگ سورج کو سرچشمۂ حیات سمجھتے تھے اور اسی لیے وہ ان کے ہاں ''اپل نیمو ہوانی'' کے نام سے موسوم تھا ، یعنی ''وہ جس کی بدولت انسان جیتا ہے ۔'' لیکن اگر وہ دنیا کو زندگی بخشتا تھا تو زندگی کے لیے دنیا کا محتاج بھی تھا اور چوں کہ دل زندگی کا مرکز اور زندگی کی علامت ہے اس لیے سورج کو آدمیوں اور جانوروں کے خون میں لتھڑے ہوئے دل نذر کیے جاتے تھے تاکہ وہ چاق چوبند رہے اور آسمان پر اپنا معمول

جاری رکھ سکے ۔ اس طرح اہل میکسیکو سورج کو جو قربانیاں دیتے تھے ، ان میں مذہب پر سحر کا عنصر غالب تھا کیوں کہ ان قربانیوں سے سورج کی استمالت و رضاجوئی کی بجائے اس کی صحت و توانائی مقصود تھی ۔ آتش مہر کے لیے انسانی ایندھن کی مسلسل مانگ ہر سال ہمسایہ قبیلوں سے جنگ کے ذریعے پوری کی جاتی تھی جس میں اسیروں کی ایک کثیر تعداد قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لیے ان کے ہاتھ آتی تھی ۔ آن کی ان مسلسل لڑائیوں اور انسانی قربانیوں کے وحشیانہ دستور کی بناء ، جو تاریخ کے صفحات پر سفاکی کا انتہائی بدنما داغ ہیں ، بڑی حد تک نظام شمسی کے متعلق ان کا غلط نظریہ تھا ۔ خالص فکری نوعیت کی غلطی سے جو ہلاکت خیز نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کی اس سے نمایاں مثال پیش نہیں کی جا سکتی ۔ قدمائے یونان کا عقیدہ تھا کہ آسمان پر سورج کی سواری ایک رتھ میں نکلا کرتی ہے ۔ چناں چہ جزیرۂ رھوڈز کے رہنے والے جو سورج کو اپنا مہا دیوتا سمجھتے تھے، ایک رتھ اور چار گھوڑے اس کی نذر کرتے اور انہیں اس کے استعمال کے لیے سمندر میں جھونک دیتے تھے ۔ ان کا یقیناً یہ خیال تھا کہ سال بھر چلنے کے بعد پرانے گھوڑے اور رتھ بے کار ہو جاتے ہیں ۔ غالباً اسی مقصد سے یہودیہ (بنی اسرائیل کی سلطنت جو ''قید بابل'' سے ان کی رہائی کے بعد قائم ہوئی تھی) کے بت پرست بادشاہ گاڑی گھوڑے سورج کے لیے وقف کیا کرتے تھے ۔ اور اسپارٹا ، ایران اور بلخ و بخارا کے لوگ آسے گھوڑوں کی قربانی دیتے تھے ۔ اہل اسپارٹا اپنی رسم قربانی ٹیگی ٹس کی دل کش پہاڑی پر ادا کیا کرتے تھے جس کے پیچھے ہر شام انہیں نیر اعظم غروب ہوتا نظر آتا تھا ۔ اہل رھوڈز کی سمندر میں گاڑی گھوڑے جھونکنے والی رسم کی طرح جنہیں ہر شام سمندر میں سورج ڈوبتا نظر آتا تھا ، وادیٔ اسپارٹا کے رہنے والوں کا گھوڑے قربان کرنا قدرتی بات تھی ۔ اس صورت سے اس تھکے ماندے دیوتا کو اپنی آخری منزل پر خواہ وہ سمندر میں ہوتا یا پہاڑوں پر ، جہاں کہیں تازہ دم گھوڑوں کی ضرورت ہوتی وہ اسے تیار ملتے ۔

جہاں کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ سورج کو روشن کرنے یا اس کی رفتار تیز کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، وہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ سورج کو لوٹا دینا یا روک دینا ان کے بس کی بات ہے۔ پیرو کے علاقے میں کوہ اینڈیز کا ایک درہ ہے جہاں دو مینار ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ ان میں آہنی تلاپے لگے ہیں تاکہ ایک مینار سے دوسرے تک جال پھیلایا جا سکے۔ یہ جال سورج کے لیے بچھایا جاتا ہے۔ ایسے آدمیوں کے قصے مشہور ہیں جنھوں نے سورج کو اپنے جال میں پھانسا ہو۔ جب سورج خزاں میں جنوب کی سمت حرکت کرتا ہے اور بحر منجمد شمالی پر جھکتا چلا آتا ہے تو اگ لولیک کے اسکیمو چڑیا کا پنجہ کھیلتے ہیں تاکہ وہ ان کی ڈور کے پھندے میں پھنس کر رہ جائے اور ہاتھ سے جانے نہ پائے اور جب بہار میں سورج شمال کی طرف جانے لگتا ہے، تو وہ اسے جلد واپس لانے کی غرض سے گیند پیالے کا کھیل شروع کر دیتے ہیں۔ جب کوئی آسٹریلوی وحشی یہ چاہے کہ اسے راستے میں شام نہ ہو تو وہ ڈوبتے سورج کے بالکل سامنے کسی درخت کے دوشاخے پر ایک گھسیلا یا دوپیا ڈھیلا رکھ دیتا ہے۔ اس کے برعکس سورج کی رفتار تیز کرنے کے لیے یہ وحشی اس کی طرف خاک اڑا کر پھونکیں مارتے ہیں۔ شاید اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کرۂ سبک رو کو مغرب کی طرف دوڑا کر اسے اس ریت کے اندر دفن کر دیا جائے جس میں وہ ہر شام ڈوبتا نظر آتا ہے۔ نیز، جس طرح کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سورج کی رفتار تیز کر سکتے ہیں، اسی طرح کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ سست خرام چاند کو ٹھیل سکتے ہیں۔ نیوگنی کے قدیم باشندوں کے ہاں قمری مہینے رائج ہیں اور ان میں کچھ لوگوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ چاند پر پتھر اور نیزے پھینکتے تھے تاکہ اس کی رفتار تیز کی جائے اور اس طرح ان کے آن دوستوں کی واپسی جلد ہو سکے جو مسلسل بارہ مہینے تک گھر سے دور تمباکو کے کھیتوں پر محنت مزدوری کرتے تھے۔ ملائیوں کا خیال ہے کہ غروب کے وقت شفق پھولنے سے کمزور آدمی بخار میں

مبتلا ہو سکتا ہے ، لہذا وہ اس آگ کو بجھانے کے لیے اس پر کلیاں کرتے یا خاک اڑاتے ہیں ۔ شسواپ نامی ریڈ انڈینوں کے عقیدے کے بموجب کسی ایسے درخت کی لکڑی جلانے سے موسم میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے جس پر بجلی گری ہو ۔ اس عقیدے کی بناء شاید ان کا یہ مشاہدہ ہے کہ ان کے ملک میں برق و باراں کے طوفان کے بعد ٹھنڈ ہو جاتی ہے ، لہذا بہار کے موسم میں یہ لوگ مرتفع زمین پر برف میں چلتے ہیں تو اس لکڑی کی چھپٹیاں جلاتے ہیں تاکہ برف کی سطح پگھلنے نہ پائے ۔

(۴) سحر اور ضبط ہوا — اس کے علاوہ وحشی یہ سمجھتا ہے کہ ہوا چلانا یا بند کرنا اس کے اختیار میں ہے ۔ اگر گرمی پڑ رہی ہو اور کسی یاکوت (سائبیریا کی ایک قوم) کو طویل مسافت طے کرنی ہو تو وہ ایک ایسا پتھر لیتا ہے جو اسے اتفاق سے کسی جانور یا مچھلی کے پیٹ میں سے ملا ہو اور اسے گھوڑے کے پشم سے اچھی طرح لپیٹ کر ایک لکڑی سے باندھ دیتا ہے ۔ پھر منتر پڑھتے ہوئے اس لکڑی کو گھماتا ہے ، جس سے تھوڑی دیر میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلنے لگتے ہیں ۔ اس غرض سے کہ نو دن تک ٹھنڈی ہوا چلتی رہے ، اس پتھر کو کسی چڑیا یا جانور کے خون میں ڈبویا جاتا ہے ۔ اس کے ساتھ جادوگر آفتاب کے رخ چلتے ہوئے تین چکر کاٹتا ہے ۔ اگر کسی ہاٹین ٹاٹ (جنوبی افریقہ کے وحشیوں کی ایک نسل) کو ہوا بند کرنی مقصود ہو تو وہ ایک موٹی سی وزنی کھال کسی کھمبے کے سرے سے ٹانگ دیتا ہے ۔ اس کے عقیدے کی رو سے کھال کو اس طرح لٹکا کر اڑایا جائے تو آندھی اتر جاتی ہے ۔ فیوگی (جزیرہ ٹیراڈیل فیوگو والے) جادوگر ہوا کے رخ گھونگے پھینکتے ہیں تاکہ اس کا زور گھٹ جائے ۔ جزیرہ بی بی لی کے باشندے جو نیوگنی کے قریب واقع ہے ، پھونکوں سے ہوا چلانے کے لیے مشہور ہیں ۔ آندھی آتی ہے تو بوگاڈجم لوگ کہتے ہیں کہ یہ بی بی لی والوں کی حرکت ہے ۔ ہوا چلانے کا ایک نیوگنی والا دستور یہ ہے

کہ ایک پتھر پر جو ''سنگ ہوا'' کہلاتا ہے ، لکڑی سے ہلکی ہلکی ضربیں لگائی جاتی ہیں ۔ اگر اس پتھر کو زور سے مارا جائے تو آندھی آ جاتی ہے ۔ اسی طرح اسکاچستان میں جادوگرنیاں ہوا کو تیز کرنے کے لیے ایک دھجی پانی میں بھگو کر اسے تین دفعہ پتھر پر مارتی ہیں اور ساتھ ہی یہ کہتی جاتی ہیں :

''میں دھجی اس پتھر پر مارتی ہوں کہ شیطان کے لیے آندھی آئے اور جب تک میں نہ چاہوں اترے نہیں ۔''

گرین لینڈ میں عورت کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زچگی کے ایام میں اور زچگی کے بعد کچھ عرصے تک اس میں کچھ ایسی قوت ہوتی ہے کہ اس کے اثر سے آندھی اتر جاتی ہے ۔ اسے بس یہ کرنا ہوتا ہے کہ گھر سے باہر نکلے ، منہ میں ہوا بھر کر گھر میں لوٹ آئے اور پھر اسے پھونک دے ۔ قدیم زمانے میں کورنتھ (یونان) میں ایک خاندان تھا جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ اٹھتے طوفان کو دبا سکتا ہے ، لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس خاندان کے افراد کس طریقے سے اس قدر مفید کام انجام دیتے تھے ، جس کا انہیں اس خاک نائے کے بحر نوردوں میں نری شہرت سے کہیں زیادہ ٹھوس صلہ ملتا ہوگا ۔ خود مسیحیت کے دور دورے میں بھی ، جب قسطنطنیہ میں قسطنطین سریرآرائے سلطنت تھا ، وہاں سوپاتر نامی ایک شخص ہواؤں کو جادو کے اثر سے بند کرنے کے الزام میں مارا گیا تھا ۔ ہوا یہ کہ مصر اور شام کے جو جہاز اناج لیے آ رہے تھے ، باد مخالف کے بند ہو جانے سے دور کہیں رک گئے اور بھوکے بازنطینی عوام کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا ۔ فنستانی جادوگر ان جہازرانوں کو جو طوفان کے سبب رکے پڑے ہوں ، ہوا بیچا کرتے تھے جو تین گرہوں میں باندھ دی جاتی ۔ پہلی گرہ کے کھولنے سے معتدل ہوا نکلتی ، دوسری سے تند اور تیسری سے جھکڑ چلنے لگتے ، بلکہ آج بھی ایستھونی ، جن کے ملک اور فنستان کے درمیان ایک تنگ خلیج حائل ہے ، اپنے شمالی ہمسایوں کے استدراج پر اعتقاد رکھتے ہیں ۔ چناں چہ اس تند و تیز ہوا کو جو بہار میں شمال اور مشرق سے چلتی ہے اور اپنے ساتھ

تپ لرزہ اور وجع مفاصل کی وبا لے کے آتی ہے ، ایستھونیا کے سادہ لوح کسان فنستانی جادوگروں اور جادوگرنیوں کے مکر و فریب کی مدد سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں ، خاص طور پر بہار کے تین دن ایسے ہیں جن سے وہ بہت خائف رہتے ہیں اور انہیں وہ 'ایام بلا' کہتے ہیں ۔ ان میں ایک مبارک پنج شنبے کو پڑتا ہے ۔ فیلن کے قرب و جوار میں رہنے والے ان دنوں باہر نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں لیپ لینڈ سے چلنے والی بے رحم ہوائیں انہیں ہلاک نہ کر ڈالیں ۔ ایک ایستھونی گیت جس کا موضوع یہ ہلاکت خیز ہوا کچھ اس طرح ہے :

اے باد بلا ! اے کمال زور و تیزی !
تیرے پر پرواز نے بہت طوفان اٹھائے ،
اے صرصر گریاں ، صد رنج بہ داماں !
تیرے جھونکوں کے دوش بدوش
ساحران شاہ سوار آتے ہیں فنستان سے

یہ بھی سنا گیا ہے کہ ملاح جب خلیج فنستان میں ہوا کے رخ اپنی کشتی لیے چلے جاتے ہیں تو انہیں کبھی کبھی ایک عجیب سا جہاز اپنے عقب سے ابھرتا نظر آتا ہے جو بڑی تیزی سے انہیں آن لیتا ہے ۔ یہ جہاز اپنے تمام بادبان کھولے ، کینویس کا ایک بادل لیے موجوں کے جھاگ میں سے اپنا راستہ کاٹتا اور پن کٹ سے پانی کی چادریں پیچھے کو پھینکتا عین ہوا کے رخ بڑھا چلا آتا ہے ۔ اس کے بادبان ہوا سے اس طرح ابھرے ہوتے ہیں کہ پھٹے پڑ رہے ہوں اور رسیاں اس طرح تنی کہ ٹوٹ رہی ہوں ۔ اس وقت ان جہاز رانوں کی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ فنستان سے آیا ہے ۔

ہوا کی گرہ بندی کا یہ فن کہ جتنی گرہیں کھولتے جائیے اتنا ہی ہوا کا زور بڑھے ، لیپستان کے جادوگروں اور شیٹ لینڈ ، لیوس اور جزیرۂ مین (یہ ٹاپو انگلستان کے آس پاس واقع ہیں) کی جادوگرنیوں سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ شیتستانی ملاح ابھی تک گرہ دار رومالوں کی صورت میں جادوگرنیوں سے ہوا خریدا کرتے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ

طوفانوں پر ان کی حکومت ہے ۔ کہتے ہیں کہ اب لروک میں اگلے وقتوں کی بڑی بوڑھیوں کا گزارا ہوا کی فروخت پر ہے ۔ یولیسز کو اقلیم ہوا کے بادشاہ ایولس سے چمڑے کی ایک ہوا بند تھیلی ملی تھی ۔ نیوگنی کے ماتوماتوؤں کے خیال میں ہوائیں 'اویابو' جادوگر چلاتا ہے ۔ ہر سمت کی ہوا کے لیے اس کے ہاں ایک بانس ہے جسے وہ جب چاہتا ہے چیر دیتا ہے ۔ مغربی افریقہ کے ضلع ٹوگو میں کوہ آگو کی چوٹی پر ایک فتیش (Fetish) ہے جس کے متعلق خیال ہے کہ باد و باراں اس کے تابع ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا پجاری ہواؤں کو ایک برتن میں بند رکھتا ہے ۔

بسا اوقات طوفانی ہواؤں کو ایسی بد روح خیال کیا جاتا ہے جسے ڈرانا ، دھمکانا ، مار بھگانا یا ہلاک کرنا ممکن ہے ۔ جب طوفان عرصے تک فرو نہ ہو اور موسم کی مسلسل خرابی کے سبب وسطی اسکیموؤں کے ہاں خوراک کی قلت ہو جائے تو وہ طوفان کو مسحور کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس کا عمل یوں ہے کہ بحری گھاس کا ایک لمبا سا چابک تیار کیا جاتا ہے اور سمندر کے کنارے پہنچ کر اس سے ہوا کے رخ ضربیں لگائی جاتی ہیں اور ساتھ ہی چیخ چیخ کر یہ کہا جاتا ہے ''ٹابا! (بس بہت ہو چکا)''۔ ایک دفعہ جب اتر کی پچھوا سے ساحل پر عرصے تک برف جمی رہی اور غذا کی قلت ہو گئی تو اسکیموؤں نے اس کو بند کرنے کے لیے ایک خاص عمل کیا ۔ ساحل پر آگ جلائی گئی اور لوگوں نے اس کے گرد جمع ہو کر ایک راگ الاپا ، پھر ان میں ایک بوڑھا آگ کی طرف بڑھا اور بڑی منت و سماجت سے ہوا کے شیطان کو بلایا کہ وہ آگ کے نیچے آن کر گرم ہو جائے ۔ جب یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ آن پہنچا ہے تو ایک بوڑھے نے اس بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی کا ایک برتن انڈیل دیا ۔ اس برتن کے پانی میں ان سب آدمیوں کا حصہ تھا جو اس وقت وہاں موجود تھے ۔ آگ پر پانی پڑتے ہی اس پر تیروں کی ایک باڑھ مار دی گئی ۔ ان کا خیال تھا کہ شیطان اس جگہ ہرگز نہیں ٹھہرے گا جہاں اس کے ساتھ ایسی بدسلوکی ہوئی ہو ۔ اس کے بعد مختلف سمتوں میں

بندوقیں داغی گئیں تاکہ اس کا پورا پورا اثر ہو اور ایک فرنگی جہاز کے کپتان سے درخواست کی گئی کہ وہ ہوا پر اپنی توپ چلا دے۔ یکم فروری ۱۸۸۳ء کو پائنٹ بارو، الاسکا، کے اسکیموؤں نے ایسی ہی ایک رسم ادا کی تھی تاکہ ہوا کی بد روح کا کام تمام کر دیا جائے۔ اس موقع پر عورتوں نے اس کو گھروں سے مار بھگانے کے لیے سونٹے اور چھڑیاں ہوا میں چلائیں۔ ادھر مردوں نے، جو الاؤ جلائے بیٹھے تھے، یہ کیا کہ آگ پر پانی کا ٹب جھونک دیا اور جوں ہی اس کی راکھ سے دھواں اٹھا، اس شیطان پر اپنی رائفلیں داغ دیں اور اسے کچلنے کے لیے ایک بھاری پتھر اس پر اور پھینک دیا۔

گران چیکو (امریکہ) کے لنگوا نامی باشندے بگولے کو کسی روح کے گزرنے سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے ڈرا کر بھگانے کی غرض سے اس پر لکڑیاں پھینکتے ہیں۔ جب آندھی سے جنوبی امریکہ کے پیاگوا قبیلے کی جھونپڑیاں گرنے لگتی ہیں تو ان میں کچھ لوگ اسے ڈرانے کے لیے بھڑکتی ہوئی لکڑیاں لے کر اس پر چڑھ دوڑتے ہیں اور کچھ لوگ اس کے مکے رسید کرتے ہیں۔ جب گائی کیورس (ریڈانڈینوں کی ایک نسل) قوم کو شدید طوفان کا خطرہ ہو تو مرد ہتھیار باندھ کر نکلتے ہیں اور عورتیں اور بچے اسے دھمکیاں دینے کی غرض سے گلے پھاڑ پھاڑ کر چیختے چلاتے ہیں۔ طوفان کے دوران میں سوماٹرا کے ایک باتکی موضع کے رہنے والوں کو تلواروں اور برچھیوں سے مسلح اپنے گھروں سے جھپٹ کر نکلتے دیکھا گیا ہے۔ وہ اپنے راجا کی سرکردگی میں نکلے اور چیختے چلاتے بڑے جوش و خروش سے اس غیرمرئی غنیم پر حملہ آور ہوئے۔ ان میں ایک بڑھیا اپنے گھر کی مدافعت میں خاص طور پر سرگرم عمل نظر آئی جو ایک لمبا سا تیغا لیے ہوا میں شپاشپ ہاتھ مار رہی تھی۔ باد و باراں کے ایک شدید طوفان میں جب بڑے زور و شور کی گرج ہو رہی تھی، طوفانی شیاطین کو ڈرا کر بھگانے کے لیے بورنیو کے کاہنوں نے اپنی تلوار پن آدھی آدھی نیام سے نکال لی تھیں۔ آسٹریلیا کے ایک بیابانی علاقے میں سرخ ریت کے بگولوں کو بد روحوں کے گزرنے پر محمول کیا جاتا ہے۔ ایک

دفعہ ایک تگڑا آسٹریلوی ایک بگولے کے پیچھے اپنا بومرنیگ (آسٹریلیا والوں کا ایک چوبی ہتھیار جو پھینکنے والے کے پاس واپس آ جاتا ہے) لے کے دوڑا کہ اسے مار ڈالے۔ وہ دو تین گھنٹے غائب رہنے کے بعد تھکا ہوا واپس آیا اور یہ بتایا کہ اس نے کوچی (بھوت) کا کام تمام کر دیا ہے، لیکن کوچی اس پر بہت غرایا، اس لیے اس کی بھی موت لازمی ہے۔ مشرقی افریقہ کے بدویوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب کبھی کوئی بگولہ ان کے راستے میں آتا ہے تو دس بارہ وحشی اس کے تعاقب میں خنجر لے کر جھپٹتے ہیں اور اس کے بیچوں بیچ گھونپ دیتے ہیں تاکہ اس بگولے کی بد روح کو مار بھگائیں۔

ان مثالوں کی روشنی میں ایک واقعہ، جو ہیروڈوٹس نے بیان کیا ہے اور جسے آج کے نقاد محض افسانہ سمجھتے ہیں، سچا معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس کی کوئی سند پیش کیے بغیر یہ کہتا ہے کہ ایک مرتبہ طرابلس میں صحرا سے ایسی لو چلی کہ سارے تالاب خشک ہو گئے۔ لوگوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور ان کی ایک جمعیت نے اس سموم جنوبی سے جنگ کے لیے کوچ کر دیا۔ لیکن جب وہ صحرا میں داخل ہوئے تو سموم ان پر جھپٹی اور سب کو تہ خاک کر ڈالا۔ یہ قصہ ایسے شخص نے بیان کیا ہوگا جس نے انھیں طبل جنگ بجاتے، صف بہ صف سرخ بگولوں میں غائب ہوتے دیکھا ہوگا۔

چھٹا باب

# ساحر شاهی

سحر کے اس دعوے کے ثبوت میں مندرجہ بالا شواهد کافی هیں که بہت سے ملکوں اور قوموں میں اس نے انسان کی فلاح و بہبود کے لیے فطرت کی زبردست قوتوں کو اپنے تابع رکھا ہے ۔ اگر بات یہی ہے تو پھر یہ فن جن لوگوں کا پیشہ رہا ہے انھیں ایسے معاشرے میں اثر و رسوخ اور اهمیت حاصل هونی ضروری ہے جو ان کے جھوٹے دعوؤں پر ایمان لے آتے هیں اور اگر ان میں کچھ لوگ اپنی شہرت اور هیبت و جلال کی وجه سے اپنے ساده لوح ساتھیوں پر اقتدار اعلیٰ کے منصب تک پہنچ جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ واقعات سے کچھ یہی اندازہ هوتا ہے که اکثر صورتوں میں ساحروں نے ترقی کرتے کرتے سرداروں اور بادشاهوں کی حیثیت حاصل کر لی هوگی ۔

آئیے سب سے پہلے آسٹریلیا کے اصلی باشندوں پر نظر ڈالی جائے جو انتہائی پستی کی حالت میں هیں اور جن کے متعلق دوسری وحشی قوموں کے مقابلے میں سب سے زیادہ معلومات بہم پہنچی هیں ۔ ان وحشیوں پر نہ سرداروں کی حکومت ہے نہ بادشاهوں کی ۔ وہ اپنی سیاسی تشکیل کے جس مرحلے پر پہنچ پائے هیں وہ ایک طرح کی جمہوریت بلکه ایسے با اثر بڑے بوڑھوں کی چند شخصی حکومت پر مشتمل ہے جو پنچ کی صورت میں بیٹھتے هیں اور سارے اهم امور طے

کرتے ہیں۔ ان کی اس مجلس مشاورت میں جوانوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ وہ اس سنیٹ (رومی سنیٹ مراد ہے) سے ملتی جلتی ہے جو بعد کے زمانے میں وجود میں آئی ۔ اس قسم کی حکومت کو اصطلاحاً ''شیوخیت'' کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے ۔ آسٹریلیا کے ان معمر لوگوں میں جن کا اس صورت سے پنچ بیٹھتا ہے اور قبیلے کا نظم و نسق چلاتا ہے ، بیشتر افراد ٹوٹموں کے لحاظ سے اپنی اپنی برادریوں کے سردار ہوتے ہیں ۔ وسطی آسٹریلیا میں جو بیرونی اثرات کی دسترس سے دور ایک بنجر علاقہ ہے اور اس وجہ سے جہاں ترقی کی رفتار اتنی دھیمی رہی ہے کہ وہاں کے لوگوں کی وحشت و جاہلیت میں امتداد زمانہ سے کوئی فرق نہیں آیا ، ٹوٹموں کی افزائش کے لیے سحری رسوم ادا کرنا مختلف ٹوٹم والی برادریوں کے سرداروں کے فرائض میں شامل ہے اور چوں کہ بیشتر ٹوٹم ایسے جانوروں اور پودوں پر مشتمل ہیں جو کھانے میں آتے ہیں ، اس لیے ظاہر ہے کہ ان سرداروں کا کام سحر کی مدد سے عام لوگوں کے لیے خوراک مہیا کرنا ہے ۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو بارش کرنے اور دوسری اجتماعی قسم کی خدمتوں پر مامور ہیں ۔ مختصر یہ کہ وسطی آسٹریلیا کے قبائل میں سرداروں کی حیثیت پیشہ ور ساحروں کی ہے ۔ نیز ان کا اہم ترین فرض اس مقدس گودام کی نگرانی ہے جو عموماً چٹانوں کے شگاف یا کنوئیں پر مشتمل ہوتا ہے اور اس میں وہ متبرک پتھر اور لکڑیاں (چرنگا) رکھی ہوتی ہیں جن سے ایک طرح تمام مردہ اور زندہ آدمیوں کی روحیں وابستہ سمجھی جاتی ہیں ۔ ان سرداروں کو قبائلی دستور کی خلاف ورزی کے لیے تعزیر و سزا جیسے سول نوعیت کے فرائض ضرور انجام دینے پڑتے ہیں لیکن ان کے اصل فرائض مقدس یا سحری ہیں ۔

ہم آسٹریلیا سے نیوگنی کی طرف آتے ہیں تو یہاں یہ صورت نظر آتی ہے کہ لوگ اگرچہ آسٹریلیا والوں سے کہیں زیادہ مہذب ہیں ، لیکن ان کا معاشرہ ہنوز بنیادی طور پر چند شخصی یا جمہوری اور سرداری طرز حکومت ابھی نہایت ابتدائی حالت میں ہے ۔ چناں چہ سر ولیم میک گریگر کا کہنا ہے کہ ''نیوگنی میں آج تک ایک بھی

ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جو اپنی ذہانت، جسارت اور زور بازو سے کسی ایک ضلع کا مطلق العنان حکمران بن گیا ہو'' اور سر ولیم ہی کے الفاظ میں ''زیادہ سے زیادہ یہ ہوا ہے کہ ایک آدھ شخص اٹھا اور جادوگر کی حیثیت سے نام پیدا کر لیا لیکن اس کے نتیجے میں بس ایک چوتھ کے سوا اس کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔'' ایک میلینشیائی بیان کے بموجب وہاں کے سرداروں کے اقتدار کی بناء عام لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی طاقت ور روحوں سے رسم و راہ ہے اور وہ خرق عادت کی قدرت رکھتے ہیں۔ اگر ان میں کسی سردار نے کوئی جرمانہ عائد کیا تو وہ اس لیے ادا کیا گیا کہ سب لوگ اس کی باطنی قوت سے ڈرتے تھے اور انہیں اس پر کامل اعتقاد تھا کہ نافرمانی کرنے والے کو وہ بیماری اور مصیبت میں مبتلا کر سکتا ہے۔ جوں ہی لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان کی روحانی طاقت پر شک کرنے لگتی تو ان کا اختیار ختم ہو جاتا اور وہ جرمانہ عائد کرنے کے قابل نہ رہتے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر جارج براؤن کا بیان ہے: ''نیوبرٹن (ایک جزیرہ جو نیوگنی کے مشرق میں واقع ہے) میں مذہبی فرائض ہمیشہ حکمران طبقے سے وابستہ رہے، یعنی وہ اس بات کا مدعی ہوتا کہ ''بتارنوں'' (روحوں) سے ربط و ضبط سے اور ان کے اثر سے مینہ برسانے یا دھوپ چمکانے، خوش گوار یا ناخوش گوار ہوا چلانے، صحت بخشنے یا بیماری میں مبتلا کرنے، جنگ میں جتانے یا ہرانے اور ہر وہ برکت یا مصیبت نازل کرنے کی قدرت رکھتا ہے جس کے لیے سائل اسے معقول معاوضہ ادا کرنے پر رضا مند ہو''۔

افریقہ میں ہمیں تہذیب کی سطح اور بھی اونچی نظر آتی ہے، جہاں سرداری اور بادشاہت دونوں تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ یہاں ساحر بالخصوص بارش گر کے ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے سرداری تک پہنچنے کی وافر شہادت ملتی ہے۔ چناں چہ مشرقی افریقہ کی ویمبگوے نامی ایک قوم کا، جو بانتو نسل سے تعلق رکھتی ہے، ابتدائی طرز حکومت ایک طرح کی خاندانی جمہوریت تھا، لیکن جادوگروں نے اپنی زبردست موروثی طاقت کے سبب چھوٹے سرداروں کی حیثیت

اختیار کر لی۔ ۱۸۹۴ء میں ان کے ہاں جو تین سردار تھے ان میں ساحروں کی حیثیت سے دو کا بڑا رعب چھایا ہوا تھا اور وہ اپنے سارے مویشی ان ساحر سرداروں کی خدمت کے صلے میں ان کی نذر کر دیتے تھے۔ ان سرداروں کا اصل کام مینہ برسانا تھا۔ مشرقی افریقہ کی وتاترو نامی ایک اور قوم کے سرداروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سب نرے جادوگر ہیں اور لوگوں پر براہ راست ان کا کوئی سیاسی اثر نہیں۔ نیز کہا جاتا ہے کہ مشرقی افریقہ کے واگوگوؤں کے سرداروں کے اقتدار کی بناء ان کا فن بارش گری ہے۔ اگر خود سردار کو یہ فن نہ آتا ہو تو اسے ایسے شخص سے مینہ برسوانا پڑتا ہے جسے اس کی قدرت ہو۔

اس کے علاوہ ان قبائل میں جو دریائے نیل کے بالائی علاقے میں رہتے ہیں، جادوگر ہی عام طور پر سردار ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں مینہ برسانے کا استدراج حاصل ہے اور اسی استدراج پر ان کے اقتدار کا انحصار ہے، اس لیے کہ ان اضلاع کے رہنے والوں کے لیے بارش ہی سب کچھ ہے۔ وہ صحیح وقت پر نہ ہو تو انہیں سخت مصائب کا سامنا ہوتا ہے، اس لیے ان میں چالاک آدمیوں کا یہ دعویٰ کرنا کہ وہ بارش گری جیسے خرق عادت کی قدرت رکھتے ہیں یا اپنے آپ کو بارش‌گر مشہور کرکے اپنے پڑوسیوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لہذا مذکورہ بالا قبائل میں بیشتر سردار بارش‌گر ساحر ہیں اور ان میں وقت پر مینہ برسانے کی جو جتنی طاقت رکھتا ہے اسی کی مناسبت سے اپنے لوگوں میں مقبول ہے۔ یہ بارش‌گر سردار اپنے گاؤں ہمیشہ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر بساتے ہیں، کیوں کہ انہیں یقیناً اس کا علم ہوتا ہے کہ پہاڑ بادلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اس مقام سے ان کی موسمی پیشین گوئیوں میں غلطی کا بہت کم احتمال رہتا ہے۔ ان میں ہر ایک کے پاس سنگی بلور، سنگ چینی اور نیلم کی قسم کے ''بارش کار'' طلسمی پتھر ہوتے ہیں جنھیں وہ ایک برتن میں بڑی احتیاط سے محفوظ رکھتا ہے۔ جب وہ مینہ برسانا چاہتا ہے تو ان پتھروں

کو پانی میں ڈبو کر تر کر لیتا ہے ۔ اس کے بعد ہاتھ میں ایک چھلی ہوئی چھڑی پکڑے ، جس کے بالائی سرے میں چیرا لگا ہوتا ہے ، وہ بادلوں کو اپنی طرف آنے یا اس طرف جانے کا اشارہ کرتا ہے ، جدھر ان کی ضرورت ہو ؛ ساتھ ہی ایک منتر بھی پڑھتا جاتا ہے ۔ پھر وہ کسی پتھر کے جوف میں پانی اور بھیڑ یا بکری کی اوجھڑی ڈال کر آسمان کی طرف اس کے چھینٹے اڑانے لگتا ہے ۔ سردار کو بارش‌گری کی جو فرضی طاقت حاصل ہوتی ہے اس کی وجہ سے گو وہ بڑی دولت پیدا کر لیتا ہے لیکن بسااوقات بلکہ عموماً اس کا انجام برا ہوتا ہے ، اس لیے کہ جب خشک سالی ہوتی ہے تو لوگ اس کو اسی سے منسوب کرتے ہیں اور جوش غضب میں اسے قتل کر ڈالتے ہیں ۔ تاہم سرداری کا یہ منصب موروثی ہوتا ہے اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہتا ہے ۔ ان قبائل میں جو ایسی چیزوں پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اس قسم کی رسموں کے پابند ہیں ، لاتوکا ، باری ، لالوبا اور لوکوئیا شامل ہیں ۔

نیز وسطی افریقہ میں جھیل البرٹ کی مغربی جانب لینڈو نام کا ایک قبیلہ آباد ہے جس کا اس بات پر کامل اعتقاد ہے کہ بعض لوگ مینہ برسانے کی قدرت رکھتے ہیں ۔ اس قبیلے میں بارش‌گر یا تو سرداری کے منصب پر فائز ہوتا ہے یا اپنے استدراج کی بناء پر عام طور پر سردار کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے ۔ بان بورو قوم میں بھی بارش‌گر بڑی محترم ہستی ہے جو تحفے تحائف سے لاد دیا جاتا ہے اور وہ بڑا جادوگر جو اس قوم کے نزدیک بارش پر کامل قدرت رکھتا ہے ، تخت و تاج کا مالک ہے ۔ لیکن وہ اپنا یہ اختیار بارش گری دوسرے اشخاص کو تفویض کر سکتا ہے تا کہ اس کی برکتیں ہر طرف نازل ہوں اور اس کی قلم رو کا کوئی حصہ ابر رحمت سے محروم نہ رہے ۔

افریقہ کے مغربی نیز وسطی و مشرقی علاقوں میں ساحر اور سردار کے مناصب کا یہی امتزاج نظر آتا ہے ۔ چناں‌چہ فین قبیلے میں سردار اور جادوگر کے درمیان کوئی خاص حد امتیاز قائم نہیں ہے ۔ سردار ہی

جادوگر ہوتا ہے اور ساتھ ہی لوہار بھی ، کیوں کہ ان فنیوں کے ہاں ہن گری کا پیشہ بہت مقدس سمجھا جاتا ہے اور سرداروں کے سوا اسے کوئی اختیار نہیں کر سکتا ۔

بارش گر اور سردار کے عہدوں کے باہمی رشتے کے متعلق ایک کتاب کا مؤلف ، جسے اس ضمن میں بڑی معلومات حاصل ہیں ، یہ لکھتا ہے کہ ''قدیم زمانے میں قبیلے کے سردار اپنے اس فن میں کسی کی مسابقت گوارا نہیں کرتے تھے کہ کہیں کوئی بارش گر ان سے بازی نہ جیت لے اور خود قبیلے کا سردار نہ منتخب ہو جائے ۔ لیکن اس کا ایک سبب اور بھی تھا ۔ کوئی بارش گر شہرت حاصل کر لیتا تو اس کا دولت مند بن جانا یقینی تھا ، اور سردار کسی کا ضرورت سے زیادہ مال و دولت پیدا کرنا کبھی گوارا نہ کرتا ۔ چوں کہ بارش گر کا لوگوں پر بڑا اثر ہوتا ہے ، اس لیے اس کے منصب کو حکم ران طبقے سے وابستہ رکھنا بہت ضروری تھا ۔ روایت کی رو سے قدیم سرداروں اور سورماؤں کی نام وری کا باعث ہمیشہ ان کا یہی استدراج بارش گری تھا اور سرداری کے منصب کی ابتداء اسی سے ہوئی ہوگی ۔ جو لوگ مینہ برساتے وہی لازمی طور پر سردار بن جاتے ۔ اسی طرح چاکا (زولوؤں کا مشہور مطلق العنان حکم ران) یہ کہا کرتا تھا کہ ملک میں صرف وہی ایک پیشین گوئی کر سکتا ہے کیوں کہ اس نے کسی اور کو اس کی اجازت دی تو اس کی جان خطرے میں پڑ جائے گی''۔ ڈاکٹر مافٹ مجموعی طور پر جنوبی افریقہ کے قبائل کے متعلق کہتے ہیں کہ ان میں ''بارش گر بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور لوگوں کے ذہنوں کو اس نے اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ بادشاہ کی اس کے آگے کچھ پیش نہیں جاتی ، بلکہ خود بادشاہ کو بھی اس کے آگے سرتسلیم خم کرنا پڑتا ہے ۔

مندرجہ بالا شہادت کی بناء پر یہ امر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ میں بادشاہت کا آغاز پیشہ ور ساحروں ، خاص کر بارش گروں سے ہوا ۔ ساحر کی ترقی میں دو چیزوں کا حصہ رہا ہوگا ، ایک لوگوں کے دلوں پر اس کی بے پناہ ہیبت ، دوسرے وہ مال و متاع جو اپنے

پیشے کی بدولت اس کے ہاتھ آتا تھا ۔ لیکن اگر ساحر کے پیشے سے کسی پر فن اور ماہر شخص کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے تو اس میں کسی بدقسمت یا اناڑی کے لیے متعدد خطرے بھی موجود ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی پیشہ ور جادوگر کی جان غضب میں ہوتی ہے ، اس لیے کہ جہاں لوگوں کا اس بات پر کامل یقین ہوتا ہے کہ مینہ کا برسنا ، سورج کا چمکنا اور زمین کا سرسبز ہونا اسی کی قدرت کا کرشمہ ہے ، وہاں لا محالہ وہ قحط و خشک سالی کو بھی اسی کی غفلت یا ہٹ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اس کا اسے خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے ۔ چنانچہ افریقہ میں جو ساحر مینہ برسانے سے قاصر رہے اسے جلا وطن کر دیا جاتا ہے ۔ مغربی افریقہ کے بعض حصوں میں بادشاہ سے التجائیں کرنے اور اسے نذرانے پیش کرنے سے بارش نہ ہو تو رعایا اسے رسیوں سے باندھ کر کشاں کشاں اس کے آبا و اجداد کی قبروں پر لے جاتی ہے کہ وہ ان سے بارش کروائے ۔ مشرقی افریقہ کے بانجر بادلوں یا صاف موسم کو اپنے بادشاہ کی کارسازی سمجھتے ہیں ۔ جب تک مطلع صاف رہتا ہے وہ بادشاہ کو اناج اور مویشی کے نذرانوں سے مالامال کرتے رہتے ہیں ، لیکن اگر خشک سالی یا بارش کی کثرت سے فصلوں کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کی خیر نہیں ۔ جب تک موسم نہ بدلے اسے خوب ذلیل کیا جاتا ہے اور مارا پیٹا جاتا ہے ۔ لوانگو (مغربی افریقہ) میں فصل اچھی نہ ہو یا ساحل پر تلاطم کے سبب مچھلی کا شکار نہ ہو سکے تو وہاں کے لوگ اپنے بادشاہ کو بد دلی کے الزام میں معزول کر دیتے ہیں ۔ گرین کوسٹ (لائبیریا) میں بڑا پیشوا یا وہ مقدس بادشاہ جس کا لقب بوڈیو ہے ، اپنی قوم کی صحت ، زمین کی زرخیزی اور بحر و دریا میں مچھلی کی افزائش کا ذمہ دار ہے ۔ اگر ان میں سے کسی چیز کے ٹھیک نہ ہونے سے ملک کو مصیبت کا سامنا ہو تو بوڈیو معزول کر دیا جاتا ہے ۔ ضلع اوسوکوما میں ، جو جھیل وکٹوریہ نیانزا کے جنوبی کنارے واقع ہے ، بارش اور ٹڈی دل کا سوال سلطان کی حکومت کا واحد مسئلہ ہے ۔ خود سلطان کے لیے بھی یہ جاننا ضروری ہے کس طرح مینہ برسایا

جائے اور ٹڈیوں سے نجات حاصل کی جائے ۔ اگر وہ اور اس کے جادوگر اس مسئلے سے عہدہ برا نہ ہو سکیں اور لوگ مصیبت سے دو چار ہوں تو سلطان کی جان خطرے میں ہوتی ہے ۔ ایک مرتبہ لوگ خشک سالی سے ایسے عاجز آئے کہ انھوں نے سلطان کو اپنے ملک سے نکال دیا (اور اسے ناسا کے قریب ایک جگہ اتاوا میں پناہ گزیں ہونا پڑا)۔ اس ملک کے باشندوں کے خیال میں فرمان رواؤں کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ فطرت اور اس کے مظاہر کو اپنے قابو میں رکھیں ۔ نیز نیانزا کے باشندوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے عام عقیدے کے بموجب مینہ سحر کا نتیجہ ہے اور اسے وقت پر برسانا سردار قبیلہ کا ایک اہم فرض ہے ۔ اگر وہ وقت پر نہ برسے تو ہر شخص شکایت کرتا ہے ۔ چھوٹے چھوٹے کئی بادشاہوں کو خشک سالی کے سبب جلاوطن کر دیا گیا ۔ بالائی نیل کے لاتوکا قبیلے کی فصل مرجھانے لگے اور بارش کے لیے سردار قبیلہ کی کوششیں کارگر نہ ہوں تو رات کی تاریکی اس پر دھاوا بول دیا جاتا ہے اور اسے لوٹ کھسوٹ کر علاقے سے نکال دیا جاتا ہے ، لیکن بسا اوقات اسے قتل کر دیا جاتا ہے ۔

دنیا کے دوسرے بہت سے حصوں میں بادشاہوں سے یہ توقع وابستہ رہی ہے کہ وہ فطرت کے آئین کو اس طرح منضبط کریں کہ ان کی رعیت متمتع ہو سکے ۔ اگر وہ اپنا یہ فرض انجام دینے سے قاصر رہے تو انھیں سزا دی گئی ۔ سیتھیوں (سیتھیا کے باشندے جو اس علاقے کا قدیم نام ہے جو بحیرۂ اسود ، بحیرۂ اخضر اور بحیرۂ ارال کے شمال میں واقع ہے) کے ہاں جب غذا کی قلت ہوتی تو وہ اپنے بادشاہوں کو قید کر دیتے تھے ۔ مصر قدیم میں فصلوں کی خرابی بادشاہوں کے سر تھوپی جاتی تھی ، لیکن ساتھ ہی مقدس جانور بھی عمل فطرت کے ذمہ دار قرار پاتے تھے ۔ جب خشک سالی کی وجہ سے وبا یا کوئی اور آفت نازل ہوتی تو مذہبی پیشوا رات کے وقت ان جانوروں پر جا پڑتے اور انھیں دھمکیاں دیتے ۔ اس پر بھی مصیبت رفع نہ ہوتی تو انھیں ذبح کر دیا جاتا ۔ جنوبی بحرالکاہل کے جزیرۂ نیوی یاسیویچ پر جو بحیرۂ مرجان

میں واقع ہے ، بادشاہوں کا ایک سلسلہ حکومت کرتا تھا ۔ ان کی حیثیت مذہبی پیشواؤں کی بھی تھی ، اس لیے بحر و بر سے خوراک پیدا کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا ۔ جب قحط پڑتا تو لوگ انھیں جوش غضب میں قتل کر ڈالتے تھے ۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یکے بعد دیگرے سب بادشاہ مارے گئے اور جب حکومت کے لیے اس خاندان کا ایک بھی فرد باقی نہ رہا تو وہاں بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا ۔

چین کے قدیم مصنفوں کے بیان کے بموجب کوریا میں بارش کی قلت یا کثرت سے فصل کے نہ پکنے کے لیے بادشاہ کو قصور وار ٹھہرایا جاتا ۔ چناں چہ کبھی ایسی صورت پیش آتی تو لوگ یہ کہتے کہ اسے تخت و تاج سے اتار دیا جائے اور کچھ کی یہ صلاح ہوتی کہ اس کا قصہ پاک کر دیا جائے ۔

امریکی الاصل قوموں میں تہذیب کو سب سے زیادہ فروغ میکسیکو اور پیرو کی ملوکی اور مذہبی حکومتوں کے تحت ہوا ، لیکن ان ملکوں کے ابتدائی حالات کے متعلق ہماری معلومات کا ذخیرہ نہایت محدود ہے اور اس لیے کہا نہیں جا سکتا کہ آیا ان کے یوجان بادشاہوں کے پیش رو جادوگر یا نیرنگ ساز تھے یا نہیں ۔ ان کے ارتقاء کے اس پہلو کی طرف شاید اس حلف میں کچھ اشارے ملیں جو میکسیکی بادشاہوں کو اپنی تخت نشینی کے موقع پر لینا پڑتا تھا ۔ اس میں شاہان مذکور سورج کو روشن کرنے ، بادلوں کو برسانے ، دریاؤں کو بہانے اور زمین کو سرسبز کرنے کا اقرار کرتے تھے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ کے اصلی باشندوں میں ساحر یا نیرنگ ساز اپنی پر اسرار و پر ہیبت شخصیت کی بدولت بڑی اہمیت رکھتا تھا اور کچھ عجب نہیں کہ اسی نے بہت سے قبائل میں سردار اور بادشاہ کی حیثیت حاصل کر لی ہو ، اگرچہ ان کے ارتقاء میں ایسے کسی تسلسل کی کوئی صریح شہادت موجود نہیں ۔ چناں چہ کیٹ لین (آنیسویں صدی کا امریکی فن کار اور سیاح) کا بیان ہے کہ شمالی امریکہ میں نیرنگ سازوں کو ''قبیلے کے اکابر کا مرتبہ حاصل ہے اور سب لوگ ان کا بے حد احترام کرتے ہیں ۔ اس کا سبب محض اپنے علم الادویہ

میں ان کی مہارت نہ تھی بلکہ سحر اور مذہبی رسوم میں ان کا کمال اور پرکاری تھی ، جو بڑی حد تک ان کا ذریعۂ معاش ہے ۔ ان قبائل کے تمام طبیب شعبدہ باز ، ساحر ، کاہن بلکہ مذہبی پیشوا ہیں ، اس لیے کہ رسوم مذہبی انھی کے زیر اہتمام ادا کی جاتی ہیں اور انھیں ہواتف قوم سمجھا جاتا ہے ۔ ''امن و جنگ کی مجلسوں میں انھیں سرداروں کے برابر نشست ملتی ہے ۔ اجتماعی طور پر جب بھی کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے ، ان سے باقاعدہ مشورہ کیا جاتا ہے اور ان کی رائے بڑی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے''۔ اسی طرح کیلےفورنیا کی 'میڈو قوم میں شاید شامن (مذہبی پیشوا) کو اہم ترین فرد کی حیثیت حاصل تھی یا اب بھی ہے ۔ کسی خاص طرز حکومت کی عدم موجودگی میں اس کی بات بڑی اہمیت رکھتی ہے اور ایک طبقے کی حیثیت سے لوگوں پر ان کا بڑا رعب ہے اور عام طور پر لوگ سردار سے زیادہ ان کا حکم مانتے ہیں ۔''

جنوبی امریکہ میں بھی ساحر یا طبیب قسم کے نیرنگ ساز سے سرداری یا بادشاہت وجود میں آئی ہوگی ۔ ساحل برازیل پر جو فرنگی سب سے پہلے آباد ہوئے تھے ان میں ایک تھیوے نامی فرانسیسی کا بیان ہے کہ وہاں کے باشندوں میں اس قسم کے جادوگر کا ادب پرستش کی حد تک کیا جاتا تھا ، بلکہ وہ اسے اپنا معبود سمجھتے تھے ۔ عوام الناس اس کے درشن کے لیے جاتے ، اس کے آگے سجدہ کرتے اور اس سے یہ دعا مانگتے کہ وہ انھیں اور ان کے بچوں کو بیمار پڑنے یا مرنے نہ دیں اور وہ ان کی دعا قبول کر لیتا ۔ لیکن اگر ان جادوگروں کی بات سچ نہ نکلتی اور ان کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوتی تو لوگوں کو انھیں ننگ سحر سمجھ کر قتل کرنے میں کوئی باک نہ ہوتا ۔ گرین چیکو کے لنگوا نامی ریڈانڈینوں میں ہر برادری کا ایک سردار ہے لیکن اس کا اثر و اختیار برائے نام ہے ۔ اسے اپنے عہدے کی بدولت بڑے تحفے دینے پڑتے ہیں اس لیے اس کے ہاں دولت ٹکنے نہیں پاتی بلکہ اس کا لباس اپنی رعایا سے بھی ابتر ہوتا ہے ۔ ان کے ہاں اصل میں صاحب اقتدار ہستی جادوگر کی ہے ۔ وہ تحفے دیتا

نہیں بلکہ لیتا ہے ۔ ساحر کا یہ کام ہے کہ وہ قبیلے کے دشمنوں کو مصیبت میں مبتلا کرے اور اپنی قوم کو دشمنوں کے سحر سے محفوظ رکھے۔ ان خدمات کا اسے معقول معاوضہ ملتا ہے اور ان کے ذریعے اسے قوم میں بڑا اثر و اختیار حاصل ہو جاتا ہے ۔

ملایا کے طول و عرض میں راجا کے متعلق یہ وہم عام ہے کہ وہ فوق الفطرت قوتوں کا حامل ہے ، اس لیے اس کا بے انتہا ادب کیا جاتا ہے ۔ چند ایسے وجوہ موجود ہیں جن کی بناء پر یہ سمجھنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ راجا بھی بہت سے افریقی ساحروں کی طرح سیدھے سادے ساحر کی ترقی یافتہ صورت ہے ۔ آج بھی ملائی اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ فصلوں کی نشو و نما اور درختوں کی باروری جیسے کاموں میں راجا کی ذات فطرت پر اثر انداز ہو سکتی ہے ۔ زرخیزی اور باروری کی اسی قوت سے کم تر درجے میں راجا کے نائبوں بلکہ ان یورپیوں کو بھی متصف سمجھا جاتا ہے جن کے سپرد کسی ضلع کا انتظام ہو ۔ چناں چہ سیلان گور میں ، جو جزیرہ نمائے ملایا کی ایک دیسی ریاست ہے ، چاول کی فصلوں کا اچھا یا خراب ہونا اکثر ان افسران اضلاع سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ جنوبی سلیبیز کے تورایوں کے نزدیک چاول کی صحیح نشو و نما ان کے فرماں رواؤں کے طرز عمل پر منحصر ہے اور بری حکومت کے نتیجے میں ، جس سے ان کی مراد ایسی حکومت ہے جو قدیم دستور کے مطابق نہ ہو ، فصلیں خراب ہو جاتی ہیں ۔

ساراوک کے دایکوں کا یہ اعتقاد تھا کہ ان کے مشہور انگریز حکمران راجا بروک کی ذات میں ایک سحری جوہر ہے ، جس کے صحیح استعمال سے دھان کی فصل وافر ہو سکتی ہے ۔ چناں چہ جب وہ کسی قبیلے میں جاتا تو لوگ اس کے پاس وہ دانہ لے آتے ، جو آئندہ سال بویا جانے والا ہو اور بروک اس دانہ پر سے کسی عورت کے گلوبند جو پہلے سے کسی خاص محلول میں ڈبو لیے جاتے تھے ، وار کر انھیں قوت افزائش و نمو عطا کر دیتا ۔ جب وہ کسی گاؤں میں داخل ہوتا تو عورتیں اس کے پاؤں ایک دفعہ سادہ پانی سے

دھو کر ان پر ناریل کا پانی ڈالتیں ، پھر انھیں سادہ پانی سے دھوتیں اور یہ سارا پانی اس اعتقاد کے ساتھ کھیتوں میں تقسیم کرنے کی غرض سے محفوظ رکھا جاتا کہ اس کے اثر سے فصل ضرور اچھی ہوگی - وہ قبائل جن تک بروک فاصلے کی وجہ سے نہیں پہنچ سکتا ، اسے ایک چھوٹا سا سفید کپڑا اور کچھ سونا اور چاندی بھیجتے اور جب وہ ان چیزوں میں اپنی قوت پیدائش و افزائش کا اثر پیدا کر دیتا تو ان قبیلوں کے لوگ انھیں اپنے کھیتوں میں دفن کر دیتے اور بڑے اعتماد سے فصل فراواں کا انتظار کرتے - ایک مرتبہ سامبن قبیلے کے ہاں دھان بہت کم ہوا ؛ ایک یوروپین نے اس کا سبب دریافت کیا تو اس قبیلے کے سردار نے فوراً جواب دیا کہ یہی ہونا تھا ، اس واسطے کہ راجا بروک ان کے ہاں کبھی نہیں آیا - پھر اس نے اس یورپین سے التجا کی کہ وہ مسٹر بروک کو اس کے قبیلے میں آنے اور اس کی اراضی کا بنجر پن دور کرنے پر آمادہ کریں -

یہ عقیدہ کہ بادشاہ سحری اور فوق الفطرت قوتوں کے حامل ہوتے ہیں ، جس کی وجہ سے زمین کو سرسبز و زرخیز کرنا اور اپنی رعایا پر دوسری برکتیں نازل کرنا ان کے بس کی بات ہے ، ہندوستان سے لے کر آئرستان تک آریائی نسل کی ساری قوموں میں عام رہا ہوگا اور خود ہمارے ملک میں آج بھی اس کے آثار صاف نظر آتے ہیں - چناں چہ ہندوؤں کے اس قدیم مجموعۂ قوانین میں جو مانوشاستر کے نام سے موسوم ہے ، کسی اچھے بادشاہ کے دور حکومت کے اثرات یہ بیان کیے گئے : ''جس ملک میں بادشاہ ان لوگوں کا مال و متاع لینے سے گریز کرتا ہے ، جو گناہ ہائے کبیرہ کے مرتکب ہوں ، وہاں آدمی صحیح وقت پر جنم لیتے ہیں اور بڑی عمر پاتے ہیں ، اور کاشت کار جیسا کچھ بوتے ہیں ویسا ہی کاٹتے ہیں - بچے مرتے نہیں اور نکھ سکھ سے درست اور ہاتھ پاؤں کے پورے پیدا ہوتے ہیں -'' ہومر کے عہد کے یونان میں بادشاہ کی ہستی اس قدر مقدس تھی کہ اس کا نام بڑے ادب سے لیا جاتا تھا ، بلکہ اس کے گھر اور رتھ کی بھی بڑی حرمت کی جاتی تھی اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کسی اچھے

بادشاہ کی حکومت باعث خیر و برکت ہوتی ہے ۔ اسی کے سبب زمین گندم و جو پیدا کرتی ہے ، درخت پھلوں سے لد جاتے ہیں ، جانوروں کی افزائش نسل ہوتی ہے اور سمندر مچھلی سے بھر جاتے ہیں ۔ قرون وسطیٰ میں جب شاہ ڈینمارک والڈیمر اول نے (یا والڈیمار اعظم ۱۱۳۱ء و ۱۱۸۲ء) جرمنی کا سفر کیا تو مائیں اپنی گود کے بچے اور کسان اپنے بیج لیے اس کے پاس پہنچے کہ وہ ان پر اپنا ہاتھ رکھ دے ۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ کے چھونے سے بچے پھلیں پھولیں اور پروان چڑھیں گے اور اسی وجہ سے کسانوں نے اس سے التجا کی کہ وہ اپنے دست مبارک سے ان کے کھیتوں میں تخم ریزی کر دے ۔ قدیم آئرستانیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب بادشاہ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہیں تو موسم معتدل ، فصلیں وافر ، مویشیوں کی افزائش اور سمندر میں مچھلی کی افراط ہو جاتی ہے اور درختوں پر پھل اس قدر گھن گھنا کر آتا ہے کہ انھیں سہارا دینا پڑتا ہے ۔ ایک کلیسائی قانون میں سینٹ پیٹرک (آئرستان کے محافظ ولی جو غالباً پانچویں صدی میں گزرے ہیں) سے منسوب کیا جاتا ہے ، کسی عدل گستر بادشاہ کے عہد حکومت کی جو برکتیں گنوائی گئی ہیں ان میں ''موسم کا صاف ، سمندر کا پرسکون ، فصلوں کا وافر اور درختوں کا پھلوں سے لدا ہونا'' شامل ہیں ۔ اس کے برعکس قحط سالی ، گایوں کا بانجھ پن ، پھلوں کا ٹھٹھرنا اور اناج کی قلت اس بات کا قطعی ثبوت سمجھا جاتا تھا کہ بادشاہ وقت اچھا نہیں ۔

غالباً اسی قسم کا ایک وہم باطل جو انگریز بادشاہوں کی ذات سے وابستہ رہ گیا تھا ، یہ تھا کہ ان کے چھونے سے کنٹھ مالا کا مریض اچھا ہو جاتا ہے ۔ یہ مرض ''بلائے شاہی'' کہلاتا تھا ۔ ملکہ الزبتھ اول اس کے علاج کے لیے اکثر اپنے اعجاز مسیحائی سے کام لیتی تھی اور ۲۴ جون ، ۱۶۳۳ء کو چارلس اول نے ہالی روڈ کے شاہی نماز خانے کے اندر ایک ہی داؤں میں سو مریضوں کو شفا بخش دی تھی ۔ لیکن اس بدعت پر سب سے زیادہ جس بادشاہ کے عہد میں عمل ہوا ، وہ اس کا بیٹا چارلس دوم تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے

اپنے عہد حکومت میں کنٹھ مالا کے ایک لاکھ مریضوں پر ہاتھ پھیرا تھا ۔ اس کے قریب پہنچنے کے لیے ایسی دھکا پیل ہوتی تھی کہ ایک دفعہ سات مریض بھیڑ میں کچلے گئے ۔ ولیم سوم نے جو معتدل مزاج بادشاہ تھا اور اس فریب کاری کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا ، اپنے آپ کو اس سے بچائے رکھا ۔ جب لوگوں کے ہجوم سے ، جس نے حسب معمول اس کے محل کو گھیر رکھا تھا ، وہ تنگ آ گیا تو حکم دیا کہ انھیں شاہی خیرات خانے سے کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا جائے ۔ ایک مرتبہ ایک مریض اس قدر بضد ہوا کہ اسے جان چھڑانی مشکل ہو گئی ۔ ولیم نے مجبور ہو کر اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''خدا تمھیں تندرستی اور عقل عطا فرمائے ۔'' لیکن اس دستور کو توہم پرست اور ضعیف العقل جیمس اور اس کی بیٹی ملکہ این نے ، جیسی کہ ان سے توقع ہو سکتی تھی ، جاری رکھا ۔

فرانسیسی بادشاہ بھی علاج بالمّس کے اس کمال کے مدعی تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کمال انھوں نے کلووی یا سینٹ لوئی سے کسب کیا تھا ، اور ہمارے انگریز بادشاہوں کو ایڈورڈ سوم سے ورثے میں ملا تھا ۔ اسی طرح ٹونگا (جنوبی بحرالکاہل کے جزائر) کے وحشی سرداروں کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ ان کے پاؤں لگانے سے کنٹھ مالا اور جگر کا ورم جاتا رہتا ہے اور علاج کا یہ طریقہ قطعی طور پر مثلی نوعیت کا تھا ، اس لیے کہ مرض اور علاج دونوں بادشاہ کی ذات یا ہر اس چیز کے لمس کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا جو اس کی ذات سے متعلق ہو ۔

ان مثالوں کی روشنی میں ہمارا یہ استنباط بہ حیثیت مجموعی بے جا نہ ہوگا کہ دنیا کے بہت سے حصوں میں بادشاہت کا آغاز قدیم پیشہ ور ساحروں سے ہوا ۔ جب ساحروں کے ایک خاص طبقے کو باقی جماعت سے الگ کر کے ایسی خدمات پر لگا دیا جائے جن پر اجتماعی سلامتی و بہبود منحصر ہو ، تو اس کے ارکان رفتہ رفتہ دولت و اقتدار حاصل کر لیتے ہیں اور ان میں جو سب سے زیادہ ماہر و پرکار ہوتے ہیں وہ ترقی

کرکے مذہبی قسم کے بادشاہوں کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں ، لیکن اس عمرانی انقلاب کے ساتھ ساتھ جو اس طرح جمہوریت سے شروع ہو کر مطلق العنانی پر ختم ہو جاتا ہے ، ایک عقلی انقلاب بھی رونما ہوتا ہے جو ملوکیت کے تصور اور منصب دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے ، اس لیے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے سحر کی منطقی خامی معاشرے کے ذہین اور سنجیدہ طبقے پر ظاہر ہوتی جاتی ہے ۔ بہ الفاظ دیگر ، ساحر مذہبی پیشوا کے حق میں اپنے منصب سے دست بردار ہو جاتا ہے اور انسانی بھلائی کے لیے براہ راست فطرت کے عمل کو منضبط کرنے کی سعیٔ لا حاصل ترک کرکے دیوتاؤں سے رجوع کرتا ہے ، تاکہ یہی مقصد ان کے وسیلے سے پورا ہو جائے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ بادشاہت ساحری کے بطن سے جنم لیتی ہے اور رفتہ رفتہ جادو کی بجائے مذہبی منصب اختیار کر لیتی ہے اور جب تک خدا اور انسان کے صحیح فاصلے معین نہیں ہوتے ، اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انسان کی ذات میں مستقل یا عارضی طور پر کسی زبردست روح کے حلول کر آنے سے انسان خود اسی زندگی میں مقام کبریا تک پہنچ سکتا ہے ۔ جسد انسانی میں خدا کے متشکل ہونے کے اس عقیدے سے معاشرے کے جس طبقے نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا وہ بادشاہ تھے ۔ تشکل کا یہ عقیدہ اور اس کے ساتھ اپنے صحیح مفہوم میں بادشاہوں کی الوہیت کا نظریہ ہمارے اگلے باب کا موضوع ہوگا ۔

ساتواں باب

# خدا انسان کے روپ میں

میں نے گزشتہ باب میں دنیا بھر کی غیر مہذب اقوام کے عقائد اور رسم و رواج سے جو مثالیں پیش کی ہیں ان سے اس بات کا کافی ثبوت مل جائے گا کہ ایام جاہلیت میں انسان کو فطرت پر اپنے اختیار کی ان حدوں کا شعور نہیں ہونے پاتا جو آج ہم پر بالکل روشن ہیں۔ جس معاشرے میں ہر فرد کم و بیش فوق‌الفطرت قوتوں کا حامل سمجھا جاتا ہو، اس میں ظاہر ہے کہ خدا اور انسان کا فرق مبہم سا ہوگا بلکہ وہ شاید سرے سے کبھی پیدا ہی نہیں ہوا اور دیوتاؤں کی ایسی فوق البشر ہستیوں کا تصور، جن کی بے پایاں طاقتوں کے آگے انسان ضعیف البنیان کا اختیار بہ لحاظ کیف و کم کوئی حقیقت نہ رکھتا ہو، آہستہ آہستہ وجود میں آیا۔ بات یہ ہے کہ جاہلیت کے ابتدائی دور میں وحشی اقوام کے نزدیک انسان پر مافوق عوامل کو کوئی خاص فوقیت حاصل نہیں ہوتی، اس لیے کہ ان کی دانست میں انسان ان عوامل کو ڈرا دھمکا سکتا ہے اور جبراً ان سے اپنی بات منوا سکتا ہے۔ فکری ارتقاء کے اس مرحلے پر اس عالم کی حیثیت ایک عظیم الشان جمہوریت کی ہوتی ہے اور اس کے تمام موجودات میں خواہ وہ فطری ہوں یا فوق‌الفطری خاصی مساوات پائی جاتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے انسان کا علم ترقی کرتا جاتا ہے اسے فطرت کی بے پناہ طاقتوں اور ان کے آگے اپنی فرو مایگی اور ناطاقتی کا روز افزوں احساس ہونے لگتا ہے۔

تاہم اپنی بے چارگی کے اس بڑھتے ہوئے شعور کے ساتھ یہ نہیں ہوتا کہ ان مافوق ہستیوں کی طاقت پر سے بھی اس کا اعتقاد اٹھ جائے، بلکہ اس سے اس اعتقاد کو اور بھی تقویت پہنچتی ہے، اس لیے کہ وہ ابھی اس نظام عالم کے تصور سے نا آشنا ہوتا ہے، جس میں غیر شخصی عوامل مقررہ اور ناقابل تغیر قوانین کے مطابق اپنا کام کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے نظام کا ایک خیال سا اس کے ذہن میں ضرور موجود ہوتا ہے اور اسی پر نہ صرف وہ اپنے سحر میں عمل پیرا ہوتا ہے بلکہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی۔ لیکن یہ خیال ایک ہلکے سے شعور تک محدود رہتا ہے اور جب وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا کے افہام و تفہیم کی کوشش کرتا ہے تو اسے یہ دنیا ایک شعوری عزم اور ایک شخصی قوت کا ظہور معلوم ہوتی ہے۔ لہذا اگر وہ اپنے آپ کو اس قدر حقیر و ناتواں سمجھتا ہو تو ان ہستیوں کو کس قدر نہ زبردست اور طاقتور خیال کرتا ہوگا جو فطرت کے اس عظیم الشان کارخانے کو چلاتی ہوں! اس طرح جوں ہی دیوتاؤں سے انسان کا زعم ہم سری خاک میں مل جاتا ہے، اس کی اس امید پر پانی پھر جاتا ہے کہ وہ بلا کسی سہارے کے، اپنے بل بوتے پر، یعنی جادو کے زور سے فطرت پر حکومت کر سکتا ہے اور اس کا دیوتاؤں پر زیادہ سے زیادہ تکیہ رہنے لگتا ہے، جن کی ذات اس کے نزدیک ان فوق الفطرت قوتوں کے مخزن کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، جن میں کبھی وہ بہ زعم خود ان کا شریک و سہیم رہا تھا۔ لہذا علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ عبادت اور قربانی کو مذہبی رسوم میں تقدم حاصل ہو جاتا ہے اور سحر، جو کبھی اسی قدر اہم تھا، پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور محض ''سفلی فن'' بن کر رہ جاتا ہے۔ اب اسے دیوتاؤں کے دائرۂ اختیار میں فضول اور ملحدانہ مداخلت سے تعبیر کیا جانے لگتا ہے اور مذہبی رہنما جن کا اثر اور شہرت اپنے اپنے دیوتاؤں کے اثر اور شہرت پر منحصر ہوتی ہے، ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ زمانۂ مابعد میں جب مذہب اور توہمات کی حدیں متعین ہو جاتی ہیں تو عبادت اور قربانی معاشرے کے متقی

و پرہیزگار اور روشن خیال طبقے کا وسیلہ بن جاتی ہے اور جاہل اور توہم پرست اسی طرح سحر پر تکیہ کیے رہتے ہیں ۔ لیکن اس سے بھی آگے جب انسان میں ضابطۂ فطرت کا شعور پیدا ہونے لگتا ہے اور شخصی عوامل کی حیثیت سے عناصر فطرت کے تصور کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے تو سحر ، جس کی بنیاد اسباب و نتائج کے ایسے ناگزیر اور غیر متغیر تسلسل کے اصول پر ہے جس میں کسی شخصی ارادے کا کوئی دخل نہ ہو ، اپنی ساکھ دوبارہ قائم کر لیتا ہے اور فطرت کے عمل تسبیب کی چھان پھٹک کرکے سائنس کے لیے راستہ ہموار کر دیتا ہے ۔ اس طرح کیمیا کی کوکھ سے کیمسٹری، جنم لے لیتی ہے ۔

انسانی خدا یا ایسی انسانی ہستی کا تصور جس کو ربانی یا مافوق‌الفطرت قوتیں عطا ہوئی ہوں ، اصل میں اس قدیم زمانے کی چیز ہے جب انسان اور خدا کے درمیان فرق مراتب پیدا نہیں ہوا تھا اور ہنوز وہ ناگزار خلیج حائل نہیں ہوئی تھی جو آگے چل کر نظر آتی ہے ۔ لہذا کسی ایسے خدا کا خیال ، جو انسانی قالب میں متشکل ہو ، ہمیں کچھ عجیب سا معلوم ہوگا ، لیکن قدیم زمانے کے انسان کے لیے اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ۔ اسے صرف انسان دیوتا یا دیوتا انسان میں وہ فوق الفطرت قوتیں کچھ زیادہ نظر آتی ہیں جن کے حامل ہونے کا وہ خود بہ صدق دل مدعی ہوتا ہے ۔ نیز وہ کسی دیوتا اور طاقت ور جادوگر کے درمیان کوئی قطعی حد امتیاز قائم نہیں کرتا ۔ اس کے دیوتا محض غیرمرئی ساحروں کی حیثیت رکھتے ہیں جو پردۂ فطرت میں وہی جادو منتر کرتے رہتے ہیں جو آدم زاد ساحر مرئی اور جسانی صورت میں اپنے جیسے دوسرے آدمیوں کے سامنے کرتے ہیں اور چوں کہ دیوتاؤں کے متعلق عام عقیدہ یہ ہے کہ وہ اپنے پرستاروں پر انسانی روپ میں ظاہر ہوتے ہیں لہذا ساحر کو انسان دیوتا کی حیثیت سے قبول عام حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ۔ اس صورت سے ساحر جو ابتداء میں محض ایک معمولی شعبدہ باز ہوتا ہے ، ترقی کے مراحل طے کرتے کرتے اپنی ذات سے ایک مکمل خدا بن جاتا ہے اور ساتھ ہی بادشاہ بھی ۔ لیکن ساحر کو

خدا کہتے وقت ہمیں یہ بات ضرور ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اس لفظ سے غیر مہذب انسان کی جو مراد ہوتی ہے اس میں وہ مجرد اور پیچیدہ تصورات شامل نہ ہو جائیں جو ہمارے ذہن میں اس لفظ کے ساتھ وابستہ ہیں ۔ اس دقیق موضوع پر ہمارے خیالات ایک طویل عقلی اور اخلاقی ارتقاء کا نتیجہ ہیں اور وحشی کے لیے وہ اس قدر بعیدالفہم ہیں کہ جب ان خیالات سے اس کو روشناس کرانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ ان کو سمجھ نہیں پاتا ۔ غیر ترقی یافتہ نسلوں کے مذہب سے متعلق جو ہنگامۂ نزاع برپا رہا ہے اس کا سبب بڑی حد تک باہمی غلط فہمی کے سوا کچھ نہ تھا ۔ مہذب لوگوں کے خیالات وحشی کی سمجھ میں نہیں آتے اور مہذب لوگ وحشی کے خیالات کو بہت کم سمجھتے ہیں ۔ جب وحشی خدا کا نام لیتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک خاص ہستی کا تصور ہوتا ہے ؛ جب مہذب انسان خدا کا نام لیتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک بالکل مختلف ہستی کا تصور ہوتا ہے اور اگر ، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے ، یہ دونوں کے دونوں اپنا اپنا نقطۂ نظر ایک دوسرے پر واضح کرنے سے یکساں قاصر رہیں ، تو ان کے بحث و مباحثے سے الجھن اور غلطیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا ۔ اگر ہم مہذب لوگ خدا کا نام ذات باری تعالیٰ کے اس مخصوص تصور تک محدود رکھنے پر مصر ہوں جو ہم نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے تو پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ وحشی کا کوئی خدا نہیں ۔ بہ ایں ہمہ تاریخی حقائق کے پیش نظر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کم از کم ان وحشیوں کے معتقدات میں ، جنھوں نے ترقی کے کچھ زینے طے کر لیے ہیں ، ایسی فوق الفطرت قوتوں کا بنیادی عنصر ضرور موجود ہے جنھیں خدا کے نام سے موسوم کرنا بے جا نہ ہوگا ، گو اس وسیع مفہوم میں نہ سہی جو ہمارے ذہن میں ہے ۔ یہی بنیادی عنصر ہر اعتبار سے غالباً وہ ہیولیٰ ہے جس سے مہذب قوموں نے رفتہ رفتہ ربوبیت کے متعلق اپنے اعلیٰ تصورات پیدا کر لیے ۔ اگر ہمارے لیے سارے مذہبی ارتقاء کا سراغ لگانا ممکن ہو تو شاید ہمیں پتا چلے کہ ہمارے اور وحشی کے تصورات کے درمیان زنجیر کی کڑیاں باہم

مربوط اور مسلسل ہیں ۔

اس تشریح وانتباہ کے بعد اب ان خداؤں کی چند مثالیں پیش کی جائیں گی جنھوں نے اپنے پوجنے والوں کے عقائد کی رو سے ، بلا تخصیص مرد و زن ، زندہ انسانوں کے روپ دھارے ہیں ۔ ایسے اشخاص کے لیے جن کی ذات مظہر الٰہی متصور ہو ، یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر صورت میں بادشاہ یا بادشاہوں کی اولاد ہوں ، بلکہ وحشی کے خیال کے بہ‌موجب خدا اپنی تجسیم و تشکل کے لیے ادنیٰ درجے کے آدمیوں کو منتخب کر سکتا ہے ۔ ہندوستان میں ، مثلاً ، ایک انسان دیوتا ذات کا جولاہا تھا اور ایک بڑھئی ۔ لہٰذا میں جو مثالیں پیش کروں گا ان میں شاہی طبقے کی کوئی تخصیص نہ ہوگی ، اس لیے کہ مجھے انسانوں کی تربیب یا بہ لفاظ دیگر انسان کی صورت میں خدا کے ظہور و تشکل کے عام اصول کی توضیح مقصود ہے ۔ خیر تو اس قسم کے مجازی خدا غیر ترقی یافتہ معاشرے میں ہر جگہ ملتے ہیں ۔ ان کے تشکل و تجسیم کی نوعیت عارضی بھی ہوسکتی ہے اور مستقل بھی ۔ پہلی صورت میں تشکل کا یہ عمل ، جو بالعموم الہام یا سایہ اور اثر سے تعبیر کیا جاتا ہے ، فوق‌الفطرت قسم کے علم تک ممدود رہتا ہے اور اس میں اس قسم کی کسی قوت کا پہلو نہیں ہوتا ۔ دوسرے لفظوں میں عارضی طور پر خدا کا ظہور علم الغیب اور پیشین گوئی کی صورت میں ہوتا ہے ، استدراج یا خرق عادت کی صورت میں نہیں ۔ اس کے برعکس اگر روح ربانی مستقل طور پر کسی انسان کے جسم میں حلول کر آئے ، تو اس انسان دیوتا سے اپنی خدائی کا بھرم رکھنے کے لیے خرق عادت کا سر زد ہونا ضروری ہوتا ہے ۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ فکری ارتقاء کے اس مرحلے پر خرق عادت یا استدراج کو قانون فطرت کے منافی نہیں سمجھا جاتا ۔ بات یہ ہے کہ جاہلیت کے دور میں انسان کو چوں کہ قانون فطرت کے وجود کا شعور نہیں ہوتا ، اس لیے اس سے انحراف کا اسے خیال بھی پیدا نہیں ہوتا ۔ اس کے نزدیک استدراج عام طاقت کے اظہار کے سوا کچھ نہیں ۔

انسان کے روپ میں خدا کے عارضی طور پر ظاہر ہونے یا الہام

پر اعتقاد دنیا میں ہر جگہ پایا جاتا ہے ۔ اس اعتقاد کی رو سے بعض اشخاص پر کبھی کبھی کوئی روح آ جاتی ہے یا کسی دیوتا کا سایہ ہو جاتا ہے ۔ جب تک ان میں سے کسی شخص پر اس روح کا اثر رہے ، اس کی اپنی شخصیت معطل ہو جاتی ہے ، اس کے سارے جسم میں ایک اہتزاز اور تشنج کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس کی حرکات و سکنات اور نگاہوں سے وحشت ٹپکنے لگتی ہے اور یہ سب باتیں خود شخص مذکور کی بجائے اس روح سے منسوب کی جاتی ہیں ، جو اس کے جسم میں حلول کر آئی ہو اور اس جنون کی حالت میں اس کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے ، وہ آمنا و صدقنا اس خدا کا کلام سمجھ لیا جاتا ہے ، جس نے اس کے تن خاکی پر قبضہ کر رکھا ہو ۔ چنانچہ جزائر سینڈوچ میں بادشاہ ، جو خدا کا روپ بھرتا تھا ، ایک ٹٹی کی اوٹ میں سے غیب کی باتیں بتایا کرتا تھا ۔ لیکن بحرالکاہل کے جنوبی جزائر میں خدا ''اکثر مذہبی پیشوا کے جسم میں حلول کر آتا تھا ، جس کی وجہ سے اس کے قول و فعل میں اس کے اپنے ارادے کا کوئی دخل نہ ہوتا ، اور اس کے حرکات و سکنات اور گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا جیسے اس پر کسی فوق‌الفطرت ہستی نے قبضہ جما لیا ہو ۔ اس لحاظ سے جزائر پولینیشیا کے وحشیوں اور یونان قدیم کی نامور قوموں کے کاہنوں کے درمیان بڑی مشابہت تھی ۔ جوں ہی کسی مذہبی پیشوا کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا کہ اس کے جسم میں کوئی دیوتا حلول کر آیا ہے ، وہ اپنے آپ پر وجد کی کیفیت طاری کر لیتا اور اس سے طغیان جنون کی علامتیں ظاہر ہونے لگتیں ۔ اس کے پٹھوں میں تشنج پیدا ہو جاتا ، جسم پھول جاتا ، چہرہ مسخ ہو کر خوف ناک بن جاتا ، بھویں تن جاتیں اور آنکھوں سے وحشت برسنے لگتی ۔ اس عالم میں وہ اکثر زمین پر لوٹنے لگتا اور اس کے منہ سے کف جاری ہو جاتا ، گویا اس کی ساری ہستی دیوتا کے قبضے میں ہو ۔ پھر چیخ چیخ کر اور بسا اوقات دھاڑ دھاڑ کر جو کچھ دیوتا کو منظور ہوتا اس کا اعلان کرتا ، دوسرے پروہت جو وہاں ہوتے اور جو رموز غیب سے واقف ہوتے ، اس پیام کو سنتے اور لوگوں کو اس سے

آگاہ کرتے جاتے ۔ جب وہ پیشوا ندائے غیب سنا چکتا تو اس کی وہ دورے کی سی کیفیت کم ہوتی جاتی ، لیکن دیوتا ہمیشہ اپنا پیغام دے کر اس سے فوراً رخصت نہیں ہو جاتا ، بلکہ بعض وقت اسی ''تورا'' یا پیشوا پر دو تین دن تک چھایا رہتا ۔ ایک قسم کے دیسی کپڑے کی دھجی جو اس شخص کے بازو پر بندھی ہوتی ، اس الہامی ہیجان یا دیوتا کے اثر کی نشان دہی کرتی ۔ اس دوران میں اس کا ہر فعل دیوتا کا فعل متصور ہوتا اور اس لیے اس کی ہر حرکت اور چہرے کی ہر کیفیت انتہائی توجہ سے دیکھی جاتی ۔ جب تک وہ ''اروھیا'' (روح کے زیر اثر) ہوتا اس کا دیوتا کی طرح ادب کیا جاتا اور لوگ اسے ''اتوا'' یعنی دیوتا کہتے ، گو عام حالت میں اس کا نام وہی ''تورا'' یا ''مذہبی پیشوا رہتا''۔

لیکن الہام یا عارضی طور پر انسانی جسم میں اس طرح دیوتاؤں کے حلول کر آنے کی مثالیں دنیا کے ہر حصے میں اس قدر کثرت سے پائی جاتی ہیں اور نسلیات کی کتابوں کے ذریعے اس قدر عام ہو چکی ہیں کہ ان سے متعلق عام اصول کی توضیح غیر ضروری ہے ۔ تاہم اس الہامی کیفیت کے پیدا کرنے کے دو خاص طریقے ایسے ہیں جن کا ذکر یہاں نا مناسب نہ ہوگا ، اس لیے کہ لوگ ان سے نسبتاً کم واقف ہیں اور اس لیے بھی کہ آگے چل کر ان کے حوالے کا موقع آئے گا ۔ ان میں ایک عمل یہ ہے کہ جس شخص پر الہامی کیفیت طاری کرنی مقصود ہو ، وہ کسی قربانی کے جانور کا خون چوستا ہے ۔ آرگس (یونان) میں اپولوڈی ریڈیوٹیز (اپولو ، یونانی دیو مالا میں سورج دیوتا اور زیوس کا بیٹا ۔ اس کا دائرۂ خدائی نہایت وسیع تھا ، جس میں جنگ ، وبائیں ، سلطنتوں کا قیام ، موسیقی ، شاعری اور الہام و پیش گوئی سب شامل تھے ۔ نیز وہ مردانہ حسن و شباب کی علامت کی حیثیت رکھتا تھا) کا ایک مندر تھا ۔ اس میں رات کے وقت مہینے میں ایک مرتبہ ایک بزغالہ قربان کیا جاتا تھا ۔ ایک پاک دامن عورت جو ایک خاص ضابطۂ پرہیزگاری کی پابند ہوتی ، اس بزغالے کا خون زبان پر رکھ لیتی جس کے اثر سے اس پر دیوتا آ جاتا اور وہ

غیب کی باتیں بتانے لگتی ۔ آ کیا (یونان) میں ایجرا کے مقام پر دھرتی کی دیوی کی پجارن پیشین گوئی کے لیے غار میں داخل ہونے سے پہلے بیل کا تازہ خون پیتی تھی ۔ اسی طرح کورو وکارتوں کے عقیدے کی رو سے جنوبی ہند میں چڑی ماروں اور گداگروں کی ایک ذات ہے ، کالی دیوی اپنے پجاری پر آتی ہے اور وہ بکری کے گلے سے بہتا ہوا تازہ خون پینے کے بعد غیب کی باتیں بتانے لگتا ہے ۔ شمالی سلیبیز میں منہاسا کے الفوروں کے ایک تیوہار میں ایک سؤر مارا جاتا ہے ۔ ان کا مذہبی پیشوا جوش کی حالت میں اس پر ٹوٹ پڑتا ہے اور اس کے دھڑ پر اپنا منہ رکھ کر اس کا خون چوس لیتا ہے ۔ اس کے بعد اس پیشوا کو وہاں سے کھینچ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے ، جس پر سے وہ اس سال کی دھان کی فصل کے متعلق پیشین گوئی کرتا ہے ۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس مردہ سؤر پر جھپٹتا ہے اور اس کا خون چوستا ہے ، جس کے بعد اسے پھر کھینچ کر کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے اور وہ اپنی پیشین گوئیاں دوبارہ شروع کر دیتا ہے ۔ اس مذہبی پیشوا کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک روح سمائی ہوئی ہے اور اس کی پیشین گوئیاں اسی روح کا استدراج ہیں ۔

الہامی کیفیت پیدا کرنے کا دوسرا عمل کسی متبرک درخت یا پودے کے استعمال پر مشتمل ہے ۔ چناں چہ ہندوکش میں دیودار کے مقدس درخت کی ڈالیاں جلائی جاتی ہیں اور وہاں کی کاہنہ سر پر ایک کپڑا لپیٹے اس کا دھؤاں کھینچتی ہے تا آں کہ اس تلخ دھوئیں سے اس پر تشنج کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتی ہے ۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ بیٹھتی ہے اور چیخ چیخ کر کچھ الاپنے لگتی ہے ، جسے حاضرین سن کر بہ آواز بلند دہراتے جاتے ہیں ۔ اسی طرح اپولو کی پیغامبر کاہنہ پیشین گوئی کرنے سے پہلے لارل کے مقدس پتے کھاتی اور اس کی دھونی لیتی تھی ۔ باخوسی کاہن (باخوس Bacchus ، یونانی دیو مالا میں تاک شراب وغیرہ کا دیوتا) عشق پیچاں کے پتے کھایا کرتے تھے ۔ بعض لوگ ان کے الہامی جوش کو اس سرور انگیز اور نشہ آور پودے کی تاثیر پر محمول کرتے تھے ۔

یوگانڈا میں مذہبی رہنما اپنے سر پر دیوتا کو بلانے کے لیے پائپ میں تمباکو بھر کر اس کے کش پہ کش لیتا ہے تا آں کہ اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس جذبے کی حالت میں وہ چیخ چیخ کر جو کچھ کہتا ہے اسے دیوتا کا کلام تسلیم کر لیا جاتا ہے ۔ جزیرۂ مدورا میں ، جو ساحل جاوا کے شمال کی جانب واقع ہے ، ہر روح کا ایک مورد مقرر ہے جو اکثر صورتوں میں عورت ہوتی ہے ۔ یہ عورت اپنے آپ کو روح کے لیے تیار کرنے کی غرض سے بخور دان پر سر رکھ کر عود و لوبان کی دھونی لیتی ہے ۔ اس سے رفتہ رفتہ اس پر بے خودی طاری ہو جاتی ہے ، جس کے ساتھ وہ چیخنے اور منہ بنانے لگتی ہے اور اس کے جسم میں شدید قسم کا تشنج پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس وقت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں روح حلول کر آئی ہے ۔ پھر جب اسے کچھ سکون ہو جاتا ہے تو اس کے الفاظ کو صدائے غیب یعنی اس روح کی آواز سمجھ لیا جاتا ہے جو اس عورت میں داخل ہو گئی ہو ، کیوں کہ اس کیفیت میں خود اس کی اپنی روح اسے چھوڑ جاتی ہے ۔

جس شخص کو الہام ہوتا ہے وہ عام عقیدے کی رو سے محض عالم الغیب ہی نہیں ہوتا بلکہ بعض موقعوں پر اسے کسی دیوتا کی قوت بھی حاصل ہوتی ہے ۔ کیمبوڈیا میں جب کوئی وبا پھیلے تو بہت سے گاؤں کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور اس شخص کی تلاش میں نکلتے ہیں جسے ان کے خیال کے بموجب کسی مقامی دیوتا نے عارضی طور پر اپنے تشکل کے لیے منتخب کیا ہو ، اور ان کے آگے آگے گانے بجانے والوں کا ایک طائفہ چلتا ہے ۔ جب وہ شخص انھیں مل جاتا ہے تو اس کو مذکورہ بالا دیوتا کی قربان گاہ پر لے جایا جاتا ہے جہاں اس کی رسم تشکل ادا کی جاتی ہے ۔ اس کے بعد اس شخص کی ہستی اپنے ساتھیوں کے لیے معبود کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور وہ اپنے اس خدائے مجازی سے التجا کرتے ہیں کہ انھیں وبا سے بچائے ۔ اپولو کا ایک خاص بت میگنیشیاء (تھسلی ، یونان) کے قریب ہائی لے کے مقام پر رکھا تھا ، جس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ انسان کو مافوق البشر قوت عطا کرتا

ہے اور جن مقدس شخصیتوں کو اس کی طرف سے یہ قوت عطا ہوتی وہ اونچی اونچی چٹانوں سے چھلانگ لگا دیتے ، تن آور درختوں کو جڑ سے اکھاڑ دیتے اور انھیں اپنی کمر پر لادے تنگ سے تنگ درے میں سے نکال لے جاتے۔ درویشوں کی کرامات بھی کچھ اسی قبیل کی چیز ہیں۔

یہاں تک تو ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ وحشی ، جسے فطرت پر اپنے اختیار کی حدود کا شعور نہیں ہوتا ، یہ سمجھتا ہے کہ خود وہ اور اس کی طرح تمام دوسرے آدمی بعض قوتوں کے حامل ہیں جنھیں مافوق کہنا درست ہوگا۔ نیز ہم نے یہ دیکھا کہ اس عام مافوقیت کے علاوہ بعض اشخاص کے متعلق یہ خیال ہے کہ ان پر تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے کسی روح کا اثر ہو جایا کرتا ہے ، اور اس کی وجہ سے انھیں اس روح کا علم اور قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ جہاں لوگوں میں اس قسم کے عقائد پیدا ہو جائیں وہاں ان کے لیے اس بات پر ایمان لے آنا چنداں دشوار نہیں رہتا کہ بعض اشخاص پر مستقلاً کوئی دیوتا اپنا قبضہ جما لیتا ہے ، یا کسی اور نا معلوم صورت سے ان میں مافوق قوتیں اس درجہ ودیعت ہو جاتی ہیں کہ وہ دیوتاؤں کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں اور عام لوگ ان کی پرستش کرنا اور ان پر بھینٹ چڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض وقت ان انسان دیوتاؤں کا کام محض مافوق یا روحانی نوعیت کا ہوتا ہے ، لیکن بعض صورتوں میں انھیں اس کے علاوہ سیاسی اقتدار اعلیٰ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اس دوسری صورت میں ان کی حیثیت بادشاہ اور خدا دونوں کی ہوتی ہے اور ان کی حکومت مذہبی حکومت سے عبارت ہوتی ہے۔ چناں چہ جزائر مارکے ساس یا واشنگٹن (جنوبی بحرالکاہل) کے باشندوں میں ایک خاص طبقے کے افراد عمر بھر کے لیے دیوتا متصور ہوتے تھے ، جنھیں عام عقیدے کے بموجب عناصر پر مافوق قدرت حاصل تھی۔ وہ زمین سے اناج اگلوا سکتے یا اسے بنجر کر سکتے تھے اور وبا پھیلانا یا لوگوں کو مارنا ان کے اختیار میں تھا۔ ان کے غضب سے بچنے کے لیے انھیں انسانی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ لیکن اس قسم کے

آدم زاد دیوتا معدودے چند تھے ۔ ہر جزیرے میں زیادہ سے زیادہ ایک یا دو ۔ ان میں ہر ایک سب سے الگ تھلگ ایک پر اسرار گوشۂ عزلت میں اپنا قیام رکھتا تھا ۔ بعض صورتوں میں ان کی مافوق قوتیں انھیں ورثے میں ملتی تھیں ۔ ایک مسیحی مبلغ نے ایسے ایک دیوتا کا حال بیان کیا ہے جسے اس نے بہ چشم خود دیکھا تھا ۔ یہ دیوتا ایک معمر شخص تھا اور ایک احاطے کے اندر وسیع مکان میں رہتا تھا ۔ اس مکان میں ایک طرح کی قربان گاہ تھی اور اس کے شہتیروں اور آس پاس درختوں سے انسانی پنجر سر کے بل ٹنگے تھے ۔ اس دیوتا کے پجاریوں کے سوا کوئی شخص اس کے احاطے میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا ۔ صرف ان موقعوں پر عام آدمیوں کو وہاں جانے کی اجازت ہوتی جب انسان اس پر بھینٹ چڑھائے جاتے ۔ یہ انسان دیوتا دوسرے تمام دیوتاؤں سے زیادہ قربانیاں لیتا تھا ۔ وہ اپنے گھر کے سامنے ایک چبوترے پر جا بیٹھتا اور بہ یک وقت دو دو تین تین قربانیاں طلب کرتا ۔ لوگ اس سے اس قدر دہشت زدہ تھے کہ اس کا یہ مطالبہ ہر صورت میں پورا کر دیا جاتا ۔ ہر بات میں اس کی دھائی دی جاتی اور ہر طرف سے اسے نذریں بھیجی جاتیں ۔ اس کے علاوہ جزائر بحر جنوبی کے متعلق بہ حیثیت عمومی یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں ہر جزیرے کا ایک مجسم خدا تھا جو دیوتا کہلاتا تھا ۔ اس کے جوہر کو اس دیوتا کے جوہر کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ، جس کی وہ نمائندگی کرتا ہو ۔ یہ انسان دیوتا بعض وقت خود بادشاہ ہوتا لیکن بیشتر صورتوں میں وہ کوئی پجاری یا زبردست سردار ہوتا ۔

قدیم مصریوں نے اپنی حیوان پرستی صرف کتوں ، بلیوں اور ایسے ہی دوسرے چھوٹے چھوٹے چوپایوں تک محدود نہیں رکھی تھی بلکہ اس میں انھوں نے بڑی فراخ دلی سے انسان کو بھی شامل کر لیا تھا ۔ ان کے انسانی خداؤں میں ایک قریۂ انابیس میں رہتا تھا ۔ اس کی قربان گاہوں پر سوختنی قربانیاں دی جاتی تھیں ، جس کے بعد وہ ایک عام فانی انسان کی طرح اپنا کھانا تناول فرماتا ۔ کلاسیکی عہد میں صقلیہ کے فلسفی ایمپیڈوکلیز نے (صقلیہ کے مشہور تاریخی شہر

اگری جنٹم کا رہنے والا یہ خوش بیان فلسفی ۳۴۴ ق ۔ م کے لگ بھگ گزرا ہے) اپنے آپ کو محض ساحر ہی مشہور نہیں کیا تھا بلکہ اس کے ساتھ خدائی کا دعویٰ بھی کر دیا تھا ۔ اپنے ہم وطنوں سے نظم میں وہ یوں خطاب کرتا ہے :

''دوستو ! اگری جنٹم کی سنہری چٹانوں پر بسی ہوئی اس شان دار نگری کے رہنے والو ! نیک کام اور مہمان نوازی تمہارا طرۂ امتیاز ہے ۔ مرحبا ! تم میں میری جو توقیر و عزت ہے ، اس نے میرا سر فخر سے بلند کر رکھا ہے ۔ تم پھولوں ، تازہ تازہ پھولوں کے تاج میرے سر پر رکھتے ہو ۔ میں اب فانی انسان نہیں رہا بلکہ ایک امر دیوتا بن گیا ہوں ۔ میں جہاں کہیں جا نکلتا ہوں ، نوگوں کا ہجوم مجھے گھیر لیتا ہے اور میری پوجا کرتا ہے ، اور ہزاروں صحیح راستے کی تلاش میں میرے نقش قدم پر چلتے ہیں ۔ کچھ مجھ سے پیغمبرانہ بصیرت کے طلب گار ہیں ۔ مصیبت کے مارے میرے تسلی کے الفاظ بڑے صبر سے سنتے ہیں اور ان کا دکھ درد جاتا رہتا ہے ۔''

اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے پیروؤں کو ہوائیں چلانے اور بند کرنے ، مینہ برسانے اور سورج روشن کرنے ، بیماری اور بڑھاپے کا خاتمہ کرنے اور مردوں کو جلانے کا راز بتا سکتا ہے ۔ جب ۳۰۷ ق ۔ م میں ڈیمیٹریس پولیرسٹیز (شاہ مقدونیہ ، ۳۳۸ تا ۲۸۳ ق ۔ م) کے ہاتھوں ایتھنی جمہوریت بحال ہوئی تو اہل ایتھنز کی جانب سے اس کو اور اس کے باپ انٹی گونس کو خدائی اعزازات بخشے گئے ۔ یہ دونوں ''خداوندان نجات دہندہ'' کے لقب سے ملقب اس وقت حیات تھے ۔ ان کے لیے قربان گاہیں نصب کی گئیں اور ایک پجاری ان کی پوجا پاٹ کے لیے مقرر ہوا ۔ لوگوں نے اپنے نجات دہندہ کے خیر مقدم کے لیے بھجن گائے اور رقص کیے ، نیز پھولوں کے ہار ، بخورات اور شراب لیے ہوئے شہر کے گلی کوچوں میں دو رویہ کھڑے ہو کر اس کی تعریف میں یہ گیت گایا :

"خوشا نصیب کہ سب سے بڑے اور سب سے پیارے دیوتا ہمارے شہر پدھارے ہیں ،

ایک طرف فصلوں کی دیوی ڈیمیٹر اپنی بیٹی (پراسپرین) کے وداع کی مقدس رسم منانے آتی ہے (یعنی فصلیں تیار اور کٹنے والی ہیں اور اس خوشی میں سالانہ تیوہار منایا جانے والا ہے ۔ اس کے بعد یہی تیوہار ایتھنز میں ڈیمیٹیریس کے نام پر منایا جانے لگا) تو دوسری طرف ڈیمیٹیریس پوری شان خداوندی سے، شاداں و خنداں پیکر خلق و مروت بنا، قدم رنجہ فرماتا ہے ۔

اپنے وفادار ساتھیوں کے جھرمٹ میں اس کی عظمت و جلال کا منظر دیدنی ہے ۔ ایک آفتاب ہے کہ ستاروں میں گھرا ہوا ہے ۔

جلیل القدر پوسائی ڈون کے بیٹے (جل اور ساگر کے دیوتا پوسائی ڈون کا ایک لقب اہل یونان کے ہاں Soter یعنی محافظ تھا اور جب ڈیمیٹیریس نے انہیں آزاد کرایا تو یہ اس کا خطاب بن گیا ۔ نیز پوسائی ڈون کا ایک اور لقب Encircler یعنی احاطہ کرنے والا تھا اور اس بادشاہ کے عام لقب پولیرسٹیز کے معنی Beseiger محاصرہ کرنے والے کے ہیں ۔ غالباً اسی مناسبت سے یہاں اسے پوسائی ڈون کا بیٹا کہا گیا ہے) افرودیتی کے لخت جگر !

خوش آمدید !

دوسرے دیوتا سب کہیں دور بستے ہیں ،
یا ان کے کان نہیں ، یا سرے سے ان کا کوئی وجود نہیں ، یا پھر انہیں ہماری پروا نہیں ،

تو ہی ایک سچا دیوتا ہے ، لکڑی اور پتھر کا نہیں ، بلکہ حاضر و ناظر ہماری آنکھوں کے سامنے ، اس لیے ہم تیری عبادت اور پرستش کرتے ہیں ۔"

قدیم زمانے کے جرمن عورتوں کو مقدس سمجھتے تھے اور ان سے غیب کی باتیں پوچھا کرتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی مقدس عورتیں دریاؤں کو غور سے دیکھتیں اور پانی کی گڑگڑاہٹ کو غور سے سنتیں اور پھر انہیں جو کچھ دکھائی اور سنائی دیتا اس کے مطابق پیشین گوئی کرتیں ۔ لیکن مرد محض کاہنات کی حیثیت سے ان کا ادب نہیں کرتے تھے ۔ مثلاً ویسپیزین (رومی شہنشاہ ۹ تا ۷۹ ق ۔ م) کے عہد حکومت میں قبیلۂ بروکٹیر کی ویلیدا نامی ایک عورت کو لوگ دیوی سمجھتے تھے ۔ اس حیثیت میں وہ اپنی قوم پر راج کرتی تھی ، اور اس کی حکومت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ یہ عورت رھائن کے معاون دریائے لپے پر ایک لاٹ کے اندر رھتی تھی ۔ جب کولون کے لوگوں نے اس سے معاھدہ کرنے کے لیے اپنے سفیر بھیجے تو انہیں باریاب نہیں کیا گیا اور گفت و شنید ایکس وزیر کے ذریعے ہوئی ، جس نے اس دیوی کی پیشین گوئیوں سے انہیں مطلع کر دیا ۔ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح ہمارے آباؤ و اجداد کے بادشاہت اور خدا کے تصور ہم آہنگ تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ گئے نامی قبیلے (زیریں دینوب کے کنارے آباد ایک تھریسی قبیلہ ہے) میں دور عیسوی کے آغاز تک کوئی نہ کوئی شخص کسی دیوتا کا روپ بھرا کرتا اور قبیلے کے لوگ اسے بادشاہ کہتے تھے ۔ وہ ایک مقدس پہاڑی پر قیام رکھتا تھا اور بادشاہ کے مشیر کے فرائض انجام دیتا تھا ۔

ایک قدیم پرتگالی مورخ داس سانتوس کے بیان کے بموجب جنوب مشرقی افریقہ کی ایک زمبا یا موزمبا نامی قوم ”کسی بت کو نہیں پوجتی اور نہ کسی خدا کو مانتی ہے ، اس کی بجائے ان کے ہاں بادشاہ کی بڑی عزت اور احترام کیا جاتا ہے اور وہ دیوتا متصور ہوتا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے بادشاہ کا دنیا میں کوئی ہم سر نہیں اور خود بادشاہ اپنے متعلق کہتا ہے کہ وہی ایک رب الارض ہے ، اور اسی وجہ سے جب اس کی مرضی کے خلاف بارش ہوتی ہے یا شدید گرمی پڑتی ہے تو وہ آسمان کو سرکشی کی سزا دینے کے لیے اس پر تیر چلاتا ہے ۔“ مشرقی افریقہ کی ماشونا قوم کے لوگوں نے اپنے اسقف کو بتایا کہ کبھی

ان کا بھی ایک دیوتا تھا ، لیکن ماتابلے قوم نے اسے مار بھگایا ۔ ''اس دیوتا کا ذکر بعض گاؤں کے ایک عجیب و غریب دستور کے سلسلے میں آیا ، جہاں کسی شخص کو دیوتا بنا کے رکھا جاتا تھا ۔ اس سے غالباً صلاح مشورہ کیا جاتا تھا اور تحفے تحائف دیے جاتے تھے ۔ ایسا ہی ایک دیوتا ایک گاؤں میں تھا ، جو کسی زمانے میں ایک ماگونڈی سردار (ماشونا سردار) کی ملکیت تھا ۔ ہم سے کہا جاتا کہ گاؤں کے قریب بندوق نہ چلائیں ، ورنہ وہ ڈر کر بھاگ جائے گا ۔'' ماشونا دیوتا کسی وقت ماتابلے بادشاہ کو ہر سال خراج ادا کیا کرتا تھا جو چار سیاہ بیلوں اور ایک رقص پر مشتمل تھا ۔ ایک مسیحی مبلغ نے بادشاہ کے جھونپڑے کے آگے اس کے رقص کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے ، جس کے بموجب یہ سیاہ فام دیوتا متواتر تین گھنٹے تک طنبوری کی گت اور ہاتھی دانت کی جھانجھوں کی تال پر اور یک سرے نغمے کی گونج میں محو رقص رہتا ، جس میں وہ درزی کی طرح پٹھوں کے بل جھکتا اور سؤر کی طرح پسینہ پسینہ ہوتا اور اس پھرتی سے چھلانگیں لگاتا کہ اس سے اس کی ٹانگوں کے ربانی زور اور لچک کی تصدیق ہو جاتی ۔

وسطی افریقہ کی باگنڈا قوم کا جھیل نائنزا کے ایک دیوتا پر ایمان تھا ، جو بعض وقت کسی عورت یا مرد کے جسم میں حلول کر آتا تھا ۔ اس مجسم دیوتا سے سب لوگ بادشاہ اور سردار سمیت بے حد ڈرتے تھے ۔ جب اس دیوتا کی رسم تشکل ادا ہو چکتی تو وہ شخص یا یوں کہیے کہ دیوتا جھیل کے کنارے سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر چلا جاتا اور یہاں اپنے مقدس فرائض شروع کرنے سے قبل رویت ہلال کا انتظار کرتا اور جس لمحے چاند نظر آتا بادشاہ اور اس کی ساری رعیت اس انسانی خدا یا خود ان کی زبان میں ''لوبیر'' (دیوتا) کے تابع فرمان ہو جاتی ، جسے نہ صرف مذہبی معاملات میں بلکہ جنگ اور حکومت کی پالیسی میں بھی اختیار کلی حاصل ہوتا ۔ کاہن کی حیثیت سے اس سے مشورہ کیا جاتا ، اس کے حکم سے امراض پیدا یا دور ہو جاتے ، بارش رک جاتی اور کال پڑ جاتا ۔ مشورہ کرتے وقت اسے بڑے تحفے

پیش کیے جاتے تھے ۔ جھیل ٹانگانیکا کے مغرب میں اس وسیع علاقے کا سردار جو آروا کے نام سے موسوم ہے ، ''خدائی اعزاز و قوت کا دعوے دار ہے اور بہ زعم خود وہ دنوں کھانا نہیں کھاتا اور نہ اسے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے بلکہ وہ یہ تک ظاہر کرتا ہے کہ بہ حیثیت ایک دیوتا کے اس کی ذات غذا کی احتیاج سے بالاتر ہے اور یہ کہ وہ فقط لطف کی خاطر کھاتا پیتا اور تمباکو نوشی کرتا ہے ۔'' گلاؤں کے ہاں جب کوئی عورت خانہ داری کی فکروں سے اکتا جاتی ہے تو واہی تباہی بکنے اور نازیبا حرکتیں کرنے لگتی ہے ۔ یہ کیفیت اس پر مقدس روح کالو کے آنے کی علامت ہے ، جس کے ظاہر ہوتے ہی اس کا شوہر اس کے آگے سجدے میں گر پڑتا ہے اور اس کا انتہا درجے احترام کرتا ہے ۔ اب وہ بیوی نہیں کہلاتی بلکہ ''خداوند'' کا لقب اختیار کر لیتی ہے ، خانہ داری کی جھنجھٹ سے بالکل آزاد ہو جاتی ہے اور اس کی رضا خدا کی رضا بن جاتی ہے ۔

شاہ لوانگا کا اس کی قوم اس قدر احترام کرتی ہے کہ ''جیسے وہ کوئی دیوتا ہو ۔ اسے 'سامبی' اور 'پانکو' کہا جاتا ہے جس کے معنی خدا کے ہیں ۔ اس قوم کا عقیدہ ہے کہ ان کا یہ خدا جب چاہے اس پر ابر رحمت برسا سکتا ہے اور ہر سال دسمبر میں جب کہ ان لوگوں کو بارش کی ضرورت ہوتی ہے ، وہ اپنے اس خدا سے بارش کی دعا مانگنے آتے ہیں ۔ اس موقع پر بادشاہ اپنے تخت پر کھڑا ہو کر ہوا میں تیر چلاتا ہے جس سے وہ سمجھتے ہیں کہ بارش ہو جاتی ہے ۔'' یہی کچھ تمباسا کے بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے ۔ ابھی چند سال کی بات ہے کہ شاہ بینن اپنی قلم رو میں سب سے بڑے معبود کی حیثیت سے پجا کرتا تھا ، لیکن انگریزوں کی بحری فوج نے اپنے دنیوی ہتھیاروں سے اس کی روحانی حکومت کا اچانک خاتمہ کر دیا ۔ ''کیتھولک یورپ میں پوپ کا جو مقام ہے اس سے کہیں بلند اپنے ملک میں اس بادشاہ کا مرتبہ ہے ، کیوں کہ نہ صرف، وہی ایک روئے زمین پر خدا کا خلیفہ ہے ، بلکہ اپنی ذات سے خود ایک دیوتا ہے اور اس حیثیت سے اس کی رعایا اس کی اطاعت بھی کرتی ہے

اور پرستش بھی ؛ کو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی پرستش کی بنیاد خوف پر ہے محبت پر نہیں ۔'' نائی جر کی مہم پر جو انگریز افسر بھیجے گئے تھے ان سے اداہ کے بادشاہ نے کہا کہ ''خدا نے مجھ کو اپنے نمونے پر تخلیق کیا ہے ، میں خدا کی مثل ہوں اور اسی نے مجھ کو بادشاہ مقرر کیا ہے ۔''

برما میں بادون ساچین نامی ایک عجیب خونی بادشاہ تھا جس کے چہرے سے اس کے مزاج کی درندگی عیاں تھی اور جس کی حکومت میں غنیم سے زیادہ جلاد کے ہاتھوں لوگ مارے گئے ۔ اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ آدم خاکی سے ایک بلند تر ہستی ہے اور اس کا مرتبۂ عالی اصل میں اس کے اچھے کاموں کا صلہ ہے ؛ چنانچہ اس نے اپنا شاہی لقب ترک کر دیا اور اپنے آپ کو دیوتا بنانے کی ٹھان لی ۔ اس مقصد سے ، نیز مہاتما بدھ کی پیروی میں ، جو دیوتا کا مرتبہ حاصل کرنے سے پہلے اپنے شاہی محل اور حرم سرائے کو تیاگ کر تارک الدنیا ہو گئے تھے ، بادون ساچین نے اپنے محل سے نکل کر ملک کے سب سے بڑے عظیم الشان مخروطی مندر میں دھونی رمائی جسے اس نے برسوں میں تعمیر کروایا تھا ۔ یہاں اس نے ایسے راہبوں کی مجلس مشاورت منعقد کی جو تبحر علمی میں سب پر فضیلت رکھتے تھے اور انہیں یہ یقین دلانا چاہا کہ وہ پانچ ہزار برس جو مہاتما بدھ کے احکام کی تعمیل کے لیے مقرر کیے گئے تھے ، پورے ہو چکے اور اس میعاد کے گزرنے کے بعد جس دیوتا کو ظاہر ہونا اور پرانے قانون کو منسوخ کرکے اس کی جگہ اپنا نیا قانون نافذ کرنا تھا ، وہ خود اس کی اپنی ذات ہے ، لیکن بہت سے راہبوں نے اس کے اس دعوے کی تردید کا تہیہ کر لیا اور اس کے خلاف ایسی دلیلیں پیش کیں کہ وہ اپنا سا منہ لے کے رہ گیا ۔ ایک تو یہ مایوسی ، دوسرے اس کی ہوس اقتدار اور پھر اس پر بیراگ کی نا قابل برداشت سختیاں ، جلد ہی اس کے سر سے خدائی کا سودا جاتا رہا اور وہ اپنی محل سرائے اور حرم میں لوٹ آیا ۔ شاہ سیام کی دیوتا کی طرح تعظیم ہوتی ہے ۔ رعایا میں کسی شخص کی مجال نہیں

کہ روئے سلطانی کو نگاہ اُٹھا کر دیکھ لے ۔ جب اس کی سواری نکلتی ہے تو لوگ اس کے آگے سر بسجود ہو جاتے ہیں اور اس کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں تو گھٹنے اور کہنیاں ٹیک دیتے ہیں ۔ اس کی ذات کے لیے خاص الفاظ وقف ہیں اور ہر شخص کو اس سے گفتگو یا اس کا ذکر کرتے ہوئے یہی الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں ۔ خود سیامیوں کے لیے اس مخصوص درباری زبان پر عبور حاصل کرنا مشکل ہے ۔ سلطان کے سر کے بال ، تلوے ، سانس غرض کہ اس کے جسم کی ہر اندرونی اور بیرونی چیز کے الگ الگ نام مقرر ہیں ۔ وہ جب کھاتا یا پیتا ، سوتا یا چلتا ہے تو ایک خاص لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو سلطان کے ان افعال کو ظاہر کرتا ہے ، اور یہ الفاظ کسی اور شخص کے افعال کے لیے استعمال نہیں کیے جا سکتے ۔ سیامی زبان میں کوئی لفظ ایسا نہیں پایا جاتا جو بادشاہ سے برتر و بزرگ تر ہستی کا مفہوم ادا کرتا ہو اور عیسائی مشنریاں اس زبان میں تبلیغ کرتے ہوئے خدا کے لیے 'لفظ' بادشاہ استعمال کرنے پر مجبور ہیں ۔

لیکن جس کثرت سے ہندوستان نے انسانی خدا پیدا کیے ہیں وہ شاید ہی دنیا کے کسی اور ملک نے پیدا کیے ہوں ۔ اس ملک میں بادشاہ سے لے کر گھوسی تک سماج کا کوئی طبقہ ایسا نہیں جس کو ربوبیت ارزانی نہ ہوئی ہو ۔ چناں چہ جنوبی ہند میں کوہ نیل‌گری کے ٹوڈا نامی گڈریوں کی قوم میں شیرخانے کی حیثیت عبادت گاہ کی ہے اور اس کے گوالے کو دیوتا بتایا گیا ہے ۔ وہاں کے لوگوں سے جب یہ پوچھا گیا کہ آیا ٹوڈا سورج کو ڈنڈوت کرتے ہیں یا نہیں تو ان میں سے ایک نے جواب دیا ''وہ بے چارے تو سب کرتے ہیں ، لیکن میں'' اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے کہا ''میں ایک دیوتا ہوں ، بھلا میں سورج کو ڈنڈوت کیوں کرنے لگا !'' گوالے کو اس کے باپ سمیت ہر شخص سجدہ کرتا ہے اور اس کی کسی بات سے انکار کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی ۔ اسے دوسرے گوالے کے سوا کوئی اور چھو نہیں سکتا اور جو کوئی اس سے مشورہ کرتا ہے

وہ اسے غیب کی باتیں بتاتا ہے ۔

نیز ہندوستان میں ''ہر راجا کو ایک حاضر و ناظر دیوتا سمجھا جاتا ہے ۔ اس سے بھی بڑھ کر ہندوؤں کی مانوشاستر یہ کہتی ہے کہ ''راجا بالک بھی ہو تو اس کو اس خیال سے حقیر نہیں جاننا چاہیے کہ وہ محض ایک فانی ہستی ہے ، اس لیے کہ وہ انسان کے روپ میں ایک دیوتا ہے ۔'' کہا جاتا ہے کہ چند سال قبل اڑیسہ میں ایک فرقہ تھا جو ملکہ وکٹوریہ آں جہانی کی زندگی میں ان کی اپنے خاص معبود کی حیثیت سے پرستش کرتا تھا ، اور آج بھی ہندوستان میں ان تمام زندہ افراد کی ذات کو جو قوت شجاعت یا کسی فرضی استدراج کی وجہ سے نمایاں اور ممتاز ہوں ، دیوتاؤں کی حیثیت سے پجنے کا خطرہ لاحق ہے ۔ چناں چہ پنجاب میں ایک فرقہ تھا جس کے دیوتا کا نام نکل سین تھا ۔ یہ نکل سین جنرل نکل سن کی صاحب جلال ہستی تھی ۔ یہ جنرل ان کے ساتھ کچھ ہی کرتا اور ان سے کچھ ہی کہتا ، لیکن ان کی آتش عبودیت کسی طرح ٹھنڈی نہ ہوتی ۔ وہ جس قدر ان کی سرزنش کرتا اسی قدر وہ اس کی ہیبت سے مرعوب ہو کر اس کی پرستش کرتے ۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا بنارس میں ایک مشہور دیوتا ایک ہندو صاحب کی صورت میں متشکل ہوا تھا ، جو اپنے مدھر نام بھسکرانند جی سرسوتی پر پھولے نہ سماتے تھے ۔ ان کی ہیئت کارڈنل مانگ (انگلستان کے کیتھولک کلیسا کا ایک مشہور صدر جو انیسویں صدی میں گزرا ہے ۔ لٹن اسٹریچی نے اپنے ایک مضمون میں اس کا نہایت دل چسپ مرقع پیش کیا ہے ، ملاحظہ ہو : Eminent Victorians) کی طرح عجیب سی تھی ۔ فرق بس اتنا تھا کہ وہ مانگ سے زیادہ معصوم نظر آتے تھے ۔ ان کی آنکھوں کی چمک سے انسانیت کی لگن ہویدا تھی اور کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے معصومانہ انداز سے اپنے پجاریوں کے جوش عقیدت کا لطف اٹھاتے تھے ۔

چنچواد میں ، جو شہر پونا سے کوئی دس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے ، ایک کنبہ اب تک موجود ہے ۔ مرہٹوں کی ایک

بڑی تعداد کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر نسل میں ہاتھی کے سر والا دیوتا گن پتی (یہ گنیش کا دوسرا نام ہے جو ہندو دیومالا میں بصیرت اور دور اندیشی کا دیوتا ہے) اس کنبے کے کسی نہ کسی فرد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ مشہور و معروف دیوتا سب سے پہلے ۱۶۳۰ء میں مورابا گوسائیں نامی ایک برہمن کی شکل میں ظاہر ہوا تھا ، جس نے اپنی نجات کے لیے بڑی نفس کشی اور عبادت کی تھی ۔ چناں چہ اسے اپنے ریاض کا صلہ مل گیا اور یہ دیوتا ایک رات خواب میں اس پر ظاہر ہوا اور اس سے وعدہ کیا کہ اس کی ، یعنی گن پتی کی روح مقدس کا ایک عنصر خود اس برہمن کی ذات اور اس کی اولاد میں سات پشتوں تک سایا رہے گا ۔ گن پتی کا یہ وعدہ پورا ہوا اور اس کی روح گوسائیں کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ سات پشتوں تک برابر منتقل ہوتی رہی اور اس جہان تیرہ و تار پر اپنا نور برساتی رہی ۔ اس خانوادہ گن پتی کا آخری چراغ ، جو ایک بھاری بھرکم دیوتا تھا اور جس کی آنکھیں کمزور تھیں ، ۱۸۱۰ء میں گل ہوگیا ۔ لیکن ایک تو سچائی کے پرچار کی لگن ، دوسرے عبادت گاہ کی قیمتی املاک ، جس کی وجہ سے یہ برہمن بہ سکون قلب اس نقصان کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے جو گن پتی کے معدوم ہونے سے دنیا کو پہنچ جاتا ، چناں چہ انھوں نے ایک ایسا تن خاکی ڈھونڈ نکالا جس میں ان کے گرودیو کی روح از سر نو ظاہر ہوئی تھی اور اس وقت سے اس کے ظہور کا سلسلہ تن بہ تن آج تک جاری ہے ۔ روحانی تقلیل کے اس افسوس ناک لیکن اٹل قانون کے بموجب جو مذہب کی تاریخ میں پر اسرار طور پر کار فرما رہا ہے ، اس دور انحطاط میں کسی انسان دیوتا سے جو خرق عادات ممکن الوقوع ہیں ، وہ ان خرق عادات کو نہیں پہنچ سکتے جو اس کے پیش روؤں سے زمانۂ قدیم میں سرزد ہوئے ہوں ۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ موجودہ نسل کے لیے اس دیوتا کی واحد نشانی اس کی مجازی ہستی کا یہ استدراج ہے کہ وہ ناگوں کو رزق پہنچاتی ہے ، جن کی ایک کثیر تعداد ہر سال اس کی دعوت میں مقام چنچواد شریک ہوتی ہے ۔

ایک ہندو فرقے کے نزدیک جس کے متعدد ارکان بمبئی اور وسط ہند میں ہیں، ان کے روحانی سردار جنھیں وہ مہاراجا کہتے ہیں، کرشن دیوتا کے نمائندے بلکہ فی‌الحقیقت مجسم صورتیں ہیں، اور چوں کہ آسان سے کرشن کی نظر عنایت سب سے زیادہ ان لوگوں پر رہتی ہے جو زمین پر اس کے جانشینوں اور نمائندوں کی حاجت روائی کرتے ہیں، لہذا جاں نثاری کی ایک خاص رسم جاری ہوگئی جس کے ذریعے اس کے وفادار پجاری اپنا تن من اور جو چیز شاید ان دونوں سے بھی زیادہ اہم ہے، یعنی دھن، ان لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں جن کی صورتوں میں کرشن متشکل ہو۔ نیز عورتوں کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ان ہستیوں سے ہم کنار ہو کر سب سے بڑی روحانی مسرت حاصل کی جا سکتی ہے، جن میں انسانی صورت بلکہ نفسانی خواہشات کے ساتھ ساتھ جوہر الوہیت بھی ودیعت کیا گیا ہے۔

خود مسیحیت اس قسم کے توہمات سے ملوث ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا دامن ان لوگوں کی بے ہودگیوں سے داغ داغ ہے، جو الوہیت میں اس مذہب کے جلیل‌القدر بانی کی ہم سری بلکہ ان پر بھی تفوق کے مدعی رہے ہیں۔ دوسری صدی عیسوی میں ایک شخص مان ٹے نس فریجیائی نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ تثلیث مجسم ہے، یعنی اس کے جسم میں خدا، حضرت مسیح اور روح‌القدس متحدہ طور پر متشکل ہوئے ہیں۔ لیکن یہ محض ایک غیر متوازن ذہن کی لاف و گزاف کی واحد مثال نہیں۔ مسیحی دور کے آغاز تک متعدد فرقوں کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ ہر وہ شخص جو جملہ رسوم کے ساتھ عیسائی ہوا ہو، مسیح علیہ السلام بلکہ خود باری تعالیٰ کی ذات کا مظہر ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی ایک دوسرے کی پرستش کرتے چلے آئے ہیں۔ ترتولین (رومی پادری اور مصنف جو ۱۵۰ء میں گزرا ہے) لکھتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں اس کے دینی بھائی کارتھیج میں یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ سینٹ کولمبا (اسکاچستان کے ایک نصرانی

ولی جو چھٹی صدی عیسوی میں گزرے ہیں) کے مرید یہ سمجھتے تھے کہ حضرت عیسیٰ ان کے پیر کے روپ میں دوبارہ مبعوث ہوئے ہیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ایلی پاندس تولیدوی (تولیدو، ہسپانیہ کا ایک قدیم شہر ہے) یہ کہا کرتا تھا کہ حضرت عیسیٰ ''خداؤں میں ایک خدا'' ہیں، جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ وہ تمام لوگ جو عیسائیت پر ایمان رکھتے ہوں، حضرت عیسیٰ کی طرح خدا ہیں۔ ال بی جن سیس فرقہ (بارھویں اور تیرھویں صدی میں جنوبی فرانس کا ایک فرقہ جس نے رومی کلیسا پر کڑی نکتہ چینی کی تھی اور پادریوں کی اخلاقی خرابیوں کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ پاپائے روم انوسینٹ سوم نے ان پر مانویت پھیلانے کا الزام لگایا۔ چودھویں صدی کے اوائل میں ایک مذہبی عدالت احتساب نے جنوبی فرانس میں تولوز کے مقام پر اس فرقے کے عقائد کی تحقیقات کی اور اسے مرتد قرار دے کر اس کا استیصال کر دیا) کے ارکان ایک دوسرے کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اس عدالت احتساب کی دستاویزات میں جو ان کے خلاف الزامات کی تحقیقات کے لیے چودھویں صدی کے اوائل میں قائم ہوئی تھی، ان کی اس بدعت کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔

تیرھویں صدی میں قلندروں کا ایک فرقہ پیدا ہوا تھا جو ''اخوان و خواہران آزادیٔ باطنی'' کہلاتا تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ طویل اور مسلسل مراقبے سے کسی بھی شخص کو وصال الٰہی ہو سکتا ہے اور اس طرح اس کی ذات اس ہستی سے ہم کنار ہو سکتی ہے جو تمام اشیاء کا سرچشمہ اور مبدأ وجود ہے، اور یہ کہ جو اس طرح خدا کے مقام ارفع تک پہنچ جائے اور اس کے جوہر لطیف میں جذب ہو جائے، وہ ہر اعتبار سے حضرت عیسیٰ کی طرح خدا کا جزو اور بیٹا بن جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی ذات تمام انسانی اور خدائی قوانین کی پابندیوں سے بالا تر ہو جاتی ہے۔ اس خوش اعتقادی سے مسرور و از خود رفتہ مجنونانہ وضع بنائے اور عجیب و غریب لباس پہنے یہ قلندر مارے مارے پھرتے اور نعرے لگا لگا کر بھیک

مانگتے تھے ۔ وہ ہر قسم کی جائز محنت و مشقت کو اپنے مراقبے اور معراج روحانی میں رکاوٹ سمجھ کر پائے استحقار سے ٹھکرا دیتے تھے ۔ اس آوارہ گردی میں عورتیں ان کی پیروی کرتیں ، جن کے ساتھ وہ نہایت بے تکلفانہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ ان میں سے وہ اشخاص جو اپنی دانست میں سلوک کی منزلیں طے کر چکتے ، اپنی برادری کی مجلسوں میں برھنہ شریک ہوتے ، اس لیے کہ ان کے نزدیک شرم و شائستگی فساد باطنی کی علامت اور اس روح کی خصوصیت تھی جو ہنوز جسمانی ذلتوں سے نجات حاصل کرکے روح ربانی یعنی اپنے مرکز و مبداء سے ہم کنار نہ ہو سکی ہو ۔ بعض وقت رومی کلیسا کی عدالت احتساب کی بدولت ان کی منازل سلوک بڑی تیزی سے طے ہو جاتیں اور وہ انتہائی فخر و انبساط کے ساتھ آگ میں جل کر خدا سے جا ملتے ۔

۱۸۳۰ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کینٹکی کی سرحد پر ایک بہروپئے نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ خدا کا بیٹا اور انسانیت کا نجات دہندہ ہے اور دنیا میں دوبارہ اس لیے آیا ہے کہ وہ بد اعمالوں ، ملحدوں اور گناہ گاروں کو اپنے بھولے ہوئے فرض کا احساس دلائے ۔ اس نے اعلان کیا کہ اگر انھوں نے ایک خاص مدت کے اندر اپنی اصلاح نہ کی تو وہ اشارہ کر دے گا اور دنیا کا تختہ الٹ جائے گا ۔ اس کی ان ڈینگوں کو اور تو اور معاشرے کے سر برآوردہ اور دولت مند افراد نے بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ۔ آخر ایک جرمن نے بڑے عجز و انکسار سے اس نئے مسیحا سے درخواست کی کہ وہ آنے والے عذاب کا اعلان اس کے ہم وطنوں کے سامنے جرمن زبان میں کرے اس لیے کہ وہ انگریزی نہیں جانتے اور یہ بڑی افسوس ناک بات ہوگی کہ محض اسی وجہ سے وہ جہنم واصل کر دیے جائیں ۔ اس بہروپیے نے جو شفیع انسانیت بننے کے خواب دیکھ رہا تھا ، راست بازی سے کام لیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ اسے جرمنی نہیں آتی ۔ ''بڑے تعجب کی بات ہے'' اس جرمن نے جواب دیا ، ''تم خدا کے بیٹے ہو کر ساری زبانیں نہیں جانتے ، یہاں تک کہ تمھیں جرمنی بھی نہیں آتی ۔ چلو چلو ، تم نرے دغا باز ، ریا کار اور پاگل ہو اور تمھاری صحیح جگہ

پاگل خانہ ہے۔'' آس پاس جو لوگ کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے ہنس پڑے اور اپنی خوش اعتقادی پر شرمندہ ہو کر وہاں سے چل دیے۔

بعض وقت کسی انسان دیوتا کی موت پر خدا کی روح کسی اور آدمی کے قالب میں منتقل ہو جاتی ہے۔ بدھ کے ماننے والے تاتاریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بدھ کی سینکڑوں جیتی جاگتی صورتیں ہیں جو مہا لاماؤں کی حیثیت سے بڑے بڑے مندروں میں پیشوائی کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ جب کوئی مہا لاما مر جاتا ہے تو اس کے چیلوں کو اس کا قطعی رنج نہیں ہوتا، کیوں کہ انہیں معلوم ہے کہ وہ کسی بچے کی صورت میں دوبارہ جنم لے لے گا۔ انہیں صرف یہ فکر رہتی ہے کہ وہ کس مقام پر پیدا ہوگا۔ اگر اس وقت قوس قزح نمودار ہو جائے تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ علامت متوفی مہا لاما کی طرف سے اس کے گہوارے کی نشان دہی کے لیے ظاہر ہوئی ہے۔ کبھی وہ مقدس بچہ خود اپنی شناخت کرا دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے ''میں ہوں مہا لاما، فلاں فلاں مندر کا زندہ گوتم بدھ، مجھے اپنی پرانی خانقاہ لے چلو، میں اس کا امر گرو ہوں۔'' بدھ کی جنم بھومی کا انکشاف خواہ کسی طرح ہو، چاہے وہ خود بتا دے یا قوس قزح اس کی نشان دہی کرے، اس موقع پر خیمے نصب کیے جاتے ہیں، خوش و خرم زائر اپنے بادشاہ یا شاہی خاندان کے سب سے ممتاز فرد کی سرکردگی میں بالک دیوتا کو تلاش کرکے اسے اپنے گھر لانے کے لیے نکلتے ہیں۔ عام طور پر وہ تبت کی مقدس سرزمین میں پیدا ہوتا ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے زائروں کے کاروان کو خوف ناک بیابانوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ انجام کار جب انہیں وہ بچہ مل جاتا ہے تو سب کے سب اس کے آگے سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اس کی پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ تاہم قبل اس کے کہ وہ بچہ مہا لاما تسلیم کر لیا جائے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنی اصلیت کے بارے میں ان کا اطمینان کر دے۔ اس سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ جس خانقاہ کے گرو ہونے کا مدعی ہے اس کا نام کیا ہے، وہاں سے کتنی دور ہے اور اس میں کتنے جوگی رہتے ہیں۔ نیز اس کو متوفی مہا لاما کے عادات و اطوار

بتانے پڑتے ہیں اور یہ بھی کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی ۔ پھر اس کی مزید آزمائش کے لیے اس کے سامنے عبادت نامے ، چائے دانیاں اور پیالیاں وغیرہ رکھ دی جاتی ہیں ۔ اگر اس نے یہ ٹھیک ٹھیک بتا دیا کہ ان میں کون کون سی چیزیں پچھلے جنم میں اس نے استعمال کی تھیں تو اس کا دعویٔ خدائی تسلیم کر لیا جاتا ہے اور بڑے فخر و مسرت کے ساتھ اسے خانقاہ لے جایا جاتا ہے ۔ تمام لاماؤں کا سردار لاھا ساکا دلائی لاما ہے ، جس کی بدولت یہ مقام تبت کا رومۃ الکبری ہے ۔ اسے زندہ دیوتا سمجھا جاتا ہے اور وہ مرتا ہے تو اس کی روح ایزدی کسی بچے کی صورت میں از سر نو جنم لے لیتی ہے ۔ بعض لوگوں کے بیان کے بموجب کسی عام سہا لاما کی طرح دلائی لاما کا پتا بھی اسی مذکورہ طریقے سے چلایا جاتا ہے ، لیکن بعض لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کا انتخاب ایک سنہری مرتبان میں قرعہ اندازی کے ذریعے عمل میں آتا ہے ۔ وہ جہاں کہیں پیدا ہوتا ہے درخت سرسبز ہو جاتے ہیں ، اس کے حکم سے پھولوں پر جوبن آ جاتا ہے اور چشمے جاری ہو جاتے ہیں اور اس کے حضور سے آسمانی برکتیں نازل ہونے لگتی ہیں ۔

لیکن ان علاقوں میں صرف یہی ایک واحد شخص نہیں جو دیوتا کا روپ بھرتا ہو ۔ چین کی وزارت مستعمرات میں سلطنت کے تمام انسان دیوتاؤں کی باضابطہ رجسٹری ہوتی ہے اور اس قسم کے اجازت یافتہ دیوتاؤں کی تعداد ایک سو ساٹھ ہے ۔ ان میں تیس کا سایہ تبت پر ہے ، انیس کی ذات شمالی منگولیا کا سرمایۂ مسرت ہے اور جنوبی منگولیا پر پورے ستاون اپنا نور برساتے ہیں ۔ حکومت چین پرجا کی بھلائی کی خاطر رجسٹری شدہ دیوتاؤں کو تبت کے سوا کہیں اور جنم لینے کی اجازت نہیں دیتی کہ مبادا منگولیا میں کسی دیوتا کی پیدائش اس کے لیے سیاسی مشکلات کا باعث بن جائے اور کسی شاہی خاندان سے کوئی اولوالعزم دیوتا اٹھے اور منگولوں کی محب وطن اور عسکری روح کو بیدار کرکے انہیں اپنے جھنڈے تلے جمع کر لے اور اس طرح اپنی دینی اور دنیوی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے ۔ ان خداوندان عامہ یا با ضابطہ

خداوندوں کے علاوہ بہت سے نجی قسم کے چھوٹے چھوٹے یا غیر اجازت یافتہ دیوتا بھی ہیں جو پوشیدہ مقامات پر اپنے کمالات خدا وندی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور لوگوں پر برکتیں نازل کرتے رہتے ہیں ۔ چند سال سے حکومت نے ان ناجائز دیوتاؤں کے بیرون تبت دوبارہ جنم لینے سے چشم پوشی کر رکھی ہے ۔ تاہم ایک دفعہ وہ پیدا ہو جائیں تو حکومت باضابطہ اور بے ضابطہ دونوں قسم کے دیوتاؤں پر کڑی نظر رکھتی ہے ۔ اگر ان میں کسی سے کوئی ناروا حرکت سر زد ہو جائے تو اسے معزول کرکے کسی دور افتادہ خانقاہ میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور اسے دوبارہ جنم لینے کی سخت ممانعت ہوتی ہے ۔

غیر مہذب معاشرے میں بادشاہ کی مذہبی حیثیت کا جو جائزہ لیا گیا ہے اس کی بناء پر یہ استنباط قرین صحت ہوگا کہ میکسیکو اور پیرو جیسی عظیم تاریخی سلطنتوں کے بادشاہوں کے الوہیت و مافوقیت کے دعوے ان کی رعونت بے جا کا نتیجہ یا ان کے حقیر محکوموں کی قصیدہ خوانی سے عبارت نہ تھے ، بلکہ محض زندہ بادشاہوں کی تقدیس کے قدیم وحشیانہ دستور کی یادگار اور توسیع شدہ صورت تھے ۔ چناں چہ ابنائے شمس کی حیثیت سے پیرو کے انکاؤں کا (جنوبی امریکہ کی قدیم سلطنت پیرو کا شہنشاہ اور اس کے خاندان کا ہر فرد سورج کا بیٹا مانا جاتا تھا اور انکا کے لقب سے ملقب تھا ۔ صیغۂ جمع میں اس لفظ کا اطلاق شہنشاہ کی رعایا پر بھی ہوتا تھا) دیوتاؤں کی طرح ادب کیا جاتا تھا ۔ وہ نہ کبھی کسی پر ظلم کر سکتے ہیں ، نہ کبھی کسی کو انہیں جسمانی یا مالی نقصان پہنچانے یا ان کی اہانت کا خیال پیدا ہوتا ہے ۔ نیز عام لوگوں کی طرح انکا بیماری کو برا نہیں سمجھتے تھے ، بلکہ ان کی نظر میں بیماری کی حیثیت ایک ایسے قاصد کی تھی جس کے ذریعے سورج دیوتا نے انہیں اپنے پاس آرام کرنے کے لیے بلا بھیجا ہو ۔ جب کسی انکا کا آخری وقت آن پہنچتا تو وہ اس کا اعلان ان الفاظ میں کرتا ''میرا باپ مجھے اپنے پاس آرام کرنے کے لیے بلاتا ہے ۔'' وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف قربانی دے کر صحت یاب ہونے کی کوشش نہ کرتے ، بلکہ علی الاعلان یہ کہتے کہ اس نے

انھیں آرام کرنے کے لیے بلایا ہے۔ اسی طرح جب ہسپانوی فاتح جنوبی امریکہ کی گرم وادیوں سے نکل کر کولمبیائی انڈیز کی سطح مرتفع پر پہنچے تو انھیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہاں کے لوگ ان وحشیوں کے بالکل برعکس ہیں جنھیں وہ نیچے تپتے ہوئے صحراؤں میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ خاصے مہذب ہیں جو کھیتی باڑی کرتے ہیں اور ایسی حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے ہیں جسے ہوم بولٹ (ہیرن الگزانڈر ہوم بولٹ، انیسویں صدی کا جرمن سائنس دان اور سیاح۔ یہ اپنی ایک تحقیقی مہم پر میکسیکو اور جنوبی امریکہ گیا تھا) تبت اور جاپان کی مذہبی حکومت کے ہم پایہ قرار دیتا ہے۔ یہ چبچا، موسیکا یا موزکا قوم تھی جو ان دو سلطنتوں میں بٹی ہوئی تھی، جن کے دارالمالک بوگوٹا اور ٹنجا تھے۔ لیکن وہ بہ ظاہر سوگا موزو یا اراکا کے پیشوائے اعظم سے اپنی روحانی وفاداری کی بنا پر متحد تھی۔ ان لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ اس روحانی حکمران کو طویل ریاضت کے سبب یہ تقدس حاصل ہے کہ آب و باراں اس کا حکم مانتے ہیں اور موسم اس کے تابع ہے۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ میکسیکی بادشاہوں کو اپنی تخت نشینی پر آفتاب کو روشن کرنے، بادلوں سے مینہ برسانے اور زمین سے وافر فصل پیدا کرانے کا حلف دینا پڑتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ میکسیکو کے آخری بادشاہ مونتزیما کو اس کی قوم ایک دیوتا کی طرح پوجتی تھی۔

بابل قدیم کے سلاطین سارگن اول (یہ غالباً حضرت مسیح سے تین ہزار سال پہلے گزرا ہے) سے لے کر اُر کی چوتھی سلطنت تک (اُر عراق میں دریائے فرات کے دہانے پر بصرے کے قریب واقع ہے۔ یہ مقام عہد عتیق میں چار سلطنتوں کا دارالمملکت تھا، جن میں آخری سلطنت کی بنا نینوا کے زوال کے بعد ۶۱۲ ق۔م میں پڑی تھی) جیتے جی خدائی کا دعویٰ کرتے تھے۔ خاص کر اس چوتھی سلطنت کے بادشاہوں نے اپنی پرستش کے لیے مندر تعمیر کرا رکھے تھے۔ وہ مختلف عبادت گاہوں میں اپنے مجسمے رکھوا کر لوگوں کو حکم دیتے تھے کہ وہ ان پر بھینٹ چڑھائیں۔ سال کا آٹھواں مہینہ خاص طور پر ان بادشاہوں

کی عبادت کے لیے وقف تھا ، اور ہر چاند کی پہلی اور پندرہ تاریخ کو انھیں قربانیاں دی جاتی تھیں ۔ (پارتھیار پارتھیوں کا ملک جو بحیرۂ خضر کے جنوب مشرق میں واقع تھا ۔ پارتھی سیتھی نسل کے لوگ تھے) کے ارساسی بادشاہ (ان کی سلطنت ارساسیس پارتھی نے ۲۵۰ ق ۔ م میں قائم کی تھی) اپنے آپ کو برادران مہر و ماہ کہلواتے تھے اور دیوتاؤں کی طرح ان کی پرستش کی جاتی تھی ۔ دنگے فساد میں ارساسی خاندان کے کسی فرد کو بھی مارنا پیٹنا سخت بے ادبی سمجھا جاتا تھا ۔

شاہان مصر کو ان کی زندگی میں دیوتا بنا دیا جاتا تھا ۔ انھیں قربانیاں دی جاتیں اور خاص مندروں میں مخصوص پروہت ان کی پوجا پاٹ کی رسم ادا کرتے ، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بادشاہوں کے آگے دیوتاؤں کا چراغ گل ہو گیا تھا ۔ چناں چہ شاہ میرنرا کے عہد حکومت میں ایک حاکم اعلیٰ نے اعلان کیا تھا کہ اس نے بہت ساری عبادت گاہیں تعمیر کرا دی ہیں تاکہ ''تمام دیوتاؤں سے زیادہ'' غیر فانی شاہ میرنرا کی آتما سے مدد مانگی جا سکے ۔ ''اس میں کبھی کسی کو شک نہیں ہوا کہ بادشاہ حقیقی الوہیت کا مدعی تھا'' ۔ وہ 'مہا دیوتا' تھا ، اس کی حیثیت رع (مصری دیومالا میں سورج دیوتا اور سب سے بڑا معبود ۔ اس کا ذکر آگے آئے گا) کے بیٹے حورس درخشاں کی تھی (یہ مصری دیومالا میں روشنی کا دیوتا ہے ، اس کی آفتاب صبح کی حیثیت سے پرستش کی جاتی تھی اور وہ حیات نو کی علامت سمجھا جاتا تھا ۔ اس سے بھی آگے بحث کی گئی ہے ) وہ نہ صرف مصر پر اپنی بادشاہت کا مدعی تھا بلکہ بہ زعم خود ''سارے ممالک و اقوام'' ، ''مشرق سے لے کر مغرب تک سارا عالم'' ، ''وہ ساری فضائے بسیط جو نیر اعظم کے پرتو سے تاباں و درخشاں ہے'' ، ''ارض و سماء اور جملہ موجودات ارض و سماء'' کا فرماں روا تھا ۔ ''ہر قسم کے دوپائے ، چوپائے اور پرندے ، غرض کہ ساری دنیا اپنی پیداوار اس کی نذر کرتی ہے ۔'' بلکہ فی الحقیقت سورج دیوتا کے متعلق جو کچھ دعوے سے کہا جاتا تھا ، وہی اصولاً شاہ مصر پر منطبق کیا جاتا تھا ۔ اس کے القاب براہ راست سورج دیوتا کے القاب سے ماخوذ تھے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ

''الوھیت کے بارے میں اھل مصر کا کوئی تصور ایسا نہ تھا جس کا بادشاہ جیتے جی اپنے آپ پر اطلاق نہ کرتا ھو ۔ اپنی پیدائش سے اور شاھی منصب کی بدولت وہ ایک فوق‌البشر دیوتا تھا ، اور مرنے کے بعد ایک مقدس و معبود انسان کی حیثیت اختیار کر لیتا ۔ اس طرح اس کی ذات مصریوں کے عقائد کے بموجب خدا کی جملہ صفات کا مجموعہ تھی ۔''

یہ تھی ایک مکمل لیکن نہایت مختصر روداد اس مقدس بادشاھت کے ارتقاء کی جس کی معراج پیرو اور مصر کی ملوکیتیں تھیں ۔ تاریخ کی رو سے یہ ظاھر ھوتا ھے کہ اس دستور کی ابتداء ساحروں اور عطار قسم کے طلسم گروں یا نیرنگ سازوں کے طبقے سے ھوئی ۔ منطقی حیثیت سے وہ خیالات کے تلازم کی بناء پر غلط استنباط کا نتیجہ ھے ۔ لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ فطرت کا نظام اور ان کے تصورات کا نظام ایک ھی چیز ھیں اور اس وجہ سے وہ یہ خیال کرنے لگے کہ اپنے افکار پر ان کا جو اختیار ھے ، یا جو اختیار نظر آتا ھے اس کی بناء پر وہ اشیائے عالم پر بھی ویسا ھی اختیار رکھتے ھیں ، اور جن لوگوں کے متعلق کسی نہ کسی سبب ، ان کی فطری خوبیوں یا خامیوں کی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ انھیں فطرت پر سحری نوعیت کے یہ اختیارات بدرجۂ اتم حاصل ھیں ، انھوں نے رفتہ رفتہ اپنے ھم جنسوں سے الگ ھو کر ایک مخصوص طبقے کی صورت اختیار کر لی ۔ یہی وہ طبقہ تھا جس کے بنی نوع انسان کے سیاسی ، مذھبی اور عقلی ارتقاء پر دور رس نتائج مرتب ھونے والے تھے۔ جیسا کہ ھم جانتے ھیں ، عمرانی ترقی اصل میں کام کی مسلسل تفریق یا دوسرے لفظوں میں پیہم تقسیم محنت سے عبارت ھے ۔ جاھلی دور کے معاشرے میں جو کام بہ حیثیت مجموعی سب لوگ یکساں اور بری طرح کرتے ھیں وہ رفتہ رفتہ کاریگروں کے مختلف طبقوں میں بٹ جاتا ھے اور بہتر سے بہتر طور پر انجام پانے لگتا ھے اور جس حد تک ان کاریگروں کی محنت کی مادی یا غیر مادی پیداوار میں سب لوگوں کا حصہ ھوتا ھے ، ان کاریگروں کے اختصاص سے سارا معاشرہ متمتع ھوتا ھے ۔ ماھروں اور پیشہ وروں کی حیثیت سے ساحروں اور طلسم گروں کا طبقہ عمرانی ارتقاء میں سب

سے قدیم معلوم ہوتا ہے ، اس لیے کہ تحقیق کی رو سے جادوگر ہر وحشی قبیلے میں پایا جاتا ہے اور آسٹریلیا کے اصلی باشندوں جیسے ان وحشیوں میں جو انتہائی جاہلیت اور پستی کی حالت میں ہیں ، بس یہی ایک پیشہ ور طبقہ وجود رکھتا ہے ۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے ، کام کی مسلسل تفریق کے ساتھ ساتھ خود طلسم گروں کا طبقہ معالجوں ، بارش گروں وغیرہ کے ذیلی گروہوں میں بٹ جاتا ہے اور اسی دوران میں اس طبقے کا سب سے مقتدر رکن قبیلے کی سرداری کے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے اور پھر ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے بادشاہ کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے جس کے ساتھ ساتھ اس کے منصب ساحری کی اہمیت کم ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی جگہ مذہبی اور الوہی قسم کے فرائض لے لیتے ہیں ۔ اس کے منصب کی یہ تبدیلی سحر پر مذہب کے بہ تدریج غلبے کی مناسبت سے عمل میں آتی رہتی ہے ۔ اس سے بھی آگے ایک دور آتا ہے جس میں بادشاہت کے مذہبی اور سیاسی پہلو الگ الگ ہو جاتے ہیں اور اس سے دنیوی اور روحانی اختیارات دو مختلف آدمیوں کو تفویض ہو جاتے ہیں ۔ اس اثناء میں ساحر مذہب کے غلبے سے دب تو جاتا ہے مگر اس کا استیصال نہیں ہونے پاتا اور وہ عبادت اور قربانی کی نئی رسوم کو قبول کرنے کی بجائے اپنے جادو منتر پر اڑا رہتا ہے ۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب اس طبقے کے دانش ور افراد سحر کے منطقی سقم کو محسوس کر لیتے ہیں اور انھیں انسان کی فلاح کے لیے فطرت کی قوتوں سے کام لینے کا سحر سے زیادہ مؤثر ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے ۔ مختصر یہ کہ وہ سحر کو ترک کرکے سائنس سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں ۔ میری مراد اس سے ہرگز یہ نہیں کہ انسان نے ہر جگہ ترقی کی بس یہی ایک روش اختیار کی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کی صورت مختلف معاشروں میں مختلف رہی ہے ۔ میرا مقصد بس اتنا ہے کہ انسان کے عمرانی ارتقاء کے عام رجحان کی اجمالی کیفیت پیش کردوں ۔ صنعتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کا رخ کام کی یکسانیت سے تنوع کی طرف رہا ہے اور سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جمہوریت سے مطلق العنانی کی طرف ۔

ملوکیت کے بعد کے دور کی تاریخ ، خاص کر مطلق العنانی کے خاتمے اور اس کی جگہ ایسے طرز ہائے حکومت کے قیام سے جو انسانیت کی اعلیٰ ضروریات سے زیادہ مناسبت رکھتے ہوں ، ہماری اس تحقیق کا کوئی تعلق نہیں ۔ ہماری بحث کا موضوع ایک ایسے عظیم دستور کی نشو و نما ہے نہ کہ انحطاط جو اپنے زمانے میں انسان کے لیے باعث خیر و برکت تھا ۔

آٹھواں باب

# شاہان مظاہر فطرت

اوپر جو کچھ تحقیق ہوا ہے اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ کسی شاہی لقب اور مذہبی فرائض کا امتزاج نیمی کے بن کے بادشاہ ، روم کے شاہ قربانی اور ایتھنز کے اس میجسٹریٹ کی ذات تک محدود نہ تھا جو بادشاہ کہلاتا تھا ، بلکہ یہی چیز غیر کلاسیکی ادوار میں بھی وحشت و جاہلیت سے لے کر تہذیب و شائستگی تک ہر مرحلۂ ارتقا پر معاشروں کی ایک عام خصوصیت رہی ہے ۔ نیز اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی رہنما کا یہ خسروانہ منصب نری نام کی بادشاہت نہ تھی، بلکہ وہ حقیقت میں بہ یک وقت مذہبی اور شاہی دونوں قسم کے فرائض انجام دیا کرتا تھا ۔ ان تمام چیزوں سے یونان اور اٹلی کی جمہوریتوں میں لقبی بادشاہوں کی اصل سے متعلق قدیم روایت کی تصدیق ہو جاتی ہے ۔ ہماری اس توضیح کے بعد کہ اٹلی اور یونان والی روایت دینی اور دنیوی اقتدار کے جس امتزاج کی شاہد ہے وہ در حقیقت متعدد مقامات پر موجود رہا ہے ، کم از کم اس روایت کے قرین صحت ہونے سے متعلق کسی شبہ کا احتمال باقی نہیں رہا ۔ لہذا اب یہ سوال اٹھانا بے جا نہ ہوگا کہ کیا نیمی والے بن کے بادشاہ کی اصل بھی کچھ اسی قسم کی نہ ہوگی جو روم کے شاہ قربانی اور ایتھنز کے لقبی بادشاہ کی تھی؟ دوسرے لفظوں میں کیا اس کے پیش رو بھی ایسے بادشاہوں کے سلسلے سے تعلق نہیں رکھتے تھے جو کسی جمہوری انقلاب کے سبب اپنے سیاسی اقتدار سے

محروم ہو گئے ہوں اور جن کا فقط مذہبی منصب اور نام کی بادشاہت باقی رہ گئی ہو ؟ اس سوال کا جواب نفی میں دینے کے لیے ہمارے پاس کم از کم دو وجوہ موجود ہیں ۔ ایک تو خود نیمی کے اس پجاری کا مسکن ، دوسرے اس کا لقب یعنی ''بن کا بادشاہ'' ۔ اگر اس کے پیش رو عام مفہوم میں بادشاہ ہوتے تو وہ بھی روم اور ایتھنز کے ان بادشاہوں کی طرح جو تخت و تاج سے محروم ہو چکے تھے، اسی شہر میں قیام رکھتا جس کی حکومت اس سے چھن گئی ہو ، اور یہ شہر اریشیا ہی ہونا چاہیے اس لیے کہ قرب و جوار میں کوئی اور شہر موجود نہ تھا ۔ لیکن اریشیا اس عبادت گاہ سے جو جھیل کے کنارے واقع تھی، تین میل پرے تھا ، لہذا اگر کوئی جگہ اس کے زیر نگیں تھی تو وہ شہر نہ تھا بلکہ جنگل تھا ۔ اس کے علاوہ اس کے لقب ''بن کا بادشاہ'' کے پیش نظر بھی یہ فرض کرنا مشکل ہے کہ وہ کبھی عام مفہوم میں بادشاہ رہا ہوگا ۔ اغلب تو یہ ہے کہ اس کا راج فطرت اور فطرت کے ایک خاص حصے یعنی اس بن پر تھا ، جس کی بدولت اسے مذکورہ بالا لقب ملا تھا ۔ اگر ہمیں ایسے بادشاہوں کی مثالیں مل جائیں جنھیں ''شاہان مظاہر فطرت'' کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہو ، میری مراد ایسے اشخاص سے ہے جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہو کہ فطرت کے خاص عناصر یا پہلو ان کے تابع ہیں ، تو وہ شاید بن کے اس بادشاہ کی ان دیوتا قسم کے بادشاہوں کی بہ نسبت زیادہ صحیح نظیر پیش کر سکیں جو اب تک ہمارے زیر بحث رہے ہیں ، اور فطرت پر جن کی حکومت کی نوعیت عام ہے ، یعنی وہ فطرت کے کسی خاص پہلو تک محدود نہیں ہوتی ۔

چناں چہ ایسی ہی ایک مثال اس بادشاہ کی ہے جو نام ولوومو یعنی شاہ باران و طوفاں کہلاتا ہے اور دریائے کانگو کے دھانے کے قریب بوما میں ایک پہاڑی پر رہتا ہے ۔ اسی طرح بیان کیا جاتا ہے کہ بالائی نیل کے علاقے کے بعض قبائل میں عام مفہوم میں بادشاہ کا کوئی وجود نہیں ، وہ صرف ایسے اشخاص کی بادشاہت کو تسلیم کرتے ہیں جو شاہان بارش یا ''ماٹا کوڈو'' کے نام سے موسوم ہیں اور جو لوگوں کے عقیدے کے بموجب صحیح وقت پر یعنی برسات میں مینہ

برسانے کی قوت رکھتے ہیں ۔ مارچ کے آخر میں بارش شروع ہونے سے قبل ان کا علاقہ ایک دشت بے آب و گیاہ بنا رہتا ہے اور مویشی ، جو ان کی اصل پونجی ہے ، چارے کی قلت کے سبب موت کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ لہذا جب مارچ کا مہینہ ختم ہونے لگتا ہے تو ہر گھر کا مالک شاہ بارش کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور ایک گائے اس کی نذر کرتا ہے تاکہ وہ چراگاہوں میں زرد اور مرجھائی ہوئی گھاس پر ابر رحمت برسا دے ۔ لیکن اگر اس کا کوئی اثر نہ ہو تو لوگ سب جمع ہو کر اس بادشاہ سے بارش کا مطالبہ کرتے ہیں اور جو اس پر بھی بادل نمودار نہ ہوں تو یہ لوگ اس بادشاہ کا پیٹ چاک کر ڈالتے ہیں جس میں وہ ان کے عقیدے کے بموجب طوفان لیے رہتا ہے ۔ باری قبیلے میں (یہ بھی نیل کے بالائی علاقے کا ایک قبیلہ ہے) ایک شاہ بارش ایک دستی گھنٹی سے چھڑکاؤ کرکے مینہ برسایا کرتا تھا ۔

حبشہ کے سرحدی قبائل میں شاہ بارش کا ایسا ہی ایک منصب موجود تھا ۔ ایک صاحب نے اس بادشاہ کا چشم دید حال یوں بیان کیا ہے : ''اس مذہبی پیشوا کا منصب جو باریا اور کونامانامی قبائل میں الفائی کہلاتا ہے ، عجیب و غریب چیز ہے ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے استدراج سے بارش کر سکتا ہے ۔ یہ منصب پہلے الجیدوں کے ہاں موجود تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی نوبائی حبشیوں کے لیے ایک عام چیز ہے ۔ باریا قبیلے کا الفائی ، جس سے شمال کے کومانا بھی رجوع کیا کرتے ہیں ، اپنے کنبے کے ساتھ الگ تھلگ تمبے دیر کے قریب ایک پہاڑ پر رہتا ہے ۔ لوگ خراج کے طور پر کپڑا اور پھل لے کر اس کے پاس پہنچتے ہیں اور اس کے ایک وسیع کھیت کو کاشت کر جاتے ہیں ۔ اس کی حیثیت ایک قسم کے بادشاہ کی سی ہے اور اس کا عہدہ وراثتاً اس کے بھائی یا بہن کے لڑکے کو منتقل ہوتا ہے ۔ اس کا کام جادو کے زور سے مینہ برسانا اور ٹڈیوں کو اڑانا ہے ، لیکن اگر وہ لوگوں کی توقع پوری نہ کر سکے اور ملک میں خشک سالی پھیل جائے تو اس الفائی کو پتھراؤ کرکے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے ، جس میں پہلا پتھر اس کے سب سے قریبی رشتہ دار کو مارنا

پڑتا ہے ۔ جس وقت ہمارا اس علاقے سے گزر ہوا ہے تو الفائی کے عہدے پر ایک معمر شخص فائز تھا ، لیکن سنا ہے کہ بارش گری کا یہ منصب اس کے حق میں بے حد خطرناک ثابت ہوا اور وہ اس سے دست بردار ہو گیا ۔''

کیمبوڈیا کے دور افتادہ بنوں میں دو پُر اسرار بادشاہ رہتے ہیں ۔ ان میں ایک آگ کے بادشاہ کی حیثیت سے مشہور ہے اور دوسرا پانی کے بادشاہ کی حیثیت سے ۔ سارے جزیرہ نمائے ہند چین میں ان کی دھوم ہے لیکن اہل یورپ کے کانوں میں اس کی صرف ایک بھنک سی پڑی ہے ۔ چند سال پیشتر تک کسی یورپین کو ان دونوں بادشاہوں میں سے کبھی کسی کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا ۔ اگر حال میں ان کے اور شاہ کیمبوڈیا کے درمیان با ضابطہ رابطہ قائم نہ ہو جاتا اور سالانہ تحفے تحائف کا سلسلہ نہ شروع ہو جاتا تو ان بادشاہوں کو محض فرضی ہستیاں تصور کر لیا جاتا ۔ ان کا شاہی منصب خالص باطنی اور روحانی نوعیت کا ہے اور انہیں کوئی سیاسی اختیار حاصل نہیں ۔ یہ دونوں کے دونوں سیدھے سادے کسان ہیں اور ان کی گزر بسر اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی اور معتقدوں کی نذر و نیاز پر ہوتی ہے ۔ ایک بیان کے بموجب وہ گوشۂ عزلت میں زندگی گزارتے ہیں ۔ نہ آپس میں ملتے جلتے ہیں اور نہ کسی فرد بشر کی شکل دیکھتے ہیں ۔ ان کا قیام یکے بعد دیگرے سات لاٹوں میں رہتا ہے ، جو سات پہاڑوں پر بنے ہوئے ہیں اور وہ ہر سال ایک لاٹ سے دوسرے لاٹ میں اٹھ جاتے ہیں ۔ لوگ چوری چھپے وہاں پہنچتے ہیں اور ان کی گزر بسر کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ڈال جاتے ہیں ۔ ان کی بادشاہت سات سال یعنی اتنے عرصے تک رہتی ہے جو سات لاٹوں میں ان کے قیام کے لیے ضروری ہے ، لیکن ان میں بہت سے معینہ وقت سے پہلے ہی راہیٔ ملک عدم ہو جاتے ہیں ۔ ان کے عہدوں کی وراثت ایک یا (بعض دوسرے بیانات کے بموجب) دو خاندانوں میں رہتی ہے ۔ ان خاندانوں کا لوگوں میں بڑا احترام ہے ۔ ان کا مالیہ مقرر ہے اور وہ زمین کی جتائی سے مستثنیٰ ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اس مخدوش عہدے سے جو عزت و وقار وابستہ

ہے اس کا کوئی خواہش‌مند نہیں ہوتا اور جب یہ عہدہ خالی ہوتا ہے تو وہ تمام اشخاص جو قانوناً اس کے اہل اور مستحق ہوتے ہیں (ان کا قوی اور صاحب اولاد ہونا ضروری ہے) راہ فرار اختیار کرتے ہیں اور روپوش ہو جاتے ہیں۔ ایک اور بیان سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ورثا عہدہ قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں، لیکن سات لاٹوں میں ان بادشاہوں کی راہبانہ زندگی کی تصدیق نہیں ہوتی، اس لیے کہ اس بیان کی رو سے جب یہ پر اسرار بادشاہ لوگوں کے سامنے آتے ہیں تو وہ ان کے آگے سجدے میں گر پڑتے ہیں، کیوں کہ انہیں یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر وہ ان سے اپنی عقیدت کا اظہار نہ کریں تو ملک پر آندھی کی صورت میں قہر نازل ہو جائے گا۔ دوسرے تقدس مآب بادشاہوں کی طرح جن کا ذکر آگے آئے گا، آگ اور پانی کے ان بادشاہوں کو اپنی موت مرنے نہیں دیا جاتا؛ اس لیے کہ اس سے ان کے نام پر حرف آ جاتا ہے۔ لہذا ان میں سے جب کوئی سخت علیل ہوتا ہے تو بڑے بوڑھوں کا ایک پنچ بیٹھتا ہے۔ اگر اس کا یہ فیصلہ ہو کہ بادشاہ کا مرض لاعلاج ہے تو وہ اسے چاقو گھونپ کر ہلاک کر دیتے ہیں، اس کی لاش جلا دی جاتی ہے اور اس کی راکھ بڑی عقیدت سے جمع کی جاتی ہے، جسے پانچ سال تک خاص و عام سب خراج عقیدت ادا کرتے رہتے ہیں۔ اس متبرک راکھ کا ایک جزو بادشاہ کی بیوہ کو دیا جاتا ہے جسے وہ ایک خاک دان میں رکھتی ہے اور جب وہ اپنے شوہر کی تربت پر اشک فشانی کے لیے پہنچتی ہے تو اسے اس خاک دان کو اپنی پشت پر لاد کر لے جانا پڑتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آگ کے بادشاہ کی پیشوائی میں، جو پانی کے بادشاہ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور جس کی مافوق قوتوں پر کبھی کسی کو شک نہیں ہوا، شادی بیاہ کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں، تیوہار منائے جاتے ہیں اور ''یان'' یا روح کے نام پر قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ان موقعوں پر اس کے لیے ایک علیحدہ جگہ مخصوص ہوتی ہے اور اس راستے پر، جس سے ہو کر وہ اس جگہ پہنچتا ہے، سفید کپڑا بچھا دیا جاتا ہے۔ بادشاہت کے جاہ و منصب کو ایک خاندان تک

محدود رکھنے کا ایک سبب یہ ہے کہ اس خاندان کے قبضے میں بعض بیش قیمت طلسم ہیں جو اگر کسی اور خاندان میں چلے جائیں تو اپنا جوہر کھو دیں یا غائب ہو جائیں۔ یہ طلسم تین ہیں: ایک تو ایک قسم کی بیل کا پھل ہے جو 'کوئی' کہلاتی ہے۔ یہ بیل قرنوں پہلے جو آخری طوفان آیا تھا اس میں ہاتھ لگی تھی، لیکن جس کی تازگی اور شادابی میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا۔ دوسرا طلسم رتان ہے (کھجور کی قسم کا ایک پودا جو شرق الہند میں پایا جاتا ہے) یہ بھی بہت پرانا ہے، لیکن اس کے پھول سدا بہار ہیں اور آخری طلسم ایک تلوار پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک یان یا روح سمائی ہوئی ہے جو اس کی ہر وقت حفاظت کرتی رہتی ہے اور اس کے ذریعے اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ روح ایک غلام کی ہے جس کا خون اتفاق سے اس تلوار کے پھل پر اس وقت ٹپک گیا جب وہ ڈھالی جا رہی تھی۔ اس غلام سے نادانستہ ایک جرم سرزد ہو گیا تھا جس کی تلافی اس نے اپنی جان دے کر کی تھی۔ اول الذکر دو طلسموں کے ذریعے ہانی کا بادشاہ ایسے زبردست طوفان اٹھا سکتا ہے کہ ساری زمین غرقاب ہو جائے۔ اگر آگ کا بادشاہ اس طلسمی تلوار کو نیام سے دو تین انچ باہر نکال لے تو سورج چھپ جائے اور آدمیوں اور جانوروں پر گہری نیند چھا جائے اور اگر وہ اسے بالکل بے نیام کر دے تو دنیا کا خاتمہ ہو جائے۔ اس تیغ حیرت انگیز پر مینہ برسانے کے لیے بھینس، سور، مرغیاں اور بطخیں بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں اور شاہ کیمبوڈیا کے ہاں سے ہر سال جو تحفے آتے ہیں، ان میں اس مقدس تلوار کے لیے بیش قیمت غلاف شامل ہوتے ہیں۔

اس ملک میں مردوں کو دفن کرنے کا دستور ہے، لیکن اس کے برخلاف ان دونوں پراسرار بادشاہوں کی لاشیں جلا دی جاتی ہیں۔ مگر تبرک کے طور پر ان کے ناخن، کچھ دانت اور ہڈیاں رکھ لی جاتی ہیں۔ جس وقت ان دونوں جادوگروں میں سے کسی کی لاش چتا پر جلتی ہے، اس کے اقرباء فرار ہو کر کہیں چھپ رہتے ہیں کہ کہیں اس منصب عالی پر انہیں فائز نہ کر دیا جائے۔ لوگ ان کی تلاش

میں نکلتے ھیں اور جس شخص کی کمین گاہ کا سب سے پہلے سراغ لگتا ھے وہ آگ یا پانی کا بادشاہ بنا دیا جاتا ھے ۔

یہ تھیں ان بادشاھوں کی مثالیں جنھیں میں نے شاھان مظاھرفطرت کہا ھے ۔ لیکن کیمبوڈیا کے جنگل و منبع نیل اور اٹلی میں بعد مشرقین ھے اور اگرچہ بارش ، پانی اور آگ کے بادشاھوں کا پتا چل چکا ھے مگر ھمیں ھنوز بن کے ایک ایسے بادشاہ کا کھوج لگانا ھے جو اسی لقب سے ملقب اریشیائی پجاری کا مثیل ھو ۔ شاید اس کی نظیر ھمیں قریب ھی یورپ میں کہیں مل جائے ۔

نواں باب

# شجر پرستی

## (۱) شجری روحیں—یورپ کی آریائی اقوام کی تاریخ میں

درختوں کی پرستش کا بڑا اہم حصہ رہا ہے اور یہ بالکل قدرتی بات تھی؛ اس لیے کہ تاریخ کے آغاز کے وقت یورپ کی سر زمین پر عہد اولیٰ کے گھنے جنگل چھائے ہوئے تھے جن میں جگہ جگہ زرعی اراضی کے کھلے ٹکڑے اس طرح بکھرے ہوئے ہوں گے جیسے سمندر میں ننھے ننھے ٹاپو۔ پہلی صدی قبل مسیح تک صحرائے ہرمینیا (جنوبی اور وسطی جرمنی کا قدیم پہاڑی بن) رہائن سے لے کر مشرق کی جانب اس قدر وسیع علاقے پر پھیلا ہوا تھا کہ اس کی حد کی کسی کو خبر نہ تھی۔ ان جرمنوں نے جو اس صحرا میں سے گزرے تھے، سیزر کے دریافت کرنے پر بتایا کہ وہ اس میں دو مہینے تک سفر کرتے رہے مگر اس کے سرے تک نہ پہنچ پائے۔ چار صدی بعد شہنشاہ جولین اس میں گیا ہوگا تو اس کی طبع حساس پر اس جنگل کی تنہائی، اداسی اور سکوت نے گہرا اثر کیا ہوگا اور وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا ہوگا کہ سلطنت روما میں کوئی چیز اس جنگل کا جواب نہیں۔ خود ہمارے ملک (انگلستان) میں ویلڈ کے اضلاع کینٹ، سرے اور سیکس انڈ ریڈا کے عظیم الشان جنگل کی یادگار ہیں جو کسی زمانے میں جزیرۂ برطانیہ کے سارے جنوب مشرقی حصے پر چھایا ہوا تھا۔ مغرب میں غالباً اس کی حدیں ایک اور بن سے جا ملی تھیں جو ہیمپشائر بیے ڈے ون تک چلا گیا

تھا - ہنری دوم کے عہد حکومت تک اہل لندن ہیمسٹیڈ کے بنوں میں جنگلی بیل اور سور کا شکار کیا کرتے تھے ، بلکہ پلانٹگنیٹ خاندان (انگلستان کے بادشاہ ہنری دوم سے رچرڈ سوم تک اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے) کے بعد کے بادشاہوں کے عہد میں بھی شاہی جنگلات کی تعداد اڑسٹھ تھی - کہا جاتا ہے کہ آرڈن بن کے اندر (انگلستان میں مڈلینڈ کا قدیم جنگل ، شیکسپئر کے مشہور طربیۂ ایز یو لائک اٹ ، کے بیشتر حصے کا سین یہی بن ہے) دور جدید میں بھی وارو ک شائر کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک گلہری پیڑ پیڑ چھلانگ لگا سکتی تھی - دریائے پو کی وادی میں قدیم شہتیری گاؤں کی کھدائی سے اس امر کا انکشاف ہوا ہے کہ سلطنت روما کے عروج بلکہ غالباً اس کی بناء پڑنے سے بہت پہلے شمالی اٹلی پر نارون (ایلم) شاہ بلوط (چیسٹ نٹ) اور خاص کر اوک (بلوط) کے گنجان جنگل چھائے ہوئے تھے - یہاں تاریخ سے آثار قدیمہ کی تائید ہوتی ہے ، اس لیے کہ کلاسیکی اہل قلم کے ہاں اٹلی کے ایسے جنگلوں کا کئی جگہ ذکر آیا ہے جن کا آج نشان بھی باقی نہیں - روم اور اٹروریا کے درمیان چیمنی کا خوف ناک جنگل حائل تھا ، جس کا لیوی (رومی مورخ جو پہلی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے) نے جرمنی کے بنوں سے مقابلہ کیا ہے - اگر اس رومی مورخ کے بیان پر یقین کیا جائے تو کبھی کسی تاجر کو اس بے راہ جنگل کی تنہائیوں میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی اور جب ایک رومی جنرل اس کی دشوار گزاریوں کا پتا چلانے کے لیے دو اسکاؤٹوں کو بھیجنے کے بعد اس میں اپنی فوج لے کے گیا اور بڑھتا ہوا اس پہاڑی بن کی چوٹی پر جا پہنچا جس کے دامن میں اٹروریا کے زرخیز کھیت لہلہاتے تھے، تو لوگ اس کی دلیری پر عش عش کرنے لگے - یونان میں صنوبر ، بلوط اور دوسرے خوب صورت درخت آرکیڈیائی پہاڑوں کی ڈھلانوں پر اب تک باقی ہیں ، جن کی تازگی و شادابی آج بھی اس گہری گھاٹی کے حسن کو دوبالا کرتی ہے جس میں سے دریائے لاڈن بہتا ہوا مقدس الفیوس (جنوبی جزیرہ نمائے یونان پیلو پونیسس کا سب سے بڑا دریا) میں جا ملتا ہے اور چند سال پیشتر تک جن کا عکس فینیسس کی سنسان جھیل

کے سیاہی مائل نیلے پانی میں پڑتا رہتا تھا ۔ لیکن یہ درخت ان جنگلات کا بچا کھچا حصہ ہیں جو عہد کہن میں وسیع علاقوں کو ڈھانکے ہوئے تھے اور جو شاید قدیم تر زمانے میں جزیرہ نما ئے یونان پر سمندر سے سمندر تک محیط تھے ۔

گرِم نے (Grimm ، جرمن ماہر لسانیات جو انیسویں صدی میں گزرا ہے) لفظ 'ٹیمپل' (عبادت گاہ) کے تیوتانی مترادفات کی جو تحقیقات کی ہے اس سے یہ بات قرین قیاس ہو جاتی ہے کہ جرمنوں کے قدیم ترین معابد قدرتی بن تھے ۔ بہر کیف آریائی نسل کی ساری یورپی اقوام میں شجر پرستی کا رواج ایک مصدقہ چیز ہے ۔ کیلٹ قوم کے ڈروڈوں (کیلٹوں کے مذہبی رہنما اور جادوگر جو تناسخ پر اعتقاد رکھتے تھے) کی اوک پوجا یا بلوط پرستی سے سبھی واقف ہیں ۔ عبادت گاہ کے لیے ان کی زبان کے قدیم الفاظ اپنی اصل اور مفہوم کے لحاظ سے لاطینی لفظ نیمس (Nemus) کے مماثل ہیں ، جس کے معنی شجر زار یا بن میں کھلے میدان کے ہیں ۔ یہ مفہوم نیمی کے نام میں اب تک موجود ہے ۔ مقدس شجر زار قدیم زمانے کے جرمنوں کے ہاں عام تھے اور ان کے اخلاف میں شجر پرستی کا آج تک خاتمہ نہیں ہوا ۔ قدیم زمانے میں درختوں کی پرستش کس قدر سنجیدگی کے ساتھ ہوتی تھی ، اس کا کچھ اندازہ اس ظالمانہ سزا سے ہوتا ہے جو قدیم جرمن قوانین میں کسی درخت کی چھال اتارنے والے کے لیے مقرر تھی ۔ اس قانون کے بموجب ایسے مجرم کی ناف کاٹ کر نکال لی جاتی اور اس درخت میں ٹھونک دی جاتی جس کی چھال اتارنے کا وہ مرتکب ہوتا ۔ پھر اس کو درخت کے اطراف ہانکا جاتا تا آں کہ اس مجرم کی ساری انتڑیاں اس کے تنے سے لپٹ جاتیں ۔ اس سزا کا مقصد صاف یہ تھا کہ مردہ چھال کے بدلے مجرم کے جسم کا جان دار حصہ درخت پر لگا دیا جائے ۔ یہ ایک طرح کا قصاص تھا ، یعنی درخت کی جان کا بدلہ آدمی کی جان ۔ سویڈن کے قدیم مذہبی دارالسلطنت اپسالا میں ایک مقدس شجر زار تھا جس کے ہر شجر کی حیثیت ایک دیوتا کی سی تھی ۔ بت پرست سلافی درختوں اور شجر زاروں کو پوجا کرتے تھے ۔ اہل لیتھونیا چودھویں صدی تک اپنے قدیم

مذہب پر قائم تھے اور جس وقت انھوں نے عیسائی مذہب قبول کیا ہے ، ان کے ہاں درختوں کی پوجا ایک نمایاں چیز تھی ۔ ان میں بعض لوگ بلوط کے تناور درختوں اور دوسرے بڑے بڑے پیڑوں کا بہت احترام کرتے تھے جن سے انھیں غیب کے جوابات سنائی دیتے تھے اور بعض لوگ اپنے گاؤں اور گھروں کے آس پاس مقدس درختوں کے جھنڈ کھڑے رکھتے تھے جن میں سے ایک ڈالی بھی توڑنی گناہ تھی ۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے کسی شجر زار کی ٹہنی توڑنے والے کی یا تو اچانک موت واقع ہو جاتی ہے یا اس کے کسی عضو میں نقص آ جاتا ہے ۔ قدیم یونان اور اٹلی میں شجر پرستی کے ثبوت بہ کثرت ملتے ہیں ۔ مثلاً کاس کے مقام پر ایسلیپیس کے معبد میں سرو کی ٹہنی توڑنا ممنوع تھا جس کا جرمانہ ایک ہزار درہم تھا ۔ لیکن شاید سب سے زیادہ خود رومۃالکبریٰ میں مذہب کی یہ قدیم صورت محفوظ چلی آئی تھی ۔ فورم میں ، جو اہل روم کی سرگرمیوں کا مرکز تھا ، رمولس (بانیٔ روم) کے انجیر کے پودے کی عہد شہنشاہیت تک پرستش ہوتی رہی اور اس کے تنے کا مرجھا جانا سارے شہر میں سراسیمگی پھیلانے کے لیے کافی تھا ۔ اس کے علاوہ کوہ پیلیٹین (یہ شہر روم کی سات پہاڑیوں میں سے ایک کا نام ہے ، روم کے ابتدائی بادشاہ اسی پر قیام رکھتے تھے) کی ڈھلان پر ایک قرانیا (ایک درخت جس کا پھل زیتون کے برابر اور اس کے مشابہ ہوتا ہے) تھا جس کا روم کی مقدس ترین چیزوں میں شمار ہوتا تھا ۔ جب کبھی کوئی راہ گیر اس درخت کو پژمردہ دیکھ پاتا ، غل مچا دیتا ۔ گلی کوچوں میں لوگ اس کا ساتھ دیتے اور تھوڑی دیر میں ہر طرف سے ایک ہجوم پانی کی بالٹیاں لیے سراسیمگی کی حالت میں اس طرح بھاگتا نظر آتا (بہ قول پلوٹارک) جیسے کہیں آگ لگ گئی ہو ۔

یورپ میں فِنی اوگریائی نسل (شمال مشرقی یورپ کی سومی نسل) کے کافر قبیلے اپنی رسوم پرستش زیادہ تر مقدس شجر زاروں میں ادا کیا کرتے تھے جن کے ارد گرد ہمیشہ احاطہ کھینچا ہوتا ۔ ان کا پیڑ مندر اکثر محض چند درختوں سے گھرے ہوئے ایک کھلے میدان یا زمین کے کسی صاف قطعے پر مشتمل ہوتا اور کسی زمانے میں ان درختوں

پر قربانی کی کھالیں ٹنگی ہوتیں ۔ کم از کم قبائل والگا میں ایسے پیڑ مندر کا مرکز ایک مقدس شجر ہوتا جس کے آگے کسی کی کوئی حقیقت نہ تھی ۔ اس درخت کے سامنے اس کے پوجنے والے جمع ہوتے اور پروہت پوجا پاٹ کی رسم ادا کرتا ۔ اس کی جڑوں میں قربانی کی جاتی اور بعض وقت اس کی شاخوں سے منبر کا کام لیا جاتا ۔ اس شجرزار میں لکڑی کاٹنے یا کسی درخت کی ڈالی توڑنے کی اجازت نہ تھی اور اس میں عورتوں کا داخلہ ممنوع تھا ۔

لیکن یہاں ضروری ہے کہ کسی قدر تفصیل سے ان تصورات کی جانچ پڑتال کی جائے جن پر درختوں اور پودوں کی پرستش مبنی ہے ۔ وحشی عالم کو بالعموم ذی حیات تصور کرتا ہے اور پیڑ پودے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ۔ وہ اپنی طرح انھیں بھی ذی روح سمجھتا ہے اور اسی برتاؤ کا مستحق جو ذی روح مخلوق کے سزاوار ہو ۔ پورفری ، جو نبات خوری کا حامی تھا ، لکھتا ہے : ''کہتے ہیں عہد جاہلیت میں لوگوں کی زندگی اجیرن تھی اس لیے کہ ان کے دائرۂ توہمات میں جانور تو جانور پودے بھی داخل تھے ، لہذا وہ سمجھتے تھے کہ بیل یا بھیڑ کو ذبح کرنا بلوط یا صنوبر کے کاٹنے سے زیادہ برا فعل کیوں ہو جب کہ ان درختوں کے اندر بھی روح موجود ہے ؟'' اسی طرح شمالی امریکہ کی ہیڈاٹسا قوم کا یہ عقیدہ ہے کہ فطرت کی ہر شے ذی روح ہے یا یوں کہیے کہ اس پر روح کا سایہ ہے ۔ ان سایوں کا کچھ نہ کچھ لحاظ یا ادب واجب ہے ۔ مثال کے طور پر سیمل کے پیڑ کے متعلق ، جو میسوری کی بالائی وادی میں سب سے بڑا درخت ہے ، یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر ایسی ذہنی صلاحیت رکھتا ہے کہ اگر اس سے مناسب طور پر رجوع کیا جائے تو بعض کاموں میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے ۔ لیکن ان کے ہاں جھاڑیوں اور گھاس والی روح یا سائے کی کوئی اہمیت نہیں ۔ جس وقت موسم بہار میں بارش یا برف پگھلنے کے سبب دریائے میسوری چڑھ آتا ہے اور اپنے کناروں کے کچھ حصے کے ساتھ کسی اونچے درخت کو بہا لے جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ جب تک درخت کی جڑیں زمین میں گڑھی رہتی

ھیں اور اس کا تنا چھینٹے اڑاتا ھوا دریا میں گر نہیں پڑتا ، اس کی روح چیختی رھتی ھے ۔ امریکہ کے قدیم باشندے کسی زمانے میں ان قوی ھیکل پیڑوں میں سے کسی کو کاٹنا اچھا نہیں سمجھتے تھے اور انھیں لٹھوں کی ضرورت ھوتی تو وہ ایسے پیڑوں کو کام میں لاتے جو خود بخود گر پڑے ھوں ۔ کچھ عرصہ پیشتر تک ضعیف‌الاعتقاد بوڑھے علی الاعلان یہ کہتے تھے کہ ان کی قوم کی بہت سی مصیبتوں کا سبب موجودہ زمانے میں سیمل کے درختوں کے حقوق سے بے اعتنائی ھے ۔ اری کوئی قوم (ریاست نیویارک کے جنگ جو قبائل) کا عقیدہ تھا کہ ھر قسم کے درخت ، جھاڑی ، پودے اور جڑی بوٹی میں اس کی اپنی ایک روح موجود ھے اور اس قوم کے لوگ ان روحوں کا شکر ادا کیا کرتے تھے ۔ مشرقی امریکہ کے وارنیکا لوگوں کا خیال ھے کہ ھر درخت ، خاص کر ناریل کا درخت ذی روح ھے ۔ ''ان کے نزدیک کسی ناریل کے درخت کو برباد کرنا بمنزلہ مادر کشی کے ھے ، اس لیے کہ وہ ان کی اسی طرح پرورش کرتا ھے جس طرح ماں بچے کی کرتی ھو ۔'' سیامی راھب اس عقیدے کی بناء پر کہ ھر جگہ روحیں جاری و ساری ھیں اور کسی بھی چیز کو برباد کرنا کسی روح کو جبراً بے دخل کرنے سے عبارت ھے ، کسی درخت کی ٹہنی توڑنے سے اسی طرح احتراز کریں گے جس طرح ایک معصوم شخص کا بازو توڑنے سے ۔ یہ راھب بدھ مت والے جوگیوں کے سوا کوئی اور نہیں ۔ لیکن بدھ مت میں روحیت مظاھر یا نسبت (Animism) کا جو عنصر پایا جاتا ھے وہ کوئی فلسفیانہ نظریہ نہیں ، بلکہ محض ایک عام وحشانہ اعتقاد ھے جو مذھب کے ایک تاریخی نظام میں شامل کر لیا گیا ھے ۔ بینفے اور اس کے ھم خیال لوگوں کی یہ رائے کہ ایشیا کی غیر مہذب قوموں میں روحیت مظاھر یا نسمیت کے جو نظریے ملتے ھیں وہ بدھ مت سے ماخوذ ھیں ، حقیقت کے بالکل برعکس ھے ۔

بعض صورتوں میں صرف خاص قسم کے درختوں کو روحوں کا مسکن تصور کیا جاتا ھے ۔ ڈالمیشیا (آسٹریا) میں گربالج کے لوگ یہ کہا کرتے ھیں کہ بیچ ، بلوط اور دوسرے بڑے بڑے پیڑوں

میں بعض ایسے ھیں جن میں روحیں ودیعت کی گئی ھیں اور جو کوئی ان میں کسی پیڑ کو کاٹے اس کا وھیں مر جانا یا کم از کم عمر بھر کے لیے اپاھج ھو جانا لازمی ھے ۔ اگر کسی لکڑھارے کو یہ ڈر ھو کہ اس نے اس قسم کے کسی ذی روح درخت کو کاٹ ڈالا ھے تو اسے چاھیے کہ وہ اس پیڑ کی ٹھنٹھ پر اسی کلھاڑی سے جس سے اس نے کٹائی کی ھو ، ایک مرغا ذبح کرے ۔ ایسا کرنے سے اسے کوئی گزند نہیں پہنچنے پائے گا ، خواہ وہ پیڑ واقعی ذی روح ھی کیوں نہ ھو ۔ ریشمی روئی کے درخت ، جن کے زبردست تنے اس قدر اونچے نکلتے ھیں کہ دوسرے تمام درخت ان کے آگے پست ھو کر رہ جاتے ھیں ، سینیگل سے لے کر نائیجر تک سارے مغربی افریقہ میں مقدس سمجھے جاتے ھیں اور ان کے متعلق وھاں کے لوگوں کا یہ عقیدہ ھے کہ وہ کسی دیوتا یا روح کا ٹھکانا ھیں ۔ سلیوکوسٹ ( گنی ) کی ایو زبان بولنے والی قوموں میں اس بلند قامت درخت میں بسنے والا دیوتا ھنٹن کہلاتا ھے ۔ لیکن وہ ریشمی روئی کے ھر درخت کو اپنی سکونت سے عزت نہیں بخشتا ۔ جو خاص درخت اس کا مسکن ھوتے ھیں ، ان کے گرد کھجور کے پتوں کا حلقہ بنا دیا جاتا ھے اور مرغیوں ، نیز کبھی کبھی انسانوں کی بھینٹ اس کے تنے سے باندھ دی جاتی ھے ۔ اس درخت کو جس کی نشان دھی اس طرح کھجور کے پتوں کا حلقہ بنا کر کی گئی ھو ، کاٹنے یا کسی اور طرح گزند پہنچانے کی اجازت نہیں ۔ اس قسم کے ایسے درختوں کی کٹائی بھی ممنوع ھے جو ھنٹن کی روح سے خالی ھوں ، تا وقتیکہ لکڑھارا پہلے مرغیوں یا کھجور کے تیل کی بھینٹ چڑھا کر اس کی بے حرمتی کا کفارہ نہ دے دے ۔ اس بھینٹ کے چڑھانے میں فروگزاشت ایک ایسا جرم ھے جس کی سزا موت ھو سکتی ھے ۔ پنجاب میں کانگڑے کی پہاڑیوں میں ھر سال ایک لڑکی ایک پرانے دیودار کے درخت پر بھینٹ چڑھائی جاتی تھی ۔ یہ لڑکی دیہات کے کنبے باری باری فراھم کرتے ۔ چند سال ھوئے اس درخت کو کاٹ ڈالا گیا ۔

اگر درخت ذی روح ھوں تو ان کا حساس ھونا بھی ضروری ھے ،

اس کی وجہ سے ان کی کٹائی ایک نازک عمل جراحی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں مریض کے احساسات کا لحاظ کرتے ہوئے پوری پوری احتیاط برتنی چاہیے، ورنہ جراح اناڑی ہو تو وہ الٹ کر اس کا کچومر نکال دیں گے۔ جب بلوط کے کسی درخت کی کٹائی کی جاتی ہے تو ''اس کی آہ و بکا میلوں سنی جا سکتی ہے، جیسے بلوط کی روح فریاد کرتی ہو۔ ای۔ وائلڈ صاحب نے یہ فریاد بارہا سنی ہے''۔ اوجبوے قبیلے کے لوگ ''شاید ہی کبھی کسی سرسبز درخت کو کاٹتے ہوں، ان کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے اس درخت کو تکلیف ہوتی ہے اور ان کے بعض طلسم گروں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے کلہاڑی کی دھار کے تلے درختوں کی گریہ و زاری سنی ہے۔'' ایسے درختوں کا ذکر چینی کتابوں بلکہ مستند تاریخوں میں بہ کثرت ملتا ہے جو کاٹنے یا جلانے سے لہو لہان ہو جاتے ہیں یا درد و کرب یا غم و غصہ سے چیخنے لگتے ہیں۔ آسٹریا کے بوڑھے کسانوں کا اب تک اس بات پر اعتقاد ہے کہ جنگل کے درخت ذی روح ہوتے ہیں اور وہ بلا کسی خاص وجہ کے ان کی چھال چیرنے نہیں دیتے۔ انہوں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ درخت اپنی خراش کو اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی زخمی آدمی اپنے زخم کو۔ جب وہ کسی درخت کی کٹائی کرنے لگتے ہیں تو اس سے معافی مانگ لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بیلیٹنیٹ (جرمنی) کے بالائی علاقے میں بھی بوڑھے لکڑھارے اب تک کسی خوب صورت اور صحیح و سالم درخت کو کاٹنے سے قبل چپکے سے اس سے معذرت کر لیتے ہیں۔ اسی طرح جارکینو میں لکڑھارا جس درخت کو کاٹتا ہے اس سے معافی کا خواست گار ہوتا ہے۔ نوران (فیلپائن) کے الوکین کسی تازہ جنگل یا پہاڑیوں میں درختوں کی کٹائی سے پہلے کچھ اشلوک پڑھتے ہیں، جن کا مطلب یہ ہے ''اے عزیز! گھبرائیو مت، ہم تجھے کاٹتے ہیں کہ حکم سے مجبور ہیں۔'' اس کارروائی سے انہیں اپنے آپ کو ان روحوں کی عداوت سے محفوظ رکھنا مقصود ہے جو درختوں میں بستی ہیں اور جو بلاوجہ نقصان پہنچانے والوں کو کسی شدید مرض

میں مبتلا کرکے اپنا انتقام لیتی ہیں ۔ وسطی افریقہ کے باسوگا قبیلے کا خیال ہے کہ جب کوئی درخت کاٹا جاتا ہےتو اس میں سمائی ہوئی روح غضب ناک ہو جاتی ہے اور اس کے سردار کے کنبے کو ہلاک کر سکتی ہے ۔ اس آفت سے بچنے کے لیے وہ کسی درخت کی کٹائی سے پہلے کسی نیرنگ ساز یا طلسم‌گر سے مشورہ کر لیتے ہیں ۔ اگر یہ ماہر فن کٹائی کی اجازت دے دے تو لکڑھارا پہلے ایک مرغی اور بکری اس درخت کو پیش کرتا ہے اور اپنی کلہاڑی کی پہلی ضرب کی چیر پر منہ رکھ کر اس کا تھوڑا سا ست چوس لیتا ہے ۔ اس صورت سے ، جس طرح دو آدمی ایک دوسرے کا خون چوس کر خونی رشتے کے بھائی بن جاتے ہیں ، وہ اس درخت سے برادرانہ رشتہ جوڑ لیتا ہے ۔ اس کے بعد وہ اپنے پیڑ بھائی کو بلا خوف سزا کاٹ سکتا ہے ۔

لیکن نباتات کی روحوں سے یہ مودبانہ سلوک ہمیشہ نہیں ہوتا ۔ اگر میٹھے بول اور نرمی کا برتاؤ ان پر اثر نہ کرے تو بعض وقت ان پر سختی کی جاتی ہے ۔ شرق الہند میں ڈوریو کے درخت کا پھل ، جس کا سپاٹ تنا آٹھ یا نو فٹ اونچا ہوتا ہے ، نہایت خوش ذائقہ لیکن بڑا بودار ہوتا ہے ۔ ملایا والے اس پھل کے لیے اس درخت کی کاشت کرتے ہیں اور پتا چلا ہے کہ اس کی بار آوری کے لیے ایک خاص رسم ادا کی جاتی ہے ۔ سیلانگر میں جگرا کے قریب ڈوریو کا ایک چھوٹا سا باغ ہے ۔ دیہات کے لوگ ایک خاص جگہ مقرر کرکے اس باغ میں جمع ہوا کرتے ، جس کے بعد کوئی مقامی جادوگر اس درخت پر جو سب سے زیادہ بے ثمر ہوتا ، شدید ضربیں لگاتا اور اس کے ساتھ یہ کہتا جاتا ''بتا ، اب تو بار لائے گا یا نہیں ، اگر نہیں لائے گا تو میں تجھے کاٹ ڈالوں گا ۔'' اس کا جواب وہ درخت ایک اور شخص کی زبانی جو قریب ہی کسی منگوسٹین کے پیڑ پر چڑھا ہوتا ، (ڈوریو پر چڑھا نہیں جاتا) یہ دیتا ''میں اب ضرور بار لاؤں گا ، مجھے نہ کاٹو ۔'' اسی صورت سے جاپان میں درختوں کو ثمر ور کرنے کے لیے دو آدمی باغ میں پہنچتے ہیں ۔ ایک آدمی ایک درخت پر

چڑھ جاتا ہے اور دوسرا اس کے پیچھے کلہاڑی لیے کھڑا ہو جاتا ہے ، پھر یہ کلہاڑی والا اس درخت سے پوچھتا ہے کہ وہ آئندہ سال اچھی فصل دے گا یا نہیں؟ نیز وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اسے کاٹ کر گرا دیا جائے گا۔ اس کا جواب درخت کی شاخوں میں سے اس کا ساتھی یہ دیتا ہے کہ وہ اگلی فصل میں گھن گھنا کر بار لائے گا۔ باغ بانی کا یہ طریقہ ہمیں کچھ عجیب و غریب معلوم ہوگا، لیکن اس کی ہوبہو مثالیں یورپ میں بھی ملتی ہیں۔ کرسمس کی رات جنوبی سلیوونیا اور بلغاریہ کے متعدد کسان یہ کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک آدمی میوے کے کسی بانجھ درخت کو ڈرانے کے لیے اس پر کلہاڑی گھمانے لگتا ہے اور ایک اور کسان جو اس کے برابر کھڑا ہوتا ہے ، اس درخت کی سفارش یوں کرتا ہے ، ''اسے نہ کاٹو ، یہ جلد بار لے آئے گا۔'' تین مرتبہ اس پر کلہاڑی گھمائی جاتی ہے اور تین مرتبہ سفارش کرنے والے کسان کی استدعا پر اسے ضرب لگتے لگتے رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ خوف زدہ درخت ضرور پھل دے گا۔

درختوں کے ذی حیات ہونے کے بارے میں اس تصور کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ انھیں ایسے نر اور مادہ کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جن کا صحیح معنی میں شادی بیاہ ہو سکتا ہو اور یہ خیال نرا وہم نہیں ، اس لیے کہ جانوروں کی طرح درختوں میں بھی جنس ہوتی ہے اور وہ بھی اپنے ذکور و اناث کے اختلاط سے اپنی نوع کی افزائش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تمام اعلیٰ حیوانات میں ہر جنس کے مخصوص اعضا الگ الگ ہوتے ہیں ، وہاں بیشتر اشجار میں یہ صورت پائی جاتی ہے کہ کسی نوع کے منفرد درخت میں دونوں قسم کے اعضاء ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ تاہم یہ کلیہ عالم گیر نہیں ہے اور بہت سے پودے ایسے ہیں جن میں نر اور مادہ ایک دوسرے سے ممیز ہوتے ہیں۔ بعض وحشی اقوام نے ان کے اس جنسی فرق کا ضرور مشاہدہ کیا ہوگا ، کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ ''ماوری (پولینزشیا کی ایک قوم) درختوں وغیرہ کی جنس سے واقف ہیں اور ان لوگوں کے ہاں درختوں

کے نر اور مادہ الگ الگ ناموں سے موسوم کیے جاتے ہین ۔'' قدیم زمانے کے لوگوں کو کھجور کے نخل کے جنسی فرق کا علم تھا اور وہ نر کے پھول کا زیرہ مادہ کے پھول پر چھڑک کر اس نخل کو مصنوعی طور پر پھلایا کرتے تھے ۔ ان کی پھلائی کا یہ عمل موسم بہار میں کیا جاتا تھا ۔ ہاران (شام) کے بت پرستوں میں وہ مہینہ جس مین نخول کو ثمر ور کیا جاتا تھا ''کھجوروں کا مہینہ'' کہلاتا تھا اور اسی زمانے میں وہ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کے بیاہ کا تیوہار مناتے تھے۔ کھجور کے درخت کے اس حقیقی اور ثمر ورانہ اتحاد سے بالکل مختلف پودوں کی وہ بے حقیقت اور بے نتیجہ شادیاں ہیں جو ہندو توہمات میں اپنا ایک حصہ ادا کرتی ہیں ۔ مثال کے طور پر اگر کسی ہندو نے امرائی لگائی ہو تو جب تک وہ اس میں کے کسی آم کے پیڑ کو دولہا بنا کر اس کا کسی اور قسم کے پیڑ سے بیاہ نہ کر دے ، وہ اور اس کی بیوی اس امرائی کا آم نہیں کھا سکتے ۔ اس بیاہ میں دلہن عموماً املی کا پیڑ ہوتا ہے ، جو عموماً امرائی ہی میں آم کے درخت کے قریب نمو پاتا ہے ۔ لیکن اگر املی نہ ہو تو پھر موتیا دلہن کا کام دے سکتی ہے ۔ اس قسم کے بیاہ کا خرچ اکثر خاصا ہوتا ہے ، اس لیے کہ اس موقع پر جتنے زیادہ برہمنوں کی ضیافت کی جائے گی اتنی ہی امرائی کے مالک کی شان بڑھے گی ۔ ایک ہندو خاندان کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے آم اور موتیا کا دھوم دھام سے بیاہ رچانے کے لیے اپنے سونے چاندی کے زیور بیچ دیے تھے اور جس قدر قرضہ مل سکا وہ سب اس پر لگا دیا تھا ۔ کرسمس کی رات جرمن کسان درختوں کو پھلانے کے لیے انہیں پرال کی رسی سے باندھ دیتے تھے اور اسے وہ ان کی شادی پر محمول کرتے تھے ۔

مالوکاز (جزائر اسپائس جو سلیبیز اور پاپوا کے درمیان واقع ہیں) میں جب لونگ کے درختوں پر پھول آتا ہے تو ان کے ساتھ حاملہ عورتوں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے ۔ ان کے قریب کوئی شور نہیں مچا سکتا ، رات کو ان کے پاس سے آگ یا روشنی لے کر گزرنے کی اجازت نہیں ، کوئی شخص ان کے آگے ٹوپی پہنے نہیں آ سکتا اور سب کو ان کے آگے

برہنہ سر رہنا پڑتا ہے۔ یہ سب احتیاطیں اس لیے برتی جاتی ہیں کہ کہیں وہ درخت خوف زدہ ہو کر بار لانا نہ چھوڑ دے یا اس کا بار کسی دہشت زدہ عورت کے اسقاط حمل کی طرح قبل از وقت نہ جھڑ جائے۔ مشرق میں بڑھتے ہوئے دھان کا بھی حاملہ عورت کی طرح خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ چناں چہ امبوئنا (مولا کاز) میں جب دھان شباب پر ہوتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اسے حمل ہے اور اس کے کھیتوں کے قریب بندوق چلانے یا شور مچانے سے احتراز کرتے ہیں۔ انھیں یہ خوف ہوتا ہے کہ اس سے کہیں چاول گھبرا کر جھڑ نہ جائے اور فقط بھوسا ہی بھوسا نہ رہ جائے۔

بعض صورتوں میں عقیدہ یہ ہے کہ مردوں کی روحیں درختوں کو زندگی بخشتی ہیں۔ وسطی افریقہ کا ڈائری قبیلہ بعض درختوں کو نہایت مقدس سمجھتا ہے، جن کے متعلق اس کا یہ خیال ہے کہ وہ اس کے متوفی بزرگوں کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ چناں چہ ایسے درختوں کا ذکر بڑے ادب سے کیا جاتا ہے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی کٹنے یا جلنے نہ پائے۔ اگر وہاں کے آبادکار اس قبیلے کے لوگوں سے ان درختوں کو کٹوانا چاہتے ہوں تو وہ اس کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو انھیں بد نصیبی کا منہ دیکھنا اور اپنے آبا و اجداد کی حفاظت نہ کرنے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ جزائر فلپائن کے بعض باشندوں کے عقیدے کی رو سے چند درخت ایسے ہیں جن میں ان کے اسلاف کی روحیں بستی ہیں، اس لیے وہ ان کی جان نہیں لیتے۔ اگر انھیں ان میں سے کسی درخت کی کٹائی کرنی پڑ جائے تو وہ اس سے یہ کہہ کر معافی مانگ لیتے ہیں کہ انھوں نے اپنے پیشوا کے کہنے سے ایسا کیا تھا۔ روحیں اپنے رہنے کے لیے بلند قامت اور پھیلے ہوئے شان دار درختوں کو منتخب کرتی ہیں۔ ہوا میں ان کے پتوں کی سرسراہٹ کو جزائر مذکورہ کے باشندے روح کی آواز سمجھتے ہیں اور وہ جب بھی ایسے کسی درخت کے قریب سے گزرتے ہیں تو اس کے آگے ادب سے سر جھکا دیتے ہیں،

اور اس کے آرام میں مخل ہونے کی معافی مانگتے ہیں ۔ اگنوروٹ قوم میں ہر گاؤں کا ایک مقدس درخت ہوتا ہے جس میں اس گاؤں کے لوگوں کے اسلاف کی روحیں رہتی ہیں ۔ اس درخت پر نذریں چڑھائی جاتی ہیں اور ان لوگوں کے عقیدے کے بموجب اگر اسے کوئی گزند پہنچے تو گاؤں پر کوئی نہ کوئی آفت آنی ضروری ہے اور اگر اس درخت کو کاٹ دیا جائے تو سارے گاؤں والوں کا خاتمہ ناگزیر ہے ۔

کوریا میں جو لوگ وبا میں یا سڑک کے کنارے مرتے ہیں یا جن عورتوں کی موت زچگی میں واقع ہوتی ہے ، ان کی روحیں ہمیشہ درختوں کو اپنا مسکن بناتی ہیں ۔ ایسی روحوں کو کیک ، شراب اور لحم خنزیر (سؤر کا گوشت) کی نذر پیش کی جاتی ہے ، جسے درختوں کے نیچے لگے ہوئے ڈھیر پر رکھ دیا جاتا ہے ۔ چین میں قدیم الایام سے قبروں پر درخت لگانے کا دستور رہا ہے تاکہ مردوں کی روحوں کو تقویت پہنچائی جائے اور اس طرح ان کے جسم سڑنے نہ پائیں اور چوں کہ سدا بہار سرو اور صنوبر میں قوت حیات سب سے زیادہ ہوتی ہے ، لہذا انہیں اس مقصد کے لیے دوسروں پر ترجیح دی گئی ہے ۔ اسی وجہ سے ان درختوں کو جو قبروں پر نمو پاتے ہیں ، متوفی اشخاص کی روحیں سمجھا جاتا ہے ۔ میاؤ کیا نسل کے لوگوں کے ہاں ، جو جنوبی اور مغربی چین کے اصلی باشندے ہیں ، ہر گاؤں کے دروازے پر ایک مقدس درخت کھڑا ہے جس میں گاؤں والوں کے عقیدے کے بموجب ان کے جد اعلیٰ کی روح بستی ہے اور ان کی تقدیر اسی درخت کے تابع ہے ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گاؤں کے قریب کسی مقدس شجرزار میں درخت اپنی اپنی جگہ کھڑے مرجھانے اور سوکھ سوکھ کر گرنے کے لیے چھوڑ دیے جاتے ہیں ۔ ان کی شکستہ شاخوں سے زمین پٹ جاتی ہے ، جنھیں کوئی شخص ہٹا نہیں سکتا تا وقتیکہ وہ درخت کی روح سے اس کی اجازت نہ مانگ لے اور اسے بھینٹ نہ دے دے ۔ جنوبی افریقہ کی ماروے قوم میں قبرستان کی حیثیت ایک مقدس مقام کی ہے ، جس میں کسی درخت کا کاٹنا یا چوپائے کا مارنا ممنوع ہے ، اس لیے کہ اس میں ہر چیز مردوں کی

روحوں کا مسکن سمجھی جاتی ہے ۔

اگر ان سب میں نہیں تو بیشتر صورتوں میں روح کو درخت کا جزو لاینفک تصور کیا جاتا ہے ، جو درخت کو حیات بخشتا ہے اور جس کا درخت کے ساتھ مصیبت جھیلنا اور فنا ہو جانا لازمی ہے ۔ لیکن ایک اور رائے کے بموجب جو غالباً بعد میں قائم کی گئی ہے ، درخت کی حیثیت جسم کی نہیں بلکہ وہ محض روح کے ٹھکانے سے عبارت ہے ، جسے وہ جب چاہے چھوڑ سکتی ہے اور جب چاہے اس میں لوٹ کر آ سکتی ہے ۔ شرق الہند کے ایک جزیرے سیاو کے لوگ بعض روحوں پر اعتقاد رکھتے ہیں ، جو جنگلوں یا اونچے اونچے تنہا پیڑوں میں بسیرا کرتی ہیں ۔ چاند کی چودھویں کو روح اپنی کمین گاہ سے نکل کر گشت لگاتی ہے ۔ اس کا منہ بڑا ، ہاتھ پاؤں لمبے لمبے اور جسم بھاری بھرکم ہوتا ہے ۔ ان صحرائی روحوں کو رام کرنے کے لیے لوگ کھانے ، مرغیوں ، بکریوں وغیرہ کی بھینٹ لے کر ان جگہوں پر جاتے ہیں جنھیں روحوں کا مرجع خیال کیا جاتا ہے ۔ نیاس کے لوگوں کا خیال ہے کہ کسی درخت کے مرنے پر اس کی روح پرواز کرتی ہے تو بھوت بن جاتی ہے ، جو کسی ناریل کے درخت پر آتر آئے تو اس کی جان چلی جائے اور کسی گھر کے ستون پر آ بیٹھے تو اس کے بچوں کا خاتمہ ہو جائے ۔ نیز وہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ بعض درختوں میں آوارہ گرد شیاطین بسے رہتے ہیں ۔ اگر ان درختوں کو ضرر پہنچے تو وہ آزاد ہو کر آزار رسانی کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں ، اس لیے اس جزیرے کے لوگ ان درختوں کا بڑا احترام کرتے ہیں اور انھیں کبھی نہیں کاٹتے ۔

آسیب زدہ درختوں کی کٹائی پر جو رسمیں ادا کی جاتی ہیں ان میں بہت سی اس عقیدے پر مبنی ہیں کہ ان درختوں کو اپنی مرضی یا ضرورت سے چھوڑنا روحوں کے اختیار میں ہے ۔ چناں چہ جب جزائر پی لو (خلیج کارپنٹریا ، شمالی آسٹریلیا) کے باشندے کسی درخت کی کٹائی کرتے ہیں تو وہ اس کی روح کو جادو کرکے کسی اور درخت پر اڑا دیتے ہیں ۔ سلیوکوسٹ کا حبشی ، جو کسی اشورین کے

درخت کو کاٹنا چاہتا ہو ، لیکن جانتا ہو کہ جب تک اس پر روح موجود ہے وہ ایسا نہیں کر سکتا ، تو زمین پر کھجور کا کچھ تیل رکھ دیتا ہے جیسے شکار کو دانہ ڈالتا ہو اور پھر جب وہ روح اپنے اس من بھاتا کھاجے پر آتر آتی ہے تو اس کے گھر کو ڈھانے کے لیے جھپٹ پڑتا ہے ۔ اسی طرح سلیبیز کے ٹوبوں کو جس وقت دھان بونے کے لیے جنگل میں کسی زمین کے قطعے کو صاف کرنے لگتے ہیں تو ایک ننھا سا مکان بناتے ہیں اور اس میں چھوٹے چھوٹے کپڑے ، کچھ کھانا اور سونا رکھ دیتے ہیں ، پھر جنگل کی تمام روحوں کو بلا کر انھیں وہ مکان تمام چیزوں سمیت پیش کر دیتے ہیں اور ان کی منتیں کرتے ہیں کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ جائیں ۔ اس کے بعد یہ لوگ وہاں بڑے اطمینان سے کٹائی کر سکتے ہیں ، جس میں اُنھیں اپنے زخمی ہونے کا کوئی خطرہ نہیں رہتا ۔ سلیبیز کے ایک اور قبیلے کے لوگ ، جس کا نام ٹومورِی ہے ، کسی اونچے درخت کی کٹائی کرنے سے پہلے پان کا ایک بیڑا اس کی جڑ میں رکھ دیتے ہیں اور اس میں بسی ہوئی روح سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنا ٹھکانا بدل دے ۔ نیز وہ اس درخت کے تنے سے ایک چھوٹی سی سیڑھی لگا دیتے ہیں تاکہ روح بہ حفاظت آتر آئے ۔ سوماٹرا کے مینڈلنگ اس قسم کی تمام بد اعمالیوں کا الزام ولندیزی حکام کے سر رکھ دیتے تھے ۔ چناں چہ جب ان میں سے کوئی شخص جنگل میں سڑک بنا رہا ہو اور اسے کسی ایسے درخت کو کاٹنا پڑ جائے جو راستے میں حائل ہو تو وہ جب تک یہ نہ کہہ لے گا کلہاڑی نہیں چلائے گا : ''اس درخت میں بسنے والی روح ! اگر میں تیرے گھر کو گراؤں تو تو برا نہ مان ، اس لیے کہ میں کنٹرولر کے حکم سے ایسا کرتا ہوں ، اس میں میری مرضی کو کوئی دخل نہیں ۔'' اور جو وہ جنگل میں زمین کا کوئی ٹکڑا کاشت کرنے کی غرض سے صاف کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس مقام کی صحرائی روحوں سے ان کے ہرے بھرے مسکن گرانے سے پہلے اس بات پر مفاہمت کرلے ۔ چناں چہ اس مقصد سے شخص مذکور اس قطعۂ زمین کے بیچوں بیچ چلا جاتا ہے اور جھک

کر کوئی خط اٹھانے کا بہانہ کرتا ہے ، پھر کاغذ کا ایک پرزا کھول کر ولندیزی حکومت کا ایک خیالی مکتوب بلند آواز سے پڑھتا ہے ، جس میں اس پر سخت تاکید کی جاتی ہے کہ وہ بلا تاخیر زمین کی صفائی کا کام شروع کر دے ۔ یہ کر چکنے کے بعد وہ کہتا ہے ''روحو ! سنتی ہو؟ مجھے فی‌الفور صفائی شروع کر دینی چاہیے ، ورنہ میرا سر قلم کر دیا جائے گا ۔''

کسی درخت کے گر چکنے اور اس کے تختے کٹ کر مکان میں لگ چکنے کے بعد بھی اس بات کا امکان رہتا ہے کہ صحرائی روح شہتیروں وغیرہ میں چھپ رہی ہو ۔ لہذا بعض لوگ ایسے مکان میں سکونت اختیار کرنے سے پہلے یا اس کے بعد اس روح کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ چناں چہ جب کوئی نیا گھر تیار ہوتا ہے تو سلیبیز کے ٹوراڈجا ایک بکری ، سؤر یا بھینس مار کر اس کا خون عمارت میں لگی ہوئی لکڑی پر مل دیتے ہیں ۔ اگر وہ عمارت لوبو یا روح کا نشیمن ہو تو لکڑی پر مرغی یا کتا لے جا کر مارا جاتا ہے ، تاکہ اس کا خون عمارت کی دونوں جانب بہہ نکلے ۔ ٹوناپو ، جو ٹوراڈجاؤں سے زیادہ وحشی ہیں ، ایسی صورت میں عمارت کی چھت کے اوپر قربانی کرتے ہیں ۔ لوبو یا معبد کی چھت پر اس قربانی کی غرض و غایت وہی ہے جو کسی معمولی مکان میں لگی ہوئی لکڑی پر خون ملنے کی ، یعنی جنگل کی ان روحوں کی رضا جوئی جو عمارت کی لکڑی میں چھپی رہ گئی ہوں ۔ اس صورت سے ان روحوں کو ہموار کر لیا جاتا ہے تاکہ وہ عمارت کے مکینوں کو کوئی گزند نہ پہنچائیں ۔ سلیبیز اور جزائر مالوکاز کے لوگ جو اس بات سے بہت ڈرتے ہیں کہ کہیں کسی مکان کی تعمیر میں اس کا ستون الٹا نہ نصب ہو جائے ، اس کا بھی یہی کچھ سبب ہے ۔ کیوں کہ یہ لازمی امر ہے کہ صحرائی روح جو لکڑی میں رہ گئی ہو ، اپنی اس اہانت پر ناراض ہو جائے گی اور اس کے مکینوں کو بیماری میں مبتلا کر دے گی ۔ بورنیو کے کاینوں کی رائے میں شجری روحوں کو اپنی عزت کا بڑا پاس ہوتا ہے اور اگر انھیں کوئی آزار پہنچتا ہے تو وہ آدمی کو اس کا مزہ چکھا دیتی ہیں ۔

چناں چہ کوئی مکان بنانے کے بعد ، جس میں انھیں بہت سے درختوں کے ساتھ بری طرح پیش آنا پڑتا ہے ، یہ لوگ سال بھر تک اس کی تلافی کرتے ہیں اور اس میں انھیں بہت سی چیزوں کا پرہیز ہوتا ہے ، جیسے ، ریچھ شیر ، بلی اور سانپ کا مارنا ۔

(۲) شجری روحوں کی برکتیں — جب کسی درخت کو اپنی روح کے جسمانی مظہر کی بجائے شجری روح کا محض ایک ایسا ٹھکانا تصور کیا جانے لگے جسے وہ اپنی مرضی سے چھوڑ سکتی ہو تو مذہبی فکر میں ترقی کا ایک نہایت اہم قدم آگے بڑھتا ہے اور روحیت مظاہر کا عقیدہ کثرت الہ کے عقیدے سے بدل جاتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں اپنے مذہبی ارتقاء کے اس مرحلے پر انسان کو ہر درخت ایک ذی‌حیات اور باشعور ہستی کی بجائے ایک ایسا ڈھیر دکھائی دینے لگتا ہے جسے طویل یا مختصر مدت کے لیے کسی مافوق ہستی نے اپنا مسکن بنا رکھا ہو ۔ اور چوں کہ یہ روح اس نئے عقیدے کی رو سے آزادانہ شجر بہ شجر منتقل ہو سکتی ہے ، اس لیے اسے درختوں پر قبضے یا ملکیت کا ایک خاص حق حاصل ہو جاتا ہے اور وہ کسی ایک درخت کا عنصر نہیں رہتی بلکہ بن دیوتا بن جاتی ہے ۔ جیسے ہی شجری روح اس طرح ہر درخت سے ایک حد تک علیحدہ کر دی جاتی ہے ، اپنی صورت بدلنے اور ابتدائی عہد کے عام فکری رجحان کے مطابق ، جس کی بناء پر مجرد قسم کی تمام روحانی ہستیاں آدمی کا روپ دھار لیتی ہیں ، انسانی جسم میں ظاہر ہونے لگتی ہے ۔ چناں چہ کلاسیکی فن میں صحرائی معبود انسانی شکل میں پیش کیے گئے ہیں ، جن کی شجری خصوصیت کو ایک آدھ شاخ یا اسی قسم کی کوئی اور علامت ظاہر کرتی ہے ۔ لیکن صورت کی اس تبدیلی سے شجری روح کی اصلیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ وہ کسی درخت کے جزو بدن یا عنصر کی حیثیت سے آگے جن قوتوں کی حامل ہوتی تھی ، وہ نخلستانی دیوتا بننے کے بعد بھی اس میں برقرار رہتی ہیں ۔ میں اب اس کا مفصل ثبوت پیش کرنے کی کوشش کروں گا ۔ اس سلسلے میں ایک تو میں یہ بتاؤں گا

کہ ایسے درختوں کے متعلق جنھیں ذی روح ہستیوں کی نظر سے دیکھا جاتا ہو ، یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مینہ برسانے ، دھوپ نکالنے ، مویشی کی افزائش کرنے اور عورتوں کی گود ہری کرنے کی قوتیں رکھتی ہیں ۔ دوسرے یہ کہ بعینہ یہی قوتیں تشبیہی یا زندہ انسانوں کی صورت میں متشکل ہستیوں کی حیثیت سے شجری دیوتاؤں سے بھی منسوب کی جاتی ہیں ۔

آئیے تو پہلے ذی روح موجودات کی حیثیت سے درختوں یا شجری روحوں کی قوتوں پر غور کیا جائے ۔ ان کے بارے میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ وہ مینہ برساتی یا دھوپ نکالتی ہیں ۔ چناں چہ پریگ کا جیروم نامی مبلغ جس وقت لیتھونیا کے بت پرستوں کو اس بات کی تلقین کر رہا تھا کہ وہ اپنے مقدس شجرزاروں کو کاٹ ڈالیں تو عورتوں کا ایک ہجوم لیتھونیا کے فرماں روا کے پاس پہنچا اور اس سے استدعا کی کہ جیروم کو اپنی تبلیغ سے باز رکھا جائے ۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بنوں کے ساتھ دیوتا کے اس گھر کی بربادی کے درپے ہے جس سے انھیں دھوپ اور بارش ملتی رہی ہے ۔ آسام کے منڈاری سمجھتے ہیں کہ اگر ان کے مقدس شجرزار کا کوئی درخت کاٹ ڈالا جائے تو بن کے دیوتا خفا ہو کر بارش روک دیتے ہیں ۔ برما میں ضلع ساگا انگ کے ایک گاؤں مونیو کے لوگ بارش کے لیے اپنے گاؤں کے قریب سب سے بڑا املی کا پیڑ چن کر اسے اس روح (ناٹ) کے مسکن کے نام سے موسوم کرتے جو بارش پر حکومت کرتی ہے ۔ پھر وہ روئی ، ناریل ، کیلے اور مرغیاں اپنی اس مینہ برسانے والی محافظ روح کی نذر کرتے اور اس سے یہ پرارتھنا کرتے ”اے خداوند ناٹ ! ہم غریب خاکیوں پر رحم کر اور بارش نہ روک ! ہم نے تجھے دل کھول کر بھینٹ دی ہے ، تو بھی دن رات مینہ برسا دے ۔“ اس کے بعد اس املی پر کوئی چیز از قسم مشروبات نذر چڑھائی جاتی اور پھر تین سن رسیدہ عورتیں عمدہ لباس زیب تن کیے اور گلوبند اور بندے پہنے بارش کا گیت گاتیں ۔

اس کے علاوہ شجری روحیں فصلوں کو نمو بخشتی ہیں ۔ منڈاریوں کے ہاں ہر گاؤں کا ایک مقدس شجرزار ہے اور '' شجری معبودوں پر فصلوں کی افزائش کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور تمام بڑے بڑے فصلی تیوہاروں میں انہیں خاص عزت بخشی جاتی ہے ۔'' گولڈ کوسٹ کے حبشیوں میں بعض اونچے اونچے درختوں کی جڑوں میں قربانی کرنے کا رواج ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی درخت کو کاٹ ڈالا جائے تو دھرتی کے سارے پھل پھول ملیا میٹ ہو جائیں ۔ گلا جوڑیاں بنا کر مقدس درختوں کے گرد رقص کرتے ہیں اور ان سے اچھی فصل کی پرارتھنا کرتے ہیں ۔ ان میں ہر جوڑی ایک عورت اور ایک مرد پر مشتمل ہوتی ہے ، جو ایک لکڑی کے سرے پکڑے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں اور ان کی بغلوں میں اناج کے تازہ پودے اور ہری گھاس دبی ہوتی ہے ۔ سویڈن کے کسان اپنے اناج کے کھیتوں کی ہر ریگاری میں ایک ہری بھری ٹہنی گاڑ دیتے ہیں ۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ان کے ایسا کرنے سے فصل وافر ہوگی ۔ یہی تصور جرمنوں اور فرانسیسیوں کی حاصل بہار والی رسم میں نظر آتا ہے ۔ حاصل بہار (Harvest may) اناج کے بھٹوں سے سجی ایک لمبی سی شاخ یا سالم درخت ہوتا ہے ، جسے فصل والے کھیت سے آخری ویگن میں لایا جاتا ہے اور کھتے کی چھت سے باندھ دیا جاتا ہے جہاں وہ سال بھر رکھی رہتی ہے ۔ مان ہارٹ نے ثابت کیا ہے کہ یہ درخت یا شاخ اس شجری روح کا مظہر ہے جو نباتات کے عام جوہر سے عبارت ہے اور جس کی حیات بخش اور بارآور قوت سے اس طرح اناج کو متاثر کیا جاتا ہے ۔ چناں چہ سوبیبا (جرمنی) میں حاصل بہار کو کھیت میں کھڑے باقی ماندہ پودوں سے باندھ دیا جاتا ہے ۔ دوسرے مقامات پر اسے اناج کے کھیت میں نصب کر دیا جاتا ہے اور وہ پولی ، جو سب سے آخر میں کاٹی گئی ہو ، اس کے تنے سے باندھ دی جاتی ہے ۔

اس کے علاوہ ، شجری روح جانوروں کی افزائش اور عورتوں کو اولاد عطا کرتی ہے ۔ شمالی ہند میں آنولے کا درخت ایک مقدس شجر

کی حیثیت رکھتا ہے ۔ پھاگن (فروری) کی گیارہ تاریخ کو اس کی جڑوں میں دھار (Libatoin) چڑھائی جاتی ہے ۔ اس کے تنے سے ایک زرد ڈوری لپیٹی جاتی ہے اور عورتوں، جانوروں اور فصلوں کی باروری کے لیے پرارتھنا کی جاتی ہے ۔ نیز شمالی ہند میں ناریل کا شمار مقدس ترین پھلوں میں ہوتا ہے اور وہ سری پھل یا لکھشمی دیوی کا میوہ کہلاتا ہے اور زرخیزی کی علامت ہے ۔ شمالی ہند کے طول و عرض میں پجاری اسے مندروں میں رکھتے ہیں اور ان عورتوں کو دیتے ہیں جو اولاد کی خواہش مند ہوں ۔ پرانے کیلے بار (ساحل گنی) کے قریب قصبۂ کوا میں کھجور کا ایک درخت تھا ؛ اگر کوئی بانجھ عورت اس کی ایک کھجور توڑ کر کھا لیتی تو اس کا با مراد ہونا یقینی تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں شجر بہار یا بیساکھے (May-po'e) ، یہ ایک بانس یا بلی ہوتی ہے جسے یوم بہار پر یعنی مئی کی پہلی تاریخ کو پھولوں سے سجا کر اس کے گرد رقص کیا جاتا ہے ۔ ہم نے اس کے لیے ''بیساکھے'' کا لفظ اس لیے منتخب کیا ہے کہ ہندؤوں کے ہاں غالباً بیساکھ کی ایک رسم میں ایک بلی پرتشٹھ کی جاتی ہے جسے بیساکھا کہا جاتا ہے ۔ بیساکھ کے مہینے کے کچھ دن مئی کے اوائل میں پڑتے ہیں) کے متعلق بھی یہ خیال ہے کہ وہ اپنے اندر عورتوں اور مویشی کو بارور کرنے کی بھی قوتیں رکھتا ہے ۔ چناں چہ جرمنی کے بعض حصوں میں پہلی مئی کو کسان طویلے اور گوسالہ کے دروازوں پر ہر گھوڑے یا گائے کے لیے ایک ایک شجر بہار نصب کر دیتے ہیں ۔ ان کی دانست میں ایسا کرنے سے گائے بہت دودھ دیتی ہے ۔ آئرستان والوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ''ان کے خیال میں یوم بہار پر کسی پیڑ کی ہری بھری ٹہنی مکان سے باندھ دی جائے تو اس سال گرمیوں میں دودھ افراط سے پیدا ہوگا ۔''

بعض وینڈ (شمال مشرقی جرمنی کے باشندے) جولائی کی دوسری تاریخ کو گاؤں کے بیچوں بیچ ایک شجر بلوط نصب کر دیا کرتے تھے ، جس کی انی پر ایک آہنی مرغ بندھا ہوتا ۔ پھر وہ اس کے اطراف رقص کرتے اور اپنے مویشی کو افزائش نسل کی غرض سے اس کے گرد

گھاتے ۔ سرکیشیا (روس) والے ناشپاتی کے درخت کو مویشی کا محافظ سمجھتے ھیں ۔ چناں چہ جنگل میں پہنچ کر وہ اس کا ایک پودا کاٹتے ھیں اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے گھر لاتے ھیں ، جہاں ایک دیوتا کی طرح اس کا بڑا احترام کیا جاتا ھے ۔ ان کے ھاں تقریباً ھر گھر میں ایسا ایک شجر ھوتا ھے ۔ خزاں کے تیوھار کے دن اس شجر کو باجے گاجے کے ساتھ سارے گھر والوں کے خوشی کے نعروں کی گونج میں ، جو اس کے ورود سعود پر اسے سلام کرتے ھیں ، بڑے دھوم دھڑکے سے گھر میں لایا جاتا ھے ۔ پھر اسے موم بتیوں سے ڈھانک دیا جاتا ھے اور اس کی انی پر پنیر باندھ دی جاتی ھے ۔ اس کے گرد سب بیٹھ جاتے ھیں اور کھاتے پیتے اور گاتے بجاتے ھیں ۔ اس کے بعد اسے الوداع کہہ کر گھر کے صحن میں واپس لے جایا جاتا ھے ، جہاں وہ دیوار کے سہارے سال بھر کھڑا رھتا ھے اور اس دوران میں اس کا کوئی ادب نہیں ھوتا ۔

ماوریوں کے توھو قبیلے میں ''درختوں سے عورتوں کو اولاد بخشنے کی قوت منسوب کی جاتی ھے ، جنھیں وہ اپنے بعض خاص اسلاف کی نالوں سے وابستہ سمجھتے ھیں ، اس لیے کہ کچھ عرصہ پیشتر تک تمام بچوں کی نالیں ان پر لٹکائی جاتی رھی ھیں ۔ بانجھ عورت کو ایسے کسی درخت سے چمٹنا پڑتا ، اور اگر وہ اس کے مشرقی رخ سے ھم کنار ھوتی تو لڑکا پاتی اور مغربی رخ سے ھم کنار ھوتی تو لڑکی ۔'' یورپ میں یوم بہار پر کسی کنواری محبوبہ کے گھر کے سامنے یا اس کے اوپر جھاڑی نصب کرنے کا جو عام دستور ھے اس کی بناء غالباً یہ عقیدہ ھے کہ شجری روح کے اثر سے عورتوں میں قوت تولید پیدا ھوتی ھے ۔ بویریا کے بعض حصوں میں اس قسم کی جھاڑیاں نئے بیاھتا جوڑوں کے گھروں میں نصب کی جاتی ھیں اور یہ رسم صرف اس وقت ادا نہیں کی جاتی جب عورت کی زچگی کے دن قریب ھوں ، اس لیے کہ ایسی صورت میں لوگ یہ کہنا شروع کر دیتے ھیں کہ مرد نے ''بیساکھ والی جھاڑی خود اپنے لیے نصب کی ھے ۔'' جنوبی سلیوونیا کے لوگوں میں بانجھ عورت ، جسے اولاد کی خواھش ھو ، سینٹ جارج کے عرس

کی رات ایک نئی شمیز کسی پھل دار درخت پر رکھ آتی ہے۔ اگلے دن سویرے جو پھٹنے سے پہلے وہ اس پوشاک کو الٹ پلٹ کر دیکھتی ہے۔ اگر اس پر کسی جان دار چیز کے چلنے کا نشان نظر آ جائے تو اس عورت کو اسی سال اپنے بامراد ہونے کی آس بندھ جاتی ہے اور پھر وہ اسے پہن کر اس خیال میں مگن رہتی ہے کہ اس میں بھی اس درخت کے برابر قوت ثمروری پیدا ہو جائے گی، جس پر اس کی شمیز نے رات گزاری ہو۔ کارکرغیزوں (وسط ایشیا کی ایک قوم) کے ہاں بانجھ عورتیں سیب کے کسی تنہا پودے کے نیچے لوٹ لگاتی ہیں تاکہ ان کے ہاں بچے پیدا ہوں۔ افریقہ اور سویڈن کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ درخت اپنے اندر زچگی میں عورتوں کی مشکل آسان کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ سویڈن کے بعض اضلاع میں ہر کھیت کے قریب ایک ''بار ٹراڈ'' یا محافظ شجر (لیموں، ایش یا نارون) ہوتا تھا۔ کسی شخص کو اس مقدس شجر کا ایک پتا بھی توڑنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اسے ضرر پہنچانے کا خمیازہ بد قسمتی یا بیماری کی صورت میں بھگتنا پڑتا تھا۔ حاملہ عورتیں اس شجر سے چمٹا کرتیں تاکہ زچگی میں انھیں تکلیف نہ ہونے پائے۔ کانگو کے چند حبشی قبائل میں حاملہ عورتیں اپنے لیے ایک خاص شجر مقدس کی چھال کی پوشاک تیار کرتی ہیں، اس لیے کہ ان کے عقیدے کے بموجب یہ شجر ان تمام خطرات سے مامون رکھتا ہے جو حمل سے وابستہ ہیں۔ یہ قصہ کہ لیتو نے جڑواں دیوتاؤں اپولو اور ارتمیس کو جنتے وقت ایک کجھور، ایک زیتون اور دو لارل کے درختوں کو پکڑا تھا، درختوں کے متعلق زچہ کی مشکل آسان کرنے والے اسی قسم کے عقیدے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

دسواں باب

# جدید یورپ میں شجر پرستی کے آثار

شجری روحوں کی منفعت بخش خصوصیات کے بارے میں عام معتقدات کا اوپر جو جائزہ لیا گیا ہے ، اس کی روشنی میں یہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں رہتا کہ شجر بہار یا بیسا کھے والی جیسی رسموں کو یورپ کے کسانوں کے تیوہاروں میں اس قدر عام اور نمایاں حیثیت کیسے حاصل ہو گئی۔ بہار یا گرمیوں کے شروع بلکہ یوم گرما (۲۴ جون) پر بھی یورپ کے بعض حصوں میں یہ دستور رہا ہے ، یا ابھی تک جاری ہے کہ لوگ بنوں میں پہنچتے ہیں اور ایک درخت کاٹ کر گاؤں میں لے آتے ہیں جسے یہاں ایک جشن عام میں نصب کر دیا جاتا ہے ۔ یا پھر جنگل میں اس درخت کی شاخیں کاٹ لی جاتی ہیں اور گاؤں میں لا کر ایک ایک شاخ ہر گھر پر باندھ دی جاتی ہے ۔ ان رسموں سے مقصود یہ ہے کہ گاؤں کے ہر گھر پر وہ برکتیں ارزانی ہو جائیں جن کا نازل کرنا شجری روح کے اختیار میں ہے ۔ بعض مقامات پر ہر گھر کے روبرو ایک شجر بہار نصب کرنے یا گاؤں کے عام شجر بہار سے ہر گھر کو مستفیض کرنے کے لیے اسے دربدر لیے پھرنے کا جو دستور ہے ، اس کی تہ میں بھی یہی عقیدہ کارفرما ہے ۔ اس موضوع پر شواہد کی کثیر تعداد میں سے یہاں چیدہ چیدہ مثالیں پیش کی جائیں گی ۔

سر ہنری پیرس اپنی تالیف ''حالات ویسٹ میتھ'' (ویسٹ میتھ آئرستان کے ایک ضلع کا نام ہے) میں ، جو ۱۶۸۲ء میں لکھی گئی ہے ،

بیان کرتے ہیں : ''شام بہار کو ہر کنبہ اپنی چوکھٹ کے سامنے زرد رنگ کے پھولوں سے چھترائی ایک ہری بھری جھاڑی نصب کرتا ہے ، جو سبزہ زاروں میں بہ کثرت پیدا ہوتی ہے - ان علاقوں میں جہاں بن پائے جاتے ہیں ، پتلے پتلے قد آور درخت نصب کیے جاتے ہیں جو سر اٹھائے سال سال بھر اس طرح کھڑے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی اجنبی ادھر آ نکلے تو ان سب کو مے فروش کی دکان کا نشان سمجھے اور ہر خانہ اسے شراب خانہ نظر آئے ۔'' نارتھمپٹن شائر میں یہ دستور تھا کہ ہر گھر کے سامنے دس یا بارہ فٹ اونچا ایک پودا نصب کردیا جاتا تھا ، اس طرح کہ گویا ہنوز اس کی نشو و نما ہو رہی ہو - پھر کچھ پھول اس کے اوپر پھینک دیے جاتے اور کچھ گھر کی دھلیز کے آس پاس بھی بکھیر دیے جاتے - قدیم رسموں میں ، جو آج تک کارن والیوں کے ہاں جاری ہیں ، مئی کی پہلی تاریخ کو مکانوں کے دروازوں اور پورچوں کو سیکامور (ایک قسم کا انجیر جو مصری انجیر بھی کہلاتا ہے) اور ہاتھارن کی سرسبز شاخوں سے سجانا اور مکانوں کے سامنے ایک یا کئی درختوں کے ٹنڈ نصب کرنا شامل ہے ۔'' شمالی انگلستان میں پہلے یہ دستور تھا کہ نوجوان نصف شب کے کچھ دیر بعد ، یعنی مئی کا پہلا دن شروع ہوتے ہی اٹھ جاتے اور باجا بجاتے اور قرنا پھونکتے بنوں میں جا پہنچتے ، جہاں درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر ان پر گل دستے اور پھولوں کے تاج سجاتے ؛ یہ کر چکنے کے بعد طلوع آفتاب کے لگ بھگ لوٹ آتے اور ان پھولوں سے سجی ٹہنیوں کو اپنے اپنے گھروں کے دروازوں پر باندھ دیتے - برک شائر میں ایبنگڈن کے مقام پر کبھی یہ ہوا کرتا تھا کہ نوجوان یوم بہار کی صبح جتھے بنا کر خوشی کا ایک گیت الاپتے ہوئے گشت کے لیے نکلتے - اس گیت کے دو ٹکڑے حسب ذیل ہیں :

گھومتے گھومتے رات بھر
اور آج بھی خاصی دیر تک
آئے ہیں ہم اب لوٹ کر
پھولوں کا تازہ ہار لیے

ہار شگفتہ پھولوں کا
لے کے تمہارے در پہ کھڑے ہیں،
کمو نپل ہے یہ کلیسائی
خالق کی صنعت کا نمونہ

ایسیکس کے شہروں سیفرن والڈن اور ڈیبڈن میں ننھی ننھی لڑکیوں کی ٹکڑیاں ایک گیت گاتی، جو قریب قریب وہی ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، پھولوں کے گجرے لیے گھر گھر پھرتی ہیں۔ عام طور پر ایک گڑیا سفید کپڑوں میں ملبوس ہر گجرے کے بیچ میں رکھی ہوتی ہے۔ ایسی ہی رسمیں انگلستان کے دوسرے مختلف حصوں میں بھی جاری رہی ہیں بلکہ آج تک جاری ہیں۔ پھولوں کے یہ گجرے عموماً ہوپوں کی شکل کے (حلقہ نما) ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے عموداً مربوط۔ غالباً آئرستان کے بعض علاقوں کے دیہاتی اب بھی یوم بہار پر رُوَن (ایک پھول جو برطانوی جزائر میں پیدا ہوتا ہے) اور گل آبی گیندے سے سجے ہوئے ہوپ لے کر نکلتے ہیں۔ ان ہوپوں میں دو گیندیں لٹکی ہوتی ہیں، جن پر کبھی کبھی طلائی اور نقرئی ورق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں ان گیندوں کی حیثیت مہر و ماہ کی شبیہوں کی تھی۔

کوہ ووژ (فرانس اور جرمنی) کے بعض دیہات میں مئی کے پہلے اتوار کو لڑکیوں کی ٹولیاں ایک قصیدۂ بہاریہ گاتی گھر گھر جاتی ہیں، جس میں ''اس رزق کا ذکر ہوتا ہے جو مئی کے مہینے میں میسر آتا ہے۔'' اگر ان لڑکیوں کو پیسے مل جاتے ہیں تو وہ ایک ہری شاخ گھر کے دروازے سے باندھ جاتی ہیں، اور جو انہیں کچھ نہ ملے تو گھر والوں کو یہ کوسنا دے جاتی ہیں کہ ان کے ہاں بہت سارے بچے ہوں اور ان بچوں کو کھلانے کے لیے کچھ نہ ہو۔ فرانس کے ضلع مائی این میں لڑکے، جنھیں 'میلوٹین' کہا جاتا تھا، یوم بہار پر خوشی کے گیت گاتے کھیت کھیت جاتے، جس کے صلے میں انھیں ہر جگہ پیسے ملتے یا شراب سے ان کی خاطر کی جاتی اور وہ ایک چھوٹا سا پودا یا کسی درخت کی شاخ نصب کر جاتے۔ السامس (فرانس) میں سیورتے

کے قریب لوگوں کی ٹکڑیاں شجر ہائے بہار لیے نکلتی ہیں ۔ ان میں ایک شخص سفید قمیص پہنے ہوتا ہے جس کے منہ پر کالک مل دی جاتی ہے ۔ اس کے آگے آگے ایک بلند قامت شجر بہار چلتا ہے ۔ نیز اس جلوس کے ہر آدمی کے ہاتھ میں ایک ایک چھوٹا سا شجر ہوتا ہے ۔ ان میں ایک آدمی ایک بڑی ساری بالٹی اٹھائے ہوتا ہے ، جس میں وہ انڈے ، لحم خنزیر وغیرہ کی نذریں لے لے کر جمع کرتا جاتا ہے ۔

اس جمعرات کو ، جو سفید اتوار سے پہلے پڑتی ہے ، روس کے دیہاتی ''بنوں میں پہنچ کر گیت الاپتے ہیں ، پھولوں کے ہار تیار کرتے ہیں اور برچ کا ایک پودا (شمالی یورپ کا ایک درخت جس کی شاخیں پتلی اور چھال چکنی ہوتی ہے) کاٹ کر اسے زنانہ لباس پہناتے ہیں ، یا رنگ رنگ کی دھجیوں اور ربنوں سے سجاتے ہیں ۔ پھر ایک ضیافت ہوتی ہے ، جس کے بعد وہ اس ملبوس برچ کو ناچتے اور گاتے بجاتے خوشی خوشی گاؤں لے جاتے ہیں اور وہاں کسی ایک گھر میں نصب کر دیتے ہیں ، جہاں یہ پودا سفید اتوار تک ایک معزز مہمان کی حیثیت سے رہتا ہے ۔ بیچ کے دو دن وہ اپنی اس مصنوعی مہمان خاتون کی زیارت کرتے رہتے ہیں ، لیکن تیسرے دن یعنی سفید اتوار کو یہ خاتون پانی میں جھونک دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ اس کے ہار بھی ۔'' برچ کو زنانہ لباس پہنانے والا یہ روسی دستور درختوں کو آدمی کا روپ دینے کی ایک نمایاں مثال ہے اور اس کا ندی میں پھینکا جانا غالباً بارشی افسوں ہے ۔

سویڈن کے بعض حصوں میں لڑکے یوم بہار پر برچ کی ہری بھری ڈالیوں کی ایک ایک پولی ہاتھوں میں لیے نکلتے ہیں ۔ گاؤں کا سارنگیا ان کی پیشوائی کرتا ہے اور وہ سب بہار کا ایک نغمہ گاتے ہوئے گھر گھر پہنچتے ہیں ۔ ان کے اس نغمے کا ٹیپ کا بند صاف موسم ، وافر فصل اور مادی و روحانی برکتوں کی دعا پر مشتمل ہوتا ہے ۔ ان میں سے ایک لڑکا انڈوں وغیرہ کی نذریں وصول کر کر کے ایک ٹوکرے میں جمع کرتا جاتا ہے ۔ ان کی آؤ بھگت ہوتی ہے تو وہ ایک ہری بھری ٹہنی جھونپڑی کے دروازے کی چھت پر لگا جاتے ہیں ۔ لیکن سویڈن

میں یہ رسم زیادہ تر وسط گرما میں ادا کی جاتی ہے ۔ حضرت یوحنا کے عرس (۲۳ جون) کی شب مکانوں کی خوب صفائی کی جاتی ہے اور انھیں درختوں کی سرسبز شاخوں اور پھولوں سے آراستہ کیا جاتا ہے ۔ دروازوں اور باڑوں کے آس پاس صنوبر کے پودے نصب کیے جاتے ہیں اور اکثر باغوں میں منڈوے بھی چھا دیے جاتے ہیں ۔ اسی روز اسٹاک ہام میں ''پت ہاٹ'' کا میلہ لگتا ہے ، جس میں چھ چھ انچ سے لے کر بارہ بارہ فٹ تک کے ہزارہا بیساکھے فروخت کے لیے دکانوں پر سجائے جاتے ہیں ۔ یہ بیساکھے پھول ، پتوں اور کاغذ کے رنگا رنگ پرزوں سے آراستہ ہوتے ہیں ، جن کے کھونٹوں سے انڈوں کے سنہری چھلکے ٹنگے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ ۔ نیز پہاڑوں پر الاؤ جلائے جاتے ہیں اور لوگ ان کے اطراف ناچتے اور ان پر چھلانگیں لگاتے ہیں ۔ لیکن اس تیوہار کی سب سے نمایاں چیز بیساکھے کی رسم تنصیب ہے ۔ یہ ایک اونچے چیڑ پر مشتمل ہوتا ہے ، جس کی شاخیں کاٹ ڈالی جاتی ہیں ۔ کسی وقت ''ہوپ اور کسی وقت لکڑی کے ٹکڑے آڑے ترچھے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اس پر لگا دیے جاتے ہیں ۔ نیز کبھی اسے کمانوں سے اس طرح سجایا جاتا ہے ، جیسے کوئی آدمی کولھوں پر ہاتھ رکھے کھڑا ہو ۔ یہ بیساکھا اوپر سے لے کر نیچے تک بلکہ اس کے ہوپ ، کمانیں وغیرہ تک پتوں ، رنگین کپڑوں اور انڈوں کے سنہری خولوں سے آراستہ ہوتی ہیں اور اس کی انی پر ایک مرغ بادنما یا جھنڈی لگی ہوتی ہے ۔'' اس بیساکھے کی رسم تنصیب ، جس کی آرائش گاؤں کی کنواریوں کی رہین منت ہوتی ہے ، بڑے دھوم دھڑکے سے ادا کی جاتی ہے ۔ لوگ ہر طرف سے جوق در جوق اس کے پاس پہنچتے ہیں اور اس کے اطراف رقص کرتے ہیں ۔ اسی قسم کی گرمائی رسوم کبھی جرمنی کے بعض حصوں میں بھی جاری تھیں ۔ چناں چہ ہارٹس (شمال مشرقی جرمنی میں ایک پہاڑ) کے بالائی علاقے کے قصبات میں صنوبر کے بلند قامت درختوں کے نچلے حصوں کی چھال تراش کر انھیں کھلے مقامات پر نصب کر دیا جاتا تھا اور پھولوں اور رنگے ہوئے زرد اور سرخ انڈوں سے سجا دیا جاتا ۔ ان

درختوں کے گرد دن کو نوجوان اور رات کو بوڑھے رقص کیا کرتے۔ نیز بوھیمیا کے بعض علاقوں میں یوم سینٹ جان کی رات کو بیسا کھے یا شجر ھائے گرما نصب کر دیے جاتے ھیں ۔ لڑکے ایک اونچا سا صنوبر یا چیڑ جنگل سے لاتے ھیں اور اسے کسی بلند مقام پر نصب کر دیتے ھیں جہاں لڑکیاں اسے گل‌دستوں ، ھاروں اور سرخ ربنوں سے آراستہ کرتی ھیں ، بعد میں اسے جلا دیا جاتا ھے ۔

اسی طرح انگلستان ، فرانس اور جرمنی جیسے مختلف یورپی ممالک میں یوم بہار پر گاؤں کا عام شجر بہار یا بیسا کھا نصب کرنے کی جو رسم جاری تھی اس کی تفصیل بیان کرنا تحصیل حاصل ھے ۔ یہاں اس کی صرف چند مثالیں کافی ھوں گی ۔ ایک پیورٹن مصنف فلپ اسٹبز نے (انگریز پمفلیٹیر یا رسالہ نگار جو سولھویں صدی میں گزرا ھے ، اس کی محولہ تصنیف اس عہد کے انگلستان سے متعلق ایک نہایت اھم تاریخی دستاویز ھے) اپنی تصنیف ''سماجی برائیوں کا تجزیہ'' میں جو سب سے پہلے ۱۵۸۳ء میں لندن سے شائع ھوئی تھی ، بڑے حقارت آمیز انداز سے ملکۂ بیس (غالباً کاؤنٹس آف شروبری مراد ھے جو اسٹبز کی ھم عصر تھی) کے عہد میں بیسا کھے نکلنے کا حال بیان کیا ھے ۔ اس کے لکھے ھوئے ان حالات سے اگلے وقتوں کے زندہ دلان انگلستان کی جیتی جاگتی تصویر نظر میں پھر جاتی ھے ۔ ''یوم بہار ، سفید اتوار یا دوسرے تیوھاروں پر لڑکے اور ناکتخدا لڑکیاں ، بوڑھے مرد اور ان کی بیویاں رات کے وقت بنوں ، شجرزاروں اور پہاڑوں میں آوارہ گردی کرتے ھیں اور رنگ رلیوں میں ساری رات گزار دیتے ھیں ۔ صبح کو اپنی محفلوں کی آرائش کے لیے برچ اور دوسرے درختوں کی شاخیں لے کر لوٹتے ھیں ، اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ، اس لیے کہ ان کا گرو گھنٹال ، یعنی اقلیم دوزخ کا تاج دار ابلیس ان کے ساتھ ھوتا ھے اور ان کے راسش و رنگ اور کھیل تماشوں میں صدر مجلس ھوتا ھے ۔ وھاں سے یہ لوگ جو سب سے قیمتی چیز لے کر آتے ھیں وہ بیسا کھا ھے ۔ یہ بڑے ادب و احترام کے ساتھ گھر لایا جاتا ھے ۔ ان لوگوں کے پاس بیس یا چالیس جوڑی بیل ھوتے ھیں اور ھر بیل کے سینگوں

کی انی پر ایک ایک مہکتا گل‌دستہ لگا ہوتا ہے ۔ یہ بیل بیساکھے (یا یوں کہیے کہ اس بت متعفن) کو کھینچ کے لاتے ہیں ، جس کے ارد گرد اوپر سے لے کر نیچے تک پھول اور جڑی بوٹیاں بندھی ہوتی ہیں اور جسے کبھی کبھی مختلف رنگوں سے رنگ دیا جاتا ہے ۔ اس کے پیچھے پیچھے تقریباً دو یا تین سو عقیدت مند مردوں ، عورتوں اور بچوں کا ہجوم ہوتا ہے ۔ اس کی انی پر رومال اور جھنڈیاں لہرا کر اسے نصب کر دیا جاتا ہے اور اس کے اطراف پھول وغیرہ بچھا دیے جاتے ہیں ۔ اس کے ارد گرد ہری بھری ٹہنیاں باندھ دی جاتی ہیں اور قریب ہی زائرین کے لیے سائبان اور منڈوے چھا دیے جاتے ہیں ۔ پھر سب لوگ مل کر اس بیساکھے کے اطراف رقص شروع کر دیتے ہیں ، جس طرح بت پرست دیوتاؤں کو اصنام نذر کرتے وقت کیا کرتے تھے ۔ یہ بھی اسی بت پرستانہ دستور کا ایک نمونہ ہے ، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بعینہ وہی چیز ہے ۔ میں نے بعض نہایت سنجیدہ اور مشہور آدمیوں کو وثوق کے ساتھ یہ کہتے سنا ہے کہ ان چالیس ، ساٹھ یا سو کنواریوں کی تعداد کا ایک ثلث بھی ، جو اس طرح رات کو جنگل جاتی ہیں ، شاید ہی کبھی اپنی عصمت سلامت گھر لاتا ہو ۔''

سویبیا میں یکم مئی کو صنوبر کا ایک لمبا درخت کاٹ کر گاؤں میں لایا جاتا تھا ، جہاں اسے ربنوں سے آراستہ کرکے نصب کر دیا جاتا ، پھر لوگ سنگیت کی دھن پر اس کے گرد رقص کرتے ۔ جب تک اگلے یوم بہار پر دوسرا شجر کٹ کر نہ آ جاتا یہ شجر گاؤں کے سبزہ زار پر سال بھر ایستادہ رہتا ۔ میکسنی میں ''لوگ انسان کے روپ میں (شاہ یا ملکۂ بہار کی صورت میں) موسم گرما کو گھر لانے پر قانع نہ رہتے بلکہ وہ بنوں سے خود سرسبز نباتات کو گھر اٹھا لاتے ، یعنی یوم بہار یا سفید اتوار والے شجر ، جن کا ذکر تیرھویں صدی اور بعد کی دستاویزات میں ملتا ہے ۔ شجر بہار کے لانے کی جو رسم ادا کی جاتی تھی اس کی حیثیت ایک تیوہار کی بھی تھی ۔ لوگ مئی یا بہار کی جستجو میں جنگل جاتے ، وہاں سے پودے ، خاص کر

و نہال برچ اور صنوبر کاٹ کر گاؤں لاتے اور انھیں گھروں کے دروازوں پر یا تھانوں یا کمروں کے روبرو نصب کر دیتے ۔ نوجوان ، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ، ان گھریلو شجرھائے بہار کے علاوہ ایک بڑا شجر بہار یا بیساکھا ، جو مذکورۂ بالا شجروں ھی کی طرح جلوس کی شکل میں گاؤں لایا جاتا اور جس کے انتخاب اور نگہداشت میں اجتماعی طور پر گاؤں کے تمام لوگوں کا حصہ ھوتا ، گاؤں کے وسط یا قصبے کے بازار میں نصب کر دیا جاتا ۔ عموماً اس شجر کی شاخیں اور پتے چھانٹ دیے جاتے اور صرف اس کی چوٹی رھنے دی جاتی ، جس پر مختلف رنگ کے ربنوں اور کپڑوں کے علاوہ انواع و اقسام کی اغذیہ جیسے لنگوچے ، کیک اور انڈے بطور نمائش سجا دیے جاتے ۔ نوجوانوں میں ان چیزوں کو جیتنے کے لیے مقابلے ھوتے ۔ وہ چکنے کھمبے جو اب بھی ھمارے میلوں میں دکھائی دیتے ھیں ، اگلے وقتوں کے انھی بیساکھوں کی یادگار ھیں ۔ اکثر یہ ھوتا کہ پیدل یا گھوڑوں پر بیساکھے تک دوڑ لگائی جاتی ۔ سفید اتوار کے تیوھار کی یہ تفریحی صورت ، جس کا مقصد اب فوت ھو چکا ھے ، جرمنی کے بہت سے حصوں میں ایک عوامی رسم کی حیثیت سے آج تک باقی ھے ۔'' بوردوژ میں پہلی مئی کو گلیوں کے لڑکے اپنی اپنی گلی میں ایک بیساکھا لا کر گاڑا کرتے تھے ۔ اسے گجروں سے سجایا جاتا اور اس کو ایک بڑا سا تاج پہنایا جاتا اور مئی کے سارے مہینے جوان لڑکے اور لڑکیاں ھر شام اس بیساکھے کے گرد رقص کیا کرتے ۔ زندہ‌دلان پروونس کے ھاں آج تک یوم بہار پر گاؤں گاؤں پھول پتوں سے سجے شجر ھائے بہار نصب کیے جاتے ھیں اور ان کے نیچے نوجوان رنگ رلیاں مناتے ھیں اور بوڑھے آرام کرتے ھیں ۔

ان تمام صورتوں سے یہ بات ظاھر ھے کہ ھر سال ایک تازہ بیساکھا نصب کرنے کا دستور رھا ھے یا تھا ۔ تاھم دوسرے مقامات کے برخلاف ، انگلستان میں شجر بہار کو ھر سال بدلا نہیں جاتا تھا ۔ کم از کم بعد کے دور میں ایک ھی شجر اصولاً مستقل طور پر ایستادہ رھتا ۔ شمالی بویریا کے دیہات میں ھر تیسرے ، چوتھے یا

پانچویں سال نئے بیساکھے کی رسم تنصیب ادا کی جاتی ہے ۔ یہ جنگل سے لایا ہوا ایک صنوبر ہوتا ہے ۔ اس سارے ساز و سامان ، یعنی ہاروں ، جھنڈیوں اور طغروں میں جس سے اس شجر کو آراستہ کیا جاتا ہے ، ایک اہم ترین چیز پتوں کا وہ گچھا ہوتا ہے جو اس غرض سے اس پر لگا رہنے دیا جاتا ہے کہ لوگوں کو یہ یاد دلاتا رہے کہ ان کا تعلق مردہ بیساکھے سے نہیں ، بلکہ ایسے شجر سے ہے جو بن سے کٹ کر تازہ تازہ آیا ہو ۔ ہمارے لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتداء میں ہر جگہ سال بہ سال ایک تازہ شجر بہار نصب کرنے کا دستور تھا ۔ چوں کہ اس دستور کی غرض و غایت یہ تھی کہ نباتات کی قوت باروری سے جو بہار میں بیدار ہو جاتی ہے ، انسان کو مستفیض کیا جائے ، اس لیے اگر ہر سال سرسبز و شاداب شجر کی بجائے کوئی خشک اور مردہ کندہ نصب کیا جاتا یا ایک ہی کندے کو مستقل طور پر ایستادہ رکھا جاتا تو اس دستور کا مقصد فوت ہو جاتا ۔ تاہم جب اس دستور کا مفہوم لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو گیا اور شجر بہار کو محض کھیل تماشوں کا مرکز سمجھا جانے لگا تو ان کے نزدیک ہر سال ایک تازہ درخت کاٹ کے لانے کا جواز باقی نہیں رہا اور انھیں یہی بہتر معلوم ہوا کہ پرانے شجر کو قائم رکھ کر ہر سال اسے تازہ پھولوں سے سجا لیا جائے ۔ لیکن بیساکھے نے جب ایک کھم کی صورت اختیار کر لی ، تب بھی کبھی کبھی لوگوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اسے لکڑی کے ایک بے جان کندے کی بجائے ہرے بھرے درخت کی صورت دی جائے ۔ چناں چہ ویورھم واقع چیشائر میں ''دو بیساکھے ہیں جو آج کے دن (یوم بہار) قدیم رسوم کے ساتھ بڑی توجہ سے سجائے جاتے ہیں ۔ اس کے پہلوؤں پر ہار ڈالے جاتے ہیں اور انی پر برچ یا دوسری قسم کے پتلے پتلے ہرے بھرے پودے لگا دیے جاتے ہیں ۔ ان کے تنوں کی چھال چھیل کر انھیں اس کھم سے جوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ چوٹی سے لے کر نیچے تک ایک درخت دکھائی دے ۔'' اس طرح شجر بہار کی تجدید ویسی ہی ہے جیسی حاصل بہار کی تجدید ۔ ان دونوں سے مقصود یہ ہے کہ

نباتات سے زرخیزی کی تازہ قوت حاصل کی جائے اور اسے سال بھر محفوظ رکھا جائے ۔ لیکن جہاں حاصل بہار کی تاثیر فصلوں کی افزائش تک محدود رہتی ہے ، وہاں شجر بہار یا شاخ بہار کی قوت سے ، جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں ، مویشی اور عورتیں بھی فیض یاب ہوتی ہیں ۔ آخر میں یہ امر توجہ طلب ہے کہ پرانا شجر بہار بعض وقت سال کے خاتمے پر جلا دیا جاتا ہے ۔ چنانچہ ضلع پریگ میں نوجوان عام شجر بہار کو کاٹ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں اور ان ٹکڑوں کو کمروں کے اندر ٹنگی ہوئی مقدس تصویروں کے پیچھے رکھ دیتے ہیں جہاں وہ اگلے سال یوم بہار تک لٹکے رہتے ہیں ۔ اس کے بعد انھیں چولھوں میں لگا دیا جاتا ہے ۔ ورٹمبرگ میں وہ جھاڑیاں جو مکانوں پر عید فسح پر نصب کی جاتی ہیں ، سال بھر اسی طرح کھڑی رہنے دی جاتی ہیں اور پھر انھیں جلا دیا جاتا ہے ۔

یہ تھی درخت کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت سے شجری روح کی کیفیت ۔ اب ہمیں شجری روح کے اس تصور پر روشنی ڈالنی ہے جس کی بناء پر اسے درخت سے علیحدہ کرکے انسانی روپ بلکہ جیتے جاگتے مردوں عورتوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے ۔ شجری روح کو اس طرح تشبیہی حیثیت سے پیش کرنے کے شواھد زیادہ تر یورپ کے زراعت پیشہ طبقے کے رسم و رواج میں ملتے ہیں ۔

ان میں وہ سبق آموز صورتیں شامل ہیں جن میں شجری روح بہ یک وقت نباتی اور انسانی دونوں روپ دھارتی ہے اور اس کی ان دونوں شبیہوں کو گویا اس مقصد سے ایک ساتھ رکھ دیا جاتا ہے کہ ایک سے دوسرے کی وضاحت ہو جائے ۔ ان رسموں میں شجری روح کی انسانی صورت کبھی کوئی گڑیا یا کٹھ پتلی ہوتی ہے ، کبھی کوئی زندہ آدمی ۔ یہ شبیہ ، خواہ وہ گڑیا ہو یا جیتا آدمی ، کسی درخت یا درخت کی شاخ کے پہلو بہ پہلو رکھ دی جاتی ہے ۔ اس طرح یہ دونوں صورتیں ، یعنی کٹھ پتلی یا آدمی اور درخت یا شاخ ، مل کر ایک ایسے کتبے کی مثال پیش کرتے ہیں جس کی عبارت دو زبانوں

میں نقش ہو ، یعنی ایک دوسرے کا ترجمہ ۔ لہذا اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ شجری روح کو فی‌الواقع انسان کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے ۔ اس طرح بوہیمیا میں ایسٹر سے پہلے کے چلے میں چوتھے اتوار کو نوجوان ایک کٹھ پتلی ، جسے ''موت'' کہا جاتا ہے ، پانی میں پھینکتے ہیں ۔ پھر لڑکیاں جنگل میں پہنچتی ہیں اور وہاں سے ایک شجر کاٹ کر اس کے ساتھ ایک کٹھ پتلی باندھ دیتی ہیں ، جسے سفید کپڑوں میں اس طرح ملبوس کیا جاتا ہے کہ وہ عورت دکھائی دے ۔ اس شجر اور کٹھ پتلی کو لے کر وہ بخشش وصول کرتی گھر گھر جاتی ہیں اور کچھ گیت گاتی ہیں جن کے ٹیپ کا بند یہ ہے :

موت کو ہم گاؤں سے نکالیں
گرما کو ہم گاؤں میں لائیں

اس میں ، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ، گرما نباتات کی روح سے عبارت ہے جو بہار میں عود کر آتی ہے یا بیدار ہو جاتی ہے ۔ خود ہمارے ملک انگلستان میں بچے چھوٹے چھوٹے مصنوعی بیساکھے اور نہایت نفیس کپڑوں میں ملبوس ایک گڑیا لیے ، جو خاتون بہار کہلاتی ہے ، ٹکے مانگتے پھرتے ہیں ۔ ان صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ شجر اور کٹھ پتلی کو ایک دوسرے کے مساوی سمجھا جاتا ہے ۔

السامس میں تھان کے مقام پر یہ ہوتا ہے کہ ایک لڑکی جسے ''ننھی گل بہار'' پکارا جاتا ہے ، سفید کپڑے پہنے اور گجروں اور ربنوں سے سجا ایک چھوٹا سا شجر بہار ہاتھ میں لیے نکلتی ہے ۔ اس کی سہیلیاں جو اس کے ہمراہ ہوتی ہیں ، ہر گھر سے بھیک وصول کرتی اور یہ گاتی جاتی ہیں :

''ننھی گل بہار ! تین دفعہ گھوم !
ہمیں بار بار اپنا جلوہ دکھا ،
اے بہار کے پھول ، چل جنگل چلیں
اور وہاں چل کر خوشیاں منائیں ،
یوں ہم بہار سے چل کر گلوں میں پہنچیں

اس گیت کے ساتھ ساتھ وہ یہ کوسنا بھی دیتی جاتی ہیں کہ اگر کوئی کچھ نہ دے تو اس کی مرغیاں مارٹین (نیولے کی قسم کا ایک جانور) کا شکار ہو جائیں - اس کی بیل پر انگور ، درخت پر پھل اور کھیت میں اناج پیدا نہ ہو - لوگوں کا خیال ہے کہ سال کی پیداوار کا انحصار ان نذروں یا دان پر ہے جو ان نغمہ سرایان بہار کو دیا جاتا ہے - اس رسم اور یوم بہار پر بچوں کے ہری بھری شاخیں یا گجرے لے کے نکلنے اور دان لیتے پھرنے کی مذکورہ بالا صورتوں کا مطلب یہ ہے کہ بچے روح نباتات کے ساتھ گھر میں برکت و افراط اور خوش نصیبی لے کے آتے ہیں اور لوگوں سے اپنی اس خدمت کے صلے کی توقع رکھتے ہیں - روسی لیتھونیا میں لوگ یوم بہار پر گاؤں کے سامنے ایک ہرا بھرا درخت نصب کیا کرتے تھے - اس کے بعد دیہاتی نوجوان سب سے خوب صورت لڑکی چن کر اسے تاج پہناتے ، اس پر برچ کی ڈالیاں لپیٹتے اور پھر اسے ایک شجر بہار کے برابر بٹھا دیتے ، جہاں وہ ناچتے گاتے اور ''اے بہار ! اے بہار !'' کے نعرے لگاتے - بری (آئل ڈی فرانس) میں ایک شجر بہار گاؤں کے بیچوں بیچ نصب کر دیا جاتا ہے - اس کی چوٹی پھولوں سے آراستہ ہوتی ہے ، جس کے نیچے پتے اور ٹہنیاں اور ان کے نیچے بڑی بڑی ہری بھری شاخیں لپٹی ہوتی ہیں - اس کے گرد لڑکیاں رقص کرتی ہیں اور ایک لڑکے کو جو 'بہار بابا' کہلاتا ہے ، گھمایا جاتا ہے - شمالی بویریا کے فرینکن والڈ کے پہاڑی قصبات میں ، مئی کی دوسری تاریخ کو ایک شجر والبر شراب خانے کے آگے نصب کر دیا جاتا ہے اور ایک شخص اس کے اطراف ناچتا ہے - یہ سر سے پاؤں تک تنکوں میں اس طرح لپٹا ہوتا ہے کہ ان میں لگے ہوئے اناج کے بھٹے اس کے سر پر ایک تاج کی طرح چھا جاتے ہیں - اس شخص کو والبر کہا جاتا ہے - پہلے گلی کوچوں میں اس کا جلوس نکلا کرتا تھا جو اس موقع پر برچ کی ڈالیوں سے سجائے جاتے تھے -

کارنتھیا کے سلافیوں کے ہاں یہ دستور ہے کہ یوم سینٹ جارج (۲۳ اپریل) پر نوجوان مل کر ایک شجر کو ، جو اس تیوہار کی

رات کاٹ لیا جاتا ہے ، پھولوں اور گجروں سے آراستہ کرتے ہیں ۔ پھر باجے گاجے کے ساتھ خوشی کے نعروں کی گونج میں اس کا جلوس نکلتا ہے ، جس میں سب سے نمایاں حیثیت ''سبز پوش جارج'' کی ہے ۔ یہ سر سے پاؤں تک برچ کی ہری بھری ٹہنیوں میں مستور ایک نوجوان ہوتا ہے ۔ جب اس تیوہار کی سب رسمیں ختم ہو چکتی ہیں تو ہرے بھرے جارج یعنی اس نوجوان کے پتلے کو پانی میں پھینک دیا جاتا ہے ۔ جو لڑکا اس سبز پوش جارج کا حصہ ادا کرتا ہے ، اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو ہری بھری پوشاک سے نکال لے اور اپنی جگہ مذکورہ بالا پتلے کو اس صفائی سے رکھ دے کہ اس کارروائی کی کسی کو خبر نہ ہو ۔ تاہم بہت سے مقامات پر خود اس لڑکے کو ندی یا حوض میں غوطہ دے دیا جاتا ہے ۔ اس عمل سے ان سلافیوں کا مقصد صریحاً یہ ہے کہ بارش کا یقین کر لیا جائے تاکہ گرمیوں میں کھیت اور مرغ زار سرسبز ہو جائیں ۔ بعض مقامات پر لوگ اپنے مویشی کو تاج پہنا کر تھانوں سے نکالتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ گیت گاتے جاتے ہیں :

ہم ہرے بھرے جارج کو لاتے ہیں
ہم ہرے بھرے جارج کے ساتھ آتے ہیں
وہ ہمارے ڈھوروں کو کھلا پلا کر موٹا کر دے
نہیں پانی میں ڈوب جائے

یہاں آپ یہ دیکھیں گے کہ مینہ برسانے اور مویشی کی افزائش نسل کی جو قوتیں درخت کے جزولاینفک کی حیثیت سے شجری روح سے منسوب کی جاتی ہیں ، انھی سے اسے زندہ آدمی کی صورت میں بھی متصف کیا جاتا ہے ۔

ٹرانسلوینیا اور رومانیا کے جپسیوں میں ہرے بھرے جارج کا تیوہار فصل بہار کی سب سے بڑی رسم کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ان میں سے بعض اسے ایسٹر کے پیر کو مناتے ہیں اور بعض سینٹ جارج کے عرس کے دن (۲۳ اپریل) ۔ اس تیوہار کی رات بید کا ایک پودا کاٹا جاتا ہے اور اسے پھولوں کے ہاروں اور پتوں سے آراستہ کرکے زمین میں گاڑ دیا

جاتا ہے ۔ عورتیں اپنا کوئی کپڑا رات بھر کے لیے اس پودے کے نیچے رکھ آتی ہیں ۔ اگر اگلے دن صبح انھیں اس کپڑے پر کوئی پتا پڑا مل جائے تو وہ سمجھ جاتی ہیں کہ ان کی زچگی بخیر و خوبی ہو جائے گی ۔ بیمار اور بوڑھے لوگ شام کو اس پودے کے پاس پہنچتے ہیں اور اس پر تین مرتبہ تھوک کر یہ الفاظ دہراتے ہیں : ''تمھارا وقت تو اب قریب آ چکا ہے ، مگر تم ہم کو زندہ رہنے دو ۔'' اگلی صبح سارے جپسی اس کے گرد جمع ہوتے ہیں ۔ اس تیوہار کی سب سے نمایاں چیز ''ہرا بھرا جارج'' یعنی ایک لڑکا ہوتا ہے جو سر سے پاؤں تک سبز پتوں اور کلیوں میں مستور ہوتا ہے ۔ یہ قبیلے کے پالتو جانوروں کو دو پولیاں گھاس کی ڈال دیتا ہے تاکہ انھیں سال بھر چارہ میسر آتا رہے ، اس کے بعد وہ تین ایسی کیلیں لیتا ہے جو تین دن اور تین رات پانی میں پڑی رہی ہوں اور انھیں اس بید کے پودے میں ٹھونک دیتا ہے ۔ پھر انھیں کھینچ نکالتا ہے اور آبی روحوں کی استمالت کی غرض سے بہتی ندی میں پھینک دیتا ہے ۔ آخر میں ہرے بھرے جارج کو پانی میں پھینکنے کا ڈھونگ کیا جاتا ہے ۔ لیکن جسے سچ مچ پانی میں غرق کیا جاتا ہے وہ اصل میں شاخوں اور پتوں کا بنا ہوا ایک پتلا ہوتا ہے ۔ اس دستور سے متعلق یہ جو بیان ابھی ہماری نظر سے گزرا ہے اس کی رو سے زچگی میں عورتوں کی مشکل آسان کرنے اور بیماروں اور بوڑھوں کو توانائی بخشنے کی قوت شجر بید سے منسوب کرنا ظاہر ہے ۔ ساتھ ہی بید کا انسانی ہم زاد ہرا بھرا جارج مویشی کو چارا عطا کرتا ہے ، نیز آبی روحوں سے شجر بید کا براہ راست رابطہ قائم کرکے ان کی تائید حاصل کر لیتا ہے ۔

اس ضمن میں مزید مثالیں پیش کیے بغیر پچھلے صفحات میں جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں ان کا مان ہارٹ کے الفاظ میں یوں خلاصہ کیا جا سکتا ہے : ''محولہ بالا رسوم اس رائے کی قطعی تصدیق کے لیے کافی ہیں کہ بہاری جلوسوں میں روح نباتات کی نمائندگی اکثر شجر بہار اور اس کے علاوہ ہرے بھرے پتوں میں ملبوس کوئی آدمی یا لڑکی کرتی ہے ۔ ی وہ روح ہے جس سے شجر کی زندگی عبارت ہے اور جو ادنیٰ درجے کے پودوں میں کار فرما ہے ، نیز اسی کے بارے میں ہم کو

اس اعتقاد کا ثبوت ملا ہے کہ وہ شجر بہار اور حاصل بہار میں بھی موجود ہوتی ہے ۔ اس تصور کے عین مطابق شجری روح کے متعلق یہ بھی خیال ہے کہ وہ شگوفۂ نوبہار کا روپ دھارتی ہے اور اس لڑکی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو ''گل بہار'' کہلاتی ہے ۔ نیز فصل پیدا کرنے والی قوت کی حیثیت سے 'والبر' اس کا مظہر ہے ۔ شجری الہ کے اس مجازی نمائندے کے جلوس کے متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اس کے بھی مرغیوں ، پھل دار درختوں اور فصلوں پر وہی منفعت بخش اثرات مرتب ہوتے ہیں جو خود اس کے معبود کے حضور کے ۔ دوسرے لفظوں میں اس کا روپ بھرنے والے کو ایک پیکر محض نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کی حیثیت روح نباتات کے حقیقی نمائندے کی تھی ۔ اسی وجہ سے ''گل بہار'' اور شجر بہار کے خدام ان لوگوں کو جو انہیں انڈے ، لحم خنزیر وغیرہ کی صورت میں دان دینے سے انکار کریں ، یہ کوسنا دیتے ہیں کہ وہ ان برکتوں سے محروم رہیں جن کا نازل کرنا اس آوارہ گرد روح کے اختیار میں ہے ۔ یہاں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بیساکھوں یا شاخ ہائے بہار کے جلوس کی صورت میں نکلنے اور در بدر بھیک مانگتے پھرنے (بہار یا گرما کو گھر لانے) کی رسم کو شروع شروع میں ہر جگہ بڑی اہمیت بلکہ تقدس حاصل رہا ۔ لوگوں کا واقعی یہ عقیدہ تھا کہ نمو کا دیوتا غیرمرئی طور پر ہر شاخ میں موجود ہوتا ہے اور اسے نزول برکات کی غرض سے جلوس کی شکل میں جگہ جگہ لے جایا جاتا تھا ۔ جن مختلف ناموں کے ذریعے نباتات کی تشبیہی روح کو اکثر ظاہر کیا جاتا ہے ، یعنی 'بہار' 'بہار بابا' 'خاتون بہار' 'ملکۂ بہار' ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نباتی روح کا تصور اس موسم کے تشکل و تجسیم سے وابستہ ہے جس میں اس روح کی قوتوں کا ظہور سب سے نمایاں ہوتا ہے ۔''

یہاں تک تو ہم نے یہ دیکھا کہ شجری یا عام نباتی روح کو یا تو محض نباتات ، یعنی کسی شجر شاخ یا پھولوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے یا بہ یک وقت انسانی اور نباتی دونوں صورتوں میں ۔ یعنی کسی درخت ، شاخ یا پھول کے ساتھ ساتھ کسی کٹھ پتلی یا زندہ انسان

کے روپ میں ۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بعض وقت جہاں نباتی صورتوں میں اسے ظاہر کرنے کی رسم ترک کر دی جاتی ہے ، وہاں کسی زندہ شخص کی صورت میں اس کا ظہور جاری رہتا ہے ۔ ایسی صورت میں جو آدمی اس کا روپ بھرتا ہے اس کی شبیہی خصوصیت ظاہر کرنے کے لیے عموماً اسے پھولوں یا پتوں میں ملبوس کر دیا جاتا ہے ۔ کبھی کبھی اس کی اس خصوصیت کو وہ نام بھی ظاہر کرتا ہے جس سے اسے خاص موقعوں پر موسوم کیا جاتا ہے ۔

چناں چہ روس کے بعض حصوں میں سینٹ جارج کے عرس کے دن (۲۳ اپریل) ایک نوجوان کو ہمارے (انگریزوں کے) برگ پوش جیک کی طرح پھول پتوں کا لباس پہنا دیا جاتا ہے ۔ سلووینی (کارنتھیا وغیرہ کے سلافی النسل باشندے) اسے سبز پوش جارج کہتے ہیں ۔ یہ ایک ہاتھ میں مشعل اٹھائے اور ایک میں پائی (ایک یورپی ڈش) لیے اناج کے کھیتوں پر جاتا ہے ۔ اس کے پیچھے لڑکیاں مناسب گیت گاتی چلتی ہیں ۔ وہاں کچھ جھاڑیاں جلا کر ان کے بیچوں بیچ اس پائی کو رکھ دیا جاتا ہے اور جن لوگوں نے اس رسم میں حصہ لیا ہو وہ اس آگ کے ارد گرد بیٹھ کر پائی کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں ۔ اس رسم میں سبز پوش جارج کی حیثیت وہی کچھ ہے جو اسی دن کارنتھیا ، ٹرانسلوینیا اور رومانیا والی رسموں میں اس سبز پوش جارج کی ہے جو کسی شجر سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ نیز ہم دیکھ چکے ہیں کہ روس میں سفید تیوہار پر ایک برچ کے درخت کو زنانہ لباس پہنا کر گھر میں ایستادہ رکھا جاتا ہے ۔ اسی سے قطعی مماثل وہ رسم ہے جو ضلع پتنسک میں روسی لڑکیاں سفید پیر کو مناتی ہیں ۔ وہ اپنے میں سے سب سے خوب صورت لڑکی کو چن کر اسے برچ اور میپل (ایک قسم کا درخت جس کا قند وغیرہ تیار کیا جاتا ہے) کے پتوں میں لپیٹتی ہیں اور اسے لے کر گاؤں میں پھرتی ہیں ۔

روہلا میں ، جوں ہی بہار میں درختوں پر نئے پتے اور کونپلیں پھوٹنی شروع ہوتی ہیں ، بچے کسی اتوار کو جمع ہو کر بنوں میں جاتے ہیں اور وہاں اپنے ایک ہم جولی کو چن کر اسے ''ننھا برگ پوش'' بناتے

ہیں ۔ درختوں کی شاخیں توڑ کر ان میں اس بچے کو سر سے پاؤں تک اس طرح ڈھانک دیا جاتا ہے کہ فقط اس کے جوتے ذرا ذرا سے باہر کو نکلے رہتے ہیں ۔ اس پوشاک میں آنکھوں کے پاس چھید کر دیے جاتے ہیں تاکہ وہ بچہ دیکھ سکے اور ان میں سے دو بچے اس ننھے برگ پوش کو راستہ دکھانے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں کہ کہیں اس کے ٹھوکر نہ لگ جائے یا وہ گر نہ پڑے ۔ پھر سب اسے لے کر گاتے اور ناچتے ، انڈے ، بالائی ، لنگوچے اور کیک مانگتے گھر گھر پھرتے ہیں ۔ آخر میں اس برگ پوش کو پانی کے چھینٹے دیے جاتے ہیں اور کھانے پینے کی جو چیزیں ان کے ہاتھ لگتی ہیں انھیں سب مل کر اڑاتے ہیں ۔ سوئٹزر لینڈ میں فرکٹل کے مقام پر سفید تیوہار پر لڑکے جنگل جاتے ہیں اور اپنے کسی ساتھی کو شاخوں سے ڈھانک دیتے ہیں ۔ اسے سفید عید کا دھقان کہا جاتا ہے ۔ اس کو گھوڑے پر بٹھا کر ایک ہری بھری شاخ اس کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے اور اس صورت سے اس کو گاؤں واپس لے جایا جاتا ہے ۔ یہ قافلہ گاؤں کے کنوئیں پر پہنچ کر رکتا ہے اور پھر اس برگ پوش دھقان کو گھوڑے سے اتار کر اسے پانی میں غوطہ دے دیا جاتا ہے ۔ اس کارروائی کے بعد اسے لوگوں پر چھینٹے اڑانے کی آزادی مل جاتی ہے اور وہ اپنی اس آزادی سے کام لیتے ہوئے خاص طور پر لڑکیوں اور بازاری لڑکوں پر چھینٹے اڑاتا ہے ۔ ان لڑکوں کا ایک غول اس برگ پوش کے آگے آگے چلتا ہوا اس سے یہ التجا کرتا ہے کہ وہ انھیں سفید عید کی خوشی میں بھگو ڈالے ۔

انگلستان میں ان برگ پوش بہروپیوں کی سب سے معروف مثال ''برگ پوش جیک'' کی ہے ۔ یہ ایک چمنی صاف کرنے والا ہوتا ہے جو ہولی (ایک جھاڑی جس کے پتے خاردار اور پھل سرخ ہوتے ہیں) اور عشق پیچاں کے پتوں سے ڈھکی ایک مخروطی شکل کی پٹاری میں بند ہوتا ہے ، جس کے اوپر پھولوں کا تاج رکھ دیا جاتا ہے اور ربن لپیٹ دیے جاتے ہیں ۔ اس طرح آراستہ ہو کر وہ یوم بہار پر رقص کرتا ہوا نکلتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے دوسرے چمنی صاف کرنے

والے راستے میں پیسے وصول کرتے چلتے ھیں ۔ فرکٹل میں اسی شکل کی ایک بید کی ٹوکری کو سفید عید والی پٹاری کہتے ھیں ۔ جیسے ھی درختوں پر کلیاں آنی شروع ھوتی ھیں ، جنگل میں ایک خاص مقام منتخب کیا جاتا ھے اور یہاں گاؤں کے لڑکے نہایت خفیہ طریقے سے اس پٹاری کو تیار کرتے ھیں کہ کہیں اور لوگ اس معاملے میں پہل نہ کر جائیں ۔ ھری بھری ٹہنیوں میں لپٹے ھوئے دو حلقے تیار کیے جاتے ھیں ، جن میں سے ایک اس کے پہننے والے کے کندھوں پر رکھ دیا جاتا ھے اور ایک اس کی دونوں پنڈلیوں پر چڑھا دیا جاتا ھے ۔ اس کی آنکھوں اور منہ کے سامنے چھید کر دیے جاتے ھیں اور سر پر برگ و گل کا ایک تاج رکھ دیا جاتا ھے ۔ اس بھیس میں وہ عین مغرب کی عبادت کے وقت اچانک گاؤں میں نمودار ھوتا ھے اور تین لڑکے قرنائے پھونکتے اس کی پیشوائی کرتے ھیں ۔ اس کے ساتھیوں کا مقصد یہ ھوتا ھے کہ اس سفید عید والی پٹاری کو مع اس کے پہننے والے کے اپنے گاؤں کے کنوئیں پر لگائے رکھیں اور ھمسایہ گاؤں کے لڑکوں کے ھاتھ نہ لگنے دیں ، جو اس تاک میں لگے رھتے ھیں کہ اس پٹاری کو وھاں سے اڑا لے جائیں اور اسے اپنے گاؤں کے کنوئیں کی زینت بنائیں ۔

ظاھر ھے کہ اس قسم کی رسموں میں جن کے نمونے ابھی ھماری نظر سے گزرے ھیں ، برگ پوش آدمی کی حیثیت وھی ھے جو اس شجربہار ، شاخ بہار یا لعبت بہار کی ھے جسے بچے بھیک مانگتے گھر گھر لیے پھرتے ھیں ۔ یہ دونوں صورتیں بہار کی فیض رساں روح کی شبیہوں سے عبارت ھیں اور انھیں گھروں پر لے جانے کے صلے میں روپیہ پیسہ یا کھانا دیا جاتا ھے ۔ اکثر صورتوں میں نباتی روح کے اس برگ پوش نمائندے کو بادشاہ یا ملکہ بھی تصور کیا جاتا ھے ۔ چناں چہ وہ شاہ بہار ، شاہ عید ، سفید ملکۂ بہار وغیرہ وغیرہ کہلاتا یا کہلاتی ھے ۔ جیسا کہ مان ھارٹ کا خیال ھے ، ان القاب سے یہ مفہوم نکلتا ھے کہ اس روح کی حیثیت جو نباتات کا جزو لاینفک ھے ، ایک حکمران کی ھے ، جس کی تخلیقی قوت کا دائرہ نہایت وسیع ھے ۔ سالٹس ویڈل کے

قریب ایک گاؤں میں سفید عید پر ایک شجربہار نصب کیا جاتا ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے لڑکے دوڑ لگاتے ہیں ۔ اس دوڑ میں جو سب سے آگے رہتا ہے وہ بادشاہ بن جاتا ہے ، اسے ہار پہنا کر اس کا جلوس نکالا جاتا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاخ بہار ہوتی ہے ، جس سے وہ جگہ جگہ اوس صاف کرتا ہے اور ہر گھر پر جلوس والے رک رک کر ایک گیت گاتے ہیں جس میں گھر والوں کے لیے دعائے خیر ہوتی ہے اور ''گئو سالہ میں سفید دودھ دینے والی کالی گائے اور دڑبے میں سفید انڈے دینے والی کالی مرغی'' کی طرف اشارہ ہوتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انڈوں وغیرہ کا سوال بھی کرتے جاتے ہیں ۔ می لیشیا کے موضع الگاتھ میں ایک رسم ادا کی جاتی ہے جو شاہی دوڑ کہلاتی ہے ۔ کسی سبزہ زار میں ایک کھمبا گاڑ دیا جاتا ہے ، جس سے ایک کپڑا بندھا ہوتا ہے ۔ نوجوان گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس کے پاس سے گزرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کھمبے پر بندھے ہوئے کپڑے کو کھینچ لے جائے ، اور جو اس دوڑ میں سب پر بازی لے جاتا ہے اور کپڑے کو قریب ہی دریائے اوڈر میں ڈبو لیتا ہے اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا جاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس رسم میں کھمبا شجر بہار کا بدل ہے ۔ برنسوک کے بعض گاؤں میں عید سفید پر مٹی کے بادشاہ کو شاخ ہائے بہار سے ڈھانک دیا جاتا ہے ۔ تھورنجن کے بعض حصوں میں بھی سفید عید پر ایک شخص شاہ بہار بنتا ہے ، لیکن اس کا لباس اس سے قدرے مختلف ہوتا ہے ۔ اس کے لیے ایک چوبی فریم تیار کیا جاتا ہے ، ایسا کہ اس کے اندر ایک آدمی سما جائے ۔ اس فریم کو ہر طرف سے شاخ ہائے بہار میں مستور کر دیا جاتا ہے اور اس پر پھولوں اور برچ کے پتوں سے تیار کیا ہوا ایک تاج رکھ دیا جاتا ہے ، جس کے اندر ایک گھنٹی بندھی ہوتی ہے ۔ پھر اس چوبی فریم کو بن میں رکھ دیا جاتا ہے ، جہاں شاہ بہار اس میں داخل ہوتا ہے اور باقی آدمی اسے ڈھونڈنے نکلتے ہیں ۔ جب وہ اسے پالیتے ہیں تو گاؤں میں میجسٹریٹ ، پادری وغیرہ کے پاس لے کے آتے ہیں ، جنھیں یہ پوچھنا ہوتا ہے کہ اس پتوں کے فریم میں جو شخص بند ہے وہ کون

ہے ۔ اگر اس کا قیاس غلط نکلے تو شاہ بہار اپنا سر ہلا کر گھنٹی بجا دیتا ہے اور اپنے اس غلط اندازے کے لیے اسے شراب یا ایسی ہی کوئی شے تاوان کے طور پر دینی پڑ جاتی ہے ۔ واراسٹیڈ میں یہ دستور ہے کہ لڑکے سفید عید پر قرعہ اندازی کے ذریعے ایک بادشاہ اور ایک مہتمم اعلیٰ منتخب کرتے ہیں ۔ مؤخرالذکر سر تا پا ہاتھارن کی جھاڑی میں چھپا اور گجروں سے سجا لکڑی کا تاج پہنے اور ہاتھ میں ایک چوبی تلوار لیے نکلتا ہے ۔ اس کے اور بہار کے بادشاہ کے لباس میں صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ مؤخرالذکر کی کلاہ میں ایک گلدستہ لگا ہوتا ہے اور ہاتھ میں ایک سرکنڈا جس سے سرخ ربن بندھا ہوتا ہے ۔ یہ لڑکے گھر گھر انڈے مانگتے پھرتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ دھمکی دیتے جاتے ہیں کہ جہاں سے انھیں کچھ نہ ملے گا وہاں سال بھر مرغی انڈا نہ دے گی ۔ اس دستور میں کسی نہ کسی وجہ سے مہتمم اعلیٰ نے بادشاہ کا نشان امتیاز غصب کر لیا ہوگا ۔ ہلڈے شائم میں سفید پیر کی شام کو پانچ چھ نوجوان ایک شاہ برگ پوش کو لیے مقررہ وقفوں سے لمبے لمبے کوڑے بجاتے در بدر پھرتے ہیں اور انڈے وصول کرتے ہیں ۔ ان کا یہ بادشاہ ایک لڑکا ہوتا ہے جو برچی ٹہنیوں میں اس طرح لپٹا ہوتا ہے کہ اس کے پاؤں کے سوا اور کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی ۔ نیز اس کے سر پر برچ ہی کی ٹہنیوں کی ایک اونچی ٹوپی سے اس کا ظاہری قد و قامت کچھ اور بلند ہو جاتا ہے ۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک لمبا سا آنکڑا اٹھائے چلتا ہے جس سے وہ کوچہ گرد کتوں اور بچوں کو پکڑتا جاتا ہے ۔ ہوھیمیا کے بعض علاقوں میں سفید پیر کے دن نوجوان برچ کی چھال کی لمبی لمبی ٹوپیاں اوڑھے نکلتے ہیں ، جو پھولوں سے سجی ہوتی ہیں ۔ ان میں سے ایک کو بنا سنوار کر بادشاہ بنایا جاتا ہے اور سلیڈ (ایک گاڑی جو برف پر گزرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور جسے کتے یا گھوڑے کھینچتے ہیں) میں گاؤں کے سبزہ زار پر لے جایا جاتا ہے ۔ اگر راستے میں کوئی جوہڑ پڑے تو سلیڈ الٹ دی جاتی ہے ۔ سبزہ زار پر پہنچ کر وہ سب اس بادشاہ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور ان میں سے جو شخص نقیب بنتا ہے وہ کسی

درخت یا پتھر پر چڑھ کر ہر گھر اور گھر کے رہنے والوں کی مذمت میں ہجو سرائی کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ سب اپنے جسموں پر سے چھالیں اتار پھینکتے ہیں اور زرق برق لباس پہن کر ایک شجر بہار لیے گاؤں میں بھیک مانگنے نکلتے ہیں۔ انہیں کبھی کبھی انڈے اور اناج مل جایا کرتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں لنگن سالزا کے قریب گراس وار گولا کے مقام پر سفید عید کا ایک جلوس نکلا کرتا تھا جو گھاس راجا یا شاہ سبزہ کا جلوس کہلاتا تھا۔ اس گھاس راجا کو سروسہی کی ٹہنیوں کے ایک ہرم نما ڈھانچے میں بند کر دیا جاتا جو فقط چہرے پر سے کھلا ہوتا اور اس کی چوٹی پر برگ و گل کا ایک تاج پہنا دیا جاتا۔ اس ڈھانچے میں مستور وہ ایک گھوڑے پر سوار نکلتا، اس طرح کہ ڈھانچے کا نچلا حصہ زمین سے لگا رہتا۔ نوجوان سواروں کے دستے میں گھرا یہ گھاس راجا ٹاون ہال اور پادری کے مکان پر پہنچتا، جہاں سب کو شراب پیش کی جاتی۔ پھر سومربرگ کے لائم (ایک قسم کا درخت جس کے پتے دل کی شکل کے اور زرد ہوتے ہیں) کے سات درختوں کے تلے پہنچ کر گھاس راجے پر سے وہ ڈھانچا اتار لیا جاتا۔ اس کا تاج میئر کے سپرد کر دیا جاتا اور ٹہنیاں سن کے کھیتوں میں گاڑ دی جاتیں تاکہ سن اونچا اونچا پیدا ہو۔ اس آخری کارروائی سے وہ منفعت بخش قوت آشکارا ہے جو شجری روح کی شبیہ سے منسوب کی جاتی ہے۔ پلسن (بوہیمیا) کے گرد و نواح میں یہ ہوتا ہے کہ ہری بھری شاخوں کی ایک ایسی مخروطی جھونپڑی تیار کی جاتی ہے جو چاروں طرف سے بند ہوتی ہے۔ اس جھونپڑی کو سفید عید پر گاؤں کے بیچوں بیچ نصب کر دیا جاتا ہے اور اس پر گاؤں کے لڑکوں کا پورا ایک رسالہ اپنے بادشاہ کی قیادت میں پہنچتا ہے۔ اس بادشاہ کے پہلو سے تلوار بندھی ہوتی ہے اور سر پر سیٹھے کی ایک ہرم نما ٹوپی۔ اس کے جلو میں ایک نقیب اور ایک مسخرا چلتا ہے، جو مینڈک مار کہلاتا ہے۔ آخرالذکر ایک زنگ آلود تلوار لگائے مریل ٹٹو پر سوار ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا جھونپڑی پر پہنچ کر نقیب اپنے گھوڑے سے اتر جاتا ہے اور اس کے

چاروں طرف دروازہ ڈھونڈتا پھرتا ہے اور جب اسے کوئی دروازہ نہیں ملتا تو یہ کہتا ہے ''اوھو یہ تو شاید کوئی جادو کا قلعہ ہے ۔ جادوگرنیاں پتوں میں سے رینگ کر نکل آتی ہیں ، انہیں دروازے کی حاجت نہیں ۔'' آخر کار وہ اپنی تلوار سونت لیتا ہے اور اس سے جھونپڑی میں اپنے لیے راستہ بنا لیتا ہے ۔ جھونپڑی کے اندر ایک کرسی رکھی ہوتی ہے جس پر وہ بیٹھ جاتا ہے اور قرب و جوار کی لڑکیوں ، کسانوں اور کھیت کے ملازموں کی مذمت میں ہجویہ شعر پڑھتا ہے ۔ جب یہ کارروائی ختم ہو چکتی ہے تو مینڈک مار آگے بڑھتا ہے اور ایک پنجرا دکھا کر جس میں مینڈک بند ہوتے ہیں ، ایک سولی کا تختہ نصب کرتا ہے اور اس پر ان مینڈکوں کو ایک قطار میں لٹکا دیتا ہے ۔ پلاس کے قرب و جوار میں یہ دستور کچھ مختلف ہے ۔ یہاں بادشاہ اور اس کے سپاہی سر سے پاؤں تک پھولوں اور ربنوں سے سجی چھال میں ملبوس ہوتے ہیں ۔ یہ سب کے سب تلواریں لیے ہری بھری شاخوں اور پھولوں سے آراستہ گھوڑوں پر سوار ہو کے نکلتے ہیں ۔ جس وقت منڈھوے پر گاؤں کی لڑکیوں اور عورتوں کے عیب گنے جاتے ہیں ، کوئی چپکے سے کسی مینڈکی کے چٹکی توڑ لیتا ہے ۔ وہ بلبلا کے چلا اٹھتی ہے اور بادشاہ اس مینڈکی کی موت کا حکم صادر کر دیتا ہے ، جس کی تعمیل میں جلاد اس کا سر قلم کر دیتا ہے اور اس کے لہولہان جسم کو اٹھا کر تماشائیوں میں پھینک دیتا ہے ۔ آخر میں بادشاہ کو جھونپڑی سے بھگا دیا جاتا ہے اور سپاہی اس کا پیچھا کرتے ہیں ۔ جیسا کہ مان ہارٹ کا خیال ہے ، مینڈکی کو ایذا پہنچانا اور اس کا سر کاٹنا بلاشبہ ایک بارشی افسوں ہے ۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ اوری نوکو کے بعض وحشی مینہ برسانے کی غرض سے مینڈکیوں کو پیٹتے ہیں ، نیز یورپ میں بارشی عمل کے طور پر مینڈک مارا جاتا ہے ۔

اکثر صورتوں میں نباتی روح کی نمائندگی بادشاہ کی بجائے ملکہ کرتی ہے ۔ لب چووک (بوھیمیا) کے گرد و نواح میں لینٹ (ایسٹر سے پہلے کے چالیس دن جو مجاہدۂ نفس اور روزوں کے لیے مخصوص ہیں) کے

چوتھے اتوار کو لڑکیاں سفید کپڑے پہنے اور بالوں میں نوبہار کے بنفشہ اور ڈیزی سجائے گاؤں میں ایک لڑکی کو لے کے نکلتی ہیں، جسے ملکۂ بہار کہا جاتا ہے۔ ان کے اس جلوس کے دوران میں جو بڑے ضابطے کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ کسی لڑکی کو ساکت کھڑے رہنے کی اجازت نہیں۔ اس کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ لگاتار گردش کرتی اور گاتی رہے۔ یہ ملکۂ بہار ہر گھر میں بہار کی آمد کا اعلان کرتی ہے اور گھر والوں کے حق میں خیر و برکت کی دعا کرتی ہے، جس کے عوض اسے تحفے ملتے ہیں۔ ہنگری کے جرمن علاقے میں لڑکیاں سب سے حسین دوشیزہ کو منتخب کرکے اسے سفید عید کی ملکہ بناتی ہیں۔ اس کی پیشانی سے ایک اونچا سا گجرا باندھ دیتی ہیں۔ پھر اسے لے کر گلی کوچوں میں پھرتی ہیں اور ہر گھر پر رک رک کر قدیم بیلیڈ (مختصر بندوں پر مشتمل سادہ اور عوامی گیت جو ساز پر گایا جاتا تھا۔ جدید مفہوم میں بیلیڈ سے مراد جذبات سے بھری ایسی نظم ہے جس میں کوئی قدیم روایت یا قصہ بیان کیا گیا ہو) گاتی ہیں اور تحفے وصول کرتی ہیں۔ آئرستان کے جنوب مشرقی علاقے میں یوم بہار پر سب سے خوب صورت لڑکی سال بھر کے لیے ضلع کی ملکۂ بہار منتخب کی جاتی تھی۔ اسے جنگلی پھولوں کا تاج پہنایا جاتا جس کے بعد دعوتیں اڑتیں، رقص اور دیہاتی کھیل ہوتے اور ان سب کے آخر میں شام کو ایک جلوس نکلتا۔ اپنے راج کے دوران میں وہ دیہی نوجوانوں کی رقص و سرود اور خوشی کی محفلوں میں صدارت کے فرائض انجام دیتی۔ اگر آئندہ یوم بہار سے پہلے اس کا بیاہ ہو جاتا تو اس کا یہ اقتدار ختم ہو جاتا، لیکن اس کی جانشین کا انتخاب آئندہ یوم بہار تک ملتوی رہتا۔ ملکۂ بہار والی یہ رسم فرانس میں عام ہے اور انگلستان میں بھی اکثر ادا کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ، بعض وقت نباتی روح بادشاہ اور ملکہ، رئیس اور بیگم یا دولہا اور دلہن کا روپ بھرتی ہے۔ اس صورت میں بھی نباتات سے انسانی اور انسانوں سے نباتی خصوصیات کے انتساب میں متوازیت قائم ہے، کیوں کہ اوپر بعض درختوں کو آپس میں بیاہنے

کی مثالیں ہماری نظر سے گزر چکی ہیں ۔ چناں چہ ہال فرڈ واقع جنوبی وارو ک شائر میں بچے جوڑیاں بنا کر ایک بادشاہ اور ملکہ کے زیر قیادت جلوس کی شکل میں کھر کھر پہنچتے ہیں ۔ ان میں سے دو لڑکے کوئی چھ یا سات فٹ اونچا ایک بیساکھا اٹھائے چلتے ہیں جو سبزہ و گل سے ڈھکا ہوتا ہے ۔ اس کے بالائی سرے کے پاس دو بلیاں آڑی بخط مستقیم بندھی ہوتی ہیں ۔ یہ بلیاں بھی ، نیز ان کے سروں سے لٹکے ہوئے ہوپ ، پھولوں سے ڈھکے ہوتے ہیں ۔ گھروں پر پہنچ کر یہ بچے بہار کے نغمے گاتے ہیں اور تحفے وصول کرتے ہیں ۔ ہوہیمیا میں کونیگراٹس کے قریب ایک گاؤں ہے جہاں سفید پیر کو لڑکے بادشاہ کا کھیل کھیلتے ہیں ۔ اس میں بادشاہ اور ملکہ ہار پہنے چھتر کے نیچے چلتے ہیں ۔ سب سے کم سن لڑکی ایک پلیٹ میں گجرے لیے ان کے پیچھے ہوتی ہے اور لڑکے اور لڑکیاں ، جو دولہا کے دوست اور دلہن کی سکھیاں کہلاتی ہیں ، ان کی خدمت کے لیے ساتھ ہوتے ہیں ۔ یہ سب کے سب تحفے وصول کرتے کھر کھر پہنچتے ہیں ۔ سی لیشیا میں سفید عید کے جشن عام کی ایک مستقل خصوصیت یہ تھی یا کسی حد تک آج بھی ہے کہ اس میں بادشاہت کے لیے باقاعدہ مقابلہ ہوتا تھا ، جس کی مختلف صورتیں تھیں ۔ اس میں گول یا مقررہ نشان عموماً بیساکھا یا شجر بہار ہوتا ۔ بعض صورتوں میں جو نوجوان چکنے کھمبے پر چڑھ کر گوھر مقصود اتار لاتا اس کے شاہ عید سفید اور اس کی محبوبہ کے ملکۂ عید سفید ہونے کا اعلان کر دیا جاتا ۔ اس کے بعد بادشاہ ھاتھارن کی جھاڑی لیے اپنے رفقاء کی معیت میں شراب خانے کا رخ کرتا جہاں رقص و ضیافت پر ان کی یہ رنگ رلیاں ختم ہو جاتیں ۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ نوجوان کسانوں اور مزدوروں میں گھڑ دوڑ ہوتی ، جس میں مقررہ نشان پھولوں ، ربنوں اور تاج سے سجا ایک بیساکھا ہوتا ۔ جو اس بیساکھے تک سب سے پہلے پہنچتا وہ بادشاہ تسلیم کر لیا جاتا اور باقی سب اس ایک دن کے لیے اس کے تابع فرماں ہو جاتے ۔ اس دوڑ میں جو سب سے پھسڈی رہتا وہ مسخرا بنتا ۔ بیساکھے کے پاس پہنچ کر سب اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر جاتے اور بادشاہ کو کندھوں پر اٹھا لیتے اور وہ بڑی پھرتی سے بیساکھے پر چڑھ جاتا اور اس کی

انی سے بندھی ہوئی شاخ بہار اور تاج اتار لاتا ۔ اتنے میں مسخرا نہایت تیزی سے شراب خانے پہنچتا اور وہاں سے تیس عدد نان پاؤ اور ایک گیلن برانڈی لے کر اس پر ٹوٹ پڑتا ۔ اس کے پیچھے بادشاہ شاخ بہار اور تاج اٹھائے اور جلو میں اپنے رفقاء کو لیے روانہ ہوتا ۔ اس دوران میں مسخرا اگر نان پاؤ اور برانڈی کا صفایا کر چکتا اور بادشاہ کے پہنچنے پر اس کی خدمت میں آداب بجا لاتا تو روٹی اور شراب کا خرچ بادشاہ ادا کرتا ، ورنہ اسے اپنا حساب آپ چکانا پڑتا ۔ پھر گرجا کی عبادت کا وقت گزرنے کے بعد ایک شان دار جلوس گاؤں کا چکر کاٹتا ، جس میں بادشاہ پھولوں کا ہار پہنے اور شاخ بہار ہاتھ میں لیے گھوڑے پر سوار سب کے آگے آگے چلتا اور مسخرا الٹے کپڑے پہنے ، سن کی ڈاڑھی لگائے اور سر پر عید سفید کا تاج رکھے اس کے پیچھے ہوتا ۔ دو سوار محافظوں کا بھیس بدلے ان کے جلو میں چلتے ۔ یہ جلوس ہر باڑے کے سامنے رکتا اور محافظ سوار گھوڑوں سے اتر کر اس کے اندر بند کر دیتے اور کھیت والے کی بیوی سے مسخرے کی ڈاڑھی دھونے کے لیے صابن کا چندہ مانگتے ۔ دستور کی رو سے انھیں اس بات کی آزادی ہوتی کہ ان اشیائے خوردنی میں سے جو مقفل نہ ہوں ، جو چاہیں لے جائیں ۔ سب سے آخر میں وہ اس مکان پر پہنچتے جس میں بادشاہ کی ملکہ رہتی ہو ۔ اسے ملکۂ عید سفید کی حیثیت سے سلامی دی جاتی اور شایان شان تحفے ، یعنی ایک رنگا رنگ کمر بند ، ایک کپڑا اور ایک ایپرن پیش کیا جاتا ۔ بادشاہ کو صدری ، گلوبند وغیرہ انعام میں ملتے ۔ نیز اسے اس بات کا حق حاصل ہو جاتا کہ وہ شاخ بہار یا شجر عید سفید کو اپنے آقا کے باڑے کے آگے نصب کر دے ، جہاں یہ شاخ یا شجر آئندہ سال اسی دن تک نشان امتیاز کے طور پر لگا رہتا ۔ آخر میں ان کا جلوس شراب خانے پہنچتا ۔ یہاں ملکہ اور بادشاہ محفل رقص کا افتتاح کرتے ۔ بعض وقت سفید عید کے بادشاہ اور ملکہ کا انتخاب ایک اور صورت سے عمل میں آتا ۔ ایک قد آدم پتلے کو جس کے سر پر لال ٹوپی رکھی ہوتی ، چھکڑے میں لاد کر دو نقلی محافظوں کے درمیان اس مقام پر لے جایا جاتا جہاں ایک نقلی عدالت اس کے مقدمے کی سماعت کے لیے تیار

ہوتی ۔ ایک جم غفیر اس چھکڑے کے پیچھے پیچھے ہوتا ۔ رسمی سماعت کے بعد پتلے کو سزائے موت دی جاتی اور مقتل میں ایک کھمبے سے باندھ دیا جاتا ۔ نوجوان جن کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی اسے نیزے کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ۔ اس میں جو کام یاب ہوتا وہ بادشاہ بن جاتا اور اس کی محبوبہ ملکہ ۔ اس پتلے کو جالوت (ایک فلسطی سورما جس نے بنی اسرائیل اور ان کے بادشاہ طالوت کے دانت کھٹے کر دیے تھے اور جو بالآخر حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں مارا گیا) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا ۔

ڈینمارک کے ایک کلیسائی حلقے میں سفید عید پر یہ دستور تھا کہ ایک کم سن لڑکی کو کپڑے پہنا کر عروس عید سفید بنایا جاتا اور ایک ننھے سے لڑکے کو اس کا دولھا ۔ اس لڑکی کا جوان دلھن کی طرح سنگھار کی تمام چیزوں سے بناؤ ہوتا اور وہ بہار کے تازہ ترین پھولوں کا تاج پہنے ہوتی ۔ اس کے دولھا کو پھولوں ، ربنوں اور گانٹھوں سے آراستہ کیا جاتا ۔ دوسرے بچے کسم اور گولے کے سنہری پھولوں کی زرق برق پوشاک زیب تن کیے ہوتے ۔ پھر یہ سب کے سب بڑے تزک و احتشام سے دلھن کی سہیلیوں کی پیشوائی میں باڑوں کا رخ کرتے اور ان کی آمد کا اعلان کرنے چھ یا آٹھ سوار گھوڑے دوڑاتے ان کے آگے روانہ ہوتے ۔ انڈے ، مکھن ، ڈبل روٹی ، بالائی ، کافی ، قند اور موم بتیاں جو ہر باڑے سے انھیں پیش کی جاتیں ، وہ ٹوکریوں میں رکھ لی جاتیں ۔ جب وہ سارے کھیتوں کا گشت لگا چکتے تو چند کسانوں کی بیویاں شادی کی دعوت کا انتظام کرتیں ۔ پھر بچوں کا کھڑاؤں ناچ شروع ہوتا جو پو پھٹنے اور چڑیوں کے چہچہانے تک جاری رہتا ۔ یہ سب چیزیں اب افسانہ ہو گئی ہیں اور صرف اگلے وقتوں کے لوگوں کو عید سفید کی ننھی دلھن اور اس کا ظاہری کر و فر یاد رہ گیا ہے ۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ رسمیں جو دوسرے مقامات پر یوم بہار اور عید سفید کے لیے مخصوص ہیں ، وہ سویڈن میں بالعموم وسط گرما میں ادا کی جاتی ہیں ۔ چناں چہ آج بھی سویڈن کے صوبۂ بیکنگی کے بعض حصوں میں ایک ''عروس گرما'' منتخب کی جاتی ہے ، جسے

کبھی کبھی گرجے کا تاج عاریتاً دے دیا جاتا ہے ۔ یہ لڑکی اپنے لیے ایک دولھا منتخب کرتی ہے اور اس جوڑے کے لیے، جس کے ساتھ عارضی طور پر میاں بیوی کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے ، چیزیں اکٹھی کی جاتی ہیں ۔ اس طرح دوسرے نوجوان بھی اپنے لیے ایک ایک دلھن منتخب کر لیتے ہیں ۔ ایسی ہی ایک رسم آج بھی ناروے میں جاری ہے ۔

بریون سون (ڈافنے) کے گرد و نواح میں یوم بہار پر ایک ایسے نوجوان کو، جس کی محبوبہ اس سے بے وفائی کرکے چلی گئی ہو ، یا کسی اور سے بیاہ کر لیا ہو ، لڑکے پھول پتوں میں لپیٹ دیتے ہیں ۔ یہ نوجوان سونے کا بہانہ کرکے پڑ رہتا ہے ، پھر ایک لڑکی جو اسے چاہتی ہے اور اس سے بیاہ کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے ، آن کر اسے جگاتی ہے اور اسے زمین سے اٹھا کر اس کے ساتھ شادی کا اقرار کرتی ہے اور اسے ایک جھنڈی پیش کرتی ہے ۔ اس کے بعد وہ شراب خانے جاتے ہیں جہاں ان دونوں کی پیشوائی میں رقص ہوتا ہے ۔ لیکن اس جوڑے کے لیے سال بھر کے اندر شادی کرنا لازمی ہے ، ورنہ ان کے ساتھ بوڑھے کنواروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے اور نوجوان ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں ۔ اس لڑکے کو نوشہ ماہ مئی کہا جاتا ہے ۔ شراب خانے پہنچ کر وہ اپنا لباس برگ اتار دیتا ہے ، جس میں پھول ملا کر اس کی ہم رقص ایک گلدستہ تیار کرتی ہے اور جب نوشہ اسے دوبارہ شراب خانے لے جاتا ہے تو وہ اسے اپنے سینے کی زینت بناتی ہے ۔ اسی طرح کی ایک روسی رسم ہے ۔ یہ ضلع نرختا میں اس جمعرات کو ادا کی جاتی ہے جو سفید اتوار سے پہلے پڑتی ہے ۔ اس رسم میں لڑکیاں برچ کے بن میں پہنچتی ہیں اور برچ کے کسی بلند و بالا درخت سے ایک پٹی یا کمر بند لپیٹ دیتی ہیں ۔ اس کی نچلی شاخوں کے ہار گوندھ کر ان میں سے ہر جوڑی ایک دوسرے کو چومتی ہے اور سہیلی کہتی ہے ۔ اس کے ایک لڑکی آگے بڑھتی ہے اور شرابی کا سوانگ بھر کر زمین پر گر پڑتی ہے ، گھاس پر لوٹ لگاتی ہے اور پھر یوں بن کر پڑ رہتی ہے جیسے گہری نیند میں ہو ۔ ایک اور لڑکی اس کے پاس پہنچتی ہے اور اس کا بوسہ لیتی ہے ۔ پھر وہ سب کی سب گاتی ہوئی بن کا

چکر کاٹتی ہیں اور گجرے بنا بنا کر انہیں پانی میں پھینکتی جاتی ہیں۔ ندی کے دھارے پر بہتے ہوئے ان گجروں میں انہیں اپنا نصیب نظر آتا ہے۔ اس رسم میں سونے والے کا سوانگ غالباً کسی زمانے میں ایک لڑکا بھرا کرتا تھا۔ متذکرہ فرانسیسی اور روسی رسموں میں ہمیں ایک ایسے دولہا کی مثال ملتی ہے جس کی محبوبہ اس سے بے وفائی کر گئی ہو۔ بر خلاف اس کے مندرجہ ذیل مثال میں دولہا کی جگہ ایسی دلہن ملتی ہے جس کا چاہنے والا اسے چھوڑ گیا ہو۔ اس منگل کو جو توبہ و استغفار کے لیے مخصوص ہے، اوبکرین کے سلافی خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے ایک کٹھ پتلی لیے گاؤں میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر پھرتے ہیں۔ پھر وہ اسے پانی میں پھینک دیتے ہیں یا آگ میں ڈال دیتے ہیں اور اس سے اٹھتے ہوئے شعلوں کی بلندی سے اگلی فصل کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اس میں آدمیوں کا ایک غول غل مچاتا ایک نقاب پوش عورت کے پیچھے پیچھے ہو لیتا ہے، جو ڈوری سے بندھا ایک لمبا چوڑا تختہ گھسیٹتی جاتی ہے اور لوگوں سے یہ کہتی جاتی ہے کہ وہ ایک حرمان نصیب دلہن ہے، جس کا دولہا اس سے بے وفائی کر گیا ہے۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی روشنی میں اس شخص کا جگایا جانا، جو اپنی محبوبہ کی بے وفائی کا زخم کھا کر سو رہتا ہو، بہار میں احیائے نباتات کی تمثیل ہے۔ لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ مذکورہ بالا دولہا اور اسے جگانے والی لڑکی ان رسوم میں اپنا اپنا جو حصہ ادا کرتے ہیں اس کی بناء کیا ہے؟ کیا یہ سونے والا شخص سردیوں میں جنگل کے بے برگ و بار درختوں یا بے گیاہ زمین سے عبارت ہے؟ کیا اسے جگانے والی لڑکی بہار کی تازہ نباتات یا خوشگوار دھوپ کا مظہر ہے؟ موجودہ شواہد کی بناء پر ان سوالات کا جواب دینا ممکن نہیں۔

اسکاٹ لینڈ کے کہستان میں یوم سینٹ برائڈ پر، جو یکم فروری کو منایا جاتا تھا، بہار میں نباتات کی نئی زندگی کی ہو بہو تصویر پیش کی جاتی تھی۔ چناں چہ ہبریڈیز میں ''ہر گھر کی خاتون اور اس کی کنیزیں جئی کی ایک پولی لے کر اسے زنانہ لباس پہناتیں اور

ٹوکری میں ڈال کر اس کے برابر ایک بلی رکھ دیتیں، جسے دلھن کا بستر کہا جاتا۔ پھر گھر والی اور اس کی کنیزیں تین مرتبہ یہ الفاظ بہ آواز بلند دھراتیں ''دلھن آگئی، دلھن خوش آمدید!'' یہ سب سونے سے پہلے ہوتا اور اگلے روز صبح جب وہ بیدار ہوتیں تو راکھ میں بلی کا نشان تلاش کرتیں۔ اگر وہ انھیں نظر آ جاتا تو اسے اچھی فصل اور بھاگوان سال کی علامت سمجھا جاتا اور اگر کچھ نظر نہ آتا تو اسے شگون بد خیال کیا جاتا۔ اس رسم کو ایک شاھد عینی نے یوں بیان کیا ھے: ''کینڈل مس (حضرت مریم کے چلہ نہانے کا دن) کی رات کو یہ ھوا کرتا ھے کہ دھلیز کے پاس گھر کے ایک حصے میں اناج اور سوکھی گھاس کا ایک بستر سا بنا دیا جاتا ھے، جس پر چند کمبل دیے جاتے ھیں۔ اس کے بعد ایک شخص باھر نکل کر تین مرتبہ یہ الفاظ دھراتا ھے، 'دلھن، دلھن، آؤ بستر تیار ھے۔' اس کے قریب ایک یا ایک سے زائد موم بتیاں تمام رات جلتی رھتی ھیں۔'' اسی طرح جزائر مان میں ''یکم فروری کی شب کو اس خاتون کے اعزاز میں جو سینٹ ماگولڈ سے بیعت ھو کر نن بننے کے لیے جزیرہ مان چلی گئی تھی، ایک تیوھار منایا جاتا تھا جسے مانکون (مذکورہ بالا جزائر کے باشندے) کی زبان میں ''لال بری شے'' کہا جاتا تھا۔ اس میں دستور یہ تھا کہ سیٹھے کی ھری بھری ٹہنیوں کی پولیاں اکٹھی کی جاتیں اور ان کے برابر دھلیز پر کھڑے ھو کر سینٹ بریجیٹ کو دعوت دی جاتی کہ وہ آئیں اور رات گھر میں گزاریں۔ اس دعوت کے الفاظ یہ تھے: 'دلھن، دلھن! میرے گھر آؤ، میرے گھر آؤ، دلھن کے لیے دروازہ کھولو، دلھن کو اندر آنے دو!'' ان الفاظ کے دھرائے جانے کے بعد سیٹھے کی وہ ٹہنیاں فرش یا سینٹ بریجیٹ کے بستر کے طور پر بچھا دی جاتیں۔ بالکل ایسی ھی ایک رسم سلطنت مان کے بعض بیرونی جزائر میں جاری تھی۔'' ظاھر ھے کہ ان مانکی اور اسکاچستانی رسموں میں سینٹ برائڈ یا سینٹ بریجیٹ مسیحیت کے پردے میں عہد بت پرستی کی ایک بار آور دیوی ھے۔ غالباً یہ آگ اور فصلوں کی کیلٹی دیوی بری جٹ کے سوا کوئی اور نہیں۔

بسا اوقات نباتی روح کا بیاہ، جو اگرچہ براہ راست کوئی تمثیلی صورت اختیار نہیں کرتا ، اس کی انسانی شبیہ کو 'دلھن' کہنے اور شادی کے کپڑے پہنانے میں مقدر ہوتا ہے ۔ چناں چہ آلٹ مارک کے بعض قریوں میں سفید تیوھار پر جس وقت لڑکے شجر بہار لے کر یا ایک لڑکے کو پھول پتوں میں لپیٹے گھومتے پھرتے ہیں، لڑکیاں عروس بہار کو لے کر نکلتی ہیں ۔ یہ ایک لڑکی ہوتی ہے جسے لباس عروسی پہنایا جاتا ہے اور جس کے سر میں پھولوں کی موٹی سی بینی لگی ہوتی ہے ۔ یہ عروس بہار اپنی سکھیوں کی معیت میں ایک گیت گاتی ہوئی گھر گھر پہنچتی ہے ، جس میں وہ نذریں طلب کرتی ہے اور گھر والوں سے کہتی ہے کہ اگر وہ اسے کچھ نہ کچھ دیں تو انھیں بھی سال بھر کچھ نہ کچھ ضرور ملتا رہے گا ، لیکن اگر وہ کچھ نہ دیں تو خود بھی کچھ نہ پائیں گے ۔ ویسٹ فیلیا کے کچھ حصوں میں دو لڑکیاں ایک لڑکی کو لیے، جس کے سر سہرا بندھا ہوتا ہے اور جو سفید تیوھار کی دلھن کہلاتی ہے ، در بدر انڈے مانگتی پھرتی ہیں ۔

گیارھواں باب

# نباتات پر جنس کا اثر

اوپر یورپ کے بہاری اور گرمائی تیوہاروں کی جو چھان بین کی گئی ہے ، اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے غیر مہذب اسلاف کی نظر میں نباتی قوتیں عورتوں اور مردوں کی جنسی خصوصیات کی حامل تھیں اور وہ مثلی یا صوری سحر کے اصول پر بہار کے بادشاہ اور ملکہ ، سفید عید کے دولہا اور دلہن وغیرہ کے روپ میں جنگل کے معبودوں کا بیاہ کرکے درختوں اور پودوں کی روح نمو بیدار کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ متذکرہ قوتوں کی یہ تمثیلی صورتیں محض اشاری یا مثالی قسم کے ڈرامے یا ایسے دیہی ناٹک نہ تھے جن کا مقصد گاؤں کے تماشائیوں کو محظوظ یا وعظ و نصیحت کرنا ہو ؛ یہ سب افسون تھے جن کے اثر سے بنوں کو سر سبز کرنا ، سبزے کو نمو بخشنا ، اناج کی افزائش کرنی اور پھول کھلانے مقصود تھے ۔ اور لوگوں کو یہ خیال پیدا ہونا قدرتی بات تھی کہ پھول پتوں میں ملبوس یہ بہروپئے جنگلی روحوں کی اصلی شادی کی جس قدر صحیح تصویر پیش کریں گے ، اسی قدر اس قسم کا افسوں مؤثر ہوگا ۔ لہذا یہ فرض کرنا قرین صحت ہوگا کہ یہ رسمیں جن اوباشیوں کے لیے بدنام تھیں ، ان کی حیثیت کسی زمانے میں محض اتفاق بے راہ روی کی نہ تھی بلکہ وہ ان رسموں کا لازمی جزو تھیں اور یہ کہ ان رسموں کو جو لوگ ادا کیا کرتے تھے ان کی رائے میں درختوں اور پودوں کا بیاہ انسانی

جنسوں کے اختلاط کے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا تھا ۔ آج کے مہذب یورپ میں اس قسم کی رسموں کی تلاش جو صریحاً نباتات کے فروغ و افزائش کی غرض سے ادا کی جاتی ہوں ، بے سود ہوگی لیکن دنیا کے دوسرے حصوں میں نیم وحشی نسلیں زمین کو زرخیز کرنے کے لیے دانستہ جنسی اختلاط سے کام لیتی رہی ہیں اور بعض رسموں کی ، جو اب تک یا کچھ عرصہ پیشتر تک یورپ میں جاری رہی ہیں ، معقول حد تک یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ وہ ایسے ہی دستور کی بچی کھچی صورتیں تھیں جنھیں مذموم سمجھ کر ترک کر دیا گیا ۔ حسب ذیل واقعات سے اس کی وضاحت ہوگی ۔

وسطی امریکہ کے پی پائل بیج کی بوائی سے چار دن قبل اپنی بیویوں سے علیحدہ رہتے ''تاکہ تخم ریزی سے پہلے جو رات آئے اس میں وہ اپنی نفسانی خواہشات جی بھر کر پوری کر سکیں ۔ بعض لوگوں کے بارے میں تو یہ تک کہا جاتا ہے کہ وہ عین اس وقت مباشرت کرتے ہیں جب پہلا بیج زمین میں پیوست کیا جاتا ہے ۔'' بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مذہبی رہنما انھیں حکم دیتے تھے کہ اس وقت اپنی بیویوں کو ضرور تصرف میں لائیں ، جس کی خلاف ورزی کی صورت میں ان کے لیے بوائی ناجائز قرار پاتی ۔ اس دستور کی صرف یہی توجیہ ممکن معلوم ہوتی ہے کہ یہ ریڈ انڈین اس عمل کو جس کے ذریعے انسان اپنی نسل کا سلسلہ جاری رکھتا ہے اور پودوں کی افزائش نوع کے عمل کو ایک ہی چیز خیال کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ مباشرت کے ساتھ ساتھ مؤخرالذکر عمل بھی انجام پاتا ہے ۔ جاوا کے بعض علاقوں میں یہ دستور ہے کہ جس وقت وہاں دھان اپنے شباب پر ہوتا ہے ، کاشت کار اور اس کی بیوی رات کے اندھیرے میں کھیت پر جاتے ہیں اور فصل کی افزائش کی غرض سے مباشرت کرتے ہیں ۔ لیتی سار ماتا اور ان دوسرے جزائر کے باطل پرست باشندوں کے نزدیک جو ساحل نیوگنی کے مغربی سرے اور آسٹریلیا کے شمالی علاقے کے درمیان واقع ہیں ، آفتاب کی حیثیت عنصر نرینہ کی ہے اور زمین کی حیثیت عنصر مادین کی ، جسے آفتاب بارور کرتا ہے اسے وہ اپولیرا

یا شری سوریہ کہتے ہیں اور اس کی شبیہ کے طور پر ناریل کے پتوں کے چراغ تیار کرتے ہیں جو ہر جگہ ان کے گھروں میں اور انجیر کے مقدس شجر کے نیچے رکھے نظر آتے ہیں ۔ اس شجر کے نیچے ایک بڑا سا چپٹا پتھر رکھا رہتا ہے ، جس سے قربانی کی میز کا کام لیا جاتا ہے ۔ اس پر دشمنوں کے کٹے ہوئے سر رکھے جاتے تھے اور بعض جزیروں میں آج بھی رکھے جاتے ہیں ۔ ہر سال ایک مرتبہ برسات کے شروع میں شری سوریہ زمین کو بارور کرنے کی غرض سے انجیر کے درخت پر اترتے ہیں ۔ سات سیڑھیوں کا ایک نردبان اس شجر سے لگا باقاعدہ تیار رہتا ہے تاکہ وہ سہولت سے اتر سکیں ۔ نردبان پر ان طیور کی تصویریں کھدی ہوتی ہیں جو اپنی بانگ سے مطلع مشرق پر ورود خاور کی منا دی کرتے ہیں ۔ اس موقع پر سؤر اور کتے کثیر تعداد میں قربان کیے جاتے ہین ۔ مرد و زن یکساں داد عیش دیتے ہیں اور سورج اور دھرتی کے لگن کو ظاہر کرنے کے لیے اس شجر مقدس کے تلے رقص و سرود کے ساتھ کھلے بندوں مرد و زن کی مواصلت کا ڈراما ہوتا ہے ۔ اس تیوہار کا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہے کہ سورج دیوتا سے آب باراں ، رزق اور دولت بہ افراط حاصل کی جائے ۔ وہ یہ پرارتھنا کرتے ہیں کہ ہر بکری دو دو یا تین تین بچے دے ، آدمیوں کی نسل بڑھے ، مردہ سؤروں کی جگہ نئے سؤر پیدا ہوں اور چاول کے خالی ٹوکرے بھر جائیں وغیرہ وغیرہ ۔ نیز سورج سے اپنی التجائیں قبول کرانے کے لیے اسے سؤر کا گوشت ، چاول اور شراب پیش کرتے ہیں اور اس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ آئے اور بسم‌اللہ کرے ۔ جزائر بابر میں اس تیوہار پر آفتاب کی تخلیقی توانائی کی علامت کے طور پر ایک جھنڈا نصب کیا جاتا ہے ۔ سفید سوتی کپڑے کا یہ جھنڈا کوئی نو فٹ اونچا ہوتا ہے اور ایک خاص حالت میں آدمی کی تصویر پیش کرتا ہے ۔ ان موقعوں پر بدمستیوں کا جو مظاہرہ ہوتا ہے انھیں محض شہوانی جوش پر محمول کرنا قرین انصاف نہ ہوگا ۔ یہ فحش رسمیں یقیناً زمین کی بار آوری اور آدمی کی زرخیزی کے لیے ناگزیر سمجھ کر ادا کی جاتی ہیں ۔

انھی ذرائع کا، جو اس طرح فصلوں کی قوت افزائش کو بیدار کرنے کی غرض سے اختیار کیے جاتے ھوں، درختوں کو بارور کرنے کے لیے استعمال کیا جانا قدرتی بات ھے۔ چناں چہ ایمبونیا کے بعض علاقوں میں لونگ کے کشت زار کی حالت سے فصل کی قلت کا امکان ظاھر ھو تو رات کے وقت لوگ ان کشت زاروں پر برھنہ پھنچتے ھیں اور پودوں کو اس طرح بارور کرنے کی کوشش کرتے ھیں، جیسے عورتوں کا حمل ٹھہراتے ھوں اور ساتھ ھی یہ نعرہ لگاتے ھیں ''اور لونگ!'' ان کا خیال ھے کہ اس عمل سے درختوں پر لونگ بہ کثرت آئے گی۔

وسطی افریقہ کے باگنڈا مباشرت اور زمین کی زرخیزی کے قریبی تعلق پر اس شدت سے یقین رکھتے ھیں کہ ان کے ھاں بیوی بانجھ ھو تو اسے رخصت کر دیا جاتا ھے، اس لیے کہ ایسی عورت کے اثر سے اس کے شوھر کے باغ کے درخت بار لانا چھوڑ دیتے ھیں۔ برخلاف اس کے، ان کے عقیدے کی رو سے ایسے میاں بیوی میں جنھوں نے جڑواں بچے پیدا کرکے اپنی غیر معمولی قوت افرائش نسل کا ثبوت دیا ھو، کیلے کے پودے کی باروری میں اضافہ کرنے کی طاقت ودیعت ھوتی ھے، جو ان کی اصل خوراک پیدا کرتا ھے۔ جڑواں بچوں کی پیدائش کے تھوڑی دیر بعد ایک رسم ادا کی جاتی ھے، جس کا واضح مقصد یہ ھے کہ ان بچوں کے ماں باپ کا تولیدی جوھر کیلوں میں منتقل کیا جائے۔ ماں گھر کے قریب گھنی گھاس پر چت لیٹ جاتی ھے اور کیلے کا ایک پھول اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں رکھ لیتی ھے۔ پھر اس کا شوھر آن کر اپنے.....کی ضرب سے پھول کو نکال پھینکتا ھے۔ نیز یہ دونوں میاں بیوی اپنے علاقے کا چکر کاٹتے ھیں اور اپنے عزیز دوستوں کے باغوں میں رقص کرتے ھیں تاکہ کیلے کے درختوں پر افراط سے پھل آئے۔

یورپ کے مختلف حصوں میں بہار اور فصلوں کی کٹائی کے موسم میں ایسی رسمیں جاری رھی ھیں جن کی بنیاد صریحاً اس خیال خام پر ھے کہ انسانی جنسوں کے باھمی رشتے سے کام لے کر پودوں کی

قوت افزائش و نمو بیدار کی جا سکتی ہے ۔ مثلاً یوکرین میں یوم سینٹ جارج پر (۲۳ اپریل کو) جب کھیتوں میں کلے پھوٹتے ہیں تو پادری اپنی عبا پہنے کلیسائی خدام کے ساتھ وہاں پہنچتا ہے اور ان کلوں کے لیے دعائے برکت پڑھتا ہے ۔ اس کے بعد جوان بیاہتا جوڑے کھیتوں میں کئی مرتبہ لوٹ لگاتے ہیں ۔ ان کے عقیدے کے بموجب ایسا کرنا فصلوں کے لیے باعث تقویت ہوتا ہے ۔ روس کے بعض حصوں میں عورتیں خود پادری کو پھوٹتے ہوئے کلوں پر لٹاتی ہیں ، بلا لحاظ اس کے کہ اس منفعت بخش عمل میں اسے کیچڑ اور گڑھوں میں لوٹنا پڑے گا ۔ اگر راعی (پادری) مزاحمت یا احتجاج کرے تو اس کی رعیت بڑبڑانے لگتی ہے کہ وہ ''ان کا خیر خواہ نہیں ہے ، اور ان کے اناج پر گزارا تو کرنا چاہتا ہے لیکن اسے یہ منظور نہیں کہ انہیں اناج میسر آئے ۔'' جرمنی کے بعض حصوں میں جب فصلوں کی کٹائی ہوتی ہے تو وہ عورتیں اور مرد جو اس میں شریک ہوتے ہیں ، کھیتوں میں لوٹ لگاتے ہیں ۔ یہ صورت بھی غالباً کسی ایسے قدیم اور وحشیانہ دستور کی یادگار ہے جس کی شدت میں استداد زمانہ سے کمی آ گئی ہے اور جس کے ذریعے ایسے طریقوں سے زمین کو بارور کرنا مقصود تھا جن سے قدیم زمانے میں وسطی امریکہ کے پی پائل کام لیتے تھے اور جو آج بھی چاول کے جاوائی کاشت کار اختیار کرتے ہیں ۔

اس طالب علم کے لیے جو ان پر پیچ راہوں کا جویا ہو ، جن سے تلاش حق میں انسانی ذہن گزرا ہے ، یہ امر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نباتات پر جنسوں کے مشارک اثر کے بارے میں جس نظری اعتقاد کے بموجب زمین کو بارور کرنے کے لیے جہاں بعض اقوام نے عیاشی سے کام لیا ہے وہاں بعض دوسری اقوام نے اس سے بالکل متضاد ذرائع اختیار کیے ہیں ۔ چناں چہ نیکارا گوا (وسطی امریکہ) کے قدیم باشندے مکئی کی فصل کی بوائی سے اس کی کٹائی کے وقت تک بڑی پاک بازانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اپنی بیویوں سے مجتنب رہتے تھے ۔ اس تمام عرصے میں وہ نمک ، کوکو اور چیچا یعنی اس شراب سے پرہیز کرتے جو مکئی کے خمیر سے تیار کی جاتی ہے ۔ مختصر یہ کہ ان کے لیے یہ موسم ، جیسا

کہ ایک ہسپانوی مورخ کا خیال ہے ، پرہیز گاری کا زمانہ تھا ۔ آج تک وسطی امریکہ کے بعض قبائل فصلوں کی افزائش کی غرض سے مجاہدۂ نفس کرتے ہیں ۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ کیکچی نامی امریکی قوم کے لوگ بوائی سے قبل اپنی بیویوں سے علیحدہ سوتے ہیں اور پانچ دن تک گوشت کو نہیں چھوتے ، نیز لانکی نیرو اور کاجابو نیرو لوگوں میں اس مجاہدۂ نفس کی مدت تیرہ دن ہے ۔ اسی طرح ٹرانسلوینیا کے بعض جرمنوں کا یہ اصول ہے کہ کوئی شخص ، جب تک وہ کھیتوں کی بوائی میں لگا ہو ، اپنی بیوی سے ہم بستر نہیں ہو سکتا ۔ اسی اصول کے ہنگری میں کالوتا سیگ والے بھی پابند ہیں ۔ ان لوگوں کے خیال میں اگر اس دستور سے انحراف کیا جائے تو اناج کو پھپوند لگ جائے گی ۔ اسی طرح وسطی آسٹریلیا کے کایتیش قبیلے کا کوئی سردار اس تمام عرصے میں جب کہ وہ گھاس اگانے کے لیے سحری رسمیں ادا کر رہا ہو ، اپنی بیوی سے سخت پرہیز کرتا ہے اس لیے کہ اس اصول کی خلاف ورزی سے گھاس کے کلے اچھی طرح نہیں پھوٹ پائیں گے ۔ ملینیشیا کے بعض جزائر میں جس وقت رتالو کی بیلیں چڑھائی جا رہی ہوں ، مرد سب باغوں کے قریب سوتے ہیں اور اپنی بیویوں کے سائے سے دور رہتے ہیں ۔ اگر وہ اس ضابطۂ پرہیزگاری کی خلاف ورزی کرکے باغ میں داخل ہوں تو اس کا پھل خراب ہو جاتا ہے ۔

یہاں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ایک جیسے عقائد کے منطقی نتیجے کے طور پر دو متضاد ضوابط عمل ، یعنی جنسی اختلاط سے اجتناب کلی اور کھلی فحاشی کے اصول ، کیسے پیدا ہو گئے؟ وحشی کی فہم و دانش کے لحاظ سے اس کی توجیہ چنداں دشوار نہیں ۔ اگر وحشی کو اپنی ذات اور فطرت مماثل نظر آتے ہوں ؛ اگر وہ اپنے داخلی محرکات و عوامل اور فطرت کے ان ہمہ گیر رجحانات میں تمیز کرنے سے قاصر رہے ، جو حیوانات و نباتات کی پیدائش و افزائش کی تہ میں کارفرما ہیں تو وہ بلا تامل ان دو میں سے کوئی ایک نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ اس کا اپنی جنسی بھوک کو پورا کرنا حیوانات و نباتات کی افزائش کا باعث ہوگا یا وہ اپنی قوت تناسل کے استعمال سے احتراز کرے تو اس طرح توانائی کا

جو ذخیرہ جمع ہوگا وہ دوسری مخلوقات کی افزائش نوع میں ، خواہ وہ حیوانات ہوں یا نباتات ، کسی نہ کسی صورت سے ضرور کام آئے گا۔ اس طرح ایک ہی قسم کے وحشیانہ فلسفے سے ، ایک ہی قسم کے نا مکمل تصورات حیات و فطرت سے ، وہ مختلف دلائل کی بناء پر ضبط نفس یا تعیش کا ایک اصول اخذ کر لیتا ہے ۔

جن قارئین کا ذہنی خمیر مشرق کے کسی عینیت پسند مذہب سے بنا ہو ، انہیں خاص حالات میں وحشیوں کی پرہیزگاری کے اصول کی یہ توجیہ شاید بے جا اور دور از قیاس نظر آئے ۔ انہیں اس اصول کو اخلاق پاکیزگی سے الگ کرکے دیکھنا شاید کچھ زائد سی بات معلوم ہو ، اس لیے کہ ایسے لوگوں کے ذہن میں ضبط نفس کا تصور اخلاق پاکیزگی سے وابستہ ہوتا ہے ۔ ملٹن کی طرح ان قارئین کرام کا شاید یہ خیال ہو کہ عفت یا پاک دامنی بجائے خود ایک بڑی اخلاقی خوبی ہے اور جو لوگ اپنے نفس امارہ کو مار کر اپنے اندر یہ وصف اعلیٰ پیدا کر لیتے ہیں انہیں عام سطح سے بلند وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جو رضائے الٰہی کا ضامن ہے ۔ یہ انداز فکر ہمیں کیسا ہی فطری کیوں نہ معلوم ہو ، وحشی کے لیے نہایت عجیب و غریب بلکہ ناقابل فہم ہے ۔ اگر وہ کبھی کبھی اپنی جنسی جبلت کو دباتا ہے تو اس کا سبب کسی اعلیٰ نصب العین کا شعور اور اخلاق پاکیزگی کی لگن ہرگز نہیں ، بلکہ وہ کسی ایسے مقصد کے لیے ضبط نفس سے کام لیتا ہے جس کا حصول فوراً ممکن نہ سہی ، لیکن جو ٹھوس اور قطعی ہوتا ہے ۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ بات یہی ہے یا یہی کچھ ہو سکتی ہے ، محولہ بالا مثالیں نہایت کافی ہیں ۔ ان سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ تحفظ ذات کی جبلت ، جو بیشتر تلاش قوت لایموت کی صورت میں رونما ہوتی ہے ، جنسی جبلت سے متصادم ہوتی نظر آئے ، جو افزائش نسل کا سر چشمہ ہے ، تو حفظ و بقا کے تقاضے اس دوسری جبلت پر غالب آ جاتے ہیں ۔ بہ الفاظ دیگر کہ وحشی پیٹ کی خاطر اپنی جنسی امنگ کو مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ دوسرا مقصد جس کے لیے وہ اپنے آپ پر جبر کرتا ہے ، جنگ میں فتح و نصرت ہے ۔ نہ صرف وہ سپاہی جو میدان جنگ

میں مصروف پیکار ہو ، بلکہ اکثر گھر پر اس کے اعزا و احباب بھی اپنی نفسانی خواہشات کو دباتے ہیں ۔ ان کے عقیدے کے بموجب ایسا کرنے سے سپاہی کے لیے دشمن کو زیر کرنے میں آسانی ہوتی ہے ۔ اس قسم کے عقیدے کا منطقی سقم بھی اس عقیدے کی مانند کہ بوائی کرنے والے کی پاک دامنی بیج کے اگانے میں مدد و معاون ہوتی ہے ، بالکل عیاں ہے ۔ تاہم ہر چند کہ اس قسم کے عقائد کی کوئی بنیاد اور اصلیت نہیں ، ان کی بناء پر جو مجاہدۂ نفس کیا گیا ہے وہ نسل انسانی کی قوت و استحکام کے لیے سود مند ضرور ثابت ہوا ، کیوں کہ نسل اور فرد دونوں کے کردار کی قوت بڑی حد تک اس بات پر موقوف ہوتی ہے کہ حال کو مستقبل پر قربان کر دیا جائے ؛ ان ذرائع کی خاطر جو آئندہ مسرت و انبساط کا ایک مستقل سر چشمہ ہیں ، ہنگامی لذتوں سے اجتناب کیا جائے طاقت سے جس قدر کام لیا جائے گا اسی قدر کردار بلند اور مستحکم ہوگا ، یہاں تک کہ جو لوگ اس خیال سے زندگی کی مسرتوں سے کنارہ کر لیتے ہیں ، بلکہ اپنی جانیں بھی قربان کر دیتے ہیں کہ آئندہ نسلوں کو صدیوں بعد ہی شاید کبھی ان کے اس ایثار کا فائدہ پہنچ جائے اور سچائی اور آزادی کی برکتیں میسر آ جائیں ، وہ سورما بن جاتے ہیں ۔

بارھواں باب

# مقدس بیاہ

## (۱) دائنا، بارور کرنے والی دیوی کی حیثیت سے

ہم دیکھ آئے ہیں کہ ایک عام عقیدے کے بموجب جو اصلیت سے خالی نہیں، درختوں میں جنسی اختلاط کے ذریعے افزائش نوع ہوتی ہے اور یہ کہ مثلی یا صوری سحر کے اصول پر نباتی روحوں کی تمثیلی شکلوں میں مردوں اور عورتوں کے اصلی یا نقلی بیاہ سے درختوں کی افزائش کے اس عمل کو تقویت پہنچتی ہے۔ اس قسم کے سحری ڈراموں کا یورپ کے عوامی تیوہاروں میں بڑا حصہ رہا ہے اور چوں کہ ان کی بنیاد ضابطۂ فطرت کے ایک نہایت موہوم سے شعور پر ہے، اس لیے یہ کھیل نہایت قدیم زمانے سے چلے آتے ہوں گے۔ اس وجہ سے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ یہ اصل میں اس زمانے کی یادگار ہیں جب یورپ کی مہذب اقوام کے اسلاف ابھی وحشت و جاہلیت کی حالت میں تھے اور ان وسیع جنگلات میں زمین کے کھلے ٹکڑوں پر پڑاؤ ڈالے مویشی چراتے اور کھیتی باڑی کرتے تھے، جو بحیرۂ قلزم سے لے کر بحیرۂ منجمد شمالی تک اس براعظم کے بیشتر حصے پر چھائے ہوئے تھے۔ لیکن برگ و بار اور سبزۂ و گل کی افزائش و نمو کے لیے قدیم جادو منتر دیہاتی ناٹکوں اور عوامی جشنوں کی صورت میں آج تک باقی ہیں، تو کیا یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ وہ کسی قدر مذہبی ضابطے کا رنگ لیے کلاسیکی عہد

کی متمدن اقوام میں موجود نہ ہوں گے ، یا دوسرے لفظوں میں ، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس عہد کے تیوہاروں میں ہماری آج کی بہار ، گرما اور سفید عید والی رسموں کے ایسے نمونے مل جائیں جنھوں نے ابھی نرے کھیل تماشوں کی صورت اختیار نہ کی ہو بلکہ اپنی اس قدیم صورت میں سحری اور مذہبی رسوم کی حیثیت رکھتے ہوں اور ان میں حصہ لینے والے شعوری طور پر دیوتا اور دیویوں کا روپ بھرتے ہوں ؟ اس کتاب کے ابتدائی باب میں ہم نے معقول وجوہ کی بناء پر یہ رائے قائم کی تھی کہ اس پجاری کی ملکہ ، جس کو بن کے بادشاہ کا لقب حاصل تھا ، خود شجر زار کی دیوی دائنا تھی ۔ لہذا کیا یہ پجاری اور دیوی ، بادشاہ اور ملکہ کی حیثیت سے ان زندہ دل بھروپیوں کی سنجیدہ صورتیں نہ ہوں گی جو جدید یورپ میں بہار کے بادشاہ اور ملکہ ، سفید تیوہار کے دولہا اور دلہن کا حصہ ادا کرتے ہیں ؟ نیز کیا بن کے بادشاہ اور ملکہ کے ملاپ کی رسم ہر سال دیو بیاہ کے طور پر ادا نہیں کی جاتی ہوگی ؟ دیوتا اور دیویوں کی شادی کے ایسے ناٹک ، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ، کلاسیکی دنیا کے بہت سے حصوں میں باضابطہ مذہبی رسموں کی صورت میں کھیلے جاتے تھے ۔ لہذا یہ بات فی نفسہ قرین صحت معلوم ہوتی ہے کہ نیمی کے مقدس شجرزار میں اس قسم کی رسم ہر سال ادا کی جاتی تھی ۔ اگرچہ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جس سے براہ راست اس بات کا ثبوت ملتا ہو ، لیکن نظائر سے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے ۔ اب میں اسی نکتے کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا ۔

دائنا بنیادی طور پر بنوں کی دیوی تھی ۔ جس طرح سیریز (ڈیمٹر کا رومی نام) اناج کی دیوی اور باخوس تاک کا دیوتا تھا ۔ اس کی عبادت گاہیں عموماً شجر زاروں میں ہوتی تھیں ، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہر شجر زار اس کے لیے مخصوص تھا اور نذروں میں اکثر اسے جنگل کے دیوتا سلوانس سے منسوب کیا جاتا تھا ۔ لیکن دائنا کی اصل خواہ کچھ ہی سہی ، وہ ہر صورت میں محض ایک شجری معبود نہ تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی یونانی بہن ارتمیس کی طرح ترقی کرتے

کرتے عالم فطرت کا مظہر بن گئی جو نباتات و حیوانات دونوں سے معمور ہے۔ بن کی رانی کی حیثیت سے اس کے بارے میں یہ خیال پیدا ہونا قدرتی بات تھی کہ وہ جنگلی اور پالتو چوپائے جو بن میں پڑے پھرتے اور گھنی جھاڑیوں میں دبکے شاخوں میں سے ان کے ہرے ہرے پتے اور کونپلیں چبایا کرتے یا کھلے میدانوں اور وادیوں میں کھڑے جڑی بوٹی پر منہ مارا کرتے ، وہ سب کے سب دائنا کی ملکیت ہیں۔ اس طرح سلوانس کی مانند جو نہ صرف بنوں کا دیوتا تھا بلکہ مویشی کا بھی ، دائنا نے شکاریوں اور گڈریوں کی محافظ دیوی کی بھی حیثیت اختیار کر لی۔ اسی صورت سے فن لینڈ میں درندوں کو بن کے دیوتا ٹاپو اور اس کی حسین و با تمکین بیوی کا گلہ خیال کیا جاتا تھا۔ کوئی شخص ان میں سے کسی جانور کو مار نہیں سکتا تھا ، تاوقتیکہ وہ ان کے مقدس مالکوں کی اجازت نہ طلب کر لیتا۔ اسی لیے فن شکاری صحرائی معبودوں سے پرارتھنا کیا کرتا اور یہ مراد مانگا کرتا کہ اگر معبود شکار کو اس کے راستے پر ڈال دیں تو وہ انھیں گراں قدر قربانی دے گا۔ مویشی کو بھی خواہ وہ تھان پر ہوں یا جنگل میں بھٹکتے پھرتے ہوں ، ان صحرائی روحوں کی پناہ حاصل رہی ہوگی۔ چناں چہ سوماٹرا کے گیؤ نامی قبیلے کے لوگ شکاری کتوں سے ہرن ، جنگلی بکری یا سؤر کا شکار کرنے سے قبل صحرا کے ان دیکھے مالک سے اجازت حاصل کر لینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اجازت طلبی کی یہ باضابطہ رسم ایسا شخص ادا کرتا ہے جو بنوں کا ماہر ہو۔ یہ شخص ایک ایسے کھمبے کے آگے پان کا بیڑا رکھ دیتا ہے جسے خداوند جنگل کی شبیہ کے طور پر ایک خاص شکل میں تراشا جاتا ہے۔ یہ کرنے کے بعد شخص مذکور اس روح سے پرارتھنا کرتا ہے کہ وہ اپنی منظوری یا نامنظوری کو ظاہر کر دے۔ شکار پر اپنے رسالے میں ارین (ایک یونانی مورخ جو دوسری صدی میں گزرا ہے) لکھتا ہے کہ کیلٹ ہر سال ارتمیس کو اس کی سالگرہ کے موقع پر ایک جانور قربانی دیتے تھے۔ یہ جانور اس جرمانے کی رقم سے خریدا جاتا تھا جو ہر اس لومڑی ، خرگوش اور ہرن کے لیے ادا کیا جاتا ، جو سال کے

دوران میں اس کے ہاتھوں مارا گیا ہو ۔ اس دستور کا مطلب صاف یہ تھا کہ یہ سب جنگلی جانور ارتمیس کی ملکیت ہیں اور یہ کہ اس دیوی کو ان کا خون بہا دینا لازمی ہے ۔

لیکن دائنا کی خدائی محض درندوں یا جنگلی چوپایوں کی ولایت جنگلوں اور پہاڑیوں ، سنسان میدانوں اور شور انگیز دریاؤں تک محدود نہ تھی ، اسے چاند اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص طور پر موسم خزاں کے ماہ کامل کی دیوی تصور کیا جاتا تھا اور اپنی اس حیثیت میں وہ اچھے اچھے پھلوں کی صورت میں کسان کے گھر پر اپنی رحمت ارزانی کرتی اور درد زہ میں عورتوں کی فریاد سنتی ۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں ، اپنے نیمی والے مقدس شجر زار میں وہ ولادت کی اس دیوی کی حیثیت سے پجا کرتی تھی جو مرد و زن کو اولاد عطا کرتی ہو ۔ لہذا دائنا کو ارتمیس کی طرح ، جسے ہمیشہ دائنا کے مماثل سمجھا جاتا تھا ، بالعموم فطرت اور بالخصوص زرخیزی و ثمروری کی دیوی قرار دیا جا سکتا ہے ۔ بنا، بر ایں یہ امر چنداں باعث تعجب نہیں کہ ایونٹائن (Aventine ، ان سات پہاڑیوں میں سب سے اونچی پہاڑی جن پر شہر روم کی بنیاد استوار تھی اور اسی پر وہ مندر کھڑا تھا جس میں دائنا کی محمولۂ ذیل مورتی رکھی تھی اور جہاں مفرور غلام اور نچلے طبقے کے لوگ اس دیوی کی پرستش کیا کرتے تھے) پر اس دیوی کی جو مورتی رکھی تھی وہ کئی چھاتیوں والی ایفوشیائی ارتمیس کے بت کا چربہ تھی ، اور اس میں وہ قوت ثمروری کی تمام علامتوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی تھی ۔ اسی کی بناء پر اس کا سبب بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ جب کوئی محرمات (وہ قریبی رشتہ دار جن سے جنسی مواصلت حرام ہو) کے ساتھ زنا کا مرتکب ہوتا تو ایک قدیم رومی قانون کی رو سے جو شاہ تولوس ہوستی لیس سے منسوب کیا جاتا ہے ، بڑے بڑے پجاریوں کو دائنا کے شجر زار میں کفارے کے طور پر قربانیاں دینی پڑتی تھیں کیوں کہ اس جرم کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اس کے ارتکاب سے قحط پڑ جاتا ہے ، لہذا ضروری تھا کہ اس کے لیے ثمروری کی دیوی کو فدیہ دیا جاتا ۔

اصول کی رو سے چوں کہ پھلائی کی دیوی کو خود بھی ثمرور ہونا چاہیے ، لہذا دائنا کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس کا کوئی رفیق نرینہ بھی ہوتا ۔ اگر سرویس کی شہادت کو تسلیم کیا جائے تو دائنا کا یہ رفیق وربیس تھا جس کی نمائندہ یا یوں کہیے کہ جس کی جسمانی صورت نیمی والے بن کے بادشاہ کی ذات تھی ۔ ان دونوں کے بیاہ سے زمین حیوانات اور نوع بشر کی ثمروری کو فروغ دینا مقصود تھا اور یہ خیال پیدا ہونا قدرتی بات تھی کہ زندہ اشخاص یا شبیہوں کی نمائندگی میں ان دونوں کے بیاہ کی رسمیں ہر سال ادا کی جائیں تو اس مقصد کا حاصل ہونا زیادہ یقینی ہوگا ۔ قدیم اہل قلم میں کسی کے ہاں اس چیز کا ذکر نہیں ملتا کہ نیمی میں یہی کچھ ہوا کرتا تھا ، لیکن اریشیاء کی مذہبی رسوم کے متعلق ہمارا علمی سرمایہ اس قدر محدود ہے کہ زیر بحث موضوع پر معلومات کے فقدان کے باعث ہمارے اس نظریے پر کوئی شدید قسم کا اعتراض وارد نہیں ہو سکتا ۔ اس نظریے کی بنیاد کسی صریحی شہادت کی عدم موجودگی میں مذکورہ بالا رسم جیسے ایسے دستوروں پر ہونی چاہیے جو دوسرے مقامات پر جاری رہے ہوں ۔ ایسے دستوروں کی کچھ مثالیں جو بگڑی ہوئی شکل میں آج بھی پائے جاتے ہیں ، پچھلے باب میں پیش کی جا چکی ہیں ۔ اب ان کی قدیم صورتوں پر غور کیا جائے گا ۔

(۲) دیوی دیوتاؤں کا بیاہ ۔ بابل میں بعل کا ہشت منزلہ معبد اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ مینار بہ مینار ایک ہرم کی طرح سر نکالے کھڑا تھا ۔ اس کے سب سے اونچے مینار کے اندر ، جس کی بلندی تک نچلے تمام میناروں کے گرد گھومتا ہوا زینوں کا سلسلہ چلا گیا تھا ، ایک مندر اور اس مندر میں بچھا ہوا ایک لمبا چوڑا پر تکلف اور نرم نرم تکیوں سے آراستہ بستر تھا ، جس کے برابر ایک سنہری میز رکھی تھی ۔ اس مندر میں کہیں کوئی بت نہیں دکھائی دیتا تھا اور نہ سوائے ایک عورت ذات کے کبھی کوئی متنفس وہاں رات کو ٹھہرتا ۔ کلدانی رہنمایان مذہب کے نزدیک یہ بابلی عورت بعل کی منظور نظر تھی ۔ ان کا کہنا تھا کہ دیوتا رات کو

بہ نفس نفیس مندر میں آتا ہے اور اس بستر پر استراحت فرماتا ہے ۔ اس عورت کو دیوتا کی رفیقہ کی حیثیت سے کسی فرد بشر سے تعلق رکھنے کی اجازت نہ تھی ۔

مصر کے شہر تھیبس میں (یہ مصر قدیم کی راجدھانی تھی) ایک عورت عمون (Ammon، تھیبی معتقدات کی رو سے اہل مصر کا سب سے بڑا دیوتا ۔ بعد میں اہل یونان و روما بھی علی الترتیب زیوس اور جوپیٹر کے نام سے اس کی پرستش کرنے لگے) کی رفیقہ بنی جو اس کے مندر میں سویا کرتی تھی ، اور کہا جاتا ہے کہ بابل میں بعل کی آدم زاد بیوی کی طرح اس کا بھی کسی مرد سے کوئی تعلق نہ ہوتا ۔ اکثر مصری تحریروں میں اس کے لیے ''دیو رانی'' کا لقب استعمال کیا گیا ہے اور عام طور پر اسے ملکۂ مصر کی حیثیت حاصل ہوتی ، اس لیے کہ مصری اپنے بادشاہوں کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انہیں واقعی عمون نے جنوایا ہے اور وہ عارضی طور پر حکمران بادشاہوں کا روپ بھر کر ملکہ سے صحبت کرتا ہے ۔ تولید کا یہ مقدس عمل اپنے تمام جزئیات کے ساتھ دیرالبہار اور لکسر کے دو قدیم ترین مصری مندروں کی دیواروں پر منبت کاری اور مصوری کے نمونوں میں پیش کیا گیا ہے ۔ ان نمونوں کے ساتھ جو کتبے لگے ہیں ان کی روشنی میں ان تصویروں کے معنی سے متعلق شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔

ایتھنز میں تاک دیوتا ڈایونائی سس کو ہر سال ملکہ سے بیاہا جاتا تھا ۔ اس مقدس رسم میں نسبت اور خلوت صحیحہ دونوں کا منظر ڈرامائی صورت میں پیش کیا جاتا ۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ دیوتا کا نمایندہ کوئی بت ہوتا تھا یا اس کا حصہ کوئی آدمی ادا کیا کرتا تھا ۔ ارسطو کا بیان ہے کہ یہ رسم بادشاہ کی اس قدیم سرکاری قیام گاہ پر ادا کی جاتی تھی جسے ''تھان'' کہا جاتا تھا اور جو بالاحصار ایتھنز کے شمال مشرقی رخ پر واقع تھی ۔ اس بیاہ کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے ذریعے انگور کی بیلوں اور دوسرے پھل دار پودوں کو جن کا خالق ڈایونائی سس تھا ، ثمرور کیا جائے ۔ اس طرح صورت و معنی ہر دو اعتبار سے یہ رسم بہار کے بادشاہ

اور ملکہ کی شادیوں سے مطابقت رکھتی تھی ۔

ان عظیم مذہبی رسوم میں جو ایلوسس کے مقام پر (ایتھنز کے قریب) ستمبر کے مہینے میں ادا کی جاتی تھیں ، اناج کی دیوی ڈیمیٹر سے آسمان کے دیوتا زیوس کا عقد ہوتا تھا ۔ اس میں ڈیمیٹر کی پجارن دلھن بنتی اور وہ پجاری جو ان رسموں کا ماہر ہوتا دولھا ، لیکن اس میں ان کی صحبت محض ڈرامائی یا اشاری نوعیت کی ہوتی تھی ، اس لیے کہ شکران (ایک تلخ زہریلا درخت جس کا رس مسکن ہوتا ہے) کے استعمال سے مذکورہ بالا پجاری کی رجولیت کچھ عرصے کے لیے گم ہو جاتی تھی ۔ مشعلوں کے بجھنے کے بعد یہ جوڑا ایک تاریک مقام پر اتر جاتا اور اس دوران میں معتقدین کا ہجوم امید و بیم کی حالت میں اس مخفی مواصلت کے نتیجے کا منتظر رہتا ، کیوں کہ ان کے عقیدے کے بموجب ان کی نجات اسی پر موقوف تھی ۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پجاری باہر نکل آتا اور چپ چاپ ایک شعلے کی روشنی میں مجمع کو عقد مقدس کے نتیجے کے طور پر اناج کی ایک کٹی ہوئی بالی دکھاتا ، پھر یہ اعلان کرتا ''ملکہ بریمو کے ہاں مقدس لڑکا بریموس پیدا ہوا ہے'' جس کا مطلب یہ تھا کہ ''ایک طاقت ور ہستی نے ایک طاقت ور ہستی کو پیدا کیا ہے ۔'' قصہ اصل میں یوں تھا کہ ان ماتا اپنے بچے اناج کو جنم دیتی تھی اور اس کے درد زہ کے دوروں کا منظر اس مقدس ڈرامے میں پیش کیا جاتا تھا ۔ غالباً کٹے ہوئے اناج کی نمائش اس کا آخری سین تھا ۔ اس طرح بعد کے زمانوں کی شاعری اور فلسفے میں ان رسموں پر جو حاشیہ آرائی کی گئی ہے ، اس میں سے سورج کی شعاعوں میں کسی کہر آلود منظر فطرت کی طرح ایک ایسے سیدھے سادے دیہاتی تیوہار کے خد و خال نظر آ جاتے ہیں ، جس کے ذریعے اناج کی دیوی سے آسمان کے دیوتا کا بیاہ رچا کر ، جو برہنہ زمین کو مینہ سے سرسبز کرتا تھا ، ایلوسس کے وسیع میدانوں کو زرخیز کرنا مقصود تھا ۔ اسی طرح بیوشیا (یونان کا وسطی علاقہ جس کا دارالمملکت تھیبیس تھا ۔ یہاں کے لوگ کند ذہن مشہور تھے ، اگرچہ اس کی خاک سے بڑے بڑے نامور اٹھے ہیں) میں پلے ٹے ایا کے لوگ ایک تیوہار منایا کرتے

تھے جو چھوٹا ڈیڈالا کہلاتا ۔ اس میں بلوط کے جنگل سے ایک درخت کاٹ کر لایا جاتا اور اس کی لکڑی میں ایک مورتی کھود کر اور اُسے دلھن کی طرح بنا سنوار کر ایک بیل گاڑی میں لاد دیا جاتا ، اور اس کے پاس اس کی ایک نقلی سہیلی بٹھا دی جاتی ۔ اس کے بعد اس مورتی کو غالباً دریائے ایسوپس کے کنارے کھینچ کر لے جایا جاتا تھا اور ایک ہجوم شہنائیاں بجاتا اور رقص کرتا اس کے ساتھ ہوتا ۔ ہر ساٹھویں سال بیوشیا کے سب لوگ مل کر بڑا ڈیڈالا منایا کرتے تھے ۔ اس میں وہ ساری مورتیاں جو چھوٹے تیوہاروں میں جمع ہوتیں اور جن کی کل تعداد چودہ ہوتی ، چھکڑے میں لاد کر جلوس کی شکل میں دریائے ایسوپس پر لے جائی جاتیں اور وہاں سے کوہ سیتھے رون کی چوٹی پر جہاں انھیں ایک بڑی ساری چتا پر رکھ کر نذر آتش کر دیا جاتا ۔ اس تیوہار کی توضیح میں جو قصہ بیان کیا جاتا ہے ، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح وہ اصل میں زیوس کے ساتھ ہیرا کا بیاہ کرتے تھے ، جس میں اس دیوی کی آئینہ دار ایک بلوطی مورتی ہوتی تھی جسے دلھن کی طرح سجایا جاتا تھا ۔ سویڈن میں ثمروری کے دیوتا فرے کے قد آدم بت کو ، جو حیوانات و نباتات دونوں کی باروری کا دیوتا تھا ، ملک میں جگہ جگہ پھرایا جاتا تھا ۔ اس بت کے ساتھ ایک خوب رو لڑکی ہوتی جسے اس دیوتا کی بیوی کہا جاتا ۔ یہ حسینہ اپسالا میں اس دیوتا کے بڑے مندر کی پجارن کے فرائض بھی انجام دیتی تھی ۔ جہاں جہاں گاڑی دیوتا کے بت اور اس کی عروس رعنا کو لے کر پہنچتی ، لوگ جوق در جوق اس کی زیارت کو آتے اور ایک حاصل خیز سال کے لیے اسے قربانیاں دیتے ۔

اس طرح قدیم زمانے کی قوموں میں بتوں یا انسانوں سے دیوی دیوتاؤں کو بیاہنے کا دستور عام تھا ۔ جن تصورات پر اس دستور کی بنیاد تھی وہ اس قدر وحشیانہ اور غیر ترقی یافتہ ہیں کہ اس میں ہمارے لیے شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ وہ بابل ، مصر اور یونان کی متمدن قوموں کو یقیناً اپنے جاہل اور غیر مہذب اسلاف سے ورثے میں ملا ہوگا ۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس قسم کی رسمیں

ان انسانی نسلوں میں اب تک جاری ہیں ، جو وحشت و پستی کی حالت میں ہیں ، تو ہمارا یہ قیاس اور بھی قرین صحت ہو جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ روس کے ضلع مالمیز کے ووتیاک نامی لوگوں کو فصلوں کی مسلسل خرابی کے سبب بڑی آفت کا سامنا ہوا ۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے ۔ آخر کار سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا طاقت ور اور شرپسند دیوتا کریمیت شاید اپنی شادی نہ ہونے کے سبب خفا ہو گیا ہے ۔ چناں چہ ان کے بڑے بوڑھوں کا ایک وفد کیورا کے ووتیاکوں کے ہاں پہنچا اور اس مسئلے پر ان سے ایک سمجھوتا کیا ۔ پھر گھر لوٹ کر انھوں نے برانڈی کا ایک ذخیرہ فراہم کیا اور ایک گھوڑا گاڑی کو سجا کر جلوس کی شکل میں گھنٹیاں بجاتے ، جس طرح وہ گونے کی رسم میں کیا کرتے ہیں ، کیورا کے مقدس شجر زار میں پہنچے ۔ یہاں رات بھر ناچ و نوش کی محفل گرم رہی ۔ اگلے دن صبح وہ گھاس کا ایک تختہ اکھیڑ کر گھر واپس آئے ۔ یہ چیز اگرچہ ان مالمیز والوں کے لیے تو باعث برکت ثابت ہوئی ، لیکن اس کا کیورا کے لوگوں پر برا اثر پڑا ، اس لیے کہ مالمیز میں تو روٹی اچھی نکلی لیکن اس معاملے میں کیورا والے گھاٹے میں رہے ۔ لہذا کیورا کے ان لوگوں پر بڑی لے دے ہوئی ، جو اس بیاہ پر رضا مند ہوئے تھے اور گاؤں والوں نے طیش میں آ کر ان کی خوب مرمت کی ۔ جس مصنف نے اس رسم کا حال بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ ''اس سے ان لوگوں کا مطلب کیا تھا ، اس کا سمجھنا چنداں آساں نہیں ۔ شاید جیسا کہ بختیرو نامی لوگوں کا خیال ہے ، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ کریمیت سے کلیلسن یعنی رحم دل اور ثمرور زمین کی دیوی کو بیاہا جائے ، تاکہ اس دیوتا پر ہمیشہ اس کا اثر رہے ۔'' جب بنگال میں کنوؤں کی کھدائی ہوتی تھی تو ایک دیوتا کا چوبی بت تراش کر اس کا جل دیوی سے بیاہ رچایا جاتا تھا ۔

اکثر صورتوں میں لکڑی یا مٹی کے بت کی بجائے زندہ عورت کو کسی دیوتا کی دلہن بنایا جاتا ہے ۔ پیرو کے قدیم باشندوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کسی چودہ سالہ حسینہ کو آدمی کی شکل کے سنگی

بت سے بیاہا کرتے تھے ۔ اس بت کو وہ اپنا دیوتا (ہوا کا) تصور کرتے تھے ۔ اس بیاہ کی تقریب میں گاؤں کے تمام لوگ شریک ہوتے ، جو تین دن تک جاری رہتی اور جس میں خوب داد عیش دی جاتی ۔ اس رسم کے بعد وہ لڑکی عمر بھر کنواری رہتی اور قوم کی خاطر اس بت پر بھینٹ چڑھا دی جاتی ۔ اس کا انتہا درجہ ادب کیا جاتا اور وہ دیوی متصور ہوتی ۔ اسی طرح ہر سال مارچ کے وسط میں جب کہ جال کے ذریعے مچھلی پکڑنے کا موسم آتا ہے ، الگون کوئین ، اور ہوران نامی قبائل اپنے جال سے چھ یا سات سال کی دو لڑکیوں کا عقد کرتے تھے ۔ شادی کے کھانے پر جال دو لڑکیوں کے بیچ میں رکھ دیا جاتا اور اس کو نصیحت کی جاتی کہ وہ ہمت سے کام لے اور بہت سی مچھلی پکڑ لائے ۔ ایسی کم سن لڑکیوں کو اس غرض سے منتخب کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کی دوشیزگی کے بارے میں کوئی شبہ نہ ہو ۔ کہا جاتا ہے کہ اس دستور کی طرح یوں پڑی کہ ایک سال ماہی گیری کے موسم میں الگن کوئینوں نے حسب معمولی اپنے جال ڈالے تو ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا ۔ اس ناکامی پر وہ ششدر رہ گئے ۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے ۔ آخر جال کی روح (اوکی) ایک بلند قامت آدمی کی شکل میں ان کے سامنے ظاہر ہوئی اور بڑے جوش کی حالت میں ان سے کہا : ''میں اپنی بیوی کو کھو چکا ہوں اور مجھے ایسی کوئی اور بیوی نہیں ملتی جس کو کسی دوسرے آدمی نے ہاتھ نہ لگایا ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ تم کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ۔ تمھیں اسی صورت میں کامیابی ہو سکتی ہے کہ اس معاملے میں تم میری تسلی کر دو ۔'' چناں چہ ان الگن کوئینوں نے ایک مجلس منعقد کی اور اس میں یہ طے کیا کہ اوکی کو دو ننھی ننھی لڑکیوں سے بیاہ کر اس کی خوشنودی حاصل کی جائے ، تاکہ اس باب میں آیندہ اسے شکایت کا موقع نہ ملے ۔ لہذا انھوں نے ایسا ہی کیا اور مچھلی کی خاطر خواہ مقدار ان کے جال میں آ گئی ۔ یہ بات ان کے ہمسایہ ہورانوں میں پھیل گئی اور انھوں نے اس ریت کو اپنا لیا ۔ جس

قدر مچھلی پکڑی جاتی تھی اس کا ایک حصہ ان لڑکیوں کے والدین کو ضرور ملتا جنھیں اس سال جال کی بیویاں بنایا جاتا ۔

بنگال کے اوراؤں دھرتی کو ایک دیوی کی حیثیت سے پوجتے ھیں اور ھر سال جس وقت سال کے درخت پر شگوفہ پھوٹتا ھے ، سورج دیوتا سے اسے بیاھا جاتا ھے ۔ رسم اس طرح ادا کی جاتی : سب لوگ اشنان کرتے ھیں ، جس کے بعد مرد مقدس شجر زار پر پہنچتے ھیں اور عورتیں گاؤں کے پجاری کے گھر جمع ھو جاتی ھیں ۔ پھر سورج دیوتا اور شجر زار کی روح پر کچھ مرغیاں بھینٹ چڑھانے کے بعد مرد اکل و شرب میں لگ جاتے ھیں ۔ ''اس کے بعد پجاری کو ایک تگڑے آدمی کے کندھوں پر بٹھا کر گاؤں واپس لایا جاتا ھے ۔ گاؤں کے قریب عورتیں مردوں سے ملتی ھیں اور اپنے پاؤں دھوتی ھیں ۔ پھر ڈھول پیٹتے ، گاتے ناچتے اور کودتے پھاندتے سب کے سب پجاری کے مکان پر پہنچتے ھیں ، جسے پھول پتوں سے سجایا جاتا ھے ۔ اس کے بعد معمولی رسوم کے ساتھ پجاری اور اس کی بیوی کا بیاہ ھوتا ھے ، جو سورج دیوتا اور دھرتی دیوی کے فرضی عقد کا آئینہ دار ھوتا ھے ۔ اس رسم سے فارغ ھونے کے بعد سب کھاتے پیتے اور رنگ رلیاں مناتے ھیں ؛ رقص ھوتا ھے ، عریاں گیت گائے جاتے ھیں اور انتہائی شرم ناک حرکتیں کی جاتی ھیں ۔'' اس طرح سورج اور دھرتی کے بیاہ کی مقدس رسم جس میں پجاری اور اس کی بیوی دولھا دلھن کا سوانگ بھرتے ھیں ، ایک سحری عمل کے طور پر ادا کی جاتی ھے ، تاکہ زمین کی ثمروری کی طرف سے یقین کر لیا جائے ۔

اس ضمن میں یہ امر بھی قابل ذکر ھے کہ وہ مافوق ھستی جس کے ساتھ اکثر صورتوں میں عورتوں کو بیاھا جاتا ھے ، جل کی روح یا دیوتا ھے ۔ چناں چہ جھیل وکٹوریا نیانزا کے دیوتا مکاسا کو جسے ھر طویل سفر پر روانہ ھونے سے پہلے باگنڈا راضی کرنے کی کوشش کرتے تھے ، ازواج کے طور پر کنواریاں پیش کی جاتی تھیں ، جو وستائی راھبات کی مانند عفیف و پاک دامن رھنے کا عہد کرتی

تھیں ، لیکن غالباً یہ ان راہبات کے برخلاف اپنے اس عہد سے منحرف ہو جاتی تھیں ۔ یہ رسم موانگا قوم کے مسیحیت قبول کرنے تک جاری تھی ۔ برطانوی مشرقی افریقہ کے اکیکویو ایک خاص دریا کے سانپ کی پرستش کرتے ہیں اور کئی کئی سال کے وقفے سے عورتوں ، خاص کر نوخیز لڑکیوں کے ساتھ سانپ دیوتا کا بیاہ کرتے ہیں ۔ اس غرض سے طلسم گروں کی جماعت جھونپڑیاں ڈال کر ان میں ان سادہ لوح کنواری جوگنوں کے ساتھ خلوت صحیحہ کرتی ہے ۔ اگر یہ لڑکیاں اپنی خوشی سے کافی تعداد میں جھونپڑیوں پر نہ پہنچیں تو انہیں دیوتا سے ہم کنار ہونے کے لیے کشاں کشاں لے جایا جاتا ہے ۔ ان شادیوں کے نتیجے میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں ، انہیں دیوتا (ناگائی) کی اولاد قرار دیا جاتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اکیکوؤں میں کچھ بچے ایسے ہیں جنہیں خدا کے بچے تصور کیا جاتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ شرق الہند کے ایک جزیرے بورو میں علاقۂ لیکی کے باشندوں پر ایک دفعہ مگرمچھوں نے کثیر تعداد میں یورش کر دی اور ان کی جان خطرے میں پڑ گئی ۔ انہوں نے اس آفت ناگہانی کا سبب یہ جانا کہ ان مگرمچھوں کے بادشاہ کو ایک خاص لڑکی سے محبت ہو گئی ہے ۔ چناں چہ اس دوشیزہ کے باپ کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس دوشیزہ کو دلہن کی طرح بنا سنوار کر اس کے عاشق کے چنگل میں دے دے ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جزائر مالدیو کے باشندوں کے مشرف بہ اسلام ہونے سے قبل ان کے ہاں ایسی ہی ایک رسم جاری تھی ۔ مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ نے اس رسم کا حال بیان کیا ہے اور یہ بھی کہ اس رسم کا خاتمہ کس طرح ہوا ۔ اس سیاح کو بہت سے معتبر مالدیویوں نے ، جن کے اس نے نام گنوائے ہیں ، یہ باور کرایا کہ جس زمانے میں اس جزیرے کے باشندے بت پرستی میں مبتلا تھے تو ہر مہینے انہیں ایک بد جن دکھائی دیتا تھا جو ایک جہاز بنا ، اس پر بہت سی شمعیں روشن کیے سمندر پر سے آیا کرتا ۔ ان جزائر کے لوگوں کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جوں ہی انہیں وہ جہاز آتا دکھائی دیتا ، وہ

ایک نوخیز کنواری کو بنا سنوار کر اپنے اس بت خانے لے جاتے جو ساحل پر واقع تھا ۔ اور جس کی ایک کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی ۔ یہاں اس دوشیزہ کو رات بھر کے لیے چھوڑ دیا جاتا اور اگلے دن صبح لوگ جب وہاں لوٹ کر آتے تو کیا دیکھتے کہ دوشیزہ کی عصمت لٹ چکی ہے اور وہ مری پڑی ہے ۔ ان میں سے آخری دوشیزہ جو اس عفریت کو پیش کی گئی تھی ، بربر نامی ایک پرہیزگار شخص کی بدولت بچ گئی ، جس نے کلام اللہ کی آیتیں پڑھ کر اس جن بد کو سمندر کی طرف واپس بھگا دیا ۔

ابن بطوطہ نے اس عشق باز جن اور اس کی آدم زاد دلھنوں کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ اس لوک کہانی سے قریبی مشابہت رکھتا ہے جس کے نمونے مشرق میں جاپان اور انام سے لے کر مغرب میں سینی گیمبیا ، اسکینڈی نیویا اور اسکاچستان تک پائے جاتے ہیں ۔ مختلف قوموں میں جزئیات کے اختلاف کے ساتھ اس کہانی کا لب لباب یہ ہے : کسی ملک کے لوگوں کی جان ایک صد سرے سانپ یا اژدھے یا کسی اور خوف ناک اور خوں خوار جانور نے غضب میں ڈال رکھی ہے ۔ اگر وقتاً فوقتاً اسے کسی انسان ، بالعموم کسی دوشیزہ کی بھینٹ نہ دی جاتی رہے تو وہ سب لوگوں کو ہلاک کر ڈالے ۔ سینکڑوں بد نصیب اس کا لقمہ بن چکے ہیں ، جس کے بعد آخر خود بادشاہ کی دختر کی باری آ گئی ۔ اسے بھی اس بلائے بے درماں کے سامنے رکھ دیا گیا ۔ لیکن کہانی کا ہیرو جو ایک نہایت غریب گھرانے کا فرد ہے ، اسے بچانے کے لیے بیچ میں کود پڑا اور اس حیوان مہیب کو موت کے گھاٹ اتار دیا ، جس کے صلے میں اسے وہ شہزادی مل گئی ۔ بہت سی کہانیوں میں اس عجیب الخلقت درندے کا مسکن ، جسے بعض صورتوں میں سانپ بھی کہا گیا ہے ، سمندر ، جھیل یا چشمے کا پانی ہوتا ہے ۔ لیکن اسی قبیل کی دوسری کہانیوں میں وہ ایک مہیب سانپ یا اژدھا ہوتا ہے جو چشموں پر قبضہ کر لیتا ہے اور ان کا پانی صرف اسی صورت میں بہنے یا لوگوں کو استعمال کرنے دیتا ہے کہ اس پر کوئی انسانی بھینٹ چڑھایا جائے ۔ ان کہانیوں کو محض داستان گو کے

ذھن کی اپج سمجھ کر نظر انداز کر دینا شاید درست نہ ھو ، بلکہ یہ قیاس کرنا بے جا نہ ھوگا کہ یہ اس دستور کی آئینہ دار ھیں ، جس میں لڑکیوں یا عورتوں کو اُن آبی روحوں کی بیویاں بننے کے لیے قربان کر دیا جاتا تھا ، جو عام عقیدے کے بموجب خوف ناک سانپوں یا اژدھوں کا روپ دھارتی تھیں ۔

تیرھواں باب

# روم اور البا کے بادشاہ

(۱) نوما اور ایجیریا—رسوم و قصص کا اوپر جو جائزہ لیا گیا ہے اس کی بناء پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آبی اور نباتی دونوں قسم کی روحوں کے بیاہ کی مقدس رسم بہت سی قوموں میں جاری رہی ہے اور اس کے ذریعے زمین کو زرخیز کرنا مقصود ہے ، جس پر انسانوں اور جانوروں دونوں کی زندگی منحصر ہوتی ہے اور یہ کہ ان رسموں میں مقدس دولھا یا دلھن کا حصہ کوئی مرد یا عورت ادا کرتی ہے ۔ مندرجہ بالا شواھد سے اس قیاس کی کچھ نہ کچھ تائید ہوتی ہے کہ آبی اور نباتی قوتیں نیمی کے مقدس شجر زار میں ، جہاں گھنے پیڑوں ، پر شور آبشاروں اور شفاف جھیلوں کی صورت میں جلوہ گر تھیں ، ھمارے شاہ و ملکۂ بہار کی طرح ھر سال بن کے آدم زاد بادشاہ اور غیر فانی ملکہ دائنا کا بیاہ رچایا جاتا تھا ۔ اس رسم کا تعلق شجرزار کی ایک نہایت اھم ھستی جل پری ایجیریا سے تھا ، جس کو حاملہ عورتیں پوجا کرتی تھیں ، اس لیے کہ دائنا کی طرح زچگی میں ان کی مشکل آسان کرنا اس کے اختیار میں تھا ۔ اس سے بلاخوف تردید یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عام عقیدے کی رو سے اور بہت سے چشموں کی طرح ایجیریا کے جل میں استقرار حمل اور وضع حمل دونوں کا جوھر پایا جاتا تھا ۔ اس مقام سے جو نذر کردہ اشیاء ملی ھیں ، وہ صریحی طور پر بچوں کی پیدائش سے متعلق ھیں ۔ یہ اشیاء دراصل دائنا کی بجائے ایجیریا پر نذر

چڑھائی گئی ہوں گی - یا یوں کہیے کہ شاید یہ آبی حسینہ ایجیریا محض فطرت کی عظیم دیوی دائنا ہی کی ایک صورت تھی ، جو شور انگیز دریاؤں کی بھی رانی تھی اور گنجان بنوں کی بھی ، جس کا مسکن جھیل کا کنارا تھا اور جس کا آئینہ جھیل کا پر سکون پانی اور جس کی یونانی مماثل ارتمیس تالاب اور چشموں پر منڈلاتی رہتی تھی - پلوٹارک کے ایک بیان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ایجیریا دائنا ہی کا دوسرا نام تھا - اس بیان کے بموجب ایجیریا ایک بلوطی پری زاد تھی ، جس کے متعلق رومیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ بلوط کے ہر شاداب جنگل پر اس کی عمل داری ہے ، اس لیے کہ جہاں دائنا بالعموم بنوں کی دیوی کی حیثیت رکھتی تھی وہاں یہ پری زاد بالخصوص بلوط سے وابستہ تھی ، خاص کر اپنے نیمی والے شجری معبد میں - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایجیریا اس چشمے کی پری تھی جو ایک مقدس بلوط کی جڑوں سے نکل کر بہتا تھا - کہا جاتا ہے کہ ایسا ایک چشمہ ڈوڈونا (یہ مقام ایپریس (یونان) میں تھا ، جہاں ایک مشہور اور قدیم ترین زیوسی کاہن رہتا تھا - یہاں بلوط کے پتوں کی سرسراہٹ پیام الٰہی سے تعبیر کی جاتی تھی) میں ایک بلند اور گھنے بلوط سے پھوٹتا تھا اور پجارن کو اس کے بہاؤ کے سرود میں نوائے سروش سنائی دیتی تھی - یونانیوں کا خیال تھا کہ خاص متبرک چشموں یا کنوؤں کے جل کے ایک گھونٹ سے آدمی میں غیب دانی کی قوت پیدا ہو جاتی ہے - اس کی روشنی میں اس روایت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ ایجیریا نے اپنے شوہر یا عاشق شاہ نوما کو الوہی بصیرت عطا کی تھی - اس امر کے پیش نظر کہ عمرانی ارتقاء کے ابتدائی مراحل پر بادشاہ اکثر و بیشتر آب باراں اور زمین کی پیداوار کا ذمہ دار قرار پاتا تھا ، یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ نوما اور ایجیریا کے بیاہ کا قصہ روم کے قدیم بادشاہوں کے اس عقد مقدس کی یادگار ہے جو وہ جل یا نباتات کی کسی دیوی کے ساتھ اس غرض سے کیا کرتے تھے کہ اپنے الوہی یا سحری فرائض پورے کر سکیں - اس قسم کی رسم میں دیوی کی نمائندہ یا تو مورتی ہوتی تھی یا عورت - عورت کی صورت

میں غالباً ملکہ دیوی کا حصہ ادا کرتی ۔ اگر ہمارا قیاس اصلیت سے خالی نہیں تو یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ روم کی ملکہ اور بادشاہ بھی ، مصر کی ملکہ اور بادشاہ کی طرح ، دیوی دیوتا کا روپ بھرا کرتے تھے ۔ نوما اور ایجیریا والے قصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شادی کی یہ مقدس رسم جو بہار کے بادشاہ اور ملکہ یا باخوس اور ملکہ ایتھنز کی مانند نہ صرف زمین کی زرخیزی بلکہ انسان اور جانور کی افزائش نسل کے لیے جادو کا ایک عمل تھی جو کسی مکان کی بجائے ایک مقدس شجر زار میں ادا کی جاتی تھی ۔ بعض بیانات کے بموجب اس شادی کی جگہ نیمی والے شجرزار کے سوا کوئی اور نہ تھی ، اور ایسے اسباب کی بناء پر ، جو کسی تائید و اثبات کے محتاج نہیں ، ہم نے یہ فرض کیا ہے کہ وہ یہی شجر زار تھا جس میں بن کے پجاری بادشاہ کا دائنا کے ساتھ عقد کیا جاتا تھا ۔ تحقیقات کے دو مختلف خطوط کا ایک نکتے پر آ ملنا اس بات کی دلیل ہے کہ قصص و روایات میں ایجیریا کے ساتھ شاہ روم کے جس بیاہ کی طرف اشارہ ملتا ہے ، وہ اصل میں ایجیریا یا اس کی ہم زاد دائنا کے ساتھ بن کے بادشاہ کے بیاہ کی رسم کا آئینہ دار تھا ۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ رومی بادشاہ شجرزار اریشیا میں بن کے بادشاہوں کے فرائض انجام دیتے تھے ۔ اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ شروع شروع میں وہ اسی عام نوعیت کی مذہبی خصوصیت کے حامل تھے اور ان کی بادشاہت کی شرائط بھی کچھ اسی قسم کی تھیں جو بن کے مذہبی بادشاہ کے عہدے کی تھیں ۔ زیادہ اضح الفاظ میں ، یہ عین ممکن ہے کہ ان شاہان روم کی حکومت کی بنیاد موروثی حق کی بجائے کسی دیوتا کے نمائندں یا زندہ پیکروں کی حیثیت سے ان کی فرضی الوہیت ہو ، نیز یہ کہ اپنی اس حیثیت میں وہ کسی دیوی سے بیاہ کرتے ہوں اور اپنے آپ کو فرائض ربانی کا اہل ثابت کرنے کے لیے انھیں وقتاً فوقتاً زور آزمائی کرنی پڑتی ہو ، جس میں شاید وہ اکثر کام آ جاتے اور اپنا تاج فتح مند حریف کے لیے چھوڑ جاتے ۔ رومی بادشاہت کے بارے میں ہمارا علمی سرمایہ اس قدر قلیل ہے کہ ہم ان میں سے ایک بات بھی دعوے کے ساتھ نہیں کہہ

سکتے ، تاہم کم از کم کچھ بے ترتیب اور منتشر اشارے یا حوالے ایسے ملتے ہیں جن سے نیمی کے پجاریوں اور روم کے بادشاہوں یا ان کے ان پیش روؤں کے درمیان جو عہد قصص و روایات کے آغاز سے قبل قرون ظلمت میں گزرے ہیں ، مشابہت کے یہ رخ ضرور اجاگر ہو جاتے ہیں ۔

(۲) بادشاہ جوپیٹر کے روپ میں — اول یہ کہ غالباً رومی بادشاہ خود مہا دیوتا جوپیٹر (رومیوں کی بزم اصنام (Pantheon) کا سب سے بڑا دیوتا ۔ ابتداء میں اس کی حیثیت خدائے عناصر کی تھی ، بعد کے زمانوں میں اسے زیوس کا مماثل سمجھا جانے لگا اور زیوس سے متعلق ساری روایات اس پر بھی منطبق ہو گئیں ۔ اس کے نام کا مطلب ہے 'چمکتے آکاش کا دیوتا') کا روپ بھرا کرتے تھے ، اس لیے کہ عہد شہنشاہیت تک دستور یہ تھا کہ روم کے غازی سپہ سالار اپنے جشن فتح میں ، اور وہ مجسٹریٹ جو سرکس کے کھیل تماشوں کی صدارت کرتے تھے ، جوپیٹر کی پوشاک پہنا کرتے جو کیپیٹل پر (کیپیٹولین پہاڑی کی چوٹی جس پر جوپیٹر کی یہ محولہ عبادت گاہ واقع تھی) اس کے عظیم‌الشان مندر سے مستعار لی جاتی ۔ نیز قدیم اور جدید اہل قلم دونوں کی رائے کے بموجب جو نہایت قرین صحت ہے ، اس کا یہ سوانگ شاہان روم کے روایتی خلعت اور نشانات امتیاز کے ساتھ ان شاہوں کی نقل سے عبارت تھا ۔ لارل کا تاج پہنے اور چار گھوڑوں کے ایک یمان پر سوار وہ پیادہ پا آدمیوں کے ہجوم میں شہر سے گزرتے ۔ وہ نیلے رنگ کی زرق برق کارچوبی عبا میں ملبوس ہوتے ۔ ان کے داہنے ہاتھ میں لارل کی ڈالی ہوتی اور بائیں ہاتھ میں ہاتھی دانت کا ایک عصا جس کے دستے پر عقاب بنا ہوتا ، سر پر سہرا بندھا ہوتا ، چہرے پر سندور کی سرخی اور ان کے سر پر غلام سونے کا ایک بھاری تاج اٹھائے چلتا جو بلوط کے پتوں کی شکل کا ہوتا ۔ ان امتیازی نشانات میں سے جو چیزیں سب سے زیادہ ان کو جوپیٹر کے قریب لاتیں وہ ان کے عصا کا عقاب ، بلوط نما

تاج اور چہرے کی سرخی تھی ، اس لیے کہ عقاب جوپیٹر کا طائر ہے ، بلوط اس کا مقدس درخت اور اس کے بت کا چہرہ جو کیپیٹل پر اسی طرح چار گھوڑوں والے یمان پر کھڑا تھا ، تیوہاروں پر باقاعدہ گل‌گونہ سے سرخ کیا جاتا تھا ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دیوتا کے خد و خال پر غازہ ملنا اس قدر اہمیت رکھتا تھا کہ یہ کام ٹھیکے پر کرانا مجسٹریٹ کے فرائض اولین میں شامل تھا ۔ چوں کہ فتح کے جلوس کی منزل مقصود جوپیٹر کا کیپیٹل والا مندر تھا ، اس لیے یہ چیز خاص طور پر ضروری تھی کہ فاتح کے سر پر بلوط کا سہرا بندھا ہو ۔ کیوں کہ نہ صرف ہر بلوط وقف جوپیٹر تھا ، بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس دیوتا کا کیپیٹولین مندر رمولس نے ایک مقدس شجر بلوط کے برابر تعمیر کیا تھا ، جس کا گڈریے بڑا احترام کرتے تھے (رمولس ، بانئی روم کی پرورش ایک گڈریے نے کی تھی) اور اس شجر سے وہ مال غنیمت باندھ دیا تھا جو لڑائی میں دشمنوں کے جنرل سے ہاتھ لگا تھا ۔ یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ بلوطی تاج کیپیٹل والے جوپیٹر کے لیے وقف تھا ۔ اووڈ کے ایک فقرے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تاج اس دیوتا کی مخصوص علامت تصور کیا جاتا تھا ۔

ایک روایت کے بموجب جسے نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ، روم کی بناء ان آبادکاروں کے ہاتھوں پڑی جن کا تعلق البالونگا سے تھا ۔ یہ شہر کوہ البا کی ڈھلان پر آباد تھا ، جس کے نشیب میں جھیل اور کیمپیگنا (وہ میدان جو روم کے اردگرد پھیلا ہوا تھا) واقع تھے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر رومی بادشاہوں کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ آسمان ، رعد اور بلوط کے دیوتا جوپیٹر کے نمائندے یا جیتی جاگتی تصویریں ہیں : تو یہ خیال پیدا ہونا قدرتی بات ہے کہ شاہان البا (رمولس کا سلسلۂ نسب ، جیسا کہ اس سے پہلے ہم ایک نوٹ میں بتا چکے ہیں ، ٹروجا کے مشہور سورما اینی آس سے ملتا تھا ، جو اٹلی چلا آیا تھا ، جہاں کے بادشاہ لاطیس نے آس کا خیر مقدم کیا اور اپنی ایک لڑکی آس سے بیاہ دی ۔ اس کے بطن سے ایسکے نی رس

پیدا ہوا جس نے کوہ البا پر مذکورۂ بالا شہر بسایا جہاں رمولس کے ہاتھوں سلطنت روما کی بناء پڑنے سے پہلے تین سو سال تک مختلف سلاطین نے حکومت کی) بھی جن سے بانئی روم اپنا سلسلہ ملاتا تھا، اس سے قبل بھی کچھ دعویٰ کرتے ہوں گے۔ ان البائی سلاطین کا لقب ''سلویائی'' یا جنگل تھا اور اس کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہیں کہ ورجل نے، جس کا شمار قدمائے روما میں ہوتا ہے، اپنی اس پر روم کی تاریخی عظمت کے انکشاف کے موقع پر تمام سلاطین سلویائی کو بلوط کا تاج پہنے دکھایا ہے۔ اس صورت سے بلوط کے پتوں کا سہرا شاہان البالانگا کا ایک طرۂ امتیاز رہا ہوگا اور اسی صورت سے ان کے بعد اُن کے قائم مقام سلاطین روم کا بھی۔ ان دونوں صورتوں میں یہ جوپیٹر کی نمائندگی کا نشان تھا۔ روم کی تاریخی اسناد میں درج ہے کہ رمولس، ریمولس یا ایمولیس سلویس نامی البا کا ایک بادشاہ اس بات کا مدعی تھا کہ وہ خود اپنی ذات سے ایک دیوتا ہے، جوپیٹر کا ہم سر بلکہ اس سے بھی برتر۔ اس دعوے کی تائید میں اور اپنی رعایا کو مرعوب کرنے کے لیے اس نے مشینیں بنوا رکھی تھیں، جن کے ذریعے وہ بادل کی مصنوعی گھن گرج اور بجلی کی چمک پیدا کرتا تھا۔ ڈیڈورس کا بیان ہے کہ پھلوں کی فصل کے زمانے میں جب بادل زور و شور سے گرجتے ہیں، یہ بادشاہ اپنے سپاہیوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنی ڈھالوں اور تلواروں کی جھنکار میں آسمان کی توپوں کی گھن گرج کو دبا دیں۔ لیکن اُسے اس بے ادبی کی سزا مل گئی اور باد و باراں کے طوفان میں برق نے اس کو اہل و عیال سمیت جلا کر بھسم کر ڈالا۔ البائی جھیل میں ایسا سیلاب آیا کہ اس کا محل غرقاب ہو گیا؛ لیکن پھر بھی، ایک رومی مورخ لکھتا ہے: جب جھیل کا پانی اُترتا ہے اور ہوا کا کوئی جھونکا اس شفاف جھیل کی سطح کو ہموار کر جاتا ہے تو اس کی تہہ پر مذکورہ بالا محل کے کھنڈر دکھائی دے جاتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کا ایلیس کے بادشاہ سالمونیس والا قصہ دونوں ایک ایسی رسم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو یونان اور اٹلی کے ابتدائی بادشاہ واقعی ادا کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ

آج تک وہ شاہان افریقہ میں جاری ہے ، جن سے لوگ اپنی فصلوں کی نشو و نما کے لیے آسمان سے مینہ برسانے اور بادلوں کو گر جانے کی توقع رکھتے ہوں گے ۔ خدا ترس بادشاہ نوما کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ برق لہرانے میں ید طولیٰ رکھتا ہے ۔ ہم جانتے ہیں کہ عہد جدید میں متعدد قوموں نے بارشی عمل کے طور پر بادل کی گھن گرج پیدا کی ہے ، لہذا قدیم بادشاہوں نے بھی یہی کچھ کیوں نہ کیا ہوگا ؟

اس طرح اگر روم اور البا کے بادشاہ خدائے بلوط کی حیثیت سے جوپیٹر کا روپ بھرتے تھے تو وہ مصنوعی برق و رعد پیدا کرکے موسم دیوتا کی حیثیت سے بھی اس کی نقل کرتے ہوں گے ۔ اگر یہ صحیح ہے تو غالباً آسمان پر جوپیٹر اور زمین پر بہت سے بادشاہوں کی مانند وہ قومی بارش گروں کا منصب بھی ادا کرتے ہوں گے اور اپنے جادو ٹونوں کے ذریعے ابر آلود آسمان سے مینہ برسا کر زمین کی پیاس بجھاتے ہوں گے ۔ روم میں ایک مقدس پتھر کی مدد سے آسمانی بند کے دروازے کھولے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز آن مذہبی رسوم میں شامل تھی ، جو بجلی چمکانے اور مینہ برسانے والے دیوتا جوپیٹر ایلیشیس کے لیے مخصوص تھیں ۔ اس رسم کی ادائی کا فرض انجام دینے کے لیے بادشاہ سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا تھا ، جس کی ذات آسمان کے دیوتا کا زندہ نمونہ تھی ؟

اگر شاہان روم کیپیٹلی جو (جوپیٹر) کی نقل کرتے تھے تو یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ آن کے پیش رو البا کے بادشاہ آس عظیم لاطینی جوپیٹر کا سوانگ بھرا کرتے تھے جس کا مرکز شہر سے دور کوہ البا کی چوٹی پر تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ لاطینس ، جو قصص و روایات کی رو سے ان سلاطین البا کا مورث اعلیٰ تھا ، قدیم لاطینی بادشاہوں کی مانند نہایت پر اسرار طریقے سے غائب ہو گیا اور جوپیٹر بن گیا ۔ پہاڑ پر اس دیوتا کی جو عبادت گاہ تھی ، اسے لاطینی ریاست ہائے متحدہ کے حرم کی حیثیت حاصل تھی ۔ جس طرح البا آس وقت تک آن کا سیاسی مرکز رہا جب تک روم نے اپنے اس قدیم حریف سے اقتدار اعلیٰ

چھین نہ لیا ۔ بہ ظاہر البا کے مقدس پہاڑ پر اس دیوتا کا کوئی مندر صحیح معنی میں کبھی نہیں تعمیر کیا گیا ۔ فلک و رعد کے دیوتا کی حیثیت سے اس کے پرستار کھلی فضا میں اس کو خراج عقیدت پیش کرتے تھے اور یہی طریقہ مناسب بھی تھا ۔ وہ مضبوط دیوار جو آج بھی عزادارن مسیح کے قدیم باغ کو گھیرے ہوئے ہے ، اس مقدس احاطے کا ایک جزو ہوگی جو آخری رومی بادشاہ تارکوئین ذی شان نے (یہ چھٹی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے) لاطینیوں کے سالانہ اجتماع کے لیے مخصوص کر رکھی تھی ۔ اس ہوادار قلۂ کوہ پر جوپیٹر کی قدیم ترین عبادت گاہ ایک شجر زار تھا اور نہ صرف جوپیٹر کے لیے بلوط کو مخصوص کرنے کا دستور ، بلکہ البائی بادشاہوں کے روایتی بلوطی تاج ، نیز روم میں کیپیٹولین جوپیٹر کی نظیر کے پیش نظر یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ شجر زار بلوط کے درختوں پر مشتمل تھا ۔ ہم جانتے ہیں کہ قدیم زمانے میں البائی سلسلے کی بیرونی (مشرقی) پہاڑی الجی ڈس پر بلوط کے جنگل چھائے ہوئے تھے ، نیز عہد اولیٰ کے بعض لاطینی قبائل میں ، جن کا اس بیل کے گوشت میں حصہ تھا جو البن پہاڑ پر قربان کیا جاتا تھا ، ایک قبیلے کے افراد نے 'بلوطی' کا لقب اختیار کر رکھا تھا ۔ اس کا سبب یقیناً وہ بن تھے جن میں یہ قبائل آباد تھے ۔

لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ قدیم تاریخی ادوار میں اس سارے علاقے پر ہر طرف جنگل ہی جنگل چھائے ہوئے تھے ۔ تھیو فریسٹس (ایک یونانی فلسفی جو ارسطو کا شاگرد تھا) چوتھی صدی قبل مسیح کے جنگلات لاطیم کے حالات قلم بند کر گیا ہے ۔ وہ کہتا ہے : '' لاطینیوں کا سارا علاقہ مرطوب ہے ۔ میدانی علاقے میں لارل اور حنا کے پودے اور بیچ کے زبردست پیڑ پیدا ہوتے ہیں ۔ لوگ جو درخت جنگل سے کاٹ کر لاتے ہیں وہ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کی فقط ایک شاخ ٹرھینیائی (شمال مغربی اٹلی کے قدیم ترقی یافتہ شہروں کی طرف اشارہ ہے ، جو اٹروریا کے نام سے موسوم تھے) جہاز کے پیندے کے لیے کافی ہے ۔ میرو اور صنوبر کے درخت پہاڑوں میں اگتے ہیں ۔ جس علاقے کو سرسی

(ایک جادوگرنی جس کا ذکر ہومر کے رزمیہ اوڈے سے میں ملتا ہے ۔ اس نے یونانی سورما یولیسیز کو گرفتار کرکے سال بھر اپنے ملک میں قید رکھا تھا) کا ملک کہا جاتا وہ بلوط، حنا اور لارل کے گھنے درختوں کے گنجان بنوں سے ڈھکی ایک راس ہے ۔ اس علاقے کے باشندوں کا کہنا ہے کہ سرسی اس راس میں رہتی تھی اور یہ لوگ ایپیز کی قبر دکھاتے ہیں ، جس سے وہ حنا اگتی ہے جس کے ہار گوندھے جاتے ہیں ۔ دوسری قسم کی حنا کے پودے بلند قامت ہوتے ہیں ۔'' اس طرح کوہ البا کی چوٹی سے قدیم زمانے میں جو منظر نظر آتا تھا وہ بہت سی باتوں میں اس منظر سے بہت مختلف تھا جو آج نظر آتا ہے ۔ اگرچہ سہر درخشاں کی شعاعوں یا بادلوں کی دھوپ چھاؤں میں ایک طرف ایپی نائنز (آلپ کی شاخ جو اٹلی کا طول ناپتی ہوئی بحیرۂ قازم تک چلی گئی ہے ، کوہ البا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے) کے نیلگوں سلسلے کا ابدی سکوت اور دوسری طرف بحیرۂ قلزم کا ابدی اضطرار جوں کا توں ہے ۔ لیکن آج کے کیمپیگنا کے ملیریائی اور سنسان خطے کی بجائے جس کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک رویائے مرزا کے پل کی شکستہ کمانوں کی طرح (ایڈیسن کی مشہور سبق آموز کہانی جس میں مرزا کو انسان کی زندگی ستر محرابوں پر مشتمل ایک لمبے پل کی صورت میں نظر آتی ہے ، جس پر سے اسے آدمیوں کا ایک جم غفیر گزرتا دکھائی دیتا ہے ۔ اس پل کے چھپے ہوئے فرشی دروازوں میں سے بہت سے لوگ نیچے گر پڑتے ہیں اور سیلاب میں بہہ جاتے ہیں) قدیم پلوں کی محرابوں کے کھنڈر قطار اندر قطار کھڑے ہیں ۔ اس زمانے میں ہر سمت جنگل ہی جنگل نظر آتے ہوں گے ، جن کی رنگا رنگی بہار و خزاں کا نظارہ دکھاتی دور نیلگوں پہاڑوں اور سمندر میں محو ہو جاتی ہوگی ۔

لیکن اس مقدس پہاڑ کی چوٹی پر اکیلے جوپیٹر ہی کی خدائی نہ تھی بلکہ اس کی رفیقہ جونو بھی اس میں اس کی شریک و سہیم تھی ، جسے کیپیٹل کی طرح یہاں بھی مونیٹا کے نام سے پوجا جاتا تھا ۔ نیز یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ کیپیٹل ہی کی طرح کوہ البا پر بھی بلوط کا تاج

جوپیٹر اور جونو کے لیے مخصوص تھا ، اس لیے کہ ان کی پرستش کی رسم کوہ البا ھی سے کیپیٹل پہنچی تھی ۔ اس طرح بلوط کے بن میں باوط کے دیوتا کے ساتھ اس کی رفیقہ بلوط کی دیوی کا ھونا ظاھر ھے ۔ کچھ یہی صورت ڈوڈونا میں بھی تھی جہاں بلوطی زیوس کو ڈایون کی رفاقت حاصل تھی ، جس کے نام اور جونو کے نام کا تفاوت محض زبان کے مقامی تغیر کا نتیجہ ھے ۔ نیز جیسا کہ ھم دیکھ آئے ھیں ، غالباً کوہ سیتھے رن (بیوشیا اور اٹیکا کے درمیان ایک پہاڑ) پر اسی زیوس کو عہد بہ عہد ھیرا کے بت کے ساتھ بیاھا جاتا تھا ۔ یہ امر قرین قیاس ھے ، اگرچہ اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا ، کہ لاطینی الاصل ساری قومیں جونو اور جوپیٹر کے بیاہ کی مقدس رسم ھر سال وسط گرما یعنی ماہ جون میں ادا کیا کرتی تھیں جس کا نام جونو ھی سے ماخوذ ھے ۔

اگر اھل یونان کے زیوس اور ھیرا والے عقد کے مطابق رومیوں کے ھاں سال میں کسی وقت جوپیٹر اور جونو کا بیاہ ھوتا تھا تو یہ فرض کیا جا سکتا ھے کہ جمہوریت کے دور دورے میں (قدیم رومی جمہوریت مراد ھے) اس دیوی اور دیوتا کے بیاہ کی یہ رسم یوں ادا کی جاتی کہ اس میں یا تو ان کی مورتیوں کو دولھا و دلھن بنایا جاتا ، یا فلیمن ڈیالس (زوسیوں کا پروھت جو جوپیٹر کی پوجا پاٹ کے لیے منتخب کیا جاتا تھا) اور اس کی بیوی فلیمینیکا ان دونوں کا سوانگ بھرتے کیوں کہ فلیمن جونو کا پجاری تھا ، بلکہ قدیم و جدید اھل قلم کی رائے میں ، جونو قرین صحت معلوم ھوتی ھے ، ان کی حیثیت جوپیٹر کے زندہ پیکر ، یعنی آسمان کے دیوتا کی انسانی شبیہ کی تھی ۔ یہ قدرتی بات تھی کہ ابتدائی عہد میں رومی بادشاہ جوپیٹر کے نمائندے کی حیثیت سے اس موقع پر آسمانی دولھا کا حصہ ادا کیا کرتا اور اس کی ملکہ آسمانی دلھن بنتی ۔ جس طرح مصر میں بادشاہ اور ملکہ معبودوں کا روپ بھرا کرتے تھے اور جس طرح ایتھنز میں ملکہ ھر سال تاک دیوتا ڈایونائی سس سے بیاھی جاتی تھی ۔ رومی شاہ و ملکہ کے لیے جوپیٹر اور جونو کا سوانگ بھرنا اس لیے اور بھی قدرتی بات تھی کہ خود یہ معبود شاہ و ملکہ کے لقب سے ملقب تھے ۔

بہرکیف ایسا ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو ، نوما اور ایجیریا کا قصہ اس عہد کی یادگار معلوم ہوتا ہے جب مذہبی بادشاہ خود مقدس دولہا کا حصہ ادا کرتا تھا اور ، جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں ، چوں کہ یہ قیاس کرنے کی وجہ موجود ہے کہ شاہان روم بلوطی دیوتا کا روپ بھرا کرتے تھے ، نیز ایجیریا کے متعلق قطعی طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ بلوطی پری تھی ، لہذا ان کے بیاہ والے اس قصے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاہی عہد کے روم میں (عہد جمہوریت سے قبل) وقتاً فوقتاً ایک ایسی رسم ادا کی جاتی تھی ، جو بعینہ ایتھنز کی اس سالانہ رسم سے ملتی جلتی تھی ، جو ارسطو کے عہد تک جاری رہی ۔ تاکہ دیوتا کے ساتھ ملکۂ ایتھنز کے بیاہ کی طرح ، بلوطی دیوی سے شاہ روم کی شادی کی غرض و غایت یہ ہوگی کہ مثلی سحر کی مدد سے نباتات کی قوت افزائش و نمو کو بیدار کیا جائے ؛ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ ان دونوں صورتوں میں روم والی رسم کو اولیت حاصل تھی ، نیز یہ کہ بحیرۂ روم کے ساحلوں پر شمالی حملہ آوروں کو انگور کی بیل کا پتا چلنے سے بہت پہلے ، ان کے اسلاف وسطی اور شمالی یورپ کے وسیع جنگلات بلوط میں شجری دیوتا اور شجری دیوی کا بیاہ کیا کرتے تھے ۔ ہمارے عہد کے انگلستان میں جنگلوں کا تقریباً صفایا ہو چکا ہے ، لیکن پھر بھی کئی گاؤں کے سبزہ زاروں اور متعدد دیہات کے گلی کوچوں کے اندر کسانوں کے کھیل تماشوں میں اس مقدس بیاہ کی زوال پذیر صورت آج بھی نظر آ جاتی ہے ۔

چودھواں باب

# لاطیم میں تخت و تاج کی وراثت

اوپر جو کچھ معرض بحث میں آیا ہے ، اس کی بناء پر ہم نے روم کے بادشاہ کے متعلق ، جس کے مذہبی فرائض اس کے جانشین شاہ رسوم مقدسہ نے اختیار کر لیے تھے ، حسب ذیل نتا ٔ اخذ کیے ہیں : وہ آسمان ، رعد اور بلوط کے عظیم دیوتا جوپیٹر کا نمائندہ تھا ، بلکہ اس کا سوانگ بھرا کرتا تھا اور دنیا کے مختلف حصوں میں دوسرے بہت سے بادشاہوں کی طرح اپنی اس حیثیت میں پرجا کی بھلائی کے لیے مینہ برساتا اور گرج چمک پیدا کرتا ۔ نیز وہ نہ صرف بلوطی تاج پہنے اور دوسرے خدائی نشانات امتیاز لگائے بلوط کے دیوتا کی نقل کرتا بلکہ ایجریا نامی اس بلوط پری کے ساتھ اس کا بیاہ کیا جاتا جو بہ ظاہر جنگل ، جل اور وضع حمل کی دیوی دائنا کی ایک مقامی صورت تھی ۔ ہم نے رومی شواہد کی بناء پر یہ جو نتیجے نکالے ہیں ان کا اطلاق بہ گمان غالب دوسری لاطینی قوموں پر بھی کیا جا سکتا ہے ۔ غالباً عہد قدیم میں ان کے بھی مقدس یا مذہبی بادشاہ ایسے تھے جن کے مذہبی مناصب سول اختیارات سے الگ ہو کر ان کے قائم مقام مقدس رسوم کے بادشاہوں پر منتقل ہو گئے ۔

لیکن ہمیں ابھی یہ دریافت کرنا باقی ہے کہ قدیم لاطینی قبائل میں تخت و تاج کی وراثت کا دستور کیا تھا؟ روایت کی رو سے روم کے کل آٹھ بادشاہ ہوئے ؛ ان میں سے آخری پانچ کی تخت نشینی کے متعلق شبہے

کی کوئی گنجائش نہیں اور ان کے عہد حکومت کے بارے میں روایتی تاریخ کے اصل واقعات صحیح ہیں۔ اب یہ امر قابل غور ہے کہ یوں تو روم کے سب سے پہلے تاج دار رمولس کا سلسلۂ نسب البا کے خانوادۂ شاہی سے چلتا ہے، جس میں روایت کے بموجب بادشاہت کی وارث اولاد نرینہ ہوتی تھی، لیکن روم کے بادشاہوں میں ایک بھی ایسا نہیں گزرا جس کا بیٹا تخت و تاج کا وارث ہوا ہو۔ اگرچہ ان میں بہت سے اپنے پیچھے بیٹے اور پوتے چھوڑ گئے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک بادشاہ کا سلسلہ باپ کے بجائے ماں کی طرف سے ایک سابق شاہ روم سے ملتا تھا، اور تین بادشاہ یعنی تاتیس، تار کوئین اکبر اور سرویس تلیس کے بعد ان کے داماد سربرآرائے سلطنت ہوئے، جو سب کے سب یا تو غیر ملکی تھے یا کسی غیر ملکی کی اولاد، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان شاہان روم میں تخت و تاج کی وراثت کا حق آل پر منتقل ہوتا تھا اور اس حق سے حقیقت میں وہ غیر ملکی کام لیتے تھے جو شہزادیوں سے شادی کرتے۔ گویا روم اور غالباً لاطیم میں تخت و تاج کی وراثت کا تعین ان خاص ضوابط کی بناء پر ہوتا ہوگا جن کے بموجب دنیا کے بہت سے حصوں میں قدیم معاشرے کی تشکیل ہوئی تھی اور جنھیں تاریخ کی اصطلاح میں ازدواج خارجی، ازدواج ہجری (Beena marriage) یا سلسلۂ مادری کہا جاتا ہے۔ ازدواج خارجی سے مراد وہ دستور ہے جس کی رو سے مرد کو اپنے کفو سے باہر شادی کرنی پڑتی ہے؛ ازدواج ہجری اس دستور سے عبارت ہے جس کی رو سے اسے اپنا وطن چھوڑ کر اپنی بیوی کے لوگوں میں بود و باش اختیار کرنی پڑتی ہے اور سلسلۂ مادری سے مراد وہ دستور ہے جس کی رو سے مرد کی بجائے عورت سے سلسلۂ نسل ملایا جاتا ہے اور نسلاً بعد نسل خاندان میں اسی کا نام چلتا ہے۔ اگر قدیم لاطینی قوموں میں شاہی وراثت کا تعین انھی ضوابط کی بناء پر ہوتا تھا تو اس زمانے میں صورت حال کچھ اس طرح ہو گی: ہر برادری کا سیاسی اور مذہبی مرکز بادشاہ کے آتش کدے کی وہ آگ ہوگی جسے دودمان شاہی کی وستائی کنواریاں ہر وقت جلائے رکھتی

تھیں - بادشاہ کا تعلق کسی اور برادری ، شاید کسی اور شہر ، بلکہ نسل سے ہوتا اور وہ اپنے پیش رو کی لڑکی سے بیاہ رچاتا جس کے ساتھ اسے سلطنت بھی مل جاتی - اس شاہزادی کے بطن سے اس کے جو بچے ہوتے وہ باپ کی بجائے ماں کی کنیت اختیار کرتے - لڑکیاں گھر رہتیں اور لڑکے بڑے ہو کر گھر سے نکل کھڑے ہوتے اور دوسرے ملکوں میں پہنچ کر وہاں کی لڑکیوں سے شادیاں کرتے اور بادشاہوں یا عام آدمیوں کی حیثیت سے وہیں سکونت اختیار کر لیتے - ادھر گھر پر لڑکیاں طویل یا مختصر مدت تک آتش کدۂ شاہی کی نگہداشت کے لیے وقف رہتیں اور وقت آنے پر اپنے باپ کے جانشین کی ملکہ بن جاتیں -

مندرجہ بالا مفروضے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے بلا کسی الجھن کے لاطینی سلطنت کی روایتی تاریخ کے چند تاریک رخ اجاگر ہو جاتے ہیں - اس کی بدولت کم از کم لاطینی بادشاہوں کے وہ قصے کچھ اور قابل فہم ہو جاتے ہیں کہ انہیں دیوتاؤں نے کنواریوں کے بطن سے پیدا کیا ہے ، اس لیے کہ اگر اس قسم کے قصوں کو خیالی عنصر سے الگ کرکے دیکھا جائے تو ان کا لب لباب یہ ہوگا کہ کسی عورت کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا باپ کوئی نامعلوم شخص تھا - مشکوک ولدیت کی یہ روداد اس طرز بادشاہت کے مطابق ہے جس میں ابوی حسب و نسب کی کوئی خاص اہمیت نہیں - یہ واقعہ کہ لاطینی بادشاہوں کی پیدائش پر ان کے آباء کا واقعی کوئی علم نہ ہوتا یا تو اس بد راہی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو شاہی خاندان میں عام تھی ، یا اس بے اصولی کی طرف جس کا مظاہرہ خاص موقعوں پر کیا جاتا ، جب کسی خاص موسم میں عیاشی کی کوئی قدیم روایت زندہ کی جاتی - اس قسم کی بد مستیاں یا ساترنیلیا (یہ سردیوں کے اس تیوہار کا نام تھا جس میں اہل روم دل کھول کر داد عیش دیا کرتے تھے - اس میں ہفتہ عشرہ کے لیے غلاموں کو بھی عیش و طرب کی آزادی مل جاتی تھی) بعض مراحل پر عمرانی ارتقاء کی ایک خصوصیت ہوتی ہے - خود ہمارے ملک میں اگر کرسمس نہیں تو یوم بہار اور سفید عید والے تیوہاروں میں اس کے نقش مدتوں باقی رہے ہیں - اس قسم کے تیوہاروں میں

مرد و زن کے آزادانہ میل جول سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان کی ولدیت قدرتی طور پر ان دیوتاؤں سے منسوب کی جاتی جن کے لیے متذکرہ تیوہار مخصوص تھے۔

اس ضمن میں یہ امر توجہ طلب ہے کہ یوم گرما پر روم کے عامی اور غلام ایک تیوہار منایا کرتے تھے، جس میں عیش و طرب اور رامش و رنگ کی محفلیں گرم ہوتیں۔ اس تیوہار کا تعلق آتش زاد بادشاہ سرویس تلمیس سے تھا اور فارچونا دیوی کے اعزاز میں منایا جاتا تھا جو سرویس سے اسی طرح محبت کرتی تھی جس طرح ایجیریا نوما سے کرتی تھی۔ اس ہنگام عیش و نشاط میں پیدل اور کشتیوں کی دوڑ کے مقابلے ہوتے اور اس وقت دریائے ٹائی بر میں ہاروں سے لدی کشتیوں کی بہار ہوتی جن میں نوجوان بیٹھے جام و سبو لنڈھاتے۔ اس تیوہار کی حیثیت غالباً ایک طرح کے گرمائی ساترنیلیا کی تھی جو سرمائی ساترنیلیا کا جواب تھا۔ جدید یورپ میں، جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا، وسط گرما کے بڑے تیوہار کی حیثیت سب سے بڑھ کر آتش و عشاق کے تیوہار کی تھی۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت عاشق و معشوق کے بیاہ کی ہے، جس میں وہ دست بہ دست الاؤ پر سے جست لگاتے ہیں یا الاؤ کے آر پار ایک دوسرے پر پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اس موسم خفا میں گلوں کی رعنائی سے عشق و محبت اور شادی بیاہ کے بہت سے شگون لیے جاتے ہیں۔ لیکن آج کے ان تیوہاروں میں جو معصومیت اور حسن نظر آتا ہے اس کی وجہ سے ہمیں ان بدتہذیبیوں کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر لینی چاہئیں جو قدیم زمانے میں ان کا ایک جزو بلکہ شاید جزو لاینفک ہوں گی۔ ایستھونی کسان غالباً اپنے تیوہاروں میں آج تک نہیں تو موجودہ نسلوں تک ان بدتہذیبیوں کا مظاہرہ کرتے چلے آئے ہیں۔ یوم گرما (۲۴—جون) کے رومی تیوہار کی ایک اور خصوصیت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس دن پھولوں سے آراستہ کشتیوں میں دریا کی سیر کا جو دستور تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت کسی حد تک ایک آبی رسم کی تھی۔ یوم گرما کی رسموں میں پانی کا ہمیشہ نمایاں حصہ رہا ہے، جس سے

یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کلیسا نے کفار کے اس قدیم تیوہار کو اپنا رنگ دے کر حضرت یوحنا یحییٰ سے منسوب کر دیا ہے ۔

ظاہر ہے کہ اس مفروضے کی حیثیت نری قیاس آرائی سے زیادہ کچھ نہیں کہ لاطینی بادشاہ کسی سالانہ عشقیہ تیوہار پر جنم لیتے ہوں گے ۔ گو پاریلیا (ڈھوروں وغیرہ کے دیوی دیوتا کا تیوہار) والے تیوہار پر شاہ نوما کی پیدائش والے قصے سے اس بات کا گمان سا ضرور ہوتا ہے ، جب جشن بہار میں لوگ اسی طرح الاؤ پر سے کودا پھاندا کرتے تھے جس طرح آج کے گرمائی تیوہاروں میں عشاق جلتی آگ پر سے جست لگایا کرتے ہیں ۔ لیکن یہ عین ممکن ہے کہ ان بادشاہوں کے آبا سے متعلق شبہات ان کے مرنے کے مدتوں بعد اس وقت پیدا ہوئے ہوں جب ان کے بارے میں قصے گھڑے جانے لگے ہوں اور ان کی خاکی ہستیوں نے آسمان پر اٹھتے ہوئے نخیل کی رنگ آمیزی سے عجیب و غریب اور نورانی صورتیں اختیار کر لی ہوں ۔ اگر اپنی قلم رو میں ان کی حیثیت غیر ملکی مہاجروں ، اجنبیوں اور زائروں کی تھی تو لوگوں نے قدرتی طور پر ان کے حسب نسب کو بھلا دیا ہوگا اور ساتھ ہی انہیں ایک ایسے سلسلۂ نسب سے منسوب کر دیا ہوگا جس کی اصلیت کچھ نہ سہی لیکن جس میں الوہی عظمت و جلال ضرور موجود تھا ۔ اگر ان بادشاہوں نے اپنی زندگی میں واقعی خدائی کا دعویٰ کیا ہو تو اس کی وجہ سے ان کی مکمل تربیب اور بھی آسان ہو گئی ہوگی ۔

اگر لاطینیوں کے ہاں شاہزادیاں گھر پر رہتی تھیں اور ایسے مردوں سے بیاہی جاتی تھیں جو کسی اور قبیلے بلکہ کسی اور ملک سے تعلق رکھتے تھے اور شاہزادیوں سے اپنی شادی کی بناء پر بادشاہ بن جاتے تھے تو نہ صرف یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روم میں غیر ملکی تخت و تاج کے مالک کیسے بن جاتے تھے ، بلکہ یہ بھی کہ شاہان البا کی فہرست میں غیر ملکی نام کیوں نظر آتے ہیں ۔ معاشرے کے ارتقاء کے جس مرحلے پر عالی نسبی کا معیار سلسلۂ مادری ہو اور سلسلۂ نرینہ کی قطعاً کوئی اہمیت نہ ہو ، اعلیٰ خاندان کی عورتوں کا نیچ ذات کے مردوں بلکہ پردیسیوں اور غلاموں سے بیاہا جانا کوئی

قابل اعتراض چیز نہیں ہوتی ، بہ شرطیکہ یہ مرد بہ ذاتہ اس قابل ہوں کہ ان کے صحیح شوہر بن سکیں ۔ ایسے معاشرے میں جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ شاہی نسل کا سلسلہ جس پر قوم کی خوش حالی بلکہ بقاء منحصر سمجھی جاتی ہے ، پوری قوت اور اہلیت کے ساتھ جاری رکھا جائے اور یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ خاندان کی عورتوں کے ہاں تندرست اور صحیح الدماغ بچے پیدا ہوں تاکہ وہ قدیم معاشرے کے معیار کے مطابق توالد و تناسل کا اہم فرض پورا کر سکیں ۔ اس طرح عمرانی ارتقاء کے اس مرحلے پر بادشاہوں کی ذاتی خصوصیات انتہائی اہمیت رکھتی ہیں ۔ اگر بادشاہ بھی ملکہ کی طرح دودمان شاہی و الوہی کا فرد ہو تو سونے پر سہاگا ہوتا ہے ، لیکن اس کی بادشاہت کے لیے یہ چیز لازمی شرط نہیں ہوتی ۔

روم کی طرح ایتھنز میں بھی شاہزادیوں کے ساتھ شادی کی بناء پر بادشاہوں کی تخت نشینی کے سراغ ملتے ہیں ۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ ایتھنز کے دو قدیم ترین بادشاہوں یعنی سیکروپس اور ایمفیٹیون نے اپنے پیش رو فرماں رواؤں کی لڑکیوں سے شادی کی تھی ۔ شہادت سے اس روایت کی کسی حد تک تصدیق ہوتی ہے ، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایتھنز کی تاریخ میں عورتوں کی بادشاہت کو مردوں کی بادشاہت پر اولیت حاصل رہی تھی ۔

اس کے علاوہ اگر میرا قیاس درست ہے کہ لاطیم قدیم کے شاہی خاندان اپنی لڑکیوں کو گھر رکھتے اور لڑکوں کو رخصت کر دیتے تھے تاکہ وہ دوسرے ملکوں میں پہنچ کر وہاں کی راج کماریوں سے شادی بیاہ کرلیں اور ان کے لوگوں میں راجا بن کر براجیں ، تو اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ ان کی اولاد نرینہ نسلاً بعد نسلٍ دوسری سلطنتوں پر راج کیا کرتی تھی ۔ یونان اور سویڈن میں بہ ظاہر یہی کچھ ہوا کرتا تھا ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ اس قسم کا دستور یورپ کی آریائی نسل کی ایک سے زیادہ قوموں میں جاری تھا ۔ متعدد یونانی روایتوں میں یہ قصہ ملتا ہے کہ کس طرح کوئی شاہزادہ اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر کسی دور دراز ملک میں

پہنچا اور وہاں کے بادشاہ کی دختر سے شادی کرکے تخت و تاج کا وارث بن گیا ۔ یونان کے قدیم اہل قلم نے اس صورت سے شہزادوں کی ہجرت کے متعدد اسباب بیان کیے ہیں ۔ ان میں سے ایک عام سبب یہ بتایا گیا ہے کہ قتل کے الزام میں شہزادے کو جلا وطن کر دیا جاتا تھا ۔ اس سے یہ بات تو بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شاہزادے اپنے وطن سے کیوں بھاگ کھڑے ہوتے تھے ، لیکن یہ قطعی نہیں ظاہر ہوتا کہ وہ دوسرے ملکوں کے بادشاہ کیسے بن بیٹھتے تھے ۔ ہمیں شبہ ہے کہ اس قسم کی توجیہیں بعد کی خیال آرائیاں اور ان اہل قلم کے ذہن کی اختراع ہیں جن کے عہد میں باپ کی جائداد اور سلطنت کے وارث بیٹے ہوا کرتے تھے اور جن کے لیے ان روایات کی توجیہ ایک ٹیڑھا سوال تھا جن کی رو سے شہزادے ترک وطن کر جاتے اور دوسرے ملکوں کی زمام حکومت سنبھال لیتے تھے ۔ اسکینڈی نیویا کی روایت بھی اس قسم کے دستور کی شاہد ہے ۔ چناں چہ اس میں شاہزادیوں کے ایسے شوہروں کے قصے ملتے ہیں جن کو اپنے سسروں اور بادشاہوں کی سلطنت میں حصے ملتے تھے ؛ حالاں کہ ان بادشاہوں کی نرینہ اولاد موجود ہوتی ۔ خاص طور پر بھورے بالوں والے شاہ ہیرلڈ سے پہلے کی پانچ نسلوں کے عہد میں ینگ لنگر خاندان کے متعلق ، جو کہا جاتا ہے کہ سویڈن سے ناروے پہنچا تھا ، ہائم اسکرنگلا یا شاہان ناروے کی تاریخی داستانوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس خاندان کے ذکور نے مقامی بادشاہوں کی لڑکیوں سے شادی کرکے ناروے کے کم از کم چھ صوبے حاصل کر لیے تھے ۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ بعض آریائی قوموں کے عمرانی ارتقاء کے کسی خاص مرحلے پر یہ ہوا کرتا تھا کہ عورتیں شاہی نسل کا سر چشمہ تصور کی جاتیں اور تخت و تاج ایک ایسے آدمی کو سونپ دیا جاتا جو غیر خاندان اور اکثر غیر ملک سے تعلق رکھتا اور جو کسی شاہزادی سے شادی کرکے اس کی قوم پر حکومت کرتا ۔ ایک عام لوک کہانی میں جو غالباً اسی قبیل کے کسی دستور کی سچی روداد ہے ، ایک مرد جان باز کا قصہ ملتا ہے جو کسی اجنبی ملک

میں جا پہنچتا ہے اور وہاں کی شاہزادی کو اس کے باپ کی آدھی سلطنت سمیت حاصل کر لیتا ہے ۔

جہاں اس قسم کے رواج اور خیالات پائے جاتے ہوں وہاں ظاہر ہے کہ سلطنت ض کسی شاہزادی کے جہیز سے عبارت ہوتی ہے ۔ قدیم ڈینش مورخ سیکسو گراما ٹیکس نے بادشاہت کے اس تصور کو نہایت وضاحت کے ساتھ اسکاٹ لینڈ کی ایک داستانی ملکہ ہرمٹ روڈ کی زبانی یوں بیان کیا ہے : ''وہ حقیقت میں ایک ملکہ تھی اور اگر اس کی جنس مانع نہ ہوتی تو اس میں اور ایک بادشاہ میں کوئی فرق نہ ہوتا ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے (اور یہی زیادہ صحیح بھی ہے) کہ جس کسی کو وہ اپنے بستر عروسی کا اہل سمجھتی خود کو اپنی سلطنت سمیت اس کے سپرد کر دیتی ۔ اس طرح اس کا عقد اور سلطنت لازم و ملزوم تھے ۔'' اس بیان کی اہمیت اس لیے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ وہ ایک ایسے دستور کا آئینہ دار ہے جو پکٹوں (ایک قدیم اسکاچ قوم) میں واقعی رائج تھا ۔ بیڈ (یا بیڈا ، ایک انگریز راہب اور مذہبی مورخ) کی شہادت کی بناء پر ہمیں اس کا علم ہے کہ ان پکٹوں میں جب کبھی سلطنت کی وراثت کے متعلق کوئی شبہ پیدا ہوتا تو بادشاہ کے انتخاب میں آل کو اولاد پر ترجیح دی جاتی تھی ۔

وہ ذاتی خصوصیات جن کی بناء پر کوئی مرد شاہی خاندان میں شادی بیاہ اور تخت و تاج کی وراثت کا اہل قرار پاتا تھا ، رائج الوقت خیالات اور بادشاہ یا اس کے قائم مقام کی سیرت کے لحاظ سے بدلتے رہتے تھے ۔ لیکن یہ قیاس کرنا بےجا نہ ہوگا کہ قدیم معاشرے کے نزدیک ان خصوصیات میں جسمانی صحت و توانائی اور مردانہ حسن کو خاص مقام حاصل تھا ۔

بعض صورتوں میں معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادی کے ساتھ شادی اور تخت و تاج کی وراثت دوڑ کے نتیجے پر منحصر ہوتی تھی ۔ چناں چہ الیتمینائی لیبائیوں کے ہاں سلطنت اس شخص کا انعام تھی جو سب سے پھرتیلا ہوتا اور دوڑ میں سب پر بازی لے جاتا ۔ قدیم زمانے میں اہل پروشیا کے ہاں امارت کے لیے دوڑ کا مقابلہ ہوتا اور اس میں جو شخص

سب سے پہلے سلطانی بارگاہ تک پہنچ جاتا اسے امارت مل جاتی ۔ روایت کے بموجب اولمپیا پر زور آزمائی کے مقابلوں کی ابتداء کا سہرا اندیمیون کے سر ہے جس نے سلطنت کی وراثت کے لیے اپنے لڑکوں میں دوڑ کا مقابلہ کرایا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا مقبرہ دوڑ کے میدان میں اس جگہ واقع تھا جہاں سے دوڑ شروع ہوتی تھی ۔ پیلوپس اور ہپوڈیمیا کی مشہور کہانی (پیلوپس یونان کا ایک بادشاہ جس نے اپنی ملکہ ہپوڈیمیا کو اس کے باپ سے رتھوں کی دوڑ میں جیتا تھا) ان اولمپیائی دوڑوں سے متعلق قصص و روایات کی ایک اور مثال ہے جن میں تخت و تاج کی شرط لگائی جاتی تھی ۔

دلھن کے لیے شرطیہ دوڑوں کے قدیم دستور کے بارے میں یہ روایات صحت و اصلیت سے خالی نہیں ، کیوں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا دستور متعدد قوموں میں جاری رہا ہے ، اگرچہ اب اس نے نری مصنوعی اور رسمی شکل اختیار کر لی ہے ۔ چناں چہ ''کرغیزوں میں ایک دوڑ کا مقابلہ ہوتا ہے ، جو 'تعاقب محبوب' کہلاتا ہے ، اور جسے بیاہ کی رسم کا ایک جزو قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اس میں دلھن بڑا سا ایک چابک لیے ایک تیز رو گھوڑے پر سوار ہو جاتی ہے اور وہ تمام نوجوان جو اس کے عشق کا دم بھرتے ہوں ، اس کا پیچھا کرتے ہیں ۔ ان میں سے جو سب سے پہلے اس دلھن کو جا پکڑتا ہے وہ اس کی ہو جاتی ہے ۔ لیکن اپنے گھوڑے کو پوری قوت کے ساتھ دوڑانے کے علاوہ ، اسے اپنے ناپسندیدہ عشاق کو دور رکھنے کے لیے چابک سے کام لینے کا حق حاصل ہوتا ہے ، جسے وہ اکثر بڑے زور سے استعمال کرتی ہے ۔ اس معاملے میں وہ غالباً اپنے اس چاہنے والے کا ضروری لحاظ رکھتی ہے جس کو اس نے دل ہی دل میں اپنے لیے منتخب کر رکھا ہو ۔'' دلھن حاصل کرنے کے لیے شرطیہ دوڑ کا دستور شمال مشرقی ایشیا کے کور یاکوں کے ہاں بھی پایا جاتا ہے ۔ یہ مقابلہ ایک وسیع خیمے میں ہوتا ہے ، جس کے اطراف ایک مسلسل دائرے کی شکل میں الگ الگ ڈیرے لگے ہوتے ہیں ۔ دلھن بننے والی لڑکی دوڑ شروع کرتی ہے ۔ اگر وہ دولھا کے ہاتھ لگے بغیر تمام

ڈیروں میں سے گزر جائے تو شادی سے بری ہو جاتی ہے ۔ خیمے سے متعلقہ عورتیں دوڑ کے دوران میں دولھا کے چھڑیاں مار مار کر اور اڑنگے لگا لگا کر نیز دوسری اور تدبیروں سے دولھا کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں ، تاکہ وہ کامیاب نہ ہونے پائے ، تاوقتیکہ خود دلھن اس کی خواہش مند نہ ہو اور اسے موقع نہ دے ۔ ایسے ہی دستور تیوتانی قوموں میں جاری رہے ہوں گے ، اس لیے کہ جرمن ، اینگلو سیکسن اور ناروی زبانوں میں ایک مشترک لفظ ایسا ملتا ہے جس کے معنی فقط 'شادی کی دوڑ' کے ہیں ۔ نیز اس دستور کے آثار عہد جدید تک باقی رہے ہیں ۔

اس سے ظاہر ہے کہ کسی لڑکی ، خاص کر کسی شاہزادی سے بیاہ کا حق بہت سی صورتوں میں زور آزمائی کے مقابلوں میں کامیابی پر مبنی رہا ہے ۔ اس لیے اگر رومی بادشاہ بھی اپنی لڑکیوں کو بیاہنے سے قبل اپنے دامادوں اور جانشینوں کی ذاتی خصوصیات کو آزمانے کے لیے اسی قدیم طریقے سے کام لیتے رہے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ اگر میرا یہ نظریہ صحیح ہے تو روم کا بادشاہ اور ملکہ ، جوپیٹر اور اس کی دیورانی کا روپ دھارا کرتے تھے اور ان معبودوں کی حیثیت سے فصلوں کے نمو اور آدمیوں اور جانوروں کی باروری و افزائش کی غرض سے ہر سال اپنے عقد کی رسم از سر نو ادا کیا کرتے تھے ۔ اس طرح یہ بادشاہ وہی کچھ کیا کرتے تھے جو غالباً خیال تھا کہ قدیم زمانے میں شمالی علاقوں کے شاہ و ملکہ کیا کرتے تھے ۔ خیر تو ہم یہ دیکھ آئے ہیں کہ شاہ بہار بننے اور ملکۂ بہار سے شادی کرنے کا حق بعض صورتوں میں زور آزمائی ، خاص طور پر شرطیہ دوڑ کے ذریعے معین ہوتا رہا ہے ۔ یہ ریت بیاہ کے ایسے ہی کسی قدیم دستور کی یادگار ہوگی جس پر غور کیا جا چکا ہے ، یعنی ایک ایسا دستور جس سے بیاہ کے امیدوار کی اہلیت کی آزمائش مقصود تھی ۔ بنا بریں یہ طریقہ خاص طور پر بادشاہ کی ذات پر شد و مد کے ساتھ آزمایا جاتا تھا تاکہ اس کی کوئی ذاتی خامی ان مذہبی اور دوسری رسموں کی ادائگی میں مانع نہ ہو ، جن کی تکمیل اجتماعی سلامتی

اور خوش حالی کے لیے اس کے سول اور فوجی فرائض کی تکمیل سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی تھی اور یہ قدرتی بات تھی کہ بادشاہ کو اپنی شاہانہ صلاحیتوں کے عام مظاہرے کے لیے وقتاً فوقتاً انھی مراحل آزمائش سے گزرنا پڑتا ۔ اس آزمائشی دستور کا ایک نقش شاید اس رسم میں باقی رہ گیا تھا جو فرار یا تعاقب شاہی کے نام سے موسوم تھی اور جو روم میں عہد شہنشاہیت تک ہر سال ادا کی جاتی رہی ۔ اس رسم میں فروری کی چوبیس تاریخ کو کومیشیم (رومی مجلس انتخاب و قانون ساز) میں ایک قربانی کی جاتی تھی جس کے اختتام پر شاہ رسوم مقدسہ دارالعدل سے فرار ہو جاتا ۔ یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ بادشاہ کے فرار کی یہ رسم ابتداء میں بادشاہت کے لیے دوڑ کے سالانہ مقابلے پر مشتمل تھی ، جس میں سب سے تیز دوڑنے والا بادشاہ منتخب کر لیا جاتا تھا ۔ پھر سال کے اختتام پر وہ دوبارہ انتخاب کے لیے دوڑ میں حصہ لیتا اور اس طرح جب تک وہ ہار نہ جاتا اور معزول یا قتل نہ کر دیا جاتا اس کے انتخاب کا یہ سلسلہ جاری رہتا ۔ اس طرح جو چیز پہلے شرطیہ دوڑ کی حیثیت رکھتی تھی اس نے فرار یا تعاقب کی نوعیت اختیار کر لی ۔ اس مؤخرالذکر رسم میں یہ ہوتا کہ بادشاہ کو روانگی کا اشارہ ملتا اور وہ دوڑنا شروع کر دیتا ۔ اس کے پیچھے اس کے حریف روانہ ہوتے اور جو شخص بادشاہ کو جا لینے میں سب پر سبقت لے جاتا ، بادشاہ اپنا تاج اور شاید اپنی زندگی اس کے حوالے کر دیتا ۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ کوئی تحکم پسند شخص اٹھا اور اس نے تخت و تاج پر مستقل قبضہ جما کر دوڑ یا بادشاہ کے تعاقب کے سالانہ مقابلے کو محض ایک ظاہری رسم کی وہ شکل دے دی جو سارے تاریخی ادوار میں باقی رہی ۔ اس رسم کو بعض وقت روم سے بادشاہوں کے اخراج کی یادگار سمجھا جاتا تھا ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز بعد میں اس رسم کی توجیہ کی غرض سے گھڑی گئی تھی ، جس کا قدیم مفہوم لوگوں کے ذہن سے محو ہو چکا تھا ۔ بلکہ اغلب تو یہ ہے کہ شاہ رسوم مقدسہ جو کچھ کیا کرتا تھا اس کا سلسلہ ایک ایسی رسم سے جا ملتا تھا جو عہد شاہی میں اس کے پیش رو سلاطین ہر سال

دا کیا کرتے تھے ۔ اس رسم کا اصل مقصد کیا تھا ، اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں ۔ ہم نے اس کی جو توضیح پیش کی ہے اس میں موضوع کی دشواری اور الجھاؤ کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے ۔

خیر تو اگر میرا نظریہ غلط نہیں ہے تو شاہ روم کے سالانہ فرار و تعاقب کا دستور اس عہد کی یادگار تھا جب منصب شاہی ایک سالانہ عہدے سے عبارت تھا جو شاہزادی کے ساتھ اس شخص کو انعام میں ملتا تھا جس کے ہاتھ زور آزمائی یا تیغ زنی کا میدان رہتا ۔ اس کے بعد وہ اور اس کی ملکہ دیوتا اور دیوی کا روپ دھارے شادی کے ایک مقدس جشن میں جلوہ گر ہوتے ، جس کے ذریعے مثلی سحر کی مدد سے زمین کو بارور کرنا مقصود تھا ۔ اگر میرا یہ قیاس درست ہے کہ ابتدائی عہد میں روم کے قدیم بادشاہ کسی دیوتا کا سوانگ بھرتے تھے اور اپنی اس حیثیت میں انھیں با قاعدہ ٹھکانے لگا دیا جاتا تھا تو ان میں بہت سوں کی پر اسرار موت یا ہلاکت سے متعلق روایت زیادہ قابل فہم ہو جاتی ہے ۔ یہ روایت ہماری نظر سے گزر چکی ہے کہ البا کے ایک بادشاہ نے جوپیٹر کی گھن گرج کی نقل اڑانے کی جسارت کی تھی اور اس بے ادبی کی اسے یہ سزا ملی تھی کہ اس پر کڑک کر ایسی بجلی گری کہ وہ جل کر بھسم ہو گیا ۔ رمولس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی اس کی طرح پر اسرار طور پر غائب ہو گیا تھا ، یا ان امراء نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے جنھیں اس سے تکلیف پہنچتی تھی ۔ اور جولائی کی ساتویں تاریخ کو ، جس دن کہ وہ ہلاک ہوا تھا ، ساترنیلیا سے ملتا جلتا ایک تیوہار منایا جاتا تھا ۔ اس میں لونڈیوں کو بعض عجیب قسم کی آزادیاں مل جاتیں اور وہ آزاد گرہستنوں اور ناکت خدا لڑکیوں کا لباس پہنے شہر سے باہر نکلتیں اور راستے میں جس کسی سے ان کی مڈبھیڑ ہوتی اس کا مذاق اڑاتیں اور اس پر فقرے چست کرتیں ۔ پھر ان کا آپس میں ایک معرکہ ہوتا جس میں وہ ایک دوسرے کو مارتیں ، پیٹتیں اور سنگ سار کرتیں ۔ دوسرا رومی بادشاہ جو ہلاکت کی موت مرا رمولس کا سابین رفیق کار (سابین سے مراد اٹلی کی ایک قدیم قوم ہے جو روم کے گرد و نواح

میں آباد تھی) تیتیس تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ لاوینیم میں قربانی کی ایک رسم عام ادا کرنے میں مصروف تھا کہ کچھ آدمیوں نے، جنھیں اس نے ناراض کر دیا تھا، قربانی کے چھروں اور قربان گاہ کی میخوں سے اس کا کام تمام کر ڈالا ۔ جس موقع پر اور جس صورت سے اس کی موت واقع ہوئی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس کا قتل نہ تھا بلکہ قربانی تھی ۔ اس کے علاوہ نوما کے جانشین تلس ہوستی لیس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اس پر بجلی گری تھی، لیکن بہت سے لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ اینکس مارشیس (روم کا چوتھا بادشاہ اور نوما کا پوتا) کے اشارے سے مارا گیا تھا، جو اول الذکر کے بعد سریر آرائے سلطنت ہوا ۔ پلوٹارک نے نوما کا ذکر کرتے ہوئے، جس کی حیثیت ایک داستانی کردار کی سی ہے اور جو مذہبی قسم کا بادشاہ تھا، یہ لکھا ہے کہ ''اس کی شہرت کو اس کے جانشینوں کے انجام سے چار چاند لگ گئے تھے، اس لیے کہ اس کے بعد جن پانچ بادشاہوں نے حکومت کی ان میں سے آخری بادشاہ معزول کر دیا گیا اور اپنی زندگی کے آخری ایام جلاوطنی میں گزار دیے ۔ باقی چار میں ایک کو بھی اپنی موت مرنا نصیب نہ ہوا، اس لیے کہ تین قتل کر دیے گئے اور تلس ہوستی لیس کو بجلی نے جلا کر خاک کر ڈالا ۔''

شاہان روم کے قتل و ہلاکت کے ان قصوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زور آزمائیاں جن میں وہ اپنا تخت و تاج جیتا کرتے تھے، بعض صورتوں میں دوڑ کے مقابلوں کی بجائے مرگ و زیست کے معرکوں پر مشتمل تھیں ۔ اگر بات یہی ہے تو ہم روم اور نیمی کے جن دستوروں کے درمیان مشابہت کا کھوج لگا آئے ہیں وہ ایک دوسرے کے اور بھی قریب آ جاتے ہیں ۔ اس طرح دونوں مقامات کے تقدس مآب بادشاہوں کو، جن کی ذات مظہر الوہیت تھی، ایک ایسے شخص کے ہاتھوں معزولی اور قتل کا خطرہ لگا رہتا جو اپنے زور بازو اور تیغ آب دار سے بادشاہت کے متبرک منصب پر اپنا خدا داد حق ثابت کر سکتا ہو ۔ کچھ عجب نہیں جو قدیم لاطینوں کے ہاں بھی

حق سلطنت دو حریفوں کی لڑائی کے ذریعے متعین ہوتا ہو ، اس لیے کہ تاریخی عہد کے آغاز تک اہل اومبریا (اٹلی کے موجودہ ضلع پیروجیا کا قدیم نام) اپنے نجی جھگڑوں میں جھوٹ سچ کے امتحان کے لیے باقاعدہ نبرد آزمائی کرتے تھے ، اور جو شخص غنیم کا سر آتار لیتا ، اس کا حق بجانب ہونا تسلیم کر لیا جاتا ۔

پندرھواں باب

# بلوط کی پرستش

معلوم ہوتا ہے کہ بلوط کے درخت یا بلوط کے دیوتا کی پرستش یورپ کی ساری آریائی قوموں میں ایک مشترک چیز تھی۔ یونان اور اٹلی دونوں ملکوں کے لوگ اس درخت کو اپنے سب سے بڑے معبود زیوس یا جوپیٹر سے نسبت دیتے تھے، جو آسمان، بارش اور رعد کا دیوتا تھا۔ یونان کی شاید قدیم ترین اور بلاشبہ ایک سب سے مشہور عبادت گاہ ڈوڈونا میں تھی، جہاں زیوس الہامی بلوط کی صورت میں پوجا جاتا تھا۔ برق و رعد کے ان طوفانوں کے سبب جو کہا جاتا ہے کہ یورپ بھر میں سب سے زیادہ ڈوڈونا میں آیا کرتے تھے، یہ جگہ لوگوں کے نزدیک زیوس کا مسکن بنی ہوئی تھی، جس کی آواز بلوط کے پتوں کی سرسراہٹ اور بادلوں کی گھن گرج میں یکساں سنائی دیتی تھی۔ کانسی کے جو گھنٹے اس عبادت گاہ میں لگے تھے اور جن کی گونج سے آس پاس کی فضا معمور رہتی تھی، ان کے ذریعے شاید بادلوں کی نقل مقصود تھی، جو اکثر وادی کے اطراف خشک اور تند رو پہاڑیوں میں گھاٹی گھاٹی کڑکتے رہتے ہوں گے۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، بیوشیا میں غالباً ریاستوں کا ایک مذہبی وفاق بلوط کے دیوتا اور دیوی، زیوس اور ہیرا کے بیاہ کی مقدس رسم بڑی دھوم دھام سے ادا کیا کرتا تھا۔ اور آرکیڈیا میں کوہ لے کے ایس پر زیوس کا پجاری ایک مقدس چشمے میں بلوط کی ٹہنی ڈبو کر، جو ایک بارشی افسون کیا کرتا تھا، اس سے اس مقام پر بارش اور بلوط دونوں کے دیوتا کی حیثیت سے زیوس کی خصوصیت اجاگر ہو

جاتی ہے ۔ بارش کے دیوتا کی حیثیت سے یہی وہ معبود تھا جس سے یونانی ابر کرم برسانے کی پرارتھنا کیا کرتے تھے ۔ یہ بالکل فطری امر تھا اس لیے کہ اکثر صورتوں میں اس کا ٹھکانا پہاڑ تھے ، جہاں بادل گھر کے آتے ہیں اور جہاں بلوط پیدا ہوتا ہے ۔ ایتھنز کے بالا حصار پر زیوس سے بارش کی پرارتھنا کرتی ہوئی دھرتی کا ایک بت تھا اور خشک سالی میں، خود ایتھنز والے یہ پرارتھنا کیا کرتے تھے: ''بارش! بارش! پیارے زیوس ، ایتھنز والوں کے کھیتوں اور میدانوں پر بارش!''

اس کے علاوہ زیوس برق اور رعد دونوں پر قادر تھا ۔ اولمپیا اور دوسرے مقامات پر وہ 'کڑکے' یا میگھ راج (اندر) کے نام سے پجا کرتا تھا۔ ایتھنز کی شہر پناہ پر ایک آتش کدہ تھا ، جہاں برق زیوس کو قربانی دی جاتی تھی ۔ اس آتش کدے سے بعض مذہبی عہدہ دار سال کے خاص خاص موسموں میں کوہ پارنیس پر بجلی کے کوندنے کا مشاہدہ کیا کرتے تھے ۔ نیز اہل یونان ان مقامات کے گرد جن پر بجلی گری ہو ، باقاعدہ احاطہ کھینچ دیا کرتے تھے اور اسے ہبوط کرنے والے زیوس یعنی اس دیوتا کے لیے وقف کر دیتے جو برق تجلی بن کر آسمان سے گرا ہو ۔ ان احاطوں میں قربان گاہیں نصب کی جاتیں اور ان پر قربانیاں دی جاتیں ۔ قدیم کتبوں سے پتا چلتا ہے کہ ایتھنز میں ایسے متعدد احاطے موجود تھے ۔

اس طرح جب قدیم عہد کے یونانی بادشاہ اپنا سلسلۂ نسب زیوس سے ملاتے ، بلکہ اپنے آپ کو زیوس کہلواتے تھے تو یہ فرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اپنی قوموں کی بھلائی کی خاطر یا ان کے دشمنوں کو منتشر کرنے کی غرض سے مینہ برسا کر یا بادل کی گھن گرج پیدا کرکے اس دیوتا کے منصب بھی پورے کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے ۔ اس اعتبار سے سالمونیس کا قصہ غالباً ان تمام فرماں رواؤں کے دعووں کا آئینہ دار ہے ، جو بلوط کے بنوں سے ڈھکے ہوئے یونان کے کہستانوں میں اپنے اپنے محدود علاقوں پر حکومت کرتے تھے ۔ ان فرماں رواؤں سے ، ان کے بھائی بند آئرستانی بادشاہوں کی طرح ، یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ اپنی برکتوں سے زمین کو زرخیز کریں

اور مویشی کو قوت تولید بخشیں ۔ ان توقعات کو پورا کرنے کی بہترین صورت یہی تھی کہ وہ اپنے رشتہ دار اور بلوط ، رعد اور بارش کے عظیم دیوتا زیوس کا حصہ ادا کرتے ۔ بہ ظاہر وہ زیوس کا بعینہ اسی طرح روپ دھارا کرتے تھے جس طرح اٹلی کے بادشاہ جوپیٹر کا سوانگ بھرا کرتے تھے ۔

قدیم زمانے کے اٹلی میں بلوط کا ہر درخت جوپیٹر کے لیے وقف تھا ، جو زیوس کا ایطالوی مماثل تھا ۔ کیپیٹل پر یہ معبود بلوط کے علاوہ رعد و باراں کے دیوتا کی حیثیت سے بھی پجا کرتا تھا ۔ اگلے وقتوں کی نیکی اور خوش عقیدتی کا اس عہد کے تشکک سے مقابلہ کرتے ہوئے (جب کسی کی نظر میں آسمان وہ آسمان نہیں رہا تھا اور جوپیٹر کی کوئی وقعت نہ تھی) ایک رومی مصنف لکھتا ہے کہ پرانے زمانے میں اونچے گھرانوں کی بیویاں بال کھولے اور دلوں میں صدق و خلوص کا جذبہ لیے ننگے پاؤں جوپیٹر سے بارش کی پرارتھنا کرتی کیپیٹل پر چڑھا کرتی تھیں ، اور اس کا بیان ہے کہ اسی وقت موسلا دھار بارش ہونے لگتی اور ہر شخص شرابور گھر لوٹتا ۔ ''لیکن آج'' وہ کہتا ہے : ''ہم مذہب سے دور ہو چکے ہیں اور اسی لیے کھیت سب خشک پڑے تپتے رہتے ہیں ۔''

جب ہم جنوب سے وسطی یورپ کی طرف آتے ہیں تو یہاں بھی ہمیں ان آریائی وحشیوں میں ، جو عہد اولیٰ کے وسیع جنگلات میں بسے ہوئے تھے ، بلوط اور رعد و باراں کا عظیم دیوتا ملتا ہے ۔ چناں چہ گال کے کلٹوں کے ڈروڈوں کی نظر میں آکاس بیل اور بلوط سے بڑھ کر ، جس پر یہ بیل نمو پاتی ہے ، کوئی چیز مقدس نہیں تھی ۔ وہ پوجا پاٹ کے لیے بلوط کے شجر زار منتخب کیا کرتے تھے اور بلوط کے پتوں کے بغیر اپنی کوئی مذہبی رسم ادا نہ کرتے ۔ ایک یونانی مصنف لکھتا ہے : ''کیلٹ زیوس کی پرستش کرتے ہیں اور زیوس کی کیلٹی شبیہ بلند قامت بلوط ہے ۔'' معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیلٹ فاتح جو تیسری صدی قبل مسیح میں ایشیا پنچ کر وہیں کے ہو رہے تھے ، اپنے اس نئے وطن میں بلوط کو پوجتے گئے تھے ؛ اس لیے کہ ایشیائے کوچک

کے قلب میں گالیشیائی سینیٹ (گالیشیا ، ایشیائے کوچک میں اس ملک کا نام ہے جہاں یہ گالی یا فرانسیسی اور ایطالوی کیلٹ آباد ہوئے تھے) کا اجلاس ایک ایسے مقام پر منعقد ہوتا تھا جو ایک خالص کیلٹی نام 'ڈرائی نے میٹم' یعنی 'بلوط زار' یا 'بلوط مندر' سے موسوم تھا ۔ بلکہ حقیقت میں بعض مستند آراء کی رو سے خود لفظ 'ڈروڈ' کے معنی 'بلوطی' یا 'بلوط والے' کے سوا کچھ نہ تھے ۔

قدیم جرمنوں کے مذہب میں مقدس شجر زاروں کی حرمت اور تمام چیزوں پر مقدم ہوگی اور گرم کا خیال ہے کہ ان کے متبرک درختوں میں غالباً بلوط کی اہمیت سب سے زیادہ تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ درخت خاص طور پر رعد کے دیوتا 'ڈونار' یا 'تھونار' کے لیے مخصوص کیا جاتا تھا ، جس کا ناروی مرادف 'تھور' ہے ، کیوں کہ ہیس میں گائسمر کے قریب ایک بلوط کا درخت جسے بونی فیس نے (سینٹ ون فرڈ بونی فیس ، ایک جرمن مصلح و مبلغ) آٹھویں صدی میں کاٹا تھا ، باطل پرستوں کے ہاں 'جوپیٹر کا بلوط' (روبر جووس) کہلاتا تھا ۔ قدیم جرمن زبان میں یہ نام 'Donares eih' یا ڈونار کا بلوط ہوگا ۔ یہ امر کہ رعد کے تیوتانی دیوتا 'ڈونار' 'تھونار' تھور کو رعد کے ایطالوی دیوتا جوپیٹر کے مماثل سمجھا جاتا تھا ، انگریزی لفظ 'تھرس ڈے' یعنی 'تھونار کے دن' سے ظاہر ہے ، جو محض لاطینی 'ڈائیس جووس' کا ترجمہ ہے ۔ اس صورت سے قدیم اہل یونان و ایطالیہ کی طرح ، تیوتانیوں کے ہاں بلوط کے دیوتا کی حیثیت رعد کے دیوتا کی بھی تھی ۔ اس کے علاوہ اسے پھلائی کی ایک ایسی زبردست قوت تصور کیا جاتا تھا جو مینہ برساتی اور زمین کو ثمرور کرتی ہو ۔ چناں چہ آدم بریمنی کا بیان ہے کہ ''فضاؤں پر تھور کا راج ہے ، وہی رعد و برق ، باد و باراں اور فصل و موسم پر حکومت کرتا ہے ۔'' لہذا ان اعتبارات سے بھی رعد کا تیوتانی دیوتا یونانی اور ایطالوی زیوس اور جوپیٹر سے مشابہت رکھتا تھا ۔

سلافیوں کے ہاں بھی غالباً بلوط کا درخت رعد کے دیوتا پیرن سے متعلق تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ نوف گوراڈ کے مقام پر برق پتھر ہاتھ

میں اٹھائے ایک انسانی مجسمے کی صورت میں پیرن کا ایک بت رکھا تھا۔ جس کے احترام میں بلوط کی لکڑی کی آگ رات دن جلتی رہتی تھی، اور اگر کسی وقت یہ آگ بجھ جاتی تو اس کے خدام کو اس غفلت کی پاداش میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ زیوس اور جوپیٹر کی طرح پیرن اپنی قوم کا سب سے بڑا معبود رہا ہوگا، اس لیے کہ پروکوپیس (ایک بازنطینی مورخ جو چھٹی صدی میں گزرا ہے) کہتا ہے: ''سلافیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بجلی چمکانے والا ہی وہ واحد دیوتا ہے جو مالک جزو کل ہے اور لوگ بیل اور قربانی کے تمام جانور اس پر بھینٹ چڑھاتے ہیں۔''

اہل لیتھونیا کا سب سے بڑا معبود رعد و برق کا دیوتا پرکناس یا پرکنس تھا۔ زیوس اور جوپیٹر سے اس کی مشابہت کی طرف اکثر اشارے کیے گئے ہیں۔ بلوط کے درخت اس کے لیے مخصوص تھے اور جب مسیحی مبلغوں نے انھیں کاٹ ڈالا تو لوگوں نے غل مچا دیا کہ ان کے شجری معبود برباد کر دیے گئے ہیں۔ پرکناس کے احترام میں بلوط کے چند خاص درختوں کی لکڑی کی آگ ہمیشہ فروزاں رکھی جاتی تھی۔ اگر یہ آگ بجھ جاتی تو مقدس لکڑیوں کی رگڑ سے اسے پھر سلگا دیا جاتا۔ مرد اچھی فصل کے لیے بلوط کے درختوں کو قربانیاں دیتے تھے اور عورتیں لائم کے درختوں کو۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک بلوط کی حیثیت نر کی تھی اور لائم کی حیثیت مادہ کی۔ امساک باراں میں جب لوگوں کو بارش کی ضرورت ہوتی تو وہ قلب صحرا میں ایک کالی بچھیا، ایک کالا بکرا اور ایک کالا مرغا رعد کے دیوتا پر بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ ان موقعوں پر لوگ گرد و نواح سے جوق در جوق وہاں پہنچتے، کھاتے پیتے اور پرکناس کی دھائی دیتے۔ شراب کا ایک پیالہ تین مرتبہ اس آگ کے گرد گھمایا جاتا، پھر اس کی شراب آگ پر انڈیل دی جاتی، جس کے ساتھ ساتھ اس دیوتا سے مینہ کی پرارتھنا کی جاتی۔ اس طرح لیتھونیائی مہا دیوتا اور زیوس و جوپیٹر کے درمیان قریبی مشابہت پائی جاتی ہے اور اس کی حیثیت بھی رعد و باراں کے دیوتا کی تھی۔

بلوط پرستی کا اوپر جو جائزہ لیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ بلوط اور رعد و باراں کا دیوتا یورپ میں آریائی نسل کی تمام بڑی بڑی قوموں میں پجا کرتا تھا ، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ان کی بزم اصنام کا سب سے بڑا معبود تھا ۔

سولھواں باب

# دائنا اور دائنسس

اس باب میں میرا ارادہ ہے کہ جو رائیں ہم اب تک اپنی تحقیق کے نتیجے میں قائم کرتے چلے آئے ہیں ان کا مختصراً اعادہ کر لیا جائے اور ان سب کی روشنی میں نیمی والے پجاری کے تاریک خد و خال اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہم نے یہ پتا چلایا ہے کہ انسان نے اپنے عمرانی ارتقاء کے ابتدائی دور میں ایک مرحلے پر، اس بات سے بالکل بے خبر کہ مظاہر فطرت کی تہہ میں کیا کیا عمل جاری ہیں اور ان پر اپنے اختیار کا دائرہ کس قدر تنگ ہے، بہ زعم خود ایسے کام انجام دیے ہیں جنھیں موجودہ علم و تحقیق کے پیش نظر فوق‌البشری یا الوہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ انسان کی یہ خود فریبی آنھی چیزوں کی بنیاد پر قائم اور استوار رہی، جو اس کا سبب بنی تھیں۔ یعنی فطرت کے عمل کا عجیب و غریب نظم اور یکسانیت، اس کی عظیم‌الشان مشین کی حرکت پیہم کا توازن اور باقاعدگی جس سے کوئی صبر و استقلال کے ساتھ مشاہدہ کرنے والا پہلے سے اگر عین اس لمحے کا نہیں تو اس موسم کا کم از کم ضرور اندازہ لگا سکتا ہے، جس میں اس کی آمیدیں بر آنے کا امکان یا اندیشے صحیح نکلنے کا کھٹکا ہو۔ واقعات فطرت کا متواتر اور بار بار ظہور، بلکہ اس ظہور کے عظیم سلسلے کودن وحشی کے ذہن پر بھی بہت جلد اپنا نقش بٹھا دیتے ہیں۔ اسے قبل از وقت

اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس علم کی بناء پر وہ اس واقعے کو ، جو اس کے حسب دل خواہ پیش آئے ، اپنے ارادے کا نتیجہ سمجھ بیٹھتا ہے اور اس واقعے کے ظہور کو جس کا اسے خطرہ لگا ہو، اپنے دشمن کے ارادے سے منسوب کر دیتا ہے ۔ اس طرح وہ چھپی ہوئی کلیں جو فطرت کے اس وسیع کارخانے کو حرکت میں رکھتی ہیں ، اگرچہ ہماری سرحد علم سے پرے ہیں اور ہمارے لیے ان کا پتا چلانا کبھی ممکن نہیں ، سادہ لوح اور جاہل آدمی کو اپنی دسترس میں نظر آتی ہیں ۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ان کلوں کو چھیڑ سکتا ہے اور جادو کے زور سے اپنے آپ کو ہر قسم کا فائدہ پہنچا سکتا ہے اور دشمنوں کو ہر قسم کا گزند ۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس پر اپنے اس اعتقاد کا منطقی سقم کھل جاتا ہے ۔ اسے پتا چل جاتا ہے کہ بعض کام ایسے ہیں جو اس کے بس کے نہیں ، بعض مسرتیں ایسی ہیں جن کا حاصل کرنا اس کے لیے ناممکن ہے ، بعض غم ایسے ہیں جن سے زبردست ساحر کو بھی مفر نہیں ۔ اب وہ نا قابل حصول نفع اور ناگزیر نقصان کو اُن ان دیکھی قوتوں کے فعل کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے ، جن کی مہربانی حیات و شادمانی سے عبارت ہو اور جن کا قہر باعث مرگ و مصیبت ۔ اس طرح مذہب سحر پر غالب آ جاتا ہے اور مذہبی رہنما ساحر پر ۔ فکری ارتقاء کے اس مرحلے پر چیزوں کے اسباب غائی کو شخصی قسم کی ایسی کثیرالتعداد اور متلون مزاج ہستیوں سے تعبیر کیا جانے لگتا ہے ، جو آدم سرشت ہوتی ہیں ، بلکہ جن میں انسان کی سی خامیاں بھی موجود ہوتی ہیں ، گو وہ انسان سے زیادہ طاقت ور اور ان کا عرصۂ حیات انسان کی زندگی، مختصر سے بہت لمبا سہی ۔ یہ وہ دور ہے جس میں ابھی ان ہستیوں کی غیر مبہم انفرادی خصوصیات اور ان میں سے ہر ایک کے واضح اور نمایاں خد و خال نے فلسفے کے تیز محلل کے اثر سے گھل مل کر مظاہر عالم کی کثرت میں اس نا معلوم بنیادی وحدت کی صورت اختیار کرنی شروع نہیں کی جسے انسان کا تخیل مختلف خاصیتوں سے متصف کرتا ہے اور جس کے لیے ان خاصیتوں کی مناسبت سے اس نے طرح طرح

کے پرشکوہ نام ایجاد کر رکھے ہیں تاکہ اس کی بے علمی اور جہالت پر پردہ پڑا رہے۔ لہذا جب تک انسان اپنے خداؤں کو اپنی جیسی ایسی ہستیاں تصور کیے رہتا ہے، جن کا مقام اعلیٰ اس کے لیے ممکن الحصول ہو، اس کے نزدیک اپنے ان ساتھیوں کے لیے جو دوسروں پر فوقیت رکھتے ہوں، مرنے کے بعد، بلکہ زندگی میں بھی، خدا کے مرتبے تک پہنچنا نا ممکن نہیں ہوتا۔ ان دوسری قسم کے انسان دیوتاؤں کا دور غالباً سحری اور مذہبی عہد کے درمیان آتا ہے۔ اگر ان کے نام اور ظاہری شان و شوکت دیوتاؤں کی سی ہوتی ہے تو ان کے مفروضہ اختیارات بالعموم ان کے پیش رو ساحر کے سے ہوتے ہیں۔ ساحر ہی کی طرح ان خداوندان مجازی سے یہ توقع وابستہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو سحر اعداء سے محفوظ رکھیں گے، انھیں اولاد عطا کریں گے اور موسم کے نظم و ضبط، نیز دوسری ایسی رسموں کے ذریعے انھیں خوراک کی وافر مقدار بہم پہنچاتے رہیں گے، جن کا ادا کرنا زمین کی زرخیزی اور جانوروں کی افزائش کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہو۔ جن اشخاص کے بارے میں یہ عقیدہ ہو کہ وہ ایسے اعلیٰ اور دور رس اختیارات کے حامل ہیں ان کا اپنے ملک میں سب سے بلند مقام حاصل کر لینا قدرتی بات ہے، اور چوں کہ دین اور دنیا کے درمیان ابھی کوئی قطعی حد فاصل قائم نہیں ہوتی، اس لیے وہ سول اور مذہبی دونوں قسم کے معاملات میں مختار کل ہوتے ہیں۔ اس طرح بادشاہ پر خدا کا سایہ نہایت قدیم زمانے سے چلا آتا ہے اور قرنوں میں جا کے کہیں فطرت اور انسان کے متعلق وہ دقیق تصور پیدا ہوتا ہے، جس سے بادشاہ کی تقدیس و الوہیت کا خاتمہ ہو۔

یونان اور لاطیم کے کلاسیکی عہد میں بادشاہت بڑی حد تک ایک قصۂ ماضی ہو چکی تھی، تاہم ان کے بادشاہوں کے سلسلۂ نسب، القاب اور لاف و گزاف کے بارے میں جو قصے کہانیاں ملتی ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ انھیں بہ زعم خود حکومت کا خداداد حق اور مافوق اختیارات حاصل تھے۔ لہذا ہم بلا تامل یہ فرض کر سکتے ہیں کہ نیمی والا بن کا بادشاہ جو بعد کے زمانوں

میں اپنی عظمت دیرینہ کھو چکا تھا اور اس کے برے دن آ چکے تھے ، مقدس سلاطین کے ایک طویل سلسلے کا نمائندہ تھا اور یہ سلاطین کسی زمانے میں ان گوناگوں برکتوں کے عوض جن کا نازل کرنا ان کا فرض منصبی تھا ، اپنی رعایا سے نہ صرف خراج عقیدت وصول کرتے بلکہ پجا کرتے تھے ۔ اریشیائی شجر زار میں دائنا کے منصب سے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں اس کی حیثیت بارور کرنے والی دیوی ، خاص کر زچگی کی دیوی کی تھی ۔ لہذا یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ان اہم فرائض کی تکمیل میں اسے اپنے پجاری کی اعانت حاصل تھی اور یہ دونوں بن کے بادشاہ اور ملکہ کی حیثیت سے بیاہ کی ایک مقدس رسم میں حصہ لیتے ، جس کے ذریعے زمین کو بہار کے تازہ پھولوں اور خریف کے پکے پھلوں سے رونق بخشنا اور صحت مند بچوں سے مردوں اور عورتوں کی گودیں بھرنا مقصود تھیں ۔

اگر نیمی کا پروہت اپنے آپ کو محض بادشاہ ہی نہیں بلکہ خدائے شجر زار ظاہر کرتا تھا تو یہ سوال ہنوز باقی رہتا ہے کہ وہ کون دیوتا تھا جس کا روپ یہ پروہت بھرا کرتا تھا ؟ قدیم شواہد کی روشنی میں اس کا جواب یہ ہے کہ وہ دائنا کے شوہر یا عاشق وربیس کا نمائندہ تھا ۔ لیکن اس جواب سے ہمیں کوئی خاص مدد نہیں ملتی ، اس لیے کہ ہم وربیس کے متعلق اس کے نام سے زیادہ کچھ نہیں جانتے ۔ شاید اس وستائی آگ سے اس مسئلے کے حل کی کوئی راہ نکل سکے ، جو نیمی کے شجر زار میں جلا کرتی تھی ، اس لیے کہ یورپ کے آریاؤں کے ہاں غالباً مقدس آگ بالعموم بلوط کی لکڑی سے جلائی اور اسی سے روشن رکھی جاتی تھی اور خود روم میں جو نیمی سے زیادہ دور نہ تھا ، وستائی آگ کا ایندھن ، جیسا کہ ان کوئلوں کے خوردبینی تجزیے سے ثابت ہوتا ہے جو کاسینڈ تیورجی بونی کو آنیسویں صدی کے آخر میں رومی فورم کی یادگار کھدائی کے دوران میں ملے تھے ، بلوط کی لکڑی یا گدوں پر مشتمل تھا ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لاطیم کے مختلف شہروں کی مذہبی رسوم میں بڑی یکسانیت پائی جاتی

تھی ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ لاطیم میں جہاں کہیں وستائی آگ روشن رکھی جاتی تھی اس میں روم کی طرح بلوط کے درخت کی مقدس لکڑی جلائی جاتی تھی ۔ اگر نیمی میں بھی دستور یہی تھا تو یہ امر قرین صحت ہو جاتا ہے کہ وہاں کا متبرک شجرزار بلوط کے ایک قدرتی بن پر مشتمل تھا اور اس لیے خود وہ خاص درخت بھی جس کی بن کے بادشاہ کو اپنی جان ہتیلی پر رکھ کر حفاظت کرنی پڑتی تھی، بلوط ہی تھا اور ورجل کے بیان کے بموجب اینی آس نے حقیقت میں ایک سدا بہار بلوط ہی سے شاخ زریں توڑی تھی ۔ اب بلوط کے متعلق یہ طے ہے کہ وہ لاطینیوں کے مہا دیوتا جوپیٹر کا مخصوص درخت تھا ۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ بن کا بادشاہ جس کی زندگی ایک طرح بلوط کے ایک درخت سے وابستہ تھی، خود اس معبود جلیل جوپیٹر کا روپ بھرتا تھا ۔ کم از کم شہادت سے، جو اگرچہ ناکافی ہے، اس استنباط کا پہلو نکلتا ہے ۔ البا کے سلویائی یا بنوں والے قدیم سلاطین جن کا نشان امتیاز بلوط کے پتوں کا تاج تھا ۔ صریحاً لاطینی جوپیٹر کا اتباع اور جوپیٹر سے منسوب اختیارات کی ریس کرتے تھے جس کا ٹھکانا کوہ البا پر تھا ۔ لہذا یہ بات نا ممکن نہیں کہ بن کا وہ بادشاہ جو اسی پہاڑ پر کسی قدر نشیب میں مقدس بلوط کی حفاظت کیا کرتا تھا، سلویائی سلسلے کے ان قدیم شاہان البا کا جائز وارث اور نمائندہ ہو ۔ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے کہ لوگوں کی نظر میں اس کی حیثیت ایک آدم زاد جوپیٹر کی تھی تو بہرکیف یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وریبس، جو قصص و روایات کی رو سے اس بن کے بادشاہ کا دوسرا نام تھا، جوپیٹر ہی کی ایک مقامی صورت تھی جو شاید بنوں کے دیوتا کی حیثیت سے اس کا اصلی روپ متصور ہوتی تھی ۔

ہم نے یہ جو فرض کیا ہے کہ بعد کے زمانوں میں بہر صورت بن کا بادشاہ جوپیٹر کا حصہ ادا کیا کرتا تھا، اس کی تصدیق اس نام نہاد بادشاہ کی مقدس رفیقہ دائنا کے بارے میں چھان بین سے ہوتی ہے کیوں کہ استدلال کے دو مختلف خطوط کے اتصال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دائنا جہاں بنوں کی عام دیوی تھی، وہاں وہ نیمی کے مقام

پر بلوط کی خاص دیوی کی حیثیت رکھتی تھی ۔ اول یہ کہ اس کا لقب وستا تھا اور اپنی وستائی حیثیت میں وہ اس مقدس آگ کی رانی تھی جو ہر وقت روشن رکھی جاتی تھی اور جس کے متعلق ، جیسا ہم دیکھ آئے ہیں ، یہ باور کرنے کی وجہ موجود ہے کہ اس کا مخصوص ایندھن بلوط کی لکڑی تھی ۔ لیکن کسی آگ کی دیوی اور اس آگ کے ایندھن کی دیوی میں کچھ زیادہ بعد نہیں ۔ غیر ترقی یافتہ فکر غالباً شعلے اور اس لکڑی کے درمیان جس سے شعلہ پیدا ہوتا ہو ، کوئی حد فاصل قائم نہیں کر پایا تھا ۔ دوسرے یہ کہ نیمی کی پری زاد ایجیریا محض دائنا ہی کی ایک صورت معلوم ہوتی ہے اور ایجیریا کے متعلق یہ واضح ہے کہ وہ ایک قسم کی صحرائی پری زاد یعنی بلوط کی پری تھی ۔ اٹلی میں دوسرے مقامات پر دائنا دیوی کا مسکن وہ پہاڑ تھے جن پر بلوط کے بن چھائے ہوئے تھے ۔ چناں چہ البائی سلسلے کی ایک شاخ کوہ الجی ڈس عہد قدیم میں سدا بہار اور موسمی دونوں قسم کے بلوط کے گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا ۔ جاڑوں میں اس سرد پہاڑ پر کئی کئی مہینے برف جمی رہتی تھی اور خیال تھا کہ اس کے سنسان اور اداس بلوط زار دائنا کا پسندیدہ مسکن ہیں ، جس طرح موجودہ عہد کے یورپ میں وہ رہزنوں کا اڈہ بنے رہے ہیں ۔ اس کے علاوہ قدیم زمانے میں سلسلۂ ایپی نائن کے اس بے ربط اور طویل پہاڑ پر جو کوہ تفاتا کے نام سے موسوم ہے اور جو کاپوا کے عقب میں کیمپینیائی میدان اپنے دامن میں لیے کھڑا ہے ، بلوط کے سر سبز درخت چھائے ہوئے تھے ، جن میں دائنا کا ایک مندر تھا ۔ یہاں سلانے (رومی آمر—۱۳۸ ق—م تا ۷۸ء) اپنی اس فتح کے لیے جو اس کو ماریس اور اس کے حلیفوں پر نیچے میدان میں حاصل ہوئی تھی ، دائنا کا شکر ادا کیا تھا اور اس کی شکر گزاری کا ثبوت بعد میں وہ کتبے پیش کرتے رہے جو اس مندر میں لگے تھے ۔ لہذا ہم مجموعی حیثیت سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نیمی والا بن کا بادشاہ جوپیٹر ہی کے روپ میں ظاہر ہوتا اور مقدس شجر زار میں بلوط کی دیوی دائنا کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتا ۔ ان کے اس مقدس رشتے کی ایک محاکاتی صورت نوما اور ایجیریا کی داستان عشق

میں نظر آتی ہے جن کے ملاپ کی جگہ بعض لوگوں کی رائے میں انھی متبرک بنوں کے اندر تھی ۔

مندوجہ بالا نظریے کے متعلق یہ اعتراض پیدا ہونا قدرتی بات ہے کہ جوپیٹر کی دیورانی جونو تھی نہ کہ دائنا اور یہ کہ اگر دائنا کا واقعی کوئی شوہر تھا تو اس کا نام جوپیٹر کی بجائے دائنس(Dianus) یا جینس (Janus) ہونا چاہیے جن میں یہ دوسرا نام محض (Dianus) کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے ۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن یہ اعتراض اس بناء پر نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ دیوی دیوتاؤں کے یہ دو جوڑے یعنی ایک طرف جوپیٹر اور جونو اور دوسری طرف دائنا اور دائنس یا جینس اور جینا ایک دوسرے کے محض مثنیٰ ہیں اور ان کے اسماء و مناصب اپنی اصل اور معنی کے لحاظ سے ایک ہیں ۔ جہاں تک ان کے ناموں کا تعلق ہے ، وہ چاروں کے چاروں ایک آریائی مادہ ڈائی (Di) بہ معنی روشن سے مشتق ہیں ، جو انھی کے مماثل یونانی مہا دیوتا زیوس اور اس کی قدیم اہلیہ ڈایون (Dione) کے ناموں میں بھی موجود ہے ۔ مناصب کے اعتبار سے جونو اور دائنا دونوں ثمروری اور زچگی کی دیویاں تھیں اور دونوں نے دیر یا سویر چاند کی حیثیت اختیار کر لی ۔ جینس کے منصب کی صحیح نوعیت خود قدیم عہد کے لوگوں کے لیے بھی ایک معمہ تھی اور جس چیز کا انھیں کوئی قطعی علم نہ ہو اس کے بارے میں ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے ۔ لیکن وارو (ایک قدیم رومی عالم) کے بیان کے بموجب جینس کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ آسمان کا دیوتا ہے ، جس کی تائید نہ صرف آسمان کے دیوتا جوپیٹر کے نام کے ساتھ اس کے نام کے صرف تطابق سے ہوتی ہے بلکہ اس تعلق سے بھی جو اس کا جوپیٹر کی دو بیویوں جونو اور جوترنا کے ساتھ رہا ہوگا ۔ کیوں کہ جینس کا جونونیائی کے لقب سے ملقب کیا جانا ان دیوی دیوتاؤں کے رشتۂ ازدواج کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ اور ایک بیان کے بموجب جینس جل پری جوترنا کا شوہر تھا ، جو بعض دوسرے بیانات کی رو سے جوپیٹر کی محبوبہ تھی ۔ نیز جونو کی طرح جینس کا عام لقب ''باپ'' تھا اور اس کی دھائی دیتے ہوئے با ضابطہ

یہی لقب استعمال کیا جاتا تھا ۔ فی الحقیقت جینس نہ صرف فاضل سینٹ آگسٹائن کی منطق کی رو سے جوپیٹر ھی کا دوسرا نام قرار پاتا ھے ، بلکہ اس کے ایک پرستار کی عقیدت مندی کی بناء پر بھی جس نے جوپیٹر دائنس پر ایک نذر چڑھائی تھی ۔ بلوط سے اس کے رشتے کا سراغ دریائے ٹائی بر کی داھنی جانب ایک پہاڑ جینی کولم سے لگ سکتا ھے ، جہاں کہا جاتا ھے کہ اٹلی کی تاریخ کے اولین ادوار میں جینس کا راج تھا ۔

اس طرح اگر میرا خیال درست ھے تو ایک ھی قسم کے دو دو قدیم دیوی دیوتا یونانی اور اطالوی اقوام میں زیوس اور ڈایون ، جوپیٹر اور جونو یا دائنس (جینس) اور دائنا (جینا) کے مختلف ناموں سے موسوم تھے اور یہ نام معناً اور اصلاً ایک تھے ، اگرچہ ان دیوی دیوتاؤں کے پوجنے والے قبیلوں کی بولیوں کے لحاظ سے ان کی صورتیں بدلی ھوئی تھیں ۔ ھوا یہ ھوگا کہ پہلے پہل جب لوگ ایک دوسرے کے قریب آباد تھے تو ان دیوی دیوتاؤں کا فرق ناموں کے اختلاف سے آگے نہ بڑھا ۔ دوسرے لفظوں میں اس فرق کی نوعیت محض لسانی رھی ، لیکن جب قبائل رفتہ رفتہ مختلف سمتوں میں بکھر گئے اور اس کے نتیجے میں ان کے باھمی رشتے منقطع ھو گئے تو ان دیوی دیوتاؤں کے تصور اور انداز پرستش میں بھی فرق آتا چلا گیا ، جنھیں وہ اپنے آبائی وطن سے پوجتے نکلے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان سے متعلق اساطیر و رسوم میں تناقض پیدا ھوگئے اور اس طرح ان معبودوں کے درمیان شروع شروع میں جو نرے ظاھری اختلافات تھے وہ حقیقی اور معنوی اختلافات میں بدل گئے ۔ پھر جب کلچر کی آھستہ آھستہ ترقی کے ساتھ ساتھ وحشت و جاھلیت اور طوائف الملوکی کا طویل دور ختم ھونے لگا اور کسی ایک طاقت ور قبیلے کے سیاسی اقتدار کی کشش یا دباؤ سے اس کے کمزور ھمسائے متحد ھو کر قومی رشتے میں منسلک ھو گئے تو ان کی بولیوں کی طرح ان کے معبودوں نے بھی ایک مشترک سرمائے کی حیثیت اختیار کرلی ۔ اس طرح شاید یہ ھوا کہ وہ قدیم دیوی دیوتا جنھیں عہد انتشار سے قبل ان کے آبا و اجداد ایک ساتھ پوجا کرتے

تھے ، زبان کے مقامی تغیرات اور مذہبی اختلافات کے مجموعی اثر سے ایسے جون بدلے کہ ان کے اصلی خد و خال کی شناخت ممکن نہ رہی اور انھیں قومی بزم اصنام میں جداگانہ معبودوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے برابر جگہ مل گئی ۔

دیوی دیوتاؤں کی اس تضعیف ، ایک ھی نسل کے مختلف قبایل کے آخری میل کے اس نتیجے سے ، جو عہدوں ایک دوسرے سے کٹے رہے تھے ، رومی مذہب میں جینس کے ساتھ جوپیٹر اور دائنا یا جینا کے ساتھ جونو کے ظہور کی وضاحت ہو جاتی ہے ۔ یہ نظریہ کم از کم اس رائے سے زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے ، جس کی بعض جدید عالموں نے تائید کی ہے اور جس کی رو سے جینس ابتدا میں محض ایک دربان دیوتا تھا ۔ یہ امر کہ اس جیسا عظیم اور اہم معبود جو رومیوں کے نزدیک دیوتاؤں کا دیوتا اور اپنی قوم کا باپ تھا ، شروع شروع میں ایسی معمولی حیثیت کا مالک تھا ، دور از قیاس معلوم ہوتا ہے ، جس کی معراج یہ کچھ ہو ، وہ آغاز میں اس قدر حقیر کیسے ہو سکتا ہے ۔ زیادہ قرین صحت یہ ہے کہ اسم (Janua) کی اصل جینس کا نام تھا ، نہ کہ جینس کے نام کی اصل ۔ خود لفظ (Janua) پر غور کرنے سے اس نظریے کی تائید ہوگی ۔ ہندوستان سے لے کر آئرستان تک ساری آریائی زبانوں میں دروازے کے لیے باضابطہ لفظ ایک ھی ہے ۔ سنکسرت میں وہ 'در' ہے ، یونانی میں 'تھرا' جرمن میں 'ٹوئر' انگریزی میں 'ڈور' آئرستانی میں 'ڈورس' اور لاطینی میں 'فورس' ۔ تاہم لاطینیوں کے ہاں دروازے کے لیے اس عام اور مشترک لفظ کے علاوہ ایک اور اسم جینوا بھی تھا جس سے مطابقت رکھنے والا لفظ کسی اور ہند یورپی زبان میں نہیں ملتا ۔ یہ لفظ اسم جینس سے ماخوذ ایک صفت معلوم ہوتا ہے ۔ میرا قیاس ہے کہ لاطینی اپنے ہر گھر کے بڑے دروازے پر جینس کی مورتی یا نشانی ایستادہ رکھا کرتے تھے تاکہ وہ اس عظیم دیوتا کی حفاظت میں رہے ۔ اس صورت سے جو دروازہ اس کی حفاظت میں ہوتا وہ شاید جینوا فورس یا جینوائی دروازہ کہلاتا ۔ اور پھر ان دو لفظوں کی ترکیب کی تخفیف سے لفظ جینوا وجود میں آ گیا

جس میں لفظ فورس محذوف ہو کر مقدر رہ گیا ۔ اس تبدیلی کی بناء پر دروازے کے عام مفہوم میں ، خواہ جینس اس کا نگہبان ہو یا نہ ہو ، لفظ جینوا کا استعمال ایک قدرتی تغیر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔

اگر میرے اس قیاس میں حقیقت کا عنصر موجود ہے تو اس سے جینس کے دوھرے سر کی اصل و بناء بڑی آسانی سے واضح ہو جائے گی جس پر ماھرین صنمیات نے مدتوں سر کھپایا ہے ۔ جب جینس کے بت کو مکانوں اور شہروں کے دروازوں کا محافظ بنانے کا دستور عام ہو گیا تو شاید یہ ضروری خیال کیا جانے لگا کہ یہ سنتری دیوتا بہ یک وقت آگے پیچھے دونوں سمت نگراں رہے تا کہ کوئی چیز اس کی نگاہ سے بچ کر نکلنے نہ پائے ، اس لیے کہ اگر یہ مقدس پاسبان ہمیشہ ایک ھی سمت دیکھتا رہتا تو اس کی پیٹھ پیچھے بے خوف سزا کیا کچھ نہ شرارت ہو سکتی تھی ؟ روم کے دو سر والے دیوتا کی اس توجیہ کی تصدیق اس دوھرے سر کے بت سے ہوتی ہے جو سوری نام (جنوبی امریکہ) کے اندرونی علاقے کے صحرائی حبشیوں کے کسی گاؤں کے دروازے پر بطور محافظ باقاعدہ ایستادہ نظر آتا ہے ۔ کندے کا یہ بت جس کی دونوں جانب ایک بھدی سی انسانی شکل کھدی ہوتی ہے ، گاؤں کے پھاٹک کے نیچے کھڑا کر دیا جاتا ہے ، جو دو تھموں اور ایک آڑی بلی پر مشتمل ہوتا ہے ۔ اس کے برابر بھوت پریت کو دور رکھنے کے لیے عام طور پر ایک سفید دھجی رکھی ہوتی ہے اور بعض وقت ایک سونٹا یا ایک طرح کا ایک چوبی ھتھیار بھی ۔ نیز پھاٹک کی آڑی بلی سے ایک لٹھ ٹنگا ہوتا ہے ، تا کہ ہر اس بد روح کی سرکوبی کی جائے جو گاؤں میں داخل ہونے کی کوشش کرے ۔ یہ بالکل واضح ہے کہ سوری نام کے حبشیوں کے گاؤں کا یہ بت جینس کی دو سر والی مورتیوں سے قریبی مشابہت رکھتا ہے جو اپنے ایک ہاتھ میں لکڑی پکڑے اور دوسرے میں چابی ، روم میں کھڑی شہر اور گھروں کی دربانی کیا کرتی تھیں ۔ اور ان دونوں صورتوں میں آگے پیچھے دیکھتے ہوئے سر بھی یقیناً اس محافظ دیوتا کی چوکسی کے آئینہ دار تھے، جو دونوں جانب شیاطین پر نگاہ رکھے اپنی جگہ تیار

کھڑا رہتا تھا ، تاکہ وہیں ان کا سر کچل دے ۔ لہذا ہم دو سر والے جینس سے متعلق ان لاطائل اور اکتا دینے والی توجیہوں کو اپنی بحث سے خارج کر سکتے ہیں جن کے ذریعے ، اگر اووڈ کا اعتبار کیا جائے ، تو خود اس دیوتا نے ایک فکر مند سائل کو فریب دیا تھا ۔

تحقیق کے ان نتائج کی بنا پر نیمی والے پجاری کے متعلق یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ دائنا کے شوہر کی حیثیت سے جوپیٹر کی بجائے دائنس یا جینس کا نمایندہ تھا ، لیکن شروع شروع میں یہ ایک ہی معبود کے دو مختلف نام تھے اور ناموں کے اس سطحی فرق کا آسمان ، رعد اور بلوط کی قوت کی حیثیت سے اس دیوتا کے مناصب اصلی پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا ۔ لہذا مناسب تھا کہ نیمی میں اس کا انسانی نمائندہ بلوط کے شجر زاروں میں قیام رکھتا اور ، جیسا کہ ہم ثابت کر آئے ہیں ، وہ اسی میں رہتا تھا ۔ اس پجاری کا لقب 'بن کا بادشاہ' اس معبود کی دشتی خصوصیت کا آئینہ دار ہے ، جس کی پوجا پاٹ اس کا فرض منصبی تھا اور چوں کہ اس پر وہی شخص حملہ کر سکتا تھا جس نے اس شجر زار کے کسی خاص درخت کی ڈالی توڑی ہو ، لہذا اس کی زندگی ایک طرح اس مقدس درخت سے وابستہ تھی ۔ اس طرح وہ نہ صرف بلوط کے عظیم آریائی دیوتا کا پرستار تھا ، بلکہ اس کی انسانی صورت بھی ۔ نیز بلوط کے دیوتا کی حیثیت سے وہ بلوط کی دیوی کے ساتھ ، خواہ اس کا نام ایجیریا رہا ہو یا دائنا ، رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتا اور کسی نہ کسی صورت میں ان دونوں کی خلوت صحیحہ زمین کی زرخیزی اور انسان اور حیوان کی افزائش نسل کے لیے ناگریز خیال کی جاتی ۔ مزید بر ایں چوں کہ بلوط کا دیوتا آسمان اور رعد و باراں کا بھی دیوتا تھا ، لہذا اس کے انسانی نمائندے کے لیے دوسرے مقدس بادشاہوں کی مانند یہ ضروری تھا کہ وہ صحیح موسم میں آسمان پر بادل اٹھا کر لائے اور انھیں گرجوا کر برسوائے تاکہ کھیت اور باغ پھلیں پھولیں اور چراگاہیں سر سبز ہو جائیں ۔ وہ مشہور ہستی ، جو ایسے اعلیٰ اختیارات کی حامل ہو ، یقیناً بڑی اہمیت رکھتی ہوگی ۔ اس مقام سے جہاں نیمی کی عبادت گاہ واقع تھی ، جو نذر کردہ چیزیں دستیاب

ہوئی ہیں ان سے اور ان کے ساتھ کلاسیکی اہل قلم کی شہادت کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعد کے زمانوں میں یہ عبادت گاہ اٹلی کی ایک سب سے بڑی اور سب سے مقبول زیارت گاہ تھی ۔ اس عہد میں بھی جب کہ گرد و نواح کا میدانی علاقہ ابھی تک لاطینی اتحاد کے چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹا ہوا تھا ، اس مقدس شجرزار کے متعلق یہ پتا چلتا ہے کہ وہ ایک ادب گاہ عام تھا اور اس کی سارے قبیلے یکساں خبر رکھتے تھے اور جس طرح شاہان کیمبوڈیا اپنے ملک کے دور افتادہ گرم جنگلوں کے قلب میں چھپے آگ اور پانی کے مقدس بادشاہوں کو تحفے بھیجا کرتے تھے ، اسی طرح یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ لاطینیوں کے وسیع علاقے کے گوشے گوشے سے زائروں کی نگاہیں اور قدم اس مقام کی طرف اٹھتے رہتے تھے ، جہاں نیلگوں کوہ ایپی نائن یا دور سمندر کے سیاہی مائل منظر کے بالمقابل البائی پہاڑ ان کے سامنے کھڑے تھے اور جہاں بن کا پر اسرار بادشاہ رہتا تھا ۔ یہاں ہرے بھرے بنوں اور پہاڑوں کی پرسکون جھیل کے کنارے بلوط ، رعد اور برستے آسمان کے دیوتا کی پوجا کی قدیم آریائی ریت اپنی ابتدائی اور قریب قریب سحری صورت میں اس سیاسی اور ذہنی انقلاب کے بعد بھی مدتوں جاری رہی، جس کے سبب لاطینیوں کا مذہبی مرکز نیمی کے جنگل سے شہر روم منتقل ہو چکا تھا ۔

سترھواں باب

# بارکج کلاھی

## (۱) بادشاھوں اور مذھبی پیشواؤں سے متعلق امتناعات

**امتناعات** — معاشرے کے ارتقاء کے ایک ابتدائی مرحلے پر اکثر بادشاہ یا مذھبی رھنما کی ذات مافوق الفطرت ھستی یا خدائے مجازی تصور کی جاتی ھے اور اس عقیدے کے بموجب یہ خیال کیا جاتا ھے کہ فطرت کم و بیش اس کے تابع ھے اور اسے موسم اور فصلوں کی خرابی ، نیز اسی قسم کے دوسرے مصائب کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ھے ۔ بہ ظاھر کسی حد تک یہ فرض کیا جاتا ھے کہ اپنی رعایا اور غلاموں کی طرح فطرت پر بھی بادشاہ کی حکومت میں اس کے قطعی ارادوں کو دخل ھے اور اس لیے اگر خشک سالی ، قحط ، وبا یا طوفان کی صورت میں کوئی آفت آئے تو لوگ اسے بادشاہ کی غفلت سے منسوب کرتے ھیں یا اس کا جرم بالعمد قرار دیتے ھیں ، جس کی پاداش میں اسے باندھ کر پیٹا جاتا ھے اور اگر اس پر بھی وہ اپنی ضد نہ چھوڑے تو معزول اور قتل کر دیا جاتا ھے ۔ تاھم بعض وقت عام خیال کے بموجب فطرت اپنے معمول میں ، جہاں بادشاہ کی ذات پر انحصار رکھتی ھے ، وھاں جزواً بادشاہ کے عزم اور ارادے سے آزاد ھوتی ھے ، یا یوں کہیے کہ بادشاہ کی ذات کائنات کا ایسا مرکز حرکی متصور ھوتی ھے جس کی تحریک و تہیج سے آسمان کا گوشہ گوشہ متحرک ھو جاتا ھو ۔ چناں چہ وہ سر ھلا دے ،

ہاتھ اٹھا دے یا کوئی اور حرکت کر جائے تو اسی وقت فطرت کے کسی نہ کسی حصے پر اس کا اثر مرتب ہو جائے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی سخت خلل پڑ جائے۔ اس کی ذات پر عالم کا توازن قائم ہوتا ہے اور اس کی خفیف سی بے ضابطگی سے بھی یہ توازن بگڑ سکتا ہے۔ لہذا اس کے لیے انتہا درجے محتاط رہنا اور اس کی سخت خبر رکھنی چاہیے۔ اس کی ساری زندگی ضابطے کی پابند ہونی چاہیے تاکہ اس کے کسی ارادی یا غیر ارادی فعل سے نظم گیتی برہم نہ ہونے پائے۔ اس قسم کے سلاطین کا خاص نمونہ جاپان کے شہنشاہ میکاڈو یا ڈیری کی ذات ہے، یا کبھی تھی۔ اس کی ہستی سورج کی دیوی کا مظہر ہے جو دیوتاؤں اور انسانوں سمیت ساری کائنات پر حکومت کرتی ہے۔ سال میں ایک مرتبہ سارے دیوتا اس کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور اس کے دربار میں ایک مہینہ گزارتے ہیں۔ اس مہینے کے دوران میں جس کے نام کا مطلب ''دیوتاؤں کے بغیر'' ہے، مندروں میں کوئی نہیں جاتا، اس لیے کہ وہ دیوتاؤں سے خالی ہوتے ہیں۔ میکاڈو اپنی رعایا سے خدائے مجسم یا مجازی کا لقب حاصل کرتا ہے اور اسے اپنے فرمانوں اور سرکاری اعلانوں میں استعمال کرتا ہے، اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اسے جاپان کے دیوتاؤں پر اختیار عام حاصل ہے۔ مثلاً ۶۴۶ء کے شاہی فرمان میں بادشاہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''خدائے مجسم جو کائنات کا حاکم ہے۔'' آج سے تقریباً دو سو سال قبل میکاڈو کے طرز زندگی کا جو حال قلم بند کیا گیا تھا، وہ حسب ذیل ہے:

> ''آج بھی جن شہزادوں کا سلسلۂ نسب اس خاندان سے ملتا ہے، خاص کر جو سریر آرائے سلطنت ہوتے ہیں، ان کی ذات کا لوگوں کی نظر میں بڑا تقدس ہے اور ان میں سے ہر ایک کو پیدائشی پیشوائے اعظم خیال کیا جاتا ہے۔ انھیں اپنی رعایا کے ذہن میں ان مفید مطلب تصورات کو قائم رکھنے کے لیے اپنی ذات با برکات کا انتہائی خیال رکھنا اور وہ کچھ کرنا پڑتا ہے، جس کا دوسری قوموں کے رسم و رواج سے

مقابلہ کیا جائے تو مضحکہ خیز اور لغو معلوم ہو ۔ یہاں اس کی چند مثالیں بے محل نہ ہوں گی ۔ وہ سمجھتا ہے کہ زمین سے اس کا پاؤں لگنا اس کی کسر شان اور بے حرمتی ہے ، اس وجہ سے اگر وہ کہیں جانا چاہے تو اسے آدمیوں کے کندھوں پر بیٹھ کر جانا چاہیے ۔ اسی طرح اگر اس کی ذات مقدس کھلی فضا میں رہے تو اس کی شان خسروی و خداوندی میں فرق آ جائے گا ۔ آفتاب اس قابل نہیں کہ اس کے سر پر چمکے ۔ اس کے جسم کا ایک ایک جزو اس قدر معتبرک سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے سر کے بال ڈاڑھی یا ناخن نہیں کٹوا سکتا ۔ تاہم اس کے جسم کی صفائی کی خاطر یہ متبرک اجزاء رات کو اس وقت کاٹے جا سکتے ہیں جب وہ نیند میں ہو ۔ کہتے ہیں کہ اس حالت میں اس کے جسم سے کسی چیز کا علیحدہ کرنا بہ منزلہ چوری کے ہے اور ایسی چوری سے اس کی سطوت و حرمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ اگلے زمانے میں اسے ہر روز صبح کچھ گھنٹے تاج شہنشاہی پہنے بالکل بے حس و حرکت ایک بت کی طرح اپنے تخت پر بیٹھا رہنا پڑتا تھا ، خیال تھا کہ اس صورت سے اس کی سلطنت میں امن و امان برقرار رہ سکے گا اور اگر وہ کسی سمت ذرا سی بھی جنبش کر جاتا یا کچھ دیر اپنی قلم رو کے کسی حصے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتا تو اس بد نصیب علاقے کی خیر نہ تھی ۔ اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جاتا کہ بس اب اس پر جنگ ، قحط ، آتش زدگی وغیرہ کی صورت میں کوئی نہ کوئی آفت آیا چاہتی ہے ۔ لیکن بعد میں جب یہ پتا چلا کہ تاج سلطانی وہ طلسم سلامتی ہے جس کے سکون و قرار سے سلطنت میں امن قائم رہ سکتا ہے تو یہ قرین مصلحت سمجھا گیا کہ ذات خسروی کو اس فرض کے بار گراں سے سبک دوش کر کے عیش و آرام کے لیے وقف کر دیا جائے ، اور اس لیے آج کل تاج ہی

ہر روز صبح چند گھنٹے تخت پر رکھ دیا جاتا ہے ۔ اس کا خاصہ ہر روز نئے برتنوں میں پکایا اور نئی قابوں میں میز پر چنا جانا چاہیے ۔ کھانے پکانے کے یہ ظروف نہایت پاک صاف لیکن معمولی مٹی کے ہوتے ہیں تاکہ ایک مرتبہ کے استعمال کے بعد انہیں پھینکا یا توڑا جا سکے اور اس طرح ہر روز نئے ظروف کے استعمال پر کوئی خاص خرچ نہ آئے ۔ عام طور پر یہ ظروف اس ڈر سے توڑ دیے جاتے ہیں کہ کہیں وہ کسی عام آدمی کے ہاتھ نہ پڑ جائیں ، کیوں کہ عام عقیدے کے بہ موجب اگر کوئی عام آدمی ان مقدس قابوں میں کھانا کھا لے تو اس کا منہ اور گلا سوج جائے گا۔ ایسا ہی عقیدہ ڈیری کے متبرک خلعت کے بارے میں بھی ہے ، جس کی رو سے اگر اسے کوئی آدمی شہنشاہ کی اجازت یا حکم کے بغیر پہن لے تو اس کا عضو عضو دکھنے لگے اور سوج آئے ۔''

میکاڈو کے متعلق ایک اور قدیم بیان سے بھی یہی کچھ ظاہر ہوتا ہے : ''اس کے قدموں سے زمین کا چھو جانا بھی اس کی سخت توہین خیال کیا جاتا تھا ۔ چاند سورج کو اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ اس کے فرق مبارک پر چمکیں ۔ اس کے سر یا ڈاڑھی کے بال یا ناخن وغیرہ کوئی چیز کاٹی نہیں جاتی تھی ، اس کے خاصے کی ہر شے نئے برتنوں میں تیار کی جاتی تھی ۔''

اسی قسم کے مذہبی یا مقدس بادشاہوں کی مثالیں افریقہ کے مغربی ساحل کی ان قوموں میں ملتی ہیں جو اور بھی پس ماندہ ہیں ۔ چناں چہ جنوبی گنی میں کیپ پارڈن کے قریب شارپ پائنٹ کے مقام پر ایک مذہبی بادشاہ موسوم بہ کوکولو تن تنہا جنگل میں رہتا ہے ، وہ نہ کسی عورت کو چھو سکتا ہے اور نہ اپنے گھر سے قدم باہر رکھ سکتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اسے اپنی کرسی سے بھی اٹھنے کی اجازت نہیں جس پر بیٹھے بیٹھے ہی اسے اپنی نیند پوری کرنی پڑتی ہے ۔ اس لیے کہ وہ اگر نیچے لیٹ جائے تو ہوا نہ چلے اور

جہاز رک جائیں ۔ اس کا کام طوفانوں کا نظم و ضبط اور فضا میں اعتدال قائم رکھنا ہے ۔ ٹوگو میں کوہ آگو پر ایک فتیش یا روح ہے جو باگبا کہلاتی ہے ۔ یہ گرد و نواح کے سارے علاقے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مینہ برسانا یا روکنا اس کے اختیار میں ہے ۔ ساری ہوائیں ، مع اس سموم کے جو اندرونی علاقے سے چلتی ہے ، اس کی تابع ہیں ۔ اس کے پجاری کی بود و باش پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر ایک مکان میں ہے ، جہاں وہ بڑے بڑے مرتبانوں میں ہوائیں بند رکھتا ہے ۔ بارش کے لیے بھی اسی سے درخواست کی جاتی ہے اور وہ طلسموں کا اچھا خاصہ کاروبار کر لیتا ہے جو چیتے کے دانت اور ناخن پر مشتمل ہوتے ہیں ۔ اگرچہ اسے بڑی طاقت حاصل ہے اور حقیقت میں وہی اس علاقے کا اصل سردار ہے ، لیکن اس کے لیے اپنے معبود فتیش کے ضابطے کی رو سے ہر وقت اپنے پہاڑ پر رہنا ضروری ہے ، جس کی چوٹی پر اس کی ساری عمر بسر ہو جاتی ہے ۔ سال میں صرف ایک بار اسے خرید و فروخت کے لیے بازار جانے کی اجازت ہے اور اس صورت میں بھی وہ کسی عام انسان کے جھونپڑے میں قدم نہیں رکھ سکتا اور اسی دن اس کا اپنے پہاڑی مسکن کو لوٹ آنا ضروری ہے ۔ گاؤں کا نظم و نسق اس کے ماتحت سردار چلاتے ہیں جن کا تقرر اسی کے ہاتھ میں ہے ۔ افریقہ کی سلطنت کانگو میں ایک پیشوائے اعظم تھا جو چیٹومبے یا چیٹومبے کہلاتا تھا ۔ اس کو وہاں کے نیگرو خدائے ارض و سما سمجھتے تھے ، اس لیے جب تک وہ اپنی فصلوں کا ثمر پیش رس اس کی نذر نہ کر دیتے ایک دانہ منہ میں نہ رکھتے ۔ انھیں یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ اس دستور سے انحراف کریں تو ان پر طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہو جائیں گی ۔ جب وہ اپنے علاقے کے دورے پر نکلتا تو سارے شادی شدہ لوگوں کو سخت مجاہدۂ نفس کرنا پڑتا ، کیوں کہ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس وقت جنسی مواصلت یا بد پرہیزی ان کے حق میں مہلک ثابت ہوگی ۔ نیز انھوں نے سمجھ رکھا تھا کہ اگر چیٹومبے طبعی موت مرے تو ساری دنیا برباد اور زمین ، جو اسی کی قوت اور اہلیت کے سہارے قائم ہے ،

نیست و نابود ہو جائے گا ۔ جس وقت اہل ہسپانیہ نئی دنیا کی تسخیر کرنے گئے ہیں تو وہاں کی نیم وحشی قوموں میں جاپان کا سا مذہبی نظام حکومت قائم تھا ۔ خاص کر زاپوٹیکوں کا مذہبی پیشوا میکاڈو سے غالباً قریبی مشابہت رکھتا تھا ۔ یہ روحانی حکم ران جو خود بادشاہ کا سب سے زبردست حریف تھا ، سلطنت کے ایک بڑے شہر یوپ آ کا مطلق العنان فرماں روا تھا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے تقدس و حرمت کی کوئی حد نہ تھی ۔ اسے ایک دیوتا سمجھا جاتا تھا ، زمین اس قابل نہ تھی کہ اس کا بار اٹھائے اور نہ آفتاب کی روشنی اس کی شان کے شایاں تھی ۔ اگر وہ زمین پر قدم رکھ دیتا تو اس کی سخت بے حرمتی ہوتی ۔ اس کی پالکی کو جو عہدہ دار اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتے تھے ان کا تعلق نہایت اعلیٰ خاندانوں سے ہوتا تھا ۔ وہ آس پاس کی کسی چیز پر نظر اٹھا کر نہ دیکھتا ، اور جو کوئی اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتا منہ کے بل زمین پر گر پڑتا ۔ اسے یہ خوف ہوتا کہ اگر اس جلیل القدر ہستی کے سایے پر بھی اس کی نظر پڑ جائے تو موت اس کا گلا دبوچ لے گی ۔ زاپوٹیک پیشواؤں پر ضبط نفس کا ایک ضابطہ عائد ہوتا ، خاص کر مذکورۂ بالا بڑے پیشواء پر ، لیکن ''سال میں کچھ دن ایسے ہوتے جن میں رقص و طعام کی عام محفلیں منعقد ہوتیں ۔ ان موقعوں پر بڑا پیشوا پی کر مست ہو جایا کرتا تھا اور اس حالت میں ، جب کہ اس کا تعلق نہ زمین سے نظر آتا اور نہ آسمان سے ، ایک نہایت حسین دوشیزہ جو دیوتاؤں کے لیے وقف ہوتی ، اس کی خدمت میں لائی جاتی ۔'' اگر اس پیشوا سے اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو اس کی شہزادے کی طرح پرورش کی جاتی اور سب سے بڑا لڑکا اپنے باپ کی مسند پیشوائی کا وارث بن جاتا ۔ اس پیشواء سے جو مافوق قوتیں منسوب تھیں ان کی صراحت نہیں کی گئی ہے لیکن غالباً وہ ویسی ہی کچھ تھیں جن کے میکاڈو اور چیٹومے حامل تھے ۔

ظاہر ہے کہ جاپان اور مغربی افریقہ کی طرح ، جہاں بھی بادشاہ یا مذہبی پیشواء کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہو کہ فطرت کا نظام بلکہ

دنیا کا وجود اس کی ذات سے وابستہ ہے ، وہاں لازمی طور پر اس کی رعایا یا عقیدت مندوں کو اس سے بہ یک وقت بے حساب برکتوں کی توقع بھی ہوگی اور بے حساب آفتوں کا خطرہ بھی ۔ ایک طرف لوگ بارش اور دھوپ کے لیے ، جو زمین کے پھل کو نمو بخشتی ہے ، ہوا کے لیے جو جہازوں کو ٹھیل کے ان کے ملک کے ساحلوں کی طرف لاتی ہے ، بلکہ اس سخت زمین کے لیے بھی جس پر وہ چلتے پھرتے ہیں ، اپنے بادشاہ کے رہین منت ہوتے ہیں ۔ لیکن دوسری طرف وہ جو کچھ دیتا ہے اس سے ہاتھ بھی کھینچ سکتا ہے اور اس کی ذات پر فطرت کا دار و مدار کچھ اس طرح ہوتا ہے ، جن قوتوں کا وہ محور ہوتا ہے ان کا توازن اس قدر نازک چیز ہوتی ہے کہ اس کی خفیف سی بے ضابطگی بھی ایک ایسی ہل چل مچا سکتی ہے جس سے زمین کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں ۔ اس طرح اگر بادشاہ کی ذرا سی غیر ارادی حرکت سے بھی فطرت میں خلل پڑ جاتا ہو تو اس قیامت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں جو اس کی موت سے برپا ہوتی ہوگی ۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں ، چیٹومے کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس کی طبعی موت سے دنیا کی تمام چیزیں ملیا میٹ ہو جاتی ہیں ۔ لہذا ظاہر ہے کہ لوگ اپنی جان کی سلامتی کی خاطر جو بادشاہ کی کسی جلد بازانہ حرکت اور اس سے بھی بڑھ کر اس کی موت سے جو کھوں میں پڑ سکتی ہو ، بادشاہ سے ان ضوابط کی سخت پابندی کراتے ہیں ، جن کی تعمیل خود اس کے تحفظ اور اس کے نتیجے میں اس کی قوم اور دنیا کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں ۔ یہ خیال کہ قدیم عہد کی سلطنتیں ایسی مطلق العنان بادشاہتوں سے عبارت ہیں جن میں لوگ بادشاہ کے لیے جیتے ہیں ، زیر بحث ملوکیتوں پر قطعی منطبق نہیں ہوتا ۔ اس کے بالکل برعکس خود بادشاہ لوگوں کے لیے وجود رکھتا ہے ۔ جب تک وہ فطرت کے نظم و ضبط سے لوگوں کو فائدہ پہنچا کر اپنا فرض انجام دیتا رہتا ہے ، اس کی زندگی قابل قدر ہوتی ہے اور جوں ہی وہ اس فرض کی تکمیل سے قاصر رہے لوگوں کی ساری عقیدت اور جذبۂ خدمت و

جاں نثاری نفرت و حقارت میں بدل جاتا ہے اور اسے بڑی بےآبروئی کے ساتھ موقوف کر دیا جاتا ہے ، بلکہ وہ شاید اپنی جان سلامت لے جانا بسا غنیمت سمجھے ۔ اس طرح جو ہستی کبھی کسی دیوتا کی طرح پجتی تھی ، اب ایک مجرم کی طرح قتل کر دی جاتی ہے ، لیکن لوگوں کے رویے کی یہ تبدیلی متناقض یا متلون مزاجی کا نتیجہ نہیں ہوتی ۔ اس کے برعکس بادشاہ کے ساتھ ان کا بدلا ہوا طرز عمل قطعاً مناسب اور حالات کے مطابق ہوتا ہے ۔ اگر بادشاہ ان کا دیوتا ہے تو وہ ان کا محافظ بھی ہے یا ہونا چاہیے ۔ اگر وہ ان کا تحفظ نہیں کر سکتا تو اسے ایسے شخص کے لیے جگہ خالی کر دینی چاہیے جو اس کا اہل ہو ۔ تاہم جب تک وہ ان کی توقعات پوری کرتا رہتا ہے ، لوگ اس کا بے انتہا خیال رکھتے ہیں اور خود اسے بھی انتہا درجہ محتاط رہنے پر مجبور کرتے ہیں ۔ اس قسم کا بادشاہ آداب و رسوم کے بندھنوں میں جکڑا ہوتا اور اس کے گرد بندشوں کا جال بچھا ہوتا ہے ، جن سے اس کی شان بڑھانی یا اسے آرام پہنچانا مقصود نہیں ہوتا ، بلکہ ان کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ بادشاہ کو ایسے افعال سے روکا جائے جن سے نظم فطرت برہم ہو کر حشر برپا ہونے اور خود اس کی ذات ، قوم اور سنسار سب کے نیست و نابود ہونے کا خطرہ ہو ۔ ان پابندیوں سے بادشاہ کی آسائش میں اضافہ ہونا تو درکنار ، اس کے ایک ایک فعل پر قدغن لگ کر اس کی آزادی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی ایک وبال جان اور مصیبت بن کر رہ جاتی ہے ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ لوانگو کے مافوق الفطرت بادشاہوں میں جس کی طاقت جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنے ہی زیادہ ٹیبو اس پر عائد ہوتے ہیں ۔ اس کا چلنا پھرنا ، کھڑا ہونا ، کھانا پینا ، سونا جاگنا ، غرض کہ ہر فعل منضبط ہوتا ہے ۔ یہ قدغنیں سلطنت کے وارث پر یوں تو بچپن ہی سے لگی ہوتی ہیں ، لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے ان آداب و نواہی کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے جن کی پابندی اس کے لیے لازمی ہے ۔ ''تا آں کہ جب اس کی تخت نشینی کی نوبت آتی ہے تو وہ سر تا پا رسوم و امتناعات کی زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے ۔'' ایک جوالا مکھ

میں جس کی ڈھلانیں ہر طرف سبزے سے ڈھکی رہتی ہیں ربابا کی جھونپڑیاں اور یام (رتالو) کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں جو وہاں کے بادشاہ فرنانڈوپو کی راج دھانی ہیں۔ یہ پر اسرار ہستی اپنے حرم کی چالیس عورتوں کے ساتھ اس جوالا مکھ کی تہہ میں رہتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ چاندی کے قدیم سکوں سے اس کا جسم ڈھکا ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ایک نرا وحشی ہے لیکن سانتا ازابیل کے ہسپانوی گورنر سے کہیں زیادہ اثر و اختیار رکھتا ہے۔ بوبیوں یا اس جزیرے کے اصلی باشندوں کی قدامت پسند روحیں اس کا جزو ذات ہیں۔ اس نے کبھی کسی سفید فام آدمی کو نہیں دیکھا اور سارے بوبیوں کو اس بات کا یقین ہے کہ اگر وہ کسی زردی مائل چہرے کو دیکھ لے تو فی‌الفور اس کی موت واقع ہو جائے۔ اسے سمندر کی دید کا یارا نہیں، بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ سمندر کی طرف دور سے بھی نہیں دیکھ سکتا اور اس لیے وہ اپنے جھونپڑے کے تاریک زنداں میں اپنی زندگی کے دن کاٹ دیتا ہے۔ اس نے یقیناً ساحل پر کبھی قدم نہیں رکھا۔ اپنی مسکٹ اور چھری کے سوا وہ سفید فاموں کے ہاں کی کوئی چیز استعمال نہیں کرتا۔ یورپین کپڑے کو وہ چھوتا بھی نہیں اور تمباکو، شراب بلکہ نمک تک سے اسے نفرت ہے۔

سلیوکوسٹ کی ایو زبان بولنے والی قوموں میں ''خود بادشا ہی پیشوائے اعظم ہوتا ہے۔ اپنی اس حیثیت میں، خاص طور پر اگلے زمانے میں، رعایا کی اس تک رسائی ممکن نہ تھی، صرف رات کو غسل وغیرہ کے لیے اسے اپنی قیام گاہ سے نکلنے دیا جاتا۔ سوائے اس کے خاص نمایندے یعنی نام نہاد 'مرئی بادشاہ' اور تین منتخب اکابر کے کسی کو اس سے گفتگو کی اجازت نہ تھی اور انہیں بھی اس کی طرف پیٹھ پھیرے بیل کی کھال پر بیٹھنا پڑتا۔ وہ کسی یورپین یا گھوڑے کو دیکھ نہیں سکتا اور نہ سمندر کو، اور اس وجہ سے اسے چند لمحوں کے لیے بھی اپنی راج دھانی سے قدم باہر نکالنے کی اجازت نہ تھی۔ حال میں ان پابندیوں کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔'' خود شاہ داہومی کے لیے سمندر کا دیکھنا ممنوع ہے اور اسی صورت سے گنی کے شاہان لوآنگو

اور گریٹ آرڈرا کے لیے بھی ۔ داھومی کے شمال مغرب میں آیو نامی لوگ سمندر کو دیوتا مانتے ھیں اور مذھبی پیشوا انھیں اور ان کے بادشاہ کو ڈراتے ھیں کہ اگر انھوں نے کبھی سمندر کی طرف دیکھنے کی جرأت کی تو ان کی قضا آ جائے گی ۔ اسی طرح سینیگل میں شاہ کیور کے متعلق یہ عقیدہ ھے کہ اگر وہ دریا یا آب نائے کو عبور کر جائے تو ایک سال کے اندر اندر اس کی موت یقینی ھے ۔ ماشونستان کے سردار حال تک بعض دریاؤں ، خاص کر روروکوی اور نیاوری کو عبور کرنے سے گریز کرتے تھے اور کچھ عرصہ پیشتر تک ان کا ایک سردار اس دستور کا سختی سے پابند تھا ۔ یہ ''سردار کسی صورت میں دریا کو عبور نہیں کرے گا ۔ شدید ضرورت کے وقت اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ھو حق مچاتے اور گاتے بجاتے لے جایا جاتا ھے ۔ اگر وہ دریا میں سے چل کر گزر جائے تو اندھا ھو جائے گا یا مر جائے گا یا بہر حال اس کی سرداری تو یقیناً ختم ھو جائے گی ۔'' اسی صورت سے جنوبی مدغاسکر میں مہافالیوں اور ساکالاویوں کے چند بادشاھوں کو کشتی میں سمندر پر جانے یا بعض دریاؤں کو عبور کرنے کی ممانعت ھے ۔ ساکالاویوں کے ھاں سردار ایک مقدس ھستی ھے ''لیکن خاقان چین کی طرح اس پر بے شمار قدغنیں لگی ھوئی ھیں ، جو اس کے رویے کو ضابطے کے اندر رکھتی ھیں ۔ جب تک جادوگر فال نیک کا اعلان نہ کر دیں ، وہ کوئی کام شروع نہیں کر سکتا ۔ اسے گرم کھانا کھانے اور خاص دنوں میں اپنے جھونپڑے سے نکلنے کی اجازت نہیں وغیرہ وغیرہ ۔'' آسام کے بعض پہاڑی قبیلوں کا سردار اور اس کی بیوی دونوں غذا کے معاملے میں متعدد ٹیبوؤں کے پابند ھیں ۔ چناں چہ ان کے لیے بھینس ، سور ، کتے کا گوشت ، مرغی یا ٹماٹر کھانا حرام ھے ۔ سردار کو عفیف و پاک باز یعنی صرف ایک عورت کا شوھر ھونا چاھیے اور اسے عام یوم حرام کی شب اپنی بیوی سے علیحدہ رھنا چاھیے ۔ ان قبائل کا ایک گروہ ایسا بھی ھے جس کو کسی غیر گاؤں میں کچھ کھانے کی اجازت نہیں اور اسے خواہ کتنا ھی اشتعال دلایا جائے ، وہ منہ سے گالی نہیں نکال سکتا ۔ اس سے ظاھر ھے کہ لوگوں کے خیال کے بہ موجب اگر سردار

ان میں سے کسی بھی ٹیبو کی خلاف ورزی کرے تو سارے گاؤں پر مصیبت آ جاتی ہے ۔

قدیم شاہان آئرستان ، نیز لنسٹر ، منسٹر کناٹ اور السٹر کے صوبوں کے بادشاہوں پر بعض عجیب و غریب ٹیبو عائد ہوتے تھے جن کی باضابطہ پابندی پر قوم و ملک اور خود ان بادشاہوں کی خوش حالی منحصر سمجھی جاتی تھی ۔ اس طرح مثلاً ایرن کی قدیم راج دھانی تارا میں آئرستان کے بادشاہ پر بستر میں آفتاب طلوع نہیں ہونے دیا جاتا تھا ۔ اس کا ماگھ بریگھ کے مقام پر سواری سے اترنا ، مغرب کے بعد ماگھ کوئلن کے علاقے سے گزر کر نکلنا ، گھوڑے کو فان چومیر پر ایڑ لگانا ، اس پیر کو جہاز پر پانی میں جانا جو یوم بہار کے بعد پڑے اور یوم اولیاء کے بعد والے منگل کو آتھ میگھنے پر اپنی فوج کے راستے سے الگ ہو جانا ممنوع تھا ۔ لنسٹر کے بادشاہ پر یہ پابندیاں عائد تھیں کہ نہ وہ بدھ کے دن ٹوآتھ لیگھین کی طرف بایاں ہاتھ کیے گھوم سکتا ، ڈوتھیر (ڈوڈر) اور ڈبلن کے درمیان سر ایک طرف ڈالے سو سکتا ، نو دن تک کوالان کے میدانوں میں پڑاؤ ڈال سکتا ، ڈبلن کی سڑک پر پیر کو سفر کر سکتا اور نہ ماگھ میسٹین پر سے کسی کالے سموں کے گندے گھوڑے پر گزر سکتا ۔ شاہ منسٹر کو اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ ایک پیر سے دوسرے پیر تک لوخ لین والے جشن میں شریک رہے ، لیٹ ریکا میں گیم کے سامنے فصل کی کٹائی کے آغاز پر رات کے وقت دعوت کرے ، نو دن تک سیور پر پڑاؤ ڈالے رہے اور گابھران پر سرحد سے متعلق کوئی مجلس منعقد کرے ۔ کناٹ کے بادشاہ کو یوم اولیاء (یکم نومبر) پر صلح کے بعد اپنے کرواکن کے قدیم محل کے متعلق کوئی معاہدہ کرنے ، داغ دار کپڑا پہننے، کسی بادامی رنگ کے کسی داغ دار جنگی گھوڑے پر سوار ڈال چیس کے سرسبز میدان میں سے گزرنے ، سی گھیس میں عورتوں کی کسی محفل میں جانے ، آتھ گالٹا کے مقام پر دو کھمبوں کے درمیان کسی کانے گھوڑے پر دوڑ کا مقابلہ کرنے کی اجازت نہ تھی ۔ شاہ السٹر کے لیے ڈال اریڈھے کے نوجوانوں کے راتھ لائن والے گھوڑوں کے میلے میں شرکت کرنا ، مغرب کے بعد لن سیلیخ میں اڑتے ہوئے

پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ سننی ، ڈیوے مک ڈیرے کے بیل کا جشن منانا ، ماہ مارچ میں ماگھ کوبھا میں جانا اور شام سے لے کر پچھلے پہر تک بک‌نیم‌ھڈ کا پانی پینا ممنوع تھا ۔ اگر شاھان آئرستان ان رسموں اور ان جیسی اور بہت سی رسموں کے سختی سے پابند رھتے جو نہایت قدیم زمانے سے چلی آ رھی تھیں ، تو یقین کیا جاتا تھا کہ ان پر کوئی افتاد نہیں پڑے گی اور وہ نوے برس تک بڑھاپے کی صعوبتیں جھیلے بغیر زندہ رھیں گے ۔ ان کے عہد حکومت میں وبا یا مرگ انبوہ جیسی کوئی آفت نہیں آئے گی ، موسم خراب نہیں ھوگا اور زمین بہ کثرت پھل پھول پیدا کرے گی ۔ نیز اگر انھوں نے ان قدیم دستوروں کو ختم کر دیا تو ملک میں طاعون اور قحط پھیل جائے گا اور موسم خراب ھو جائے گا ۔

شاھان مصر کو دیوتاؤں کی حیثیت سے پوجا جاتا تھا اور ان کی روزمرہ کی زندگی کا کوئی جزو ایسا نہیں تھا جو معینہ اور غیر متبدل ضوابط کا پابند نہ ھو ۔ ڈیو ڈورس کہتا ھے ''سلاطین مصر کی زندگی ان غیر ذمہ دار بادشاھوں کی سی نہ تھی جو من مانی کرتے ھوں ۔ اس کے بر عکس ان کی ھر چیز قانون کی رو سے معین تھی ، نہ صرف ان کے فرائض بلکہ روزمرہ کی زندگی کی تمام جزئیات بھی ۔ بادشاہ کو رات دن از روئے قواعد جو کچھ کرنا ھوتا اس کے اوقات مقرر تھے ۔ چناں چہ جب وہ امور مملکت انجام دینے یا داد عدالت دینے بیٹھتا تو اس میں مقررہ ساعتوں کا پابند ھوتا ۔ سچ تو یہ ھے کہ اس کے غسل ، چہل قدمی اور ملکہ کے ساتھ سونے ، غرض کہ ھر کام کا وقت معین تھا ۔ دستور کے بہ موجب اسے سادہ غذا کھانی پڑتی ۔ اس کے لیے صرف بچھڑے اور ھنس کا گوشت حلال تھا اور وہ مقررہ مقدار سے زائد شراب نہیں پی سکتا تھا ۔' تاھم ھمارے لیے یہ سمجھنے کی وجہ موجود ھے کہ قدیم فرعون ان ضوابط کے پابند نہ تھے بلکہ وہ ان مذھبی بادشاھوں پر عاید ھوتے تھے جو تھیبیس اور بیسویں سلطنت کے آخری دور میں حبشہ پر حکومت کرتے تھے ۔

مذھبی بادشاھوں پر عائد شدہ ٹیبو یا قیود کی ایک نمایاں مثال

ان ضوابط زندگی میں ملتی ہے جو روم کے فلیمن ڈیالس کے لیے مقرر تھے اور جس کی ذات کو جوپیٹر کی جیتی جاگتی تصویر یا آسمانی روح کے زندہ مجسمے سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ یہ ضوابط حسب ذیل تھے :

''فلیمن ڈیالس کے لیے گھوڑے پر سوار ہونا تو کیا اسے چھونا تک ممنوع تھا ۔ نہ وہ مسلح فوج کو دیکھ سکتا ، نہ ثابت انگوٹھی پہن سکتا اور نہ اپنے کپڑوں میں کہیں گرہ لگا سکتا ۔ اسے آتش مقدس کے سوا معمولی آگ لے کر گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی ۔ وہ گیہوں کے آٹے یا خمیری روٹی کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا ۔ اسے بکرے ، کتے ، کچے گوشت ، سیم کی پھلی ، یا عشق پیچاں کو چھونے بلکہ اس کا نام بھی لینے کی ممانعت تھی ۔ اس کا انگور کی بیل کے تلے چلنا پھرنا ممنوع تھا ۔ اس کے پلنگ کے پایوں پر مٹی لپی ہونی ضروری تھی ۔ اس کی حجامت صرف آزاد آدمی بنا سکتا تھا اور وہ بھی کانسی کے استرے سے ۔ اس کے کٹے ہوئے بال اور ناخن کسی بھاگوان پیڑ کے تلے دبا دینے پڑتے تھے ۔ وہ کسی میت کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا اور نہ اس جگہ قدم رکھ سکتا جہاں کوئی جل کر مرا ہو ۔ وہ متبرک ایام یا ہولی ڈیز میں کوئی کام ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا اور کھلی فضا میں برہنہ سر نہیں رہ سکتا تھا ۔ اگر کسی اسیر کو اس کے گھر لے جایا جاتا تو اس کی مشکیں کھول دینی پڑتیں اور رسیوں کو چھت کے ایک چھید میں سے کھینچ کر گلی میں پھینک دینا پڑتا ۔ اس کی بیوی فلیمنیکا بھی قریب قریب انھی ضوابط کی پابند تھی اور کچھ مزید ضوابط کی بھی ، جو صرف اسی کی ذات سے مخصوص تھے ۔ وہ یونانی طرز کے زینے کی تین سیڑھیوں سے زیادہ نہیں چڑھ سکتی تھی ۔ ایک خاص تیوہار پر اسے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے کی ممانعت تھی ۔ اس کی جوتیوں میں ایسے جانور کا چمڑا نہیں لگ سکتا تھا جو طبعی موت مرا ہو ، بلکہ وہ قربانی کے جانور کے چمڑے کی بنائی جاتی تھیں ۔ اگر وہ بادلوں کی گرج سن لیتی تو جب تک قربانی کی صورت میں کفارہ نہ دے دیتی اس پر ٹیبو عائد رہتا ۔

سی ایرالیونے (مغربی افریقہ کی) گریبو قوم کا ایک مذہبی پیشوا

ہے جسے بوڈیا کہا جاتا ہے ۔ اس کا چند وجوہ کی بناء پر ، جن کی کوئی خاص اہمیت نہیں ، یہودیوں کے ربیٔ اعظم سے مقابلہ کیا گیا ہے ۔ اس کا تقرر ندائے غیب کے بموجب عمل میں آتا ہے اور اس کی مسند نشینی پر جو دقت طلب رسموں پر مشتمل ہوتی ہے ، اس کی تدھین کی جاتی ہے ۔ نشان منصبی کے طور پر اس کے ٹخنے میں کڑا پہنایا جاتا ہے ۔ اس کے گھر کے کواڑوں کی تھونیوں پر قربانی کے بکرے کا خون ملا جاتا ہے ۔ سرکاری طلسم اور بت اس کی تحویل میں ہوتے ہیں ، جنھیں وہ ہر چاند کی پہلی کو تیل اور چاول کھلاتا ہے ۔ اس کے اختیارات یوں کہنے کو تو بہت وسیع لیکن عملاً نہایت محدود ہیں ، اس لیے کہ وہ رائے عامہ کے خلاف کوئی کام کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا اور ملک پر جو بھی آفت آتی ہے اس کا وہی ذمہ دار قرار پاتا ہے ، جس میں اس کی جان کی بھی خیر نہیں ہوتی ۔ اس سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ زمین کو زرخیز کرے ، لوگوں کو صحت بخشے ، جنگ کا خطرہ نہ پیدا ہونے دے اور دفع سحر کرتا رہے ۔ اس کی زندگی بعض ٹیبوؤں کے شکنجوں میں جکڑی ہوتی ہے ۔ اس طرح وہ سوائے اپنی سرکاری قیام گاہ کے کسی اور مکان میں سو نہیں سکتا ۔ یہ مکان مسند نشینی کے موقع پر اس کی رسم تدھین کی مناسبت سے ''تدھین شدہ مکان'' کہلاتا ہے ۔ اسے شاہراہ پر پانی پینے کی اجازت نہیں ۔ شہر میں جب تک کوئی میت موجود ہو وہ کچھ کھا نہیں سکتا اور نہ کسی کی موت پر آنسو بہا سکتا ہے ۔ اگر وہ اپنی پیشوائی کی مدت کے دوران میں مر جائے تو اس کا راتوں رات دفن کیا جانا ضروری ہے اور اس کی تدفین کی خبر صرف چند آدمیوں کو ہو سکتی ہے اور جب اس کی موت کا اعلان کیا جائے تو کوئی اس کا سوگ نہیں منا سکتا ۔ اگر وہ میسی (سیسی یا مانکونی ۔ ایک درخت جو افریقہ میں پایا جاتا ہے اور جس کی چھال کا زہریلا جوشاندہ جھوٹ سچ کے امتحان کے لیے ملزموں کو دیا جاتا ہے) کی چھال کے جوشاندے کے آزمائشی زہر سے مرا ہو تو اسے کسی بہتے ہوئے چشمے میں دفن کرنا پڑتا ہے ۔

جنوبی ہند کے ٹوڈاؤں میں اس پوتر گوالے پر جو شیر خانۂ مقدس کے پروہت کے فرائض انجام دیتا ہے ، اس کے اس منصب کی میعاد کے دوران میں جو کئی سال کی ہوتی ہے ، طرح طرح کی تکلیف دہ اور گراں بار پابندیاں عائد ہوتی ہیں ۔ چناں چہ اس کو مقدس شیر خانے پر رہنا پڑتا ہے اور وہ اپنے گھر یا کسی عام گاؤں میں نہیں جا سکتا ۔ اس کا مجرد ہونا ضروری ہے اور اگر وہ شادی شدہ ہو تو اسے اپنی بیوی کو چھوڑ دینا چاہیے ۔ اس مقدس گوالے یا اس کے شیر خانے کو عام آدمی کسی صورت میں نہیں چھو سکتا ۔ اس قسم کی چھوت چھات سے وہ اس قدر نجس ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے عہدے سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے ۔ اس گوالے تک عام آدمیوں کی ہفتے میں صرف دو دن یعنی پیر اور جمعرات کو رسائی ہو سکتی ہے ۔ اور دنوں میں اگر کسی کو اس سے کوئی کام پڑ جائے تو اسے دور کھڑے کھڑے (تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے سے) گوالے سے بہ آواز بلند اپنی بات کہنی چاہیے ۔ نیز جب تک وہ اس متبرک منصب پر فائز رہتا ہے ، اپنے بال یا ناخن نہیں کٹوا سکتا ۔ وہ پل پر سے کبھی دریا پار نہیں کرتا ، بلکہ چل کر صرف خاص گھاٹوں سے اسے عبور کرتا ہے ۔ اگر اس کی برادری میں کوئی مر جائے تو وہ اس کی تجہیز و تکفین میں شریک نہیں ہو سکتا ، تاوقتیکہ وہ اپنے منصب سے مستعفی ہو کر اعلیٰ گوالے سے ایک معمولی انسان کی حیثیت نہ اختیار کر لے ۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگلے زمانے میں جب کبھی برادری میں کوئی موت ہوتی تو اسے اپنے متبرک گگروں سے دست بردار ہو جانا پڑتا ۔ تاہم یہ پابندیاں بہ حیثیت مجموعی صرف اعلیٰ درجے کے گوالوں پر ہوتی ہیں ۔

## (۲) دینی اور دنیوی اختیارات کی علیحدگی — منصب

پیشوائی یا شاہی سے جو ناگوار پابندیاں وابستہ تھیں ، ان کا جو اثر ہونا تھا وہ آخر ہو کے رہا ۔ لوگوں نے یا تو اس منصب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے وہ معطل ہو کر رہ گیا یا پھر جنھوں نے اسے قبول کر لیا وہ اس کے بوجھ کے تلے دب کر محض مزغۂ گوشت اور تیاگی ہو کر رہ گئے اور ان کے مفلوج ہاتھوں سے عنان حکومت چھوٹ

کر ایسے آدمیوں کے قوی ہاتھوں میں چلی گئی جنھیں بادشاہ کے لقب کے بغیر صحیح معنی میں سارے شاہی اختیارات حاصل رہے ۔ بعض ملکوں میں اختیارات اعلیٰ کے اس انقطاع نے مستقل صورت اختیار کر لی ، جہاں خالص مذہبی قسم کے فرائض تو قدیم شاہی خاندان کے پاس رہ گئے اور سول حکومت کسی نئی اور طاقت ور نسل کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی ۔

مثال کے طور پر اس کتاب کے کسی پچھلے باب میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کمبوڈیا میں آگ اور پانی کے بادشاہوں کے منصب اکثر ان کے ورثاء پر زبردستی ٹھونسنے پڑتے ہیں ، اور جزیرہ سیویج میں ملوکیت کا بالآخر خاتمہ ہو گیا اس لیے کہ کوئی اس مخدوش امتیاز کو قبولتا نہیں تھا ۔ مغربی افریقہ کے بعض حصوں میں جب بادشاہ مرتا ہے تو اس کے جانشین کے تقرر کے لیے خاندان شاہی کی ایک خفیہ مجلس منعقد ہوتی ہے اور وہ شخص جس کا انتخاب کیا جاتا ہے ، اچانک گرفتار کر لیا جاتا ہے اور باندھ کر فتیش خانے میں پھینک دیا جاتا ہے اور جب تک وہ تخت و تاج قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے اس میں مقید رہتا ہے ۔ بعض وقت تخت و تاج کا یہ وارث اس جبریہ اعزاز سے بچنے کی سبیل نکال لیتا ہے ۔ ایک تند خو سردار کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اس بات کا عزم بالجزم کیے مسلح پھرا کرتا تھا کہ اگر اسے تخت پر بٹھانے کی کوشش کی گئی تو وہ اس کا جواب طاقت سے دے گا ۔ سی ایرا لیونے کے ٹمنس نامی وحشی ، جن کے ہاں بادشاہ منتخب کیا جاتا ہے ، اپنے لیے تاج پوشی کی رات اسے ٹھونکنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں اور اپنے اس آئینی حق کا استعمال اس نیک نیتی سے کرتے ہیں کہ بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہو کر زیادہ عرصہ نہیں بچ سکتا ۔ لہذا جب بڑے سرداروں کو کسی شخص سے عداوت ہو اور وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہیں تو اسے اپنا بادشاہ منتخب کر لیتے ہیں ۔ پہلے یہ دستور تھا کہ کسی شخص کے شاہ ایرالیو نے منتخب کیے جانے کا اعلان کرنے سے قبل اسے زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ، پھر زنجیریں توڑ کر اسے شاہی خلعت پہنا دیا جاتا اور جلال پادشاہی

کا نشان تھا دیا جاتا جو تیشہ' جلاد تھا ۔ لہذا یہ امر باعث تعجب نہیں کہ سی ایرالیو نے میں جہاں اس قسم کے دستور جاری رہے ہیں ''مانڈنگوؤں اور سویزیوں کے بادشاہوں کے سوا شاید ہی کوئی بادشاہ اپنے زیر نگیں علاقے کا باشندہ ہو ۔ ہمارے اور ان کے خیالات میں اس قدر بعد ہے کہ ان کے ہاں بہت کم لوگ اعزاز شاہی کے خواہش مند ہوتے ہیں ، اور تخت و تاج کے لیے مسابقت کا تو ذکر تک سننے میں نہیں آتا ۔''

معلوم ہوتا ہے کہ جاپان کے میکاڈو مصلحتاً ابتداء ہی سے اختیار اعلیٰ کا اعزاز اور بار اپنے شیرخوار بچوں پر منتقل کرتے رہے ہیں اور ٹائی کونوں کے عروج کے متعلق ، جو مدتوں ملک کے دنیوی بادشاہ رہے تھے ، یہ تحقیق ہوا ہے کہ کسی میکاڈو کی اپنے تین سالہ بچے کے حق میں تخت و تاج سے دست برداری اس کا اصل سبب تھا ۔ جب کسی غاصب نے اس شیر خوار شاہزادے سے تخت و تاج چھین لیا تو یوری تومو نامی ایک جری اور با اصول شخص میکاڈو کی حمایت کے لیے اٹھا ، غاصب کو شکست دی اور میکاڈو کی بادشاہت کو برائے نام بحال کر کے عنان حکومت خود سنبھال لی اور اس طرح ایسے جو اعزاز حاصل ہوا تھا ، وہ اپنی نسل کے لیے چھوڑ کر ٹائی کونی سلسلے کی بناء ڈال دی ۔ سولھویں صدی کے نصف آخر تک یہ ٹائی کون بڑی سرگرمی اور اہلیت کے ساتھ حکومت کرتے رہے ، لیکن ان کا بھی وہی انجام ہوا جو میکاڈوؤں کا ہوا تھا ۔ انھی کی طرح وہ رسم و رواج اور ضابطے کے شکنجوں میں ایسے جکڑے گئے کہ کٹھ پتلی ہو کر رہ گئے ۔ یہ اپنے محلات کے زنداں میں بند روزمرہ کی فضول رسموں میں مشغول رہتے اور مملکت کے اصل امور ایک ریاستی کونسل انجام دیتی ۔ ٹانکین (شمالی ویٹ نام) میں بھی ملوکیت کچھ اسی ڈگر پر چلتی رہی ۔ وہاں کے تن آسان بادشاہ کو، جس کی زندگی اپنے پیش روؤں کی مانند احدیوں اور عورتوں کی طرح گزرتی تھی ، ماک نامی ایک اولوالعزم اور جان باز شخص نے تخت سے اتار دیا اور ایک ادنیٰ مچھیرے سے عامل اعلیٰ بن گیا ۔ لیکن بادشاہ کے بھائی ٹرنگ نے اس غاصب

کی سرکوبی کی اور اپنے بھائی کو تخت و تاج واپس دلا دیا ۔ تاہم اس نے بھی جملہ افواج کی سپہ سالاری کا منصب اعلیٰ اپنے ہی قبضے میں رکھا جو نسلاً بعد نسل اس کی اولاد پر منتقل ہوتا رہا ۔ اس کے بعد اگرچہ بادشاہوں کا جاہ و حشم اور لقب سلطانی بر قرار رہا ، لیکن ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا ۔ یہ سب سے الگ تھلگ اپنے محلوں میں رہتے اور ادھر موروثی سپہ سالار جو سارے اقتدار کے اصل مالک تھے ، راج کرتے ۔

ایک پولینیشیائی جزیرے مانگائیا میں مذہبی اور سول حکومت کی زمامیں مختلف ہاتھوں میں تھیں ، جس کے روحانی فرائض موروثی بادشاہوں کا ایک سلسلہ انجام دیتا اور مادی امور وقتاً فوقتاً ایک ایسے سردار کے ذمے ہوتے جس نے جنگ میں فتح حاصل کی ہو ۔ تاہم اس کی رسم مسند نشینی کا بادشاہ کے ہاتھوں انجام پانا ضروری تھا ۔ اسی طرح ٹونگا میں سول فرمان روا کے علاوہ ، جس کا حق حکومت کچھ موروثی اور کچھ جنگ میں اس کے کارہائے نمایاں اور سپاہیوں کی تعداد پر مبنی تھا ، ایک مقدس سردار اعلیٰ بھی تھا ۔ یہ ایک سہا دیوتا کی اولاد سمجھا جاتا تھا ، جس کی وجہ سے اس کا رتبہ بادشاہ سے بھی بلند تھا ۔ سال میں ایک مرتبہ فصل کا پہلا پھل ایک باضابطہ رسم کے ساتھ اس کی خدمت میں پیش کیا جاتا ۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اگر اسے یہ نذر نہ دی جائے تو ان پر دیوتاؤں کا شدید عذاب نازل ہو جائے گا ۔ اس کا ذکر خاص الفاظ میں کیا جاتا تھا جو کسی اور کے لیے استعمال نہیں کیے جا سکتے تھے اور ہر وہ چیز جسے وہ چھو لیتا مقدس اور حرام ہو جاتی ۔ جب یہ مقدس سردار اور بادشاہ ملتے تو جب تک موخرالذکر چلا نہ جاتا ، بادشاہ کو اس کے احترام میں زمین پر بیٹھنا پڑتا ۔ اگرچہ مقدس الاصل ہونے کے سبب اس کا بے انتہا احترام تھا ، لیکن اس متبرک ہستی کو کوئی سیاسی اختیار حاصل نہ تھا اور اگر وہ امور مملکت میں دخل دینے کی جرأت کرتا تو اسے یہ ڈر لگا رہتا کہ بادشاہ کہیں اسے دھتکار نہ دے ، جو اصل

حکم ران تھا اور جو بالآخر اپنے اس روحانی حریف سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گیا ۔

مغربی افریقہ کے بعض حصوں میں دو بادشاہ ایک ساتھ حکومت کرتے ہیں ۔ ایک فتیش بادشاہ دوسرا سول ، لیکن اختیارات اصل میں اس ساحر یا پوجاری بادشاہ کو حاصل ہوتے ہیں ۔ موسم وغیرہ کا نظم و ضبط اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہی ہر چیز کی بندش کر سکتا ہے ۔ وہ اپنا سرخ عصا زمین پر رکھ دے تو کوئی ادھر سے گزر نہیں سکتا ۔ دینی اور دنیوی اختیارات کی یہ تقسیم ہر اس جگہ ملتی ہے جہاں حبشی کلچر اپنی اصلی حالت میں باقی ہے ۔ لیکن داہومی اور اشانتی کی طرح جہاں کہیں حبشیوں کے معاشرے پر بیرونی اثرات پڑے ہیں ، وہاں ایک ہی بادشاہ کے ہاتھوں میں دونوں قسم کے اختیارات مرتکز رکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے ۔

شرق الہند کے جزیرے ٹیمور کے بعض حصوں میں ہمیں اختیارات کی اسی قسم کی تقسیم سے واسطہ پڑتا ہے جس کی مثال وسطی افریقہ کے سول اور ساحر یا فتیش بادشاہ پیش کرتے ہیں ۔ چند ٹیموری قبیلے دو راجاؤں کی حکومت کو تسلیم کرتے ہیں ، ایک معمولی اور سول راجا جو لوگوں پر راج کرتا ہے ، دوسرا پوجاری یا امتناع عائد کرنے والا راجا ، جس کے سپرد ہر اس چیز کا انتظام ہوتا ہے جس کا تعلق زمین اور اس کی پیداوار سے ہو ۔ اس دوسرے راجا کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی شے کو ممنوع قرار دے دے ۔ اس کی اجازت کے بغیر نئی اراضی زیر کاشت نہیں لائی جا سکتی اور کاشت کے وقت ان کا چند ضروری رسوم ادا کرنا ضروری ہے ۔ اگر فصل کو خشک سالی یا کیڑا وغیرہ لگنے کا خطرہ لاحق ہو تو اس کی دھائی دی جاتی ہے ۔ اگرچہ سول راجا سے اس کا درجہ کم تر ہے لیکن حالات کی رفتار معین کرنے میں اس کا بڑا حصہ ہوتا ہے ، اس لیے کہ اس کا دنیوی شریک کار مملکت کے تمام اہم امور میں اسی سے مشورہ لینے پر مجبور ہے ۔ ٹیمور کے آس پاس کے رائی اور مشرقی فلوریس جیسے چند جزیروں میں اسی قسم کا ایک روحانی فرماں روا موجود ہے جو

دیسی زبان میں مختلف القاب سے ملقب ہے ۔ اس کے ان تمام القاب کا مطلب ''زمین کا مالک'' ہے ۔ اسی طرح برطانوی نیوگنی کے ضلع میسکو میں دو دو سردار پائے جاتے ہیں ۔ یہاں لوگ خاندانوں کے لحاظ سے دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور دونوں کا ایک ایک سردار ہے ۔ ان دو سرداروں میں سے ایک کی حیثیت جنگی سردار کی ہے اور دوسرے کی امتناع عائد کرنے والے کی ۔ مؤخرالذکر کا منصب موروثی ہے ۔ اس کا فرض یہ ہے کہ وہ جب کبھی کھوپرے یا چھالیہ کی قسم کی کسی چیز کے استعمال کی ممانعت ضروری سمجھے ، اس کی فصل پر امتناع عاید کرے ۔ اس سردار کے منصب میں ہمیں شاید مذہبی سلطنت کے آغاز کے آثار نظر آ جائیں ؛ لیکن تا حال اس کے فرائض کی نوعیت مذہبی سے زیادہ سحری ہے اور ان کا تعلق مافوق قوتوں کی استمالت کی بجائے فصلوں کے نظم و ضبط سے ہے ۔

اٹھارواں باب

# روح کے جوکھم

(۱) روح کا بالشتیا—مندرجہ بالا مثالوں سے ہمیں یہ پتا چلا ہے کہ مقدس بادشاہ یا مذہبی رہنما اکثر نہایت ناگوار اور صبر آزما پابندیوں یا امتناعوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے، جن کا ایک بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے اس انسان دیوتا کی زندگی کو لوگوں کی فلاح و بہبود کی خاطر محفوظ رکھا جائے۔ لیکن اگر ان امتناعات سے اس کی جان کی سلامتی مقصود ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کے خیال کے بموجب ان امتناعات کی پابندی کا خاطر خواہ نتیجہ کیسے برآمد ہوتا ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے اس خطرے کی نوعیت سے واقف ہونا ضروری ہے جو بادشاہ کی زندگی کو لاحق ہو اور جس سے اس کو ان عجیب و غریب پابندیوں کے ذریعے محفوظ رکھنا مقصود ہو۔ لہٰذا ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ غیر ترقی یافتہ انسان موت سے کیا مراد لیتا ہے؟ اس کی دانست میں اس کے اسباب کیا ہیں اور اس سے کس طرح محفوظ رہا جا سکتا ہے؟

جس طرح وحشی بالعموم فطرت کی بے جان اشیاء کے ظہور کو آن ذی حیات موجودات کے عمل کا نتیجہ سمجھتا ہے، جو مظاہر عالم میں یا ان کی پشت پر کار فرما ہیں، اسی طرح وہ ذی حیات مظاہر کی بھی توجیہ کرتا ہے۔ •• سمجھتا ہے کہ اگر کوئی جانور سانس لیتا

اور حرکت کرتا ہے تو اس کا سبب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے جسم کے اندر کوئی چھوٹا سا جانور موجود ہے جو اسے حرکت دیتا رہتا ہے ۔ جانور کے اندر جو جانور یا آدمی کے اندر جو آدمی ہوتا ہے وہ اس کی روح سے عبارت ہے اور جس طرح جانور یا آدمی کے عمل کو جسم میں روح کی موجودگی کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح نیند اور موت کو اس کی غیر موجودگی سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ نیند یا سکتہ روح کا عارضی طور پر جسم سے جدا ہونا ہے اور موت مستقل طور پر ۔ لہذا موت اگر جسم سے روح کی مستقل جدائی کا نام ہے تو اس سے محفوظ رہنے کی صورت یہ ہے کہ یا تو روح کو جسم سے نکلنے سے روکا جائے، اور اگر وہ نکل ہی جائے تو اسے واپس لانے کی کوئی یقینی تدبیر اختیار کی جائے ۔ وحشی ایسے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو احتیاطی تدبیریں اختیار کرتا ہے وہ بعض امتناعوں یا ٹیبوؤں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں ۔ یہ ٹیبو محض ایسے ضوابط سے عبارت ہیں جن سے روح کو جسم میں یا تو مستقل طور پر موجود رکھنا مقصود ہے یا واپس لانا ۔ دوسرے لفظوں میں وہ جان کے محافظ ہیں ۔ ان کلیوں کی اب مثالوں کے ذریعے وضاحت کی جائے گی ۔

ایک یورپی مبلغ نے چند آسٹریلوی وحشیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ''میں ایک نہیں ہوں بلکہ دو ہوں ۔'' یہ سن کر وہ ہنس پڑے ۔''تم جتنا چاہو ہنس لو'' اس مبلغ نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا، ''میں تم سے کہتا ہوں کہ میں ایک کے اندر دو ہوں ۔ یہ میرا بڑا سارا جسم جو تمہیں نظر آتا ہے ایک ہے لیکن اس کے اندر ایک ننھا سا جسم بھی ہے جو دکھائی نہیں دیتا ۔ یہ بڑا جسم مر جاتا ہے اور سپرد خاک کر دیا جاتا ہے ، لیکن اس بڑے جسم کے مرتے وقت چھوٹا جسم پرواز کر جاتا ہے ۔'' اس پر بعض وحشیوں نے کہا ''ہاں ، ہاں! ٹھیک ہے ، ہم بھی دو ہیں ۔ ہمارا بھی ایک چھوٹا سا جسم سینے کے اندر چھپا ہے ۔'' جب ان سے پوچھا گیا کہ موت کے بعد ان کا وہ چھوٹا سا جسم کہاں جاتا ہے تو ان میں سے بعض نے کہا کہ جھاڑی کے پیچھے ، بعض نے کہا کہ سمندر میں اور بعض نے کہا کہ انھی

خبر نہیں ۔ ہورانوں (جنوبی امریکہ کے باشندوں کا ایک قبیلہ) کا خیال تھا کہ روح کے سر ، جسم ، ہاتھ ، پاؤں سب کچھ ہیں اور وہ آدمی کا ایک چھوٹا سا مکمل نمونہ ہے ۔ اسکیموؤں کا عقیدہ ہے کہ ''روح کی ہیئت اس جسم ہی کی سی ہوتی ہے ، جس سے اس کا تعلق ہو ، لیکن اس کا بدن نسبتاً لطیف اور رقیق قسم کا ہوتا ہے ۔'' نوٹکاؤں کے نزدیک روح کی شکل و صورت بونے کی سی ہے ۔ اس کا مرکز آدمی کی چندیا ہے ۔ جب وہ سیدھی کھڑی رہتی ہے تو آدمی صحت مند اور توانا رہتا ہے ، لیکن اگر کسی وجہ سے وہ سیدھی کھڑی نہ رہ سکے تو آدمی کے حواس جاتے رہتے ہیں ۔ دریائے فریزر کے نچلے علاقے کے امریکی قبیلوں کے نزدیک آدمی کی چار روحیں ہیں ، جن میں سے اصل روح بونے سے ملتی جلتی ہے اور باقی تین پرچھائیاں ہیں ۔ ملایا والے انسان کی روح کو انگوٹھے کے برابر ایک بالشتیا تصور کرتے ہیں جو رنگ ، روپ اور تناسب کے اعتبار سے ٹھیک اس جسم سے مطابقت رکھتا ہے جس میں وہ رہتا ہو ۔ یہ بالشتیا رقیق قسم کی ایک ایسی چیز ہے جو محسوس کی جا سکتی ہے لیکن اس کے کسی مادی شے میں داخل ہونے سے کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور جو ایک جگہ سے دوسری جگہ تیزی سے منتقل ہو سکتی ہے ۔ وہ سکتے ، نیند اور بیماری میں عارضی طور پر غائب رہتا ہے اور موت کے بعد مستقل طور پر ۔

بالشتیا اور آدمی یا دوسرے لفظوں میں روح اور جسم ایک دوسرے سے اس قدر قریبی مشابہت رکھتے ہیں کہ جس طرح بھاری بھرکم جسم ہوتے ہیں اسی طرح بھاری بھرکم یا دبلی پتلی روحیں بھی ہوتی ہیں ۔ اسی صورت سے جس طرح وزنی ، ہلکے ، لمبے اور چھوٹے جسم ہوتے ہیں ، اسی طرح بھاری ، ہلکی ، لمبی اور چھوٹی روحیں بھی ہوتی ہیں ۔ جزیرۂ نیاس والوں کا خیال ہے کہ ہر شخص سے اس کے پیدا ہونے سے پہلے یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسے کتنی لمبی اور کتنی بھاری روح چاہیے اور وہ جس قدر بھاری اور لمبی روح چاہتا ہے وہ اسے مل جاتی ہے ۔ بھاری سے بھاری روح جو کسی کو ملتی ہے وہ تقریباً دس گرام کی ہوتی ہے ۔ آدمی کی عمر اتنی ہی لمبی ہوتی ہے جتنی لمبی اس کی روح

ہو؛ جو بچے مر جاتے ہیں وہ پست قامت روح لے کر آتے ہیں۔ فجیوں کے ذہن میں روح کے ہونے کا جو تصور ہے وہ ان رسموں سے واضح ہے جو ناکیلو نام کے قبیلے میں جاری ہیں ۔ اس قبیلے میں جب کوئی سردار مر جاتا ہے تو اس کی میت کو تیل مل کر اور زیور پہنا کر نفیس چٹائیوں پر لٹا دیا جاتا ہے اور چند خاص آدمی جن کا موروثی پیشہ جنازہ برداری ہے ، اس سے چیخ کر یہ کہتے ہیں ''سردار صاحب! اٹھیے بس اب چلیں کہ آفتاب لب بام آ چکا ہے ۔'' پھر وہ اسے دریا پر لے جاتے ہیں جہاں روحوں کا ناخدا آن کر ناکیلوؤں کی روحوں کو دریا کے پار لے جاتا ہے ۔ اس طرح جب وہ اپنے سردار کو اس کی آخری منزل تک لے جاتے ہیں تو اپنے پنکھوں کو زمین سے لگائے رکھتے ہیں تاکہ اس پر سایہ کیے رہیں ، اس لیے جیسا کہ ان میں سے ایک آدمی نے ایک مسیحی مبلغ کو سمجھایا ، ''اس کی روح ننھی سی جان ہے ۔'' پنجاب میں جو لوگ اپنے جسموں پر تصویریں کھدواتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ ان کے مرنے پر روح یعنی ''وہ ننھا سا آدمی یا ننھی سی عورت'' جو تن خاکی کے اندر ہوتی ہے ، انھی نقش و نگار کے ساتھ آسمان پر جائے گی جو زندگی میں اس کے بدن کی زینت رہے ہوں ۔ تاہم بعض صورتوں میں ، جیسا کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے ، انسانی روح کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ اس کی شکل و صورت انسان کی بجائے جانور کی سی ہوتی ہے ۔

**(۲) روح کی غیر حاضری اور باز طلبی :** روح کے متعلق بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ جسم کے قدرتی چھیدوں ، خاص کر منہ اور نتھنوں کے راستے بچ نکلتی ہے ۔ لہذا سلیبیز میں بعض وقت مچھلی پکڑنے کا کانٹا بیمار کے نتھنوں ، ناف اور پاؤں سے باندھ دیا جاتا ہے تاکہ اگر اس کی روح بچ نکلنے کی کوشش کرے تو اس کانٹے میں اٹک کر رہ جائے ۔ بورنیو میں دریائے بارام کے نواح میں رہنے والا ایک ٹیورک چند پتھروں کو جو آنکڑے سے ملتے جلتے تھے ، اپنے سے جدا نہیں کرتا تھا ، کیوں کہ ان پتھروں نے اس کی روح کو بدن

میں اٹکا رکھا تھا اور اس طرح ان کی بدولت اس کا روحانی حصہ جسمانی حصے سے علیحدہ نہیں ہونے پاتا تھا ۔ جب کسی بحری ڈائک کو ساحر یا طلسم گر بنایا جاتا ہے تو خیال ہے کہ اس کی انگلیوں میں آنکڑے لگ جاتے ہیں ، جن سے وہ ساحر بننے کے بعد انسان کی روح کو اڑتے میں پکڑ لیتا ہے اور مرنے والے کے جسم میں پھیر دیتا ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ آنکڑوں کو دوست اور دشمن دونوں کی روحوں کو پکڑنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے بورنیو کے سر شکار اپنے مقتول دشمنوں کی کھوپریوں کے برابر چوبی آنکڑے ٹانگ دیتے ہیں ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس تدبیر سے انہیں اپنی یلغاروں میں نئے سر آتار کر لانے میں مدد ملے گی ۔ ہیڈا کے طلسم گر کے اوزاروں میں ایک ہڈی شامل ہوتی ہے جس میں وہ رخصت ہونے والی روحوں کو بند کر لیتا ہے اور جن لوگوں کے جسموں سے وہ نکلی ہوں ان میں واپس ڈال کر انہیں دوبارہ زندہ کر دیتا ہے ۔ ہندؤوں کے سامنے اگر کوئی جانی لے لے تو وہ اس کا انگوٹھا ضرور چٹخا دیں گے ۔ ان کے عقیدے کے بموجب ایسا کرنے سے روح منہ کے راستے نکلنے نہیں پائے گی ۔ مار کوئی سائی (جزائر واشنگٹن کے باشندے) آدمی کے مرتے وقت اس کا منہ اور نتھنے بند کر دیا کرتے تھے تاکہ اس کا دم نہ نکلنے پائے ۔ کہا جاتا ہے کہ نیو کیلے ڈونیا والوں کے ہاں بھی یہی دستور تھا ۔ نیز اسی مقصد سے فلپائن کے باگوبو بیماروں کے پہنچوں اور ٹخنوں میں پیتل کے کڑے پہنا دیا کرتے ہیں ۔ ادھر جنوبی امریکہ کے آئی ٹولاما مرنے والے شخص کی آنکھ ، ناک اور منہ پر مہر لگا دیتے ہیں کہ کہیں اس کی روح نکل کر اپنے ساتھ دوسروں کی روحوں کو بھی نہ نکال لے جائے ۔ کچھ اسی وجہ سے جزیرۂ نیاس والے ، جو تازہ مردوں کی روحوں کو سانس سمجھتے ہیں اور ان سے بہت خائف رہتے ہیں ، مردے کے نتھنوں میں ڈانٹ لگا کر یا جبڑوں کو باندھ کر اس کی آوارہ روح کو تن خاکی میں بند رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ آسٹریلیا کے واکل برا یہ کیا کرتے تھے کہ کسی میت کو چھوڑ کر جانے سے پہلے گرم گرم کوئلے اس کے کانوں میں رکھ دیتے تاکہ

اس کی روح جسم میں رہے اور وہ وہاں سے اس طرح چمٹ ہو جائیں کہ روح انھیں نہ پا سکے۔ جنوبی سلیبیز میں دائی زچہ کے جسم سے ایک پٹی خوب کس کر لپیٹ دیتی ہے ، تاکہ زچگی میں اس کی روح نکلنے نہ پائے۔ سوماٹرا کے منانگ کبایوروں کے ہاں بھی ایسا ہی ایک دستور جاری ہے ۔ وہ بعض وقت تاگے یا ڈور کا لچھا زچہ کے پہنچے یا پٹھوں سے لپیٹ دیتے ہیں تاکہ درد زہ میں جب اس کی روح پرواز کرنے کی کوشش کرے تو اسے باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے ۔ اور سلیبیز کے الفوروں کے ہاں جب کوئی بچہ ہوتا ہے تو اس خوف سے کہ کہیں اس کے پیدا ہوتے ہی اس کی روح بچ کر نہ نکل جائے ، بڑی احتیاط سے گھر کے سارے کھلے ہوئے حصے ، یہاں تک کہ تالے کا منہ بھی بند کر دیتے ہیں ۔ نیز گھر کے اندر اور باہر تمام جانوروں کے منہ باندھ دیے جاتے ہیں کہ مبادا بچے کی روح کو کوئی جانور نگل لے ۔ کچھ اسی وجہ سے زچگی کے دوران میں تمام وقت گھر میں زچہ سمیت سب لوگوں کو اپنے منہ بند رکھنے پڑتے ہیں ۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ انھوں نے اپنی ناکوں کو کیوں کھلا چھوڑ دیا ، جو بچے کی روح ان کے راستے داخل ہو جاتی؟ اس کا انھوں نے یہ جواب دیا کہ نتھنوں کے ذریعے چوں کہ سانس جسم میں آتا بھی رہتا ہے اور جسم سے نکلتا بھی ہے ، اس لیے اگر روح نتھنوں کے راستے داخل ہو تو فوراً خارج بھی ہو جائے گی اور اسے جسم میں ٹکنے کا موقع نہیں ملے گا ۔ مہذب قوموں کی زبانوں میں جو 'ناک میں دم ہونا' یا 'جان بہ لب ہونا' وغیرہ جیسے محاورے پائے جاتے ہیں ان سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ روح کے منہ یا نتھنوں سے بچ نکلنے کا تصور کس قدر قدرتی چیز ہے ۔

اکثر صورتوں میں روح کو ایک ایسا طائر تصور کیا جاتا ہے جو قفس عنصری سے پرواز کرنے کے لیے ہر دم پر تولے رہتا ہو ۔ اس تصور کے نقش غالباً بیشتر زبانوں میں موجود ہیں اور شاعرانہ استعاروں میں وہ آج بھی ملتا ہے ۔ ملایا والوں کے ہاں اس تصور کی بناء پر بہت سی رسمیں جاری ہو گئی ہیں ۔ اگر روح ایک اڑتی چڑیا ہے تو اسے چاول کے دانے ڈال کر پھسلایا جا سکتا ہے اور اس

طرح یا تو اڑنے سے روکا جا سکتا ہے یا اگر وہ اڑ گئی ہو تو جل دے کر واپس بلایا جا سکتا ہے ۔ چناں چہ جاوا میں جب بچے کو پہلی مرتبہ زمین پر چھوڑا جاتا ہے (یہ وہ وقت ہے جسے غیر مہذب لوگ خاص طور پر خطرناک خیال کرتے ہیں) تو اسے مرغیوں کی ٹوکری میں بند کر دیا جاتا ہے اور اس کی ماں اس طرح کٹ کٹ کرنے لگتی ہے جیسے وہ مرغیوں کو بلاتی ہو ۔ بورنیو کے ضلع سن تانگ میں جب کوئی آدمی ، عورت یا بچہ کسی مکان یا درخت پر سے گر پڑے اور اسے گھر لایا جائے تو اس کی بیوی یا رشتے کی کوئی اور عورت انتہائی تیزی سے اس مقام پر پہنچتی ہے جہاں وہ حادثہ پیش آیا ہو اور چاول کے رنگے ہوئے زرد دانے یہ کہتے ہوئے بکھیر دیتی ہے ، ''کٹ! کٹ! روح! فلاں فلاں شخص اپنے گھر میں ہے ، کٹ! کٹ! روح!'' پھر وہ ان سب چاولوں کو سمیٹ کر ایک ٹوکری میں رکھ لیتی ہے اور انھیں زخمی کے پاس لے جا کر اپنے ہاتھ سے دانہ دانہ اس کے سر پر گراتی ہے جس کے ساتھ ساتھ پھر یہ دہراتی جاتی ہے ''کٹ! کٹ! روح! ۔'' اس دستور کا مقصد بھی صریحاً یہ ہے کہ روح کی بھٹکتی چڑیا کو دانہ ڈال کر واپس بلایا جائے اور اسے متعلقہ شخص کے سر میں لوٹا دیا جائے ۔

سوتے آدمی کی روح کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ اپنے جسم سے نکل کر آوارہ گردی کرتی ہے اور سچ مچ ان مقامات پر پہنچتی ، لوگوں سے ملتی ، اور وہ سارے کام کرتی ہے جو اس آدمی کو خواب میں نظر آتے ہوں ۔ مثلاً جب برازیل یا گیانا کا کوئی وحشی گہری نیند سے جاگتا ہے تو اسے اس بات کا پورا یقین ہوتا ہے کہ اس کی روح مچھلی یا کسی اور چیز کا شکار ، درخت کی کٹائی یا جو کچھ بھی اس نے اپنے آپ کو خواب میں کرتے دیکھا ہو ، وہ سب سچ مچ کر آئی ہے ، اور اس دوران میں اس کا جسم بے حس و حرکت اپنے جھولن کھٹولے میں پڑا رہا ۔ بروروؤں (ایک برازیلی قوم) کے ایک گاؤں میں کسی نے خواب میں یہ دیکھ لیا کہ دشمن چپکے سے آن پہنچے ہیں ۔ اس سے سب لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور گاؤں خالی ہو گیا ۔ امریکہ کی

ماکوسی قوم کے ایک آدمی نے ، جو بہت کمزور تھا ، یہ خواب دیکھا کہ اس کے آقا نے اسے دشوار گزار آبشاروں سے ڈونگی کھینچ کر لانے پر لگایا ہے ۔ اگلے دن صبح اس نے اپنے آقا کو اس بات پر بہت سخت سست کہا کہ وہ ایک غریب بیمار کا کوئی خیال کیے بغیر اس سے رات کے وقت مشقت اٹھواتا رہا ۔ گرین چاکو کے باشندوں سے اکثر نہایت لغو قصے سنے گئے ہیں جنھیں وہ چشم دید واقعات بتاتے ہیں ۔ جو اجنبی ان لوگوں سے اچھی طرح واقف نہ ہوں وہ ان قصوں کو سن کر فوراً انھیں جھوٹا قرار دے دیتے ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں انھیں اس کی صداقت پر پورا پورا یقین ہوتا ہے ، کیوں کہ یہ مبالغہ آمیز قصے محض ان کے خواب کی باتیں ہیں جو ان کے نزدیک بیداری کے مشاہدات کی طرح صحیح ہیں ۔

نیند میں بھی روح کی غیر حاضری خطروں سے خالی نہیں ، اس لیے کہ اگر وہ کسی وجہ سے مستقل طور پر جسم سے دور کہیں رکی رہ گئی تو اس شخص کی موت لازمی ہے جو اس طرح اپنی قوت حیات سے محروم ہو جائے ۔ جرمنوں کے ہاں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ روح سوتے آدمی کے دھن سے سفید چوھیا یا پدی کی شکل میں پھدک کر نکل آتی ہے اور اس چوھیا یا چڑیا کی واپسی میں کوئی رکاوٹ سونے والے کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے ۔ چناں چہ ٹرانسلوینیا میں لوگ کہا کرتے ہیں کہ سوتے میں بچے کا منہ کھلا نہیں رہنا چاہیے ورنہ اس کی روح چوھیا بن کر بھاگ نکلے گی اور بچہ کبھی نہیں جاگ پائے گا ۔ نیند کی حالت میں روح کے غائب ہو کر رکے رہنے کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً ایک خفتہ آدمی کی روح کی کسی اور خفتہ آدمی کی روح سے مٹ بھیڑ ہو سکتی ہے اور ان دونوں روحوں کی آپس میں لڑائی ہو سکتی ہے ۔ اگر گنی کا کوئی حبشی صبح جوڑوں میں درد لے کر اٹھے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ نیند میں اس کی روح کی کسی اور روح نے پٹائی کی ہے ۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ سونے والے کی روح کی کسی ایسے شخص کی روح سے ملاقات ہو جائے جو حال میں مرا ہو اور وہ اسے اپنے ساتھ لے کر چلی جائے ۔ اسی وجہ سے جزائر آرو (شرق الہند) میں کسی

کے گھر کوئی مر جائے تو گھر کے لوگ اس کے بعد آنے والی رات کو سویا نہیں کرتے ، کیوں کہ ان کے خیال میں متوفی کی روح اس وقت تک گھر میں موجود ہوتی ہے ، اور انہیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ وہ کہیں ان کے خواب میں نہ آ جائے ۔ اس کے علاوہ کسی سوتے آدمی کی روح کی واپسی میں کوئی حادثہ یا طبعی قوت حائل ہو سکتی ہے ۔ چناں چہ جب کوئی دانک خواب میں اپنے آپ کو پانی میں گرتا دیکھ لیتا ہے تو وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ حادثہ اصل میں اس کی روح کو پیش آیا ہے اور وہ کسی جادوگر کو بلا بھیجتا ہے ۔ جادوگر آن کر پانی کے تسلے میں ایک دستی جال ڈالتا ہے اور بالآخر اس کی روح کو پکڑ کر اس کے جسم میں لوٹا دیتا ہے ۔ سانتال ایک آدمی کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ سوتے میں اس کی روح کو جو پیاس لگی تو وہ چھپکلی بن کر اس کے جسم سے نکل آئی اور اپنی پیاس بجھانے کے لیے ایک ٹھلیا میں گھس گئی ۔ لیکن اتفاق سے عین اس وقت ٹھلیا کے مالک نے اسے ڈھانپ دیا ۔ اس طرح روح اس آدمی کے جسم میں واپس نہ ہو سکی اور وہ سوتے کا سوتا ہی رہ گیا ۔ جب اس کے دوست اور رشتے دار اس کی لاش کو جلانے لگے تو کسی نے پانی لینے کے لیے ٹھلیا پر سے ڈھکنا ہٹا دیا اور چھپکلی اس میں سے نکل کر اپنے جسم میں واپس چلی گئی اور اس میں فوراً جان پڑ گئی ۔ وہ آدمی اٹھ بیٹھا اور اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے ان کے رونے کا سبب پوچھنے لگا ۔ انھوں نے اسے بتایا کہ وہ اسے مردہ سمجھے ہوئے تھے اور اس کی لاش کو جلانے والے تھے ۔ اس نے کہا کہ وہ پانی پینے ٹھلیا کے اندر گیا ہوا تھا لیکن اس میں سے واپس نہیں نکل سکتا تھا اور یہ کہ وہ ابھی ابھی لوٹا ہے ۔ یہ سب ان کا چشم دید واقعہ ہے ۔

غیر مہذب لوگوں کا یہ ایک عام دستور ہے کہ وہ سوتے کو جگایا نہیں کرتے ، کیوں کہ نیند میں اس کی روح اس سے دور ہوتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کے جاگتے جاگتے وہ لوٹ نہ پائے ۔ اس طرح اگر خفتہ آدمی اپنی روح کے بغیر بیدار ہو جائے تو وہ بیمار پڑ جاتا ہے ۔ اور اگر اس کا جگانا نہایت ضروری ہو تو اسے رفتہ رفتہ جگانا چاہیے تاکہ روح

کو واپسی کی مہلت مل جائے۔ جزائر فجی میں ماتوکو کے ایک آدمی کی ذرا آنکھ لگی تھی کہ اس پر کسی کا پاؤں پڑ گیا، وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنی روح کو پکار پکار کر اور گڑگڑا کر واپس بلانے لگا۔ وہ عین اس وقت یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ وہاں سے دور ٹانگا میں پہنچا ہوا ہے، اور اس طرح اچانک جاگ کر اپنے آپ کو ماتوکو میں پایا تو بے حد سراسیمہ ہوا اور اسے اپنی موت سر پر کھڑی نظر آئی جس سے بچنے کی صرف یہ صورت تھی کہ اس کی روح کو بھلا پھسلا کر جلد از جلد سمندر پر سے واپس بلا لیا جائے۔ اگر ایک عیسائی مبلغ اس کی تسکین قلب کے لیے اس وقت وہاں موجود نہ ہوتا تو وہ شخص شاید دہشت سے مر جاتا۔

غیر مہذب آدمی کے نزدیک سوتے کو اس کی جگہ سے ہٹانا یا اس کی شکل بدلنی اور بھی خطرناک ہے، کیوں کہ اگر ایسا کیا گیا تو روح واپسی پر اپنے جسم کو نہیں پا سکے گی یا پہچان نہیں سکے گی اور اس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ مینانگ کبایور سوتوں کے چہروں پر کالک ملنا یا انہیں گندہ کرنا نہایت نامناسب سمجھتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں غیر حاضر روح اپنے مسخ شدہ جسم میں داخل ہونے سے گریز نہ کرے۔ ملایا کے باٹانیوں کے خیال کے مطابق سوتے میں اگر کسی شخص کا چہرہ رنگ دیا جائے تو اس کی روح جو اس وقت اس کے جسم سے باہر گئی ہوتی ہے، اسے پہچان نہیں سکے گی، اور جب تک اس کا منہ نہ دھو دیا جائے وہ پڑا سوتا ہی رہے گا۔ بمبئی میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سوتے ہوئے آدمی کے چہرے پر طرح طرح کے رنگ مل کر یا عورت کے چہرے پر مونچھیں لگا کر اس کا حلیہ بگاڑنا بہ منزلہ قتل کے ہے، اس لیے کہ جب روح لوٹے گی تو اپنے جسم کو شناخت نہیں کر سکے گی اور سونے والا مر جائے گا۔

لیکن کسی آدمی کے جسم سے اس کی روح کے جدا ہونے کے لیے اس کا نیند میں ہونا ضروری نہیں، وہ بیداری میں بھی اس کے جسم سے علیحدہ ہوسکتی ہے، جس کا نتیجہ اس آدمی کی بیماری، دیوانگی

یا موت ہوتا ہے ۔ چناں چہ آسٹریلیا میں وورین جیری قبیلے کے ایک آدمی پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی ، کیوں کہ اس کی روح اس سے رخصت ہو چکی تھی ۔ ایک طلسم گر اس روح کے پیچھے روانہ ہوا اور راستے ہی میں اسے عین اس وقت جا پکڑا جب وہ پھولتی شفق یعنی اس روشنی میں غائب ہونے والی تھی جو مغرب میں ، جہاں آفتاب غروب ہوتا ہے ، عالم اسفل سے نکلتی ہوئی روحیں ڈال جاتی ہیں ۔ اس اڑتی روح کو پکڑ کر اور اسے اپنی اپوسمی کھال میں چھپائے وہ ماہر فن بیمار کے پاس پہنچا اور اس پر پڑ کر روح کو اس کے جسم میں دوبارہ داخل کر دیا اور کچھ دیر بعد وہ آدمی زندہ ہو گیا ۔ برما کے کارینوں کو یہ تردد رہتا ہے کہ کہیں ان کی روحیں انھیں مرتا چھوڑ کر آوارہ گردی کے لیے نہ چلی جائیں ۔ چناں چہ ان میں جب کسی آدمی کو یہ خوف ہو کہ اس کی روح یہ مہلک قدم اٹھانے والی ہے تو اسے روکنے یا واپس لانے کے لیے ایک رسم ادا کی جاتی ہے ، جس میں سارے کنبے کو حصہ لینا پڑتا ہے ۔ اس میں کھانا تیار کیا جاتا ہے جو ایک مرغ اور ایک مرغی ، خاص قسم کے چاول اور کیلے کی گیل پر مشتمل ہوتا ہے ۔ پھر صدر خاندان وہ پیالہ لیتا ہے جس میں چاول کی پیچ نکالی جاتی ہے اور اسے گھر کی سیڑھی کی انی پر تین مرتبہ مار کر یہ کہتا ہے ''پرو! لوٹ آ روح ! باہر نہ ٹھہر ، بارش میں بھیگ جائے گی ، دھوپ میں تپ جائے گی ، تجھے مچھر بھنبوڑ ڈالیں گے ، جونکیں کاٹ کھائیں گی ، شیر ہڑپ کر جائے گا ، برق و رعد پیس کر رکھ دیں گے ۔ پرو ! لوٹ آ ۔ یہاں تجھے ہر طرح کا آرام رہے گا ، ہر چیز میسر ہوگی ۔ آ ہوا اور طوفان سے محفوظ رہ اور کچھ کھا پی لے ۔'' اس کے بعد کنبے کے سب لوگ مل کر وہ کھانا کھا لیتے ہیں ۔ پھر ہر شخص اپنے داہنے پہنچے پر جادوگر کی دی ہوئی ایک طلسمی ڈوری باندھتا ہے ، جس پر یہ رسم ختم ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح شمال مغربی چین کے لولوؤں کا عقیدہ ہے کہ روح مزمن مرض میں آدمی کو چھوڑ جاتی ہے ۔ اس صورت میں وہ ایک طولانی مناجات پڑھتے ہیں ، جس میں روح کا نام لے کر اسے پکارا جاتا ہے

اور اس سے التجا کی جاتی ہے کہ وہ پہاڑیوں ، وادیوں ، دریاؤں ، جنگلوں ، کھیتوں میں سے ، یا جہاں کہیں پڑی پھر رہی ہو ، وہاں سے لوٹ آئے ۔ ساتھ ہی گھر کی دہلیز پر پانی ، شراب اور چاول کے پیالے رکھ دیے جاتے ہیں کہ تھکی ماندی روح آئے تو کھا پی کر تازہ دم ہو جائے ۔ جب یہ رسم پوری ہو جاتی ہے تو روح کو قید رکھنے کے لیے بیمار کے بازو سے ایک سرخ ڈوری باندھ دی جاتی ہے ۔ یہ ڈوری جب تک گھس گھسا کر گر نہیں جاتی ، اسی طرح بندھی رہتی ہے ۔

کانگو کے بعض قبیلوں کا عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص بیمار پڑتا ہے تو اس کی روح جسم کو چھوڑ جاتی ہے اور ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہے ۔ چناں چہ ایسی صورت میں جادوگر سے رجوع کیا جاتا ہے کہ وہ آوارہ روح کو گرفتار کر لائے اور بیمار کے جسم میں لوٹا دے ۔ عام طور پر جادوگر آن کر یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے روح کا بڑی کامیابی سے تعاقب کیا ہے اور وہ ایک درخت کی شاخ میں جاگھسی ہے ۔ اس پر قصبے کے تمام لوگ نکل آتے ہیں اور جادوگر کی معیت میں اس درخت کے پاس پہنچتے ہیں ۔ یہاں سب سے تگڑے آدمیوں کو چن کر اس شاخ کے توڑنے پر لگا دیا جاتا ہے ، جس کے اندر روح گھس گئی ہو ۔ یہ آدمی شاخ کو توڑ کر اسے اپنے کندھوں پر لادے قصبے کا رخ کرتے ہیں اور اپنی حرکات و سکنات سے یہ ظاہر کرتے جاتے ہیں کہ ان پر بڑا بھاری بوجھ لدا ہے ۔ جب وہ شاخ بیمار کے جھونپڑے پر پہنچا دی جاتی ہے تو بیمار کو اس کے برابر سیدھا کھڑا کر دیا جاتا ہے اور جادوگر کچھ عمل کرتا ہے جس کے اثر سے ان لوگوں کے عقیدے کے بموجب روح اپنے جسم میں واپس چلی جاتی ہے ۔

سوماٹرا کے باتک سمجھتے ہیں کہ روح کی غیرحاضری سے آدمی بیمار ، دہشت زدہ اور ناتواں ہو جاتا ہے اور مر جاتا ہے ۔ سب سے پہلے وہ چاول کے دانے ڈال کر روح کو واپس لانے کی کوشش کرتے ہیں ، پھر عام طور پر یہ شبدہ دہرائے جاتے ہیں : ''اے روح ! تو جنگل ، پہاڑ یا وادی میں جہاں کہیں رہ گئی ہے ، لوٹ آ ۔

دیکھ میرے پاس تیرے لیے توئیمبرا براس ہے ، راجا موئے لے جا مرغی کا انڈا ہے ، گیارہ صحت بخش پتے ہیں ۔ اسے بن ، پہاڑی اور وادی میں رو کو نہیں ۔ ایسا نہ ہونے پائے ، اے روح ! سیدھی گھر لوٹ آ ۔ '' ایک دفعہ ایک سیاح جو لوگوں میں بہت مقبول تھا ، ایک کایانی گاؤں سے اپنے سفر پر روانہ ہونے لگا تو مائیں اس خوف سے کہ کہیں ان کے بچوں کی روحیں اس کے ساتھ نہ چلی جائیں ، ان تختوں کو اٹھا لائیں جن پر وہ اپنے شیر خوار بچوں کو لیے پھرتی ہیں اور اس سے یہ پرارتھنا کرنے کی التجا کی کہ بچوں کی روحیں اپنے اپنے تختوں کو لوٹ آئیں اور اس سیاح کے ساتھ لگ کر کسی دور دراز ملک کو نہ چلی جائیں ۔ بچے کی آوارہ گرد روح کو باندھنے کے لیے ہر تختے سے ایک ایک پھندا لگا ہوا تھا ، جس میں اس کی پھولی ہوئی انگلی ڈلوائی گئی تاکہ اس بات کا یقین کر لیا جائے کہ اس کی ننھی سی روح آوارہ گردی نہیں کرے گی ۔

ایک ہندوستانی قصے میں ایک راجا اپنی روح کو ایک برہمن کی لاش میں منتقل کر دیتا ہے اور خود اس کے خالی جسم میں ایک کبڑا اپنی روح کو ۔ اس طرح کبڑا راجا اور راجا برہمن بن جاتا ہے ۔ تاہم کبڑے کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مرے ہوے طوطے میں اپنی روح ڈال کر اپنی مہارت کا ثبوت دے ۔ آدھر راجا جو موقعے کی تاک میں رہتا ہے ، اپنے جسم پر دوبارہ قبضہ کر لیتا ہے ۔ اسی قسم کی ایک کہانی فروعی اختلاف کے ساتھ ملایا والوں کے ہاں بھی ملتی ہے ، جو یوں ہے کہ کسی بادشاہ نے بلا کسی وجہ کے اپنی روح ایک بندر میں منتقل کر دی ۔ اس پر چالاک وزیر نے جھٹ اپنی روح بادشاہ کے جسم میں پہنچا دی اور اس طرح سلطنت اور ملکہ کو ہتھیا لیا ۔ اس دوران میں اصلی بادشاہ بندر کے روپ میں پڑا غم کھاتا رہا ۔ لیکن ایک دن نقلی بادشاہ ، جو جوا کھیلا کرتا تھا ، مینڈھے لڑوا رہا تھا کہ وہ مینڈھا جس پر اس نے بازی لگائی تھی مارا گیا ۔ اس میں جان ڈالنے کی بہتیری کوششیں کی گئیں ، لیکن ایک بھی کارگر نہ ہوئی ، تا آنکہ بنے ہوئے بادشاہ نے ایک سچے کھلاڑی

گی طرح اپنی جان مینڈھے میں ڈال دی اور وہ جی اٹھا ۔ اتنے میں اصلی بادشاہ جو موقع کی تلاش میں تھا ، بڑی ہوشیاری سے اپنے پرانے جسم میں منتقل ہوگیا ، جسے وزیر بے سوچے سمجھے چھوڑ گیا تھا ۔ اس طرح بادشاہ تو اپنے اصلی روپ میں آ گیا اور غاصب وزیر مینڈھا بنا کیفر کردار کو پہنچ گیا ۔ ایسا ہی ہرمیوٹس کلے زومنے نامی ایک شخص کا یونانی قصہ ہے ، جس کی روح اپنے جسم کو چھوڑ کر دور دور کی خبریں لاتی تھی ، جنھیں وہ اپنے دوستوں کو سنایا کرتا ۔ ایک دن اتفاق سے جب اس کی روح گھومتی پھر رہی تھی ، دشمنوں نے اس کے جسم پر قبضہ کر لیا اور اسے جلا ڈالا ۔

لیکن روح ہمیشہ اپنی مرضی سے جسم کو نہیں چھوڑتی ، بلکہ بھوت پریت یا جادوگر اسے زبردستی کھینچ سکتے ہیں ۔ اسی لیے کارنوں کے ہاں جب کوئی جنازہ کسی گھر کے پاس سے گزرتا ہے تو بچوں کو ایک خاص ڈوری سے گھر کے کسی حصے کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور جب تک جنازہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتا ، بچے اسی طرح اس جگہ بندھے پڑے رہتے ہیں ۔ جنازے کو قبر میں رکھ کر مٹی دینے سے پہلے مرنے والے کے سوگوار عزیز اور دوست احباب سب اپنے ایک ہاتھ میں ایک ایک چرا ہوا بانس لیے اور ایک میں ایک ایک چھوٹی سی لکڑی ، قبر کے گرد قطار باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ پھر ہر شخص اپنا بانس قبر میں ڈالتا جاتا ہے اور اس کی نالی میں سے لکڑی نکال نکال کر اپنی روح کو بتاتا جاتا ہے کہ اس طرح وہ قبر میں سے اوپر نکل آئے ۔ جب پھاوڑے سے مٹی قبر میں ڈالی جاتی ہے تو بانسوں کو بڑی احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے کہ مبادا ان میں روحیں موجود ہوں اور ان کی غفلت سے مٹی کے ساتھ قبر میں دب جائیں ۔ جس وقت وہ مدفن سے روانہ ہوتے ہیں تو اپنی روحوں سے ساتھ چلنے کی منتیں کرتے ہوئے ان بانسوں کو بھی لیتے جاتے ہیں ۔ نیز وہاں سے لوٹتے ہوئے ہر کارن اپنے لیے تین چھوٹے چھوٹے چوبی ہک درختوں سے کاٹ لیتا ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنی روح کو ساتھ چلنے کے لیے للکارتے ہوئے اسے ہک سے پکڑنے کا اشارہ کرتا جاتا ہے ۔

پھر اس ہک کو زمین میں گاڑ دیتا ہے ۔ یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ جیتوں کی روحیں مردوں کی روحوں کے ساتھ نہ رہ جائیں ۔ سوماٹرا کے کاروباتک اپنے کسی مردے کو دفن کرنے کے بعد اس پر مٹی ڈالنے لگتے ہیں تو ایک جادو گرنی ہوا میں لکڑی چلاتی ہوئی دوڑتی ہے کہ زندوں کی روح کو وہاں سے مار بھگائے ، اس لیے کہ اگر ان میں سے کسی شخص کی روح قبر میں اتر گئی اور اس میں دب کر رہ گئی تو وہ مر جائے گا ۔

جزائر لایاٹی کے ایک ٹاپو اویا میں غالباً مردوں کی روحوں کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ اپنے اندر زندوں کی روحوں کو اڑا لے جانے کی طاقت رکھتی ہیں ۔ چناں چہ جب کوئی آدمی بیمار پڑتا تو وہ جادوگر جو روحوں کا ماہر ہوتا ، بہت سے مردوں اور عورتوں کو لے کر قبرستان پہنچتا ۔ یہاں روح کو لبھا کر گھر لوٹانے کے لیے مرد بانسریاں اور عورتیں آہستہ آہستہ سیٹیاں بجاتیں ۔ کچھ دیر تک یہ ہوتا رہتا جس کے بعد روح کو ہتھیلیوں سے ہانکا دیتے ہوئے سب لوگ جلوس کی شکل میں گھر کی طرف روانہ ہوتے اور تمام راستہ مرد بانسریاں اور عورتیں سیٹیاں بجاتی چلتیں ۔ پھر مریض کے گھر پہنچ کر بہ آواز بلند روح کو حکم دیا جاتا کہ وہ بیمار کے جسم میں واپس چلی جائے ۔

اکثر صورتوں میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ بھوت پریت آدمی کی روح کو اغوا کرکے لے جاتے ہیں ۔ چناں چہ چینی ، دوروں اور تشنج کی کیفیت کو بعض ایسی ارواح کی شرارت سمجھتے ہیں ، جنھیں آدمیوں کی روحوں کو جسموں سے کھینچ نکالنے میں لطف آتا ہو ۔ امائے میں اس قسم کی ارواح جو بچوں کی روحوں کے ساتھ یہ کارروائی کرتی رہتی ہیں ''شہسوار فرشتوں'' اور ''فلک آشیاں ۔ناموروں'' کے شان‌دار القاب سے ملقب ہیں ۔ جب کسی شیر خوار بچے پر تشنج کے دورے پڑ رہے ہوں تو اس کی ماں گھبرا کر چھت پر چڑھ جاتی ہے اور ایک بانس گھما گھما کر ، جس سے بچے کا کوئی کپڑا بندھا ہوتا ہے ، یہ الفاظ بہ آواز بلند دہراتی جاتی ہے ''میرے بچے فلاں فلاں ! لوٹ آ ،

گھر لوٹ آ !'' اس دوران میں گھر کا کوئی اور فرد بھٹکتی روح کو متوجہ کرنے کے لیے، جس کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ اپنے لباس کو پہچان کر اس میں گھس جاتی ہے، ایک گھنٹے تک ضربیں لگاتا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ روح گرفتہ کپڑا بچے کو پہنا دیا جاتا ہے یا اس کے برابر رکھ دیا جاتا ہے۔ اگر بچہ مر نہ جائے تو اس کارروائی سے اس کا دیر یا سویر اچھا ہو جانا یقینی ہے۔ اسی صورت سے امریکہ کے بعض قدیم باشندے آدمی کی روح رفتہ کو اس کے بوٹ میں پکڑ لاتے ہیں اور اس بوٹ کو اس کے پاؤں میں پہنا کر اسے دوبارہ اس کے جسم میں ڈال دیتے ہیں۔

جزائر مولکا میں اگر کسی کا جی اچھا نہ ہو تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی روح کو کوئی بھوت اپنے کسی شجر یا پہاڑی ٹھکانے پر اڑا کر لے گیا ہے۔ کسی جادوگر سے اس بھوت کا ٹھکانا معلوم کرنے کے بعد مریض کے دوست احباب کچھ خشکہ، پھل، مچھلی، کچے انڈے، ایک مرغی، ایک چوزہ، ایک ریشمی عبا، سونا، بازو بند وغیرہ لیے وہاں پہنچتے ہیں اور کھانے کی چیزیں ترتیب کے ساتھ رکھ کر ان الفاظ میں بھوت سے پرارتھنا کرتے ہیں: ''اے بھوت! ہم یہ کھانا، کپڑا، سونا وغیرہ تیری نذر کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ تو یہ لے لے اور اس مریض کی روح کو رہا کر دے، جس کے لیے ہم تجھ سے پرارتھنا کرتے ہیں۔ اسے مریض کے جسم میں واپس چلا جانے دے کہ جو اس وقت بیمار ہے وہ تندرست ہو جائے گا۔'' پھر وہ تھوڑا سا کھانا کھا لیتے ہیں اور مرغی کو مریض کی روح کے فدیے کے طور پر کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ انڈے بھی وہیں رکھ دیتے ہیں، البتہ ریشمی عبا، سونا اور بازو بند اپنے ساتھ واپس لے آتے ہیں اور مریض کے گھر پہنچتے ہی ان چیزوں کو ایک اتھلوان برتن میں مریض کے سرہانے رکھ کر اس سے یہ کہتے ہیں ''لو، اب تمہاری روح آزاد ہو گئی، تم ضرور اچھے ہو جاؤ گے اور بڑی عمر پاؤ گے۔''

جو لوگ پہلی مرتبہ نئے مکان میں داخل ہوتے ہیں، انھیں خاص

طور پر بھوت پریت کا خوف ہوتا ہے ۔ چناں چہ سلیبیز میں منہاسا کے الفوروں کے ہاں نئے گھر میں جانے کی جو تقریب ہوتی ہے اس میں گھر والوں کی روحوں کو واپس لانے کی غرض سے مذہبی پیشوا ایک رسم ادا کرتا ہے ، جس میں وہ اس مقام پر جہاں بھینٹ چڑھائی جاتی ہے ، ایک تھیلی لٹکا دیتا ہے اور پھر دیوتاؤں کی فہرست پڑھنی شروع کر دیتا ہے ۔ وہ اتنے سارے ہیں کہ لگا تار ان کے نام گنواتے گنواتے تمام رات گزر جاتی ہے ۔ صبح کو وہ ایک انڈا اور کچھ چاول ان دیوتاؤں کی نذر کرتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس وقت تک گھر والوں کی ساری روحیں تھیلی میں اکٹھی ہو گئی ہیں ۔ چناں چہ پروہت تھیلی کو لے کر اسے گھر کے مالک کے سر پر پکڑے یہ کہتا ہے : ''یہ رہی تمہاری روح ، جا (روح) کل پھر چلی جا ۔'' اس کے بعد وہ گھر والی اور خاندان کے دوسرے افراد پر بھی یہی عمل دہراتا ہے ۔ انہی الفوروں کے ہاں بیمار کو شفا بخشنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کی روح کو پکڑنے کے لیے ایک پیالہ تسمے کے ذریعے کھڑکی کے باہر لٹکا دیا جاتا ہے اور جب وہ اس میں آ پھنستی ہے تو اسے کھینچ لیا جاتا ہے ۔ نیز انہی لوگوں میں جب کوئی پروہت بیمار کی روح کو کپڑے میں پکڑے واپس لا رہا ہو تو اس پر ایک لڑکی خاص قسم کے کھجور کے ایک بڑے سے پتے کا چھتر کیے اس کے آگے آگے چلتی ہے کہ کہیں بارش ہو تو وہ روح سمیت بھیگ نہ جائے ۔ اور اس کے جلو میں ایک شخص تلوار گھماتا چلتا ہے کہ دوسری روحیں اس گرفتار شدہ روح کو چھڑا کر لے جانے کی کوشش نہ کرنے پائیں ۔

بعض وقت روح گم گشتہ کو مرئی صورت میں واپس لایا جاتا ہے ۔ اوریگون کے سالیش یا چپٹے سر والے باشندوں کا عقیدہ ہے کہ آدمی کی روح کچھ عرصے کے لیے اس کے جسم سے جدا ہو سکتی ہے اور اس کے اس طرح چلے جانے سے نہ وہ مرتا ہے اور نہ اسے اس کی خبر ہونے پاتی ہے ۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ گم شدہ روح کا جلد پتا لگا کر اس کو آدمی کے جسم میں لوٹا دیا جائے ورنہ وہ مر

جائے گا ۔ اس شخص کا نام جس کی روح اسے چھوڑ گئی ہو ، خواب میں طلسم گر پر منکشف ہوتا ہے اور وہ بہ عجلت تمام مریض کے پاس پہنچ کر اسے اس کی اطلاع دیتا ہے ۔ عام طور پر بہ یک وقت کئی آدمی اس طرح اپنی روحوں سے محروم ہو جاتے ہیں ۔ ان سب کے نام طلسم گر پر ظاہر ہو جاتے ہیں اور وہ سب کے سب ان کی باز یافت کے لیے اس سے رجوع کرتے ہیں ۔ یہ بے روح آدمی گاؤں میں رات بھر ناچتے گاتے گھر گھر پھرتے ہیں اور پو پھٹتے ہی سب ایک علیحدہ مکان میں جمع ہو جاتے ہیں ، جو چاروں طرف سے بند اور تیرہ و تار ہوتا ہے ۔ پھر اس کی چھت میں ایک چھوٹا سا چھید کر دیا جاتا ہے ، جس میں سے طلسم گر پروں کی جھاڑو سے ہڈیوں کے ٹکڑوں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی شکل میں روحوں کو مکان کے اندر جھاڑ دیتا ہے ، جو اس کے پاس ایک چٹائی کے ٹکڑے پر پہنچتی ہیں ۔ اس کے بعد آگ جلائی جاتی ہے ، جس کی روشنی میں طلسم گر روحوں کی چھنٹائی کرتا ہے ۔ ان میں سب سے پہلے وہ مردوں کی روحوں کو چھانٹ کر الگ کر دیتا ہے ، جو عموماً بہت سارے ہوتے ہیں ۔ اس لیے کہ اگر وہ کسی زندہ آدمی کو مردے کی روح دے دے تو اس کا کام اسی وقت تمام ہو جائے ۔ اس کے بعد وہ یہ کرتا ہے کہ جتنے آدمی وہاں موجود ہوتے ہیں ان کی روحیں چن چن کر نکال لیتا ہے ۔ پھر ان سب کو اپنے رو بہ رو بٹھا کر ہڈی ، لکڑی یا سیپی کے ٹکڑے کی شکل میں ایک ایک روح کو اٹھاتا جاتا ہے اور بہت سے عمل پڑھتے اور بل کھاتے ہوئے اسے روح والے کے سر پر تھپکتا جاتا ہے ، تا آں کہ روح اس شخص کے قلب میں اتر کر اپنے صحیح مقام پر واپس پہنچ جاتی ہے ۔

بھٹکتی روحوں کو بھوتوں کے علاوہ آدمی ، یعنی جادوگر بھی جسموں سے نکال کر قید کر سکتے ہیں ۔ فجی میں اگر کوئی مجرم اقبال جرم سے انکار کرتا تھا تو قبیلے کا سردار ''اس بدمعاش کی روح کو کھینچ نکالنے کے لیے'' ایک گلوبند طلب کرتا ۔ اس گلوبند کو دیکھ کر ، بلکہ اس کا نام سنتے ہی مجرم عام طور پر سب کچھ

قبول دیتا ، اس لیے کہ وہ اگر ایسا نہ کرتا تو گاوبند اس کے سر پر ہلایا جاتا اور جب روح اس میں آ پھنستی تو اسے بڑی احتیاط سے تہہ کر کے سردار کی کشتی کے سرے میں ٹھونک دیا جاتا اور مجرم روح سے محروم ہو کر گھل گھل کر مر جاتا ۔ ڈینجرآئی لینڈ کے جادوگر روحوں کو پھانسنے کے لیے دام بچھایا کرتے تھے ۔ یہ دام پندرہ سے تیس فٹ لمبی مضبوط سائینٹ پر مشتمل ہوتے ، جن کی دونوں جانب روحوں کے حجم کے لحاظ سے مختلف ناپ کے پھندے لٹکے ہوتے ۔ جب کوئی ایسا شخص بیمار پڑتا ، جس سے جادوگروں کو عداوت ہوتی تو یہ روح‌گیر پھندے اس کے گھر کے قریب لگا دیے جاتے اور روح کے پرواز کرنے کا انتظار کیا جاتا ۔ اگر وہ چڑیا یا پروانے کی شکل میں آ پھنستی تو مریض جان بر نہ ہو سکتا ۔ مغربی افریقہ میں تو جادوگر اب تک اُن روحوں کو پکڑنے کے لیے پھندے لگاتے رہتے ہیں ، جو نیند میں جسموں سے نکل کر بھٹکتی پھرتی ہوں اور جب کوئی روح اُن کے پھندے میں آ پھنستی ہے تو وہ اُسے آگ پر لٹکا دیتے ہیں ، جس کے تپ کر سوکھنے سے روح والا آدمی بیمار پڑ جاتا ہے ۔ یہ کارروائی کسی خصومت کی بناء پر نہیں کی جاتی ، بلکہ وہ محض ایک کاروبار کی حیثیت رکھتی ہے ۔ جادوگر کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ جو روح اس کے ہاتھ لگی ہے وہ کس کی ہے اور اگر روح کا مالک جادوگر کو اپنی روح کی قیمت ادا کر دے تو وہ بہ خوشی اُسے اس کے جسم میں پھیر دیتا ہے ۔ بعض جادوگروں نے بھٹکتی روحوں کو پکڑ رکھنے کے لیے باقاعدہ روح خانے بنا رکھے ہیں ، اور اُس شخص کو جس کی روح کھوئی گئی ہو یا جو اپنی روح کو کہیں رکھ کر بھول گیا ہو ، مقررہ فیس ادا کرنے پر روح خانے سے ہر وقت نئی روح مل سکتی ہے ۔ نجی روح خانے کھولے رکھنا یا آوارہ گرد روحوں کو پکڑنے کے لیے پھندے لگانا مذموم فعل نہیں سمجھا جاتا ۔ یہ اُن جادوگروں کا پیشہ ہے اور اُن کے اس کاروبار کی پشت پر نفرت کا جذبہ نہیں ہوتا ۔ لیکن ان میں بعض شریر ایسے بھی ہیں جو محض بغض یا مال و زر کے لالچ سے دام بچھا کر اور چارہ لگا کر کسی آدمی کی روح

کو پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس برتن میں جو چارے سے ڈھکا ہوتا ہے، چاقو اور نکیلی کیلیں دبی ہوتی ہیں، تاکہ روح بے چاری چھلنی ہو جائے، اور یا تو اسی دم اس کا قصہ پاک ہو جائے یا اگر وہ بچ نکلے تو اس بری طرح گھائل ہو کہ مالک کے پاس لوٹنے پر وہ بیمار پڑ جائے۔ مس کنگسلے ایک کرومن سے واقف تھیں، جسے اپنی روح کی طرف سے بڑی تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ اسے خواب میں کئی رات تک چٹ پٹے خشک جھینگے کی خوشبو آتی رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے کسی بد خواہ نے خواب میں اس کی بھٹکتی روح کو پھانسنے کے لیے دام بچھا رکھا تھا اور اس میں چارے کے طور پر اس کا یہ من بھاتا کھاجا بھی لگا دیا تھا، جس کے ذریعے اس کو سخت جسمانی دکھ روحانی گزند پہنچانا مقصود تھا۔ اگلی کئی راتوں تک نیند میں اس کی روح کو بھٹکتے پھرنے سے روکنے کے لیے بڑے جتن کیے گئے اور وہ اس گرم خطے کی رات کی تپش میں کمبل کے اندر پڑا پسینے میں نہاتا اور خرخراتا رہتا تھا۔ اس کے نتھنوں اور منہ سے رومال باندھ دیا گیا تھا تاکہ اس کی بیش قیمت روح بچ کر نکلنے نہ پائے۔ ہوائی میں کچھ جادوگر تھے جو زندہ آدمیوں کی روحوں کو پکڑا کرتے تھے اور انھیں تونبوں میں بند کر کے لوگوں کو کھانے کے لیے دیا کرتے۔ کسی گرفتار شدہ روح کو اپنے ہاتھوں میں بھینچ کر وہ اس مقام کا کھوج لگا لیتے تھے جہاں لوگوں کو خفیہ طور پر دفن کیا گیا ہو۔

جزیرہ نمائے ملایا سے زیادہ شاید ہی کسی ملک میں روحوں کے اغوا کرنے کے فن کو فروغ یا کمال نصیب ہوا ہو۔ یہاں اس کام کے لیے مختلف ٹوٹکے رائج ہیں اور اسی طرح اس کے مقاصد بھی مختلف ہیں۔ بعض وقت روح کے اغوا کرنے سے جادوگر کو کسی دشمن کی تباہی مقصود ہوتی ہے اور بعض وقت کسی سنگ دل یا شرمیلی نازنین کا دل جیتنا۔ مثلاً اس دوسری قسم کے عمل میں حسب ذیل ہدایتیں دی جاتی ہیں تاکہ اس شخص کی روح کو مسخر کیا جا سکے جسے دیوانہ بنانا ہو۔ جب چاند تمتماتا ہوا افق مشرق سے ابھر

آئے تو چاندنی میں نکل کھڑے ہو اور اپنے داہنے پاؤں کا انگوٹھا بائیں پاؤں کے انگوٹھے پر رکھے داہنے ہاتھ کی مٹھی ترم کی طرح منہ پر لگا لو اور اس میں سے حسب ذیل عمل پڑھو :

اوم - میرا تیر اکارت جاتا ہے ، میرا تیر اکارت جاتا ہے کہ چاند پر اداسی چھائی جاتی ہے - میرا تیر اکارت جاتا ہے کہ سورج گل ہو گیا ہے - میرا تیر اکارت جاتا ہے کہ تارے مدھم ہوئے جاتے ہیں - لیکن میرا نشانہ سورج نہیں ، چاند نہیں ، تارے نہیں - میرا نشانہ دختر انجمن فلاں فلاں کا دل ہے - کٹ ، کٹ ! فلاں فلاں کی روح آ اور میرے ساتھ چل ! آ اور میرے پاس بیٹھ ، آ اور میرے ساتھ ایک تکیے پر سو ، کٹ کٹ ! روح !

اس عمل کو تین مرتبہ دہراؤ اور ہر مرتبہ اپنی مٹھی کا تر بجاؤ - یا پھر تم مطلوبہ روح کو اپنی پگڑی میں اس طرح پکڑ سکتے ہو : پونم کی رات اور اس سے اگلی دو راتوں کو چاندنی میں نکل کر چیونٹیوں کے ڈیہے پر بیٹھ جاؤ اور بخورات جلا کر حسب ذیل عمل پڑھو :

میں تیرے چبانے کو ایک پان کا پتا لایا ہوں ،
اے شہزادۂ غضب ناک ، اس پر چونا لگا کہ
شہزادۂ سودائی کی بیٹی اسے چبائے ،
تڑکے کوئی میرے عشق میں دیوانہ ہو جائے -
تم جب اپنے ماں باپ کو یاد کرو تو میں تمھیں یاد آؤں ،
تم جب اپنے گھر کو اور گھر کی سیڑھی کو یاد کرو تو میں تمھیں یاد آؤں ،
جب بادل گرجیں تو میں تمھیں یاد آؤں ،
جب ہوا سائیں سائیں کرے تو میں تمھیں یاد آؤں ،
جب آسمان برسے تو میں تمھیں یاد آؤں ،
جب مرغ بانگ دے تو میں تمھیں یاد آؤں ،

جب لال چڑی (روبن) اپنی کہانی سنائے تو میں تمھیں یاد آؤں ،
جب تم آفتاب کی طرف دیکھو تو میں تمھیں یاد آؤں ،
جب تم مہتاب کی طرف دیکھو تو میں تمھیں یاد آؤں
کیوں کہ اسی مہتاب میں میں ہوں ۔
کٹ کٹ ! کسی کے دل ، ادھر آ میرے پاس ،
میں اپنا دل تجھے دینا نہیں چاہتا ،
تو اپنے دل کو میرے دل میں آنے دے !

اس کے بعد ہر رات اپنی پگڑی کا ایک سرا سات مرتبہ چاند کی طرف ہلاؤ اور پھر گھر پہنچ کر اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لو ؛ اور اگر اسے تم دن میں پہننا چاہو تو بخورات جلا کر یہ کہو : ''یہ پگڑی کہ میری بغل میں ہے میری نہیں ، بلکہ کسی کی روح کی ہے ۔''

برطانوی کولمبیا میں دریائے نامس کے باشندوں کے عقیدے کی رو سے معالج سہواً اپنے مریض کی روح کو نگل سکتا ہے ۔ جس طبیب کے متعلق یہ خیال ہو کہ اس سے اس قسم کی غلطی سرزد ہو گئی ہے ، اسے اس کے شرکائے کار مریض پر کھڑا کر دیتے ہیں اور ان میں سے ایک معالج مذکور کے حلق میں انگلی ڈالتا ہے ، دوسرا پوروں سے اس کا پیٹ دباتا ہے اور تیسرا اس کی پیٹھ ٹھونکتا ہے ۔ اگر یہی ترکیب سارے اطبا آزما کے دیکھ لیں اور مریض کی روح اس میں موجود نہ ہو تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ صدر طبیب کے ڈبے میں ضرور بند ہوگی ۔ لہذا اطبا کی ایک جماعت صدر طبیب کے گھر پہنچتی ہے اور اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اس سے یہ درخواست کرتی ہے کہ وہ اپنا ڈبا نکال لائے ۔ جب وہ ڈبا نکال کر اس میں سے تمام چیزیں ایک نئی چٹائی پر جما دیتا ہے تو وہ حکیم ایس ایپس کے اس پرستار کو ایڑیوں سے پکڑ کر اور اس کے سر کو فرش میں ایک چھید کے اندر رکھ کر الٹا کھڑا کر دیتے ہیں ۔ اس حالت میں اس کا سر دھویا جاتا ہے اور ''نہاون کا جو پانی رہ گیا ہو اسے لے جا کر مریض کے سر پر بہا دیا جاتا ہے ۔'' بلا شبہ مریض کی گم شدہ روح اس پانی کے اندر ہوتی ہے ۔

(۳) روح سایہ اور عکس کی حیثیت سے— لیکن وحشی کو صرف یہی روحانی خطرے لاحق نہیں ہوتے جو میں گنوا آیا ہوں ۔ اکثر وہ اپنے سائے یا عکس کو اپنی روح یا کم از کم اپنا جزو حیات سمجھتا ہے ، اور اس حیثیت سے اس کے سائے یا عکس کا اس کے لیے خطرے کا باعث ہونا ضروری بات ہے ۔ چناں چہ اسے روندا یا مارا جائے یا اس میں چاقو گھونپا جائے تو وہ اس کی تکلیف اس طرح محسوس کرے گا کہ گویا خود اُس کو روندا ، پیٹا یا چاقو مارا گیا ہے ، اور اگر اس کا سایہ اس سے بالکل جدا ہو جائے (جیسا کہ اس کے عقیدے کی رو سے ہو سکتا ہے) تو وہ مر جائے گا ۔ جزیرہ ویتار (شرق الہند) میں ایسے جادوگر پائے جاتے ہیں جو کسی کی پرچھائیں پر برچھی گھونپ کے یا تلوار کا وار کرکے اسے بیمار کر سکتے ہیں ۔ ہندوستان میں سنکارا بدھ مت والوں کا قلع قمع کر چکا تو کہا جاتا ہے کہ وہ نیپال پہنچا ، جہاں اس کا دلائی لاما سے کچھ اختلاف رائے ہو گیا ۔ وہ اپنے استدراج کا ثبوت دینے کے لیے ہوا میں اڑنے لگا ، لیکن جس وقت وہ بلند ہوا تو دلائی لاما نے زمین پر اس کی جھولتی اور تھر تھراتی پرچھائیں کو دیکھ کر اس پر اپنا چاقو گھونپ دیا جس سے سنکارا زمین پر آ رہا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی ۔

جزائر بینک میں بعض عجیب قسم کے لمبوترے پتھر پائے جاتے ہیں ، جنھیں ''کھانے والے بھوت'' کہا جاتا ہے ، کیوں کہ عام خیال کے بموجب ان میں بعض طاقت ور اور خطرناک روحیں بستی ہیں ۔ اگر کسی پتھر پر کسی شخص کا سایہ پڑ جائے تو بھوت اس کی روح کھینچ نکالے گا اور وہ شخص مر جائے گا ۔ لہٰذا ایسے پتھر گھر میں حفاظت کے لیے رکھے جاتے ہیں اور وہ قاصد جسے گھر کے مالک نے کسی اور مقام سے گھر بھیجا ہو ، مؤخرالذکر کا نام لے کر پکارتا ہے کہ کہیں پتھر کا بھوت یہ سمجھ کر کہ وہ کسی بری نیت سے آیا ہے ، اس کے ساتھ کوئی شرارت نہ کر بیٹھے ۔ چین میں جب کسی میت کے تابوت کو ڈھانکا جاتا ہے تو مرنے والے کے قریبی رشتہ داروں کے سوا باقی جتنے لوگ وہاں کھڑے ہوتے ہیں ، چند قدم پیچھے ہٹ

جاتے ہیں ، بلکہ کسی علیحدہ کمرے میں چلے جاتے ہیں کیوں کہ اگر کسی شخص کا سایہ تابوت میں بند ہو جائے تو اس کی صحت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور جب تابوت قبر میں اتارا جانے لگتا ہے تو اکثر لوگ کچھ فاصلے پر ہٹ جاتے ہیں کہ کہیں ان کی پرچھائیاں قبر میں نہ پڑ جائیں اور اس طرح انہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔ رمال اور اس کے نائب قبر کی اس جانب کھڑے ہوتے ہیں جو آفتاب کے رخ پر ہو ، اور گورکن اور تابوت بردار کپڑے کی پٹیوں سے اپنی کمریں کس لیتے ہیں تاکہ ان کا سایہ جسموں سے لگا رہے یا پھیلنے نہ پائے۔ لیکن صرف انسان ہی اپنے سایوں کی بدولت جوکھوں میں نہیں ہوتے ، بلکہ جانوروں کو بھی اسی طرح خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ ایک قسم کے چھوٹے سے گھونگے کے متعلق جو پیراک میں چونے کی پہاڑیوں کے آس پاس اکثر نظر آتا ہے یہ اعتقاد پایا جاتا ہے کہ وہ مویشیوں کے سایوں کے ذریعے ان کا خون چوسا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جانور سوکھنے لگتے ہیں اور بعض وقت خون کی کمی سے مر جاتے ہیں۔ اگلے زمانے کے لوگوں کا خیال تھا کہ عرب میں اگر کوئی چرغ کسی آدمی کے سایہ پر پاؤں رکھ دیتا ہے تو وہ گویائی سے محروم ہو جاتا ہے اور اس میں چلنے پھرنے کی سکت باقی نہیں رہتی اور چاندنی میں کسی گھر کی چھت پر کھڑے ہوئے کتے کی پرچھائیں زمین پر پڑ رہی ہو اور اسے چرغ روند جائے تو کتا یوں نیچے آ رہے گا جیسے اسے رسی سے کھینچ لیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ان صورتوں میں سایہ اگر انسان یا جانور کی روح کے برابر نہیں تو کم از کم اس کی حیات کے ایک ایسے جزو کی حیثیت ضرور رکھتا ہے کہ اگر اسے کوئی گزند پہنچے تو اس کو انسان یا جانور اس طرح محسوس کرے جیسے وہ گزند خود اس کے جسم کو پہنچا ہو۔

دوسری طرف اگر سایے کی حیثیت انسان یا جانور کے جزو حیات کی ہے تو بعض حالات میں اس کا کسی سے چھو جانا اسی طرح خطرناک ہوگا جس طرح خود انسان یا جانور کا مس کر جانا۔ اسی وجہ سے وحشی اصولاً ایسے اشخاص کے سایے سے بچتا ہے ، جن کے

اثرات مختلف اسباب کی بنا پر خطرے کا باعث سمجھے جاتے ہوں ۔ اس قسم کے خطرناک لوگوں کے زمرے میں بالعموم سوگوار اشخاص اور عورتیں اور بالخصوص ساس کی ذات آتی ہے ۔ امریکہ کے شسواپ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی شخص پر ایسے آدمی کا سایہ پڑ جائے جو کسی کا سوگ منا رہا ہو تو مقدم‌الذکر علیل ہو جائے گا ۔ وکٹوریا کی کرنائی قوم میں لڑکوں کو ان کی رسم بلوغ پر متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اوپر کسی عورت کا سایہ نہ پڑنے دیں ، ورنہ اس کے اثر سے وہ لاغر، کاہل اور کودن ہو جائیں گے ۔ کہا جاتا ہے کہ ایک آسٹریلوی وحشی پر جو ایک درخت کے نیچے پڑا سو رہا تھا ، اس کی ساس کا سایہ پڑ گیا اور اس پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ اس کا دم نکلتے نکلتے رہ گیا ۔ غیر مہذب انسان کے دل و دماغ پر ساس کی جو ہیبت چھائی رہتی ہے وہ انسیات (anthropology) کی ایک عام حقیقت ہے ۔ نیو ساؤتھ ویلز کے یون قبیلے میں کسی شخص کا اپنی ساس سے رسم و راہ رکھنا سخت ممنوع تھا ۔ وہ ساس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور جو کہیں داماد پر ساس کا سایہ پڑ جاتا تو یہ چیز طلاق کا موجب بن جاتی اور ایسی صورت میں اسے اپنی بیوی کو چھوڑ دینا پڑتا جو میکے واپس چلی جاتی ۔ نیو برٹن کے وحشیوں کا ذہن اس بات کا اندازہ کرنے سے بھی قاصر ہے کہ داماد کا اتفاقاً ساس سے بات کرلینا کیسی کیسی شدید مصیبتیں لاتا ہے ۔ غالباً ایسے شخص اور اس کی بیوی کے لیے خود کشی کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا ۔ ان وحشیوں کے ہاں بڑی سے بڑی قسم اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے : ''جناب اگر میں سچ نہیں بول رہا ہوں تو اپنی ساس سے مصافحہ کروں ۔''

جہاں انسان کے سایے سے اس کی زندگی کا رشتہ اس قدر گہرا ہو کہ اس کے معدوم ہو جانے سے وہ نحیف و زار ہو کر رہ جائے یا مر جائے وہاں یہ خیال پیدا ہونا قدرتی بات ہے کہ کسی کے سایے کا گھٹنا تشویش کی نظر سے دیکھا جاتا ہو اور قویٰ کے انحطاط کی علامت سمجھا جاتا ہو ۔ چناں چہ جزائر ایمبونیا اور یولئیس میں جو خط استواء

کے قریب واقع ہیں اور جہاں نصف النہار کو کوئی سایہ نہیں ہوتا ، لوگوں نے اپنا یہ اصول بنا رکھا ہے کہ دوپہر کو گھر سے باہر نہ نکلیں ، کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں آدمی کی روح کا زیان ہے ۔ منگائیا (بحرالکاہل کا ایک جزیرہ) والے اپنے ایک ہیرو توکے تاوا کا قصہ سناتے ہیں ، جس کا زور اس کے سایے کے ساتھ ساتھ گھٹتا رہتا تھا ۔ صبح کو جب اس کا سایہ سب سے زیادہ لمبا ہوتا اس کی طاقت بھی اپنے نقطۂ عروج پر ہوتی ، لیکن جیسے جیسے دن چڑھتا جاتا اس کا سایہ گھٹتا جاتا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی طاقت بھی ؛ تا آں کہ ٹھیک دوپہر کو وہ انتہا درجے کم ہو جاتی ۔ کسی سورما نے توکے تاوا کی طاقت کا یہ راز معلوم کر لیا اور عین دوپہر کو اس کا سر قلم کر ڈالا۔ جزیرہ نمائے ملایا کے بے سی سس نامی وحشی دوپہر کو اپنے مردے گاڑتے ہوئے ڈرتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ اس وقت ان کے سایے کے گھٹاؤ کے مشارک اثر سے ان کی عمریں کم ہو جاتی ہیں ۔

جان اور سایے کے برابر ہونے کے متعلق جو عقیدہ پایا جاتا ہے ، اس کی سب سے نمایاں مثال شاید وہ دستور ہیں جو جنوب مشرقی یورپ میں جاری ہیں ۔ یونان جدید میں یہ دستور ہے کہ جب کسی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے تو مرغ ، بکرا یا مینڈھا مار کر اس کا خون سنگ بنیاد پر بہا دیا جاتا ہے اور پھر اسی کے نیچے قربانی کے اس جانور کو دبا دیا جاتا ہے ۔ اس قربانی سے عمارت کی پائے داری اور استواری مقصود ہے ۔ لیکن بعض صورتوں میں مکان بنانے والا جانور کی قربانی کرنے کی بجائے کسی آدمی کو بہلا پھسلا کر سنگ بنیاد کے پاس لے آتا ہے اور اس کی لا علمی میں اس کے جسم کے کسی حصے یا سایے کو ناپ کر سنگ بنیاد کے نیچے دفن کر دیتا ہے ۔ خیال ہے کہ وہ آدمی ایک سال سے زیادہ نہیں جیتا ۔ ٹرانسلوینیا کے رومانوی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شخص جس کا سایہ اس طرح محبوس ہو جائے، چالیس دن کے اندر اندر مر جاتا ہے ۔ چناں چہ ان لوگوں کو جو کسی زیر تعمیر عمارت کے پاس سے گزرتے ہوں ، یہ صدا سنائی دیتی ہے : ''خبر دار ! کہیں وہ تیرا سایہ نہ لے لیں ۔'' کچھ عرصہ پیشتر تک اس علاقے میں ایسے

لوگ موجود تھے جو سایوں کی تجارت کیا کرتے تھے اور دیواروں کو پائے دار بنانے کے لیے معماروں کو سایے بہم پہنچاتے ۔ ان صورتوں میں سایے کا ناپ خود سایے اور ناپ کا دفن کرنا آدمی کی جان یا روح کے دفن کرنے کے مساوی سمجھا جاتا ہے ، اور جو آدمی یوں اپنی روح سے محروم ہو جاتا ہے ، اس کی موت یقینی ہوتی ہے ۔ اس طرح یہ رواج زندہ آدمی کو دیواروں میں چننے یا کسی عمارت کے سنگ بنیاد کے نیچے دفن کر دینے کے اس قدیم دستور کا بدل ہے ، جس کا مقصد عمارت کو استوار اور پائے دار کرنا تھا ۔ یا زیادہ واضح لفظوں میں ، مذکورہ بالا دستور سے یہ ظاہر مقصود یہ تھا کہ اس آدمی کی غضب ناک روح جو اس طرح ہوس کر دی گئی ہو ، عمارت میں منڈلاتی رہے اور اسے دشمنوں کے حملے سے محفوظ رکھے ۔

جس طرح بعض قوموں کے نزدیک آدمی کی روح اس کے سایے میں داخل و شامل ہوتی ہے ، اسی طرح بعض دوسری قوموں (یا انھی قوموں) کے عقیدے کے بموجب وہ پانی یا آئینے میں آدمی کے عکس سے عبارت ہے ۔ چناں چہ ''انڈمانی اپنے سایے کی بجائے (آئینے میں) اپنے عکس کو اپنی روح تصور کرتے ہیں ۔'' نیوگنی کے ماتومو نامی لوگوں نے جب آئینے میں پہلی مرتبہ اپنا عکس دیکھا تو انھوں نے اسے اپنی روح سمجھا ۔ نیوکیلے ڈونیا کے بڑے بوڑھوں کے نزدیک کسی آدمی کی روح پانی یا آئینے میں اس کے عکس سے عبارت ہے ۔ لیکن نوجوان ، جنھوں نے کیتھولک پادریوں سے تعلیم پائی ہے ، یہ رائے رکھتے ہیں کہ آدمی کا عکس ویسا ہی ہے جیسے پانی میں کھجور کے درخت کا عکس اور بس ۔ عکسی روح کو جو آدمی کے باہر ہوتی ہے وہی کچھ خطرے لاحق ہوتے ہیں ، جو سایے والی روح کو ہوتے ہوں ۔ زولو کسی تاریک گڑھے میں نہیں جھانکتے کیوں کہ ان کے خیال میں اس کے اندر ایک جانور بند ہوتا ہے جو آدمیوں کے عکس کو کھینچ لے جاتا ہے اور وہ مر جاتے ہیں ۔ باسوتو کہا کرتے ہیں کہ مگرمچھ کے اندر آدمی کے سایے کو اس صورت سے گھسیٹ کر لے جانے اور اسے ہلاک کرنے کی قوت ہوتی ہے ۔

جب ان میں سے کسی کی موت اچانک واقع ہو جائے اور اس کا بہ ظاہر کوئی سبب نہ ہو تو اس کے عزیز وثوق کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اس کے عکس کو کسی وقت اس کے ندی پار کرتے میں کوئی مگرمچھ کھینچ لے گیا ہے ۔ جزیرۂ ساڈل (ملینیشیا) میں ایک جوہڑ ہے ، ''جس میں اگر کوئی دیکھ لے تو مر جائے ۔'' اس جوہڑ کی خبیث روح جھانکنے والے کے عکس کے وسیلے سے اس کی جان اپنی گرفت میں لے لیتی ہے ۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے اس کے پیش نظر یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ قدیم عہد کے ہندوستانی اور یونانی اصولاً پانی میں اپنا عکس دیکھنے سے کیوں گریز کیا کرتے تھے اور یونانیوں کے ہاں خواب میں کسی شخص کا پانی کے اندر اپنا عکس دیکھ لینا اس کی موت کا شگون کیوں سمجھا جاتا تھا ۔ انھیں یہ خوف تھا کہ آبی روحیں آدمی کو مرنے کے لیے بے روح چھوڑ کر اس کے عکس کو پانی میں گھسیٹ لے جاتی ہیں ۔ یہی چیز غالباً حسین نارسی سس (یونانی صنمیات کی رو سے یہ دریائی دیوتا سے فی سس اور لاریوپے پری کا حسین و جمیل بیٹا تھا ۔ اسے چشمے میں کہیں اپنا عکس نظر آ گیا ، جسے وہ چشمے کی پری سمجھ کر اس پر سو جان سے فریفتہ ہو گیا اور اسے حاصل کرنے کی سعیٔ لا حاصل میں غم کھا کھا کر مر گیا ۔ مرنے کے بعد اس ۔ اس پھول یعنی نرگس کی صورت اختیار کرلی جو آج اسی کے نام سے موسوم ہے) والی کلاسیکی کہانی کی اصل ہے ، جو پانی میں اپنا عکس دیکھتا دیکھتا گھل گھل کر مر گیا ۔

نیز اب اس عام دستور کی وضاحت بھی ممکن ہے جس کے مطابق اگر گھر میں کوئی مر جائے تو آئینوں پر پردے ڈال دیے جاتے ہیں ، یا انھیں دیوار کی طرف گھما دیا جاتا ہے ۔ لوگوں کو یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں زندہ آدمی کی جان کو جو اس کا عکس بن کر آئینے پر پڑتی ہے ، متوفی کی روح اپنے ساتھ لے کر نہ چلی جائے ، جو ان کے خیال میں میت کی تدفین تک گھر کے آس پاس موجود رہتی ہے ۔ یہ دستور بعینہ ویسا ہی ہے جیسے آرو والا وہ دستور ، جس کے مطابق

لوگ اس اندیشے سے گھر میں سویا نہیں کرتے کہ زندہ آدمی کی روح کی ملاقات ، جو خواب میں اس کے جسم سے نکل آتی ہے ، کسی پریت سے نہ ہو جائے اور مؤخرالذکر اسے اپنے ساتھ لے کر نہ چلا جائے ۔ بیماروں کو جو آئینہ دیکھنے سے منع کیا جاتا ہے اور بیمار کے کمرے کے آئینے کو جو ڈھانپ دیا جاتا ہے اس کا سبب بھی واضح ہے ۔ بیماری میں خاص طور پر ، جب کہ روح آسانی سے پرواز کر سکتی ہے، آدمی کی روح کا عکس بن کر جسم سے نکلنا اور آئینے پر پڑنا خطرناک ثابت ہوتا ہے ۔ یہ قاعدہ بعض قوموں کے اس قاعدے کے بعینہ مشابہ ہے جس کی رو سے بیماروں کو سونے نہیں دیا جاتا ، اس لیے کہ نیند میں روح جسم سے باہر نکل آتی ہے اور ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ شاید لوٹ کر نہ آئے ۔

سایوں اور عکسوں پر جو بات صادق آتی ہے وہی تصویروں پر بھی آتی ہے ۔ ان کے متعلق بھی بسا اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں اس شخص کی روح مضمر ہوتی ہے جس کی تصویر کھینچی گئی ہو ۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں ، اپنی شبیہ اتروانے سے گریز کرتے ہوں گے ، اس لیے کہ اگر تصویر اس شخص کی روح یا کم از کم جزو حیات ہے جس کی وہ شبیہ ہو ، تو وہ جس کسی کے قبضے میں ہو گی وہ اس شخص کو اپنے اثر سے ہلاک کر سکتا ہے ۔ چناں چہ آبنائے بیرنگ کے اسکیموؤں کا عقیدہ ہے کہ جو لوگ سفلی فن سے شغف رکھتے ہیں وہ آدمی کا سایہ اڑا سکتے ہیں اور وہ اس کے بغیر گھل گھل کر مر جاتا ہے ۔ ایک دفعہ دریائے یوکون کے نچلے علاقے کے کسی گاؤں میں ایک سیاح نے کیمرا لگایا کہ گھروں کے آس پاس چلتے پھرتے لوگوں کی تصویر لے ۔ وہ اپنے آلے کا فوکس درست کر رہا تھا کہ گاؤں کا سردار اس کے پاس آیا اور پردے میں منہ ڈال کر جھانکنے پر اصرار کرنے لگا جس کی اس کو اجازت دے دی گئی ۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے زمین کش عدسے پر حرکت کرتے ہوئے پیکروں کو بغور دیکھا ، پھر پردے میں سے منہ باہر نکال لیا اور اپنے لوگوں سے چیخ چیخ کر کہنے لگا ''اس نے تم سب کے سائے اس ڈبے

میں بند کر لیے ہیں۔'' یہ سننا تھا کہ وہ سب بدحواس ہو کر بھاگے اور افتاں و خیزاں اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے۔ میکسیکو کے نئے پے ہوانوں کا کیمرے سے دم نکلتا تھا، انھیں تصویر کھنچوانے پر آمادہ کرنے کے لیے پانچ دن تک جھک جھک کرنی پڑی اور خدا خدا کرکے جب وہ راضی ہوئے تو ان کی شکلوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی گردنیں ماری جانے والی ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ فوٹوگرافر ان کی روحیں کھینچ کر لے جا سکتا ہے اور انھیں ہڑپ کر سکتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جس وقت ان کی تصویریں فوٹوگرافر کے ملک میں پہنچیں گی تو ان کا خاتمہ ہو جائے گا یا ان پر کوئی افتاد پڑ جائے گی۔ جب ڈاکٹر کٹاٹ اور ان کے چند ساتھی مدغاسکر کے مغربی ساحل پر علاقہ بارا کی دریافت کی مہم میں مصروف تھے تو لوگ دفعتاً ان کی مخالفت پر اتر آئے۔ پچھلے دن ہی یہ سیاح شاہی خاندان کی تصویر لینے کے مرتکب ہوئے تھے، گو اس میں انھیں دشواری ضرور پیش آئی تھی۔ اور اب ان پر یہ الزام تھا کہ وہ لوگوں کی روحیں لیے جاتے ہیں تاکہ فرانس پہنچ کر انھیں فروخت کر دیں۔ انھوں نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا سنا مگر بے سود۔ مجبوراً ملک کے دستور کے بموجب ان وحشیوں کی روحوں کو پکڑ کر ایک ٹوکری میں رکھا گیا اور ڈاکٹر کٹاٹ کے حکم سے انھیں اپنے اپنے مالک کو لوٹا دیا گیا۔

سکھم کے بعض دیہاتیوں کے آگے جب کبھی کیمرے کا عدسہ یا بقول ان کے ''ڈبے کی چشم بد'' پھیری گئی تو وہ بڑے خوف زدہ ہوئے اور منہ چھپانے لگے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ آلہ ان کے عکس کے ساتھ ان کی روحیں بھی کھینچ لے جاتا ہے، اور اس طرح تصویروں کے مالک کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ ان پر جادو ٹونا کرے۔ نیز ان کا دعویٰ تھا کہ کسی منظر کی تصویر کشی سے وہاں کی زمین خراب ہو جاتی ہے۔ سیام کے پچھلے بادشاہ کے عہد حکومت تک سیامی سکے پر بادشاہ کی تصویر کبھی نقش نہیں کی جاتی تھی، ''اس لیے کہ اس زمانے میں تصویر کشی کے خلاف سخت تعصب پھیلا ہوا تھا، خواہ اس کا ذریعہ کچھ ہی ہو۔ وہ یورپی جو سفر کرتے ہوئے جنگلوں

میں پہنچتے ہیں اپنے کیمرے کا رخ بھی مجمع کی طرف کر دیں تو وہ منتشر ہو جاتا ہے ۔ جب کسی شخص کی تصویر کھینچ لی جائے تو اس کی جان کا ایک جزو بھی اس کے ساتھ کھنچ نکلتا ہے ۔ بادشاہ کے لیے ، بجز اس کے کہ وہ عمر خضر لے کے آیا ہو ، سکوں کے ساتھ ملک میں اپنی جان کے بٹوارے کی اجازت دینی مشکل تھی ۔''

اس قسم کے عقائد یورپ کے مختلف حصوں میں آج بھی پائے جاتے ہیں ۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ، یونان کے جزیرۂ کارپتھیس میں چند بوڑھیوں کی شبیہ اتاری گئی تو وہ بہت برافروختہ ہوئیں کہ اس کے نتیجے میں وہ گھل گھل کر مر جائیں گی ۔ مغربی اسکاچستان میں کچھ اشخاص ہیں ''جو اس خوف سے اپنی شبیہ کھنچوانے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ ان پر کوئی افتاد نہ پڑ جائے ۔ وہ اپنے متعدد دوستوں کی مثالیں دیتے ہیں جن کے فوٹو لیے جانے کے بعد ایک دن بھی ان کی صحت اچھی نہیں رہی ۔''

انیسواں باب

# افعال کی تحریم

## (۱) پردیسیوں کے ساتھ میل جول پر امتناع : روح

اور روحانی خطرات کے بارے میں جاہلی تصورات کے متعلق ہمیں بس یہی کچھ کہنا تھا ۔ یہ تصورات کسی ایک قوم یا ملک تک محدود نہیں ، بلکہ فروعی تغیرات کے ساتھ دنیا میں ہر جگہ ملتے ہیں اور جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں ، آج کے یورپ میں بھی موجود ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جن عقائد کی جڑیں اس قدر گہری ہوں اور جو اس قدر ہمہ‌گیر ہوں ، ان کا بادشاہت کی ابتدائی صورت کے تعین میں ضرور حصہ رہا ہوگا ، اس لیے کہ اگر ہر شخص اپنی روح کو ان خطرات سے بچانے کے لیے جو ہر طرف سے اسے لاحق ہوں ، اتنی کھکیر اٹھاتا تھا تو اس ہستی کی حفاظت کی خاطر کیا کچھ نہ جتن کیے جاتے ہوں گے جس پر ساری قوم کی خوش حالی بلکہ بقا منحصر تھی ، اور اس لیے جس کے تحفظ میں سب کا فائدہ تھا ؟ لہذا یہ خیال پیدا ہونا ضروری ہے کہ بادشاہ کے لیے وہ پیش بندیاں اس سے بھی زیادہ اور سخت ہوں‌گی جو غیر مہذب معاشرے کا ہر فرد اپنی حفاظت کے لیے کرتا ہو ۔ واقعہ یہ ہے کہ ابتداء میں بادشاہ کی زندگی ، جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں اور اب مزید دیکھنا چاہتے ہیں ، مقررہ ضوابط کی پابند ہوتی ہے ۔ بنا بر ایں کیا یہ قیاس بجا نہ ہوگا کہ یہ ضوابط اصل میں انھی پیش بندیوں سے عبارت ہیں جو ہمارے خیال میں بادشاہ کی جان کی سلامتی

کے لیے کی جاتی ہوں ؟ خود ان ضوابط کی چھان بین سے ہمارے اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض ضوابط وہی کچھ ہیں ، جن کے عام آدمی اپنی روحوں کی حفاظت کی خاطر پابند ہوتے ہیں ، اور ان ضوابط میں بھی جو بادشاہ کی ذات کے لیے مخصوص ہیں ، سب کے سب نہیں تو بہت سے ایسے ضرور ہیں جن کی توضیح اس مفروضے کی بناء پر نہایت آسانی سے ہو سکتی ہے کہ ان کی حیثیت ایسی احتیاطی یا انسدادی تدابیر کی ہے جو بادشاہ کی زندگی کو امکانی خطرات سے بچانے کے لیے اختیار کی جائیں ۔ اب میں ایک ایک کرکے ان شاہی ضوابط یا امتناعات کی صراحت کروں گا تاکہ ہر ایک ضابطے کے اصل مقصد پر صحیح روشنی پڑ سکے ۔

بادشاہ پر جو امتناعات عاید ہوتے ہیں ، ان کا مقصد چوں کہ اسے اُن تمام چیزوں سے دور رکھنا ہے ، جو خطرے کا باعث خیال کی جاتی ہوں ، لہٰذا ان کا عام نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ضوابط کی تعداد اور شدت کے لحاظ سے اس کی زندگی قید تنہائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ ب ایسی تمام خطرناک چیزوں میں وحشی سب سے زیادہ جادو یا سفلی ن سے ڈرتا ہے اور اسے ہر پردیسی یا اجنبی پر جادوگر ہونے کا شبہ ہوتا ہے ، لہٰذا اجنبیوں کے مضر اثرات کے خلاف پیش بندی ، خواہ ان کی نوعیت ارادی ہو یا غیر ارادی ، وحشی کی مصلحت کا ایک بنیادی تقاضا ہے ۔ چناں چہ اجنبیوں کو اپنے ملک کے کسی حصے میں داخل ہونے یا اپنے ساتھ آزادانہ میل جول کی اجازت دینے سے پہلے غیر مہذب لوگ بعض رسمیں ادا کرتے ہیں تاکہ مقدم‌الذکر کی سحری قوتوں کو سلب یا ان مضر اثرات کا توڑ کیا جائے جو ان کی ذات سے منسوب کیے جاتے ہیں ۔ یا یوں کہیے کہ اس صورت سے ان کی گرد و پیش کی مسموم فضا کے اثرات زائل کیے جاسکیں ۔ چناں چہ جب وہ سفیر ، جنھیں مشرقی روما کے شہنشاہ جسٹن دوم نے ترکوں کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے بھیجا تھا ، اپنی منزل مقصود پر پہنچے تو انھیں لینے کے لیے شامن (آئمۂ مذہب) وہاں موجود تھے ، جنھوں نے ان سفیروں کے مضر اثرات دور کرنے کے لیے باضابطہ ایک

رسم تزکیہ ادا کی ۔ ان منتریوں نے سفیروں کا سامان ایک کھلے مقام پر رکھ دیا اور بخور کی جلتی ہوئی ڈالیاں لیے ان کے گرد چکر کاٹنا شروع کیے ، جس کے ساتھ ساتھ وہ ایک گھنٹی اور طنبورہ بجاتے اور جذبے کی حالت میں خر خراتے بھی جاتے تھے تاکہ ان اجنبیوں کا شر رفع ہو جائے ۔ اس کارروائی کے بعد انھوں نے خود ان سفیروں کو شعلوں میں سے گزار کر پاک کیا ۔ جزیرۂ نانومیا (جنوبی بحرالکاہل) میں جہاز پر سے یا کسی اور جزیرے سے آنے والے اجنبیوں کو وہاں کے باشندوں سے ربط ضبط پیدا کرنے کی اجازت نہ تھی ، تاوقتیکہ ان کو یا ان کے چند نمائندوں کو جزیرے کے چار مندروں میں سے ہر ایک میں نہ لے جایا جاتا اور دیوتا سے یہ پرارتھنا نہ کر لی جاتی کہ وہ ان اجنبیوں کی لائی ہوئی بیماری یا دغا سے محفوظ رکھے ۔ نیز رقص و سرود کے ساتھ قربان گاہوں پر اشیائے خورد و نوش نذر چڑھائی جاتیں ۔ ان رسموں کے دوران میں پروہتوں اور ان کے خادموں کے سوا کسی کو سامنے نہیں آنے دیا جاتا تھا ۔ بورنیو کے اوٹ ڈانم نامی لوگوں کے ہاں یہ دستور ہے کہ ان کے علاقے میں جو پردیسی داخل ہوتے ہیں ، ان سے ایک خاص رقم وصول کی جاتی ہے ۔ یہ رقم زمین اور پانی کی روحوں کو بھینسوں اور سؤروں کی قربانی دینے پر خرچ کی جاتی ہے ، تاکہ انھیں اپنے ملک میں پردیسیوں کی موجودگی پر راضی کر لیا جائے اور ان کی استمالت کی جائے کہ وہ ان کے حال پر حسب سابق مہربان رہیں ، بلکہ فصل پر اپنی برکتیں ارزانی فرمائیں وغیرہ ۔ بورنیو کے ایک ضلع کے آدمیوں نے ، جنھیں یہ خوف تھا کہ یورپینوں کو دیکھ لینے سے وہ بیمار پڑ جائیں گے ، اپنے بیوی بچوں کو متنبہ کیا کہ وہ یورپینوں کے قریب نہ جائیں ، اور جن لوگوں سے انھیں دیکھے بغیر نہ رہا گیا انھوں نے خبیث روحوں کی رضا جوئی کے لیے مرغیاں ذبح کیں اور اپنے جسموں پر ان کا خون مل لیا ۔ ایک سیاح جس نے وسطی بورنیو کا سفر کیا تھا ، بیان کرتا ہے :
''آس پاس بسنے والی خبیث روحوں سے زیادہ لوگ ان روحوں سے ڈرتے ہیں جو دور دراز ملکوں سے مسافروں کے ہم راہ آتی ہیں ۔ ۱۸۹۷ء کا

ذکر ہے کہ جب دریائے ماہاکم سے ایک جماعت بلواوکانیوں کے قبیلے میں مجھ سے ملنے آئی تو گھروں کے باہر جتنی عورتیں دکھائی دیتی تھیں سب نے پلی ہانی ڈنگ کی چھال کے گٹھے جلا رکھے تھے، جس کے بساندے دھوئیں سے روحیں بھاگ جاتی ہیں۔''

کرے واز جنوبی امریکہ کا سفر کرتے کرتے اپالیوں کے ایک گاؤں میں داخل ہوا۔ اسے وہاں پہنچے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ گاؤں والے کچھ سیاہ چیونٹے، جن کے کاٹے سے بڑی جلن ہوتی ہے، کھجور کے پتوں پر جمائے اس کے پاس پہنچے۔ پھر گاؤں کے چھوٹے بڑے، مرد عورتیں، سب اس کے سامنے آئے کہ وہ ان چیونٹوں کو ان کے چہروں، رانوں اور جسم کے دوسرے حصوں پر لگا لگا کر ان سے ان لوگوں کو ڈسوائے۔ کبھی کبھی یہ سیاح اپنے اس کام میں نرمی یا آہستگی سے کام لیتا تو وہ چیخ اٹھتے ''اور! اور!!'' اور جب تک چیونٹوں سے کٹوا کٹوا کر آتو نہ بن جاتے ان کی تسلی نہ ہوتی۔ اس رسم کا مقصد اس دستور سے واضح ہو جاتا ہے، جو ایمبونیا اور یولئیس میں جاری ہے، جس کے مطابق تیز قسم کے مسالے جیسی کٹی ہوئی ادرک یا لونگ بیماروں کے جسم پر برکی جاتی ہے تاکہ اس کی سوزش سے مرض کا بھوت بھاگ جائے۔ جاوا میں عرق النساء یا گٹھیا کا ایک عام علاج یہ ہے کہ مریض کی انگلیوں کے ناخنوں اور پاؤں کے انگوٹھوں میں ہسپانوی مرچ ملی جاتی ہے۔ خیال ہے کہ عرق النساء کا عارضہ اس مرچ کی تیزی کو برداشت نہیں کر سکتا اور اس سے بھاگ جاتا ہے۔ اسی طرح سلیوکوسٹ میں اگر کوئی بچہ بیمار ہو تو اس کی ماں بعض وقت یہ سمجھتی ہے کہ اس پر آسیب ہے، جسے اتارنے کے لیے وہ بچے کے جسم پر چیرے لگا کر ان میں ہری مرچ رکھ دیتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اس طرح آسیب کو تکلیف پہنچے گی اور وہ دور ہو جائے گا۔ بچہ غریب درد سے چیختا رہتا ہے، لیکن ماں اس خیال سے اپنا دل کڑا کر لیتی ہے کہ آسیب کو بھی اسی قدر تکلیف ہو رہی ہے۔

غالباً پردیسوں کا یہی خوف، نہ کہ ان کا احترام، بعض ان رسموں کا محرک ہوتا ہے، جو پردیسیوں کی آمد پر ادا کی جاتی ہیں اور جن کا

مقصد ظاہر نہیں کیا جاتا ۔ جزائر آنگ ٹانگ جاوا میں ، جہاں پولینیشیائی آباد ہیں ، مذہبی پیشواؤں یا جادوگروں کو بہ ظاہر بڑا اختیار حاصل ہے ۔ ان کا اصل کام حاضرات کرنا یا روحوں کا اثر زائل کرنا ہے تاکہ دکھ بیماری دور ہو ، موافق ہوائیں چلیں اور مچھلی کی وافر مقدار ہاتھ آئے ۔ جب پردیسی ان کے جزیروں پر اترتے ہیں تو سب سے پہلے جادوگر انہیں لینے کے لیے پہنچتے ہیں ۔ ان پر پانی چھڑکا جاتا ہے ، تیل ملا جاتا ہے اور اناسئے کے پتے لپیٹے جاتے ہیں ۔ ساتھ ہی چاروں طرف خاک اڑائی جاتی ہے اور چھڑکاؤ کیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد نو واردوں کی کشتی کی تازہ پتوں سے صفائی ہوتی ہے ۔ اس رسم کے بعد جادوگر سردار سے اجنبیوں کا تعارف کراتا ہے ۔ افغانستان اور ایران کے بعض حصوں میں ، قبل اس کے کہ مسافر کسی گاؤں میں داخل ہو ، اکثر جانور کی قربانی یا کھانے یا آگ اور عود و عنبر کی نذر کے ساتھ اس کا استقبال کیا جاتا ہے ۔ چناں چہ جب افغان باؤنڈری مشن افغانستان کے گاؤں میں سے گزرا تو اس کا عود و عنبر سے خیر مقدم کیا گیا ۔ بعض وقت کشتی بھر انگارا ''خوش آمدید!'' کہتے ہوئے مسافر کے گھوڑوں کے سموں کے نیچے ڈال دیا جاتا ہے ۔ امین پاشا وسطی افریقہ کے ایک گاؤں میں داخل ہوئے تو ان کا دو بکروں کی قربانی کے ساتھ استقبال کیا گیا ۔ ان بکروں کا خون راستے پر چھڑکا گیا اور اس پر سے چل کر گاؤں کا سردار امین کے سواگت کے لیے پہنچا ۔ بعض وقت لوگ پردیسیوں اور ان کے جادو سے اس قدر خائف ہوتے ہیں کہ ان کے استقبال پر کسی عنوان آمادہ نہیں ہوتے ۔ چناں چہ اسپیک (جان ہیننگ اسپیک ، انیسویں صدی کا ایک انگریز سیاح ، جس نے افریقی ممالک کا کھوج لگایا تھا) ایک گاؤں میں وارد ہوا تو اس کے باشندوں نے گھروں کے دروازے بند کر لیے ، ''کیوں کہ انھوں نے اس سے پہلے کبھی کسی سفید فام کو نہیں دیکھا تھا اور نہ ان ٹین کے ڈبوں کو جو سفید فام سیاح اپنے ساتھ لائے تھے ۔ وہ کہتے تھے ''کسے خبر جو وتوتا قزاق انھی ڈبوں کا روپ دھارے ان کی جان لینے آیا ہو؟ ، تمھیں داخلے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔'' ان کے آگے کوئی

دلیل کام نہ آئی اور سیاحوں کی جماعت کو وہاں سے دوسرے گاؤں کا رخ کرنا پڑا۔

پردیسیوں کا یہ خوف دو طرفہ ہوتا ہے۔ غیر ملک میں داخل ہوتے ہوئے وحشی یہ سمجھتا ہے کہ اس نے طلسمات میں قدم رکھا ہے اور وہاں کے باشندوں اور ان شیاطین سے بچنے کے لیے احتیاطی تدبیریں اختیار کرتا ہے، جنھوں نے اس مقام کو اپنا مرجع بنا رکھا ہو۔ چناں چہ ماوری کسی غیر ملک میں پہنچ کر بعض رسمیں ادا کیا کرتے تھے کہ اگر وہاں کی سر زمین 'مقدس' ہو تو اسے 'عام' بنایا جائے۔ جب بیرن مک لوکومیک لے (انیسویں صدی کا ایک روسی سیاح) نیوگنی کے ساحل میک لے کے قریب پہنچا تو ان دیسیوں میں سے ایک آدمی نے، جو اس کے ہمراہ تھے، ایک درخت کی ڈالی توڑی اور ایک طرف ہٹ کر کچھ دیر تک اس سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہتا گیا، پھر یکے بعد دیگرے قافلے کے تمام افراد کے پاس جا جا کر ان کی پیٹھوں پر کوئی چیز تھوکی اور اس ڈالی سے ان پر ضربیں لگائیں۔ آخر میں اس ڈالی کو جنگل کے سب سے گنجان حصے میں لے جا کر سوکھے پتوں کے تلے دبا آیا۔ ان دیسیوں کا عقیدہ تھا کہ اس رسم کی بدولت قافلہ آنے والے گاؤں میں ہر قسم کے مکر و فریب اور خطرے سے محفوظ رہے گا۔ غالباً خیال یہ تھا کہ مضر اثرات آدمیوں سے کھنچ کر ڈالی میں نفوذ کر گئے اور اس کے ساتھ قلب صحرا میں دفن ہو گئے۔ آسٹریلیا میں یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی غیر قبیلہ، جسے کسی ضلع میں بلایا گیا ہو، اس قبیلے کے پڑاؤ کے قریب پہنچتا ہے جو علاقے کا مالک ہو تو اس کے آدمی اپنے ہاتھوں میں جلتی ہوئی چھال یا لکڑیاں لے لیتے ہیں تاکہ بہ قول ان کے ہوا پاک ہو۔ جس وقت ٹوراڈجا دشمنوں کے سر لانے کی مہم پر نکلیں اور دشمن کے علاقے میں داخل ہوں تو وہ دشمن کے لگائے ہوئے کسی درخت کا پھل اور اس کے پالے ہوئے کسی جانور کا گوشت نہیں کھا سکتے ہیں، تاوقتیکہ وہ پہلے کوئی مکان جلا کر یا کسی آدمی کو مار کر جارحانہ کارروائی نہ کر لیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے اس ضابطے کی

خلاف ورزی کی تو ان کے اندر دشمن کا روحانی عنصر نفوذ کر جائے گا ، جس سے ان کے طلسم اپنا مخفی جوہر کھو دیں گے ۔

اس کے علاوہ ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ جو شخص سفر پر گیا ہوا ہو ، اس میں پردیسیوں کے ساتھ میل جول سے کسی مضر سحری اثر کے سرایت کر جانے کا امکان ہوتا ہے ۔ لہذا جب وہ گھر لوٹتا ہے تو جب تک چند رسوم کے ذریعے اس کا تزکیہ نہیں کر لیا جاتا ، وہ اپنے قبیلے اور دوست احباب میں دوبارہ گھل مل نہیں سکتا ۔ چناں چہ بکوان ''سفر سے واپسی پر اپنے سر منڈوا کر اور دوسری صورتوں سے اپنی صفائی یا تزکیہ کرتے ہیں کہ کہیں وہ اپنے ساتھ پردیسیوں کے سحر یا سفلی فن کا کوئی مضر اثر نہ لے آئے ہوں ۔'' مغربی افریقہ کے بعض حصوں میں جب کوئی آدمی طویل غیر حاضری کے بعد گھر لوٹتا ہے تو اپنی بیوی سے ملنے سے پہلے اس کو ایک خاص عرق سے غسل کرنا اور جادوگر سے اپنے ماتھے پر نشان لگوانا پڑتا ہے تاکہ اگر اس پر دوران سفر میں کسی غیر عورت نے کوئی جادو کیا ہو تو اس کا اثر زائل ہو جائے اور گاؤں کی عورت میں منتقل نہ ہونے پائے ۔ کسی راجا نے اپنے دو ہندو سفیر انگلستان بھیجے تھے ۔ جب وہ ہندوستان واپس ہوئے تو عام خیال کے موجب وہ پردیسیوں کی چھوت سے اس قدر نجس ہو چکے تھے کہ انھیں پھر سے پاک ہونے کے لیے دوبارہ جنم لینا ناگزیر ہو گیا ۔ ''نیا جنم لینے کے لیے یہ حکم ہے کہ زر خالص سے فطرت کی نسائی قوت کا ایک بت تیار کیا جائے اور جس شخص کو جنم دینا مقصود ہو ، اسے اس مجسمے میں بند کرکے اندام نہانی کے راستے کھینچ نکالا جائے ۔ چوں کہ صحیح ناپ کا ایسا مجسمہ جو زر خالص سے بنایا گیا ہو ، بہت مہنگا پڑے گا ، لہذا مقدس یونی کا بت تیار کرکے اس میں سے شخص مذکور کو گزارا جائے تو اس سے بھی یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے ۔'' چناں چہ راجا کے حکم سے کھرے سونے کا بت تیار کیا گیا اور اس میں سے مذکورۂ بالا سفیروں کو کھینچ کر انھیں نیا جنم دیا گیا ۔

جب پرجا کو پردیسیوں کے مفروضہ عمل سے بچانے کے لیے عموماً

اس قسم کی پیش بندیاں کی جاتی ہوں تو اسی خفیہ خطرے سے راجا کے حفظ ماتقدم کی خاطر خاص احتیاطی تدبیروں کا اختیار کیا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ از منۂ وسطیٰ میں ان ایلچیوں کو جو کسی خان تاتاری کے پاس بھیجے جاتے، دو الاؤں کے بیچ میں سے لے جایا جاتا اور اس طرح ان تحفوں کو بھی جو یہ ایلچی لے کے آتے۔ اس دستور کا سبب یہ بیان کیا جاتا تھا کہ آگ اس سفلی عمل کے اثر کو زائل کر دیتی ہے جو پردیسی بادشاہ پر کرنا چاہتے ہوں۔ جس وقت کالمبا (وادیٔ کانگو کا سب سے طاقت ور باشی لینجی سردار) کے محکوم سردار پہلی مرتبہ یا سرکشی کے بعد اپنے خدم و حشم کے ساتھ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں تو ان میں مرد و زن سب کو ایک ساتھ متواتر دو دن دو نالوں میں اشنان کرنا پڑتا ہے اور اس دوران میں انھیں راتیں بازار کے اندر آسمان کے نیچے گزارنی پڑتی ہیں۔ دوسرے اشنان کے بعد وہ مادر زاد ننگے کالمبا کے مکان کا رخ کرتے ہیں، جو ہر ایک کے سینے اور ماتھے پر ایک لمبا سا سفید نشان لگا دیتا ہے۔ پھر وہ بازار لوٹ کر کپڑے پہن لیتے ہیں۔ جس کے بعد انھیں ایک صبر آزما رسم سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس میں ہر اجنبی کی آنکھوں میں مرچ جھونکی جاتی ہے، جس کے ساتھ اسے اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرنا اور جو کچھ پوچھا جائے، بے کم و کاست بتا دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد وہ اجنبی جب تک چاہیں قصبے میں آزادی کے ساتھ قیام کر سکتے ہیں۔

(۲) خور و نوش پر امتناع: وحشی کے نزدیک کھانے پینے کے ساتھ خاص خطرہ وابستہ ہوتا ہے، اس لیے کہ ایسے میں روح منہ کے راستے خارج ہو سکتی ہے یا کسی ایسے دشمن کے سحر کے اثر سے جو اس وقت موجود ہو، کھینچ کر باہر آ سکتی ہے۔ سلیو کوسٹ کی ایو زبان بولنے والی قوموں میں ''یہ عقیدہ عام معلوم ہوتا ہے کہ روح منہ کے راستے جسم سے خارج اور اس میں داخل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اگر وہ کسی وقت غائب ہو تو آدمی کو اپنا منہ کھولنے میں احتیاط برتنی چاہیے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بے خانماں روح موقع پا کر اس کے جسم میں داخل ہو جائے۔ معلوم ہوتا

ہے کہ ان لوگوں کے خیال میں اس بات کا امکان سب سے زیادہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی کچھ کھا رہا ہو۔'' اس لیے ان خطرات کے خلاف پیش بندیاں کی جاتی ہیں۔ چناں چہ بیان کیا جاتا ہے کہ باتکوں کے نزدیک ''چوں کہ روح جسم کو چھوڑ سکتی ہے، لہذا وہ اس بات کی احتیاط رکھتے ہیں کہ جن موقعوں پر انھیں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہو، وہ حاضر رہے۔ لیکن اس کا روکنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ آدمی گھر میں رہے۔ ضیافتوں کے موقع پر مکان بالکل بند کر دیا جاتا ہے تاکہ روح رکی رہے اور ان نعمتوں سے لطف اندوز ہو جو اس کے آگے چنی جائیں۔'' مدغاسکر کے زافی مانیلو کھانا کھاتے وقت اپنے گھروں کے دروازوں میں تالے لگا لیتے ہیں اور انھیں کھاتے وقت کبھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ واروا اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ کھاتے پیتے وقت انھیں کوئی دیکھنے نہ پائے اور صنف مقابل کے خلاف یہ پیش بندی دگنی ہوتی ہے۔ ''میں نے دام دے کر تو ایک آدمی کو پیتے ہوئے دیکھ لیا، لیکن کسی مرد کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکا کہ وہ کسی عورت کو کچھ پی کر دکھائے۔'' جب انھیں کوئی مشروب پیش کیا جاتا ہے تو وہ عموماً یہ کہتے ہیں کہ وہ جب تک اسے پیتے رہیں، ان کے آگے اوٹ کر دی جائے۔

جہاں عام لوگ اس قسم کی معمولی احتیاطیں برتتے ہیں، وہاں بادشاہ غیر معمولی پیش بندیاں کرتے ہیں۔ شاہ لوانگو کو اگر کوئی شخص کھاتے یا پیتے وقت دیکھ لے تو اس کی سزا موت ہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ جس کمرے میں بیٹھا شراب پی رہا تھا، وہاں اس کا ایک چہیتا کتا گھس آیا، بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے وہیں مار دیا جائے۔ ایک دفعہ خود بادشاہ کے اپنے لڑکے نے، جس کی عمر بارہ یا چودہ سال تھی، بھولے سے کہیں اسے شراب پیتے دیکھ لیا۔ اس نے اسی وقت حکم دیا کہ شہزادے کو نفیس کپڑے پہنائے جائیں اور عمدہ کھانے کھلائے جائیں۔ جب یہ ہو چکا تو اس کے حکم سے شاہزادے کے چار ٹکڑے کیے گئے اور انھیں شہر میں گھماتے ہوئے یہ منادی کی گئی کہ اس لڑکے نے بادشاہ کو شراب پیتے دیکھ لیا تھا۔ ''جب بادشاہ کا پینے

کو جی چاہے تو ایک شخص ہاتھ میں گھنٹی لیے شراب کا پیالہ اس کے پاس لاتا ہے اور اسے بادشاہ کے ہاتھ میں تھماتے ہی منہ موڑ لیتا ہے اور گھنٹی بجا دیتا ہے ۔ اس پر حاضرین دربار اوندھے منہ زمین پر گر پڑتے ہیں اور جب تک بادشاہ شراب نوش جان کرتا رہتا ہے اسی طرح پڑے رہتے ہیں ۔ اس کے کھانے کا بھی کچھ یہی انداز ہے ۔ اس مقصد کے لیے ایک مکان مخصوص ہے ، جہاں اس کا خاصہ میز پر چن دیا جاتا ہے اور وہ دروازے بند کرکے اس پر جا بیٹھتا ہے ؛ پھر فارغ ہونے کے بعد دروازہ کھٹکھٹا کر باہر نکل آتا ہے ۔ اس طرح بادشاہ کو کبھی کوئی کھاتے یا پیتے ہوئے دیکھ نہیں پاتا ، کیوں کہ عام عقیدے کے بموجب اگر کسی نے ایسا کیا تو بادشاہ اسی دم مر جائے گا ۔'' اس کے دسترخوان کا بچا کھچا کھانا دفن کر دیا جاتا ہے ، جس کا مقصد بلا شبہ یہ ہے کہ وہ جادوگر کے ہاتھ نہ لگنے پائے اور وہ اس کے ذریعے بادشاہ پر اپنا مہلک جادو نہ کرنے پائے ۔ اس کا ہمسایہ شاہ کاکونگو بھی اسی قسم کے ضوابط کا پابند تھا ۔ اس بادشاہ کے متعلق خیال تھا کہ اگر اس کی رعایا کا کوئی فرد اسے کچھ پیتے وقت دیکھ لے تو اس کی موت واقع ہو جائے گی ۔ شاہ داہومی کو کھاتا کھاتے دیکھ لینا ایک سنگین جرم ہے ۔ خاص خاص موقعوں پر جب وہ جشن عام میں پیتا ہے تو پردے کے پیچھے چلا جاتا ہے یا اس کے چہرے پر رومالوں کی اوٹ کر دی جاتی ہے اور سب لوگ زمین پر اوندھے لیٹ جاتے ہیں ۔ وسطی افریقہ کی ریاست نبیورو کا بادشاہ دودھ پینے شیر خانے جاتا تو ہر شخص کو احاطۂ شاہی سے ہٹ جانا پڑتا اور عورتوں کو اپنے چہرے ڈھانک لینے پڑتے ۔ کوئی اسے پیتے وقت نہیں دیکھ سکتا تھا ۔ اس کی ایک خواص شیرخانے میں اس کے ساتھ جاتی اور اسے دودھ کا پیالہ پیش کرتی ، لیکن وہ جب تک دودھ نوش کرتا رہتا ، خواص اپنا منہ اس کی طرف سے پھیرے رہتی ۔

(۳) منہ دکھانے پر امتناع — مذکورۂ بالا بعض صورتوں میں سب سے الگ تھلگ ہو کر کھانے پینے کا مقصد روح کو نکلنے سے روکنے کی بجائے شاید یہ ہو کہ جسم میں مضر اثرات سرایت نہ کرنے

پائیں - پینے سے متعلق کانگو میں جو دستور جاری ہیں ان کی یقیناً یہی چیز محرک ہے - چناں چہ اس علاقے کے لوگوں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ''یہاں کا شاید ہی کوئی باشندہ ایسا ہو جو روحوں کو اڑانے کا عمل کیے بغیر کبھی کسی مشروب کا ایک جرعہ بھی حلق سے اتارتا ہو - کوئی پیتے میں گھنٹی بجاتا رہتا ہے ؛ کوئی دیک کر اپنا بایاں ہاتھ زمین پر رکھ لیتا ہے ، کوئی نقاب ڈال لیتا ہے ، کوئی گھاس کا پتا یا تنکا سر میں اڑس لیتا ہے یا اپنی پیشانی پر چکنی مٹی سے قشقہ کھینچ لیتا ہے - یہ سحری رسم گوناں گوں صورتیں اختیار کرتی ہے اور وحشی یہ کہہ کر اپنی تسلی کر لیتا ہے کہ وہ روحوں کو دفع کرنے کے نہایت مؤثر عمل ہیں -'' اس ملک میں بالعموم ہر سردار شراب کے ایک ایک گھونٹ پر گھنٹی بجاتا جاتا ہے اور ساتھ ہی ایک لڑکا جو اس کی پیشی میں رہتا ہے نیزہ گھماتا رہتا ہے ''تاکہ ان روحوں کو دور رکھا جائے جو شراب کے ساتھ کام و دھن کے راستے بوڑھے سردار کے جسم میں چپکے سے داخل ہونے کی کوشش کریں -'' سلاطین افریقہ کے ہاں جو چہروں کو ڈھانکنے کا دستور ہے ، اس کا مقصد بھی غالباً روحوں ہی سے بچنا ہے - سلطان دارفور سفید مسلن کا ڈھاٹا باندھے رہتا ہے ، جس کے بل منہ اور ناک کو ڈھانکتے ہوئے ماتھے تک چلے جاتے ہیں اور جس میں سے فقط اس کی آنکھیں جھانکتی رہتی ہیں - کہا جاتا ہے کہ افریقہ کے دوسرے حصوں میں بھی نقاب پوشی بادشاہوں کا ایک طرۂ امتیاز ہے - سلطان وادائی ہمیشہ پردے کی اوٹ میں سے بات چیت کرتا ہے اور اس کی صورت اس کے بے تکلف دوستوں اور چند مقربین خاص کے سوا کسی کو نہیں دکھائی دیتی -

**(۴) گھر چھوڑنے پر امتناع**—اسی قسم کی مزید پیش بندی کی بناء پر بعض وقت بادشاہوں کا اپنے محلات سے نکلنا ممنوع ہوتا ہے ، یا اگر انھیں اس کی اجازت ہو تو رعایا کو ان کے دیکھنے کی ممانعت ہوتی ہے - چناں چہ بینن کے پوجہان بادشاہ کو اپنے محل سے نکلنے کی اجازت نہ تھی - لوانگو کا بادشاہ تاج پوشی کے بعد اپنے محل میں محبوس ہوتا ہے - شاہ اونیتشا '' اپنے گھر سے نکل کر شہر

میں قدم نہیں رکھ سکتا ، تاوقتیکہ وہ دیوتاؤں پر انسان کی بھینٹ چڑھا کر انھیں راضی نہ کرلے ۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنی فرودگہ کی حدود سے باہر قدم نہیں نکال سکتا ۔'' بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا گھر سے نکلنا ایک ایسا سنگین جرم ہے ، جس کی سزا موت ہے یا جس کی پاداش میں اسے اپنے ایک یا ایک سے زائد غلاموں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے ، تاکہ انھیں اس کے سامنے قتل کیا جائے ، اور چوں کہ ملک کی دولت کا معیار غلاموں کی تعداد ہے ، لہٰذا بادشاہ اس قانون کا سخت پابند ہوتا ہے ۔ البتہ سال میں ایک مرتبہ یاموں کے جشن (فصلی جشن) میں اس بادشاہ کو اجازت ہے بلکہ اس کے لیے از روئے دستور ضروری ہے کہ وہ اپنے محل کی مٹی کی دیواروں کے باہر رقص کرے ۔ رقص میں اس کی کمر پر بھاری بوجھ ، عموماً مٹی کی ایک بوری لدی ہوتی ہے ، تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ ابھی اس میں سلطنت کا بار گراں سہارنے کی قوت باقی ہے ۔ اگر وہ یہ فرض پورا کرنے کے قابل نہ رہے تو اسے فوراً معزول کر دیا جاتا ہے ، بلکہ شاید سنگ سار بھی کیا جاتا ہے ۔ سلاطین حبشہ دیوتاؤں کی حیثیت سے پجا کرتے تھے ، لیکن انھیں بالعموم محلات میں بند رکھا جاتا تھا ۔ پونٹس کے کہستانی ساحل پر قدیم زمانے میں ایک غیر مہذب اور جنگ جو قوم رہتی تھی ، جس کا نام موزی نی یا موزی نوئیسی تھا ۔ دس ہزار فرنگیوں کا لشکر اپنی یادگار پسپائی پر اسی قوم کے کہستانی علاقے میں سے کوچ کرتا ہوا یورپ لوٹا تھا ۔ یہ وحشی اپنے بادشاہ کو ایک اونچی لاٹ کے اوپر سخت حراست میں رکھتے تھے ۔ اپنے انتخاب کے بعد اسے اس لاٹ سے اترنے کی قطعی اجازت نہ تھی ۔ وہیں سے وہ لوگوں کی داد رسی کرتا تھا ، لیکن اگر وہ انھیں ناراض کر دیتا تو دن بھر کے لیے اس کا دانہ پانی بند کر دیا جاتا ، بلکہ اسے بھوکوں مار دیا جاتا ۔ عرب کے ایک علاقے شبا (یمن) میں ، جہاں گرم مسالہ پیدا ہوتا ہے ، بادشاہوں کو اپنے محلات سے نکلنے کی اجازت نہ تھی ۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انھیں پتھراؤ کرکے مار ڈالا جاتا ۔ لیکن بالائے محل ایک دریچہ بنا ہوا تھا ، جس سے ایک زنجیر لٹکتی رہتی ۔ اگر کسی کو فریاد کرنی ہوتی تو وہ

آن کر اس زنجیر کو کھینچتا ؛ بادشاہ کو اس کی اطلاع ہو جاتی اور وہ داد خواہ کو اندر بلا کر اسے اپنا فیصلہ سناتا ۔

(۵) کھانا چھوڑنے پر امتناع—اس کے علاوہ آدمی پر اس کے پس خوردہ کے ذریعے سحر کرکے اسے گزند پہنچایا جا سکتا ہے ۔ مشارک سحر کے اصول کی بناء پر ، جو کھانا اس کے شکم میں ہو اور جو اس نے ہاتھ لگائے بغیر چھوڑ دیا ہو ، اس کے درمیان رشتۂ اشتراک موجود ہوتا ہے ، اور اس لیے اس پس ماندہ کھانے کو نقصان پہنچا کر کھانا کھانے والے شخص کو ضرر پہنچانا ممکن ہے ۔ جنوبی آسٹریلیا کی نارن یری قوم کا ہر بالغ فرد ایسے چوپایوں ، پرندوں اور مچھلی کی ہڈیوں کی تلاش میں لگا رہتا ہے ، جس کا گوشت کسی کے کھانے میں آیا ہو ، تاکہ وہ ان سے مہلک طلسم تیار کر سکے ۔ لہٰذا ہر شخص بڑی احتیاط سے اپنے کھائے ہوئے جانور کی ہڈیاں جلا ڈالتا ہے کہ کہیں وہ کسی جادوگر کے ہتے نہ چڑھ جائیں ۔ پھر بھی جادوگر کو ایسی کوئی نہ کوئی ہڈی مل ہی جاتی ہے ، جسے پا کر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اب اس مرد ، عورت یا بچے کی جان اس کی مٹھی میں ہے ، جس نے اس ہڈی والے جانور کا گوشت کھایا ہو ۔ اس طلسم سے کام لینے کے لیے وہ مچھلی کے تیل میں گیرو ملا کر اس کا پیسٹ تیار کرتا ہے اور اس پیسٹ کو کاڈ مچھلی کی آنکھ اور کسی مردے کے گوشت کے ٹکڑے میں لگاتا ہے ۔ پھر اس مرکب کا گولا سا بنا کر اسے ہڈی کے اوپر چپکا دیتا ہے اور اس طلسمی گولے میں مردہ جسم کے فساد کے اثر سے مہلک قوت پیدا کرنے کی غرض سے اسے کچھ دیر مردے کی گود میں رکھ چھوڑتا ہے ۔ اس کے بعد اسے لے جا کر آگ کے قریب زمین پر رکھ دیتا ہے ۔ جیسے جیسے وہ طلسمی مرکب پگھلتا جاتا ہے ، سحر زدہ شخص بیماری میں گھلنے لگتا ہے ۔ جب وہ سب کا سب پگھل جائے تو معمول مر جائے گا ۔ جس وقت شخص مذکور کو اس مہلک عمل کی خبر ہوتی ہے تو وہ جادوگر سے طلسمی ہڈی خریدنے کی کوشش کرتا ہے ، اور جو وہ اسے مل جائے تو اس کو تالاب یا دریا میں پھینک کر دفع سحر کر دیتا ہے ۔

جزائر نیو ہیبریڈیز کے ایک ٹاپو ٹانا میں لوگ اپنا اپنا پس خوردہ سمندر میں پھینک آتے ہیں تاکہ وہ مرض گروں کی دسترس سے باہر ہو ، کیوں کہ اگر کسی کی کھائی ہوئی چیز کا بچا کھچا حصہ ، جیسے کیلے کا چھلکا ، کسی مرض گر کو مل جائے تو وہ اسے اٹھا کر آہستہ آہستہ آگ پر جلا دیتا ہے ، جس کے جلنے کے ساتھ ساتھ اس کے کھانے والے کا جی بگڑنے لگتا ہے ، اور وہ مرض گر کو تحفے پیش کرتے ہوئے یہ کہلوا بھیجتا ہے کہ وہ کیلے کا چھلکا جلانے سے باز آ جائے۔ نیوگنی کے دیسی اس بات کی انتہائی احتیاط رکھتے ہیں کہ ان کی کھائی ہوئی چیزوں کے چھلکے اور پس خوردہ تلف ہونے سے نہ رہ جائے۔ انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ چیزیں دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائیں اور دشمن ان چیزوں سے کام لے کر ان کے کھانے والوں کو گزند نہ پہنچا دے۔ اسی لیے وہ اپنا جھوٹا یا تو جلا ڈالتے ہیں یا سمندر میں پھینک آتے ہیں۔ یا پھر اسے اس طرح ٹھکانے لگا دیتے ہیں کہ انھیں ضرر پہنچنے کا احتمال باقی نہ رہے۔

جادو کے اسی قسم کے خوف کی بناء پر کسی شخص کو شاہ لوانگو کا جھوٹا کھانے اور اس کے برتن میں پانی پینے کی اجازت نہیں۔ اس کا پس خوردہ ایک گڑھے میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں اہل روم انڈے اور گھونگے کھاتے ہی ان کے خول توڑ ڈالا کرتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی (انگریزوں کے ہاں) انڈے کھا کر ان کے خول توڑنے کا جو دستور ہے اس کے متعلق یہ سمجھنا شاید غلط نہ ہو کہ وہ اسی وہم کی بناء پر وجود میں آیا ہوگا۔

یہ خوف کہ آدمی کے بچے کھچے کھانے کی مدد سے اس پر جادو کیا جا سکتا ہے ، بے بنیاد سہی ، لیکن اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی بدولت بہت سے وحشیوں کو اپنا پس خوردہ تلف کرنے کی ترغیب ہو گئی ، جو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جاتا تو گل سڑ کر ان کی صحت واقعی تباہ کر دیتا۔ اس وہم سے وحشی کا حفظان صحت ہی نہیں ہوتا بلکہ عجیب بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کے ذہن پر یہ خوف چھایا ہوتا ہے ، جو لوگ عمل تسبیب کا یہ غلط تصور

قائم کیے رہتے ہیں ، ان کے درمیان ضمناً مہمان نوازی ، تعظیم و تکریم اور خوش اعتقادی کے اخلاقی رشتے استوار ہو جاتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اس کے چھوڑے ہوئے کھانے کے ذریعے نقصان پہنچانا چاہتا ہو تو خود اس کھانے میں شریک نہ ہوگا ، اس لیے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو مشارک سحر کے اصول کی رو سے اپنے شکار کے ساتھ آپ بھی اپنے دام میں آ جائے گا ۔ اسی تصور کی بناء پر مل جل کر کھانے پینے سے جو یگانگی پیدا ہوتی ہے ، اسے غیر ترقی یافتہ سماج میں ایک پاک اور متبرک رشتے کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے ۔ دو آدمی شریک طعام ہو کر ایک دوسرے کو اپنے اپنے رویے کی طرف سے مطمئن کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے کو اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ کوئی چالاکی نہیں کرے گا ، کیوں کہ دونوں کے شکموں میں مشترکہ کھانے کے کارن جو جسمانی رشتہ قائم ہو جاتا ہے ، اس کی بناء پر وہ اپنے ساتھی کو جو ضرر پہنچائے گا وہی خود اسے بھی پہنچ جائے گا ۔ تاہم محض منطقی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ رشتہ صرف اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک طرفین کے شکموں میں کھانا موجود رہے ۔ لہٰذا شریک طعام ہونے سے جو پیمان وفا بندھتا ہے ، وہ اس پیمان وفا سے زیادہ اہم اور دیر پا نہیں ہوتا ، جس کی بنیاد خون کے رشتے پر ہو ، اس لیے کہ خون کا اشتراک طرفین کو عمر بھر کے لیے آپس میں متحد کر دیتا ہے ۔

بیسواں باب

# اشخاص کی تحریم

## (۱) سرداروں اور بادشاہوں کی تحریم — ہم دیکھ آئے ہیں کہ میکاڈو کا خاصہ ہر روز نئے برتنوں میں پکا کرتا اور نئی ڈشوں میں چنا جاتا تھا اور کھانے پکانے کے یہ سب ظروف مٹی کے ہوتے تاکہ انہیں ایک مرتبہ استعمال کرنے کے بعد توڑا جا سکے، اور انہیں اس عقیدے کی بناء پر بالعموم توڑ دیا جاتا تھا کہ اگر آن میں کسی اور نے کھانا کھا لیا تو اس کا منہ اور گلا دونوں متورم ہو جائیں گے۔ میکاڈو کے کپڑوں کے متعلق بھی یہی خیال تھا کہ انہیں بادشاہ کی اجازت کے بغیر پہن لینے سے جسم سوج آتا اور دکھنے لگتا ہے۔ فجی میں اس مرض کو، جو عام خیال کے بموجب کسی سردار کی قابوں اور کپڑوں کے استعمال سے پیدا ہوتا، ایک خاص نام (کانالاما) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں ''جسم اور گلے پر ورم آ جاتا ہے اور سردار کے کپڑوں اور برتنوں کی بے حرمتی کرنے والا جان بر نہیں ہو سکتا۔ مجھے ایک شخص نے ایک نہایت نفیس چٹائی دی تھی، جس کے استعمال کی اسے جرأت نہیں تھی، اس لیے کہ اس پر تھاکو مباؤ کا بڑا لڑکا بیٹھ چکا تھا۔ لیکن عامیوں کا ایک خاندان یا قبیلہ ایسا بھی تھا جو اس خطرے سے مامون تھا۔ میں نے تھاکو مباؤ سے اس کا ذکر کیا، ''اوہ'' ہاں، اس نے کہا، ''او بھئی فلاں! فلاں! یہاں آنا، ذرا میری پیٹھ کھجا دینا۔'' اس نے اس کی تعمیل کی۔ یہ

شخص ان لوگوں میں سے تھا جو بے خوف سزا ایسا کر سکتے تھے۔'' وہ آدمی جنھیں یہ امتیاز حاصل تھا آنیڈوکانی، یا 'کثافت سردار' کہلاتے تھے۔

آن نقصانات میں جو میکاڈو اور فجی سردار کے برتنوں یا کپڑوں کے استعمال کا نتیجہ سمجھے جاتے تھے، ہمیں انسان دیوتا کے کردار کا وہ دوسرا رخ نظر آتا ہے جس کی طرف قارئین کی توجہ پہلے ہی مبذول کرائی جا چکی ہے۔ اُس کی مقدس ہستی باعث خیر و برکات بھی ہے اور باعث شر و آفات بھی۔ نہ صرف اس کی حفاظت ضروری ہے، بلکہ اس سے محفوظ رہنا بھی۔ اس کے جسم کے متبرک نظام میں جو اس قدر نازک ہوتا ہے کہ خفیف سے مس سے درہم برہم ہو جائے، گویا برق بار بھرا ہوتا ہے، جس کی سحری یا روحانی توانائی خارج ہو کر ہر اُس چیز کو ہلاک کر دیتی ہے، جو اس سے چھو جائے۔ لہٰذا انسان دیوتا کی علیحدگی دوسروں کی سلامتی کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی خود اس کی سلامتی کے لیے۔ اس کی محرمیت صحیح معنی میں متعدی ہوتی ہے۔ اس کی الوہیت ایک آگ ہے، جو قابو میں رہے تو بے شمار برکتوں کا باعث ہو، لیکن اندھا دھند چھو لی جائے یا قابو میں نہ رہ پائے تو جس چیز کو لگ جائے اسے بھسم کر ڈالے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ٹیبو کے تصور میں یہ چیز مقدر ہے کہ اس کی خلاف ورزی سے آفتیں نازل ہو جاتی ہیں، جیسے کوئی پاپی آگ کے قہار دیوتا کو چھولے اور وہ اسے وہیں پھونک کر رکھ دے۔

مثال کے طور پر نوبائی، جو مشرقی افریقہ میں جبل نوبا کے زرخیز اور سر سبز کہستان میں آباد ہیں، یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر وہ اپنے مقدس بادشاہ کے مکان میں قدم رکھیں تو مر جائیں گے۔ تاہم اس مداخلت بے جا کی سزا سے بچنا ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ مداخلت کا مرتکب اپنا بایاں شانہ ننگا کرکے اس پر بادشاہ کا دست مبارک رکھوا لے۔ نیز اگر کوئی شخص اس متبرک پتھر پر بیٹھ جائے جو بادشاہ نے اپنی نشست کے لیے مخصوص کر رکھا ہو تو ایسا

پاپی سال بھر سے زیادہ نہیں پنپ سکتا ۔ انگولا کے کازمبے قوم کے خیال میں اس کے بادشاہ کی ذات اس قدر مقدس ہے کہ اسے چھونے والا اس سحری توانائی سے ہلاک ہو جاتا ہے ، جو اس کی رگ و پے میں جاری و ساری ہے ۔ لیکن چوں کہ بعض وقت اسے چھوئے بغیر بھی چارہ نہیں ، لہذا ان لوگوں نے ایک ترکیب ایسی سوچ رکھی ہے جس سے پاپی کی جان بچ سکتی ہے ، یعنی وہ بادشاہ کے آگے گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے ہاتھ کی پشت سے بادشاہ کے ہاتھ کی پشت چھو لے اور پھر اس کی انگلیاں چٹخا دے ۔ اس کے بعد اپنی ہتھیلی بادشاہ کی ہتھیلی پر رکھ کر ایک مرتبہ پھر اس کی انگلیاں چٹخا دے ۔ اس عمل کو چار یا پانچ مرتبہ دہرانے سے موت کا خطرہ ٹل جاتا ہے ۔ ٹونگا والوں کا عقیدہ تھا کہ اگر کوئی سردار اپنے بالادست کے جسم یا اس کی کسی چیز کو ہاتھ لگا کر انھی ہاتھوں سے کھانا کھا لے تو اس کا جسم متورم ہو جائے گا اور وہ مر جائے گا ۔ سردار کا تقدس گویا ایک سم قاتل تھا ، جو چھوت سے ادنیٰ درجے کے آدمی کے ہاتھ میں لگ جاتا اور ان سے کھانے میں مل کر اپنا کام کر جاتا ۔ تاہم اگر کسی آدمی کے ہاتھوں میں یہ زہر سرایت کر جاتا تو وہ حسب ذیل رسم کے ذریعے اس کا توڑ کر لیتا تھا ۔ وہ یکے بعد دیگرے اپنی دونوں ہتھیلیوں اور ہاتھوں کی پشت سے بادشاہ کے تلوے کو چھوتا اور اس کے بعد اپنے ہاتھ پانی میں کھنگال لیتا ۔ اگر اس وقت پانی میسر نہ ہوتا تو کیلے کی رس بھری ٹہنی اپنے ہاتھوں پر رگڑ لیتا ۔ اس کے بعد وہ اس مہلک مرض کے حملے سے بے خوف ہو کر اپنے ہاتھوں سے کھانا کھا سکتا تھا ، جو حرام ہاتھوں سے کھانا کھانے کی وجہ سے پیدا ہو جایا کرتا تھا ۔ لیکن کفارہ یا دفع تعدیہ کی اس رسم کے ادا ہونے تک اگر اسے کھانے کی خواہش ہوتی تو اسے اس کے لیے کسی اور کی مدد لینی پڑتی یا گھٹنوں کے بل جھک کر کسی چوپائے کی طرح منہ مار مار کے کھانا پڑتا ۔ خلال تک بھی اسے اپنے منہ میں کسی دوسرے آدمی کو بتا بتا کر کرانی پڑتی ۔ یہ ٹونگائی اصل میں جگر کے ورم اور کسی خاص قسم کے کنٹھ مالا کا شکار رہتے تھے اور یہ سمجھتے تھے

کہ انھوں نے شاید بھولے سے کسی سردار یا اس کی چیزوں کو چھو لیا ہے ، جس کے کفارے کی مطلوبہ رسم ادا نہ کرنے کے سبب وہ اس مرض میں مبتلا ہوئے ہیں ۔ چناں چہ وہ یہ رسم اکثر حفظ ماتقدم کے طور پر ادا کر لیا کرتے تھے ۔ شاہ ٹونگا اس رسم میں اپنا حصہ ادا کرنے سے انکار نہیں کر سکتا تھا ۔ اسے ان لوگوں کو بے عذر اپنے پاؤں پیش کر دینے پڑتے ، جو اسے چھونے کی درخواست کرتے ، خواہ کسی وقت اسے ایسا کرنے میں تکلیف ہی کیوں نہ ہوتی ۔ ایک موٹا بادشاہ جس سے اپنا آپ نہیں سنبھلتا تھا ، جب کہیں باہر چہل قدمی کرتے وقت رعایا میں سے کچھ لوگوں کو اس مقصد سے اپنی طرف آتے دیکھ لیتا تو اکثر لشٹم پشٹم وہاں سے دور نکل جانے کی کوشش کرتا نظر آتا ، تاکہ ان غرض مند اور ضدی معتقدوں سے اپنا پنڈ چھڑائے ۔ اگر کسی شخص کو یہ وہم ہوتا کہ اس نے ٹیبو والے ہاتھوں سے کچھ کھا لیا ہے تو وہ سردار کے آگے جا بیٹھتا اور اس کا پاؤں لے کر اس سے اپنے پیٹ کو دباتا تاکہ اس کے اندر جو کھانا اتر گیا ہو وہ اسے نقصان نہ پہنچانے پائے اور وہ سوجن سے کہیں مر نہ جائے ۔ چوں کہ ٹونگا والوں کے نزدیک کنٹھ مالا ٹیبو والے ہاتھوں سے کھانا کھانے کا نتیجہ تھا ، اس لیے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ان میں جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہوتے تھے وہ اکثر بادشاہ کے پاؤں کے دباؤ سے اس کا علاج کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے ۔ ان کے اس طرز علاج اور انگریزوں کے اس دستور میں جو مشابہت پائی جاتی ہے وہ ظاہر ہے ، جس کے مطابق کنٹھ مالا کے مریض بادشاہ کے پاس اس غرض سے لائے جاتے تھے کہ وہ انھیں چھو کر شفا بخش دے ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف میں ، جیسا کہ اس سے پہلے میں کہیں اشارہ کر چکا ہوں ، کنٹھ مالا کو راج روگ یا شاہی مرض ٹونگائیوں کی طرح کے اس اعتقاد کی بناء پر کہا جاتا تھا کہ وہ تقدس مآب بادشاہوں کی چھوت سے لگتا بھی ہے اور اچھا بھی ہو جاتا ہے ۔

ٹونگا والوں کی طرح نیوزی لینڈ میں بھی لوگ سرداروں کی حرمت

سے اسی قدر خائف تھے ۔ ان کی روحانی قوت ، جس کا سرچشمہ ان کے کسی جد کی روح تھی ، جو ہر اس چیز کو متاثر کر دیتی جسے وہ چھولیتے اور جو کوئی اسے نادانستہ یا بے احتیاطی سے چھیڑ دیتا وہ اسے موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی ۔ ایک مرتبہ یہ ہوا کہ نیوزی لینڈ کے ایک سردار اعلیٰ نے جس کی بڑی حرمت تھی ، اپنا پس خوردہ سڑک کے کنارے چھوڑ دیا ۔ ایک تگڑا غلام جو بھوکا تھا ، سردار کے رخصت ہونے کے بعد وہاں پہنچا اور کچھ پوچھے بغیر وہ سارا کھانا چٹ کر گیا ۔ اتنے میں ایک دہشت زدہ شخص نے جو پاس ہی کہیں یہ تماشا دیکھ رہا تھا ، اس کو بتایا کہ اس نے بادشاہ کا جھوٹا کھا لیا ہے ۔ ''میں اس بد نصیب مجرم کو اچھی طرح جانتا تھا ؛ وہ بڑا جیالا آدمی تھا اور اس نے قبیلے کی لڑائیوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے'' لیکن ''اس منحوس خبر کے سنتے ہی اس کے پیٹ میں اینٹھن اور مروڑ کے شدید دورے شروع ہو گئے اور اسی دن سورج غروب ہونے تک اس کا کام تمام ہو گیا ۔ وہ بڑا تنو مند جوان تھا ، اگر آزاد خیال پکیہا (فرنگی) یہ کہتا کہ وہ سردار کی ٹاپو (انگریزی کا لفظ ٹیبو اسی کی بدلی ہوئی صورت ہے) جو چھوت سے کھانے میں منتقل ہوئی تھی تو اس کی بات بڑی حقارت سے سنی جاتی کہ وہ نرا جاہل اور ایک صریحی شہادت کو سمجھنے سے قاصر ہے ۔'' اس کی یہی ایک مثال نہیں بلکہ ایک ماوری عورت نے کہیں کوئی پھل کھا لیا اور اس کے بعد جب اسے پتا چلا کہ وہ پھل ایک ممنوعہ مقام سے آیا تھا تو وہ چیخ اٹھی کہ سردار کی روح ، جس کی اس طرح بے حرمتی ہوئی ہے اسے ہلاک کر ڈالے گی ۔ یہ قصہ دن میں سہ پہر کو پیش آیا اور دوسرے دن بارہ بجے تک وہ چل بسی ۔ ایک دفعہ ایک ماوری سردار کی سوختہ دانی (ڈبیا جس میں چقماق کو سوختہ پر رگڑ کر آگ پیدا کی جاتی ہے) کئی آدمیوں کی ہلاکت کا سبب بن گئی ۔ ہوا یہ کہ وہ سردار سے کہیں گم ہو گئی اور کچھ آدمیوں کے ہاتھ لگ گئی ، جو اس سے اپنے پائپ جلاتے رہے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس کا مالک کون ہے تو دہشت سے مر گئے ۔ اسی صورت سے ، نیوزی لینڈ کے کسی سردار اعلیٰ کے کپڑے

پھننے والا بھی ہلاک ہو جائے گا ۔ ایک عیسائی مبلغ نے کسی سردار کو دیکھا کہ اس نے ایک کمبل کو، جس کا بوجھ اس سے سنبھلتا نہ تھا، ایک ڈانگ سے نیچے پھینک دیا ۔ مبلغ مذکور نے اس سے کہا کہ اس نے اس کمبل کو اس طرح پھینکنے کی بجائے کسی درخت پر کیوں نہ رکھ دیا جو وہ کسی اور مسافر کے کام آ جاتا ۔ اس کا جواب اس سردار نے یہ دیا کہ ''اس نے کمبل کو ایسی جگہ پھینکا ہی اس لیے ہے کہ وہ کسی اور راہ گیر کے استعمال میں نہ آنے پائے ، کیوں کہ اگر کوئی اور اسے اوڑھ لیتا تو اس سردار کی ٹاپو (یعنی اس کی وہ روحانی قوت جو اس کے جسم سے کمبل میں سرایت کر گئی ہو اور کمبل سے آدمی میں منتقل ہو جائے) مقدم الذکر کو ہلاک کر دے گی ۔'' اسی سبب سے کوئی ماوری سردار آگ پھونکنے سے احتراز کرے گا ، کیوں کہ اس کے سانس کی حرمت آگ میں منتقل ہو جائے گی اور آگ کے ذریعے آگ پر رکھے ہوئے برتن میں ، برتن کے ذریعے برتن کے کھانے اور کھانے کے ذریعے کھانے والے آدمی کے جسم میں ۔ اس طرح کھانے ، برتن ، آگ اور سردار کی پھونک میں چھوت کا ایک ایسا رشتہ قائم ہو جاتا ہے کہ اس کھانے کا کھانے والا سردار کے سانس سے متاثر ہو کر مر جاتا ہے ۔

اس طرح پولینیشیائی نسل میں ، جس کے ماوری بھی ایک شاخ ہیں ، وہم نے ایک ایسا حصار باندھ رکھا ہے جو بے بنیاد ہونے کے ساتھ ساتھ اصلیت سے بھی خالی نہیں اور جس میں مداخلت کرنے والا اپنی خطا سے باخبر ہونے کے بعد پنپ نہیں سکتا ۔ تخیل کی یہ مہلک قوت ، جو وہم و دہشت کے ذریعے اپنا کام کرتی ہے ، کسی ایک نسل تک ہرگز محدود نہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری وحشی اقوام کی ایک عام خصوصیت ہے ۔ آسٹریلوی وحشی خفیف سا زخم لگنے سے مر جائے گا ؛ اسے بس اتنا معلوم ہو جائے کہ زخم اسے کسی دم کیے ہوئے ہتھیار سے لگا ہے ۔ اسی طرح برازیل کے بعض قدیم قبیلوں میں ''جب طلسم گر کسی ایسے شخص کی موت کی پیشین گوئی کر دیتا ہے ، جس سے اسے تکلیف پہنچی ہو تو وہ بد نصیب اسی وقت اپنے جھولن کھٹولے میں جا لیٹتا اور موت کے انتظار میں کھانا پینا سب چھوڑ

دیتا ۔ اس طرح پیشین گوئی میں جو سزا سنائی جاتی تقدیر اُس کی تعمیل کر دیتی ۔''

(۲) سوگوار اشخاص کی تحریم — اس طرح وحشی کے نزدیک اس کے بادشاہوں اور سرداروں کی مقدس ذات میں ایک ایسی پر اسرار روحانی قوت بھری ہوتی ہے کہ ہاتھ لگانے سے دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑے ، لہذا وہ قدرتی طور پر اپنے بادشاہوں اور سرداروں کا معاشرے کے خطرناک طبقوں میں شمار کرتا اور اُن پر وہی قدغنیں لگا دیتا ہے جو آدم کشوں ، حائض عورتوں اور دوسرے ایسے اشخاص پر لگی ہوتی ہیں ، جنھیں وہ خوف و دہشت کی نظر سے دیکھتا ہو ۔ مثلاً پولینیشیا کے مقدس بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں کے لیے کھانے کو ہاتھ لگانا ممنوع تھا اور اس لیے اُنھیں دوسروں کے ہاتھ سے کھانا کھانا پڑتا ۔ اور جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں ، عام آدمیوں کو اُن کے برتنوں ، کپڑوں اور دوسری چیزوں کے استعمال میں صحت اور جان کا خطرہ تھا ۔ اب بعینہ اسی قسم کی پابندیاں بعض وحشی اُن لڑکیوں پر ، جنھیں ماہواری کا پہلا خون آیا ہو ، زچاؤں ، مردم کشوں ، سوگوار لوگوں اور اُن تمام اشخاص پر عائد کرتے ہیں ، جنھوں نے کسی میت کو چھوا ہو ۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے ان آخرالذکر اشخاص کو لیجیے ۔ ماوریوں میں ہر اس شخص کا مقاطعہ کر دیا جاتا تھا ، جو کسی کے جنازے میں شریک ہوا ہو یا جس نے کسی مردے کی ہڈیوں کو چھوا ہو ، اور وہ سارے بنی نوع انسان کے لیے اچھوت قرار پاتا ۔ ایسے شخص کے قدم جس گھر میں چلے جاتے یا جس کسی کے ساتھ اس کا رابطہ ہوتا ، اُس پر آسیب کا اثر ہو جاتا ۔ وہ کھانے کو بھی اپنے ہاتھ نہیں لگا سکتا ، جو اس قدر ناپاک یا حرمت زدہ ہو جاتے کہ کسی کام کے نہ رہتے ۔ اُس کا کھانا لا کر زمین پر رکھ دیا جاتا ۔ وہ اُس کے آگے بیٹھ جاتا یا گھٹنوں کے بل جھک جاتا اور اس کے ہاتھ بڑی احتیاط سے پشت پر باندھ دیے جاتے ۔ اس کے بعد وہ اُس کھانے کو جس طرح بن پڑتا کھا لیتا ۔ بعض صورتوں میں ایسے شخص کو کوئی اور شخص کھانا کھلاتا ، جو

ہاتھ پھیلا کر کچھ اس طرح یہ کام انجام دیتا کہ مقدم‌الذکر کا جسم حرام اس سے چھونے نہ پاتا ۔ لیکن یہ کھانا کھلانے والا خود بھی بہت سی شدید قسم کی قیود کی پابندی پر مجبور ہوتا ، جو ان پابندیوں سے کچھ کم سخت نہ ہوتیں جو اصل ممنوعہ شخص پر عائد ہوتی تھیں ۔ تقریباً ہر بھرے گاؤں میں ایک ایسا مصیبت کا مارا حقیر و ذلیل آدمی ، ایک ایسا اسفل‌السافلین ، روٹی کے چند ٹکڑوں پر ماچھوں کی خدمت کرنے کے لیے موجود ہوتا ۔ چیتھڑوں میں لپٹا ، سر سے پاؤں تک گیرو اور شارک کا متعفن تیل ملے ، یہ بد نصیب ، جو عموماً ضعیف اور اکثر نیم پاگل سا ہوتا ، گاؤں کے شارع عام سے دور تمام دن بے حس و حرکت بیٹھا اپنی اداس آنکھیں گاڑے بڑی حسرت سے لوگوں کی چہل پہل کو تکتا نظر آتا ۔ بھیک کے چند ٹکڑے دن میں دو دفعہ اس کے سامنے زمین پر ڈال دیے جاتے کہ وہ انھیں ہاتھ لگائے بغیر جس طرح بن پڑے کھا لے اور رات کو وہ اپنے میلے چیکٹ چیتھڑے سمیٹ کر رینگتا گھسٹتا پتوں یا کوڑے کے کسی بھٹ میں ، جہاں گندگی ، سردی اور بھوک میں بھوت پریت کے خواب دیکھتا ، کچھ سو کر اور کچھ جاگ کر مصیبت کی رات کاٹ دیتا ، جو آنے والے مصیبت کے دن کی تمہید ہوتی ۔ یہی وہ ایک آدمی کا بچہ تھا جس کے ساتھ اس شخص کو ربط ضبط رکھنے کی اجازت تھی جس نے کسی دنیا سے گزرنے والے کی آخری خدمت انجام دی ہو اور اسے اپنا خراج عقیدت پیش کیا ہو اور جب اس شخص کی یہ قید تنہائی ختم ہو جاتی اور وہ ایک دفعہ پھر اپنے ساتھیوں میں اٹھنے بیٹھنے لگتا تو وہ سارے برتن جو اس نے اس دوران میں استعمال کیے ہوں ، چن چن کر مسمار کر دیے جاتے اور وہ سارے کپڑے جن سے اس نے اپنا تن ڈھانکا ہو ، نہایت احتیاط سے پھینک دیے جاتے کہ اس کی نجاست دوسروں میں نہ پھیلنے پائے ، جیسا کہ اسی سبب سے مقدس بادشاہوں کے برتن اور کپڑے تلف کر دیے جاتے ہیں یا پھینک دیے جاتے ہیں ۔ اس لحاظ سے وحشی کو دیوتاؤں اور سورگ باشیوں ، تقدس کی مہلک اور مردہ جسم کی بساند میں پوری پوری مطابقت نظر آتی ہے ۔

مردوں کو چھونے والے اشخاص کے لیے کھانے کو ہاتھ لگانے کی ممانعت ساری پولینیشیائی اقوام میں عام رہی ہوگی ۔ چناں چہ سموا میں ''جو لوگ شریک جنازہ ہوتے تھے ، اس بات کی سخت احتیاط رکھتے کہ کھانے کو ان کے ہاتھ نہ لگنے پائیں اور وہ کئی کئی دن دوسروں کے ہاتھ سے اس طرح کھانا کھاتے جیسے شیر خوار بچے ہوں ۔ خیال تھا کہ اس ضابطے کی خلاف ورزی کرنے والوں کو لھریلو دیوتا گنجا اور پوپلا کر دیتا ہے ۔'' نیز ٹونگا میں ''جو شخص کسی سردار کی میت کو ہاتھ لگاتا ہے ، دس قمری مہینوں تک اچھوت ہو جاتا ہے ، البتہ سرداروں کے لیے یہ مدت متوفی سردار کے تقدم کے لحاظ سے تین ، چار یا پانچ مہینے ہے ، لیکن ٹوئی ٹونگا (مقدس سردار اعلیٰ) کی میت کو چھونے کے بعد بڑے سے بڑے سردار پر بھی دس مہینے کے لیے ٹیبو لگ جاتا ہے ۔ کوئی شخص دوران تحریم میں اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھا سکتا اور اسے اس کے لیے کسی اور کی مدد لینی پڑتی ہے ، یہاں تک کہ خلال بھی دوسرے کے ہاتھ سے کرانی پڑتی ہے ۔ اگر اسے بھوک لگی ہو اور اس وقت کوئی کھانا کھلانے والا موجود نہ ہو تو اسے ہاتھ اور پاؤں ٹیک کر منہ سے کھانا اٹھا اٹھا کر کھانا پڑتا ہے اور اگر وہ ان میں سے کسی اصول سے انحراف کر جائے تو لوگوں کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا جسم سوج جائے گا اور وہ جان بر نہ ہو سکے گا ۔''

برٹش کولمبیا کے شسواپوں میں جو عورتیں اپنے شوہروں اور مرد اپنی بیویوں کے سوگ میں ہوں ، ان کا مقاطعہ کر دیا جاتا ہے ، اور خود انھیں اپنے سر یا بدن کے کسی حصے کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی ۔ انھیں کسی کھاڑی کے کنارے پسینہ خارج کرنے کے لیے ایک کٹیا بنانی پڑتی ہے ، جہاں رات رات بھر پسینہ بہا کر بلا ناغہ نہانا اور اس کے بعد صنوبر کی ڈالیوں سے اپنے جسم کو رگڑنا پڑتا ہے ۔ یہ ڈالیاں صرف ایک مرتبہ استعمال کی جا سکتی ہیں ، جس کے بعد انھیں کٹیا کے اطراف نصب کر دیا جاتا ہے ۔ شکاری ان سوگوار لوگوں کو منحوس سمجھتے ہیں اور ان سے دور رہتے ہیں ۔ اگر ان کا سایہ کسی

پر پڑ جائے تو وہ بیمار ہو جائے ۔ وہ خار دار جھاڑیوں کا تکیہ اور بستر بنا کر سوتے ہیں تاکہ متوفی کی روح ان کے نزدیک نہ آنے پائے ۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بستر کے چاروں طرف بھی کانٹیاں بچھا لیتے ہیں ۔ اس آخری احتیاط سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ خطرہ کیا ہے جس کے باعث اس قسم کے لوگوں کا مقاطعہ کیا جاتا ہے ۔ اصل میں وہ محض مرنے والے کی روح کا ڈر ہے جو عام خیال کے بموجب ان کے گرد منڈلاتی رہتی ہے ۔ برطانوی نیوگنی کے ضلع میکو میں اگر کسی آدمی کی بیوی مر جائے تو وہ اپنے سارے سول حقوق سے محروم اور برادری سے خارج ہو جاتا ہے اور لوگوں کے لیے ایک ہوا بن جاتا ہے ۔ وہ نہ کسی باغ کی کاشت کر سکتا ہے ، نہ لوگوں کو اپنا منہ دکھا سکتا ہے ، نہ گاؤں سے گزر سکتا ہے اور نہ عام سڑکوں پر چل سکتا ہے ۔ اسے کسی جنگلی چوپائے کی طرح اونچی اونچی گھاس یا جھاڑیوں میں دبکا رہنا پڑتا ہے ۔ اگر اسے کوئی اپنی طرف آتا دکھائی دے یا کسی کی آہٹ محسوس ہو ، خاص کر کسی عورت کی ، تو قاعدے کی رو سے اسے کسی درخت یا گھنی جھاڑی کے پیچھے جا چھپنا چاہیے ۔ اگر وہ شکار کرنا یا مچھلی پکڑنا چاہے تو تن تنہا رات کی تاریکی میں نکلنا چاہیے ۔ اگر وہ کسی مسیحی مبلغ سے بھی مشورہ کرتا ہے تو رات کو چوری چھپے کرتا ہے ۔ وہ اس قدر آہستہ آہستہ بولتا ہے کہ گویا س کی آواز جاتی رہی ہو ۔ اگر وہ مچھیروں یا شکاریوں کے ساتھ ہو جائے تو اس کی نحوست سے ان لوگوں کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے ، اس لیے کہ شکار اس کی بیوی کے پریت سے ڈر کر بھاگ جاتا ہے ۔ وہ جہاں کہیں جاتا ہے اپنے تبر سے مسلح ہو کر جاتا ہے تاکہ نہ صرف جنگلی سوروں سے اپنا بچاؤ کر سکے بلکہ اپنی متوفی بیوی کے خوفناک پریت سے بھی ، جو موقع پا کر اسے نقصان پہنچا سکتا ہے ، کیوں کہ تمام مردوں کی روحیں آزار رساں ہوتی ہیں اور انہیں زندوں کو نقصان پہنچانے میں مزہ آتا ہے ۔

## (۳) ماہواری اور زچگی کے ایام میں عورتوں کی تحریم

— ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام طور پر بعض آدمیوں کے کپڑوں ، برتنوں

وغیرہ کے استعمال پر امتناع اور اس امتناع کی خلاف ورزی کے منروضہ نتائج تمام صورتوں میں یکساں ہوتے ہیں ، بلا لحاظ اس کے کہ ممنوعہ چیزیں جن اشخاص کی ملکیت ہوں وہ پاک اور مقدس ہوں یا گندے اور نجس ۔ کسی مقدس بادشاہ کے استعمال شدہ کپڑوں کی طرح ان کپڑوں کو بھی ہاتھ لگانا ہلاکت کا باعث سمجھا جاتا ہے ، جنھیں کسی حائض عورت نے چھوا ہو ۔ ایک آسٹریلوی وحشی کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے کمبل پر اس کی بیوی ایام ماہواری میں لیٹ گئی تھی تو اس نے اسے مار ڈالا اور خود بھی مارے دہشت کے پندرہ دن کے اندر اندر مرگیا ۔ اسی لیے آسٹریلوی عورتوں کا ان ایام میں ایسی چیزوں کو چھو لینا جو مرد استعمال کرتے ہوں یا ان راستوں پر چلنا جن سے مرد گزرتے ہوں ایک سنگین جرم اور اس کی سزا موت ہے ۔ زچگی میں بھی ان سے گریز کیا جاتا ہے اور اس دوران میں ان کے استعمال کردہ سارے برتن جلا دیے جاتے ہیں ۔ یوگنڈا میں حائضہ یا زچہ اس قدر نجس خیال کی جاتی ہے کہ وہ جس برتن کو چھولے اسے تلف کر دینا ضروری ہے ، البتہ اس کے چھوٹے ہوئے نیزوں کو تلف کرنے کی بجائے صرف پاک کر لینا کافی ہے ۔ ''ڈے نے نامی ساری قوم نیز دوسرے بیشتر امریکی قبیلوں میں حائض عورت سے زیادہ نجس کوئی نہیں ۔ کسی لڑکی میں جوں ہی ماہواری کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں ، اسے علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور عورتوں کے سوا کسی کے ساتھ میل جول کی اجازت نہیں ہوتی ۔ اسے ایک کٹیا میں گاؤں والوں اور خانہ بدوش مردوں کی نظروں سے دور اکیلا رہنا پڑتا ہے ۔ جب تک وہ اس مخدوش حالت میں ہو ، اسے مردوں کی تمام چیزوں یا شکار کیے ہوئے ہرن اور جانور کے گوشت کو ہاتھ لگانے سے احتراز کرنا پڑتا ہے کہ کہیں اس کی چھوت سے وہ چیزیں یا گوشت ناپاک نہ ہو جائے اور شکار اپنی اس تحقیر سے ناراض ہو کر شکاریوں کو مایوس نہ کر دے ۔ کھانے میں اسے خشک مچھلی کے سوا کچھ نہ ملتا اور پینے کے لیے صرف ٹھنڈا پانی ، جسے وہ ایک نلکی کے ذریعہ چوس لیتی ۔ اس کے علاوہ چوں کہ برادری کے لیے اس کا نظر آ جانا بھی خطرناک تھا ، لہذا ماہواری

کے بعد بھی کچھ دن تک وہ ایک خاص قسم کی چرمی ٹوپی پہنے رہتی جس کے کنارے اس کے منہ سے لے کر سینے تک لٹکتے رہتے تاکہ وہ لوگوں کو دکھائی نہ دے۔'' کوسٹا ریکا (جنوب وسطی امریکہ) کے بری بری نامی قوم میں حائضہ کو ناپاک سمجھا جاتا ہے۔ وہ کھانے کے لیے برتن استعمال نہیں کر سکتی اور صرف کیلے کے پتوں میں کھانا کھاتی ہے، جنھیں استعمال کرنے کے بعد کسی کونے کھدرے میں پھینک آتی ہے، اس لیے کہ اگر ان پتوں کو کوئی گائے کھا لے تو گھل گھل کر مر جائے گی اور کچھ اسی وجہ سے اس کے پانی کا برتن بھی الگ ہوتا ہے، کیوں کہ اگر اس کے جھوٹے پیالے کو کوئی اور استعمال کر لے تو اس کی موت یقینی ہے۔

بہت سی قوموں میں عورتوں پر اسی قسم کی پابندیاں بہ ظاہر کچھ ایسے ہی اسباب کی بناء پر زچگی کے ایام میں بھی عاید ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں ان کی حالت مخدوش اور متعدی سمجھی جاتی ہے، لہذا جب تک ان کی صحت اور طاقت بحال نہیں ہو جاتی اور خیالی خطرہ ٹل نہیں جاتا، انھیں قرنطینہ میں رکھا جاتا ہے۔ چناں چہ تاہیتی (ایک جزیرہ جو بحرالکاہل میں واقع ہے) میں عورت کو زچگی کے بعد پندرہ دن یا تین ہفتے تک سب سے الگ ایک جھونپڑی میں رکھا جاتا تھا، جو عارضی طور پر مقدس قطعۂ زمین پر بنائی جاتی۔ ان ایام علیحدگی میں اسے اشیائے خور و نوش کو ہاتھ لگانے کی ممانعت تھی اور اسے کسی اور کے ہاتھ سے کھانا کھانا پڑتا تھا۔ نیز اس دوران میں کوئی اور شخص بچے کو چھو لیتا تو اس پر بھی زچہ کی رسم تطہیر تک وہی قدغنیں لگ جاتیں۔ اسی طرح الاسکا سے پرے جزیرۂ کاڈیاک میں وہ عورت جس کی زچگی ہونے والی ہو، سرکنڈوں کی ایک کٹیا میں چلی جاتی ہے جہاں اسے اپنی زچگی کے بعد بیس دن تک رہنا پڑتا ہے اور وہ اس قدر نجس سمجھی جاتی ہے کہ اسے کوئی نہیں چھوتا اور کھانا بھی لکڑیوں پر رکھ کر دیا جاتا ہے۔ بری بری زچہ کے بستر کی غلاظت کو حیض سے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں۔ جب کوئی عورت یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی زچگی کے دن قریب آ گئے ہیں تو وہ اپنے شوہر

کو اس سے آگاہ کرتی ہے ۔ وہ جلدی سے اس کے لیے ایک ویران مقام پر جھونپڑی ڈال دیتا ہے ۔ یہاں اسے اکیلے رہنا پڑتا ہے اور اپنی ماں یا کسی اور عورت کے سوا اس کا کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا ۔ زچگی کے بعد طلسم گر اس پر دم کرکے اور کوئی جانور ڈال کے اسے پاک کرتا ہے ۔ لیکن اس رسم سے بھی اس کی حالت میں بس اتنا فرق پڑتا ہے کہ اس کی نجاست کم ہو کر حائض عورت کے برابر رہ جاتی ہے اور پورے ایک قمری مہینے تک اس کو خور و نوش کے متعلق ان تمام ضوابط کی پابندی کے ساتھ ، جو ایام ماہواری میں اس پر عائد ہوتے ہوں ، اپنے گھر والوں سے علیحدہ رہنا پڑتا ہے ۔ اگر اس کا حمل ساقط ہو جائے یا اس کے ہاں مرا ہوا بچہ پیدا ہو تو اس کی نجاست اور بھی مہلک تصور کی جاتی ہے ۔ ایسی صورت میں وہ کسی زندہ آدمی کے قریب نہیں پھٹک سکتی ۔ کسی کا فقط ان چیزوں کو چھو لینا بھی جو ایسی عورت کے استعمال میں رہی ہوں ، انتہا درجے خطرناک ہوتا ہے ۔ اس کا کھانا ایک لمبی سی لکڑی پر رکھ کر اسے پہنچایا جاتا ہے ۔ اس کا سلسلہ عموماً تین ہفتے تک جاری رہتا ہے ، جس کے بعد گھر جا سکتی ہے لیکن وہاں بھی اسے انہیں پابندیوں میں رہنا پڑتا ہے ، جو زچگی کی معمولی صورت میں ضروری ہوں ۔

بعض بانتو قبیلے اس عورت کی چھوت کو اس سے بھی زیادہ ہلاکت خیز سمجھتے ہیں جس نے اپنے اسقاط حمل کو چھپایا ہو ۔ ایک مبصر جسے ان لوگوں کا بڑا تجربہ ہے ، بیان کرتا ہے کہ ''مشرقی افریقہ والوں کی نظر میں زچگی کا خون ماہو ری سے بھی زیادہ نجس اور خطرناک ہے ۔ شوہر کا اپنی بیوی کے ایام زچگی میں آٹھ دن تک اس کے زچہ خانے کی جھونپڑی میں داخل ہونا ممنوع ہے ۔ اس کا سبب زیادہ تر یہ خوف ہے کہ کہیں بیوی کے جسم سے نکلنے والی رطوبت اس کے نہ لگ جائے ۔ وہ اپنے بچے کو اس کی پیدائش کے پہلے تین مہینے تک گود میں لینے کی جرأت نہیں کر سکتا ۔ لیکن خاص طور پر اسقاط حمل کی ریزش ، بالخصوص ایسے اسقاط حمل کی ریزش جسے پوشیدہ رکھا گیا ہو ، بڑی وحشت خیز ہوتی ہے ۔ ایسی صورت میں

نہ صرف ایک مرد کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے یا وہ ہلاک ہو جاتا ہے بلکہ سارا ملک یہاں تک کہ آسمان بھی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ گویا تلازم خیالات کے کرشمے سے عضویاتی نوعیت کا ایک واقعہ سارے منسار میں ہل چل مچا دیتا ہے ۔'' اسقاط حمل کے سبب سارے ملک پر جو آفت نازل ہوتی ہے اس کے بارے میں باپیڈی قبیلے کے ایک نیرنگ ساز اور بارش گر کے الفاظ پیش کرتا ہوں :

''کسی عورت کا حمل ساقط ہونا ، اس کا اس طرح خون بہانا اور بچے کو چھپا دینا اس بات کے لیے کافی ہے کہ سارے ملک میں لو کے جھکڑ چلنے لگیں اور وہ ملک گرمی سے تپ جائے ۔ اس کی وجہ سے بارش رک جاتی ہے ، کیوں کہ ملک کا نظم درہم برہم ہو جاتا ہے ۔ بارش کو اس جگہ آنے کی جرأت نہیں ہوتی جہاں ایسی عورت کا خون گرا ہو ، او وہ مارے خوف کے اس جگہ سے دور ہی دور رہتی ہے ۔ ایسی عورت ایک سنگین جرم کی مرتکب ہوتی ہے ۔ وہ سردار کے ملک کو اپنا ایسا خون چھپا کر خراب کر دیتی ہے جس نے جم کر ابھی آدمی کی شکل اختیار نہ کی ہو ، اس کا خون حرام ہوتا ہے جسے سڑک پر کبھی نہیں ٹپکنا چاہیے ۔ سردار اپنے آدمیوں کو جمع کرکے کہتا ہے 'کیا تم لوگ اپنے گاؤں میں چین سے ہو؟' ان میں سے کوئی یہ جواب دیتا ہے 'فلاں فلاں عورت کے حمل تھا ، ہم نے ابھی تک اس کے بچے کو نہیں دیکھا ۔' پھر وہ سب جا کر اس عورت کو گرفتار کر لیتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں 'بتا تو نے اسے کہاں چھپا ہے؟' پھر وہ بچے کے مدفن کی کھدائی کرکے دو قسم کی جڑیوں کا جوشاندہ جو ایک خاص برتن میں تیار کیا جاتا ہے ، اس گڑھے کے اندر چھڑکتے ہیں ، اور اس کی تھوڑی سی مٹی لے جا کر دریا میں پھینک دیتے ہیں اور وہاں سے پانی لا کر اس مقام پر چھڑکتے ہیں جہاں اس عورت نے اپنا خون گرایا ہو ۔ خود عورت کو بھی اس عرق سے اپنی صفائی کرنی پڑتی ہے ۔ اس کے بعد

ملک بھر میں بارش ہونے لگے گی ۔ اس کے علاوہ ہم (طلسم گر) ملک کی عورتوں کو بلا کر ان سے کہتے ہیں کہ مٹی میں اس عورت کا خون ملا کر اس کا ایک گولا بنائیں ۔ وہ ایک دن صبح یہ گولا تیار کرکے لاتی ہیں ۔ اگر ہم ایسا طلسم تیار کرنا چاہیں ، جس سے سارے ملک میں ترشح ہونے لگے تو ہم اس گولے کو پیس کر اس کا سفوف بنا لیتے ہیں ۔ اس کے بعد پانچویں دن ہم ننھے ننھے لڑکوں اور ایسی لڑکیوں کو باہر بھیج دیتے ہیں جو نسائی باتوں سے ابھی بالکل نا آشنا ہوں اور جنھیں مردوں سے ابھی واسطہ نہ پڑا ہو ۔ پھر اس دوا کو بیلوں کے سینگوں میں ڈال دیتے ہیں اور یہ بچے تمام گھاٹوں اور ملک کے تمام راستوں پر پہنچتے ہیں ۔ ایک ننھی اپنی کدال سے مٹی کھودتی ہے اور دوسرے بچے سینگ میں ایک ٹہنی ڈال ڈال کر اس کے اندر مٹی چھڑکتے اور 'بارش! بارش!' کے نعرے لگاتے جاتے ہیں ۔ اس صورت سے ہم اس مصیبت کو دور کر دیتے ہیں جو ایسی عورت ملک کے راستوں پر لاتی ہے ۔ اس کار روائی کے بعد ملک کی نجاست اور بارش کی رکاوٹ دور ہو جائے گی ۔''

(۴) سپاہیوں کی تحریم ۔ نیز وحشی کے نزدیک جنگ کے دوران میں سپاہی جس فضا میں حرکت کرتے ہیں وہ گویا روحانی خطرات سے معمور ہوتی ہے ، جن کے سبب ان پر طرح طرح کی لایعنی پابندیاں عاید ہو جاتی ہیں ۔ یہ پابندیاں اپنی نوعیت کے لحاظ سے ان معقول حفاظتی تدبیروں سے مختلف ہوتی ہیں ، جو قدرتی طور پر وہ اپنے جانی دشمنوں کے خلاف اختیار کرتے ہوں ۔ اس قسم کی پابندیوں کا عام نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سپاہی فتح سے قبل اور فتح کے بعد بھی دوسروں سے کٹا رہتا ہے یا ایسے روحانی قرنطینہ میں ہوتا ہے ، جو وحشی اپنے انسان دیوتاؤں اور دوسرے مخدوش اشخاص پر عاید کیا کرتے ہیں ۔ چناں چہ جب ماوری لڑائی پر جاتے تھے تو انھیں

انتہائی حرمت حاصل ہو جاتی تھی ۔ انہیں اور ان کے لوگوں کو جو گھر پر رہ گئے ہوں ، روزمرہ کے بے شمار امتناعوں کے علاوہ بعض عجیب و غریب قواعد کی سخت پابندی کرنی پڑتی ۔ وہ اہل یورپ ، جن کو پرانی لڑائیوں کے زمانے میں ان سے واسطہ پڑتا تھا ، ان کی اس قید و بند کی حالت کو ''تحریمی غلو'' سے تعبیر کرتے تھے ۔ ان کی مہم کے سالار تک تو کسی کی بھی رسائی ممکن نہ تھی ؛ اسی صورت سے جب بنی اسرائیل جنگ کے لیے کوچ کرتے تو وہ لڑائی کے دوران میں ماوریوں اور آسٹریلوی وحشیوں کے سے پاکیزگی کے چند ضوابط کے پابند ہوتے ۔ ان کے استعمال کے برتن مقدس ہو جاتے ، انہیں مجاہدۂ نفس کرنا پڑتا اور وہ ذاتی صفائی کے ایک دستور کے پابند ہو جاتے ۔ اس دستور کا اصل محرک اسی قبیل کے اس دستور کے صریحی مقصد کے پیش نظر جس پر وحشی بالعموم کاربند ہوتے ہیں ، یہ خوف تھا کہ کہیں ان کا فضلہ دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے اور وہ اس کے ذریعے جادو کرکے انہیں تباہ نہ کر ڈالے ۔ شمالی امریکہ کے بعض قبیلوں میں کسی نوجوان سپاہی کو اپنی پہلی لڑائی میں چند رسمی ضوابط کی پابندی کرنی پڑتی تھی ، جن میں دو ضابطے وہی کچھ تھے جو انہی امریکیوں کے ہاں لڑکیوں پر پہلی ماہواری میں عائد ہوتے ۔ اس سپاہی کے کھانے پینے کے برتنوں کو کوئی نہیں چھو سکتا تھا اور اس کے لیے اپنے ناخنوں سے سر یا جسم کے کسی اور حصے کو کھجانا ممنوع تھا ۔ اگر اس سے کھجائے بغیر نہ رہا جاتا تو لکڑی استعمال کرنی پڑتی ۔ اس دستور کی بنیاد ، اس قاعدے کی طرح جس کی رو سے کسی ممنوعہ شخص کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھانے کی ممانعت ہے حرام ہاتھوں کی مفروضہ حرمت یا نجاست پر ہے ۔ نیز ، انہی امریکی قبیلوں میں ان مردوں کو لڑائی کی مہم کے دوران میں ہمیشہ اپنے ملک کی سمت کروٹ لے کر سونا پڑتا تھا ۔ اس طرح سونے میں انہیں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہوتی ، وہ دوسری طرف کروٹ نہیں لے سکتے تھے ۔ انہیں ننگی زمین پر بیٹھنے اور اپنے پاؤں گیلے کرنے کی ممانعت تھی ، اور جہاں تک ممکن ہوتا کسی بٹیا سے بچ کر چلنا پڑتا ،

اور اگر انھیں مجبوراً کسی بڑیا پر سے چلنا ھی پڑ جاتا تو وہ اپنی ٹانگوں پر بعض نیر نجات لگا کر اس کا توڑ کر لیتے ۔ جمعیت کے ھر رکن کو اپنے کسی ساتھی کی ٹانگوں ، ھاتھوں یا جسم کے کسی حصے کو لانگھنے کی ممانعت تھی ۔ اسی طرح اس کے کمبل ، بندوق ، تبر یا کسی اور چیز کا لانگھنا ممنوع تھا ۔ اگر کوئی بھولے سے اس ضابطے کی خلاف ورزی کر جاتا تو جس شخص کا جسم یا چیز لانگھی گئی ھو، اس پر یہ فرض عائد ھو جاتا کہ وہ مقدم الذکر کو مار گرائے اور لانگھنے والے کا یہ فرض ھوتا کہ وہ چپ چاپ بغیر کسی مزاحمت کے مار کھا لے ۔ وہ برتن جن میں یہ سپاھی کھانا کھاتے ، عموماً لکڑی یا چھال کے بنے ھوئے پیالے ھوتے ، جن کے دو طرف نشان لگے ھوتے ۔ گھر سے کوچ کرتے وقت انھیں ھمیشہ پیالے کو ایک طرف سے استعمال کرنا پڑتا اور لوٹتے ھوئے دوسری طرف سے ۔ واپسی پر جب گاؤں ایک دن کے فاصلے پر رہ جاتا تو وہ اپنے سارے پیالے درختوں پر لٹکا دیتے ، یا انھیں کسی گیاہ زار میں پھینک دیتے ، جس کا مقصد بلاشبہ یہ تھا کہ ان کی حرمت یا نجاست ان کے اعزا و احباب میں پھیل کر ان پر مصیبت نہ لے آئے ۔ جیسا کہ ھم دیکھ آئے ھیں ، بالکل اسی طرح مقدس میکاڈو ، حیض اور زچگی کے ایام میں عورتوں اور ان اشخاص کے برتنوں کو تلف کر دیا جاتا یا پھینک دیا جاتا ھے ، جو کسی میت کو چھونے سے ناپاک ھو گئے ھوں ۔ اپاچی (شمالی امریکہ کی اس خانہ بدوش قوم میں متعدد قبیلے شامل تھے ، جن کا تعلق اری زونا اور نیو میکسیکو سے تھا) قوم کے سپاھی کو اپنی پہلی چار لڑائیوں میں اپنی انگلیوں سے سر کھجانے اور ھونٹوں کو پانی لگانے کی اجازت نہیں ، لہذا وہ لکڑی سے سر کھجاتا ھے اور سرکنڈے یا بید کی کھوکھلی لکڑی سے پانی پیتا ھے ۔ اس قسم کی لکڑیاں اور سرکنڈے ایک تسمے میں نتھی سپاھیوں کی پیٹیوں میں آڑسے ھوتے ھیں ۔ اوجبوے لوگ اس دستور کے باضابطہ پابند ھوتے ھیں ، جس کے مطابق سپاھی کو ھاتھ کی بجائے لکڑی سے سر کھجانا پڑتا ھے ۔

بیان کیا جاتا ھے کہ کریک (Creeks ، شمالی امریکہ کے متعدد

قبائل کا اتحاد) اور انھی کے ہم نسل دوسرے قبیلے "جب لڑائی پر ہوں تو عورتوں سے صحبت نہیں کریں گے۔ وہ از روئے مذہب لڑائی پر روانہ ہونے سے تین دن اور تین رات پہلے اور اسی طرح لڑائی سے واپسی کے بعد خود اپنی بیویوں سے بھی کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں رکھتے، اس لیے کہ انھیں اپنا تزکیہ کرنا پڑتا ہے۔" جنوبی افریقہ کے باپیڈی اور باتھونگا قبیلوں کے دستور کے مطابق جنگ میں نہ صرف سپاہیوں کو عورتوں سے اجتناب کرنا پڑتا ہے، بلکہ جو لوگ گھر پر رہ جاتے ہیں ان کے لیے بھی مباشرت ممنوع ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس معاملے میں انھوں نے کوئی بے عنوانی کی تو سپاہیوں کے راستے میں کانٹے آگ آئیں گے اور وہ اپنی مہم میں کام یاب نہ ہو سکیں گے۔

اس بارے میں قطعی طور پر طور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ متعدد وحشی قومیں جنگ کے زمانے میں اصولاً عورتوں سے پرہیز کیوں کرتی ہیں، لیکن یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کا محرک یہ وہم تھا کہ سحر مشارک کے اصول کے بموجب کہیں عورتوں کی صحبت کے اثر سے ان میں نسائیت اور بزدلی نہ پیدا ہو جائے۔ اسی طرح بعض وحشیوں کا خیال ہے کہ زچگی میں عورتوں کی چھوت سے سپاہی کمزور ہو جاتے ہیں، ان کے ہتھیاروں کی قوت جاتی رہتی ہے، بلکہ وسطی بورنیوں کے کاینوں کے نزدیک تو کسی چرخے یا عورتوں کے کپڑوں تک کو چھو لینے سے مرد اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ وہ شکار، ماہی گیری اور لڑائی کے قابل نہیں رہتا۔ اسی لیے لڑائی میں وحشی سپاہی نہ صرف مباشرت سے پرہیز کرتا ہے بلکہ صنف نازک سے کسی قسم کا واسطہ نہیں رکھتا۔ چناں چہ آسام کے کھستانی قبیلوں میں کسی یلغار کے دوران میں یا اس کے بعد مردوں کو اپنی بیویوں سے مباشرت تو ایک طرف کسی عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا تک کھانے کی اجازت نہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ خود اپنی بیویوں سے بھی قطعاً نہیں بول سکتے۔ ایک دفعہ ایک عورت سے نادانستہ اس ضابطے کی خلاف ورزی ہو گئی اور اس نے اپنے شوہر سے، جب کہ اس پر

جنگی امتناع عاید تھا ، بات کر لی ۔ جب اسے پتا چلا کہ اس سے کیا خطا سر زد ہوئی ہے تو وہ ایسی بیمار پڑی کہ مر گئی ۔

**(۵) مردم کشوں کی تحریم** — اگر اب بھی آپ پر یہ بات واضح نہ ہوئی ہو کہ آیا اُن ضوابط عمل کی بنیاد جو ابھی ہمارے زیر غور تھے ، اوہام پر ہے یا مصلحت بینی پر ، تو اس بارے میں آپ کے شبہات یہ جاننے کے بعد غالباً دور ہو جائیں گے کہ اسی قسم کے ضوابط اکثر ایسے سپاہیوں پر اور بھی شدت کے ساتھ عائد ہوتے ہیں جو میدان جنگ سے سرخ رو اور کامران لوٹے ہوں اور دشمن کا قصہ پاک کر کے اس کی طرف سے بالکل مامون ہو گیے ہوں ۔ ایسی صورتوں میں فتح مند سپاہیوں پر نصرت و کامرانی کے ہنگام جو ناگوار قدغنیں لگتی ہیں ، ان کا ایک محرک غالباً مقتولوں کے برہم پریتوں کا خوف ہے اور یہ بات اکثر ظاہر کر دی جاتی ہے کہ قاتلوں کا طرز عمل مقتولوں کی روحوں کے زیر اثر ہوتا ہے ۔ مقدس سرداروں ، سوگوار لوگوں ، زچگی میں عورتوں اور جنگ میں مردوں وغیرہ وغیرہ کو جن امتناعات کی پابندی کرنی پڑتی ہے ، اُن سے بالعموم یہ صورت پیدا کرنی مقصود ہوتی ہے کہ تحریم شدہ اشخاص کا اس طرح مقاطعہ ہو جائے کہ وہ روزمرہ کی سماجی زندگی میں حصہ نہ لے سکیں اور یہ صورت پیدا کرنے کی غرض سے طرح طرح کے ضوابط عائد کر دیے جاتے ہیں ، جن کی تعمیل میں مرد یا عورتیں سب سے دور کھلی ہوا میں جھونپڑیوں میں رہنے ، جنسی اختلاط سے پرہیز کرنے ، دوسروں کے برتن استعمال کرنے سے بچنے وغیرہ وغیرہ پر مجبور ہوتے ہیں ۔ ایسے ہی ضوابط کے ذریعے فتح مند سپاہیوں کا بھی اسی صورت سے مقاطعہ کر دیا جاتا ہے ، خاص کر ایسے سپاہیوں کا جنھوں نے واقعی دشمنوں کا خون بہایا ہو ۔ جزیرہ ٹیمور میں جب کوئی جمعیت دشمنوں کے سر لے کر مظفر و منصور واپس ہوئی ہو تو مذہب اور دستور کی رو سے سالار مہم کا فوراً اپنے گھر جانا ممنوع ہے ۔ اُس کے لیے ایک علیحدہ جھونپڑی ڈال دی جاتی ہے ، جس میں اُس کو دو

مہینے تک اپنے روح و بدن کا تزکیہ کرنا پڑتا ہے۔ اس دوران میں وہ اپنی بیوی کے پاس نہیں جا سکتا اور نہ خود کھانا کھا سکتا ہے۔ کسی اور کو نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں دینے پڑتے ہیں۔ یہ امر واضح ہے کہ ان پابندیوں کی پشت پر مقتولوں کی ارواح کا خوف کارفرما ہوتا ہے، اس لیے کہ اسی جزیرے میں ان رسوم کی ایک اور روداد سے جو کسی سر شکار کے کامیاب واپس ہونے پر ادا کی جاتی ہیں، یہ پتا چلتا ہے کہ اس موقع پر مقتول کی روح کو منانے کے لیے قربانیاں دی جاتی ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ قربانیاں نہ دی گئیں تو فاتح کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ان رسموں میں رقص کے ساتھ ایک نوحہ گایا جاتا ہے، جس کے ذریعے مقتول کی موت پر اظہار غم کیا جاتا ہے۔ اس کو مخاطب کرکے کہا جاتا ہے ''تم اس بات پر خفا نہ ہونا کہ تمہارا سر ہمارے ہاں آگیا ہے؛ اگر قسمت ہمارا ساتھ نہ دیتی تو آج ہمارے سروں کی تمہارے گاؤں میں نمائش کی جاتی۔ ہم نے تمہاری خوشنودی کے لیے قربانی دے دی ہے۔ اب تمہاری روح رخصت ہو اور چین سے رہے اور ہمیں بھی سکھ چین سے رہنے دے۔ تمہیں ہم سے بیر کیوں تھا؟ کیا یہ اچھا نہ ہوتا ہے کہ ہم آپس میں دوست بنے رہتے؟ پھر نہ تمہارا خون بہایا جاتا نہ سر کاٹا جاتا۔'' وسطی سلیبیز میں پسانو کے لوگ جنگ میں اپنے دشمنوں کے سر اتار لاتے ہیں اور اس کے بعد مندر میں ان کی روحوں کو منانے کی کوشش کرتے ہیں۔

نیوگنی کے اُن قبیلوں میں جو دریائے وانی‌گیلا کے دہانے پر آباد ہیں، ''وہ شخص جس نے کسی کی جان لی ہو، جب تک چند رسمیں ادا نہ کر لے ناپاک تصور کیا جاتا ہے۔ قتل کے بعد وہ بہ عجلت ممکنہ اپنی اور اپنے ہتھیاروں کی صفائی کرتا ہے۔ یہ کام خاطر خواہ انجام دے لینے کے بعد گاؤں کا رخ کرتا ہے اور وہاں پہنچ کر اُن لٹھوں پر جا بیٹھتا ہے جن پر قربانی کی جاتی ہے۔ کوئی اس شخص کے قریب نہیں جاتا اور نہ اس کی طرف متوجہ ہوتا

ہے ۔ اس کے لیے ایک گھر بنایا جاتا ہے ، جس کی نگرانی خادموں کی حیثیت سے تین نو عمر لڑکوں کے ذمے ہوتی ہے ۔ وہ صرف بھنے ہوئے کیلے کے بیچ کا حصہ کھا سکتا ہے ، جس کے دونوں سرے پھینک دیے جاتے ہیں ۔ اس کی عزلت گزینی کے تیسرے دن اس کے دوست احباب ایک مختصر سی ضیافت کا انتظام کرتے ہیں اور وہی اس کے لیے چند ایک نئے پیڑو بند تیار کرتے ہیں ۔ اسے 'آی وی پورو' کہا جاتا ہے ۔ اگلے دن وہ شخص اپنے سارے بہترین زیور پہنے ، قتل کے نشانات امتیاز لگائے اور سارے ہتھیار باندھے جھپٹ کر نکلتا ہے اور گاؤں میں پریڈ کرنے لگتا ہے ۔ اس سے اگلے دن شکار کا انتظام کیا جاتا ہے اور جو جانور مارے گئے ہوں ، ان میں سے ایک کنگرو منتخب کرکے اس کا پیٹ چاک کیا جاتا ہے اور اس کا پتا اور کلیجی قاتل کی پشت پر ملی جاتی ہے ۔ پھر وہ بڑی متانت سے قریب ترین جھیل وغیرہ پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا جاتا ہے اور اس میں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ہاتھ منہ دھوتا ہے ۔ سارے نوجوان غیر آزمودہ سپاہی اس کی ٹانگوں کے بیچ میں سے تیرتے ہوئے نکلتے ہیں ۔ خیال ہے کہ اس سے ان میں دلیری اور طاقت پیدا ہوتی ہے ۔ دوسرے دن وہ کیل کانٹے سے لیس اپنے گھر سے جھپٹ کر نکلتا ہے اور مقتول کا نام لے لے کر چیختا ہے ۔ جب اسے تسلی ہو جاتی ہے کہ اس نے مردہ شخص کی روح کو اچھی طرح ڈرا دیا ہے تو گھر لوٹ آتا ہے ۔ فرش کے تختوں کو بجانا یا آگ جلانا بھی روح کو خوف زدہ کرنے کا ایک طریقہ ہے ۔ ان مراحل کے طے ہونے کے ایک دن بعد اس کا تزکیہ مکمل ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بیوی کے گھر جا سکتا ہے ۔"

ونڈیسی ، ولندیزی نیوگنی ، میں جس وقت سرشکاروں کی کوئی فتح مند جمعیت واپسی پر گاؤں کے قریب پہنچنے لگتی ہے تو ٹرائٹن (ایک قسم کے گھونگے کے خول) کے منکھ بجا بجا کر اپنی آمد اور کامیابی کا اعلان کرتی ہے ۔ اس میں سے جو لوگ سر کاٹ کر لائے ہوں ان کے چہروں پر کوئلے کی کالک مل دی جاتی ہے ۔ اگر ایک دشمن

کے مارنے میں کئی آدمیوں کا حصہ ہو تو اس کا سر ان سب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس طرح وقت کا اندازہ لگا کر چلتے ہیں کہ گھر پہنچیں تو تڑکا ہو۔ کشتیاں کھیتے ہوئے وہ بڑے شور و غل کے ساتھ گاؤں میں داخل ہوتے ہیں اور ان کی عورتیں برآمدوں میں کھڑی رقص کے لیے تیار رہتی ہیں۔ ان کی کشتیوں کی قطار روم سرام یا اس مکان کے پاس سے گزرتی ہے، جہاں نوجوان مرد رہتے ہیں، اور گزرتے ہوئے قاتل جتنے آدمیوں کے سر لاتے ہیں، اتنی ہی نوک دار لکڑیاں یا بانس اس مکان کی چھت یا دیوار پر پھینکتے جاتے ہیں۔ دن خاموشی سے گزار دیا جاتا ہے، البتہ کبھی کبھی وہ ڈھول یا سنکھ بجا دیتے ہیں اور بعض وقت غل مچا مچا کر گھروں کی دیواروں کو پیٹنے لگتے ہیں، تاکہ مقتولوں کے پریت ڈر کر بھاگ جائیں۔ اسی طرح نیوگنی کے بابموں کا عقیدہ ہے کہ مقتول کا پریت قاتل کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے در پے آزار رہتا ہے، اور اسی لیے وہ ڈھول پیٹ پیٹ کر پریتوں کو بھگاتے ہیں۔ جب فجی والے کسی شخص کو زندہ دفن کیا کرتے تھے تو سر شام بانسوں، سنکھوں وغیرہ سے ایک شور مچا دیتے تاکہ اس کی روح ڈر کر بھاگ جائے اور اپنے پرانے گھر میں واپس آنے کی کوشش نہ کرنے پائے۔ نیز اپنے گھر سے اسے نفرت دلانے کے لیے اس میں لگے ہوئے مارے کپڑے کھینچ نکالتے اور اسے ایسی چیزوں سے ڈھانک دیتے جو ان لوگوں کی نظر میں انتہا درجہ گھناؤنی ہوں۔ امریکہ کے قدیم باشندے یہ کیا کرتے تھے کہ جس دن وہ کسی قیدی کو اذیت پہنچا کر مار ڈالتے، اسی شام کو خوف ناک آوازیں نکالتے اور جھونپڑیوں کے سامان، دیواروں اور چھتوں پر لکڑیاں مارتے ہوئے گاؤں میں سے دوڑتے تاکہ اس کی روح ان میں اپنا ٹھکانہ نہ بنا سکے اور ان لوگوں کے ہاتھوں اسے جو ایذا پہنچی ہو اس کا بدلہ نہ لینے پائے۔ ایک سیاح بیان کرتا ہے:

> ''ایک دفعہ رات کو میں آٹ واؤں (شمالی امریکہ کے قدیم باشندے جو دریائے آٹ وا کے کنارے آباد تھے اور بعد میں

ایک سپی ریر کے جنوبی ساحل کی طرف منتقل ہو گئے) کے ایک گاؤں کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ہنگامہ برپا ہے اور لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر عجیب بد آہنگ آوازیں نکال رہے ہیں ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حال ہی میں آٹ واؤں اور کیکاپوؤں (یہ قبیلہ پہلے شمالی الی نائس میں آباد تھا اور ساکوں وغیرہ کے ساتھ لسانی رشتے میں منسلک تھا) کے درمیان جنگ ہوتی رہی ہے اور ان کے اس سارے ہنگامے کا مقصد مردہ دشمنوں کے پریتوں کو گاؤں میں داخل ہونے سے روکنا ہے ۔''

باسوتووں کے ہاں ''لڑائی سے واپسی پر نہاون کی خاص رسم ادا کی جاتی ہے ۔ سپاہیوں کے لیے یہ بدرجۂ غایت ضروری ہے کہ ان کے ہاتھوں جو خون بہا ہو اسے جلد از جلد دھو ڈالیں ، ورنہ کشتوں کے سائے ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور ان کی نیند حرام کر دیں گے ۔ وہ کیل کانٹے سے لیس جلوس کی شکل میں قریب ترین ندی پر جاتے ہیں اور اس کے پانی میں قدم رکھتے ہی ایک کاہن جو کسی بلند مقام پر بیٹھا ہوتا ہے ، کوئی مصفی شے ندی میں پھینکتا ہے ، تاہم یہ چیز ضروری نہیں ۔ ان کے نیزوں اور تیروں کی بھی دھلائی کی جاتی ہے ۔'' مشرقی افریقہ کی باگیشو قوم کے دستور کی رو سے قاتل قتل کرنے کے بعد اسی روز اپنے گھر نہیں جا سکتا ، البتہ وہ گاؤں آن کر اپنے کسی دوست کے گھر رات بسر کر سکتا ہے ۔ وہ ایک بھیڑیا مارتا ہے اور اس کے احشاء اپنی چھاتی ، داہنے بازو اور سر پر ملتا ہے ۔ اس کے بچے اس کے پاس لائے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ بھی وہ یہی کچھ کرتا ہے ۔ پھر چوکھٹ کے بازوؤں پر انتڑیاں اور اوجھری ملتا ہے اور اس کے بعد بھیڑیے کے اس مافیہ شکم میں سے جو کچھ بچ رہتا ہے ، اسے اٹھا کر اپنے گھر کی چھت پر پھینک دیتا ہے ۔ اسے دن بھر کھانے کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں اور دو تیلیوں سے چن چن کر کھانا اسے اپنے منہ میں پہنچانا پڑتا ہے ۔ اس کی بیوی پر یہ پابندیاں عاید نہیں ہوتیں ، بلکہ اگر وہ چاہے تو اس شخص کے سوگ میں

شریک ہو سکتی ہے ، جو اس کے میاں کے ہاتھوں مارا گیا ہو ۔ انگونیوں کے ہاں ، جو دریائے زمبیسی (شمالی افریقہ) کے شمال میں آباد ہیں ، وہ سپاہی جن کے ہاتھوں دشمن مارے گئے ہوں ، اپنے جسموں اور چہروں پر راکھ ملتے ہیں ، مقتولوں کے کپڑے اوڑھ لیتے ہیں اور چھال کی بٹی ہوئی رسیاں اس طرح اپنے گلوں سے لپیٹ کر باندھ لیتے ہیں کہ ان کے سرے ان کے شانوں یا سینوں پر لٹکتے رہتے ہیں ۔ یہ لباس وہ اپنی واپسی کے بعد تین دن تک پہنے رہتے ہیں اور روز تڑکے اٹھ کر چیختے چنگھاڑتے گاؤں میں دوڑتے ہیں ، تاکہ مقتولوں کے پریت ڈر کر بھاگ جائیں ، جنھیں اگر اس طرح گھروں سے نہ نکالا جائے تو وہ گھر والوں کو بیماری یا کسی اور مصیبت میں مبتلا کر دیں ۔

اس سلسلے کی بعض رودادوں میں کم از کم صفائی کی رسم کے بعد جبری علیحدگی کا کوئی ذکر نہیں ملتا ، لیکن چند افریقی قبیلوں کے ہاں جنگ میں کسی نہایت جری دشمن کے قاتل کے لیے بہتے ہوئے پانی میں اشنان کے بعد دس دن تک اپنی بیوی اور کنبے کے دوسرے افراد سے الگ رہنا ضروری ہے ۔ نیز اسے قبیلے کے طبیب سے ایک دوا ملتی ہے جسے وہ اپنے کھانے کے ساتھ چباتا ہے ۔ جس وقت مشرقی افریقہ کا ناندی کسی اور قبیلے کے آدمی کو مار ڈالتا ہے تو اپنے جسم ، نیزے اور تلوار کے پھل کے ایک طرف سرخی ملتا ہے اور دوسری طرف سفیدی ۔ قتل کے بعد چار دن تک اسے ناپاک سمجھا جاتا ہے اور وہ اپنے گھر نہیں جا سکتا ۔ اس دوران میں اس کو کسی دریا کے کنارے چھوٹا سا جھونپڑا ڈال کر اس میں رہنا پڑتا ہے ۔ اسے اپنی بیوی یا محبوبہ سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں اور وہ دلیے ، گائے اور بکری کے گوشت کے سوا کچھ نہیں کھا سکتا ۔ جب چوتھا دن پورا ہونے لگے تو اسے اپنے جسم کی صفائی کے لیے ''سیگے ٹیٹ'' کی چھال سے تیار کردہ ایک نہایت تیز جلاب لینا اور بکری کے دودھ میں خون ملا کر پینا پڑتا ہے ۔ کاوی رونڈو کے بانتو قبیلوں کا آدمی لڑائی میں دشمن کو قتل کرنے کے بعد گھر لوٹ کر اپنا سر گھٹوا دیتا

ہے اور ایک دوا جو عموماً بکریوں کی مینگنیوں پر مشتمل ہوتی ہے ، لوگ اس کے جسم پر مل دیتے ہیں ، تاکہ مقتول کی روح اسے دق نہ کرنے پائے۔ کچھ اسی منصد سے بعینہ یہی دستور مشرق افریقہ کے واگیا لوگوں میں بھی جاری ہے ۔ کاوی رونڈو کے جالوؤں میں اس کی صورت قدرے مختلف ہے ۔ ان کے ہاں سپاہی لڑائی سے واپسی کے تین دن بعد سر منڈواتا ہے ۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے گاؤں میں داخل ہو ، اسے ایک زندہ مرغی اپنے گلے سے اٹلی ٹانگ لینی پڑتی ہے ۔ پھر اس مرغی کا دھڑ کاٹ دیا جاتا ہے اور سر اس کے گلے میں لٹکا رہ جاتا ہے ۔ اس سپاہی کی واپسی کے بعد جلد ہی مقتول کے نام کی حاضری کھلا دی جاتی ہے ، تاکہ اس کا پریت قاتل کے سر پر نہ منڈ لاتا رہے ۔ جزائر پی لو (پیس کا ایک مجموعہ جو شمالی بحرالکاہل میں واقع ہے) میں مرد جب کسی کا خون کرکے لڑائی کی مہم سے لوٹتے ہیں تو نو آزمودہ جوانوں اور ان تمام افراد کو جنھوں نے مقتول کو ہاتھ لگایا ہو ، پنچایت گھر کی وسیع عمارت میں بند کر دیا جاتا ہے اور ان کی تحریم ہو جاتی ہے ۔ انھیں اس عمارت سے نکلنے ، نہانے ، عورت کو چھونے اور مچھلی کھانے کی ممانعت ہے ۔ وہ کھوپرے اور شربت کے سواء کچھ نہیں کھا پی سکتے ۔ وہ اپنے جسم پر عمل کیے ہوئے پتے ملتے ہیں اور عمل کیے ہوئے پان چباتے ہیں ۔ پھر تین دن بعد سب مل کر اس جگہ سے قریب ترین کسی مقام پر ، جہاں قتل ہوا ہو ، غسل کرتے ہیں ۔

شمالی امریکہ کے ینچیزیوں میں وہ بہادر نوجوان جو پہلی مرتبہ دشمن کے سر اتار کے لائے ہوں ، چھ مہینے تک پرہیزگاری کے بعض اصول کے پابند ہوتے تھے ۔ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ نہیں سو سکتے تھے اور نہ گوشت کھا سکتے تھے ۔ انھیں صرف مچھلی اور آٹے دودھ کی لسی پر گزارا کرنا پڑتا ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر وہ اس اصول سے انحراف کریں تو مقتول کی روح جادو کے زور سے انھیں مار ڈالے گی ۔ وہ دشمن کو پھر کبھی شکست نہیں دے سکیں گے اور دشمن کی خفیف سی ضرب سے ان کا کام تمام ہو جائے گا ۔ جب کوئی چوکٹا (امریکہ کے ان قدیم باشندوں کے قبیلے کا فرد جو اپالیشیا کے جنوب

میں آباد تھے۔ ان کے ہاں قدیم زمانے میں کھیتی باڑی ہوتی تھی، اور وہ یورپی آباد کاروں کے ساتھ بڑے امن سے رہتے تھے، ان کا شمار مہذب ترین امریکی الاصل قوموں میں ہوتا ہے) جب کسی دشمن کو مار کر اس کی کھوپری لے آتا تو ایک مہینے تک سوگ مناتا۔ اس دوران میں وہ اپنے بالوں میں کنگھا نہیں کر سکتا تھا اور اگر اس کے سر میں کھجلی ہوتی تو اس کے لیے سوائے اس چھوٹی سی لکڑی کے جو اس غرض سے اس کی کلائی سے بندھی ہوتی، کوئی اور چیز استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ مقتولوں کے لیے سوگ منانے کی یہ رسم شمالی امریکہ کے اصلی باشندوں میں عام تھی۔

اس طرح آپ نے دیکھا کہ وحشیوں کے ہاں جن سپاہیوں کے ہاتھوں لڑائی میں کشت و خون ہوا ہو، انھیں کچھ عرصے کے لیے سب سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے، خاص کر اپنی بیویوں سے اور قبل اس کے کہ وہ برادری میں پھر سے شامل ہو سکیں، ان کے تزکیے کی بعض رسمیں ادا ہونی ضروری ہیں۔ اب، جیسا کہ ہم تحقیق کر آئے ہیں، اگر ایسے سپاہیوں کے مقاطعے یا عزلت گزینی اور ان رسوم کا مقصد، جو انھیں ادا کرنی پڑتی ہوں، مقتول کے پریت سے پیچھا چھڑانا، اسے منانا یا ڈرانا ہے تو ہم بلا خوف تردید یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ ان مردم کشوں یا قاتلوں کے تزکیے کے ایسے ہی دستور کا مطلب بھی شروع شروع میں یہی کچھ تھا، جنھوں نے اپنے کسی ہم قبیلہ کے خون سے ہاتھ رنگے ہوں اور یہ تصور کہ نہانا، دھونا، روزے رکھنا وغیرہ وغیرہ اصل میں تزکیۂ نفس کی ایک صورت ہے، بعد کے زمانے کے لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے، جنھوں نے اس قدیم دستور کی یہ تعبیر اس لیے کی تھی کہ وہ اس انداز فکر کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے، جس سے یہ دستور پیدا ہوا تھا۔ اگر ہم یہ ثابت کر سکیں کہ وحشی کسی ہم قبیلہ آدمی کے قاتل پر واقعی بعض پابندیاں عاید کیا کرتے تھے اور ان پابندیوں کا محرک قطعاً یہ خوف تھا کہ اس کے سر پر مقتول کی روح منڈلاتی رہتی ہے، تو ہمارے اس قیاس کی تصدیق ہو جائے گی۔ شمالی امریکہ کے اوماہاؤں کی مثال سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ ان

لوگوں کے ہاں مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کی جان لینے کا حق حاصل تھا ، لیکن کبھی کبھی وہ تحفوں کی صورت میں اس کا خون بہا لے کر اپنے اس حق سے دست بردار ہو جایا کرتے تھے ۔ جب قاتل کی جان بخشی ہو جاتی تو اسے کچھ مدت تک بعض سخت ضوابط کی پابندی کرنی پڑتی ۔ یہ مدت مختلف صورتوں میں دو سے چار مہینے تک ہوتی ، جس کے دوران میں اسے جوتا پہننے ، اونچی آواز سے بولنے اور اپنے گرد و پیش دیکھنے کی اجازت نہ تھی ۔ اسے گرمیوں میں بھی اپنی عبا گلے پر باندھے رکھنی اور ہر وقت اسے کسے رہنا پڑتا ، تاکہ وہ ڈھیلی ہو کر لٹکتی یا کھل کر اڑتی نہ رہے ۔ وہ اپنے بالوں میں کنگھی نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہوا میں اڑنے کے لیے انھیں کھلا چھوڑ سکتا تھا ۔ جب قبیلہ شکار کے لیے نکلتا تو اس کو اپنا خیمہ باقی لوگوں سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر نصب کرنا پڑتا ''کہ کہیں اس کے مقتول کا پریت آندھی نہ لے آئے اور اس سے ان کو نقصان نہ پہنچ جائے ۔'' اس کے صرف ایک رشتہ دار کو اس کے ساتھ خیمے میں رہنے کی اجازت تھی ۔ کوئی شخص اس کے ساتھ شریک طعام ہونا پسند نہ کرتا ، کیوں کہ ان کا کہنا تھا کہ ''اگر ہم ایسے آدمی کے ساتھ کھانا کھائیں جس سے واکانڈا (ایک روح) کو نفرت ہو تو واکانڈا ہم سے نفرت کرنے لگے گی ۔'' کبھی وہ نالہ و زاری اور اپنے گناہ پر اظہار غم کرتا پھرتا ۔ جب اس کے مقاطعے کی یہ طویل مدت پوری ہو جاتی تو مقتول کے رشتہ دار اس کی آہ و بکا سن کر اس سے کہتے ''بس اب جا اور لوگوں میں شامل ہو جا ، جا مکاسن (ہرن کی کھال کا جوتا) پہن اور کوئی اچھی سی عبا اوڑھ لے ۔'' یہاں قاتل کو دور رکھنے کا جو سبب بیان کیا جاتا ہے ، اس سے ان دوسری پابندیوں کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے جو اس پر عاید کی جاتی ہیں ؛ یعنی ایسا شخص آسیب زدہ تھا اور اس لیے خطرناک ۔ قدیم زمانے کے یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ کسی ایسے شخص کی روح ، جسے قتل ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا ہو ، اپنے قاتل سے برہم ہوتی ہے اور اسے تکلیف پہنچاتی رہتی ہے ، اس لیے ایسے قاتل کے لیے بھی جو نادانستہ قتل کا

مرتکب ہوا ہو ، یہ ضروری تھا کہ سال بھر کے لیے ، یعنی جب تک اس کی روح کا غصہ نہ اتر جائے اپنا ملک چھوڑ کر کہیں چلا جائے۔ اگر مقتول اتفاق سے کوئی پردیسی ہوتا تو اسے نہ صرف اپنے بلکہ مقتول کے ملک سے بھی دور رہنا پڑتا۔ یونان کے ایسے لوگوں کی صحیح تصویر آریسٹیز کی داستان میں نظر آتی ہے ، جن کے سر پر روح منڈلاتی ہو۔ وہ اپنی ماں کو قتل کرکے اس کی انتقام لینے والی روح کو پیچھے لگائے ملک ملک پڑا پھرتا رہا اور جب تک اس کی رسم تطہیر ادا نہیں ہو گئی ، نہ کوئی اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا اور نہ اسے اپنے گھر میں قدم رکھنے دیتا۔

## (٦) شکاریوں اور ماہی گیروں کی تحریم—غیر مہذب

معاشرے میں شکاری اور ماہی گیر اکثر اسی قسم کے اصول پرہیزگاری اور رسوم تطہیر کے پابند ہوتے ہیں جو بر سر پیکار سپاہی اور قاتل پر واجب العمل ہوتی ہیں ، گو تمام صورتوں میں ان اصول و رسوم کے اصل مقصد کا اندازہ لگانا مشکل ہے ؛ تاہم بہ گمان غالب یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح سپاہی کے مقاطعے اور صفائی یا تزکیے کا محرک ان دشمنوں کا خوف ہے جن کو قتل کرنے کی اسے امید ہو یا جن کو وہ قتل کر چکا ہو ، اسی طرح شکاری اور ماہی گیر اسی قسم کے جن اصول و رسوم کا پابند ہوتا ہے ، ان کی پشت پر ان چوپایوں ، چڑیوں اور مچھلیوں کی روح کا خوف ہوتا ہے جنھیں وہ مارنے کا ارادہ رکھتا ہو یا مار چکا ہو ، کیوں کہ عموماً وحشی کے نزدیک جانوروں میں اسی قسم کی روحانی اور ذہنی خصوصیات ودیعت ہوتی ہیں جن کا وہ خود حامل ہو ، اور اسی لیے اس کا جانوروں کے ساتھ احترام سے پیش آنا قدرتی بات ہے۔ جس طرح وہ ان آدمیوں کی ارواح کو منانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے ہاتھوں قتل ہوئے ہوں ، اسی طرح وہ ان جانوروں کی روحوں کو بھی راضی کرنے کے جتن کرتا ہے جو اس نے مارے ہوں۔ روحوں کی رضاجوئی کی ان رسموں کا حال ہم اپنی اس کتاب میں آگے چل کر بیان کریں گے۔ یہاں ہم کو ان

امتناعوں سے بحث ہے جن کے صیاد اور ماہی گیر ، شکاری اور مچھلی کا موسم شروع ہونے سے قبل اور اس کے دوران میں پابند ہوتے ہیں ، اور پھر رسوم تطہیر سے جو انہیں شکار مار کر کامیاب واپس ہونے کے بعد ادا کرنی پڑتی ہیں ۔

جہاں وحشی کم و بیش تمام جانوروں کی روحوں کا احترام کرتا ہے ، وہاں اسے ایسے جانوروں کا ادب خصوصیت کے ساتھ ملحوظ ہوتا ہے ، جو اس کے لیے خاص طور پر کار آمد یا جو اپنے ڈیل ڈول ، قوت یا خوں خواری کی بدولت مہیب و خوفناک ہوں ۔ چناں چہ ایسے مفید یا خطرناک جانوروں یا چوپایوں کا شکار یا ہلاک کرنا نسبتاً چھوٹی اور بے کار مخلوقات کے مقابلے میں کہیں زیادہ سخت اور دقت طلب اصول و رسوم کی پابندی کا مقتضی ہوتا ہے ۔ چناں چہ امریکہ کے نوٹکا ساؤنڈ والے دیسی ، وہیل کے پکڑنے کی تیاری میں ایک ہفتے تک روزے رکھتے تھے ، جس کے دوران میں ان کی غذا نہایت قلیل ہوتی اور وہ دن میں کئی کئی دفعہ نہاتے دھوتے ، گاتے بجاتے اور اپنے جسم ، ہاتھ پاؤں اور منہ پر بھوسا اور جھاڑیاں مل مل کر ان کی یہ صورت بنا دیتے کہ گویا جنگلی گلاب کے کانٹوں میں الجھنے سے ان کا سارا بدن بری طرح چھل گیا ہو ۔ اتنے ہی عرصے کے لیے ان کا عورتوں سے بالکل الگ تھلگ رہنا ضروری تھا اور اس آخری شرط کی پابندی ان کی کامیابی کے لیے ناگزیر سمجھی جاتی ۔ ایک سردار کے متعلق مشہور ہے کہ اسے وہیل کے شکار میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور اس نے اپنی اس ناکامی کو اپنے آدمیوں کی جنسی بد پرہیزی سے منسوب کر دیا ۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس امریکی قبیلے میں شکار اور لڑائی پر جانے والے مردوں کے لیے ایک ہی ضابطۂ عمل مقرر تھا ۔ مدغاسکری وہیل گیر پہلے اسی قسم کے ضوابط کے پابند تھے یا اب بھی ہیں ۔ کسی وہیل گیر جہاز کے ملاح سمندر میں جانے سے آٹھ دن قبل روزے رکھتے ، عورتوں اور شراب سے اجتناب کرتے اور اپنی انتہائی پوشیدہ خطاؤں کا ایک دوسرے کے سامنے اعتراف کر لیتے ۔ اگر کسی شخص کے متعلق یہ معلوم ہوتا کہ اس سے کوئی بڑا گناہ

ہوا ہے تو اسے اپنی مہم میں شریک نہ ہونے دیتے ۔ جزیرۂ مابیاگ (جو پاپوا اور آسٹریلیا کے درمیان آبنائے گوریس میں واقع ہے) میں لوگوں کو ڈوگانگ کے شکار پر جانے سے پہلے اور کچھوؤں کے جفتی ہونے کے زمانے میں اپنا دامن بالکل پاک رکھنا پڑتا تھا ۔ کچھوؤں کے ملنے کا موسم اکتوبر سے نومبر تک رہتا ہے اور اس زمانے میں اگر ناکتخدا اشخاص آپس میں مباشرت کرتے تو یہ یقین کر لیا جاتا کہ جب انکی ڈونگی سطح سمندر پر بہتے ہوئے کچھوؤں کے پاس پہنچے گی تو نر و مادہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں گے اور دونوں مختلف سمتوں میں غوطے لگا جائیں گے ۔ اسی صورت سے نیوگنی میں ماوات کے مقام پر جب کچھوؤں کا جوڑا مل رہا ہو تو مرد عورتوں سے اجتناب کرتے ہیں ، اگرچہ وہ کسی اور وقت خاصی عیاشی کر لیتے ہیں ۔ جزائر کیرولین (بحرالکاہل) کے ایک ٹاپو اوآپ میں ہر وہ مچھیرا جو اپنی کشتی لیے سمندر میں مچھلی پکڑنے نکلا ہو ، ماہی گیری کے موسم میں جو چھ یا آٹھ ہفتے تک رہتا ہے ، تمام وقت ایک نہایت کڑے ٹیبو کا پابند ہوتا ہے ۔ جب کبھی وہ ساحل پر آتا ہے تو اسے سارا وقت مردوں کے کلب گھر میں گزارنا پڑتا ہے اور وہ کسی بھی بہانے سے اپنے گھر نہیں جا سکتا یا اپنی بیوی اور عورتوں کی صورت نہیں دیکھ سکتا ۔ اگر وہ انہیں کنکھیوں سے بھی دیکھ لے تو خیال ہے کہ رات کی تاریکی میں اڑتی ہوئی مچھلی کا اس کی آنکھوں میں چھید کر جانا لازمی ہے ۔ اگر اس مچھیرے کی ماں ، بیوی یا بیٹی اس کے لیے کوئی چیز لے کر آئے اور اس سے بات کرنی چاہے تو اسے نیچے کلب گھر کی طرف پیٹھ پھیرے اور ساحل کی جانب منہ کیے کھڑا ہو جانا چاہیے ۔ اس کے بعد مچھیرا نکل کر اس کی طرف پشت کیے اس سے بات کر سکتا ہے اور وہ اس کے لیے جو کچھ لے کے آئی ہو اسے وصول کر سکتا ہے ۔ لیکن اس کے بعد ہی اسے فوراً پھر اسی طرح قید ہو جانا پڑتا ہے ، بلکہ حقیقت میں مچھیروں کو شام کے وقت کلب گھر کے اندر دوسرے لوگوں کے ساتھ رقص و سرود میں شریک ہونے کی بھی اجازت نہیں ۔ انہیں ایک طرف سب سے الگ تھلگ گم سم بیٹھا رہنا پڑتا ہے ۔

مرزا پور میں جس وقت ریشم کے کیڑے کا انڈا گھر میں لایا جاتا ہے تو کول یا بھیار خیر و برکت کے لیے اسے ایسی جگہ لے جا کر رکھ دیتا ہے ، جہاں اچھی طرح گوبر لیپ دیا گیا ہو ۔ اس وقت سے کیڑے کے مالک کے لیے عام آلائشوں سے پاک رہنا ضروری ہے ۔ اسے اپنی بیوی کے ساتھ صحبت ترک کر دینی پڑتی ہے ، وہ حجامت نہیں بنوا سکتا ، ناخن نہیں کاٹ سکتا ، اپنے جسم پر تیل نہیں مل سکتا ، مکھن میں پکی ہوئی چیز نہیں کھا سکتا ، جھوٹ نہیں بول سکتا اور نہ کوئی ایسا کام کر سکتا ہے جو اس کے نزدیک غلط ہو ۔ وہ سنگارمتی دیوی سے یہ منت مانگتا ہے کہ اگر کیڑا خاطر خواہ نکلا تو وہ اس پر نذر چڑھائے گا ۔ جب کوئے کھلتے ہیں اور کیڑے برآمد ہونے لگتے ہیں تو وہ گھر اور پڑوس کی عورتوں کو جمع کرتا ہے ۔ یہ سب مل کر منگل گاتی ہیں ، جو کسی بچے کی پیدائش پر گایا جاتا ہے ۔ جب کیڑے جفتی ہوتے ہیں تب بھی ویسی ہی خوشیاں منائی جاتی ہیں جیسی شادی بیاہ پر منائی جاتی ہوں ۔ اس طرح کیڑوں کے ساتھ جہاں تک ہو سکتا ہے ، انسانوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ کیڑے کے انڈے سے نکلنے کے دوران میں جنسی مواصلت کی یہ ممانعت شاید مماثلت کی بناء پر اس اصول کی توسیع شدہ ایک صورت ہے ، جس پر متعدد نسلوں میں عمل ہوتا ہے اور جس کی رو سے جب تک عورت کے حمل ہو اور اس کی چھاتی میں دودھ آتا رہے ، اس کے شوہر کے لیے اس کے ساتھ مباشرت ممنوع ہے ۔

جزیرۂ نیاس میں شکاری بعض وقت گڑھے کھود کر ان پر جھاڑیاں ، گھاس اور پتے ڈھانک دیتے ہیں اور پھر شکار کو ان میں گرانے کے لیے ہانکا دے کر لاتے ہیں ۔ گڑھوں کی کھدائی کے دوران میں متعدد ٹیبوؤں کی پابندی کرنی پڑتی ہے ۔ انہیں تھوکنے سے احتراز کرنا چاہیے ، ورنہ شکار گڑھوں سے متنفر ہو کر ان سے منہ موڑ جائے گا ۔ انہیں ہنسنا نہیں چاہیے ورنہ گڑھے کے کنارے ٹوٹ کر اس میں جا گریں گے ۔ وہ نمک نہیں کھا سکتے ، سوروں کے لیے چارہ نہیں تیار کر سکتے اور گڑھے کے اندر اپنے جسموں کو نہیں کھجا سکتے ۔ اس

لیے کہ ایسا کرنے سے زمین بھربھری ہو کر ساری مٹی جھڑ جائے گی ۔ اور کھدائی کے بعد رات کو وہ کسی عورت سے صحبت نہیں کر سکتے ۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ان کی ساری کی کرائی محنت پر پانی پھر جائے گا ۔

غیر مہذب نسلوں میں یہ چیز بہت عام ہے کہ عفت و پاک بازی کو شکار اور ماہی گیری میں کامیابی کی ایک شرط سمجھا جاتا ہے اور اس بناء پر جنسی مواصلت سے سخت اجتناب کیا جاتا ہے ۔ اس کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ، ان سے یہ بات قرین قیاس ہو جاتی ہے کہ اس اصول پرہیزگاری کی بنیاد تمام صورتوں میں توہم پر ہے ، اور اس خیال پر نہیں کہ اس سے انحراف کے نتیجے میں شکاری یا ماہی گیر کچھ عرصے کے لیے کمزور ہو جاتا ہے ۔ غالباً عام خیال یہ ہے کہ جنسی بد پرہیزی سے کسی نہ کسی سبب جانور کو ٹھیس پہنچتی ہے اور اس لیے وہ دام سے گریز کرتا ہے ، نہ یہ کہ بد پرہیزی کا نتیجہ خود شکاری یا ماہی گیر کی کم زوری ہے ۔ برطانوی کولمبیا کے کیریر قبیلے کا آدمی ریچھ کے لیے دام بچھانے سے پہلے پورے ایک مہینے تک اپنی بیوی سے علیحدہ رہا کرتا تھا ، اور اس دوران میں پینے کے اس برتن کو استعمال نہیں کرتا تھا جو اس کی بیوی کے استعمال میں رہتا ہو ، بلکہ اپنے لیے چھال کا بنا ہوا ایک خاص پیالہ الگ رکھتا ۔ ان پیش بندیوں سے بے پروائی کے سبب اس کے خیال میں شکار جال میں آنے سے پہلے بچ نکلتا ۔ لیکن جب وہ مارٹن کے لیے جال بچھانے لگتا تو اس کی پرہیزگاری کی مدت دس دن ہوتی ۔

توہمات کی بناء پر وحشی کے مجاہدۂ نفس کی تمام کثیر التعداد صورتوں کی چھان بین ، گو معلومات میں اضافے کا باعث ضرور ہوں گی ، لیکن اس وقت ممکن نہیں ، اور قبل اس کے کہ تزکیہ و تطہیر کی ان رسموں سے بحث شروع کی جائے ، جو شکاری اور ماہی گیر شکار کے بعد ادا کرتے ہیں ، اس دستور پرہیزگاری کی چند متفرق مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں ۔ لاؤس میں شپ ہوم یا سیفوم کے قریب نمک کی جھیلوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو اس مقام پر جہاں وہ کام

کر رہے ہوں ، ہر قسم کے جنسی تعلقات سے پرہیز کرنا پڑتا ہے ۔ اور انہیں دھوپ سے بچنے کے لیے اپنے سر ڈھانکنے یا چھتری لگانے کی اجازت نہیں ۔ برما کے چینیوں کے ہاں شراب کا خمیر دو ایسی عورتیں تیار کرتی ہیں جنہیں قرعہ اندازی کے ذریعے اس کام کے لیے منتخب کیا جاتا ہے ۔ خمیر کی تیاری کا عمل تین دن جاری رہتا ہے ، جس کے دوران میں وہ کھٹائی نہیں کھا سکتیں اور اپنے شوہروں کے ساتھ کوئی ازدواجی تعلق نہیں رکھ سکتیں ، ورنہ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ شراب ترش نکلے گی ۔ ماسائیوں کے ہاں شہد کی شراب ایک مرد اور ایک عورت کشید کرتے ہیں ، جو شراب کی مکمل تیاری تک ایک علیحدہ جھونپڑے میں رہتے ہیں ، لیکن اس دوران میں ان کے لیے آپس میں مباشرت قطعی ممنوع ہے ۔ یہ انتہا درجے ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ شراب بنانا شروع کرنے سے پہلے تین دن تک اور ان چھ دنوں تک ، جن کے دوران میں شراب کی کشید جاری رہتی ہے ، وہ اپنا دامن ملوث نہ ہونے دیں ۔ ماسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اگر یہ جوڑا پرہیزگاری کے دستور سے انحراف کرے تو نہ صرف شراب پینے کے قابل نہ بنے گی ، بلکہ وہ مکھیاں جنھوں نے شہد بنایا ہو ، اڑ جائیں گی ۔ اسی طرح ان کے ہاں اس شخص کو جو زہر تیار کر رہا ہو ، اکیلا سونا اور دوسرے ایسے ٹیبوؤں کا پابند رہنا پڑتا ہے ، جن کی وجہ سے وہ قریب قریب برادری سے خارج ہو کر رہ جاتا ہے ۔ وانڈوروبو قبیلہ ، جس کا تعلق اسی علاقے سے ہے جس میں ماسائی آباد ہیں ، یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زہر تیار کرنے والے کے آس پاس ، محض کسی عورت کی موجودگی سے بھی زہر کی تاثیر جاتی رہتی ہے ۔ اور یہی صورت اس وقت بھی پیش آتی ہے ، جب کہ اس کی بیوی زہر کی کشید کے دوران میں اس کے پیچھے بدکاری کی مرتکب ہو ۔ ظاہر ہے کہ اس آخری صورت میں زیر بحث ٹیبو کی کوئی منطقی توجیہ ممکن نہیں ۔ زہر ساز کی بیوی کی بے عصمتی کے اثر سے زہر طبعاً اپنا جوہر کیسے کھو سکتا ہے؟ عورت کی بدکاری کے متعلق یہ خیال کہ اس کا اثر زہر پر پڑتا ہے ، مشارک سحر کی ایک واضح صورت ہے ۔

اس کی بد راہی مشارکت کے ذریعے دور سے اس کے شوہر اور زہر پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ لہذا ہم کسی قدر اعتماد کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پاک بازی کا وہ ضابطہ بھی جو خود زہر ساز پر عاید ہوتا ہے ، سحر مشارک ہی کی ایک سیدھی سادی صورت ہے ، اور جیسا کہ کسی مہذب قاری کو خیال گزر سکتا ہے ، کوئی ایسی معقول پیش بندی نہیں جس کا مقصد یہ ہو کہ زہر ساز سوئے اتفاق سے اپنی بیوی کو زہر نہ دینے پائے ۔

مشرقی افریقہ کے باپیڈی اور باتھونگا قبیلوں میں جب کسی نئے گاؤں کی تعمیر کے لیے کوئی جگہ منتخب کی جائے اور مکان بنائے جانے لگیں تو تمام شادی شدہ اشخاص کے لیے آپس میں ازدواجی تعلقات رکھنے ممنوع ہیں ۔ اگر یہ پتا چل جائے کہ کسی شادی شدہ جوڑے نے اس ضابطے کی خلاف ورزی کی ہے تو تعمیر کا کام فی الفور روک دیا جائے گا اور گاؤں کے لیے کوئی اور جگہ منتخب کی جائے گی ، کیوں کہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ جنسی بے عنوانی سے بستی کے بسنے میں کھنڈت پڑ جائے گی اور سردار دبلا ہو جائے گا ، بلکہ شاید مر جائے ۔ کوچن چین کے چاموں کے ہاں جب آب پاشی کی غرض سے دریا پر کوئی بند تعمیر یا درست کیا جاتا ہے تو اس سردار کو جو قربانیوں کی رسم ادا کرتا ہے اور دیوتاؤں سے بند کی محافظت کی پرارتھنا کرتا ہے ، تمام وقت گھاس پھوس کے ایک چھپر میں رہنا پڑتا ہے ۔ وہ اس کام میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا اور بالکل پاک دامن رہتا ہے ۔ لوگوں کے عقیدے کے بموجب اس کی جنسی بد پرہیزی سے بند ٹوٹ جاتا ہے ۔ یہاں ظاہر ہے کہ ایسے کام کے سر انجام کے لیے سردار کی جسمانی قوت برقرار رکھنی ، جس میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو ، قطعی کوئی معنی نہیں رکھتی ۔

جیسا کہ ہم ثابت کر آئے ہیں ، ان اجتنابی اصول یا ٹیبوؤں کی تہہ میں جن پر شکاری یا مچھیرے شکار سے قبل یا شکار کے دوران میں

کار بند ہوتے ہیں ، وہمی محرکات کارفرما ہیں ۔ زیادہ تر اس مخلوق کی ارواح کے ناراض یا خوف زدہ ہونے کا اندیشہ جسے مارنا مقصود ہو ۔ اس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ قیود بھی کچھ کم سخت نہیں ہوں گی جو جانور کے ہلاک ہونے کے بعد عاید ہوتی ہوں ، کیوں کہ اس صورت میں شکاری اور اس کے لوگوں کو شکار کی غضب ناک روح کا ایک خطرہ اور لگا ہوتا ہے ۔ جہاں اس مفروضے کی بناء پر کہ زیر بحث اجتنابی ضابطے ، جن میں کھانے پینے اور سونے کے پرہیز شامل ہیں ، ایسی حفظانی بندشوں سے عبارت ہیں جن کا مقصد کام کرنے کے لیے آدمی کی صحت و قوت برقرار رکھنا ہے ، وہاں کام انجام پا چکنے یعنی جانور کے مارے جانے یا مچھلی کے پکڑے جانے کے بعد ان اصول یا ٹیبوؤں کی پابندی قطعاً فضول ، لایعنی اور دور از فہم چیز ہے ۔ لیکن ، جیسا کہ میں اب بتاؤں گا ، اکثر صورتوں میں شکار ہو چکنے کے بعد بھی یہ ٹیبو برابر نافذ رہتے ہیں ، بلکہ کچھ اور سخت ہو جاتے ہیں ، لہذا یہ کسی عقلی نظریے کی گرفت میں نہیں آتے ۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان کی صحیح توجیہ صرف توہمات والے مفروضے کی بناء پر ہی ممکن ہے ۔

آب نائے بیرنگ کے اسکیموؤں کے ہاں ''شکاری کو اپنے مارے ہوئے جانوروں کے ساتھ بڑی احتیاط برتنی پڑتی ہے کہ کہیں ان کی روحوں یا سایوں کو تکلیف نہ پہنچ جائے ، اور اس کی یا اس کے لوگوں کی شامت بلکہ موت نہ آ جائے ۔'' اسی وجہ سے یونالت قوم کے اس شکاری کو جس نے سفید وہیل کے مارنے میں حصہ لیا ہو ، بلکہ جس نے اسے جال سے نکالنے میں بھی مدد دی ہو ، شکار کے بعد چار دن تک کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں ۔ خیال ہے کہ اس وقت تک وہیل کا سایہ یا روح اس کے جسم سے رخصت نہیں ہوتی ۔ ساتھ ہی اس دوران میں کوئی شخص گاؤں کے اندر کوئی تیز یا نکیلا اوزار استعمال نہیں کر سکتا کہ مبادا وہیل کے چوٹ لگ جائے ، جو عام عقیدے کے بموجب سب کی نظروں سے چھپی گرد و نواح میں منڈلاتی رہتی ہے ۔ نیز کسی قسم کا شور مچانا ممنوع ہے کہ کہیں مچھلی کی روح برہم یا

خوف زدہ نہ ہو جائے۔ جو کوئی وہیل کے جسم کو آہنی تیشے سے کاٹے گا وہ مر جائے گا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس چار دن کے دوران میں کسی قسم کے آہنی اوزار کے استعمال کی اجازت نہیں۔

یہی اسکیمو ہر سال دسمبر میں ایک بڑا تیوہار مناتے ہیں، جس میں اس سال مارے ہوئے تمام دریائی بچھڑوں، وہیلوں، دریائی گھوڑوں اور سفید ریچھوں کے نشانے گاؤں کے چوپال میں لے جائے جاتے ہیں۔ یہاں وہ کئی دن تک رکھے رہتے ہیں، جس کے دوران میں شکاری اپنی عورتوں سے گریز کرتے ہیں اور یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان مردہ جانوروں کی روحیں ناراض ہو جائیں گی۔ اسی طرح الاسکا کے ایلیوٹوں کے ہاں وہ شکاری جس نے کسی وہیل کو اپنے طلسمی نیزے کا نشانہ بنایا ہو، مزید وار کیے بغیر فوراً گھر لوٹ آتا تھا اور ایک جھونپڑے میں جو خاص طور پر اس کے لیے بنایا جاتا، اپنے لوگوں سے الگ تھلگ بھوکا پیاسا چار دن تک رہتا اور کسی عورت کو چھوتا یا اس کی طرف دیکھتا تک نہیں۔ اس دوران میں وہ گاہے گاہے زخمی یا سسکتی ہوئی وہیل کی طرح خر خر کرتا رہتا تاکہ وہ وہیل ساحل سے جانے نہ پائے۔ چوتھے دن وہ اپنے گوشۂ عزلت سے نکل کر سمندر میں نہاتا، بھرائی ہوئی آواز سے چیختا اور پانی پر ہاتھ مارتا۔ پھر کسی کو ساتھ لیے ساحل کے اس حصے پر پہنچتا جہاں اسے وہیل کے پڑے ہونے کی توقع ہوتی۔ اگر وہیل مردہ ہوتی تو اس جگہ نشان لگا دیتا جہاں اس نے مچھلی پر ضرب کاری لگائی ہو۔ لیکن اگر اس میں جان باقی ہوتی تو پھر گھر لوٹ آتا اور جب تک مچھلی دم نہ توڑ دیتی اسی طرح نہاتا دھوتا رہتا۔ یہاں شکاری جو زخم خوردہ وہیل کی نقل اتارتا ہے، اس کا مقصد غالباً یہ ہے کہ مثلی سحر کے اثر سے مچھلی مستعدی کے ساتھ مرے۔ اس کے علاوہ قطب شمالی کے علاقے کے خوف ناک سفید ریچھ سے متعلق جو ٹیبو ہیں اگر ان کی پابندی نہ کی جائے تو اس کی روح ناراض ہو جاتی ہے۔ یہ اس مقام پر جہاں اس نے اپنا جسم چھوڑا ہو، تین دن تک ٹھہری رہتی ہے۔ اس دوران میں اسکیمو قوانین امتناع کے خاص

طور پر پابند ہوتے ہیں ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ریچھ کی روح خلاف ورزی کرنے والوں کو دریائی جانوروں کی روحوں سے کہیں زیادہ تیزی سے سزا دیتی ہے ۔

جب کاین کسی خوف ناک بورنیائی چیتے کو مارتے ہیں تو انہیں اپنی روحوں کی طرف سے بڑی تشویش رہتی ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ چیتے کی روح خود ان کی روحوں سے کچھ زیادہ طاقتور ہوتی ہے ۔ لہذا وہ یہ منتر پڑھتے ہوئے آٹھ مرتبہ چیتے کی لاش کو لانگھتے ہیں ''چیتے تیری روح میری روح کے نیچے ۔'' گھر لوٹ کر وہ اپنے اور اپنے کتوں کے جسموں اور ہتھیاروں پر مرغیوں کا خون ملتے ہیں ، تاکہ ان کی روحوں کو سکون آ جائے اور وہ اڑنے نہ پائیں ۔ چوں کہ وہ خود مرغی کا گوشت شوق سے کھاتے ہیں اس لیے سمجھتے ہیں کہ ان کی روحوں کو بھی مرغی بہت مرغوب ہے ۔ اس کے بعد دوبارہ شکار پر جانے سے پہلے انہیں آٹھ دن تک رات کو نہانا پڑتا ہے ۔ ھاٹن ٹاٹوں میں جب کوئی شیر ، تیندوا ، ہاتھی یا گینڈا مارتا ہے تو اس کی ایک سورما کی طرح عزت کی جاتی ہے ، لیکن اسے اپنے گھر پر تین دن تک بالکل بے کار پڑا رہنا پڑتا ہے اور اس عرصے میں اس کی بیوی اس کے قریب نہیں آ سکتی ۔ نیز اس کی بیوی کو ادنیٰ قسم کی قلیل غذا پر قانع رہنا پڑتا ہے تاکہ فاقے سے اس کی صحت نہ خراب ہونے پائے ۔ اسی طرح لاپ لینڈ والوں کے نزدیک ریچھ کا مارنا ایک عظیم کارنامہ ہے ، جسے وہ جانوروں کا بادشاہ سمجھتے ہیں ۔ با ایں ہمہ جو لوگ اس کے مارنے میں حصہ لیتے ہیں ، ان سب کو ناپاک سمجھا جاتا ہے اور تین دن تک ایک علیحدہ جھونپڑے یا خیمے میں رہنا پڑھتا ہے ، جو ان لوگوں کے لیے خاص طور پر تیار یا نصب کیا جاتا ہے ۔ یہاں وہ ریچھ کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اسے پکاتے ہیں ۔ کوئی عورت اس ہرن کو سال بھر تک استعمال نہیں کر سکتی جو سلیڈ پر چیتے کو کھینچ کر لایا ہو ۔ بلکہ ایک اور روداد کے بموجب اسے مذکورہ بالا مدت تک کوئی بھی استعمال نہیں کر سکتا ۔ اپنے خیمۂ عزلت میں جانے سے قبل مردوں کو وہ سارے کپڑے اتار دینے پڑتے ہیں ، جو وہ ریچھ

کے شکار کے وقت پہنے رہے ہوں اور ان کی بیویاں آلڈر (بید کا سا ایک درخت جو برچ کی ایک قسم سے تعلق رکھتا ہے) کی چھال کی سرخ پیک ان کے منہ پر تھوکتی ہیں۔ وہ خیمے میں معمولی دروازے کی بجائے اس کی پشت پر ایک شگاف میں سے داخل ہوتے ہیں۔ جب ریچھ کا گوشت پک چکتا ہے تو اس کا کچھ حصہ دو آدمیوں کے ہاتھ عورتوں کو بھیجا جاتا ہے، جنھیں اس کے پکتے وقت مردوں کے خیمے کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔ یہ آدمی جو گوشت لے کر آتے ہیں اپنے آپ کو ایسے اجنبی ظاہر کرتے ہیں جو پردیس سے سوغات لے کر آئے ہوں۔ عورتیں انھیں جھوٹ موٹ اجنبی مان لیتی ہیں اور ان کی ٹانگوں میں سرخ ڈورے باندھنے کا وعدہ کرتی ہیں۔ عورتوں کو چیتے کا گوشت ان کے خیمے کے در میں سے نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اسے ایک طرف سے خیمے کا کنارا اٹھا کر اس کے اندر کھسکا دینا پڑتا ہے۔ جب علیحدگی کی یہ سہ روزہ مدت ختم ہو جاتی ہے اور مردوں کو اپنی اپنی بیویوں کے پاس جانے کی اجازت مل جاتی ہے تو وہ اس زنجیر کو اٹھائے جس سے برتن ٹنکے ہوتے ہیں، یکے بعد دیگرے دوڑتے ہوئے آگ کا طواف کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ پاک ہونے کی ایک صورت ہے۔ اس کے بعد وہ خیمے کے عام در سے نکل کر اپنی عورتوں کے پاس لوٹ سکتے ہیں۔ لیکن وہ شخص جس کی سرکردگی میں یہ ساری کارروائی عمل میں آتی ہے، دو دن اور اپنی بیوی سے صحبت نہیں کر سکتا۔

مزید برایں، کہا جاتا ہے کہ کافروں (مشرقی افریقہ کی ایک قوم جو بانتو نسل سے تعلق رکھتی ہے) کی اجگر سے روح فنا ہوتی ہے، ''اور اپنے بعض توہمات کے سبب وہ اسے مارنے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اگلے زمانے میں اس شخص کو جس نے اپنے بچاؤ کے لیے یا کسی اور وجہ سے اس سانپ کو مارا ہو، دن میں کئی کئی دفعہ بہتی ندی میں پڑا رہنا پڑتا تھا اور جب تک یہ فرض پورا نہیں کر لیتا، اس کے گاؤں میں کسی چوپائے کو ذبح کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے بعد لوگ بڑی احتیاط سے اس اجگر کی لاش کو اٹھا کر

لے جاتے اور مویشی کے باڑے کے قریب خندق کھود کر دفن کر دیتے ، جہاں وہ ایک سردار کی میت کی طرح پوری حفاظت سے مدفون رہتی۔ خوش قسمتی سے آدمیوں کے سوگ کی طرح عقوبت نفس کی یہ مدت اب گھٹ کر صرف چند دن رہ گئی ہے۔'' مدراس میں ناگ کا مارنا بڑا پاپ ہے۔ اگر کسی سے یہ پاپ ہو گیا ہو تو لوگ مردہ سانپ کو بعینہ آدمی کی لاش کی طرح جلاتے ہیں اور اسے مارنے والا اپنے آپ کو تین دن تک ناپاک تصور کرتا ہے۔ دوسرے دن سانپ کی راکھ پر دودھ کی دھار چڑھائی جاتی ہے اور تیسرے دن وہ پاپی پاک ہو جاتا ہے۔

ان آخری صورتوں میں وہ جانور جس کے خون کا قاتل کو کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے ، مقدس و متبرک متصور ہوتا ہے ، یعنی توہمات کی بناء پر اس کی جان لینے سے احتراز کیا جاتا ہے۔ تاہم ایسے کسی مقدس جانور کا خون کرنے والے پاپی کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ ویسا ہی کچھ معلوم ہوتا ہے جو کھانے کی غرض سے جانوروں کو مارنے والے عام پیشہ ور شکاریوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اس امر کے پیش نظر یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ تصورات جن پر مذکورہ بالا پاپیوں اور شکاریوں سے متعلق دستور مبنی ہیں ، فی نفسہ ایک ہیں۔ اگر میرا یہ خیال درست ہے تو یہ تصورات اصل میں جانوروں ، خاص کر کار آمد یا پر ہیبت چوپایوں کی روحوں کے تقدس کے اس احساس ، اور ان کے انتقام کے اس خوف سے عبارت ہیں جو وحشی کے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ اس نظریے کی تصدیق کسی حد تک انام (ویٹ نام) کے شکاریوں کی ان رسموں سے ہوتی ہے جو کسی مری ہوئی وہیل کے بہ کر کنارے پر آنے کے موقع پر ادا کی جاتی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شکاری وہیل کی افادیت کے سبب اس کی پرستش کرتے ہیں۔ سمندر کے ساحل پر کوئی گاؤں ایسا نہیں جس میں ایک چھوٹے سے مخروطی شکل کے مندر کے اندر وہیل کی حقیقی ہڈیاں نہ رکھی ہوں۔ جب موجیں کسی مردہ وہیل کو ساحل پر ڈال جاتی ہیں تو لوگ بڑی عقیدت سے اس کی رسم تدفین ادا کرتے ہیں۔ سوگ

منانے والوں میں سب سے نمایاں وہ شخص ہوتا ہے جس نے سب سے پہلے وہیل کو دیکھا ہو ۔ یہ شخص اس کی رسوم تدفین اسی طرح ادا کرتا ہے جس طرح اپنے قریبی عزیز کی کرے ۔ ماتمی لباس پہنے، جو تنکوں کے ٹوپ اور لمبی آستینوں والی اُلٹی عبا پر مشتمل ہوتا ہے ، نیز دوسرے ماتمی لوازمات سے آراستہ و پیراستہ ، وہ وہیل کے قریب ترین عزیز کی حیثیت سے اُس کے کریاکرم میں سب سے پیش پیش ہوتا ہے ۔ اس موقع پر عود و عنبر اور اگربتیاں جلائی جاتی ہیں ، طلائی اور نقرئی ورق نچھاور کیے جاتے ہیں اور پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں ، اُس مچھلی کا گوشت کاٹنے اور تیل نکالنے کے بعد اس کی لاش کا باقی ماندہ حصہ ریت میں دفن کر دیا جاتا ہے ۔ پھر ایک سائبان بنایا جاتا ہے اور اس کے اندر نذریں چڑھائی جاتی ہیں ۔ وہیل کے دفنائے جانے کے بعد عام طور پر اُس کی روح کسی شخص پر آن کر اس کی زبانی لوگوں کو یہ بتا جاتی ہے کہ وہ نر تھی یا مادہ ۔

اکیسواں باب

# اشیاء کی تحریم

(۱) امتناع کا مفہوم — اس طرح جاہلی معاشرے میں مذہبی پیشوا جن تطہیری رسوم کے پابند ہوتے ہیں وہ بہت سی باتوں میں آن ضوابط سے مطابقت رکھتی ہیں ، جو قاتلوں ، سوگوار لوگوں ، زچگی کے ایام میں عورتوں ، سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد لڑکیوں ، شکاریوں ، مچھیروں وغیرہ وغیرہ پر عاید ہوتے ہیں ۔ یہ مختلف قسم کے اشخاص ہمیں اپنی اپنی خصوصیات اور حالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز نظر آتے ہیں ۔ ان میں سے بعض کو ہم پاک اور مقدس کہہ سکتے ہیں اور بعض کو ناپاک اور نجس ، لیکن وحشی ان کے درمیان اس قسم کی اخلاقی حدیں قائم نہیں کرتا اور اسے حرمت اور نجاست کی کوئی تمیز نہیں ہوتی ۔ اس کے نزدیک یہ سب کے سب اشخاص یکساں خطرناک اور خطرے میں ہوتے ہیں اور ان کی بدولت دوسروں کو جو خطرہ لاحق ہوتا ہے وہ ایک روحانی وسوسہ ہے اور اس لیے محض ایک فریب تخیل ۔ تاہم وہ خیالی ہونے کی وجہ سے بے بنیاد اور اصلیت سے خالی نہیں ہوتا ۔ تخیل انسان پر اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے ، جس طرح کشش ثقل اور وہ آدمی کا کام اسی طرح تمام کر سکتا ہے ، جس طرح پروشیائی تیزاب (ہائیڈرو سائنک ایسڈ) کی ایک خوراک ۔ ان اشخاص پر جو ٹیبو عاید ہوتے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ ان کا مقاطعہ کرکے آن روحانی آفتوں کا سد باب کیا جائے ،

جن کا اُن کو یا ان کی وجہ سے دوسروں کو دھڑکا لگا ہو۔ یہ ٹیبو یا امتناع گویا برقی حواجز (Insulators) کا کام دیتے ہیں، تاکہ وہ روحانی قوت محفوظ رہے جن کا بار ایسے اشخاص میں بھرا ہو اور دوسری طرف اس قوت سے عالم خارجی کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔

ان کلیوں کی توضیح میں میں اب پہلے ممنوعہ اشیاء اور ممنوعہ الفاظ کی مثالیں پیش کروں گا۔ وحشی کے نزدیک اشخاص کی طرح اشیاء اور الفاظ دونوں میں تحریم کی پر اسرار قوت سے عارضی یا مستقل طور پر گویا برقی رو پیدا ہو سکتی ہے اور وہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ طویل یا مختصر مدت کے لیے ان کا عام استعمال ممنوع قرار دیا دے جائے۔ محولہ بالا مثالوں کے انتخاب میں ہم نے خصوصیت کے ساتھ مقدس سرداروں، بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں کو ملحوظ رکھا ہے، جو اوروں سے کہیں زیادہ ٹیبو کے شکنجوں میں جکڑے ہوتے ہیں۔ ممنوعہ اشیاء پر اسی باب میں روشنی ڈالی جائے گی اور ممنوعہ الفاظ آئندہ باب کا موضوع ہوں گے۔

(۲) لوہے کی تحریم—اس ضمن میں سب سے پہلے یہ امر قابل ذکر ہے کہ لوگوں کے دلوں پر بادشاہوں کے تقدس کی جو ہیبت چھائی ہوتی ہے، اس کی وجہ سے قدرتی طور پر ان کے متبرک جسموں کو چھونے پر امتناع لگ جاتا ہے۔ چنان چہ اسپارٹا کے بادشاہ پر ہاتھ رکھنا خلاف قانون تھا۔ سیام کے بادشاہوں کو چھونے کی سخت ممانعت تھی اور اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کی سزا موت تھی۔ کوئی شخص شاہ کمبوڈیا کو اس کے حکم کے بغیر نہیں چھو سکتا تھا۔ جولائی ۱۸۷۳ء میں یہ بادشاہ اپنی گاڑی سے گر کر زمین پر بے ہوش پڑا رہا، لیکن اس کے خدام میں سے کسی کو آسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہ ہوئی۔ ایک یورپین اتفاق سے آدھر آ نکلا اور زخمی بادشاہ کو اٹھا کر اس کے محل میں لے گیا۔ کسی زمانے میں شاہ کوریا کو کوئی نہیں چھو سکتا تھا۔ اگر وہ رعایا میں سے کسی فرد کو چھونے کا

شرف بخشتا تو اس کے بدن کا وہ حصہ مقدس ہو جاتا جسے بادشاہ نے مس کیا ہو اور اس معزز شخص کو تمام عمر ایک نشان امتیاز (عموماً ریشم کا سرخ ڈورا) لگائے رہنا پڑتا ۔ بادشاہ کے لیے سب سے بڑھ کر لوہا حرام تھا ۔ ۱۸۰۰ء میں شاہ ٹائنگ ٹسانگ ٹائی اونگ کی پیٹھ میں رسولی ہو گئی اور اس سے وہ مر گیا ۔ کسی کو اس پر نشتر رکھنے کا خیال تک نہ گزرا ، جس سے شاید اس کی جان بچ جاتی ۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بادشاہ کے ہونٹ پر پھوڑا نکل آیا اور وہ درد سے تڑپنے لگا ۔ اس کے طبیب نے مسخرے کو بلا لیا جس نے اپنی شوخیوں سے بادشاہ کو اس قدر ہنسایا کہ اس کا پھوڑا پھوٹ گیا ۔ رومیوں اور سابینیوں (سابین ، ایک قدیم اطالوی قوم جو روم کے گرد و نواح میں آباد تھی ۔ کہتے ہیں کہ ایک دعوت میں رومی ان کی عورتوں کو لے اڑے اور دونوں قوموں میں جنگ چھڑ گئی ، لیکن بعد میں ان کی صلح ہو گئی اور سابین روم منتقل ہو گئے) کے آئمۂ مذہب کی حجامت آہنی اوزار سے نہیں بنائی جا سکتی تھی بلکہ اس کام کے لیے صرف کانسی کے استروں اور قینچیوں کے استعمال کی اجازت تھی اور جب کبھی کھدائی کا کوئی آہنی اوزار روم میں آرول برادری (ایک قدیم مذہبی ادارہ) کے مقدس شجر زار کے اندر سنگی کتبوں کی منبت کاری کی غرض سے لے جایا جاتا تو بزغالہ یا سور بطور کفارہ بھینٹ چڑھانا پڑتا تھا ، اور یہی کفارہ اس اوزار کے شجرزار سے لے جاتے وقت بھی دینا پڑتا ۔ یونانی عبادت گاہوں میں لوہا لانا ممنوع تھا ۔ کریٹ میں مینے ڈیمس کے نام کی قربانی میں لوہے کی کوئی چیز استعمال نہیں کی جاتی تھی ، اس لیے کہ ایک قصے کے بموجب ٹروجانی جنگ میں مینے ڈیمس آہنی ہتھیار سے مارا گیا تھا ۔ پلاٹے کا آرکن (میجسٹریٹ) لوہے کو نہیں چھو سکتا تھا ، لیکن سال میں ایک دفعہ جب ان آدمیوں کی یاد منائی جاتی ، جو جنگ پلاٹے میں کام آئے تھے تو اسے بیل ذبح کرنے کے لیے تلوار لے جانے کی اجازت تھی ۔ ہائن ٹاٹوں کا مذہبی پیشوا آج بھی کسی جانور کی قربانی یا بچے کی ختنہ کے لیے لوہے کا چاقو استعمال نہیں کرتا ، بلکہ اس کام کے لیے وہ ہمیشہ سنگ چینی کے ٹکڑے استعمال کرتا ہے ۔

جنوب مغربی افریقہ کی اوامبو قوم کے دستور کی رو سے بچے کی ختنہ چقماق کے تیز ٹکڑے سے کی جانی چاہیے اور اگر کسی وقت چقماق میسر نہ آئے تو اس عمل جراحی کے لیے لوہا استعمال کیا جا سکتا ہے ، لیکن اس لوہے کو استعمال کے بعد دفن کر دینا چاہیے ۔ اریزونا کے موکیوں کے ہاں چاقو ، کلہاڑی وغیرہ جیسے اوزار کا عام رواج اٹھ گیا ہے ؛ البتہ اس قسم کے اوزار اب صرف مذہبی رسموں میں استعمال ہوتے ہیں ۔ پانیوں (ایک قدیم امریکی قبیلہ) کے ہاں سنگی سفانوں کا عام رواج ختم ہونے کے بعد بھی ان سے قیدی ، بیل یا ہرن کی قربانی کی جاتی رہی ۔ یہودیوں نے بیت المقدس کے ہیکل یا کسی مذبح کی تعمیر میں لوہا استعمال نہیں کیا ۔ روم کا قدیم چوبی پل جو مقدس سمجھا جاتا تھا ، لوہے یا کانسی کے کسی اوزار سے کام لیے بغیر بنایا گیا اور اس کی مرمت میں بھی دھاتیں استعمال نہیں کی گئی تھیں ۔ قانون میں یہ صراحت اس کی گنجائش رکھی گئی تھی کہ قرنوں میں جو پیٹرلی بر کی مرمت آہنی اوزاروں سے کی جا سکتی ہے ۔ سائی زیکس میں مجلس شوریٰ کی عمارت کیلوں کے بغیر نری لکڑی کی بنائی گئی تھی ، جس میں کڑیاں اس طرح جوڑی گئی تھیں کہ انھیں نکال کر بدلا جا سکتا تھا ۔

لوہے سے پرہیز کا آغاز غالباً معاشرے کے ارتقاء کے اس قدیم دور میں ہوا جب یہ دھات لوگوں کے لیے ہنوز ایک عجوبہ تھی اور اکثر اسے شک اور نا پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے ، اس لیے کہ غیر مہذب انسان ہر نئی چیز سے ہیبت کھاتا ہے ۔ بورنیو جانے والے ایک ابتدائی مہم جو کا بیان ہے کہ ''ڈوسونوں کا یہ عجیب وہم ہے کہ انھیں جو کچھ پیش آتا ہے ، خواہ وہ اچھا ہو یا برا ، مبارک ہو یا نا مبارک ، ان کے ملک میں آئی ہوئی کسی نہ کسی نئی چیز سے منسوب کر دیا جاتا ہے ۔ مثلاً حال ہی میں یہاں جو شدید گرمی پڑی ہے اس کا سبب میرا کنڈرام میں قیام تھا ۔'' ۱۸۸۶–۱۸۸۷ء کی سردیوں میں انگریزوں کے جزائر نکوبار کے جائزے کے بعد اتفاق سے زبردست بارش ہو گئی ۔ اسے وہاں کے دہشت زدہ باشندوں نے ان روحوں کے

غیظ و غضب سے منسوب کر دیا ، جن کے بہت سے مسکنوں میں زاویہ بیں (Theodolites) سطح پیما اور دوسرے عجیب و غریب آلے لگا دیے گئے تھے ۔ اور ان میں سے بعض نے یہ تجویز کیا کہ روحوں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے سور قربان کیے جائیں ۔ سترھویں صدی میں موسم کی متواتر خرابی کی وجہ سے ایستھونیائی کسانوں نے بغاوت کر دی ۔ ان کی دانست میں اس مصیبت کا اصل سبب ایک پن چکی تھی ، جو کسی ندی کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا کرکے اس کے لیے تکلیف کا باعث بنی ہوئی تھی ۔ پولستان میں جب پہلے پہل آہنی ہل رائج کیے گئے تو اتفاق سے کئی فصلیں خراب نکلیں اور کسانوں نے اس کا سبب ان آہنی ہلوں کو قرار دے کر ان کے استعمال سے احتراز کرنا شروع کر دیا اور ان کی جگہ پھر سے وہی پرانے لکڑی کے ہل استعمال کرنے لگے ۔ جاوا کے غیر مہذب بدوی ''جن کا گزارا زیادہ تر کھیتی باڑی پر ہے ، اپنے کھیتوں کی گڈائی میں لوہے کی کوئی چیز استعمال نہیں کریں گے ۔

جدت و اختراع سے مذہب کو جو بیر ہے وہ بجائے خود اس بات کی وضاحت کے لیے کافی ہے کہ لوہے کو توہم پرست بادشاہ اور مذہبی رہنما ناپسندیدگی کی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں اور اس سے دیوتاؤں کو متنفر کیوں سمجھتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ بعض مقامات پر اتفاقی اسباب کی بناء پر اس نفرت نے شدت اختیار کر لی ہو ، جیسے موسم کی متواتر خرابی کے سبب پولستان میں آہنی ہل نا مقبول ہو گئے تھے ۔ لیکن لوہے سے دیوتاؤں اور ان کے کارپردازوں کے تنفر کا دوسرا رخ بھی ہے ، یعنی اس کی بدولت انسان کے ہاتھ ایک حربہ آ جاتا ہے جو حسب ضرورت روحوں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ چوں کہ لوہے سے ان کو اس قدر متنفر سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں یا چیزوں کے قریب تک نہیں آتے جو اس مکروہ دھات کی حفاظت میں ہوں ، لہٰذا ظاہر ہے کہ اس سے ایک نیرنگ یا طلسم کا کام لیا جا سکتا ہے تاکہ بھوت پریت یا دوسری خطرناک روحوں کا بند باپ کیا جا سکے ۔ چناں چہ اسکاٹ لینڈ کے کہستانوں میں بھتنوں

سے بچاؤ کا سب سے مؤثر ذریعہ لوہا یا اس سے بھی بڑھ کر فولاد ہے۔ خواہ یہ دھات تلوار کی صورت میں ہو یا چاقو کی، بندوق کی نالی یا کسی اور صورت میں، بھتنوں کو دور رکھنے کی پوری پوری طاقت رکھتی ہے۔ جب کبھی آپ کسی ایسی عمارت میں داخل ہوں جہاں کسی پری کا بسیرا ہو تو آپ اس کے دروازے پر فولاد کا کوئی ٹکڑا جیسے چاقو، سوئی یا مچھلی پکڑنے کا کانٹا پیوست کرنا نہ بھولیے۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا تو پھر جب تک آپ عمارت سے باہر نہ نکل آئیں بھتنے دروازہ نہیں بند کر پائیں گے۔ اگر آپ نے ہرن مارا ہو اور اسے گھر لا رہے ہوں، تو اس کے جسم میں چاقو ضرور گھونپے رکھیے، اس سے پریاں اس پر اپنا ہوجھ نہیں ڈالیں گی۔ آپ کی جیب میں صرف ایک کیل رات کے وقت پریوں کو آپ کے اٹھا کر لے جانے سے روکنے کے لیے کافی ہے۔ زچہ خانے میں عورتوں کے پلنگ کے سامنے کیلیں رکھنے سے وہ اور ان کے بچے بھتنوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن بھتنوں کو یقینی طور پر روکنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ زچہ کے پلنگ کے نیچے استری اور کھڑکی میں درانتی رکھ دی جائے۔ اگر کوئی بیل چٹان پر سے گر کر مر گیا ہو تو اس کے جسم میں ایک کیل چبھو دی جائے، اس کا گوشت پریوں سے محفوظ رہے گا۔ یہودی سارنگی (یہ سارنگی منہ میں رکھ کر دھات کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے بجائی جاتی ہے، جو ٹنگ یا زبان کہلاتا ہے) پر جو گانا گایا جاتا ہے اس سے بھتنیاں شکاری کے پاس نہیں پھٹکتیں، اس لیے کہ اس کی زبان فولاد کی ہوتی ہے۔ مراقش میں لوہا شیاطین سے بچاؤ کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہاں عام طور پر بیمار کے تکیے کے نیچے چاقو یا خنجر رکھ دیا جاتا ہے۔ سنگھالیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے گرد ہر دم ارواح خبیثہ منڈلاتی رہتی ہیں اور انھیں نقصان پہنچانے کے لیے موقع کی تاک میں رہتی ہیں۔ ان کے ہاں کوئی کسان کیک یا بھنے ہوئے گوشت جیسی کوئی لذیذ چیز ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی جرأت نہیں کرتا جب تک کہ وہ بھوت پریت کو اس سے دور رکھنے اور اس طرح اس کے کھانے والے کو بیماری سے بچانے کے لیے اس پر

ایک آدھ کیل نہ رکھ لے ۔ کسی بیمار کو ہاتھ میں چابیوں کا گچھا یا چاقو لیے بغیر گھر سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہیں ہوتی ، اس لیے کہ یہ طلسم پاس نہ ہو تو اسے خوف ہوتا ہے کہ کوئی بھوت اس کی نقاہت سے فائدہ اٹھا کر اس کے جسم میں گھس جائے گا ۔ اگر کسی شخص کے جسم پر نمایاں گھاؤ یا سوجن ہو تو شیاطین سے بچاؤ کے لیے وہ اس پر لوہے کا ٹکڑا رکھ دیتا ہے ۔ سلیو کوسٹ میں جب کوئی ماں یہ دیکھتی ہے کہ اس کا بچہ روز بروز گھلتا جا رہا ہے تو وہ یہ سمجھ لیتی ہے کہ بچے پر بھوت پریت کا اثر ہو گیا ہے اور اسی لحاظ سے اپنی آزمائی ہوئی تدبیریں اختیار کرتی ہے ۔ بچے کے جسم سے بھوت کو بہلا پھسلا کر نکالنے کے لیے وہ اسے کھانا پیش کرتی ہے اور بھوت جب اس پر ٹوٹ پڑتا ہے تو جھٹ اپنے بچے کے پاؤں میں آہنی کڑے اور گھنگرو اور گلے میں زنجیر ڈال دیتی ہے ۔ خیال ہے کہ لوہے کی کھنک اور گھنگروؤں کی جھنکار سے بھوت بھوجن کر چکنے کے بعد ننھے بیمار کے جسم میں دوبارہ داخل نہیں ہونے پائے گا ۔ اسی لیے افریقہ کے اس علاقے میں بہت سے بچے لوہے کی چیزوں میں لدے نظر آئیں گے ۔

(۳) تیز ہتھیاروں کی تحریم—برما میں زینگ دیہہ کے شمال میں ایک مذہبی بادشاہ ہے جس کو سوتیہہ لوگ دین و دنیا کا سب سے بڑا حاکم مانتے ہیں ۔ اس کے گھر میں کسی قسم کا ہتھیار یا اوزار نہیں لایا جا سکتا ۔ اس امتناع کی توجیہ شاید اس عام دستور کی روشنی میں ہو سکے جو مختلف قوموں میں جاری ہے اور جس کے بموجب لوگ کسی شخص کی موت کے بعد ، جب تک اس کی روح کے متعلق یہ خیال ہو کہ وہ پاس ہی کہیں موجود ہے ، تیز اوزاروں کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں ، اس لیے کہ اس میں روح کے چوٹ آنے کا احتمال ہوتا ہے ۔ چناں چہ آب نائے بیرنگ کے اسکیموؤں کے ہاں ''کوئی موت ہو جائے تو تمام دن کسی کو کام کرنے کی اجازت نہیں اور متوفی کے رشتہ داروں کو تین دن تک محنت مزدوری سے احتراز کرنا پڑتا ہے ۔ اس دوران میں چاقو یا کلہاڑی جیسے کسی تیز اوزار سے کٹائی کرنے

کی خاص ممانعت ہے اور سوئی اور سوئے کی قسم کی نکیلی چیزوں کا استعمال بھی ممنوع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی چیزوں سے اس لیے پرہیز کیا جاتا ہے کہ کہیں متوفی کے سائے یا روح کو چوٹ یا خراش نہ آ جائے جو اس عرصے میں کسی وقت بھی ادھر کا گشت لگا سکتی ہے۔ اگر بد قسمتی سے ایسے کسی اوزار کے لگنے سے اس کے چوٹ آ جائے تو وہ برہم ہو جائے گی اور لوگ بیمار پڑ جائیں گے یا مر جائیں گے۔ متوفی کے رشتہ داروں کو کسی قسم کا شور مچانے سے بھی محترز رہنا پڑتا ہے، مبادا اس کا سایہ چونک اٹھے اور برہم ہو جائے۔'' ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ اسی طرح یہ اسکیمو سفید وہیل کو مارنے کے بعد اس اندیشے سے چار دن تک تیز یا نکیلے اوزاروں کے استعمال سے اجتناب کرتے ہیں کہ کہیں ان کے ہاتھوں نادانستہ اس مچھلی کے زخم یا خراش نہ آ جائے۔ بعض وقت وہ اسی ٹیبو پر گاؤں میں کسی کے بیمار ہونے پر بھی کار بند ہوتے ہیں، مبادا اس سائے کو گزند پہنچ جائے جو بیمار کے جسم کے پاس منڈلا رہا ہو۔ ٹرانسلوینیا کے رومانوی کسی موت کے بعد میت کے اٹھنے تک یہ احتیاط رکھتے ہیں کہ گھر میں کوئی چاقو اس طرح کھلا نہ پڑا رہے کہ اس کی دھار اوپر کی طرف ہو۔ اگر یہ احتیاط نہ برتی گئی تو ''روح مجبور ہو کر اس کے پھل پر سے چلنے لگے گی۔'' چینی کسی کی موت کے بعد سات دن تک، جب کہ میت ابھی گھر ہی میں ہوتی ہے، چاقو اور سوئی بلکہ اپنی کھانے کی تیلیوں کے استعمال سے بھی پرہیز کرتے ہیں اور انگلیوں سے کھانا کھاتے ہیں۔ اگلے زمانے کے پروشیا اور لیتھونیا والے کسی میت کے بعد تیسرے، چھٹے، نویں اور چالیسویں دن کھانا پکایا کیا کرتے تھے، جس میں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر متوفی کی روح کو دعوت دیتے۔ ان حاضریوں میں سب لوگ میز کے گرد بیٹھ کر خاموشی سے کھانا کھاتے اور چھریاں استعمال نہ کرتے، بلکہ ان عورتوں کے پاس بھی کوئی چھری نہ ہوتی جو ان حاضریوں کا اہتمام کرتیں۔ جو لقمے میز پر سے گر پڑتے انھیں ان لاوارث روحوں کے لیے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا جنھیں کھلانے والا دنیا میں کوئی نہ ہو۔

جب کھانا ختم ہو چکتا تو پادری جھاڑو لے کر یہ کہتا ہوا روحوں کو گھروں میں سے نکالتا ''روحو! تمام کھا پی چکیں، بس اب چلی جاؤ، چلی جاؤ!'' ان مثالوں کے پیش نظر ہمارے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ برما کے مذکورہ بالا پیشوائے اعظم کے گھر میں کٹائی کا کوئی اوزار کیوں نہیں لے جایا جا سکتا۔ اور بہت سے مذہبی قسم کے بادشاہوں کی طرح اس کی ذات بھی غالباً مظہرالوہیت متصور ہوتی ہے، لہذا ضروری ہے کہ جب کبھی اس کی روح ہوا میں منڈلانے یا کسی مہم پر کہیں دور جانے کے لیے اپنے کالبد خاکی سے برآمد ہو تو اس کے خراش یا چوٹ آنے کا کوئی خطرہ نہ رہے۔

(۴) **خون کی تحریم**—ہم دیکھ آئے ہیں کہ فلیمن ڈیالس کے لیے کچے گوشت کا چھونا بلکہ اس کا نام بھی لینا ممنوع تھا۔ بعض اوقات کسی پنڈت کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ کچے گوشت، خون یا ایسے اشخاص کی طرف نہ دیکھے جن کا ہاتھ کٹ گیا ہو۔ یوگانڈا میں جڑواں بچوں کے باپ پر ان کی پیدائش کے بعد کچھ عرصے تک ٹیبو لگا رہتا ہے۔ منجملہ دیگر امتناعات کے اسے کسی جاندار چیز کو مارنے یا خون دیکھنے کی ممانعت ہے۔ جزائر پی لیو میں جب کسی گاؤں پر دھاوا ہو اور دشمن کسی کا سر اتار کر لے گئے ہوں، تو مقتول کے رشتہ داروں کی تحریم ہو جاتی ہے اور اس پریت سے بچاؤ کی غرض سے چند قیود عاید ہو جاتی ہیں۔ انھیں گھر کے اندر بند کر دیا جاتا ہے اور وہ کچے گوشت کو نہیں چھوتے اور عامل کے پڑھے ہوئے پان کھاتے ہیں۔ اس کے بعد مقتول کا پریت قاتل کی تلاش میں دشمن کے ملک چلا جاتا ہے۔ یہ ٹیبو غالباً اس عام عقیدے پر مبنی ہے کہ جانور کی روح یا جان اس کے خون میں ہوتی ہے۔ چوں کہ تحریم شدہ اشخاص کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ ان کی حالت مخدوش ہوتی ہے، مثلاً کسی مقتول کے رشتہ داروں کو اس کی غضب ناک روح کے حملے کا خطرہ ہوتا ہے، لہذا ایسی خاص صورت میں ضروری ہے کہ انھیں اس طرح علیحدہ رکھا جائے کہ روحوں سے ان کا کوئی رابطہ نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے اشخاص کو کچے گوشت

سے پرہیز کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن یہ ٹیبو حسب معمول ایک عام امتناع کی مخصوص عملی صورت ہے ۔ دوسرے لفظوں میں اس کی پابندی خصوصیت کے ساتھ ایسے حالات میں ضروری ہوتی ہے جو شدت کے ساتھ اس کی تعمیل کے مقتضی ہوں ۔ لیکن ان ہنگامی حالات کے علاوہ بھی اسی امتناع پر کسی قدر نرمی کے ساتھ زندگی کے ایک اصول کی حیثیت سے عمل درآمد ہوتا رہتا ہے ۔ چناں چہ ایستھونیا کے بعض لوگ جانور کے خون کو نہیں چکھیں گے ان کے اعتقاد کے بموجب اس میں جانور کی روح شامل ہوتی ہے اور وہ اس کے چکھنے والے کے جسم میں حلول کر جاتی ہے ۔ شمالی امریکہ کے بعض قدیم قبیلے ''مذہب کے ایک کڑے اصول کے بموجب جانور کا خون پینے سے سخت اجتناب کرتے ہیں کیوں کہ اس میں جانور کی روح داخل و شامل ہوتی ہے ۔'' یہودی شکاری اپنے مارے ہوئے جانور کا خون بہا کر اس پر مٹی ڈال دیا کرتے تھے ۔ وہ خون کو زبان پر بھی نہیں رکھتے تھے کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ جانور کی روح یا جان اس میں ملی ہوتی ہے ، بلکہ خون ہی اس کی جان ہے ۔

یہ ایک عام اصول ہے کہ شاہی خون زمین پر نہ گرنے دیا جائے ۔ اسی لیے جب کسی بادشاہ یا اس کے خاندان کے کسی فرد کو قتل کرنا ہوتا ہے تو ایسی تدبیر اختیار کی جاتی ہے کہ شاہی خون زمین پر بہنے نہ پائے ۔ ۱۶۸۸ء میں سیام کی بری فوج کے سپہ سالار اعلیٰ نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کو اسی طریقے سے قتل کیا جو ''شاہی مجرموں یا ان شاہزادوں کو ہلاک کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے ، جنھیں کسی سنگین جرم کی پاداش میں سزائے موت سنائی گئی ہو ۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ ان کو ایک کڑھاؤ میں ڈال دیا جاتا ہے اور موسلیوں سے کوٹ کوٹ کر ان کا قیمہ کر دیا جاتا ہے ، اس لیے کہ شاہی خون کا ایک قطرہ زمین پر نہیں ٹپکنا چاہیے ۔ ان کے مذہب کی رو سے مقدس خون کو خاک میں ملا کر ناپاک کرنا انتہائی بے ادبی ہے ۔'' قبلائی خان چنگیز خاں کا پوتا اور (چین کی منگولی سلطنت کا بانی جو تیرھویں صدی میں گزرا ہے) نے اپنے باغی چچا نایان کو شکست

دے کر گرفتار کیا تو اسے ایک قالین میں لپٹوایا اور جھلوا جھلوا کے مروایا ۔ ''وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے شاہی سلسلے کے ایک فرد کا خون زمین پر گرے یا اس پر آکاش دیوتا اور سورج دیوتا کی نظر پڑے ۔'' ریکولڈ راہب ایک تاتاری مقولے کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے :

> ''تخت کے لیے ایک خان دوسرے خان کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے ، لیکن ساتھ ہی وہ اس کی سخت احتیاط برتتا ہے کہ خون نہ بہنے پائے ، کیوں کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ خان اعظم کا خون زمین پر گرانا سخت بے ادبی ہے ۔ چناں چہ وہ ملزم کو کسی نہ کسی طرح اس کا سانس گھونٹ کر مار ڈالتے ہیں ۔ دربار برما میں بھی شاہی خون کے متعلق یہی کچھ احساس پایا جاتا ہے ، جہاں شاہزادوں کے لیے خون بہائے بغیر پھانسی دینے کا ایک طریقہ مخصوص ہے ۔''

شاہی خون بہانے سے یہ ابا خوں ریزی یا کم از کم خون کو زمین پر گرانے کے خلاف عام رجحان کی محض ایک مخصوص صورت معلوم ہوتا ہے ۔ مارکوپولو کا بیان ہے کہ اس کے زمانے میں جو لوگ بے وقت کمبالوک (پیکن) کے گلی کوچوں میں پکڑے جاتے ، انھیں حراست میں لے لیا جاتا اور اگر ان کا جرم ثابت ہو جاتا تو ان کے قمچیاں لگائی جاتیں ۔ ''اس طرز تعزیر سے لوگ بعض وقت مر جاتے تھے لیکن اسے اس لیے اختیار کیا جاتا تھا کہ خوں ریزی نہ ہونے پائے ، کیوں کہ ان کے 'باکسیوں' کا کہنا ہے کہ آدمی کا خون بہانا فعل بد ہے ۔'' مغربی سسیکس کے لوگوں کے عقیدے کے بموجب اس زمین پر جہاں آدمی کا خون بہایا گیا ہو ، لعنت برستی ہے اور وہ بارور نہیں ہوتی ۔ بعض وحشی اقوام میں جب کسی شخص کا خون بہانا ہوتا ہے تو اسے زمین پر نہیں گرنے نہیں دیا جاتا ، بلکہ قبیلے کے لوگ اس کے آگے آ جاتے ہیں تاکہ خون جاری ہو کر ان کے جسموں

پر گرے ۔ چناں چہ بعض آسٹریلوی قبائل میں جن لڑکوں کی ختنہ کی جانے والی ہو ، انھیں قبیلے کے لوگوں کے اوپر لٹا دیا جاتا ہے ، جو اس کے لیے اپنے جسموں کا ایک چبوترہ سا بنا دیتے ہیں ، اور جب کسی لڑکے کی رسم بلوغ پر اس کا دانت اکھاڑا جاتا ہے تو اسے ایک آدمی کے کندھوں پر بٹھا دیا جاتا ہے اور اس کی چھاتی پر لڑکے کا خون بہہ نکلتا ہے جسے پونچھنے کی ممانعت ہے ۔ ''نیز گل والے (فرانسیسی) اپنے دشمنوں کا خون پیا اور اس سے اپنے جسم رنگا کرتے تھے، اور بیان کیا جاتا ہے کہ آئرستان والوں کے ہاں بھی یہی دستور تھا ۔ خود میں نے بھی بعض آئرستانیوں کو خون پیتے اور اپنے جسموں پر ملتے دیکھا ہے ، لیکن دشمنوں کے خون کو نہیں ، بلکہ اپنے لوگوں کے خون کو ۔ جب مرو اوبرائن نامی ایک غدار کو قتل کرکے اس کے چار ٹکڑے کیے گئے تو میں نے دیکھا کہ ایک بڑھیا جس نے اس شخص کو گود لے کر پالا تھا ، یہ کہتی ہوئی آگے بڑھی کہ اس کا خون ایسا نہیں کہ یوں خاک میں ملے اور اس کا سر اٹھا کر اس سے بہتا ہوا سارا خون چوس گئی ۔ اس کے علاوہ اس نے آہ و زاری کرتے اور اپنے بال الجھاتے ہوئے اس شخص کے لہو سے اپنا چہرہ اور سینہ تر کر لیا ۔'' وسطی افریقہ کے لاتوکا لوگوں کے ہاں جس زمین پر زچگی کے خون کا قطرہ ٹپکا ہو ، وہاں کی مٹی کھود کر اس پانی کے برتن میں ڈال دی جاتی ہے جس سے زچہ نے غسل کیا ہو اور اسے گھر کی بائیں جانب ایک گڑھا کھود کر ، جو خاصا گہرا ہوتا ہے ، گاڑ دیا جاتا ہے ۔ مغربی افریقہ کے دستور کی رو سے اگر کسی شخص کے خون کا ایک قطرہ بھی ٹپک جائے تو اسے بڑی احتیاط سے ڈھانک دینا اور رگڑ کر مٹا دینا چاہیے ۔ اگر وہ کسی کشتی کے پہلو یا درخت پر گرے تو اس کی اتنی چپٹی کاٹ کر تلف کر دی جاتی ہے ۔ افریقیوں کی ان ریتوں کا ایک محرک یہ خواہش ہو سکتی ہے کہ ان کا خون کسی جادوگر کے ہاتھ نہ لگنے پائے ، جو اس کی مدد سے انھیں نقصان پہنچا سکتے ہیں ۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ مغربی افریقہ والے اسی سبب سے اپنے خون کا داغ زمین پر سے مٹا ڈالتے ہیں یا اس لکڑی کو کاٹ پھینکتے ہیں

جس میں ان کا خون جذب ہوا ہو ۔ جادو ٹونے کے اسی خوف سے نیوگنی کے دیسی ایسی لکڑیوں ، پتوں یا دھجیوں کو جلا ڈالتے ہیں ، جن پر ان کے خون کا دھبا لگا ہو ۔ اور اگر ان کا خون زمین پر ٹپکا ہو تو وہ اس جگہ کی مٹی کھرچ ڈالتے ہیں اور بن پڑے تو وہاں آگ بھی جلا دیتے ہیں ۔ یہی خوف ان عجیب و غریب فرائض کی پشت پر بھی ہے جو مدغاسکر کے بیٹ سی لیو لوگوں کے ہاں ایک خاص طبقے کے افراد کو بجا لانا پڑتا ہے ، جو 'رامانگا' یا عالی نسب کہلاتے ہیں ۔ ان لوگوں کا کام امیروں کے کٹے ہوئے ناخن کھانا اور ان کے جسم سے بہتا ہوا خون چاٹنا ہے ۔ جب امراء اپنے ناخن کاٹتے ہیں تو یہ رامانگا ایک ایک ناخن چن کر نگل جاتے ہیں ۔ اگر یہ ناخن بہت بڑے ہوں تو ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیے جاتے ہیں اور پھر انھیں حلق سے اتا لیا جاتا ہے ۔ نیز اگر ناخن کاٹنے یا کسی چیز پر چلنے میں یا یوں ہی کسی اور طرح سے کسی امیر کے خراش آ جائے تو رامانگا بڑی تیزی سے اس کا خون چاٹ لیتے ہیں ۔ امرائے کبیر میں شاید ہی ایسا کوئی ہو جو اپنے ان حقیر خدام کے بغیر کہیں جاتا ہو ۔ لیکن اگر اتفاق سے کسی وقت ان میں سے کوئی حاضر نہ ہو تو کٹے ہوئے ناخن یا بہتا ہوا خون بڑی احتیاط سے رامانگا کے لیے اکٹھا کر لیا جاتا ہے ۔ ان میں امارت کا کوئی مدعی ایسا نہیں جو اس دستور کا سختی سے پابند نہ ہو ، جس کا مقصد غالباً یہ ہے کہ اس کے جسم کے یہ اجزاء ساحروں کے ہتے نہ چڑھنے پائیں ، جو سحر متعدی کے اصول کے بموجب اس کو ان اجزاء کے ذریعے نقصان پہنچا سکتے ہیں ۔

زمین پر خون ریزی کے خلاف اس رجحان کا سبب غالباً یہ عقیدہ ہے کہ روح شامل خون ہوتی ہے اور اس لیے جس زمین پر خون گرے وہ لازمی طور پر حرام یا مقدس ہو جاتی ہے ۔ نیوزی لینڈ میں ہر وہ چیز جس پر اتفاق سے کسی بڑے سردار کے لہو کی ایک بوند ٹپک جائے ، مقدس یا حرام ہو کر اس کے لیے وقف ہو جاتی ہے ۔ مثلاً ایک دفعہ دیسیوں کی ایک جماعت ایک نفیس سی نئی کشتی میں ایک سردار

کے درشن کو آئی ۔ سردار اس کشتی میں داخل ہوا ، لیکن چڑھتے ہوئے کشتی میں لگی ہوئی کوئی چپٹی اس کے پاؤں میں چبھ گئی اور اس کا لہو کشتی پر ٹپک گیا ۔ کشتی اسی وقت سردار کے لیے مختص ہو گئی ۔ کشتی کا مالک اس سے کود پڑا ، اسے کھینچ کر سردار کے مکان پر لے آیا اور وہیں چھوڑ گیا ۔ اس کے علاوہ کوئی سردار ایک مسیحی مبلغ کے مکان میں داخل ہوتے ہوئے اس کے شہتیر سے ٹکرا گیا اور اس کا خون بہنے لگا ۔ دیسیوں کا کہنا تھا کہ اگر اگلے زمانے میں ایسا ہوتا تو وہ مکان سردار کا ہو جاتا ۔ جیسا کہ ہمہ‌گیر قسم کے ٹیبوؤں کی صورت میں بالعموم ہوا کرتا ہے ۔ زمین پر کسی ہم قبیلہ شخص کا خون گرانے پر امتناع خصوصیت کے ساتھ بادشاہوں اور سرداروں پر سختی سے عاید ہوتا ہے اور جہاں اور لوگ اسے پس پشت ڈال دیتے ہیں ، وہاں سردار اور بادشاہ مدتوں اس کے پابند رہتے ہیں ۔

(۵) سر کی تحریم — بہت سی قوموں میں سر کی خاص حرمت ہے اور بعض وقت اس کے خاص تقدس کو اس عقیدے سے منسوب کیا جاتا ہے کہ اس کے اندر ایک زود حس روح رہتی ہے جو ذرا سی بد سلوکی یا بے ادبی سے متاثر ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ یوروباؤں (مغربی افریقہ کی ایک قوم) کے نزدیک ہر آدمی کے جسم میں تین روحیں رہتی ہیں ۔ ان میں پہلی روح کا مسکن جو 'اولوری' کہلاتی ہے ، سر ہے ۔ یہ روح آدمی کی محافظ ، سر پرست اور رہنما ہے ۔ اسے قربانی دی جاتی ہے ، خاص کر مرغیوں کی جن کا کچھ خون کھجور کے تیل میں ملا کر ماتھے پر ملا جاتا ہے ۔ کارینوں نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ ایک ہستی جس کا نام 'ٹسو' ہے ، سر کے سب سے اوپر کے حصے میں رہتی ہے اور جب تک وہ وہاں موجود رہے آدمی کو 'کیلاھوں' کی کوئی کوشش نقصان نہیں پہنچا سکتی ، جو سات مجسم نفسانی خواہشات پر مشتمل ہیں ۔ ''لیکن اگر ٹسو بے اعتنائی برتے یا کمزور ہو جائے تو اس کی وجہ سے آدمی کو نقصان پہنچ جاتا ہے ۔ اس لیے سر کی بڑی نگہداشت کی جاتی ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اسے ایسا لباس پہنایا یا ٹوپی اڑھائی جائے جس سے ٹسو خوش ہو ۔'' سیام والوں کا خیال

ہے کہ انسان کے سر میں ایک روح موسوم بہ کھوان یا کون بستی ہے ۔ اس روح کی سخت حفاظت ضروری ہے تاکہ اسے کسی قسم کا ضرر نہ پہنچنے پائے ۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں سر کے بال منڈواتے یا کٹواتے وقت بہت سی رسمیں ادا کی جاتی ہیں ۔ کون عزت کے معاملے میں بڑی حساس واقع ہوئی ہے اور جو سر اس کا مسکن ہو اسے اگر کوئی اجنبی ہاتھ لگا دے تو وہ اپنی سخت توہین محسوس کرتی ہے ۔ کیمبوڈیا والوں کے ہاں کسی کے سر کو چھونا سخت جرم ہے ۔ ان میں بعض لوگ ایسی جگہ نہیں جائیں گے جہاں سر پر کوئی چیز ٹنگی ہو ، خواہ وہ کچھ ہی ہو ۔ اور کیمبوڈیا کا ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی کسی ایسے کمرے میں رہنے پر آمادہ نہیں ہوتا جس کے اوپر کوئی اور رہتا ہو ۔ اسی لیے ان کے ہاں مکان صرف یک منزلہ بنائے جاتے ہیں ۔ خود حکومت بھی لوگوں کے اس عقیدے کا احترام کرتی ہے اور قیدیوں کو سزا دینے کے لیے ان کے پاؤں کاٹھ میں ٹھونک کر انھیں کسی ایسی جگہ نہیں رکھتی جس کے اوپر کوئی مکان ہو ، اگرچہ مکان کے پائے زمین سے بہت بلند ہوتے ہیں ۔ یہی وہم ملایا والوں میں بھی موجود ہے ۔ چناں چہ وہاں جانے والا ایک قدیم سیاح بیان کرتا ہے کہ جاوا میں لوگ ''سر پر کچھ نہیں پہنتے اور کہتے ہیں کہ سر برہنہ رہنے چاہئیں ۔ اگر کوئی شخص ان کے سر پر ہاتھ رکھ دے تو وہ اسے مار ڈالیں گے ۔ نیز وہ منزلوں والے مکان نہیں بناتے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے سروں پر نہ چلنے پائیں ۔''

سر کے متعلق یہی وہم پوری شد و مد کے ساتھ پولینیشیا میں بھی پایا جاتا ہے ۔ چناں چہ ایک مارکیسیائی سردار گاتینوا کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ''اس کے تالو یا کسی ایسی چیز پر ہاتھ رکھنا جو اس نے سر پر اوڑھ رکھی ہو ، اس کی سخت بے حرمتی ہے اور اس کے سر پر سے گزر جانا ایک ایسی بے ادبی ہے جو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی ۔'' کسی مارکیسیائی بڑے پیشوا کا لڑکا نہایت غم و غصے کی حالت میں مرنے کے لیے زمین پر تڑپتا دیکھا گیا کیوں کہ کسی نے اس کے سر کی بے حرمتی کی تھی اور اس کے سر پر پانی کے چند

قطرے چھڑک کر اسے اپنی الوھیت سے محروم کر دیا تھا ۔ لیکن صرف مارکیسیائی سرداروں ھی کے سر مقدس نہ تھے ، بلکہ مارکیسیا کے ھر فرد کا سر واجب احترام تھا اور اسے چھوا یا لانگھا نہیں جا سکتا تھا ، یہاں تک کہ باپ بھی اپنے سوتے ھوئے بچے کے سر کو نہیں لانگھ سکتا تھا ۔ عورتوں کو کسی ایسی چیز کے لے جانے یا چھونے کی ممانعت تھی جو ان کے باپ یا شوھر کے سر پر ٹنگی رھی ھو ۔ کسی کو شاہ ٹونگا کے سر سے اونچا نہیں ھونے دیا جاتا تھا ۔ کوئی شخص شاہ یا ملکۂ تاھیتی کے سر پر کھڑا ھو جاتا یا کسی شخص کا ھاتھ اس کے سر پر سے گزر جاتا تو اس شخص کو مار دیا جاتا ۔ جب تک چند رسمیں ادا نہ ھو جاتیں تاھیتوں کے ھاں شیر خوار بچے پر خصوصیت کے ساتھ ٹیبو لگا ھوتا ۔ اس حالت میں اس سے جو چیز بھی چھو جاتی وہ مقدس ھو جاتی اور بچے والے گھر میں اس جگہ جمع کر دی جاتی جس کے گرد اس غرض سے خاص طور پر جنگلا لگا دیا جاتا ۔ اگر بچے کے سر سے کسی درخت کی ٹہنی لگ جاتی تو اس درخت کو کاٹ ڈالا جاتا اور اس کے کٹ کر گرنے میں کسی اور درخت کی چھال چھل جاتی تو اس دوسرے درخت کو بھی گرا دیا جاتا ، کیوں کہ وہ بھی نجس ھو جاتا اور استعمال کے قابل نہ رھتا ۔ محولہ بالا رسوم کے ادا ھو چکنے کے بعد یہ خاص ٹیبو کالعدم ھو جاتے ۔ نیز تاھیتی کے ھر آدمی کا سر ھمیشہ مقدس سمجھا جاتا تھا ۔ وہ اپنے سر پر کبھی کوئی چیز رکھ کر نہ لے جاتا اور اس کے سر کو چھونا جرم تھا ۔ نیز ماوری قوم کے کسی سردار کے سر کی اس قدر حرمت تھی کہ اگر اس کی انگلیاں بھی اس کے سر سے لگ جاتیں تو انھیں اس کو اپنی ناک پر رکھ کر ان کی حرمت کو سونگھ لینا پڑتا جو سر کے لمس سے ان میں سرایت کر جاتی اور اس صورت سے اسے جسم کے اس حصے میں لوٹا دینا پڑتا جہاں سے وہ نکلی ھو ۔ اپنے سر کی اس حرمت کے سبب کوئی ماوری سردار ''آگ نہیں پھونک سکتا تھا ، اس لیے کہ اس کے مقدس سانس کی وساطت سے سر کی حرمت آگ میں منتقل ھو جاتی تھی اور اس بات کا احتمال تھا کہ اس آگ کی جلتی

ہوئی لکڑی کوئی غلام یا کسی غیر قبیلے کا آدمی لے جائے اور اس آگ کو پکانے وغیرہ کے لیے استعمال کیا جائے اور اس طرح اس کا کام تمام ہو جائے۔''

(۶) بالوں کی تحریم—جب سر کو اس قدر مقدس سمجھا جائے کہ اس کا فقط چھو لینا بھی سخت آزار کا باعث یا جرم ہو تو ظاہر ہے کہ حجامت بڑا مشکل اور جوکھوں کا کام ہوگی۔ وحشی کے زاویۂ نگاہ سے اس عمل میں دو قسم کی دشواریاں اور جوکھم ہوتے ہیں۔ ایک تو سر کی روح کو تکلیف پہنچنے کا خطرہ، جو حجامت سے برہم ہو کر اپنے کو دق کرنے والے سے بدلہ لے سکتی ہے اور دوسرے تراشے ہوئے بالوں کو ٹھکانے لگانے کی دشواری، کیوں کہ وحشی کے عقیدے کی رو سے مشارکت کا وہ رشتہ، جو اس کے اور اس کے تمام اجزائے بدن کے درمیان قائم ہوتا ہے، جسمانی طور پر منقطع ہونے کے بعد بھی برقرار رہتا ہے اور اس لیے اس کے تراشیدہ بال، ناخن وغیرہ جیسے اجزاء کو نقصان پہنچنے سے اسے تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ چنان چہ وہ اس بات کی سخت احتیاط رکھتا ہے کہ اس کے جسم کے یہ منقطع اجزاء ایسی جگہوں پر نہ پڑے پھنکتے پھریں جہاں ان پر کوئی افتاد پڑ سکتی ہو یا جہاں سے وہ کسی دشمن کے ہتے چڑھ سکتے ہوں، جو اس کے خیال میں اسے نقصان پہنچا سکتا ہے یا اسے ہلاک کر سکتا ہے۔ یہ خطرے سب کو یکساں لاحق ہوتے ہیں، لیکن عام آدمیوں سے زیادہ مقدس اشخاص کو اور اسی لیے ایسے اشخاص جو حفاظتی تدبیریں اختیار کرتے ہیں وہ اسی قدر زیادہ سخت ہوتی ہیں۔ اس خطرے سے محفوظ رہنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ بال سرے سے کٹوائے ہی نہ جائیں اور یہی وہ تدبیر ہے جو شدید خطرے کی صورت میں اختیار کی جاتی ہے۔ فرینک (فرانسیسی۔ فرنیک، جنھوں نے چھٹی صدی عسوی میں فرانس فتح کیا تھا، اصل میں قدیم الماٹوی اقوام سے تعلق رکھتے تھے) بادشاہوں کو کبھی حجامت بنوانے نہیں دیا جاتا تھا اور بچپن ہی سے انھیں اپنے بال بڑھائے رکھنے پڑتے تھے۔ ان کا اپنے ان لمبے لمبے

بسوؤں کا ترشوانا جو ان کے شانوں پر پڑے رہتے تھے ، تخت و تاج سے دست بردار ہونا تھا ۔ جب سفاک برادران کلوٹیر اور چائلڈ برٹ نے اپنے متوفی بھائی شاہ کلوڈومیر کی سلطنت کو غصب کرنا چاہا تو وہ اپنے بھتیجوں یعنی شاہ مذکور کے دونوں بیٹوں کو اڑا کر لے گئے اور ان بچوں کی دادی ملکہ کے پاس ایک ایلچی کے ہاتھ ایک قینچی اور ننگی تلوار پیرس بھیج دی ۔ ایلچی نے ملکہ کو وہ قینچی اور تلوار دکھا کر کہا کہ وہ یا تو یہ منظور کر لے کہ بچوں کے بال کاٹ دیے جائیں اور وہ زندہ رہیں ، یا پھر یہ کہ ان کے بال سلامت رہیں اور وہ مار دیے جائیں ۔ اس غیور ملکہ نے جواب دیا کہ اگر اس کے پوتوں کو بے تخت و تاج زندہ رہنا پڑے تو وہ ان کے کٹے ہوئے بالوں پر ان کی موت کو ترجیح دے گی ۔ آخر سفاک چچا کلوٹیر نے ان بچوں کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالا ۔ جزائر کیرولین کے ایک ٹاپو ہوناپے کے بادشاہ کو اپنے بال بڑھائے رکھنے پڑتے تھے اور اسی طرح اس کے امرائے کبیر کو بھی ۔ ہاس نامی قبیلے میں ''ایسے مذہبی پیشوا پائے جاتے ہیں ، جن کے سر پر عمر بھر استرا نہیں لگ سکتا تھا ۔ اس قسم کے آدمی کے اندر جو دیوتا رہتا ہے ، اس کا یہی حکم ہے جس کی خلاف ورزی کی سزا موت ہے ۔ اگر بال زیادہ بڑھ جائیں تو اسے اپنے دیوتا سے استدعا کرنی پڑتی ہے کہ وہ کم از کم ان کی نوکیں ترشوانے کی اجازت دے دے ۔ بالوں کو اصل میں اس دیوتا کا مسکن سمجھا جاتا ہے اور اس لیے اگر انھیں کاٹ دیا جائے تو وہ پیشوا اپنے دیوتا کے ٹھکانے سے محروم ہو جائے گا ۔'' کسی ماسائی برادری کے افراد کو ، جنھیں بارش گری کا ماہر سمجھا جاتا ہے ، اپنی ڈاڑھی کے بال نکالنے کی اجازت نہیں ، کیوں کہ ان کی ڈاڑھی ہی میں ان کی بارش گرانہ قوت مضمر ہوتی ہے ۔ ماسائیوں کا بڑا سردار اور دوسرے جادوگر کچھ اسی سبب سے اس ضابطے کے پابند ہوتے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی ڈاڑھی کے بال کھینچ نکالیں تو ان کی مافوق الفطرت صلاحیتیں ختم ہو جائیں گی ۔

اس کے علاوہ ایسے لوگ جنھوں نے دشمنوں سے انتقام لینے کا

عہد کر رکھا ہو ، جب تک اپنا یہ عہد پورا نہیں کر لیتے بال نہیں کٹواتے ۔ چناں چہ اہل مارکیساس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ '' وقتاً فوقتاً اپنے سر گھٹواتے رہتے ہیں ، سوائے چٹیا کے جو یا تو ان کے سروں پر کھلی پڑی رہتی ہے یا اس کا جوڑا باندھ لیا جاتا ہے ۔ لیکن چٹیا صرف اسی صورت میں بڑھائی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے کسی عزیز وغیرہ کا بدلہ لینے کی قسم کھا رکھی ہو ۔ ایسی صورت میں جب تک وہ اپنا عہد پورا نہیں کر لیتے ، چٹیا نہیں کٹواتے ۔'' قدیم زمانے کے جرمنوں کے ہاں بھی کبھی کبھی اسی قسم کے دستور پر عمل ہوتا تھا ۔ چاٹیوں (ایک قدیم جرمن قبیلہ) میں نوجوان سپاہی جب تک کسی دشمن کو قتل نہ کر لیتے اپنے سر اور ڈاڑھی کے بال نہ ترشواتے ۔ ٹوراڈجاؤں میں جس وقت جوؤں سے پیچھا چھڑانے کے لیے بچے کی حجامت کی جاتی ہے تو چندیا پر کچھ بال چھوڑ دیے جاتے ہیں تاکہ بچے کی روحوں میں سے ایک روح کا ٹھکانا باقی رہے ، ورنہ اس روح کو اپنی سکونت کے لیے جگہ نہیں ملے گی اور بچہ بیمار پڑ جائے گا ۔ کارو باتکوں کو اس بات کا بڑا ڈر رہتا ہے کہ بچے کی روح خوف زدہ ہو کر چلی نہ جائے ۔ اسی وجہ سے وہ جب اس کے بال کاٹتے ہیں تو سر کے کچھ حصے پر بال چھوڑ دیتے ہیں اور یہ چٹیا کی شکل میں تمام عمر یا کم از کم سن بلوغ تک باقی رہتے ہیں ۔

(۷) حجامت کی رسمیں—لیکن جب بال کٹوانا ضروری ہو جاتا ہے تو حجامت کے مفروضہ خطروں کو کم کرنے کے لیے احتیاطی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں ۔ فجی میں ناموسی کا سردار اس قسم کی پیش بندی کے طور پر ہمیشہ آدمی کا گوشت کھایا کرتا تھا ۔ ''ایک برادری ایسی تھی جس کو قربانی کا یہ آدمی فراہم کرنا پڑتا تھا ، جسے منتخب کرنے کے لیے اس برادری کے لوگوں کا باقاعدہ ایک پنچ بیٹھا کرتا تھا ۔ یہ سردار کو ضرر سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک قسم کی قربانی کی تقریب تھی ۔'' ماوریوں کے ہاں بال کاٹتے وقت بہت سے منتر پڑھے جاتے تھے ۔ مثلاً ان میں سے ایک اس آبسیڈیائی چاقو (آبسیڈین ، ایک قسم کا سیاہ شیشہ جو آتش فشاں مادے سے بنتا ہے)

کی تقدیس کے لیے پڑھا جاتا تھا جس سے بال تراشے جاتے تھے۔ اور ایک دوسرا منتر گرج چمک کا خطرہ دور کرنے کے لیے جو ان لوگوں کے عقیدے کے بموجب بال کاٹنے سے پیدا ہو جاتی ہے ۔ ''وہ شخص جس کی حجامت بنائی گئی ہو ، براہ راست آتوا (روح) کی تحویل میں ہوتا ہے ۔ اسے چھوت چھات سے بچنے کے لیے خاندان اور قبیلے سے دور رکھا جاتا ہے ۔ وہ کھانے کو چھو نہیں سکتا ، اور کوئی اور شخص نوالے بنا بنا کر اسے کھلاتا ہے ۔ نیز کچھ دن اسے اپنا کام دھندا اور اپنے ساتھیوں سے میل جول ترک کر دینا پڑتا ہے ۔'' حجامت بنانے والے کی بھی تحریم ہو جاتی ہے ۔ اس کے ہاتھ چوں کہ مقدس سر سے مس کر جاتے ہیں ، لہذا وہ ان سے کھانے کو چھو نہیں سکتا اور نہ کوئی اور کام کر سکتا ہے ۔ اسے کوئی اور آدمی مقدس آگ پر پکا ہوا کھانا کھلاتا ہے ۔ اس ٹیبو سے کہیں دوسرے دن جا کر اس کی گلو خلاصی ہوتی ہے ، جب وہ مقدس آگ پر پکے ہوئے آلو یا فرن (ایک قسم کا پودا) کی جڑ اپنے ہاتھ پر ملتا ہے ۔ جس وقت یہ آلو یا فرن خاندان کی سب سے بڑی عورت کے پاس لے جائی جاتی ہے اور وہ اسے کھا لیتی ہے تو اس شخص کے ہاتھ ٹیبو سے آزاد ہو جاتے ہیں ۔ نیوزی لینڈ کے بعض حصوں میں سال کا سب سے متبرک دن وہ تھا جو حجامت کے لیے مقرر تھا ۔ اس دن گرد و نواح کے لوگ کثیر تعداد میں ایک مقام پر جمع ہوتے تھے ۔

## (۸) کٹے ہوئے بالوں اور ناخنوں کا ٹھکانے لگانا—

لیکن جب بال اور ناخن بہ خیر و عافیت کٹ چکیں تب بھی ان کے ٹھکانے لگانے کی دشواری باقی رہتی ہے کیوں کہ حجامت بنوانے والے کو یہ خوف ہوتا ہے کہ اس کے بالوں اور ناخنوں کو جو گزند پہنچے گا ، وہی اس کو بھی پہنچ جائے گا ۔ یہ خیال ساری دنیا میں پایا جاتا ہے کہ آدمی کے کٹے ہوئے بالوں ، ناخنوں یا کسی اور جزو بدن کی وساطت سے اس پر سحر کیا جا سکتا ہے اور اس کے ثبوت میں جو شواہد ملتے ہیں وہ اس قدر کثیر ، عام اور اپنی یکسانیت کی وجہ سے اس قدر غیر دلچسپ ہیں کہ یہاں تفصیل کے ساتھ ان کا تجزیہ

تحصیل حاصل ہوگا ۔ یہ وہم اسی مفروضہ رشتۂ مشارکت کے عام تصور پر مبنی ہے جو آدمی اور اس کے تمام منقطع اجزائے بدن یا ہر اس چیز کے درمیان قائم رہتا ہے جس سے اس کا قریبی تعلق رہا ہو ۔ اس کی صرف چند مثالیں کافی ہوں گی ۔ ان کا تعلق سحر مشارک کی اس شاخ سے ہے جسے سحر متعدی کہا جا سکتا ہے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں جادو کا خوف مارکیسائی جزائر کے باشندوں کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی ۔ ان کے ہاں جادوگر جس شخص کو نقصان پہنچانا چاہتا وہ اس کے کچھ بال ، تھوک یا بول و براز وغیرہ ایک پتے میں لپیٹ دیتا اور اس پلندے کو ایک ایسے تھیلے میں رکھ دیتا جو ڈور یا ریشے میں گانٹھیں لگا کر بنایا جاتا اور ان سب چیزوں کو بعض رسموں کے ساتھ دفن کر دیا جاتا جس کے اثر سے معمول بیس دن تک بیماری میں گھل گھل کر ختم ہو جاتا ۔ تاہم اگر اس کے بال ، تھوک یا جو کچھ بھی ہوتا ، اسے پتا چلا کر کھود نکالا جاتا تو اس بد نصیب کی جان بچ سکتی تھی ، اس لیے کہ اس کے بعد سحر کا اثر زائل ہو جاتا ۔ جو ماوری ساحر کسی پر جادو کرنے کا تہیہ کر لیتا تھا وہ اس شخص کے بالوں کی لٹ ، ناخن تھوک یا کپڑوں کی کوئی دھجی حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور جب مطلوبہ چیز اس کے ہاتھ آ جاتی تو وہ اس پر کچھ افسوں پڑھتا اور چیخ چیخ کر تبرا بھیجتا اور پھر اسے دفنا دیتا ۔ خیال تھا کہ جوں جوں متعلقہ شخص کے جسم کا وہ جزو فنا ہوتا جائے گا وہ شخص گھلتا چلا جائے گا ۔ جب آسٹریلیا کا کوئی وحشی اپنی بیوی سے پیچھا چھڑانا چاہے تو وہ مؤخرالذکر کے سوتے میں اس کی زلف کاٹ کر اسے اپنے نیزہ انداز سے باندھے کسی ہمسایہ قبیلے میں جا پہنچتا ہے اور اپنے کسی دوست کے سپرد کر آتا ہے ۔ اس کا دوست نیزہ انداز کو ہر روز رات کو پڑاؤ کے الاؤ کے سامنے گاڑ دیتا ہے ۔ اس نیزہ انداز کا گر پڑنا شخص مذکور کی بیوی کی موت کی علامت ہے ۔ یہ جادو جس طرح اپنا کام کرتا ہے اسے وراجوری قبیلے کے ایک آدمی نے ڈاکٹر ہاوٹ کو یوں سمجھایا تھا : ''دیکھیے ، جب کوئی آسٹریلوی جادوگر کسی شخص کی کوئی چیز حاصل کرکے

اسے بعض دوسری چیزوں کے ساتھ جلاتا ہے اور اس پر اپنا منتر پڑھتا ہے تو اس شخص کی بو کو آگ لگ جاتی ہے جس سے اس غریب کا کام تمام ہو جاتا ہے۔''

کوہ کارپیتھین کے ہیوول یہ سمجھتے ہیں کہ اگر چوہوں کو کسی شخص کے بال مل جائیں اور وہ ان کا گھروندا بنا لیں تو وہ شخص درد سر میں مبتلا ہو جائے گا، بلکہ اس کی عقل میں فتور آ جائے گا۔ اسی طرح جرمنی میں یہ خیال عام ہے کہ اگر چڑیوں کو کسی آدمی کے بال مل جائیں اور وہ ان کا گھونسلا بنا لیں تو اس آدمی کو درد سر ہو جائے گا۔ بعض وقت یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ایسے شخص کے سر میں پھنسی نکل آئی گی۔ یہی وہم مغربی میکس میں پایا جاتا ہے یا پایا جاتا تھا۔

نیز خیال ہے کہ کٹے ہوئے یا شانے میں لگ کر نکلے ہوئے بالوں سے موسم بگڑ جاتا ہے اور بارش، ژالہ باری اور گرج چمک ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھ آئے ہیں کہ نیوزی لینڈ میں حجامت کے وقت گرج چمک سے محفوظ رہنے کے لیے ایک افسوں پڑھا جاتا تھا۔ ٹی رل (آسٹریا) میں لوگوں کا خیال ہے کہ جادوگرنیاں کٹے ہوئے یا شانے میں الجھ کر نکلے ہوئے بالوں کے ذریعے باد و باراں کے طوفان لایا کرتی ہیں۔ تھلنکیٹ نامی امریکی قوم کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ طوفان کو کسی لڑکی کی بد احتیاطی سے منسوب کر دیا تھا، جس نے گھر کے باہر اپنے بالوں میں کنگھی کی تھی۔ اہل روم کے خیالات بھی ایسے ہی کچھ رہے ہوں گے۔ چناں چہ ان کے ہاں یہ مقولہ مشہور تھا کہ جہاز کے سفر میں صرف اس وقت حجامت بناؤ جب طوفان آیا ہوا ہو، یعنی جب دشمن اپنا کام کر چکا ہو۔ اسکاٹ لینڈ کے کہستان میں لوگ کہا کرتے ہیں کہ اس لڑکی کو جس کا بھائی بحری سفر پر ہو، اپنے سر میں کنگھی نہیں کرنی چاہیے۔ مغربی افریقہ میں جب چٹومبے یا جمبا کا مانی مر جاتا تھا تو لوگ دوڑتے ہوئے جوق در جوق اس کی لاش کے پاس پہنچ کر اس پر ٹوٹ پڑتے اور اس کے بال، دانت اور ناخن نوچ کھسوٹ کر نکال لیتے، جنھیں بارشی

طلسم کے طور پر محفوظ رکھا جاتا ۔ خیال تھا کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو مینہ نہیں برسے گا ۔ انزیکوون کے ماکوکو نے عیسائی مبلغوں سے التجا کی تھی کہ وہ انھیں بارشی طلسم کے طور پر اپنی ڈاڑھیوں کے آدھے بال دے دیں ۔

اگر تراشے ہوئے بالوں یا ناخنوں کے ساتھ اس شخص کا رشتہ بر قرار رہتا ہے جس کا وہ جزو بدن رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ وہ جس کسی کے ہاتھ لگیں گے وہ ان سے متعلقہ شخص کے اچھے چال چلن کی ضمانت کا کام لے گا ، اس لیے کہ سحر متعدی کے اصول کی رو سے شخص مذکور کو گزند پہنچانے کے لیے اس کے ان اجزاء کو نقصان پہنچانا کافی ہے ۔ اسی وجہ سے جب ناندی کسی آدمی کو قید کرکے لاتے ہیں تو وہ اس کا سر مونڈ دیتے ہیں اور اس کے بال اس بات کی ضمانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں کہ وہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کرے گا ۔ لیکن جب اسیر کو تاوان دے کر چھڑا لیا جاتا ہے تو وہ اس کے بال اس کے لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں ۔

حجامت کے بعد بالوں اور ناخنوں کو جادوگروں کے شر اور خطرناک کارروائیوں سے بچانے کے لیے ان کا کسی محفوظ جگہ رکھنا ضروری ہے ۔ کسی ماوری سردار کے کٹے ہوئے بال بڑی احتیاط سے اکٹھے کرکے قبرستان سے ملحق کسی مقام پر رکھ دیے جاتے تھے ۔ تاہیتی والے اپنے بال مندروں میں دفن کر دیا کرتے تھے ۔ عہد جدید کے ایک سیاح کو ساکو کی گلیوں میں بڑے بڑے پتھروں کے قبر نما ڈھیر نظر آئے جن کے شگافوں میں آدمیوں کے کٹے ہوئے بالوں کے گچھے بڑی احتیاط سے رکھے تھے ۔ اس نے ان کا مطلب پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ جب وہاں کا کوئی باشندہ حجامت بنواتا ہے تو اپنے بال بڑی احتیاط سے چن کر ان پتھروں میں رکھ دیتا ہے ، جو ان کے فتیش کی نذر اور متبرک ہو جاتے ہیں ۔ اسے مزید یہ معلوم ہوا کہ مقدس پتھروں کے یہ قبر نما ڈھیر محض جادو منتر سے بچاؤ کی ایک صورت تھے ، کیوں کہ اگر کوئی شخص اپنے بالوں کو اس طرح احتیاط سے ٹھکانے نہ لگاتا تو اس بات کا احتمال تھا کہ ان میں سے کچھ دشمن کے ہاتھ

لگ جاتے اور وہ ان کے ذریعے شخص مذکور پر جادو کرکے اسے تباہ کر ڈالتا ۔ جب کسی سیامی بچے کی چٹیا کٹائی کی رسم ادا ہو چکتی ہے تو اس کے چھوٹے چھوٹے بال ایک کشتی میں رکھ دیے جاتے ہیں جو کیلوں کے پتوں سے تیار کی جاتی ہے اور کشتی کو قریب ہی کسی دریا یا نہر میں بہا دیا جاتا ہے ۔ خیال ہے کہ جیسے جیسے یہ بال بہتے جاتے ہیں ، بچے کے مزاج کی خرابیاں دور ہوتی جاتی ہیں ۔ اس کی چٹیا کے لمبے بال احتیاط سے رکھ لیے جاتے ہیں اور جب بچہ کوہ مقدس پر مہاتما بدھ کے قدم مبارک کی یاترا کر لیتا ہے تو انہیں اس خیال سے پروہتوں کو پیش کر دیا جاتا ہے کہ وہ ان بالوں کے برش بنا کر ان سے قدم مبارک کو جھاڑنے کا کام لیں گے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر سال اس قدر بال نذر کیے جاتے ہیں کہ ان پروہتوں کے لیے سب کا کام میں لانا ناممکن ہے ۔ لہذا جوں ہی یاتری وہاں سے لوٹتے ہیں ، وہ فالتو بال نذر آتش کر دیتے ہیں ۔ فلیمن ڈیالس کے ترا شیدہ بال اور ناخن کسی بھاگوان پیڑ کے تلے دبا دیے جاتے تھے ۔ وسطائی راہبات کی کٹی ہوئی کاکلیں لوٹس (کلاسیکی قصے کہانیوں کے بموجب ایک پھل جس کے کھانے سے آدمی غم بھول جاتا تھا) کے ایک قدیم درخت پر لٹکا دی جاتی تھیں ۔

اکثر صورتوں میں کٹے ہوئے بالوں یا ناخنوں کو کسی خفیہ مقام پر لے جا کر رکھ دیا جاتا ہے اور ان میں مذکورہ بالا صورتوں کی طرح یہ ضروری نہیں کہ وہ مقام کوئی مندر ، قبرستان یا درخت ہی ہو ۔ چناں چہ سویبیا میں لوگوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے بال ایسی جگہ لے جا کر رکھیں ، جہاں دھوپ یا چاندنی نہ پڑتی ہو ، مثلاً زمین یا پتھر کے تلے ۔ ڈینزیگ میں انہیں تھیلی کے اندر رکھ کر گھر کی دہلیز کے نیچے دفنا دیا جاتا ہے ۔ جزائر سلیبان کے ایک ٹاپو اوگی میں لوگ اپنے بالوں کو اس لیے دفن کر دیتے ہیں کہ وہ کہیں دشمن کے ہتے نہ چڑھ جائیں اور دشمن ان پر سفلی عمل کرکے ان لوگوں کو بیمار یا کسی اور مصیبت میں مبتلا نہ کر دے ۔ یہی اندیشہ ملینیشیا میں بھی عام معلوم ہوتا ہے ، جس کی بناء پر وہاں

کٹے ہوئے بالوں اور ناخنوں کو چھپانے کا دستور معرض وجود میں آ گیا ہے - نیز یہی دستور جنوبی افریقہ کے متعدد قبیلوں میں ملتا ہے ، جس کی بناء یہ خوف ہے کہ کہیں جادوگر جسم کے ان منقطع اجزاء کو حاصل کرکے ان کے ذریعے کوئی شرارت نہ کر جائے - کافروں کے ہاں یہ خوف اس سے بھی زیادہ پایا جاتا ہے ، جو اپنے جسم کا کوئی جزو دشمن کے ہاتھ نہیں لگنے دیتے - چناں چہ وہ نہ صرف اپنے بال اور ناخن کسی مخفی گوشے میں دفن کر آتے ہیں بلکہ جب ان میں سے کوئی اپنے کسی ساتھی کے سر کی صفائی کرتا ہے تو مقدم الذکر کی جوئیں چن چن کر محفوظ رکھتا ہے اور انہیں ''بڑی احتیاط سے اس کے حوالے کر دیتا ہے - وہ عام نظریے کے بموجب یہ سمجھتا ہے کہ چوں کہ جوئیں اس آدمی کے خون پر جیتی ہیں جس کے جسم سے وہ نکلی ہوں ، لہذا اگر کوئی شخص انہیں مار ڈالے تو جوؤں والے کا خون اس کے قبضے میں آ جائے گا اور اس طرح مقدم الذکر پر اسے فوق الفطرت قسم کی قدرت حاصل ہو جائے گی -''

بعض صورتوں میں کٹے ہوئے بالوں اور ناخنوں کو محفوظ رکھنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ جادوگر کے ہاتھ نہ لگنے پائیں ، بلکہ وہ اس لیے محفوظ رکھے جاتے ہیں کہ اگلے جنم میں ، جس کی متعدد اقوام آس لگائے رہتی ہیں ، لوگ اپنے اپنے بالوں اور ناخنوں کے ساتھ اٹھیں - چناں چہ پیرو کے انکا ''اپنے ناخنوں اور ان بالوں کو جو کاٹے گئے ہوں یا کنگھی میں الجھ کر نکل آئے ہوں ، بڑی احتیاط سے دیوار کے روزنوں یا طاقچوں میں محفوظ رکھتے تھے - اگر وہ گر پڑتے اور ان پر کسی اور پیروئی کی نظر پڑ جاتی تو وہ انہیں چن چن کر ٹھکانے سے رکھ دیتا تھا - میں نے مختلف موقعوں پر متعدد پیروئیوں سے اس کا سبب پوچھا تو ان سب کا جواب ایک ہی تھا 'جاننا چاہیے کہ جتنے آدمی دنیا میں آئے ہیں ان سب کو ایک دن دوبارہ زندہ ہونا ہے -' (ان کے ہاں احیاء یا نئے جنم کا مفہوم ادا کرنے کے لیے کوئی لفظ نہیں) ''اور روحوں کو اپنی اپنی قبروں سے ان تمام چیزوں کے ساتھ دوبارہ اٹھنا ہے جو ان کا جزو بدن رہی ہوں ، لہذا اس خیال سے

کہ ہنگامۂ رست خیز میں ہمیں اپنے بال اور ناخن ڈھونڈنے نہ پڑیں ، ہم انھیں ایک جگہ رکھ دیتے ہیں تاکہ وہ ہمیں آسانی سے مل جائیں اور جب کبھی ممکن ہوتا ہے ہم تھوکتے بھی ایک ہی جگہ ہیں ۔'' اسی طرح ترک اپنے ناخن پھینکا نہیں کرتے بلکہ احتیاط سے دیوار یا تختوں کے شگافوں میں رکھ دیتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ روز قیامت انھیں اپنے ناخنوں کی ضرورت پڑے گی ۔ آرمینیا والے بھی اپنے بال ، ناخن اور دانت پھینکتے نہیں بلکہ انھیں ایسی جگہوں میں رکھ دیتے ہیں ، جو مقدس خیال کی جاتی ہیں جیسے گرجے کی دیوار یا مکان کے ستون کے کسی شگاف میں یا کسی درخت کی کھوہ میں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قیامت میں ان کے ان تمام منقطع اجزائے بدن کی ضرورت پڑے گی اور جس شخص نے انھیں کسی محفوظ جگہ نہ رکھا ہو ، حشر کے دن ان کو تلاش کرتا پھرے گا ۔ آئرستان کے موضع ڈرم کون راتھ میں چند بوڑھیاں ، جنھوں نے انجیل مقدس سے یہ معلوم کرکے کہ قادر مطلق نے ان کے سر کے تمام بال گن رکھے ہیں ، یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ روز حشر انھیں ایک ایک بال کا حساب دینا ہوگا ۔ چناں چہ انھوں نے اپنے کٹے ہوئے بال اپنے جھونپڑوں کے چھپروں میں ٹھونس رکھے تھے تاکہ ان کا حساب دے سکیں ۔

بعض لوگ اپنے کٹے ہوئے بال جلا ڈالتے ہیں تاکہ وہ ساحروں کے ہتے نہ چڑھنے پائیں ۔ چناں چہ پاٹے گونیا والے (جنوبی امریکہ) اور بعض وکٹوریائی قبیلے یہی کچھ کیا کرتے ہیں ۔ ووژ کے بالائی علاقے میں لوگ کہا کرتے ہیں کہ آپ اپنے بالوں اور ناخنوں کو ادھر اُدھر نہ پھینکیں ، بلکہ جلا ڈالیں تاکہ ساحر ان کے ذریعے آپ کے ساتھ شرارت نہ کرنے پائیں ۔ کچھ اسی وجہ سے اطالوی عورتیں یا تو اپنے کٹے ہوئے بال نذر آتش کر دیتی ہیں یا ایسی جگہ پھینک دیتی ہیں جہاں ان کے تلاش کیے جانے کا امکان نہ ہو ۔ سحر کے اسی عالم گیر خوف کے مارے مغربی افریقہ کے حبشی ، جنوبی افریقہ کے ماکولو اور تاہیتی والے اپنے کٹے ہوئے بال جلا ڈالتے ہیں یا زمین میں دبا دیتے ہیں ۔ ٹی رل میں بہت سے لوگ اپنے بال اس ڈر سے جلا

دیتے ہیں کہ کہیں جادوگرنیاں ان سے کام لے کر باد و باراں کا طوفان نہ پیدا کر دیں ۔ کچھ لوگ انھیں اس لیے جلا دیتے ہیں یا دفن کر دیتے ہیں کہ چڑیاں انھیں اپنے گھونسلوں میں نہ لگا لیں اور اس کی وجہ سے ان لوگوں کو درد سر نہ ہو جائے ۔

ظاہر ہے کہ اس طرح بالوں اور ناخنوں کا تلف کرنا فکری تناقض اور بے ربطی کی دلیل ہے ۔ ان اجزائے بدن کو صریحاً اس لیے تلف کیا جاتا ہے کہ جادوگر ان سے کام نہ لینے پائے ۔ لیکن جادوگر کا ان اجزاء کو استعمال کرنا اس مفروضہ رشتۂ مشارکت کی بناء پر ممکن ہے جو ان کے اور اس شخص کے درمیان قائم رہتا ہے ، جن کے جسم سے انھیں کاٹا گیا ہو ۔ اور اگر یہ رشتہ ان کے کٹنے کے بعد بھی برقرار رہتا ہے تو ظاہر ہے کہ شخص مذکور کو گزند پہنچائے بغیر انھیں تلف کرنا ممکن نہیں ۔

(۹) تھوک کی تحریم — سحر کے خوف سے جہاں بہت سی قوموں میں منقطع بالوں اور ناخنوں کو چھپانے یا جلانے کی ریت پڑ گئی ، وہاں بعض دوسری یا انھی قوموں میں تھوک کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے لگا ، کیوں کہ سحر مشارک کی رو سے تھوک آدمی کا جزو بدن ہے اور اس کے ساتھ جو کچھ کیا جائے گا ، اس کا اثر آدمی پر بھی پڑے گا ۔ امریکہ کا چیاوٹ اپنے کسی دشمن کا تھوک جمع کرکے آلو کے اندر رکھ دیتا ہے اور اس آلو کو کچھ منتر پڑھتے ہوئے اس یقین کے ساتھ دھوئیں میں ٹانگ دیتا ہے کہ جیسے جیسے وہ خشک ہوتا جائے گا ، اس کا دشمن گھلتا جائے گا ۔ یا پھر وہ اس تھوک کو کسی مینڈک کے منہ میں ٹھونس کر اس مینڈک کو ایسے دریا میں پھینک آتا ہے جس تک رسائی مشکل ہو اور جو جہاز رانی کے قابل نہ ہو ۔ اس عمل سے دشمن جاڑے بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ نیوزی لینڈ کے ضلع اوری ویرا کے باشندوں نے جادو میں بڑا نام پیدا کیا تھا ۔ کہا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کے تھوک کے ذریعے ان پر جادو کیا کرتے تھے ، اسی لیے وہاں جانے والے بڑی احتیاط سے اپنا تھوک چھپا دیا کرتے تھے کہ کہیں اس کی بدولت ساحران اوری ویرا سے انھیں کوئی

گزند نہ پہنچ جائے ۔ اسی طرح جنوبی افریقہ کے بعض قبیلوں میں جب کسی شخص کا دشمن قریب ہو تو تھوکنے سے گریز کرے گا کہ مبادا اس کا تھوک دشمن کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اسے جادوگر کے حوالے کر دے ، جو تھوک کو چند طلسمی اجزاء میں ملا کر تھوکنے والے کو نقصان پہنچا دیتا ہے ۔ اسی لیے گھر میں بھی جہاں کہیں آدمی کی رال ٹپک جاتی ہے بڑی احتیاط سے صاف کر دی جاتی ہے ۔

تھوک کے معاملے میں اگر عام آدمی اس قدر محتاط رہتے ہوں تو بادشاہوں اور سرداروں کا دگنی احتیاط برتنا قدرتی بات ہے ۔ جزائر سینڈوچ میں ایک معتبر اردلی اگال دان لیے سرداروں کی خدمت میں حاضر رہتا تھا اور ان کا اگال ہر روز صبح نہایت احتیاط سے مٹی میں دبا دیا جاتا تھا ، تاکہ وہ ساحروں کی دسترس سے باہر ہو ۔ کچھ اسی سبب سے سلیوکوسٹ میں جب کبھی بادشاہ یا سردار کھنکار کر تھوکتا ہے تو اس کا بلغم انتہائی احتیاط سے اکٹھا کرکے چھپا دیا جاتا ہے یا دفن کر دیا جاتا ہے ۔ اسی وجہ سے جنوبی نائی جیریا میں سردار تابالی کے تھوک کے ساتھ بھی یہی احتیاط برتی جاتی ہے ۔

جادو ٹونے میں تھوک سے جو کام لیا جا سکتا ہے اس کی وجہ سے تھوک خون یا ناخنوں کی طرح عہد و پیمان کی ایک ٹھوس بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے ، اس لیے کہ اپنے اپنے لعاب دھن کا آپس میں تبادلہ کرکے فریقین گویا اپنی وفاداری کی ضمانت دیتے ہیں اور اگر کوئی فریق اپنے عہد سے پھر جائے تو دوسرا فریق اس کے تھوک پر سفلی عمل کرکے اسے دغا بازی کی سزا دے سکتا ہے ۔ چناں چہ مشرقی افریقہ کے واجاگا جب کسی سے کوئی معاہدہ کرنا چاہتے ہوں تو بعض وقت فریقین شراب یا دودھ کا ایک پیالہ اپنے درمیان رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس مشروب پر منتر پڑھنے کے بعد اسے اپنے اپنے منہ میں بھر کر ایک دوسرے کے منہ میں کلی کر دیتے ہیں ۔ ہنگامی صورتوں میں جب اس رسم کا وقت نہ ہو تو فریقین ایک دوسرے کے منہ میں تھوکنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اس سے بھی ان کے عہد و پیمان پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے ۔

(۱۰) غذاؤں کی تحریم — کھانے کے معاملے میں وحشی کے اوہام کی کثرت کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ وہ بہت سے ایسے جانوروں اور پودوں سے پرہیز کرتا ہے جو اگرچہ بجائے خود صحت بخش ہوتے ہیں ، لیکن جن کے متعلق وہ کسی نہ کسی وجہ سے اس وہم میں مبتلا ہوتا ہے کہ ان کا کھانا اس کے لیے نقصان یا ہلاکت کا باعث ہوگا ۔ اس قسم کے پرہیز کی مثالیں اس قدر عام ہیں کہ انہیں پیش کرنا تحصیل حاصل ہے ۔ لیکن اگر توہمات نے اس طرح معمولی آدمی پر مختلف قسم کی اغذیہ حرام کر رکھی ہوں تو اس سلسلے میں جو پابندیاں بادشاہوں یا مذہبی رہنماؤں جیسے مقدس اشخاص پر عاید ہوتی ہوں وہ کہیں زیادہ اور سخت ہوں گی ۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ فلیمن ڈیالس کے لیے بہت سے پودوں اور جانوروں کا کھانا بلکہ ان کا نام تک لینا ممنوع تھا اور مصری بادشاہ ہنس اور بچھڑے کے سوا کسی جانور کا گوشت نہیں کھا سکتے تھے ۔ کلاسیکی عہد میں بہت سی غیر مہذب قوموں کے بادشاہ گوشت قطعی نہیں کھاتے تھے ۔ ساحل لوآنگو کے گنگاؤں یا مقدس پیشواؤں کے لیے مختلف قسم کے جانوروں اور مچھلیوں کے کھانے کی ممانعت ہے ، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی لحمی غذا نہایت محدود ہے ۔ عام طور پر وہ جڑی بوٹیوں پر گزارا کرتے ہیں ، اگرچہ انہیں تازہ خون پینے کی اجازت ہے ۔ لوآنگو کے ولی عہد پر لڑکپن ہی سے لحم خنزیر حرام ہوتا ہے ۔ ایام طفولیت سے اسے دوسروں کی شرکت میں کولا کا پھل کھانے کی ممانعت ہوتی ہے ۔ بالغ ہونے پر اس کو مذہبی پیشوا یہ تلقین کرتا ہے کہ اسے مرغی نہیں کھانی چاہیے ، بجز اس مرغی کے جو خود اس نے ذبح کر کے پکائی ہو ۔ اس طرح اس کی عمر کے ساتھ ساتھ ممنوعات کی تعداد بڑھتی جاتی ہے ۔ فرنانڈوپو میں بادشاہ کو مسند نشینی کے بعد کوکو اور ہرن اور خارپشت کا گوشت کھانے کی ممانعت ہے ، جو عام لوگوں کی معمولی خوراک ہیں ۔ ماسائیوں کے سردار اعلیٰ کی غذا دودھ ، شہد اور بکری کی بھنی ہوئی کلیجی تک محدود ہے ، اس لیے کہ وہ ان چیزوں کے سوا کچھ اور کھا لے تو پیشین گوئی اور طلسم گری کی قوت کھو بیٹھتا ہے ۔

## (۱۱) گرہوں اور انگوٹھیوں کی تحریم—ہم دیکھ

چکے ہیں کہ روم میں فلیمن ڈیالس کو جن متعدد ٹیبوؤں کی پابندی ضروری تھی ، ان میں ایک گرہ دار لباس اور دوسرے ثابت انگوٹھی پہننے کی ممانعت بھی تھی ۔ اسی طرح مسلمانوں کو احرام میں گرہ دار لباس اور انگوٹھی پہننے کی اجازت نہیں ۔ ان امتناعوں کا مطلب غالباً وہی ہے جو مذکورہ بالا ٹیبوؤں کا ہے اور انھی کے ساتھ ان پر بھی غور کرنے میں کوئی امر مزاحم نہیں ۔ (کیا احرام میں بھی آپ کو سحر مشارک کا پہلو نظر آتا ہے یا احرام میں محولہ چیزوں کی ممانعت کا محرک بھی کسی جانور ، انسان وغیرہ کی روح یا سحر کا خوف ہے؟) سب سے پہلے گانٹھوں کو لیجیے ۔ دنیا کے مختلف حصوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں ، جو خاص حالات میں یا نازک موقعوں پر ، خاص کر زچگی اور شادی میں اور مرتے وقت اپنے جسم پر کسی گرہ دار چیز کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ چناں چہ ٹرانسلوینیا کے سیکسنوں کے ہاں جب کسی عورت پر درد زہ کے دورے پڑ رہے ہوں تو اس کے کپڑوں کی ساری گانٹھیں کھول دی جاتی ہیں کیوں کہ ان لوگوں کے عقیدے کے بموجب ایسا کرنے سے وضع حمل میں سہولت پیدا ہوتی ہے اور اسی غرض سے ان کے ہاں گھر کے سارے تالے کھول دیے جاتے ہیں ، خواہ وہ دروازوں میں لگے ہوں یا صندوقوں میں ۔ لیپستان والوں کا خیال ہے کہ زچہ خانے میں کسی عورت کے کپڑوں میں کوئی گرہ لگی ہو تو اس سے وضع حمل میں رکاوٹ اور تکلیف پیدا ہوتی ہے ۔ شرق الہند میں اسی قسم کا وہم سارے ایام حمل میں رہتا ہے ۔ یہاں لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی حاملہ عورت گرہ لگائے ، یا بال گوندھے یا کسی چیز کو کسے تو اس سے بچہ سکڑ جائے گا اور زچگی کے وقت خود وہ عورت جکڑی جائے گی ، بلکہ ان میں سے بعض کے ہاں تو حاملہ اور اس کے شوہر دونوں کو اس معاملے میں تاط رہنا پڑتا ہے ۔ بحری دائکوں کے ہاں جب تک بچہ پیدا نہ ہو ، ماں باپ دونوں کسی چیز کو ڈوری سے باندھ نہیں سکتے یا کوئی چیز کس نہیں سکتے ۔ شمالی سلیبیز کی ٹومبولوہ قوم میں جب کسی عورت کے چوتھا یا چھٹا مہینہ لگتا ہے تو ایک

رسم ادا کی جاتی ہے ، جس کے بعد اس کے شوہر کو کس کر گرہیں باندھنے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھنے کی اجازت نہیں ۔

ان تمام چیزوں کی پشت پر یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ گرہ باندھنے سے ، بہ قول شرق الہند والوں کے ، عورت جکڑی جائے گی ۔ بہ الفاظ دیگر اس کے وضع حمل میں روڑے اٹک جائیں گے یا وضع حمل کے بعد وہ جلد صحت یاب نہ ہو سکے گی ۔ مثلی یا صوری سحر کی رو سے ڈوری کی گانٹھ ایک ایسی مادی رکاوٹ ہے جس کے مشارک اثر سے گویا عورت کے جسم میں روڑا اٹک جاتا ہے ۔ یہ امر کہ بات واقعی یہی ہے ، اس دستور سے واضح ہو جاتا ہے جس پر مشرقی افریقہ کے ہاس زچگی کے کسی پیچیدہ کیس میں کاربند ہوتے ہیں ۔ جب کوئی عورت سخت درد زہ میں مبتلا ہو اور بچہ کسی طرح پیدا نہ ہوتا ہو تو لوگ مدد کے لیے جادوگر کو بلاتے ہیں ۔ جادوگر عورت کو دیکھ کر کہتا ہے ۔ ''بچہ رحم میں بندھ گیا ہے ، اسی لیے وضع حمل نہیں ہوتے پاتا ۔'' زچہ کی رشتہ دار عورتوں کی منت سماجت پر وہ بچے کے بندھن کھولنے کا وعدہ کر لیتا ہے تاکہ اس عورت کی زچگی ہو جائے ۔ اس غرض سے وہ مذکورہ بالا عورتوں کو جنگل میں بھیج کر کوئی مضبوط سی بیل منگواتا ہے اور اس سے زچہ کے ہاتھ پاؤں پشت پر باندھ دیتا ہے ۔ پھر ایک چاقو لیے زچہ کو آواز دیتا ہے اور جب وہ اسے جواب دیتی ہے تو یہ کہتے ہوئے چاقو سے بیل کو کاٹ ڈالتا ہے ''میں آج کے دن تیرے اور تیرے بچے کے بندھنوں کو کاٹتا ہوں ۔'' اس کے بعد وہ اس بیل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے پانی کے برتن میں ڈال دیتا ہے اور اس پانی سے عورت کو نہلاتا ہے ۔ یہاں اس بیل کو کاٹنا جس سے عورت کے ہاتھ اور پاؤں باندھے گئے ہوں ، مثلی یا صوری سحر کی ایک آسان سی صورت ہے ۔ ساحر یہ سمجھتا ہے کہ اس طریقے سے عورت کے دست و پا کو آزاد کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ماں کے رحم میں بچے کے بندھن کاٹ رہا ہے ، جن کی وجہ سے وضع حمل میں روڑا اٹک رہا ہو ۔ یہی انداز فکر بعض قوموں کے اس دستور کی پشت پر بھی ہے ، جس کے مطابق زچگی کے وقت گھر کے تمام تالے اور کواڑ وغیرہ کھلے رکھے جاتے

ہیں ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ٹرانسلوینیا کے جرمن اسی موقع پر گھر کے سارے تالے کھول دیا کرتے ہیں اور یہی ووئگستان اور میلکن برگ میں بھی ہوتا ہے ۔ آرگل شائر کے شمال مغربی علاقے میں توہم پرست لوگ زچگی کے وقت گھر کا ایک ایک قفل کھول دیتے تھے ۔ بمبئی کے قریب جزیرۂ سالسٹہ میں جب کوئی عورت درد زہ میں مبتلا ہو تو چابی لگا کر گھر کے ہر دروازے اور الماری کا قفل کھول دیا جاتا ہے ۔ سوماٹرا کے باڈالنگوں کے ہاں اس موقع پر تمام پیٹیوں اور صندوقوں کے ڈھکنے اٹھا دیے جاتے ہیں اور پتیلیوں وغیرہ کی چپنیاں ہٹا دی جاتی ہیں اور اگر اس کارروائی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو تو زچہ کے شوہر کو اپنی پریشانی میں گھر کی کسی باہر نکلی ہوئی لکڑی پر ضربیں لگانی پڑتی ہیں ، تاکہ وہ ڈھیلی ہو جائے ، کیوں کہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ ''زچہ کی مشکل آسان کرنے کے لیے ہر چیز کھلی اور ڈھیلی رکھنی چاہیے ۔'' چٹاگانگ میں اگر کسی عورت کا حمل وضع نہ ہوتا ہو تو دائی یہ ہدایت کرتی ہے کہ گھر کی تمام کھڑکیاں اور کواڑ بالکل کھول دیے جائیں ، بوتلوں کے کارک نکال دیے جائیں ، پیپوں کے ڈھکنے ہٹا دیے جائیں ، تھانوں سے گایوں ، طویلوں سے گھوڑوں تازی خانے سے رکھوالے کتوں ، بھیڑوں ، مرغیوں ، بطخوں وغیرہ وغیرہ کو کھول دیا جائے ۔ جانوروں بلکہ بے جان چیزوں کی آزادی کا یہ اذن عام ان لوگوں کے نزدیک ایک ایسی تدبیر ہے جو کبھی رائگاں نہیں جاتی اور جس سے بچے کا پیدا ہونا یقینی ہے ۔ جزیرۂ ساکھالین یا ساغالین میں جس وقت کسی عورت کو درد زہ ہوتا ہے تو اس کا شوہر ہر اس چیز کو کھول دیتا ہے ، جو کھولی جا سکتی ہو ۔ وہ اپنے بالوں کی شکنیں مٹا ڈالتا ہے اور جوتے کے بند ڈھیلے کر دیتا ہے ۔ پھر گرد و پیش کی جو بھی چیز بندھی ہوئی ہو اسے جا کھولتا ہے ۔ صحن کے اندر گڈے میں لگی ہوئی کلہاڑی نکال ڈالتا ہے ۔ اگر درخت سے کوئی کشتی بندھی ہو تو اسے جا کھولتا ہے ۔ اپنی بندوق میں کارتوس اور کمان میں تیر بھی نہیں رہنے دیتا ۔

مزید برایں ، ہم دیکھ آئے ہیں کہ ٹمبولوہ قوم کا آدمی اپنی بیوی

کے ایام حمل میں نہ صرف گرہ لگانے سے احتراز کرتا ہے بلکہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھنے سے بھی - یہ دونوں صورتیں ایک ہی سلسلۂ فکر کا نتیجہ ہیں - آپ خواہ گرہ لگانے میں تاگے کو الجھا دیں یا آرام سے بیٹھنے کے لیے فقط ٹانگ پر ٹانگ رکھ لیں ، دونوں صورتوں میں آپ واقعات کے فطری تسلسل میں رکاوٹ پیدا کریں گے اور آپ کے اس فعل سے آس پاس جو کچھ ہو رہا ہو اس میں رخنہ پڑ سکتا ہے - اس اہم حقیقت سے رومی بخوبی واقف تھے - پلینی بڑی سنجیدگی سے کہتا ہے کہ کسی حاملہ عورت یا زیر علاج مریض کے برابر انگلیوں میں انگلیاں ڈالے بیٹھے رہنا اس پر جادو کرنا ہے ، اور جڑے ہوئے ہاتھوں سے اپنی ٹانگ یا ٹانگوں کا سہلانا یا ٹانگ پر ٹانگ رکھنا اور بھی برا ہے - رومیوں کے نزدیک بیٹھنے کے یہ ڈھنگ ہر قسم کے کام میں سد راہ تھے ، نیز کسی جنگی کونسل یا عمال کی مجلس میں اور عبادت و قربانی کے موقعوں پر کسی کو ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھنے نہیں دیا جاتا تھا - اس انداز نشست سے جن ہول ناک نتائج کے برآمد ہونے کا اندیشہ تھا ان کی سب سے نمایاں مثال آلکمینا کے وضع حمل کی ہے ، جسے ہرکولیز کو جننے میں سات دن اور سات رات درد میں تڑپنا پڑا تھا ، کیوں کہ لوسی نا دیوی (دائنا یا جونو کا ایک نام ، خاص طور پر زچگی کی دیوی کی حیثیت سے) اس گھر کے آگے ہاتھ میں ہاتھ دے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی ہوئی تھی - جب تک جل دے کر اس دیوی کا انداز نشست نہیں بدلوایا گیا الکمینا کا حمل وضع نہ ہو سکا - بلغاری اس وہم میں مبتلا ہیں کہ اگر حاملہ عورت ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھنے کی عادی ہو تو اسے زچگی میں سخت تکلیف ہوگی - بویریا کے بعض حصوں میں جب لوگوں کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور خاموشی چھا جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ ''کسی نہ کسی نے ضرور اپنی ٹانگ پر ٹانگ رکھی ہوگی -''

گانٹھوں کے جس سحری اثر سے انسان کے کاموں میں روڑے اٹکتے ہیں وہ پیدائش کی طرح شادی میں بھی ظاہر ہوتا ہے - ازمنۂ وسطیٰ میں اور اٹھارویں صدی تک اہل یورپ کا یہ عام خیال تھا کہ دولہا دلہن

کی خلوت صحیحہ میں کوئی ایسا شخص رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے ، جس نے شادی کی رسم کے دوران میں کوئی تالا بند کرکے یا ڈوری پر گرہ لگا کے اسے پھینک دیا ہو۔ اس سلسلے میں تالے یا ڈوری کا پانی میں پھینکنا ضروری تھا اور جب تک اسے تلاش کرکے کھول نہ دیا جاتا دولھا دلھن صحیح ملاپ ممکن نہ تھا ۔ لہذا نہ صرف اس قسم کا کوئی عمل کرنا بلکہ کسی ایسی چیز کو چرا کر لے جانا جس کے ذریعے ایسا عمل کیا جا سکتا ہو ، ایک سنگین جرم تھا ۔ ۱۷۱۸ء میں بودوژ کی پارلیمان نے ایک آدمی کو کسی خاندان میں گرہ بند ڈور کے ذریعے رنجش پھیلانے کی پاداش میں زندہ جلانے کی سزا دے دی تھی اور ۱۷۰۵ء میں دو آدمیوں کو اسپالڈنگ آف اشین ٹلی کی شادی میں کھنڈت ڈالنے کی غرض سے کسی عورت کا تیار کردہ گنڈا چرانے کے لیے سزائے موت دے دی گئی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے جادو ٹونوں پر اعتقاد پرٹ شائر کے کہستانی علاقے میں اٹھارویں صدی کے اواخر تک موجود تھا ، کیوں کہ اس وقت تک ٹمیل اور دریائے ٹے کے درمیان لوگی ریٹ کے دل کش کلیسائی علاقے میں یہ دستور جاری تھا کہ شادی کی رسم ادا ہونے سے پہلے دولھا دلھن کے لباس کی ہر گرہ کھول دی جاتی تھی ۔ یہی وہم اور دستور آج بھی شام میں ملتا ہے ۔ جو لوگ شامی دولھا کو لباس عروسی پہناتے ہیں وہ اس بات کی بڑی احتیاط رکھتے ہیں کہ اس کے جوڑے میں کوئی بٹن ، بند اور گرہ نہ لگی رہے ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر دولھا کے لباس میں کوئی بٹن یا گرہ لگی رہ گئی تو اس کے دشمنوں کو سحر کے ذریعے اسے اپنے حقوق عروسی سے روم کرنے کی طاقت حاصل ہو جائے گی ۔ اس قسم کے جادو ٹونوں کا خوف آج بھی تمام شمالی افریقہ میں پھیلا ہوا ہے ۔ کسی دولھا کی قوت مردمی سلب کرنے کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ جادوگر کسی ایسے رومال میں گرہ لگا دے جو وہ دولھا کے گونے کے لیے روانہ ہوتے وقت گھوڑے پر سوار ہونے سے قبل چپکے سے اس کے جسم پر رکھ لایا ہو ۔ جب تک اس رومال میں گرہ لگی رہے دولھا خلوت صحیحہ کے قابل نہیں رہتا ۔

نیز گانٹھوں کے ذریعے امراض و عوارض اور ہر قسم کے مصائب پیدا کیے جا سکتے ہیں ۔ چناں چہ بعض وقت مغربی افریقہ کی ہاس قوم کا جادوگر اپنے دشمن پر لعنت بھیج کر یہ کہتے ہوئے گھاس کے تنکے میں گرہ لگا دیتا ہے : ''میں نے اس گرہ میں فلاں فلاں شخص کو باندھ ڈالا ہے ، اس پر ہر قسم کی آفت نازل ہو ۔ جب وہ کھیت جائے تو اسے سانپ ڈس لے ، شکار کے لیے نکلے تو گھات میں لگا ہوا درندہ اس پر حملہ کر دے ، دریا میں گرے تو موج اسے بہا لے جائے ، بارش ہو تو اس پر بجلی گرے اور اس کی راتیں مصیبت کی راتیں ہوں !'' خیال ہے کہ ساحر اس طرح دشمن کو گرہ میں باندھ لیتا ہے ۔ قرآن پاک میں ایسے لوگوں کے شر کی طرف اشارہ ملتا ہے ''جو گرہوں پر پڑھ کر پھونکا کرتے ہیں'' [''و مِن شرِالنَّفّٰثٰتِ فی العُقد' یہ سورۂ الفلق کی ایک آیت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے : (کہہ ! پناہ لیتا ہوں رب صبح کی) 'گرہوں پر پڑھ کر پھونکنے والیوں کے شر سے ۔' روایات کے بموجب لبید بن الاعصم نامی ایک یہودی نے جب اپنی بیٹیوں سے جناب رسالت مآب پر جادو کرایا تو گیارہ آیتوں کی دو سورتیں 'الفلق' اور 'الناس' نازل ہوئیں ۔ یہ جادو شانہ کے دندانوں اور بالوں میں گیارہ گرہیں لگا کر کیا گیا تھا ، جس سے حضور کا مزاج سال بھر تک ناساز رہا ۔ جب یہ سورتیں نازل ہوئیں تو آپ نے انھیں پڑھنا شروع کیا اور ہر آیت پر ایک گرہ کھلتی چلی گئی ۔ آخری گرہ کے کھلتے ہی جادو کا اثر زائل ہو گیا اور آپ کو افاقہ ہو گیا ۔ لیکن ان روایتوں کی تائید میں کوئی معتبر شہادت موجود نہیں اور یہ محض من گھڑت کہانیاں معلوم ہوتی ہیں ۔ مذکورہ بالا سورہ میں در اصل ہر قسم کے شر یا خوف باطل اور نفسیاتی خطروں سے خدا کی پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے ۔ اس آیۃ کریمہ میں جن خطروں کی طرف اشارہ ہے ان میں وہ وہم یا تخیل کے کرشمے شامل ہیں ، جن کی واقعیت کو خود مصنف تسلیم کر چکا ہے اور جن کے اثر سے اسی کے الفاظ میں ''آدمی کی موت اسی طرح یقینی ہے جس طرح ہائیڈرو سائنک ایسڈ کی ایک خوراک سے ۔'' [xii, (1)] ایک عرب مفسر نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ اس

میں ان عورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ڈوریوں پر گرہیں لگا کر جادو کیا کرتی ہیں اور پھر ان گنڈوں پر دم کر کے تھوک دیتی ہیں۔ (یہ شاید اس لیے کہ نفثات ، نفث سے ماخوذ ہے ، جس کے معنی پھونکنے کے بھی ہیں اور کسی چیز کو تھوکنے کے بھی۔ لیکن یہ سب مفسر کی شاعری معلوم ہوتی ہے)۔ نیز وہ بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ کسی شریر یہودی نے ایک ڈوری پر نو گرہیں لگا کر خود جناب رسالت مآب پر سفلی عمل کیا اور پھر اسے ایک کنوئیں میں چھپا دیا۔ اس کے اثر سے آپ کا مزاج مبارک ناساز ہو گیا۔ اگر جبریل آپ پر یہ منکشف نہ کر دیتے کہ وہ گنڈا کہاں چھپایا گیا ہے تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ آپ کے معتمد خاص حضرت علی اس سفلی چیز کو کنوئیں سے نکال لائے۔ آپ نے اس پر کچھ آیتیں پڑھ کر پھونکنا شروع کیں جو خاص اسی غرض سے نازل ہوئی تھیں ، جس کے اثر سے ہر آیت پر ایک ایک گرہ کھلتی چلی گئی اور آپ کو کچھ افاقہ سا محسوس ہوا۔

عام خیال کے بموجب جہاں گرہوں کے اثر سے آدمی ہلاک ہو جاتا ہے ، وہاں اچھا بھی ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس عقیدے سے مستنبط ہوتی ہے جس کی رو سے ایسی گرہوں کو کھول دینے سے جو بیماری کا موجب ہوں ، مریض کو افاقہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مضر گرہوں کی اس سلبی خوبی سے قطع نظر ، کچھ منفعت بخش گرہیں ایسی بھی ہیں جو صحت و شفا کی ایجابی خوبی کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔ پلینی کا بیان ہے کہ بعض لوگ چڈے کے امراض کا علاج اس طرح کیا کرتے تھے کہ ایک ڈوری لے کر اس پر نو گرہیں لگاتے اور پھر اسے مریض کے چڈے میں باندھ دیتے ، لیکن اس علاج میں کامیابی کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہر گرہ کسی بیوہ کا نام لے کر لگائی جائے۔ اوڈونوون نے (آنیسویں صدی کا ایک آئرش ماہر آثار قدیمہ) ترکمانوں کے ایک طریق علاج کی کیفیت بیان کی ہے۔ ان کے ہاں ساحر کچھ اونٹ کے بال لے کر کوئی منتر بڑبڑاتا ہوا ایک مضبوط تانت بٹ لیتا ہے ، پھر اس تانت کو کسنے سے پہلے اس پر سات گرہیں لگاتا ہے اور ہر گرہ پر دم کرتا جاتا ہے۔ اس گرہ دار تانت کو مریض کنگن کی طرح

اپنے ہاتھ میں پہن لیتا ہے ۔ ہر روز اس کی ایک گرہ کھول کر اس پر پھونکا جاتا ہے اور جب ساتویں گرہ کھل جاتی ہے تو اس تانت کی گولی سی بنا کر اسے دریا میں پھینک دیا جاتا ہے ، جس کے ساتھ (جیسا کہ ان کا خیال ہے) مریض کا بخار چلا جاتا ہے ۔

نیز گرہوں کے ذریعے ساحرہ کسی کو اپنے عشق میں مبتلا کرکے اسے اپنا بندۂ بے دام بنا سکتی ہے ۔ چناں چہ ورجل کے ہاں محبت کی ماری دوشیزہ تین مختلف رنگوں کی ڈوریوں پر تین تین گرہیں لگا کر ڈافنیس کو اپنے سحر کے زور سے شہر سے کھینچ لانے کی کوشش کرتی ہے ۔ اسی طرح کوئی عرب دوشیزہ جو کسی کو اپنا دل دے بیٹھی ہو ، اپنے محبوب کے چابک میں گرہیں لگا کر اس کے دل پر قبضہ کرنے اور اسے اپنا بنانے کی کوشش کرتی تھی ، لیکن اس کی رقیب رشک میں گرہوں کو سلجھا دیتی ۔ اسی اصول کی رو سے گنڈے کے ذریعے مفرور کو روکا جا سکتا ہے ۔ سوازستان (جنوبی افریقہ) میں آپ کو راستوں کے کنارے اکثر گھاس میں گرہیں لگی نظر آئیں گی ۔ اس میں ہر گرہ کسی گھریلو المیے کی داستان سناتی ہے ۔ مثلاً کسی شخص کی بیوی بھاگ گئی ہو اور وہ اور اس کے لوگ اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس طرح راستے کو بند کر گئے ہوں تاکہ مفرور دفعتاً گھوم کر انھیں جل نہ دے جائے ۔ روس میں جال کو اس کی گانٹھوں کی وجہ سے ہمیشہ جادوگروں سے بچاؤ کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے ۔ اسی لیے بعض مقامات پر جب کسی دلہن کو شادی کا جوڑا پہنایا جا رہا ہو تو اس پر مچھلی پکڑنے کا جال پھیلا دیا جاتا ہے تاکہ اسے کوئی گزند نہ پہنچنے پائے ۔ کچھ اسی مقصد سے دولھا اور دولھا والوں کے بھی اکثر جال کے ٹکڑے یا کم از کم پیٹیاں کس دی جاتی ہیں ، کیوں کہ ساحر کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان پر کوئی مضر عمل شروع کرنے سے پہلے جال کی تمام گرہیں کھول دے یا پیٹیاں اتار دے ، لیکن عام طور پر روسی حرز ایک گنڈے پر مشتمل ہوتا ہے ۔ خیال ہے کہ سرخ اون کی ایک لچھی کسی کی ٹانگوں اور بازوؤں سے لپیٹ دی جائے تو وہ جاڑے بخار سے بچا رہتا ہے اور کسی بچے کی گردن سے

بندھی تو انٹیاں سرخ بخار سے بچاؤ کا ذریعہ سمجھی جاتی ہیں ۔ صوبہ ٹویر (روس) میں ایک خاص تھیلی اس گائے کے گلے میں باندھ دی جاتی ہے جو گلے کے آگے آگے چلتی ہے تاکہ بھیڑیوں کو دور رکھا جائے ۔ اس کے اثر سے درندے کے معدے میں گویا گرہ لگ جاتی ہے ۔ اسی اصول کی بناء پر موسم بہار میں گھوڑوں کے گلے کو کھیت پر لے جانے سے پہلے اس کے ایک قفل تین لپیٹیں دے کر باندھ دیا جاتا ہے جسے سائیس راستے میں کھولتا بند کرتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا ہے : ''میں اس فولادی قفل سے بھورے بھیڑیوں کے منہ بند کرتا ہوں تاکہ وہ میرے گلے کو پھاڑ نہ کھائیں ۔''

گرہیں اور تالے جادوگروں کے علاوہ خود موت سے بھی بچنے کا وسیلہ سمجھے جاتے ہیں ۔ ۱۵۷۲ء میں سینٹ انڈریوز کے مقام پر ایک عورت جادوگری کے الزام میں ماخوذ ہو کر زندہ جلانے کے لیے لائی گئی ، جس کے لباس میں سے کالر جیسا ایک ایسا کپڑا برآمد ہوا جس میں گرہ دار ڈوریاں لگی تھیں ۔ یہ کپڑا اس سے زبردستی لے لیا گیا ؛ وہ اسے چھوڑتی نہ تھی ، کیوں کہ غالباً وہ یہ سمجھتی تھی کہ جب تک وہ اس کے جسم پر رہے گا آگ کا اس پر کچھ اثر نہ ہوگا ۔ جب اس کپڑے کو اس سے چھین لیا گیا تو اس نے کہا ''اب مجھے اپنے بچنے کی کوئی امید نہیں ۔'' انگلستان کے بہت سے حصوں میں لوگوں کا خیال ہے کہ جب تک کسی گھر کے تالے بند ہوں یا دروازوں وغیرہ کی چٹخنیاں لگی ہوں اس میں کسی کا دم نہیں نکل سکتا ۔ اس لیے وہاں یہ دستور عام ہے کہ جب مریض کا آخری وقت آ جائے تو تمام تالے اور چٹخنیاں کھول دی جاتی ہیں ، تاکہ وہ نزع کی تکلیف سے جلد نجات پا جائے ۔ مثلاً ۱۸۶۳ء کا ایک واقعہ ہے کہ ٹانٹن میں ایک لڑکے پر سرخ بخار کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ اس کی موت ناگزیر نظر آنے لگی ۔ ''عورتوں کی ایک جوڑی بیٹھ گئی اور بچے کو نزع کی اذیت سے بچانے کے لیے گھر کے سارے دروازے ، الماریاں ، صندوق ، گنجینے کھول ڈالے گئے اور ان کی چابیاں نکال لی گئیں ۔ اس جان بہ لب بچے کو گھر کے ایک شہتیر کے نیچے لٹا دیا گیا کہ اس طرح اس کے سفر آخرت میں

کسی چیز کے سد راہ ہونے کا امکان باقی نہ رہے۔'' لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ بچہ ان تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھانے اور مر کر اپنے حسن اخلاق کا ثبوت دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے اتنی جلدی اپنی روح سے جدا ہونے کی بجائے زندہ رہنا پسند کیا۔

اس دستور کی بنیاد بھی، جس کے مطابق بعض مذہبی یا سحری رسموں کے دوران میں بال کھلے اور پاؤں ننگے رکھنے ضروری ہیں، غالباً یہی خوف ہے کہ کہیں گرہ یا کسی قسم کے انقباض سے، خواہ وہ سر میں ہو یا پاؤں میں، کسی زیر تکمیل کام میں رکاوٹ نہ واقع ہو جائے۔ روحانی یا جسمانی عمل میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کچھ ایسی ہی قوت لوگ انگوٹھیوں سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ چناں چہ جزیرۂ کار پیتھیس والے میت کے کفن میں بٹن نہیں لگاتے اور اس کی انگوٹھیاں بڑی احتیاط سے اتار لیتے ہیں، ''ان کا کہنا ہے کہ روح ایک انگلی میں بھی اٹکی رہ سکتی ہے اور سکون نہیں پا سکتی۔'' اس صورت میں ظاہر ہے کہ روح کے متعلق یہ خیال تو قطعاً نہیں کہ وہ مرتے وقت ناخنوں سے نکلتی ہے، لیکن یہ تصور ضرور موجود ہے کہ انگوٹھی کے دباؤ سے غیر فانی روح مقید ہو جاتی ہے اور اپنی کوششوں کے باوجود کالبد خاکی سے نکلنے نہیں پاتی۔ مختصر یہ کہ گرہ کی مانند انگوٹھی کی حیثیت ایک روحانی بیڑی کی سی ہے۔ یہی خیال ایک یونانی مقولے کی پشت پر معلوم ہوتا ہے، جو حکیم پائی تھاگورس سے منسوب کیا جاتا ہے اور جس میں انگوٹھی پہننے کی ممانعت ہے۔ آرکیڈیا میں لائی کوشورا کے مقام پر خاتون (غالباً ڈیسپوئنا دیوی سے مراد ہے، جسے لائی کوشورا میں لوگ ڈیمیٹر اور پوسائی دان کی بیٹی کی حیثیت سے پوجتے تھے) کے معبد میں کوئی مرد یا عورت انگوٹھی پہنے داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ لوگ جو فاؤنس (جنگلی دیوتا یا روح) کی ندائے غیب سے مشورہ کرتے ان کا عفیف و پاک باز ہونا ضروری تھا، نیز وہ گوشت نہیں کھا سکتے تھے اور نہ انگوٹھی پہن سکتے تھے۔

دوسری طرف جس انقباض کے سبب روح کے نکلنے میں رکاوٹ

پیدا ہوتی ہے ، وہی ارواح بد کے داخل ہونے میں بھی سد راہ ہو سکتا ہے ۔ اسی لیے انگوٹھیاں جادوگرنیوں اور بد روحوں سے محفوظ رہنے کے لیے تعویذوں کے طور پر پہنی جاتی ہیں ۔ ٹی رل میں کہا جاتا ہے کہ عورت کو زچگی کے وقت اپنی انگوٹھی کبھی نہیں اتارنی چاہیے ۔ لیپستان والوں کے ہاں جب کوئی شخص میت کو تابوت میں رکھنے لگتا ہے تو متوفی کا شوہر ، بیوی یا بچے اسے ایک پیتل کی انگوٹھی دیتے ہیں اور جب تک میت کی بخیر و خوبی تدفین نہیں ہو جاتی اس شخص کو یہ انگوٹھی اپنے داہنے بازو پر باندھ کر رکھنی پڑتی ہے ۔ اس انگوٹھی کے بارے میں لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک ایسا حرز ہے جس کی وجہ سے میت دفن کرنے والے کو متوفی کی روح کی طرف سے کوئی گزند نہیں پہنچنے پاتا ۔ انگوٹھیوں کی طلسمی قوت سے آدمی کی روح کے جسم میں رکے رہنے یا اس کے جسم کے پریت سے محفوظ رہنے پر اعتقاد کہاں تک انگوٹھیاں پہننے کے رواج پر اثر انداز ہوا ہے ، بلکہ یہ رواج کس حد تک اس کا نتیجہ ہے ؟ ایک ایسا سوال ہے جو غور کرنے کے قابل ہے ، لیکن یہاں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس اعتقاد سے فلیمن ڈیالس کے انگوٹھی پہننے پر جو امتناع عاید تھا اس پر کیا روشنی پڑتی ہے ۔ چناں چہ اس پر اس دوسرے ضابطے کے ساتھ غور کیا جائے ، جس کی رو سے فلیمن ڈیالس پر گرہ دار لباس کا پہننا حرام تھا تو ظاہر ہوگا کہ اس امتناع کی پشت پر یہ اندیشہ کار فرما تھا کہ گرہوں اور انگوٹھیوں جیسی چیزوں کے مادی اور روحانی دباؤ سے اس پیشوا کی طاقت ور روح جکڑ کر رہ جائے گی اور اس کی آمد و شد جاری نہ رہ سکے گی ۔

بائیسواں باب

# الفاظ کی تحریم

(۱) شخصی ناموں کی تحریم — چوں کہ وحشی کے ذہن میں لفظوں اور چیزوں کا فرق مبہم سا ہوتا ہے ، اس لیے وہ بالعموم یہ سمجھتا ہے کہ کسی شخص یا چیز اور اس کے نام کا تعلق بے بنیاد یا خیالی نہیں بلکہ وہ دونوں ایک ایسے ٹھوس اور حقیقی رشتے میں منسلک ہیں کہ کسی شخص پر اس کے نام کی وساطت سے جادو کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ اس کے بالوں ، ناخنوں یا کسی اور جزو بدن کی وساطت سے ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غیر مہذب انسان کی دانست میں آدمی کا نام اس کا ایک جزو حیات ہے اور اسی لحاظ سے وہ اس کے بارے میں بڑا محتاط رہتا ہے ۔ چناں چہ شمالی امریکہ کے اصلی باشندے کے ''نزدیک اس کا نام محض ایک لیبل نہیں ہے ، بلکہ وہ اسی طرح اس کا ایک جزو بدن ہے ، جس طرح اس کی آنکھیں یا دانت ۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اس کے نام کے مخاصمانہ استعمال سے اس کو آزار پہنچنا ویسا ہی یقینی ہے جیسا کہ اس کے جسم کے کسی حصے پر ضرب لگانے سے ۔ یہ عقیدہ بحراوقیانوس سے لے کر بحرالکاہل تک مختلف قبیلوں میں پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے ناموں کے پوشیدہ رکھنے سے متعلق کئی عجیب و غریب ضوابط وجود میں آ گئے ہیں ۔'' بعض اسکیمو بڑھاپے کو پہنچ کر اپنے نام بدل ڈالتے ہیں ۔ انھیں یہ امید ہوتی ہے کہ ان نئے ناموں کی برکت سے انھیں نئی زندگی مل جائے گی ۔

سلیبیز کی تولامپو قوم کے عقیدے کے بموجب اگر آپ کسی کا نام لکھ لیں تو اس کے ساتھ اس کی روح کو لے جا سکتے ہیں۔ بہت سے وحشی آج بھی اپنے ناموں کو اپنا جزو حیات سمجھتے ہیں اور اس لیے اصلی نام پوشیدہ رکھنے میں بڑے جتن کرتے ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ان ناموں کی بدولت شرپسند اشخاص کے ہاتھ ایک حربہ نہ آ جائے اور وہ انھیں گزند نہ پہنچا دیں۔

ان میں پہلے ان وحشیوں کو لیجیے جو سب سے زیادہ پستی کی حالت میں ہیں۔ چناں چہ بیان کیا جاتا ہے کہ آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کے ہاں شخصی ناموں کے معاملے میں جو راز داری برتی جاتی ہے ''اس کی بناء بڑی حد تک یہ عقیدہ ہے کہ جو دشمن آپ کے نام سے واقف ہو جائے اس کے ہاتھ ایک ایسی چیز آ جاتی ہے کہ جس پر جادو کرکے وہ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔'' ایک اور مصنف رقم طراز ہے: ''آسٹریلوی وحشی اپنا اصلی نام بتانے سے گریز کرتا ہے، اس کی اس ہچکچاہٹ کا سبب یقیناً یہ اندیشہ ہے کہ اسے اپنے نام کے ذریعے جادوگر کی طرف سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔'' وسطی آسٹریلیا کے قبیلوں میں ہر مرد، عورت اور بچے کا اس کے عام نام کے علاوہ ایک پوشیدہ یا مقدس نام بھی ہوتا ہے جو اس کی پیدائش پر بزرگوں کی طرف سے اسے عطا ہوتا ہے اور جس کی برادری یا جماعت کے صرف انھی افراد کو خبر ہوتی ہے جو بالغ قرار دیے جا چکے ہوں۔ یہ خفیہ نام خاص موقعوں کے سوا کبھی زبان پر نہیں لایا جاتا۔ اس کا کسی غیر برادری کے مردوں اور عورتوں کو سنا دینا قبیلے کے دستور کی سخت خلاف ورزی اور بمنزلہ ایک گناہ کبیرہ کے ہے۔ خاص موقعوں پر یہ نام نہایت دھیمی آواز میں زبان سے نکالا جاتا ہے اور پہلے اس بات کی ہر ممکن احتیاط کر لی جاتی ہے کہ اس کی بھنک بھی کسی غیر برادری کے فرد کے کانوں میں نہ پڑنے پائے۔ ''اس علاقے کا باشندہ یہ سمجھتا ہے کہ کسی غیر شخص کو اس کا خفیہ نام معلوم ہو جائے تو مؤخرالذکر کو اسے سحر کے ذریعے نقصان پہنچانے کی خاص قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سحر ہی کے خوف کی بناء پر اسی قسم کا ایک دستور قدیم مصریوں کے ہاں بھی جاری تھا ، جن کی اعلیٰ تہذیب میں بہت سے بے جوڑ پیوند انتہائی وحشت و پستی کی غمازی کرتے تھے - ہر مصری کے دو نام رکھے جاتے تھے ، جن میں علیٰ الترتیب ایک اس کا سچا نام کہلاتا تھا اور ایک اچھا یا کارآمد نام ، یا ایک بڑا نام اور ایک چھوٹا نام - کارآمد یا چھوٹا نام سب کو بتا دیا جاتا تھا اور سچا یا بڑا نام غالباً بڑی احتیاط سے مخفی رکھا جاتا تھا - اسی طرح کسی برہمن بچے کو دو نام ملا کرتے ہیں - ایک عرف عام اور دوسرا مخفی نام جس کا ماں باپ کے سوا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے - اس دستور سے متعلقہ شخص کو سحر سے محفوظ رکھنا مقصود ہے ، کیوں کہ کسی افسوں کا اثر اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس میں سحر زدہ شخص کا اصلی نام شامل ہو - اسی طرح نیاس والوں کا عقیدہ ہے کہ شیاطین کسی شخص کا نام سن پائیں تو اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں - اسی لیے ان کے ہاں آن شیر خوار بچوں کے نام کبھی نہیں لیے جاتے جنھیں بد روحوں کی طرف سے خاص خطرہ ہو - اور کچھ اسی سبب سے لوگ کسی سنسان جنگل ، دریا یا اُبلتے ہوئے چشموں کے کناروں جیسے آسیب زدہ مقامات پر ایک دوسرے کو نام لے کر آواز نہیں دیتے -

چلوئے (جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل پر ایک جزیرہ جو ریاست چلی میں شامل ہے) کے قدیم باشندے اپنے نام پوشیدہ رکھتے ہیں اور انھیں یہ بات پسند نہیں کہ ان کے نام اونچی آواز میں لیے جائیں - ان کا کہنا ہے کہ براعظم یا آس پاس کے جزیروں میں بھتنے یا پریاں رہتی ہیں جو اگر لوگوں کے نام سن پائیں تو انھیں نقصان پہنچا دیتی ہیں - جب تک ان شریر روحوں کو ان کے نام نہیں معلوم ہوتے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں - آرو کینیائی (یہ بھی چلی ہی کے ایک علاقے کے قدیم باشندے ہیں) اس خوف سے کسی اجنبی کو اپنے نام نہیں بتاتے کہ ان کے جاننے سے اس کو ان لوگوں پر ایک قسم کی خارق عادت قوت حاصل ہو جائے گی - اگر کوئی اجنبی ، جو

اُن کے توہمات سے واقف نہ ہو ، ان میں سے کسی کا نام پوچھے تو وہ جواب دے گا ''میرا کوئی نام نہیں ۔'' جب کسی اوجبوے سے اس کا نام پوچھا جائے تو وہ پاس کھڑے ہوئے کسی آدمی کی طرف دیکھے گا اور اس سے کہے گا کہ تم اس کا جواب دے دو ۔ ''اس ابا کا سبب یہ ہے کہ نو عمری ہی سے ان کے دل میں یہ وہم جاگزین ہو جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے نام زبان پر لاتے رہے تو ان کی جسمانی نشو و نما رک جائے گی اور وہ ٹھگنے رہ جائیں گے ۔ اپنے نام بتانے میں ان کے اس تذبذب کی وجہ سے ہ ت سے اجنبیوں نے یہ سمجھ لیا کہ یا تو ان کے نام ہوتے ہی نہیں یا وہ انھیں بھول گئے ہیں ۔''

معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری صورت میں اجنبیوں پر نام ظاہر کرنے میں کوئی اندیشہ مانع نہیں ۔ نقصان کا خطرہ صرف اس صورت میں رہتا ہے کہ کوئی شخص اپنا نام خود بتائے ۔ اس کا کیا سبب ہے ؟ خاص طور پر یہ کیوں خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص اپنا نام زبان پر لاتا رہے تو اس کی نشو و نما رک جاتی ہے ؟ ہمارا قیاس ہے کہ ان وحشیوں کے نزدیک ، جن کے فکر و عمل کا انداز یہ ہے ، کسی شخص کا نام اس کا جزو حیات صرف اسی وقت ہوتا ہے جب وہ خود اپنے سانس کے ذریعے اسے منہ سے نکالے ۔ اگر کسی اور کے سانس کے ساتھ وہ زبان پر آئے تو اس کا مسمیٰ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اس کے ذریعے شخص مذکور کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا ۔ ان سیدھے سادے فلسفیوں کا استدلال یہ ہوگا کہ جب کوئی شخص اپنا نام خود اپنی زبان سے نکالتا ہے تو اس کی ذات کا ایک جزو اس سے الگ ہو جاتا ہے اور اگر وہ یہ بد احتیاطی کرتا رہے تو اس کے قویٰ گرتے چلے جائیں گے اور اس کی صحت برباد ہو کر اس کا کام تمام ہو جائے گا ۔ ان سادہ دل معلمین اخلاق نے مثال کے طور پر بہت سے منحنی بدکاروں اور ناتواں بیماروں کی طرف اشارہ کرکے اپنے ہیبت زدہ چیلوں کو بتایا ہوگا کہ جن غلط کاروں کو اپنا نام لینے کی لت ہوتی ہے ان کا دیر یا سویر کیا عبرت ناک انجام ہوتا ہے ۔

ہم اس چیز کی توجیہ خواہ کچھ ہی کریں ، یہ واقعہ ہے کہ

بہت سے وحشی اپنا نام زبان پر لانے سے بے حد پرہیز کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی کوئی اور ان کا نام لے تو اس پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا، بلکہ ان کا نام پوچھنے والے اجنبی کی تسلی کرنے کے لیے وہ دوسروں ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ چناں چہ مدغاسکر کے بعض علاقوں میں کسی شخص کا اپنا نام آپ بتانا ممنوع ہے۔ اس کی طرف سے کوئی غلام یا خادم اس کا نام بتاتا ہے۔ فکر و عمل کا یہ عجیب سا تناقض چند امریکی قبیلوں میں بھی ملتا ہے۔ چناں چہ ان کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ ''امریکی نسل کے کسی آدمی کا نام ایک مقدس چیز ہے، جسے وہ بلا لحاظ مناسب کسی پر ظاہر نہیں کر سکتا۔ کسی قبیلے کے سپاہی سے اس کا نام پوچھا جائے تو وہ اس کے بتانے سے صاف انکار کر دے گا یا پھر مصلحتاً تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ دے گا کہ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے کیا پوچھا گیا ہے اور جوں ہی اس سپاہی کا کوئی دوست قریب آتا دکھائی دے، وہ چپکے سے اس کے کان میں کہہ دے گا کہ اس سے کیا پوچھا جا رہا ہے۔ یہ اس کا نام بتا سکتا ہے، جس کے بدلے میں وہ اس کے ساتھ بڑی خوش خلقی سے پیش آئے گا۔'' اس کلیے کا اطلاق مثلاً برطانوی کولمبیا کے قبیلوں پر ہوتا ہے جن کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے: ''ان کے ہاں ایک نہایت عجیب رجحان، جو تمام قبیلوں میں یکساں معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ وہ اپنے نام خود بتاتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں۔ چناں چہ آپ کسی شخص کا نام خود اس سے معلوم نہیں کر سکتے۔ لیکن انہیں ایک دوسرے کے نام بتانے میں کوئی تذبذب نہیں ہوتا۔'' یہی چیز شرق الہند کے سارے مجمع الجزائر کے آداب محفل میں داخل ہے۔ یہاں اصولاً کوئی شخص اپنا نام زبان پر نہیں لائے گا۔ کسی سے یہ پوچھنا کہ ''آپ کا نام کیا ہے؟'' سخت بدتمیزی ہے۔ جب کسی انتظامی یا عدالتی کام کے سلسلے میں کسی دیسی کا نام پوچھا جائے تو وہ خود جواب دینے کی بجائے اپنے ساتھی کی طرف دیکھے گا کہ وہ اس کا جواب دے یا پھر وہ دو ٹوک یہ کہہ دے گا کہ ''ان سے پوچھیے۔'' اس وہم میں بلا استثناء سارے شرق الہند والے مبتلا ہیں اور وہ

ماتو اور ماتومو قبیلوں ، مغربی نیوگنی میں فنش ہیون کے پاپوائیوں اور جزائر بسمارک کے ملینیشیائیوں میں بھی پایا جاتا ہے ۔

جنوبی افریقہ کے متعدد قبیلوں میں اگر عورتوں اور مردوں کو ان کا نام بتانے والا کوئی مل جائے تو وہ اپنا نام خود اپنی زبان سے ہرگز نہیں لیتے ، لیکن بہ صورت مجبوری وہ اس سے بالکل انکار بھی نہیں کرتے ۔

بعض صورتوں میں ذاتی ناموں کے بارے میں یہ امتناع ہمیشہ عاید نہیں رہتا ، بلکہ حالات پر منحصر ہوتا ہے اور ان کے بدلتے ہی کالعدم ہو جاتا ہے ۔ چناں چہ جب ناندی قبیلے کے آدمی یلغار کے لیے نکلے ہوں تو گھر پر ان کے پیچھے کوئی شخص ان کے نام نہیں لے سکتا ۔ انھیں 'چڑیوں' کے عرف عام سے یاد کرنا پڑتا ہے ۔ اگر کوئی بچہ بھولے سے کہیں دور افتادہ لوگوں میں سے کسی کا نام زبان پر لے آئے تو اس کی ماں اسے ڈانٹ کر کہتی ہے ''ان چڑیوں کا ذکر نہ کرو جو عالم بالا میں ہیں ۔'' کانگو کے بالائی علاقے کے بانگالاؤں کے ہاں جب تک کوئی شخص پھلی کے شکار پر ہو یا مچھلی پکڑ کر واپس آ رہا ہو ، اس کا اصلی نام کالعدم رہتا ہے اور کوئی شخص اسے زبان سے نہیں نکال سکتا ۔ اس مچھیرے کا اپنا نام خواہ کچھ ہی ہو ، اس کو 'مویلے' کے اسم عام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دریا روحوں سے گھرا ہوتا ہے ، جو اگر اس مچھیرے کا اصلی نام سن پائیں تو کچھ ایسی شرارت کر جائیں گی کہ اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا ۔ وہ مچھلی پکڑ کر کنارے پر آ جائے ، تب بھی خریدار اسے اس کے اسم خاص سے مخاطب نہیں کر سکتا ، بلکہ اس کے لیے وہی 'مویلے' کا عرف عام استعمال کرنا پڑتا ہے ، کیوں کہ اس وقت بھی اگر روحوں کے کان میں اس کے اصلی نام کی بھنک پڑ جائے تو وہ اسے سن رکھیں گی اور کسی دن اس سے سمجھ لیں گی ۔ یا پھر جو مچھلیاں جال میں آ گئی ہوں وہ ان کا اس طرح ناس مار کر رکھ سکتی ہیں کہ مچھیرے کو ان کے اونے پونے کرنے پڑ جائیں ۔ لہذا اگر کوئی شخص مچھیرے کا نام لے لے تو وہ اس سے بھاری ہرجانہ وصول کر

سکتا ہے یا اُس ناعاقبت اندیش کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اس کی مچھلی کے معقول دام دے کر اس کی شومئی قسمت کی تلافی کر دے۔ جب نیو برٹن کے سلکا اپنے گاکیٹی نامی دشمنوں کے علاقے کے قریب سے گزرتے ہیں تو ان کے اصلی نام لینے سے سخت احتراز کرتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ان کے یہ دشمن اُن پر حملہ کرکے اُنھیں قتل کر ڈالیں گے۔ اس لیے ایسے حالات میں وہ ان گاکیٹی لوگوں کو ''اولاپ سائک'' یعنی 'نکمے کندے' کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس نام سے اپنے مخدوش دشمنوں کو یاد کرکے وہ ان کے ہاتھ پاؤں کندوں کی طرح بوجھل اور بے ڈول بنا ڈالیں گے۔ یہ آخری مثال الفاظ کی نوعیت کے متعلق ان وحشیوں کے انتہائی مادہ پرستانہ تصور کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اصل میں یہ فرض کر رکھا ہے کہ محض کسی ایسے لفظ کے بول دینے سے، جو بے ڈھنگے پن کو ظاہر کرتا ہو، مشارکت کی بناء پر ان کے دشمنوں کے ہاتھ پاؤں بے ڈول ہو جائیں گے۔ اس غلط نظریے کی ایک اور مثال کافروں (افریقہ کی ایک قوم) کے اس عقیدے میں ملتی ہے کہ کسی اُبلتے ہوئے جوشاندے کی کیتلی پر کسی نوعمر چور کا نام بلند آواز سے لیا جانے اور پھر کیتلی کا ڈھکنا بند کرکے کئی دن تک اس کے نام کو جوشاندے میں بھیگنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو چور کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ چور کا اس بات سے واقف ہونا قطعاً ضروری نہیں کہ اس کے نام کے ساتھ کیا غائبانہ کارروائی ہو رہی ہے۔ اس کے اخلاق کی اصلاح اس کے علم کے بغیر ہو جائے گی۔

جب کسی شخص کے نام کا اخفا ضروری متصور ہو تو اکثر یہ ہوا کرتا ہے کہ اسے، جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، کسی عرف یا کنیت سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عام خیال کے بموجب اصل ناموں کے برخلاف یہ دوسرے نام آدمی کا جزو ذات نہیں ہوتے، اس لیے انھیں متعلقہ آدمی کو خطرے میں ڈالے بغیر بے تکلف استعمال اور ہر شخص پر ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ بعض وقت خود اس کے اپنے نام سے بچنے کے لیے اس کے بچے کے نام سے کام چلایا جاتا ہے۔

چناں چہ بتایا جاتا ہے کہ ''گپس لینڈ (وکٹوریا ، آسٹریلیا) والوں کے لیے غیر قبیلے کے کسی شخص کا ان کے نام معلوم کرنا سخت قابل اعتراض بات تھی ۔ انھیں یہ ڈر تھا کہ کہیں دشمن ان کے ناموں کے ذریعے جادو کرکے ان کی جان نہ نکال لے۔ بچوں کے بارے میں چوں کہ یہ خیال تھا کہ ان کا کوئی دشمن نہیں ہوتا ، اس لیے کسی شخص کو اس کے بیٹے ، بھتیجے یا چچا زاد بھائی کے حوالے سے یاد کیا جاتا اور تمام صورتوں میں وہ کسی بالغ آدمی کا نام لینے سے گریز کرتے تھے ۔'' سلیبیز میں پاسو کے الفور اپنے نام زبان پر نہیں لاتے ، لہذا ان میں اگر کسی شخص کا نام معلوم کرنا ہو تو خود اس سے نہیں پوچھنا چاہیے ، بلکہ دوسروں سے معلوم کرنا چاہیے ۔ لیکن اگر یہ کسی وجہ سے ممکن نہ ہو ، مثلاً اس وقت قریب کوئی اور نہ ہو تو اس سے اس کے بچے کا نام پوچھ لیا جائے اور پھر اسے ''فلاں فلاں کے باپ'' کہہ کر مخاطب کیا جائے ۔ یہی نہیں ، بلکہ یہ الفور خود اپنے بچوں کے نام لیتے ہوئے جھجکتے ہیں ۔ چناں چہ کسی لڑکی کے بھتیجا یا بھتیجی ہو تو اسے 'فلاں فلاں کے چچا' یا 'فلاں فلاں کی پھوپھی' پکارا جاتا ہے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خالص ملائی معاشرے میں آدمی سے کبھی اس کا نام نہیں پوچھا جاتا اور ماں باپ کو ان کے بچوں کی نسبت سے پکارنے کا طریقہ اس لیے رائج ہے کہ ان کے نام نہ لینے پڑیں ۔ جس مصنف نے یہ بیان کیا ہے وہ اس کی تصدیق میں مزید یہ کہتا ہے کہ جن لوگوں کے اولاد نہ ہو انھیں اپنے بھائیوں کی نسبت سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ بری دائکوں کے ہاں جب لڑکے لڑکیاں بڑے ہوتے ہیں تو انھیں اپنے چچیرے ، ممیرے ، خلیرے اور پھوپھیرے بھائی بہنوں کا باپ یا ماں پکارا جاتا ہے ۔ کافروں کے ہاں دلہن کو اس کا نام لے کر آواز دینی بد تمیزی سمجھی جاتی تھی ، لہذا وہ اسے ''فلاں فلاں کی ماں'' کے نام سے مخاطب کرتے تھے ، خواہ ابھی اس کی محض منگنی ہی ہوئی ہو ۔ آسام کے کچانا گاؤں میں بچے کی پیدائش کے بعد ماں باپ اپنا اصلی نام ترک کرکے بچے کے نام کے لحاظ سے کنیت اختیار کر لیتے ہیں اور بے اولاد میاں بیوی ''لا ولد باپ'' ''لا ولد ماں'' ''پا نیوتا'' ''نیوتی''

کہلاتے ہیں ۔ بعض صورتوں میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ باپ کے اپنے بچے کی نسبت سے کنیت حاصل کرنے کا جو عام دستور ہے اس کی پشت پر باپ کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنی ابوت منوا کر بچوں پر وہ حقوق حاصل کر لے جو مادری نظام میں پہلے ماں کو پہنچتے تھے ۔ لیکن اس توجیہ سے اس متوازی دستور کی کچھ وضاحت نہیں ہوتی ، جس کی رو سے ماں اپنے بچے کی نسبت سے کنیت اختیار کرتی ہے اور جو باپ کی کنیت والے مذکورہ بالا دستور کے ساتھ ساتھ بالعموم پایا جاتا ہے اور نہ اس دستور کی یہ توجیہ بے اولاد ماں باپ کو نیوتا نیوتی اور بچوں کو فلاں فلاں کے چچا یا پھوپھی یا اپنے ماں باپ کے بھائی بہنوں کے بچوں کے ماں باپ کہنے کے دستور پر کسی طرح منطبق ہوتی ہے ۔ لیکن اگر ان تمام رسم و رواج کے متعلق یہ فرض کر لیا جائے کہ ان سب کی محرک وہ جھجک یا نفرت ہے جو وحشی اپنے آپ کو اپنے اصلی نام سے مخاطب یا یاد کیے جانے میں محسوس کرتا ہے تو ان کی تفہیم چنداں دشوار نہیں رہتی ۔ اس تنفر کی بنیاد غالباً کسی حد تک شریر روحوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا خوف ہے اور کسی حد تک یہ اندیشہ کہ اگر جادوگروں پر اس کا اصلی نام ظاہر ہو جائے تو وہ اس کے ذریعے اسے گزند پہنچا دیں گے ۔

(۲) اقربا کے ناموں کی تحریم ــ یہ خیال پیدا ہونا قدرتی بات ہے کہ شخصی ناموں کے بارے میں عام طور پر جو راز داری برتی جاتی ہے وہ خویش و اقارب اور دوست و احباب سے روا نہیں رکھی جاتی ہوگی ، یا کم از کم ان کے ساتھ اس معاملے میں کچھ نہ کچھ رعایت ضرور کی جاتی ہوگی ۔ لیکن معاملہ اکثر اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے ، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس اصول کا اطلاق ٹھیک انھی اشخاص پر سب سے زیادہ شد و مد کے ساتھ ہوتا ہے جن میں قرابت قریبہ ہو ، خاص کر جن کی قرابت کی بنیاد رشتۂ ازدواج پر ہو ۔ ایسے لوگوں کے لیے اکثر نہ صرف محض ایک دوسرے کے نام لینا ممنوع ہوتا ہے بلکہ وہ ایسے الفاظ تک زبان پر نہیں لا سکتے جو ان ناموں

سے مشابہت رکھتے ہوں یا جن میں ایک حرف بھی ان ناموں کا موجود ہو ۔ جن اشخاص پر ایک دوسرے کا نام لینے کے بارے میں یہ امتناع عاید ہوتا ہے ، ان میں خصوصیت کے ساتھ میاں بیوی ، میاں اور بیوی کے والدین اور بیوی اور اس کا خسر شامل ہیں ۔ مثلاً کافروں کے ہاں عورت سب کے سامنے شوہر یا اس کے کسی بھائی کا وہ نام ، جو اس کی پیدائش کے وقت رکھا گیا ہو ، منہ سے نہیں نکال سکتی اور نہ اس کے نام کا ممنوعہ لفظ عام مفہوم میں استعمال کر سکتی ہے ۔ مثال کے طور پر اگر اس کا شوہر بلی کے سے ایک جانور 'امپاکا' کے نام کی مناسبت سے اومپا کا کہلاتا ہو تو اسے اس جانور کے لیے کوئی اور لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے ۔ نیز کافر عورت کے لیے اپنے خسر اور اس کے کسی قرابت دار مرد کا نام دل میں بھی لانا ممنوع ہے اور اس نام کے نمایاں جزو یا حروف کسی اور لفظ میں پائے جاتے ہوں تو اسے ایسے جزو کے بولنے سے احتراز کرتے ہوئے یا تو کوئی بالکل نیا لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے یا کم از کم اس لفظ میں ممنوعہ جزو کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسرا حرف یا حروف بولنے پڑتے ہیں ۔ چناں چہ اس دستور کی بدولت عورتوں میں تقریباً ایک بالکل مختلف زبان رواج پا گئی ہے ، جسے کافر ''عورتوں کی زبان کہتے ہیں ۔'' ظاہر ہے کہ عورتوں کی اس زبان کا سمجھنا آسان نہیں ''اس لیے کہ ان نئے مرادفات کے وضع کرنے کے قواعد مقرر نہیں اور ایسے الفاظ کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کی کوئی فرہنگ بھی مرتب کرنی ناممکن ہے ، کیوں کہ ایک ہی قبیلے میں بہت سی عورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جنھیں خود ساختہ الفاظ استعمال کرنے کی اتنی ہی آزادی ہو ، جتنی دوسروں کے گھڑے ہوئے مرادفات استعمال کرنے کی ۔'' دوسری طرف کوئی کافر مرد اپنی خوش دامن کا نام نہیں لے سکتا اور نہ اس کی خوش دامن خود اس کا ۔ تاہم مقدم الذکر کے لیے کسی ایسے لفظ کا استعمال ممنوع نہیں ہے ، جس میں اس کی خوش دامن کے نام کا نمایاں جزو پایا جائے ۔ کرغیز (بحیرۂ اخضر کی ایک مغل قوم) عورت اپنے شوہر کے بزرگوں کے نام لینے کی جرأت نہیں کر سکتی بلکہ وہ ایسے لفظ بھی زبان پر نہیں لا سکتی ، جو صوتی

اعتبار سے ان ناموں سے مشابہت رکھتے ہوں ۔ مثلاً اگر ان بزرگوں میں کسی کا نام 'راعی' ہو تو وہ لفظ 'رعاء' (بھیڑوں کا گلہ) استعمال نہیں کر سکتی، بلکہ اسے بھیڑوں کو 'ممیانے والیاں' کہنا پڑتا ہے اور اگر کسی بزرگ کا نام 'حلوان' (بھیڑ کا بچہ) ہو تو وہ یہ لفظ نہیں بول سکتی اور اسے بھیڑ کے بچے کو میمنا (ممیانے والا بچہ) کہنا پڑتا ہے ۔ جنوبی ہند میں شادی شدہ عورتوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے نام لے لیں یا خواب میں بھی انہیں زبان پر لے آئیں تو ان کے شوہر وقت سے پہلے مر جائیں گے ۔ بحری دائکوں میں کوئی شخص اپنے سسر یا ساس کا نام لے لے تو اس پر روحوں کا غضب نازل ہو جاتا ہے ، اور چوں کہ ان کے ہاں نہ صرف بیوی کے باپ ، بلکہ بھاوجوں اور بہنوئیوں اور اسی طرح قریبی رشتے کے تمام بھائی بہنوں کے ماں باپ سسرال میں شمار ہوتے ہیں ، لہذا اس قسم کے ممنوعہ ناموں کی تعداد ان کے ہاں خاصی ہوگی اور اس معاملے میں غلطیوں کا بھی بڑا امکان ہوگا ۔ ان الجھنوں پر طرہ یہ ہے کہ اشخاص کے نام عموماً اشیاء کے ناموں پر مشتمل ہوتے ہیں ، جیسے چاند ، پل ، جو ، ناگ ، چیتا اور جب کسی شخص کے یہ سارے ساس سسر اگر ایسے ناموں سے موسوم ہوں تو یہ لفظ اپنے عام مفہوم میں اس کی زبان سے نہیں نکل سکتے ۔ سلیبیز کے منہاسا والے الفور اس معاملے میں سب سے بڑھ گئے ہیں ۔ ان کے دستور کی رو سے ایسے الفاظ کا بھی استعمال ممنوع ہے جو اشخاص کے خاص ناموں سے محض صوتی مشابہت رکھتے ہوں ۔ یہ امتناع سسر کے نام پر خصوصیت کے ساتھ عاید ہوتا ہے ۔ مثلاً اگر وہ کلالا کے نام سے موسوم ہو تو اس کا داماد گھوڑے کے لیے عام لفظ 'کوالو' استعمال نہیں کر سکتا ، بلکہ اس کی جگہ اسے ''سواری کا جانور'' (ساسا کا جن) بولنا پڑتا ہے ۔ اسی طرح بورو کے الفوروں کے ہاں ماں باپ یا ساس سسر کے نام لینے تو ایک طرف ، عام چیزوں تک کے لیے ایسے الفاظ بولنے ممنوع ہیں ، جو صوتی اعتبار سے ان ناموں سے ملتے جلتے ہوں ۔ چناں چہ کسی کی ساس کا نام 'والو' بہ معنی 'پان' ہو تو وہ پان مانگنے کے لیے عام لفظ استعمال نہیں کر سکتا ، بلکہ اس کے لیے اسے 'سرخ دھن' کا لفظ استعمال کرنا چاہیے ۔

اگر اسے سادہ پان چاہیے ہو تو وہ اسے 'سادہ پان' (ڈالو مون) کی بجائے کارون فینا کہے گا ۔ اسی جزیرے میں بڑے بھائی کا نام بھی اس کی موجودگی میں لینا ممنوع ہے ۔ ان ضوابط کی خلاف ورزی کرنے والوں پر جرمانہ کر دیا جاتا ہے ۔ سنڈا (ٹاپوؤں کا ایک سلسلہ جو بحر ہند اور بحیرۂ جاوا کے درمیان ایک آبنائے میں واقع ہے) میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ماں باپ کا نام لینے سے کسی خاص چیز کی فصل خراب ہو جاتی ہے ۔

ولندیزی نیوگنی کے نوفوروں کے ہاں ان لوگوں کو ، جن کے رشتے کی بنیاد ازدواج پر ہو ، ایک دوسرے کا نام لینے کی ممانعت ہے ۔ جن رشتہ داروں کے ناموں پر یہ امتناع عاید ہوتا ہے ان میں بیوی ، ساس سسر ، بیوی کے چچا اور پھوپھی یا انھی کے مساوی دوسرے بزرگ ، دادا کے بھائی بہن یا ایسے ہی دوسرے بزرگ اور بیوی کے کنبے کے سارے ہم مرتبہ یا ہم سن افراد شامل ہیں ۔ البتہ مرد اپنے سالوں کے نام لے سکتے ہیں ، لیکن عورتیں اپنے شوہر کے بھائیوں کے نام نہیں لے سکتیں ۔ یہ ٹیبو منگنی کے بعد ہی عاید ہو جاتا ہے ۔ جن خاندانوں میں اس طرح لڑکا لڑکی کی منگنی کی بناء پر سمدھیانے کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے ، وہ ایک دوسرے کے افراد کے نام زبان پر نہیں لا سکتے، بلکہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتے ۔ اس دستور کی بدولت وہ منظر بڑا مضحکہ خیز ہوتا ہے ، جب اتفاق سے ان لوگوں کا کہیں آمنا سامنا ہو جائے ۔ نہ محض خود یہ نام ہی ، بلکہ ان تمام لفظوں کے بولنے سے سخت احتراز کیا جاتا ہے جو ان کی سی آواز دیتے ہوں اور ان کی بجائے دوسرے لفظ استعمال کیے جاتے ہیں ۔ اگر اتفاقاً کسی شخص کی زبان سے کوئی ممنوعہ نام نکل جائے تو اسے فوراً فرش پر گر کر یہ کہنا چاہیے ''میری زبان سے غلط نام نکل گیا ہے ، میں فرش کے چھیدوں میں اسے پھینکے دیتا ہوں تاکہ میں اچھی طرح کھانا کھا سکوں ۔''

آبنائے ٹوریس کے مغربی جزیروں میں کوئی مرد اپنے ساس سسر اور سالا سالی کے نام نہیں لیا کرتا تھا اور عورت پر بھی یہی پابندیاں

عاید ہوتی تھیں - سالے کا ذکر کسی ایسے شخص کے بھائی یا شوہر کی حیثیت سے کیا جا سکتا تھا ، جس کا نام لینا جائز ہو اور اسی طرح سالی کا ذکر فلاں فلاں کی بیوی کی حیثیت سے - اور اگر اتفاقاً کسی شخص کے منہ سے اپنے سالے کا نام نکل جاتا تو وہ شرم سے سر جھکا لیتا اور جب تک وہ اس شخص کو ، جس کا نام اس نے یوں بے فائدہ لے لیا ہو ، کوئی تحفہ دے کر اپنی غلطی کی تلافی نہ کر چکتا اس کی شرم نہ ٹوٹتی - سالی ، ساس اور سسرے کے نام لینے کی بھی اسی طرح تلافی کرنی پڑتی تھی -

نیو برٹن میں جزیرہ نمائے گازیلے کے ساحلی علاقے کے باشندوں کے ہاں سالے کا نام لے لینا اس کی سخت تذلیل ہے اور ایک ایسا جرم جس کی سزا موت ہے - جزائر بینک ، ملینیشیا میں ان لوگوں کے ناموں پر سخت امتناع عاید ہوتے ہیں ، جن کی قرابت داری کی بنیاد ازدواجی رشتے پر ہو - یہاں کوئی آدمی اپنے سسر کا نام زبان پر نہیں لا سکتا اور نہ اپنی ساس اور سالے کے نام ، لیکن سالی کا نام لینے پر کوئی پابندی نہیں ، وہ اس کی کچھ نہیں لگتی - اسی طرح عورت کو اپنے سسر کا نام لینے کی اجازت نہیں اور داماد کا نام تو وہ کسی صورت میں نہیں لے سکتی - نیز سمدھیوں کے لیے ایک دوسرے کا نام زبان پر لانا ممنوع ہے - ان تمام لوگوں کو نہ صرف ایک دوسرے کے نام منہ سے نکالنے کی ممانعت ہے بلکہ انھیں ایسے معمولی الفاظ بولنے کی بھی اجازت نہیں ، جو اتفاق سے ان ناموں کے مماثل ہوں یا جن میں ان ناموں کے نمایاں جزو پائے جاتے ہوں - مثلاً کہا جاتا ہے کہ ان جزیروں کا ایک باشندہ 'سوز' اور 'مرنا' کے لفظ بولنے سے معذور تھا کیوں کہ یہ اس کے داماد کے کثیرالاجزاء نام میں شامل تھے - نیز ایک اور بد نصیب کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ 'ھاتھ' اور 'گرم' جیسے معمولی لفظ نہیں بول سکتا تھا ، اس لیے کہ وہ اس کے سالے کے نام میں آتے تھے - بلکہ وہ 'ایک' تک استعمال کرنے سے قاصر تھا کہ وہ اس کی بیوی کے کسی قریبی رشتے کے بھائی کے نام کا ایک جزو تھا -

ازدواجی رشتوں میں ایک دوسرے کے نام بلکہ ناموں کے اجزاء کے زبان پر لانے سے لوگوں کا پرہیز ، اور بہت سے عام لوگوں کا خود اپنے متوفی اشخاص یا سرداروں اور بادشاہوں کے نام لینے سے گریز ، دونوں کی نوعیت ایک ہی ہے اور اگر ان مؤخرالذکر ناموں کے معاملے میں رازداری کے عام محرک توہمات ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ مقدم‌الذکر ناموں کے اخفا کی بنیاد بھی ان کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی - یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ وحشی کا اپنا نام زبان پر لانے سے احتراز کم از کم کسی حد تک اس وسوسے پر ضرور مبنی ہے کہ کہیں اس کے دشمن ، خواہ وہ انسان ہوں یا روحیں ، اس کا نام جان کر اسے گزند نہ پہنچا دیں - اب ہمیں مردوں اور شاہی خاندان کے افراد سے متعلق اسی قسم کے دستور پر غور کرنا ہے -

**(۳) مُردوں کے ناموں کی تحریم**—قدیم زمانے میں علاقۂ قاف کے البانوی (یہ مشرق قاف اور مغربی بحیرۂ اخضر کے درمیان آباد ہیں) مرے ہوئے لوگوں کے نام زبان تک پر لانے سے احتراز کرتے تھے - یہی دستور بہت سے وحشیوں میں پورے شد و مد سے جاری ہے - چناں چہ بیان کیا جاتا ہے کہ آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کے ہاں کسی متوفی شخص کا ذکر کرنا ، خواہ وہ عورت ہو یا مرد ، حرام ہے - اور جو آدمی دنیا سے رخصت ہو چکا ہو اس کا نام بہ آواز بلند لینا وہ کفر سمجھتے ہیں اور اس سے سخت اجتناب کرتے ہیں - ان کے اس پرہیز کا ایک بڑا محرک یہ اندیشہ معلوم ہوتا ہے کہ مردے کا نام لینے سے اس کی روح آن پہنچتی ہے ، گو اس میں شک نہیں کہ مرنے والوں کے نام بھلا دینے میں یہ فطری جذبہ بھی ضرور کارفرما ہوتا ہے کہ پچھلے غم تازہ نہ ہونے پائیں - ایک مرتبہ اولڈ فیلڈ صاحب نے چیخ کر کسی مردے کا نام لے لیا ، جسے سن کر ایک دیسی پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور اسے کئی دن تک اپنی شکل دکھانے کی ہمت نہ ہوئی - جب ان دونوں کا دوبارہ سامنا ہوا تو دیسی آدمی نے اس اکھڑ فرنگی کی اس حرکت پر اس کے

لتے لے ڈالے ۔ اولڈ فیلڈ صاحب مزید یہ بیان کرتے ہیں : ''اور نہ میں کسی طرح مرنے والے کا خوف ناک نام لینے پر اسے آمادہ کر سکا ، اس لیے کہ اگر وہ میری مان لیتا تو اپنے آپ کو خبیث روحوں کے حوالے کر دیتا ۔'' و کٹوریا کے اصلی باشندوں میں مردوں کا ذکر شاذ و نادر ہوتا تھا اور وہ بھی ان کے نام لے کر نہیں ، بلکہ انھیں ''گزرے ہوئے'' یا ''مرنے والے بے چارے'' جیسے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا ۔ خیال تھا کہ نام لے کر کسی مرنے والے کا ذکر کرنے سے اس کی روح شرارت پر اتر آتی ہے ، جو مغرب کی پھولتی شفق میں ہمیشہ کے لیے غائب ہونے سے پہلے کچھ عرصے تک زمین پر منڈلاتی رہتی ہے ۔ ان قبیلوں کے متعلق جو دریائے مرے کے نچلے علاقے میں آباد ہیں ، یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں جب کوئی مر جاتا ہے تو ''وہ اس کا نام لینے سے سخت احتراز کرتے ہیں ۔ لیکن اگر انھیں ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے تو وہ اسے دبی زبان میں اس طرح بول جائیں گے کہ روح کے کان میں اس کی بھنک بھی نہ پڑنے پائے ۔'' وسطی آسٹریلیا کے قبیلوں میں جب تک کسی متوفی کے ماتم کی مدت ختم نہیں ہو جاتی ، کوئی شخص اس کا نام زبان پر نہیں لا سکتا اور جو کبھی ایسا کرنا ہی پڑ جائے تو وہ نہایت دھیمی آواز میں لے لیا جاتا ہے تاکہ متوفی کی روح ، جو بھوت کا روپ دھارے آس پاس چلتی پھرتی رہتی ہے ، برہم نہ ہو جائے ۔ اگر روح لوگوں کی زبان سے اپنا نام سن پائے تو وہ یہ سمجھ لیتی ہے کہ اقربا اس کا سوگ اچھی طرح نہیں منا رہے ہیں اور اگر انھیں اس کی موت کا دلی رنج ہوتا تو وہ اس کا نام یوں بحث میں نہ آنے دیتے ۔ سنگ دل عزیزوں کی اس بے اعتنائی سے اس کے دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور وہ برہم ہو کر انھیں خواب میں پریشان کرتی ہے ۔

اسی طرح خلیج ہڈسن کے علاقے سے لے کر پاٹاگونیا تک سارے امریکی قبیلے مردوں کے نام لینے سے کتراتے ہیں ۔ کولومبیا کے گواجروں میں کسی مرنے والے کا نام اس کے رشتہ داروں کے سامنے زبان سے نکالنا بھی ناک جرم ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والے

کو اکثر اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے ، کیوں کہ اگر یہ واردات متوفی کے بھتیجے یا چچا کی موجودگی میں ہو جائے تو وہ مجرم کو وہیں مار ڈالے گا ، لیکن اگر وہ بچ نکلے تو سزائے موت بھاری جرمانے سے بدل جائے گی ، جو عموماً دو یا دو سے زائد بیلوں پر مشتمل ہوتی ہے ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مردوں کے نام لینے کے خلاف اسی قسم کا رجحان ایسی مختلف قوموں میں بھی ملتا ہے جو ایک دوسرے سے بہت دور ہیں ، جیسے سائبیریا کے ساموائید اور جنوبی ہند کے ٹوڈا ؛ تاتار کے مغل اور صحرا کے تواریگ ؛ جاپان کے اینو اور مشرقی افریقہ کے اکامبا اور ناندی ؛ فلپائن کے تنگوانی اور جزائر نکوبار ، بورنیو مدغاسکر ، و تاسمینیا کے باشندے ۔ اور تمام صورتوں میں اس رجحان کی بنیاد غالباً روح ہی کے خوف پر ہے ، خواہ بعض صورتوں میں یہ خوف ظاہر نہ بھی کیا جاتا ہو ۔ تواریگوں کے متعلق تو ہمیں اس کا قطعی علم ہے کہ ان کے اس ابا کا اصل محرک یہی خوف ہے ۔ ان لوگوں کو مردے کی روح کے لوٹ آنے کا بڑا ڈر رہتا ہے اور اس سے محفوظ رہنے کے لیے وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے ۔ کسی کی موت کے بعد اپنا پڑاؤ اٹھا دیتے ہیں ، متوفی کا نام قطعی زبان پر نہیں لاتے اور ہر اس فعل سے احتراز کرتے ہیں ، جس میں روحوں کے حاضرات کرنے یا واپس بلانے کا پہلو ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں کے کسی کے نام میں اس کے باپ کا نام شامل نہیں ، جیسا کہ عربوں کے ہاں ہوا کرتا ہے اور کسی کو فلاں ابن فلاں نہیں کہا جاتا ۔ ہر شخص کا نام ایسا رکھا جائے گا جو اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا ۔ آسٹریلیا کے چند وکٹوریائی قبیلوں میں اصلی یا شخصی نام شاید ہی دوبارہ اختیار کیے جاتے ہوں ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو شخص کسی متوفی کا نام اختیار کرتا ہے وہ زیادہ عرصہ نہیں جیتا ۔ شاید خیال یہ تھا کہ اس کے ہم نام کی روح آن کر اسے ملک عدم اڑا لے جاتی ہے ۔

متوفی کی روح کے اسی خوف سے ، جو اس کا نام لینے یا رکھنے میں مانع ہوتا ہے ، اس کے ہم نام اشخاص نئے نام اختیار کر لیتے ہیں ، مبادا روح اپنا نام سن کر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو جائے ، جو ان کے خیال

میں کسی ایک نام کے مختلف اطلاقات میں تمیز نہیں کر سکتی ۔ چناں چہ جنوبی آسٹریلیا کے ایڈلیڈ اور خلیج این کاؤنٹر والے قبیلے ان اشخاص کے ناموں سے ، جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہو ، اس حد تک متنفر ہوتے ہیں کہ ان کے ہاں متوفی کے ہم نام یا تو کچھ عرصے کے لیے نئے نام اختیار کر لیتے ہیں یا اپنے کسی اور نام سے پکارے جانے لگتے ہیں ۔ کوئینز لینڈ کے بعض قبیلوں میں یہی دستور پایا جاتا ہے ۔ تاہم ان کے ہاں مردوں کے ناموں کے استعمال پر پابندی ، جو اگرچہ کئی سال تک رہتی ہے ، مستقل نہیں ہوتی ۔ بعض آسٹریلوی قبیلوں میں ، ناموں کی یہ تبدیلی مستقل ہوتی ہے ۔ پرانا نام ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا جاتا ہے اور متوفی کا ہم نام شخص باقی تمام عمر کے لیے یا کم از کم جب تک اسی سبب سے اسے اپنا نام بدلنا نہ پڑ جائے دوسرا نام اختیار کر لیتا ہے ۔ شمالی امریکہ کی قدیم قوموں میں اس شخص کے ہم نام تمام مرد اور عورتیں ، جس کی موت کا واقعہ تازہ ہوتا ، مجبوراً اپنے نام ترک کر دیتے تھے اور ان کی جگہ نئے نام اختیار کر لیتے تھے ۔ ناموں کی یہ تبدیلی باضابطہ طور پر رسم ماتم میں عمل میں آتی تھی ۔ ان قبیلوں میں جو راکی پربت کی مشرقی جانب آباد ہیں ، صرف ماتم کے ایام میں یہ تبدیلی قائم رہتی ، لیکن شمالی امریکہ کے بحرالکاہل والے ساحل کے قبیلوں میں وہ مستقل رہی ہو گی ۔

بعض وقت کچھ اسی انداز سے سوچتے ہوئے متوفی کے تمام قریبی رشتے دار اپنے نام بدل ڈالتے ہیں ، خواہ وہ کچھ ہی رہے ہوں ، جس کا محرک بلاشبہ یہ خوف ہے کہ کہیں بھٹکتی روح ان ناموں کو سن کر جس سے اس کے کان آشنا ہوں ، اپنے پرانے ٹھکانے پر لوٹ نہ آئے ۔ اس طرح بعض وکٹوریائی قبیلوں میں یہ ہوتا تھا کہ جب تک کسی متوفی شخص کا ماتم جاری رہتا ، اس کے قریبی عزیزوں کے نام مستعمل نہ رہتے بلکہ ان کی جگہ بعض ایسے لفظوں سے کام لیا جاتا جو از روئے دستور مقرر تھے ۔ کسی ماتمی کو اس کے اصلی نام سے پکارنا متوفی کی توہین خیال کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے اکثر جدال و قتال تک نوبت پہنچ جاتی ۔ شمال مغربی امریکہ کے دیسی قبیلوں

میں متوفی کے قریبی عزیز اکثر اپنے نام بدل ڈالتے ہیں ، ''اس خیال سے کہ اگر روحوں کے کانوں میں ایسے نام بار بار پڑتے رہیں ، جن سے وہ مانوس ہوں تو ان کی کشش سے وہ زمین کی طرف کھنچ آئیں گی ۔'' کیوا نامی امریکیوں کے ہاں کسی متوفی کا نام اس کے عزیزوں کے سامنے زبان پر نہیں لایا جاتا اور خاندان کے کسی فرد کے انتقال پر دوسرے تمام افراد اپنے نام تبدیل کر دیتے ہیں ۔ تین صدی قبل والے کے آباد کاروں نے جزیرۂ رونوک میں اس دستور کا خاص طور پر مشاہدہ کیا تھا ۔ لنگوا امریکیوں کے ہاں نہ صرف یہ کہ کسی مردے کا نام نہیں لیا جاتا ، بلکہ اس کے تمام پسماندگان اپنے نام بدل ڈالتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ جب کوئی مرتا ہے تو موت ان میں ہو جاتی ہے اور ان کے ناموں کی ایک فہرست لے جاتی ہے ، اور وہ اپنی بھینٹ لینے پھر پہنچ جاتی ہے ۔ لہذا وہ اپنے نام تبدیل کر دیتے ہیں تاکہ موت کا مقصد پورا نہ ہونے پائے ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ موت لوٹے گی تو اپنی فہرست کے باوجود ان کے ان نئے ناموں کی بدولت انہیں شناخت نہیں کر پائے گی اور ان کی تلاش میں کہیں اور چلی جائے گی ۔ نکوبار میں ماتمی پریت کی توجہ سے بچنے کے لیے نئے نام اختیار کر لیتے ہیں اور اسی مقصد سے اپنے سر منڈوا کر حلیہ بدل لیتے ہیں تاکہ پریت انہیں پہچان نہ سکے ۔

اس کے علاوہ ، اگر اتفاق سے متوفی کہیں جانور ، پودے ، آگ یا پانی جیسی کسی عام چیز کے نام سے موسوم ہو تو یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ ایسا کوئی لفظ روزمرہ کے استعمال میں نہ آنے پائے اور اس کی جگہ کسی اور لفظ سے کام لیا جائے ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا دستور لسانی تغیر کا ایک قوی محرک ہو سکتا ہے ، اس لیے کہ جہاں کہیں یہ دستور جاری ہو ، وہاں بڑی حد تک متواتر متعدد الفاظ کا ترک ہونا اور ان کی جگہ نئے الفاظ کا وجود میں آنا لازمی ہے ۔ جن لوگوں نے آسٹریلیا ، امریکہ اور دوسرے مقامات پر اس دستور کا حال قلم بند کیا ہے ، انھوں نے مذکورہ بالا رجحان کا ذکر کیا ہے ۔ مثلاً آسٹریلوی وحشیوں کے متعلق ایک مصنف رقم طراز ہے کہ ان کے ہاں ''ہر

قبیلے کی بولی مختلف ہے ۔ بعض قبیلے اپنے بچوں کو فطری اشیاء یا عناصر کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں اور جب ایسے کسی نام کا آدمی مر جاتا ہے تو یہ لفظ پھر کبھی زبان پر نہیں لایا جاتا ، لہذا اس چیز کے لیے ، جس کے نام سے متوفی موسوم رہا ہو ، ایک دوسرا لفظ ایجاد کرنا پڑتا ہے ۔'' یہ مصنف مثال کے طور پر ایک شخص کا ذکر کرتا ہے ، جس کے نام کارلا کا مطلب 'آگ' تھا ۔ جب کارلا مر گیا تو آگ کے لیے ایک نیا لفظ رائج کرنا پڑا ۔ مصنف مذکور مزید یہ بیان کرتا ہے کہ ''اسی وجہ سے ان کی زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے ۔'' اس کے علاوہ جنوبی آسٹریلیا کی خلیج این کاؤنٹر میں اگر 'این گن کے' نام کا کوئی شخص مر جائے ، جس کے معنی پانی کے ہیں تو سارے قبیلے کو پانی کے لیے خاصی مدت تک کوئی اور لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے ۔ جس مصنف نے اس دستور کی کیفیت قلم بند کی ہے اس کا قیاس ہے کہ مذکورہ بالا قبیلے کی زبان میں متعدد مرادفات کی موجودگی کا سبب یہی دستور ہو سکتا ہے ۔ اس قیاس کی تصدیق بعض وکٹوریائی قبیلوں کے ان حالات سے ہوتی ہے ، جو ہمارے علم میں آئے ہیں ۔ ان کی زبان میں سوگ کے زمانے میں عام الفاظ کی جگہ استعمال کرنے کے لیے باقاعدہ مرادفات مقرر ہیں ۔ مثلاً 'وا' (کوا) نامی شخص اس دنیا سے رخصت ہو جائے تو اس کے ماتم کے ایام میں کوئی کوے کو 'وا' نہیں کہہ سکتا ۔ ہر شخص کو اس پرندے کے لیے 'نارا پارٹ' کا لفظ بولنا پڑتا ہے ۔ جب کوئی شخص جو رنگ ٹیل اپوسم (وی آرن یہ معنی حلقہ دار دم والا پوسم) جیسے شان دار نام سے موسوم رہا ہو ، دنیا سے گزر جاتا تو اس کے سوگوار عزیزوں اور اہل قبیلہ کو کچھ عرصے تک اس جانور کے لیے اس سے بھی زیادہ گونج دار لفظ 'مانونگ کورٹ' استعمال کرنا پڑتا تھا ۔ اگر قوم ٹرکی بسٹرڈ جیسے نام سے موسوم کسی محترم خاتون کے سوگ میں ہو تو ٹرکی بسٹرڈ کا اصل اسم 'بارم بارم' مستعمل نہ ہوتا اور اس کی جگہ لفظ 'ٹلیٹ ٹلیٹش' لے لیتا ۔ اور یہی صورت جزوی اختلاف کے ساتھ کالے کاکتوا ، بھوری مرغابی ، کلنک ، کنگرو ، عقاب ، ڈنگو (کتے کی ایک قسم جو آسٹریلیا میں پائی جاتی ہے) کے ناموں کے ساتھ پیش آتی ۔

اسی قسم کے دستور کی وجہ سے پاراگوئے (جنوبی امریکہ) کے ابی پونیوں کی زبان رو بہ تغیر رہتی تھی ۔ ان کے ہاں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی لفظ ایک مرتبہ متروک ہو جاتا تھا ، پھر کبھی رائج نہیں ہونے پاتا تھا ۔ ایک مسیحی مبلغ ڈوبریز ہافر کا بیان ہے کہ ہر سال نئے لفظ اس طرح نکل پڑتے تھے جس طرح رات میں حشرات الارض ، اس لیے کہ ایسے تمام لفظ جو مردوں کے نام کے مشابہ ہوتے بہ ذریعۂ اعلان منسوخ کر دیے جاتے اور ان کی جگہ نئے لفظ گھڑ لیے جاتے ۔ الفاظ کی منٹ (دارالضرب) قبیلے کی بڑی بوڑھی عورتوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ جس کلمے کو منظور کرکے رائج کر دیتیں ادنیٰ و اعلیٰ سب اسے بے عذر قبول کر لیتے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے قبیلے کے ہر پڑاؤ اور بستی میں لوگوں کی زبانوں پر جاری ہو جاتا ۔ مبلغ موصوف کہتے ہیں کہ آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ ایک پیر زال کے فیصلے کو ساری کی ساری قوم چپ چاپ تسلیم کر لیتی ہے اور مروجہ تمام الفاظ یک سر زبان سے خارج ہو جاتے ہیں اور انہیں بھولے سے بھی کبھی کوئی زبان پر نہیں لاتا ۔ ڈوبریز ہافر کے سات سالہ قیام کے دوران میں ان امریکیوں کے ہاں جیگ وار کا نام تین مرتبہ بدلا گیا اور مگرمچھ ، کانٹے اور مویشی کے ذبح کرنے کے لیے عام الفاظ میں بھی کسی قدر کم تغیرات کے ساتھ یہی کچھ کیا گیا ۔ ان تغیرات کی وجہ سے مبلغوں کو بھی اپنے ذخیرۂ الفاظ کا ایک معتدبہ حصہ خارج کر دینا پڑتا تھا اور اس کی جگہ نئے الفاظ سے پر کرنی پڑتی ۔ برطانوی نیوگنی کے بہت سے قبیلوں میں آدمیوں اور چیزوں کے نام مشترک ہیں ۔ یہاں کے لوگوں کے عقیدے کی رو سے اگر کسی متوفی شخص کا نام لیا جائے تو اس کی روح لوٹ آئی گی اور چوں کہ وہ چاہتے نہیں کہ اس کی روح ان میں واپس آئے ، لہذا اس کا نام ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے ، اور جب کبھی ایسا کوئی ممنوعہ نام زبان کا ایک عام لفظ ہو تو اس کی جگہ نیا لفظ گھڑ لیا جاتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متعدد لفظ یا تو زبان سے یک سر خارج ہو جاتے ہیں یا پرانے لفظ بدلے ہوئے یا نئے مفہوم میں از سر نو استعمال ہونے لگتے ہیں ۔

جزائر نکوبار کی دیسی زبان پر اسی قسم کے دستور کا اثر پڑا ہے۔ مسٹر ڈی روئیپ اسٹراف کا کہنا ہے کہ اہل نکوبار کے ہاں ''ایک عجیب و غریب دستور پایا جاتا ہے، جس کی بدولت غالباً تاریخ کی تشکیل یا کم از کم تاریخی حالات کے منتقل ہونے میں بڑی رکاوٹ واقع ہوتی ہے۔ ان کے ایک اصول کی رو سے جس کی پابندی لازمی بلکہ توہمات کی بناء پر فرض ہے، کسی شخص کا نام اس کی موت کے بعد زبان پر نہیں لایا جا سکتا اور اس باب میں اس حد تک غلو کیا جاتا ہے کہ جب کبھی کوئی 'مرغی' 'ٹوپ' 'آگ' یا 'سڑک' وغیرہ نامی کوئی شخص مر جاتا ہے، جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے، تو یہ لفظ نہ صرف اس کے نام کی حیثیت سے بلکہ اپنے عام مفہوم میں بھی مروج نہیں رہتا، یا تو متعلقہ شے کے لیے نیا لفظ گھڑ لیا جاتا ہے یا دوسری نکوباری بولیوں سے، یا کسی غیر زبان کے لفظ لے لیے جاتے ہیں۔ اس عجیب و غریب دستور سے نہ صرف زبان متغیر رہتی ہے بلکہ سیاسی زندگی کا تسلسل بھی ختم ہو جاتا ہے اور تاریخی واقعات اس قدر مشتبہ ہو جاتے ہیں کہ ان کا قلم بند کیا جانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔

یہ رائے دوسرے محققوں نے بھی ظاہر کی ہے کہ ایسے عقیدے سے جس کی بناء پر متوفی اشخاص کے نام مخفی رکھے جاتے ہوں، تاریخی روایت کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ چناں چہ مسٹر اے۔ ایس۔ گاٹ شیٹ کہتے ہیں کہ ''کلامات قوم کے ہاں ایسی تاریخی روایات جو ایک صدی سے زیادہ پرانی ہوں، مفقود ہیں، جس کا سبب محض یہ ہے کہ ان کے ایک قانون کی رو سے کسی کے نام کے حوالے سے اس کا یا اس کے افعال کا تذکرہ ممنوع ہے۔ اس قانون کے کلی فورنیا اور اورے گونیا والے سختی سے پابند تھے جن کے ہاں اس کی خلاف ورزی کی پاداش میں لوگوں کو سزائے موت دی جاتی تھی۔ کسی قوم میں تاریخی معلومات کے اخفا کے لیے یہی ایک چیز کافی ہے۔ تاریخ ناموں کے بغیر کیسے لکھی جا سکتی ہے؟''

تاہم ذہن انسانی کے ایک فطری رجحان کی بدولت بہت سے

قبیلوں میں نقوش ماضی کو مٹانے والے اس عقیدے کی شدت کسی حد تک کم ہو گئی ہے۔ زمانہ صفحۂ ہستی سے گہرے سے گہرے اثرات بھی مٹا کر رکھ دیتا ہے اور اس کے امتداد سے وحشی کے ذہن پر موت کے اسرار و ہیبت کے سبب جو نقش مرتسم ہوتا ہے وہ بالکل محو نہیں ہوتا تو بہر صورت ہلکا ضرور پڑ جاتا ہے۔ دیر یا سویر جب وہ اپنے عزیزوں کو بھولنے لگتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ اس طرح فلسفیانہ ذہن کے تجسس کی بدولت یاد رفتگاں تازہ ہو جاتی ہے اور ان کے نام زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ جاتے ہیں۔ بعض وکٹوریائی قبیلوں میں مردوں کے نام لینے پر امتناع صرف سوگ کے زمانے میں عاید رہتا ہے۔ شمالی امریکہ کے چنوکوں کے ''دستور کی رو سے کسی متوفی کا نام لینا ممنوع ہے، کم از کم جب تک اس کا سوگ منانے کافی مدت نہ گزرے۔'' پویا لوپ قوم میں کسی کی موت کے کئی سال بعد، جب لوگوں کے دلوں سے اس کا غم محو ہو جاتا ہے تو اس امتناع کی شدت کم ہو جاتی ہے اور اگر متوفی کوئی مشہور سپاہی گزرا ہو، تو اس کے اخلاف میں کوئی فرد، مثلاً اس کے کسی پڑپوتے کا نام اس کے نام پر رکھا جا سکتا ہے۔ متوفی کے اعزا سے قطع نظر مذکورہ بالا قبیلے میں کسی وقت اس امتناع کی کوئی خاص پابندی نہیں کی جاتی۔ اسی طرح یسوعی فرقے کے مبلغ لافی تاؤ کا کہنا ہے کہ متوفی کے ساتھ اس کا نام اور ان پس ماندگان کے نام جو اس کے ہم نام ہوں یا جن کے نام متوفی کے نام سے ملتے جلتے ہوں، گویا دفن کر دیے جاتے ہیں اور جب اس کی موت کا غم کم ہو جاتا ہے تو اس کے اقربا از راہ تلطف ''درخت کو اٹھا کر مردے کو جگا دیتے ہیں۔'' مردے کو جگانے سے ان کی مراد مرنے والے کا نام کسی اور کو عطا کرنا تھا، جس کی صورت میں ہر لحاظ سے متوفی دوبارہ جنم لے لیتا، اس لیے کہ جاہلی فلسفے کی رو سے اگر نام مرنے والے کی روح سے عبارت نہیں تو اس کا جزو حیات ضروری ہے۔

لیپستانیوں میں جب کسی حاملہ کی زچگی کا وقت قریب آتا تو اس کے اسلاف میں سے کوئی خواب میں آن کر اسے یہ بتاتا کہ اس بچے کی

صورت میں کون دوبارہ پیدا ہونے والا ہے اور اس لیے اس کا نام کس کے نام پر رکھنا چاہیے ۔ اگر اس عورت کو ایسا کوئی خواب نہ دکھائی دیتا تو بچے کے باپ یا کسی اور عزیز کو علم غیب کے ذریعے یا جادوگر سے مشورہ کرکے اس کے نام کا تعین کرنا پڑتا ۔ کھونڈوں (ایک دراوڑی قوم) میں زچگی کے ساتویں دن بچے کی پیدائش کی خوشی منائی جاتی ہے ، جس میں گاؤں کے پجاری اور تمام لوگوں کی ضیافت کی جاتی ہے ۔ اس رسم میں پجاری بچے کے آباؤ اجداد کے نام لے لے کر پانی کے ایک پیالے میں چاول کے دانے ڈالتا ہے اور پانی میں دانے کی حرکت اور بچے کو بہ غور دیکھ کر اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس کی صورت میں اس کا کون سا جد متشکل ہوا ہے ۔ کم از کم شمالی قبیلوں میں عام طور پر بچے کو اپنے کسی جد کا نام ملتا ہے ۔ یوروباؤں کے ہاں بچے کی پیدائش کے تھوڑے ہی عرصے بعد علم‌الغیب کے دیوتا افا کا پجاری یہ معلوم کرنے زچہ خانے پہنچتا ہے کہ اسلاف میں سے کس کی روح نے بچے کی صورت میں دوبارہ جنم لیا ہے ۔ یہ طے ہونے کے بعد ہی اس کے والدین کو بتا دیا جاتا ہے کہ بچے یا بچی کو اس جد کے نقش قدم پر چلنا چاہیے ، جس کی روح اس کی صورت میں ظاہر ہوئی ہو ۔ اور اگر ، جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے ، وہ اس جد کے بارے میں اپنی لا علمی ظاہر کریں تو پروہت ضروری معلومات بہم پہنچاتا ہے ۔ بچے کو عموماً اسی جد کا نام ملتا ہے جس نے اس کے روپ میں دوبارہ جنم لیا ہو ۔

## (۴) بادشاہوں اور دوسرے مقدس لوگوں کے ناموں کی تحریم

— جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غیر ترقی یافتہ معاشرے میں محض عام آدمیوں کے ناموں کے بارے میں ، خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ ، اس قدر احتیاط برتی جاتی ہے تو مقدس سلاطین اور آئمۂ مذہب کے ناموں کے بچاؤ کے لیے سخت احتیاطی تدبیریں اختیار کی جانی چنداں باعث تعجب نہیں ۔ چناں چہ شاہ داہومی کا نام ہمیشہ مخفی رکھا جاتا ہے تاکہ کوئی بد باطن اس سے واقف ہو کر اسے گزند

نہ پہنچانے پائے۔ اہل یورپ شاہان داہومی کو ان کے جن مختلف القاب سے جانتے رہے ہیں، وہ ان کے اصلی نام نہیں بلکہ محض خطابات ہیں، جنھیں وہ ''زور دار نام'' کہتے ہیں۔ دیسیوں کے خیال میں غالباً ان القاب کے ظاہر ہونے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اس لیے کہ پیدائشی ناموں کی طرح اس قسم کے ناموں کا آدمی کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ گھیراکی گلائی سلطنت میں رعایا کے کسی فرد کے لیے بادشاہ کا پیدائشی نام لینا ممنوع ہے اور اس کی سزا موت۔ اور عام الفاظ جو اس کے نام سے صوتی مشابہت رکھتے ہوں ترک کر دیے جاتے ہیں، اور ان کی جگہ دوسرے لفظ بولے جاتے ہیں۔ وسطی افریقہ کی باھیا قوم میں جب بادشاہ کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا نام زبان سے خارج کر دیا جاتا ہے، اورجو کہیں کسی جانور کا بھی وہی نام ہو تو اس کے لیے فوراً دوسرا لفظ فراہم کرنا ضروری ہے۔ مثلاً بادشاہ اکثر ببر کے نام سے موسوم ہوتا ہے، لہذا اس نام کے بادشاہ کے انتقال پر ببروں کے لیے نیا لفظ گھڑنا پڑتا ہے۔ کسی زمانے میں سیامی بادشاہ کا اصلی نام معلوم کرنا کارے دارد تھا۔ سحر کے خوف سے اس کی کسی کو مطلق خبر نہیں ہونے دی جاتی تھی اور اسے جو شخص زبان پر لے آتا، وہ قید کر دیا جاتا۔ بادشاہ کا ذکر 'والاشان' 'کامل' 'جناب عالی' 'سلطان معظم' ملائک زاد' جیسے پرشکوہ القاب سے کیا جاتا۔ برما میں بادشاہ وقت کا نام زبان پر لانا انتہائی بے ادبی متصور ہوتی تھی۔ برمی رعیت کے افراد، خواہ وہ اپنے ملک سے دور ہی کیوں نہ ہوتے، اپنے بادشاہ کا نام لینے پر کبھی راضی نہ ہوتے۔ تخت نشینی کے بعد بادشاہ کو لوگ صرف شاہی القاب سے جانتے۔

زولوؤں میں کوئی شخص سردار قبیلہ یا اس کے اسلاف کے نام، جتنے بھی اسے یاد ہوں، زبان پر نہیں لائے گا اور نہ ایسے عام الفاظ استعمال کرے گا، جو ممنوعہ ناموں سے مطابقت یا صوتی مشابہت رکھتے ہوں۔ ڈوانڈیز قبیلے میں ایک آدمی کا نام لانگا تھا، جس کے معنی سورج کے ہیں۔ اسی وجہ سے سورج کا نام لانگا سے گلا ہو گیا اور آج تک یہی چلا آتا ہے، اگرچہ لانگا کو مرے ایک سال ہو گیا۔ نیز

ایکس نومیو قبیلے میں وہ لفظ، جس کے معنی ''گلہ بانی'' کے ہیں، الوسا یا اتوسا سے کاگیسا ہو گیا ۔ کیوں کہ سردار کا نام 'اومایومی' تھا ۔ ان امتناعات کے علاوہ، جن کا ہر قبیلہ الگ الگ پابند تھا، سارے زولو قبیلے بادشاہ کے نام کی تحریم کے معاملے میں متحد تھے، جو ساری قوم پر حکومت کرتا تھا ۔ اسی لیے، مثلاً جب پانڈا زولوستان کا بادشاہ ہوا تو لفظ امپانڈو بہ معنی ''درخت کی جڑ'' لفظ این ایکسابو سے بدل گیا ۔ نیز لفظ اساسیبو بہ معنی 'دروغ' یا 'بہتان' کی جگہ 'اماکواٹا' نے لے لی، کیوں کہ اس لفظ 'اماسیبو' میں مشہور بادشاہ 'سیچ ویو' کے نام کا ایک جزو شامل تھا ۔ تاہم الفاظ کے رد و بدل میں اس حد تک غلو کرنے والی مردوں سے زیادہ عورتیں ہیں، جو الفاظ کے ہر اس جزو کو ترک کر دیتی ہیں، جس میں ممنوعہ نام سے خفیف سی بھی صوتی مشابہت پائی جاتی ہو ۔ سچ تو یہ ہے کہ بادشاہ کے کرال (جھونپڑیاں جو احاطے سے گھری ہوں) میں شاہی حرم کی زبان سمجھنی کارے دارد ہے، کیوں کہ وہ نہ صرف بادشاہ اور اس کے اسلاف کے ناموں کے ساتھ یہ کچھ کیا کرتی ہیں، بلکہ پشت ہا پشت تک اس کے اور خود اپنے بھائیوں کے ناموں کے ساتھ بھی ۔

جب ان قبائلی اور قومی امتناعات میں ازدواجی رشتے کی بناء پر ناموں سے متعلق وہ امتناعات شامل کر لیے جائیں، جن کی کیفیت اوپر بیان کی جا چکی ہے تو یہ سمجھنا چنداں دشوار نہ ہوگا کہ زولوستان کے ہر قبیلے میں مخصوص الفاظ اور عورتوں کے خاص الفاظ کا ایک معتدبہ ذخیرہ کیوں پایا جاتا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ ایک خاندان کو دوسرے خاندان کے الفاظ کے استعمال کی ممانعت ہو سکتی ہے ۔ مثلاً اگر ایک کرال کی عورتیں 'چرغ' کے لیے معمولی اسم استعمال کر سکتی ہوں تو دوسرے کرال کی عورتیں اس جانور کے لیے اس کا عام مرادف استعمال کر سکتی ہیں، لیکن تیسرے کرال کی عورتوں کے لیے اس مرادف کا استعمال بھی ناجائز ہے، جس کی جگہ انھیں ایک نیا لفظ گھڑنا پڑتا ہے ۔ اس لیے موجودہ زولو زبان ایک دوہری بولی نظر آتی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ چیزوں کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے، جس کا مفہوم ادا کرنے

کے لیے اس زبان میں تین تین یا چار چار مرادفات پائے جاتے ہیں ، جن سے قبیلوں کے باہمی ربط کے سبب سارے زولو واقف ہیں ۔

ایسا ہی ایک دستور سارے مدغاسکر میں جاری ہے ، جس کی وجہ سے یہاں بھی زولوؤں کی طرح مختلف قبیلوں میں بعض لسانی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ۔ اس ملک میں خاندانی نام نہیں پائے جاتے اور تقریباً ہر شخصی نام روزمرہ کی بولی سے ماخوذ ہے ، اور کسی عام چیز ، فعل یا صفت کو ظاہر کرتا ہے ، جیسے چیتا ، چوپایہ ، درخت ، پودا ، رنگ وغیرہم ۔ اب جہاں کہیں ایسا کوئی لفظ کسی سردار کا نام یا نام کا جزو ہو تو اسے لازمی طور پر حرمت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اپنے عام مفہوم یعنی کپڑے وغیرہ کے اسم عام کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا ، اسی لیے ایسی کسی چیز کے لیے ممنوعہ لفظ کی جگہ نیا نام ایجاد کرنا پڑتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان تغیرات سے ایک ایسی زبان میں ، جس کے بولنے والے چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹے ہوئے ہوں ، کیا کچھ نہ انتشار اور اشتباہ پیدا ہوتا ہوگا ۔ بہ ایں ہمہ ، اس ملک میں ایسے قبیلے اور لوگ موجود ہیں ، جو قدیم الایام سے الفاظ کے استبداد کے آگے سرتسلیم خم کرتے چلے آئے ہیں ۔ اس دستور کے ناگوار نتائج مغربی ساحل کے جزیرے پر بالخصوص نمایاں ہیں ، جہاں آزاد سرداروں کی کثیر تعداد کی وجہ سے چیزوں ، جگہوں اور دریاؤں کے ناموں میں اتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ اکثر و بیشتر الجھن پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس لیے کہ سردار ایک مرتبہ عام الفاظ کا استعمال ممنوع قرار دے دیں تو لوگ ان کے پرانے مفہوم سے قطعی نا آشنا ہو جاتے ہیں ۔

لیکن مدغاسکر میں محض بادشاہوں اور سرداروں کی زندگی ہی میں ان کے ناموں کی تحریم نہیں ہوتی ، بلکہ جزیرے کے کچھ حصے ایسے ہیں جہاں ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے ناموں پر اسی طرح امتناع عائد رہتا ہے ۔ چناں چہ ساکالاوا نامی لوگوں میں جب کوئی بادشاہ مر جائے تو امراء اور عام لوگ اس کی میت کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور باضابطہ ایک ایسا نیا نام منتخب کرتے ہیں جس سے آئندہ متوفی بادشاہ کو یاد کیا جائے ۔ اس نام کے اختیار کیے جانے کے بعد بادشاہ

کا وہ نام ، جس سے وہ جیتے جی موسوم رہا ہو ، مقدس ہو جاتا ہے اور اس کا زبان پر لانے والا سزائے موت کا مستوجب ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ الفاظ بھی مقدس قرار پاتے ہیں ، جو متوفی بادشاہ کے ممنوعہ نام سے کسی قسم کی مشابہت یا مطابقت رکھتے ہوں اور ان کی جگہ دوسرے لفظ رائج کرنے پڑتے ہیں ۔ ان الفاظ کا منہ سے نکالنا سخت بدتمیزی ہی نہیں بلکہ سنگین جرم متصور ہوتا ہے ۔ تاہم لفظوں کی یہ تبدیلیاں اس ضلع تک محدود ہوتی ہیں جو متوفی بادشاہ کے زیر نگیں رہا ہو ۔ ہمسایہ اضلاع میں پرانے الفاظ اپنے سابقہ مفہوم میں اسی طرح مروج رہتے ہیں ۔

پولینیشیاء میں سرداروں کی ذات سے جو حرمت وابستہ ہے ، اس کے سبب سے قدرتی طور پر ان کے ناموں کو بھی تقدس حاصل ہے ، جنھیں جاہلی نقطۂ نظر سے ان کی شخصیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ یہی سبب ہے کہ پولینیشیاء میں سرداروں کے نام یا ان سے ملتے جلتے عام لفظوں کے بولنے پر وہی باضابطہ امتناع ملتا ہے جس سے ہم زولوستان اور مدغاسکر میں پہلے ہی دو چار ہو چکے ہیں ۔ چناں چہ نیوزی لینڈ میں سردار کا نام اس قدر مقدس سمجھا جاتا ہے کہ اگر وہ زبان کا کوئی عام لفظ ہو تو اسے بولا نہیں جا سکتا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رائج کرنا پڑتا ہے ۔ مثلاً ایسٹ کیپ کے جنوب میں ایک سردار کا نام مارلی پی تھا جس کے معنی چاقو کے ہیں ، لہذا چاقو کے لیے ایک نیا لفظ (نیکرا) رائج کیا گیا اور پرانا لفظ اس مفہوم میں متروک ہو گیا ۔ اسی طرح کسی اور مقام پر پانی کے مفہوم میں لفظ 'وائی' کو بدلنا پڑا ، کیوں کہ اتفاق سے یہی وہاں کے سردار کا نام بھی تھا ۔ اگر اس لفظ کا سردار کے ساتھ پانی جیسی عامیانہ چیز پر اطلاق ہوتا تو سردار کی بےحرمتی ہوتی ۔ اس ٹیبو کی وجہ سے ماوری زبان میں آپ ہی آپ مرادفات کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو گئی اور نو وارد سیاحوں کو آس پاس کے قبیلوں میں ایک ہی شے کے لیے مختلف ناموں سے سابقہ پڑتا تو انھیں بڑی الجھن ہوتی ۔ تاہتی میں جب کوئی بادشاہ سریرآرائے سلطنت

ہوتا ہے تو وہ تمام الفاظ جو اس کے نام سے صوتی مشابہت رکھتے ہوں ، بدل دینے پڑتے ہیں ۔ اگلے زمانے میں اگر کوئی شخص اس دستور سے انحراف کرتا اور ممنوعہ الفاظ استعمال کرتا تو اسے اور اس کے تمام اقرباء کو قتل کر دیا جاتا ۔ لیکن لفظوں کی یہ تبدیلیاں صرف عارضی ہوتی تھیں اور بادشاہ کے مرنے کے بعد نئے لفظ متروک اور اصل لفظ پھر سے زبانوں پر جاری ہو جاتے ۔

یونان قدیم میں آئمۂ مذہب اور دوسرے ان عہدہ داران اعلیٰ کے نام ، جن کا تعلق ایلوشیائی رسوم مقدسہ کی تکمیل سے تھا ، ان کی زندگی میں زبان پر لانا قانوناً ممنوع تھا ۔ لوشین (Lucian ، ایک یونانی طنز نگار جو دوسری صدی میں گزرا ہے) کے ہاں علم کا مدعی ایک کردار کہتا ہے کہ اس کی ان جلیل القدر ہستیوں سے مٹ بھیڑ ہوگئی ۔ وہ ایک بے ادب کو عدالت گھسیٹے لیے جا رہے تھے ، جس نے ان کے نام لینے کی جسارت کی تھی ، اگرچہ اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی تقدیس کے بعد ان کے نام زبان پر لانا نا جائز ہے ، کیوں کہ وہ بے نام ہو چکے تھے اور ان کے پرانے ناموں کی جگہ نئے اور مقدس القاب نے لے لی تھی ۔ ایلوسس میں دو کتبے ملے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی پیشواؤں کے نام سمندر میں غرق کر دیے جاتے تھے ۔ غالباً انہیں سیسے یا کانسی کی لوحوں پر کندہ کرکے خلیج سالمس میں ڈبو دیا جاتا تھا ۔ اس کا مقصد بلاشبہ یہ تھا کہ ان ناموں کو اس طرح پوشیدہ رکھا جائے کہ کسی کو ان کا علم نہ ہونے پائے اور اس کی بہترین صورت یہی تھی کہ انہیں سمندر میں غرق کر دیا جائے ، جس کی گہرائیوں میں کسی فرد بشر کی نظر ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی ۔ مادی اور غیر مادی چیزوں ، نام اور اس کے جسمانی مظہر کو خلط ملط کرنے کی مہذب یونانیوں کے اس دستور سے زیادہ واضح مثال نہیں مل سکتی ۔

(۵) دیوتاؤں کے ناموں کی تحریم ــــ غیر مہذب انسان اپنے خدا اپنے ہی جیسے بناتا ہے ۔ صدیوں پہلے زینو فنیز (ایک قدیم

یونانی شاعر اور فلسفی) نے یہ رائے پیش کی تھی کہ زنگی خداؤں کے رنگ سیاہ اور ناکیں چپٹی ہوتی ہیں ۔ تھریسی خدا سرخ و سفید اور ان کی آنکھیں نیلی ، اور اگر گھوڑوں ، بیلوں اور شیروں کا خداؤں پر ایمان ہوتا تو وہ بھی اپنے معبودوں کو اپنی جیسی شکلیں دیتے ۔ یہی وجہ ہے کہ چالاک وحشی جس طرح سحر کے خوف سے خود اپنا اصلی نام چھپاتا ہے ، اسی طرح وہ سمجھتا ہے کہ اس کے دیوی دیوتا بھی ضرور اپنے ناموں کے معاملے میں راز داری برتتے ہوں گے کہ کہیں دوسرے دیوی دیوتاؤں ، بلکہ انسانوں کے کانوں میں بھی ان کی بھنک نہ پڑ جائے اور مؤخرالذکر کو ان پر جادو کی قدرت نہ حاصل ہو جائے ۔ مصر قدیم میں اسمائے الوہی کے اخفا اور سحری خاصیت پر یہ اعتقاد جس حد تک راسخ تھا یا جس حد تک اس نے ترقی کی تھی ، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی ۔ یہاں تاریخی عہد سے پہلے کے توہمات کا اثر اسی طرح قائم و دائم تھا ، جس طرح ترشی ہوئی چٹانوں کے مقبروں میں بلیوں ، مگرمچھوں اور دوسرے مقدس جانوروں کی حنوط شدہ لاشیں ۔ ایک قصے سے اس اعتقاد کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے ، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح عیار آئی سس نے مصر کے عظیم رب الشمس رع سے کرید کرید کر اس کا نام معلوم کر لیا ۔ وہ قصہ یوں ہے کہ آئی سس ایک لفاظ عورت تھی ، انسانوں سے بیزار اور دیوی دیوتاؤں میں شامل ہونے کی متمنی ۔ ایک دن اس نے اپنے دل میں سوچا ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں رع کے اسم اعظم کی بدولت ایک دیوی بن جاؤں اور اسی کی مانند ارض و سما پر حکومت کرنے لگوں ؟'' بات دراصل یہ تھی کہ رع کے متعدد نام تھے ، لیکن وہ بڑا نام جس کی وجہ سے اس کو دیوتاؤں اور انسانوں پر قدرت حاصل تھی ، اس کے سوا کسی کو نہیں معلوم تھا ۔ خیر تو رع اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا ، اس کی رال کہیں زمین پر ٹپک گئی ، جسے آئی سس نے مٹی سمیت زمین سے اٹھا لیا اور اسے گوندھ کر اس کا ایک سانپ تیار کیا ، پھر اس سانپ کو راستے میں اس جگہ ڈال دیا جہاں سے گزر کر وہ مہا دیوتا جب جی چاہتا ، اپنی اقلیم دو عالم میں جاتا ۔ جب حسب معمول وہ

دوسرے دیوتاؤں کی معیت میں اُدھر سے گزرا تو اس مقدس سانپ نے اسے ڈس لیا ۔ دیوتا نے گلا پھاڑ کر چیخ ماری جو آسمان پر پہنچ گئی ۔ اس کے ہم رکاب دیوتاؤں نے پوچھا ''خیر تو ہے؟'' اور دیوتاؤں نے گرج کر کہا ''لو بھئی ، یہ کیا !'' لیکن رع کوئی جواب نہ دے سکا ۔ اس کے دانت بج رہے تھے ، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے ، زہر اس کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا ۔ جب اس جلیل القدر دیوتا کا اضطرار کم ہوا تو اس نے دھاڑ کر اپنے پیروؤں سے کہا ''میرے بچو! میرے جگر گوشو! میرے پاس آؤ! میں سلطان ابن سلطان ہوں ؛ ایک دیوتا کا مقدس تخم ۔ میرے باپ نے میرا نام تجویز کیا ، میرے ماں باپ نے میرا نام رکھا اور میری پیدائش سے اب تک وہ میرے سینے میں دفن رہا ، تاکہ کوئی ساحر مجھ پر قابو نہ پا سکے ۔ میں نکلا تھا کہ جو کچھ میں نے تخلیق کیا ہے ، اسے دیکھوں ۔ میں اپنے بنائے ہوئے دونوں جہان میں چل رہا تھا کہ کسی چیز نے مجھے ڈس لیا ۔ نہ معلوم وہ کیا چیز تھی ۔ کیا وہ آگ تھی ؟ پانی تھا ؟ میرا دل پھنک رہا ہے ، میری بوٹی بوٹی کانپ رہی ہے ، میرا ایک ایک عضو لرزاں ہے ۔ دیوتاؤں کے بچوں کو میرے پاس لاؤ ، جن کے الفاظ مسیحائی کرتے ہیں اور جن کے لبوں سے درک و بصیرت کے پھول جھڑتے ہیں ، آسمان جن کے دائرۂ اختیار میں ہے ۔'' پھر دیوتاؤں کے بچے اس کے پاس آئے اور وہ سب مغموم تھے ۔ چالاک اور عیسیٰ نفس آئی سس بھی پہنچی ، جس کے عمل سے دکھ بیماری دور ہو جاتی ہے ؛ جس کے الفاظ مردوں کو جلا دیتے ہیں ۔ وہ بولی ''کیا ہوا ؟ یا ابی' مقدس ، کیا ہوا ؟'' دیوتا منہ کھول کر یوں گویا ہوا ''میں اپنی راہ چلا جا رہا تھا ، میرا دل جو چاہا تو میں دونوں عالموں میں چلنے لگا کہ جو کچھ میں نے تخلیق کیا ہے اسے دیکھوں ۔ اتنے میں ایک سانپ نے ، جو میری نظر سے پوشیدہ تھا ، مجھے ڈس لیا ۔ کیا وہ آگ ہے ؟ کیا وہ پانی ہے ؟ میں پانی سے زیادہ سرد ہو رہا ہوں ، آگ سے زیادہ پھنک رہا ہوں ۔ میرا عضو عضو عرق عرق ہے ، میں کپکپا رہا ہوں ، میری آنکھ کسی چیز پر نہیں ٹھہرتی ، مجھے آسمان نظر نہیں آتا ، میرا چہرہ اسی طرح

مرطوب ہے جس طرح گرما میں ہوا کرتا ہے۔'' آئی سس بولی ''یا ابی! مجھے اپنا نام بتاؤ کہ جو آدمی اپنے اصلی نام سے پکارا جاتا ہے اسے موت کبھی نہیں آئے گی۔'' رع نے جواب دیا ''میں نے ارض و سما کی تکوین کی۔ میں نے پہاڑوں کو منظم کیا، بحر تا پیدا کنار کو تخلیق کیا۔ میں نے مشرق و مغرب میں افق کی قناتیں تان دیں۔ میں ہی وہ ہوں جس کے آنکھیں کھولتے ہی اجالا ہو جاتا ہے اور موندتے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے، جس کے حکم سے نیل چڑھتا ہے، لیکن جس کے نام کی دیوتاؤں کو خبر نہیں۔ صبح میں خیبرا کہلاتا ہوں، نصف النہار رع اور شام طم۔'' لیکن اس کے جسم سے زہر نہ نکل سکا۔ وہ اپنا کام کرتا گیا، یہاں تک کہ مہا دیوتا صاحب فراش ہو گیا۔ پھر آئی سس نے کہا ''تو نے مجھے جو کچھ بتایا ہے وہ تیرا اصلی نام نہیں۔ مجھے اپنا اصلی نام بتا تو تجھے زہر سے نجات مل جائے کہ جس کا نام لیا جائے وہ ہرگز نہیں مرے گا۔ اس اثناء میں وہ زہر سے پھنکنے لگا، جو آگ کے شعلے سے بھی زیادہ تیز تھا۔ رع نے کہا ''مجھے ماننا پڑتا ہے کہ آئی سس مجھے کرید کر چھوڑے گی اور میرے سینے کا راز اس کے سینے میں منتقل ہو جائے گا۔ پھر وہ روپوش ہوگیا کہ دوسرے دیوتا اسے نہ دیکھ سکیں اور سفینۂ ابد میں اس کی جگہ خالی ہو گئی۔'' اس طرح آمن جلیل القدر دیوتا کے نام کا بھید اس سے لے لیا گیا، اور آئی سس ساحرہ یوں گویا ہوئی ''اے زہر! بہہ نکل، رع کو چھوڑ جا۔ وہ میری ہستی ہے، ہاں مجھ جیسی ہستی بھی، جو زہر پر غالب آ جاتی ہے اور اسے خاک میں ملا دیتی ہے، اس لیے کہ مہا دیوتا کا نام اس سے معلوم کر لیا گیا۔ رع زندہ رہے اور زہر کا اثر زائل ہو جائے۔'' یہ تھے دیوتاؤں کی ملکہ آئی سس کے الفاظ جو رع اور اس کے اصلی نام سے واقف ہے۔

اس کہانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ رع کے اصلی نام کے متعلق، جس سے اس کی طاقت وابستہ تھی، یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ قریب قریب طبعی مفہوم میں اس کے سینے کے اندر کہیں پوشیدہ تھا۔ جہاں سے آئی سس نے ایک طرح کے عمل جراحی کے ذریعے اسے نکال لیا

اور اس کی تمام مافوق قوتوں کے ساتھ اس کو اپنے اندر منتقل کر لیا۔ مصر میں کسی مہا دیوتا کے نام پر قبضہ کرکے اس کی قوت حاصل کرنے کی آئی سس کی سی کوششوں کی روداد محض کسی قدیم اساطیری مخلوق کی داستان نہیں، بلکہ ہر مصری جادوگر کی یہ آرزو تھی کہ وہ اسی صورت سے استدراج حاصل کرے، اس لیے کہ لوگوں کے عقیدے کے بموجب جو شخص کسی دیوتا یا انسان کے اصلی نام سے واقف ہو جاتا، وہ اس دیوتا یا انسان کو اپنے قبضے میں کر لیتا اور اسے یہ طاقت حاصل ہو جاتی کہ کسی دیوتا کو بھی اپنے حکم پر اس طرح چلائے، جس طرح کوئی آقا اپنے غلام کو چلاتا ہے۔ اس لیے فن ساحری دیوتاؤں سے ان کے نام معلوم کرنے پر مشتمل تھا اور ساحر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب کوئی دیوتا ضعف کی حالت میں یا سہواً کسی جادوگر کو اپنا بھید دے دیتا تو اس کے لیے مقدم‌الذکر کی بے عذر اطاعت کرنے یا نافرمانی کا خمیازہ بھگتنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اسائے الوھی کی سحری خصوصیت پر رومی بھی اسی طرح اعتقاد رکھتے تھے۔ جب وہ کسی شہر کا محاصرہ کرتے تو ان کے مذھبی پیشوا اس مقام کے محافظ دیوتا کو ایک خاص دعا یا عمل میں مخاطب کرکے اس سے التجا کرتے کہ وہ اس محصور شہر کو چھوڑ کر رومیوں کے پاس آ جائے۔ رومی اس کا وھی بلکہ اس سے بھی زیادہ احترام کریں گے، جو اس کے پرانے مسکن میں ہوتا رہا ہو۔ اسی وجہ سے روم کے محافظ دیوتا کے نام کے بارے میں سخت راز داری برتی جاتی تھی؛ مبادا اس جمہوریہ کے دشمن اسے بہلا پھسلا کر لے اڑیں، جیسا کہ خود رومی بہت سے دیوتاؤں کو ترغیب دے چکے تھے کہ وہ ان رو بہ زوال شہروں کو چھوڑ دیں، جو خوش حالی کے زمانے میں ان کا ٹھکانہ رہے تھے۔ یہی نہیں، بلکہ شہروں کے نام بھی سخت راز میں رکھے جاتے تھے، اور انھیں زبان سے نکالنے کی مقدس رسموں میں بھی اجازت نہ تھی۔ والیریس سورانس نامی ایک شخص کو، جس نے یہ بیش بہا راز افشا کر دیا تھا، قتل کر دیا گیا یا اس کا برا انجام ہوا۔ اسی طرح

قدیم اشوریوں کے ہاں بھی شہروں کے مخفی ناموں کا ظاہر کرنا ممنوع تھا اور موجودہ دور میں بھی قاف کے علاقے کے کیریس نامی لوگ توہمات کی بناء پر اپنے قومی قریوں کے نام مخفی رکھتے ہیں۔

شخصی ناموں سے متعلق توہمات کی ہم جو کچھ تحقیق کرنے آئے ہیں، اس کا اگر آپ نے بغور مطالعہ کیا ہو تو غالباً آپ ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ شاہی ناموں کا اخفاء اپنی نوعیت کے ایک الگ واقعے یا دربار داری اور خوشامد سے عبارت نہیں، بلکہ جاہلی فکر کے ایک ہمہ گیر کلیے کی مخصوص عملی صورت ہے، جو عام آدمی اور دیوتا، سلاطین اور آئمۂ مذہب سبھی کا احاطہ کرتا ہے۔

تیئیسواں باب

# ہم پر وحشی کا احسان

سلاطین اور آئمۂ مذہب سے متعلق امتناعات کی فہرست میں اضافہ مشکل نہیں ، لیکن گزشتہ صفحات میں جو مثالیں اکٹھی کی گئی ہیں وہ بہ طور نمونہ کافی ہیں ۔ اب اپنے موضوع کے اس پہلو سے بحث ختم کرتے ہوئے ہمارے لیے اس ضمن میں اپنی تحقیق کے ان عام نتائج کا خلاصہ پیش کرنا باقی رہتا ہے جو ہم اب تک اخذ کرتے چلے آئے ہیں ۔ غیر متمدن معاشرے میں ایسے اشخاص اکثر ملتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کے توہمات کے بموجب فطرت پر قدرت رکھتے ہوں اور اس لیے ان کی پرستش کی جاتی ہو اور ان کے ساتھ دیوتاؤں کا سا سلوک ہوتا ہو ۔ ان انسان دیوتاؤں کی دینی اور دنیوی حیثیت کا فرق ، یعنی یہ سوال کہ آیا ان کے پرستاروں کی زندگیاں اور تقدیریں مادی حیثیت سے بھی ان کے قبضہ و اختیار میں ہوتی ہیں یا ان کے منصب محض روحانی اور مافوق نوعیت کے ہیں ، دوسرے لفظوں میں آیا وہ بادشاہوں اور دیوتاؤں دونوں کی حیثیت رکھتے ہیں یا محض دیوتاؤں کی ؟ ہمارے موضوع سے خارج ہے ۔ ان کی مفروضہ الٰہیت اصل چیز ہے اور اسی سے یہاں ہمیں بحث ہے ۔ اس خصوصیت کی بناء پر اپنے پرستاروں کے لیے ان کی ذات ان مظاہر طبیعی کے نظم و تسلسل کی ضامن ہے ، جن پر بنی نوع انسان کی بقا منحصر ہو ۔ لہذا ایسے خدایان مجازی کی صحت و زندگی کی طرف سے ان لوگوں کا فکر و تردد ایک قدرتی چیز ہے جن کی

خوش حالی ، بلکہ وجود ان خداؤں کی ذات سے وابستہ ہو ۔ اسی لیے انھیں ایسے ضوابط کی پابندی پر مجبور کر دیا جاتا ہے جو غیر ترقی یافتہ انسان کے ذہن نے جسمانی مصائب کے سد باب کے لیے وضع کر رکھے ہوں ، جن میں آخری مصیبت موت بھی شامل ہے ۔ یہ ضوابط ، جیسا کہ ان کی جانچ پڑتال سے ثابت ہو چکا ہے ، محض ایسے اصول یا کہنوں سے عبارت ہیں جن پر کاربند ہونا ہر عاقبت اندیش آدمی کے لیے لازمی ہے ۔ لیکن جہاں عام آدمی کے لیے ان قواعد کی تعمیل اختیاری چیز ہے ، وہاں انسان دیوتا کو اپنی معزولی بلکہ موت کے خوف سے ان کی پابندی کرنی پڑتی ہے ، اس لیے کہ اس کی زندگی سے اس کے پرستاروں کی بقاء و فلاح اس حد تک وابستہ ہوتی ہے کہ اسے کسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی اجازت نہیں دی جاتی ۔ اس لیے وہ سارے عجیب و غریب توہمات ، وہ سارے قدیم امثال و اقوال جنہیں حکمائے جاہلیت نے بڑی کاوش و عرق ریزی سے ایجاد کیا تھا اور جن کے خزانے آج بھی اگلے وقتوں کی بڑی بوڑھیاں سردی کی راتوں میں انگیٹھیوں کے پاس بیٹھی اپنے بچوں کے آگے لٹایا کرتی ہیں ، ایک طلسم تخیل تھے : ذہن کا ایک دام فریب ، جو قدیم بادشاہ یعنی خدائے مجسم کے راستے میں بچھا دیا گیا تھا اور اس کے دست و پا تارعنکبوت میں مگس کی طرح رسم و رواج کی ان ''ہوا کے سے نرم و ملائم لیکن آہنی کڑیوں سے زیادہ سخت'' بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے جن کے پیچ در پیچ تانے بانے سے اسے موت یا معزولی ہی رہا کرا سکتی تھی ۔

اس طرح ماضی کے طالب علموں کے لیے شاہان کہن اور آئمۂ مذہب کی زندگی بڑی سبق آموز ہے ۔ جب دنیائے انسانیت اپنے ارتقاء کے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی تو ان کے ضابطۂ حیات کو جامع حکمت و بصیرت تصور کیا جاتا تھا ۔ وہ ایک ایسا معیار اعلیٰ تھا ، جس کے مطابق ہر شخص اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کرتا تھا ۔ زندگی کا یہ بے عیب اور مکمل نمونہ ٹھیک ان آدرشوں کے مطابق تیار کیا گیا تھا جو فلسفۂ جاہلیت نے معین کر رکھے تھے ۔ ہر چند کہ یہ فلسفہ ہمیں لغو اور وحشیانہ نظر آئے گا ، لیکن اس کے منطقی

ربط و نظم سے انکار بڑی بے انصافی ہوگی ۔ اس فلسفے کا بنیادی مفروضہ یہ تصور ہے کہ جوہر حیات ایک ایسے بونے یا روح سے عبارت ہے جو کسی جان دار جسم میں وجود رکھتی ہو ، لیکن ساتھ ہی جو اس سے بالکل ممتاز ہو اور علیحدہ ہو سکتی ہو ۔ اس بنیادی تصور کی بناء پر وہ زندگی کا ایک مکمل اور منظم ضابطۂ حیات مرتب کر لیتا ہے ۔ اس نظام زندگی کا بنیادی سقم فلسفۂ جاہلیت کا طرز استدلال نہیں بلکہ اس کا مقدمہ یا اساسی مفروضہ ، یعنی حیات کی ماہیت کے بارے میں اس کا تصور ہے ، نہ کہ وہ نتائج جو وہ اس تصور سے اخذ کرتا ہے ۔ اس مقدمے یا مفروضے کو اس لیے مضحکہ خیز قرار دینا کہ ہم پر ان کی لغویت ہویدا ہے ، نہ صرف احسان فراموشی ہوگی بلکہ فلسفیانہ اصول کے بھی منافی ہوگا ۔ ہم خود آج انھی بنیادوں پر کھڑے ہیں جو اگلی نسلیں اٹھا گئی ہیں ۔ ہمارے لیے اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس مقام تک راہ پانے کے لیے، جہاں ہم پہنچ پائے ہیں ، اور جو کچھ ایسا بلند بھی نہیں ، بنی نوع انسان کو کتنی طویل جد و جہد اور کیسی کیسی کھکیڑیں اور مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں ۔ ہم پر ان گم نام اور بھلائے ہوئے جفا کشوں کا شکر واجب ہے ، جن کے صبر آزما تفکر اور سرگرمیوں کی بدولت ہم موجودہ حالت تک پہنچے ہیں ۔ علم کے گنجینے میں کسی ایک آدمی کا تو کیا ایک دور کا اضافہ بھی بہت تھوڑا ہوتا ہے اور سارے خرمن کو نظر انداز کرکے اس میں اپنے شامل کیے ہوئے چند دانوں پر فخر کرنا ناشکری کے علاوہ حماقت یا بد دیانتی کی دلیل ہے ۔ بنی نوع انسان کی عام ترقی میں عہد جدید بلکہ کلاسیکی دور کا بھی جو حصہ رہا ہے اس کی کم قدری کا فی الحال کوئی خطرہ نہیں ۔ لیکن جب ہم ان ادوار کی حدود سے نکل کر دیکھتے ہیں تو صورت مختلف نظر آتی ہے ۔ وحشی اور اس کے رسم و رواج کے لیے ہمارے پاس تحقیر و تضحیک یا اکراہ و ملامت کے سوا کچھ نہیں ۔ لیکن جن محسنوں کو شکر و امتنان کے ساتھ یاد رکھنا ہمارا اخلاقی فرض ہے ، ان میں بہت سے بلکہ بیشتر وحشی ہی تھے ، کیوں کہ آج بھی وحشی سے ہماری مماثلت اختلاف سے کہیں

زیادہ ہے ؛ اور جو چیزیں ہمارے اور اس کے درمیان قدر مشترک ہیں اور جنہیں ہم نے مفید اور قرین حقیقت سمجھ کر برقرار رکھا ہے ، ان کے لیے ہم اپنے غیر مہذب آباؤ اجداد کے مرہون منت ہیں ۔ انھی نے رفتہ رفتہ اپنے تجربے کی بناء پر وہ خیالات پیدا کیے اور ورثے میں ہمارے لیے چھوڑ گئے جو بہ ظاہر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور جنہیں ہم ازلی اور بدیہی سمجھتے ہیں ۔ ہماری مثال ایک ایسی پونجی کے ورثاء کی سی ہے جسے دست بہ دست منتقل ہوتے اتنے دور بیت گئے ہوں کہ جن لوگوں نے اسے جمع کیا تھا ان کی یاد تک دلوں سے محو ہو گئی، اور جو لوگ اس پر سردست قابض ہوں ، انھوں نے اپنی اس متاع کے متعلق یہ سمجھ لیا ہو کہ ان تک ایک ایسی دولت پہنچی ہے جو ابتدائے آفرینش سے جوں کی توں ان کی نسل کے قبضے میں رہتی چلی آئی ہے ۔ لیکن غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی بناء پر ہمیں اس باب میں مطمئن ہو جانا چاہیے کہ ہم جسے اپنا سرمایہ سمجھے بیٹھے ہیں ، اس کے بیشتر حصے کے لیے ہم اپنے پیش رؤوں کے مرہون منت ہیں ، نیز یہ کہ ان کے غلط نظریے غلوئے بالعمد یا مجذوب کی بڑ سے عبارت نہ تھے بلکہ محض ایسے فرضیے تھے جو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے صحیح تھے ، لیکن جنھیں بعد کے مزید تجربے نے ناقص اور غیر معقول ثابت کر دیا ۔ فرضیوں کے مسلسل آزمانے اور غلط فرضیوں کو مسترد کرنے ہی سے حقیقت ہاتھ آتی ہے ۔ بہر کیف جسے حقیقت کہا جاتا ہے وہ اس فرضیے کا نام ہے جو عملاً سب سے بہتر ثابت ہوا ہو ۔ اسی لیے غیر ترقی یافتہ ادوار و اقوام کے افکار و رسوم کا جائزہ لیتے ہوئے ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ ہم ان کی خطاؤں کو بہ نظر لینت دیکھتے ہوئے انھیں ایسی لغزشوں سے تعبیر کریں ، جن کا سرزد ہونا تلاش حق میں ناگزیر ہے اور ان کے لیے وہ رعایت ملحوظ رکھیں جس کے ایک نہ ایک دن شاید ہم بھی محتاج ہوں ۔

چوبیسواں باب

# شاہ کشی

(۱) دیوتاؤں کی موت—آدمی نے اپنے خداؤں کی تخلیق اپنے نمونے پر کی ہے اور چوں کہ اسے خود موت سے مفر نہیں، اس لیے اس کا اپنی مخلوق کو بھی فانی سمجھنا قدرتی بات ہے۔ چناں چہ گرین لینڈ والوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ہوا ان کے بڑے سے بڑے دیوتا کو ہلاک کر سکتی ہے اور یہ کہ اگر اس نے کتے کو چھو لیا تو اس کی موت یقینی ہے۔ جب شروع شروع میں انھیں خدا کے مسیحی تصور سے روشناس کرایا گیا تو وہ بار بار یہ پوچھا کرتے تھے کہ کیا وہ غیر فانی ہے؟ جب اس کا جواب اثبات میں دیا گیا تو انھیں بڑا تعجب ہوا اور انھوں نے کہا کہ وہ یقیناً کوئی بہت ہی بڑا خدا ہوگا۔ کرنل ڈاج کی تحقیقات پر شمالی امریکہ کے ایک دیسی آدمی نے بتایا کہ عالم کی تخلیق عظیم روح نے کی تھی۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کی مراد کس عظیم روح سے ہے، آیا اچھی عظیم روح سے یا بری سے؟ اس نے جواب دیا ''اوہ! نہ اچھی سے، نہ بری سے۔ جس عظیم روح نے یہ جہاں بنایا ہے وہ تو کب کی مر چکی۔ بھلا وہ اتنا عرصہ کیسے زندہ رہ سکتی تھی۔'' جزائر فلپائن کے ایک قبیلے نے ہسپانوی فاتحوں سے کہا تھا کہ جس ہستی نے عالم کی تخلیق کی ہے، اس کی تربت کابونیائی پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔ ہائن ٹاٹ قوم کا ایک مقدس سورما یا دیوتا موسوم بہ ہائسٹی آئی بب کئی مرتبہ مر کے زندہ ہوا تھا؛ اس کی

قبریں عموماً پہاڑوں کی تنگ گھاٹیوں میں پائی جاتی ہیں ۔ جب ہائن ٹاٹ ان میں کسی قبر کے پاس سے گزرتے ہیں تو اس پر ایک آدھ پتھر پھینک جاتے ہیں کہ ایسا کرنا ان کے نزدیک مبارک ہوتا ہے ۔ اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی دہرا دیتے ہیں ''ہمیں یہ افراط مویشی عطا کر!'' کریٹ میں عیسوی دور کے آغاز تک بھی زائروں کو یونانیوں کے مہا دیوتا زیوس کی قبر دکھائی جاتی تھی ۔ ڈایونائی سس کی لاش ڈیلفائی میں اپولو کے سنہری مجسمے کے برابر دفن کی گئی تھی اوراس کے مقبرے پر یہ عبارت کندہ تھی ۔ ''یہ آں جہانی ڈایونائی سس ابن سمیلے کی آرام گاہ ہے ۔'' ایک بیان کے بموجب خود اپولو کو بھی ڈیلفائی میں دفن کیا گیا تھا ۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ پائی تھاگورس نے اس کے مقبرے پر ایک کتبہ لگایا تھا ، جس میں یہ تفصیل کندہ تھی کہ کس طرح اپولو کو پائی تھان نے (ایک مہیب اژدھا) ہلاک کیا اور کس طرح اسے کانسی کی قربان گاہ کے نیچے دفن کیا گیا ۔

خود مصر کے مہا دیوتاؤں کو بھی موت سے مفر نہ تھا ۔ وہ بھی بوڑھے ہو کر چل بستے تھے ۔ لیکن بعد کے زمانے میں جب فن حنوط کاری کی بدولت لاشوں کے تحفظ کی صورت نکل آئی اور مردوں کی روحوں کو نئی زندگی مل گئی تو دیوتاؤں کو اس ایجاد کی برکتوں سے متمتع کیا جانے لگا اور آدمیوں کی طرح انھیں بھی بقائے دوام کی امید بندھ گئی ۔ اس کے بعد ہر صوبہ اپنے متوفی دیوتا کی ممی رکھنے لگا ۔ چناں چہ اوسائی رس کی ممی مینڈیس میں نظر آتی تھی ، انہوری کی ممی تھینیس کا سرمایۂ افتخار تھی اور کوتومو کی ممی ہیلیوپولس کے لیے باعث شادمانی ۔ بابلی مہادیوتا بھی جو اگرچہ اپنے پرستاروں کو صرف کشف و خواب ہی میں نظر آتے تھے ، شکل و صورت ، جذبات اور مقدر کے اعتبار سے انسان ہی جیسے متصور ہوتے تھے ۔ کیوں کہ وہ بھی انسانوں کی مانند دنیا میں آتے ، پیار محبت کرتے ، لڑتے جھگڑتے اور مر جاتے تھے ۔

(۲) قویٰ کے انحطاط کے سبب بادشاہوں کا قتل—

اگر ان مہا دیوتاؤں کے متعلق جو دنیوی ہنگاموں سے دور رہتے ہیں ،

یہ عقیدہ پایا جائے کہ انھیں ایک نہ ایک دن مرنا ہے تو کسی ایسے دیوتا سے ، جو ایک نازک سے کالبد خاکی میں بستا ہو ، یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ موت سے محفوظ رہے گا ۔ ویسے افریقی بادشاہوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سحر کے بل پر اپنے آپ کو غیر فانی خیال کرتے تھے ۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں ، بعض صورتوں میں وحشی اقوام یہ اعتقاد رکھتی ہیں کہ ان کی ، بلکہ دنیا کی سلامتی بھی کسی انسان دیوتا یا خدائے مجسم کی زندگی پر منحصر ہے ۔ اس لیے قدرتی طور پر وہ اپنی سلامتی کی خاطر اس کی جان کی حفاظت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے ، لیکن انحطاط اور موت سے مفر کہاں ! مشیت کے اس اندوہ ناک اقتضا کو ملحوظ رکھنا اور اس سے بطریق احسن عہدہ برآ ہونا انسان دیوتا کے پرستاروں کے لیے ازبس ضروری ہے ۔ وہ ایک عظیم خطرہ ہے ، اس لیے کہ اگر فطرت کا معمول اس دیوتا کی زندگی پر منحصر سمجھا جاتا ہو ، تو اس کے قویٰ کا رفتہ رفتہ گرنا اور اس کا طبعی موت مرنا ان کے خیال میں ایک زبردست آفت کا پیش خیمہ ہوگا ۔ اس آفت سے محفوظ رہنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جوں ہی انسان دیوتا سے ضعف و انحطاط کی علامتیں ظاہر ہوں اس کا کام تمام کر دیا جائے ، اور قبل اس کے کہ اس کی شمع حیات ٹمٹما کر گل ہو ، اس کی روح اس کے کسی صحیح و توانا جانشین میں منتقل کردی جائے ۔ وحشی کی نظر میں انسان دیوتا کے عمر طبعی کو پہنچنے اور دکھ بیماری سہہ کر مرنے کی بجائے اس کا قصہ اس طرح پاک کیے جانے کے جو فوائد ہیں ، وہ ظاہر ہیں ۔ وحشی کے نزدیک اس کی طبعی موت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی روح اس کے جسم کو اپنی مرضی سے چھوڑ گئی ہے اور واپس آنا نہیں چاہتی ، یا جیسا کہ بیشتر ہوا کرتا ہے ، اسے کسی بھوت یا ساحر نے کھینچ نکالا ہے ، یا کم از کم وہ بھٹکتے ہوئے کہیں پکڑی گئی ہے ۔ ان میں خواہ کوئی صورت پیش آئے ، انسان دیوتا کی روح سے اس کے پرستار محروم ہو جاتے ہیں ، جس کے ساتھ ساتھ ان کی خوش حالی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے ۔ نیز وہ دیوتا کی روح کو قفس عنصری سے پرواز کرتے وقت

پکڑنے اور اسے اس کے وارث کے جسم میں منتقل کرنے کا بندوبست بھی کر لیں تو اس سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا ، کیوں کہ طبیعی موت کی صورت میں عوارض جسمانی کے سبب اس کی روح ضعف و ناتوانی کے آخری درجے کو پہنچ جاتی ہے اور اس حالت میں وہ نئے جسم کے اندر سست اور نکمی رہ کر اپنی زندگی کے دن کاٹے گی ۔ برخلاف اس کے دیوتا کو موت کے گھاٹ اتار دینے سے ، اس کے پرستاروں کے لیے ایک تو اس کی روح کو پرواز کرتے وقت پکڑنا اور اسے جانشین کے جسم میں منتقل کرنا یقینی ہوگا اور دوسرے قویٰ کے اضمحلال سے پہلے اس کا کام تمام ہونا ان کے لیے اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی طبعی موت سے دنیا فنا نہیں ہوگی ۔ لہذا اس صورت سے اس کی ہلاکت اور جسمانی انحطاط سے پہلے ہی کسی چاق چوبند جانشین کے بدن میں اس کی روح کی منتقلی سے سارے مقاصد پورے اور سارے خطرات دور ہو جاتے تھے ۔

کمبوڈیا کے شاہان آب و آتش کو اپنی موت مرنے نہیں دیا جاتا ، لہذا ان میں جب کوئی سخت علیل ہو اور بڑے بوڑھوں کی یہ رائے ہو کہ وہ جان بر نہیں ہو سکے گا تو وہ اسے چاقو گھونپ کر ہلاک کر دیتے ہیں ۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں ، کانگو والوں کا عقیدہ ہے کہ اگر ان کا پیشوا چٹومے عمر طبعی کو پہنچ کر مرے تو دنیا فنا ہو جائے اور دھرتی جو صرف اسی کی قوت و کمال کے سہارے قائم ہے ، چشم زدن میں تہس نہس ہو کر رہ جائے ۔ چناں چہ جب وہ بیمار ہوتا ہے اور اس کی موت یقینی نظر آتی ہے تو وہ شخص جس کی قسمت میں اس کی وراثت لکھی ہوتی ہے ، ایک بلم یا رسی لیے اس کے گھر میں داخل ہوتا ہے اور اسے زد و کوب کرکے یا گلا گھونٹ کے ہلاک کر دیتا ہے ۔ سلطنت میرو کے حبشی بادشاہ دیوتاؤں کی طرح پجتے تھے ، لیکن جب کبھی آئمۂ مذہب کو منظور ہوتا ، وہ بادشاہ کو ایک قاصد کے ذریعے مرنے کا حکم دیتے اور یہ دعویٰ کرتے کہ ان کے اس حکم کو تائید غیبی حاصل ہے ۔ ارگامنیس کے عہد حکومت تک ، جو سلطان مصر بطلیموس دوئم کا ہم عصر تھا ، میرو کے بادشاہ مذہبی پیشواؤں کے اس حکم کی برابر تعمیل کرتے رہے ۔ ارگامنیس ،

جس نے یونانیوں سے تعلیم حاصل کی تھی ، اپنے ہم وطنوں کے توہمات سے آزاد ہو چکا تھا ۔ اس نے بڑی بے باکی سے مذہبی پیشواؤں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور سپاہیوں کی ایک جمعیت کے ساتھ سنہری مندر میں گھس کر انہیں تلوار کے گھاٹ اتار دیا ۔

معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ کے مذکورہ بالا حصے میں اسی قسم کے دستور عہد جدید تک موجود تھے ۔ فزوقل کے چند قبیلوں میں بادشاہ کو ایک خاص درخت کے تلے داد عدالت دینی پڑتی تھی ۔ اگر علالت کے باعث یا کسی اور وجہ سے وہ تین دن تک اپنا یہ فرض پورا کرنے سے قاصر رہتا تو اس کے گلے میں پھندا ڈال کے ایک درخت سے لٹکا دیا جاتا ۔ اس پھندے میں دو استرے اس طرح لگے ہوتے کہ جب وہ بادشاہ کے بوجھ سے کھنچتا تو اس کی گردن کٹ جاتی ۔

کچھ عرصہ پیشتر تک سفید نیل کے علاقے کے شلوک اپنے مقدس بادشاہوں کو ضعف یا پیری کی علامتیں ظاہر ہوتے ہی ہلاک کر دیا کرتے تھے ۔ حال میں ان کے اس دستور کی ڈاکٹر سی ۔ جی ۔ سیلگمن نے تحقیق کی ہے ۔ شلوک اپنے بادشاہوں کا جو احترام کرتے ہیں ، اس کا اصل سبب غالباً ان کا یہ اعتقاد ہے کہ ان کے روپ میں نیاکانگ نامی اس سورما کی روح از سر نو ظاہر ہوتی ہے ، جس نے سلطنت کی بناء ڈالی تھی اور موجودہ علاقے میں شلوک قبیلے کو بسایا تھا ۔ شلوکوں کا یہ جزو ایمان ہے کہ نیاکانگ حکمران بادشاہ کی صورت میں متشکل ہے ، اور اسی لیے مؤخرالذکر بھی ان کی نظر میں دیوتا کی حیثیت رکھتا ہے ۔ لیکن جہاں یہ شلوک اپنے بادشاہ کو نہایت قابل احترام بلکہ مقدس سمجھتے ہیں اور اس کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے کہ مبادا وہ کسی حادثے کا شکار ہو جائے ، وہاں ان کے ''عقیدے کے بموجب اسے بیمار یا ضعیف نہیں ہونے دینا چاہیے ، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے قویٰ کے اضمحلال کے ساتھ مویشی بیمار ہو جائیں اور ان کی افزائش رک جائے ، کھیتوں میں کھڑی فصل مرجھانے لگے اور آدمی امراض میں مبتلا ہو کر دھڑا دھڑ مرنے لگیں ۔'' ان آفتوں کے سدباب کے لیے شلوک اپنے دستور کے بموجب

بادشاہ کو ، جب کبھی اس میں صحت کی خرابی یا جسمانی انحطاط کی علامتیں ظاہر ہوتیں ، باقاعدہ ہلاک کر دیا کرتے تھے ۔ بادشاہ کے قویٰ کے انحطاط کی بد ترین علامت ان کی دانست میں یہ تھی کہ وہ اپنی ازواج کے جنسی جذبات کی تسکین کرنے کے قابل نہ رہتے ، جو کثیر تعداد میں تھیں اور بمقام فشودا متعدد مکانات میں رہتی تھیں ۔ جب اس میں یہ منحوس علامت ظاہر ہوتی تو ازواج شاہی اس کی اطلاع سرداروں کو دیتیں ، جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ گرمی کی دوپہر کی گھٹن میں ، جب بادشاہ قیلولہ کرتا ، اس پر سفید چادر اڑھا کر اسے اس کے انجام سے با خبر کرتے ۔ اپنی سزائے موت سے اس طرح آگاہ ہونے کے بعد وہ جلد ہی قتل کر دیا جاتا ۔ اس موقع پر خاص طور پر ایک جھونپڑی ڈالی جاتی ، بادشاہ کو اس میں لے جایا جاتا اور وہ کسی برجوگ کنواری کی آغوش میں سر رکھ کر لیٹ جاتا ۔ پھر جھونپڑی کے دروازے میں دیوار اٹھا دی جاتی اور دونوں کو اشیائے خور و نوش کے بغیر اس میں چھوڑ دیا جاتا کہ بھوک اور گھمس سے ان کا کام تمام ہو جائے ۔ یہ قدیم دستور تھا ، لیکن پانچ پیڑیاں گزریں کہ ہلاکت کے اس طریقے سے ایک بادشاہ کو شدید اذیت پہنچی ، جس کے سبب اس دستور کو ترک کر دیا گیا ۔ کہا جاتا ہے کہ اب سردار بادشاہ کو اس کے انجام سے آگاہ کر دیتے ہیں اور ایک جھونپڑی میں ، جو خاص طور پر اس مقصد کے لیے بنائی جاتی ہے ، اسے گلا گھونٹ کر مار دیا جاتا ہے ۔

ڈاکٹر سیلگمن کی تحقیقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شلوک بادشاہ نہ صرف انحطاط کی ابتدائی علامتوں کے نمودار ہونے پر مستوجب قتل ہوتا تھا ، بلکہ صحت و توانائی کی حالت میں بھی ہر وقت اسے کسی نہ کسی حریف کے حملے کا کھٹکا لگا رہتا ، جس کے ساتھ ایک فیصلہ کن معرکے میں اسے اپنے تخت و تاج کی حفاظت کرنی پڑتی ۔ شلوکوں کی عام روایت کے بموجب کسی بھی شہزادے کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ بادشاہ وقت سے نبرد آزما ہو ، اور اگر مؤخرالذکر اس کے ہاتھوں مارا جائے تو اس کی جگہ خود عنان حکومت سنبھال لے ۔ چوں کہ ہر

بادشاہ کی متعدد عورتیں اور لڑکے ہوتے ، اس لیے ہر وقت تخت و تاج کے مستحق آمیدواروں کی تعداد خاصی رہتی ہوگی اور حکم ران بادشاہ کو ہر دم اپنی جان کا خطرہ لگا رہتا ہوگا ۔ لیکن اس پر کام یاب حملہ صرف رات ہی کو ممکن تھا ، کیوں کہ دن میں بادشاہ اپنے دوستوں اور پہرے کے سپاہیوں میں گھرا ہوتا اور سلطنت کا خواست گار یہ آمید نہیں کر سکتا تھا کہ ان میں گھس کر اسے بادشاہ پر وار کرنے کا موقع ملے گا ۔ لیکن رات کو صورت حال مختلف ہوتی ؛ اس وقت پہرے کے سپاہیوں کو برخاست کر دیا جاتا اور بادشاہ اپنے احاطے میں اپنی محبوب بیویوں کے ساتھ اکیلا ہوتا ۔ ایسے میں سوائے ان چند گڈریوں کے ، جن کی جھونپڑیاں وہاں سے کچھ فاصلے پر ہوتیں ، اس کی حفاظت کے لیے کوئی موجود نہ ہوتا ۔ لہذا رات کے سناٹے میں اس کی جان جوکھوں میں ہوتی ۔ کہا جاتا ہے کہ ان اوقات میں وہ بالکل چوکس اور کیل کانٹے سے لیس ایک ایک سایے کو گھورتا اپنی جھونپڑی کا گشت لگایا کرتا یا کسی تاریک گوشے میں چوکس کھڑا پہرہ دیتا رہتا ۔ بالآخر جب اس کا حریف نمودار ہوتا تو بڑی خاموشی سے لڑائی شروع ہو جاتی ، جس میں نیزہ و سپر کی جھنکار کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دیتی ، کیوں کہ بادشاہ اپنے ناموس کی خاطر گڈریوں کو اپنی مدد کے لیے آواز نہ دے سکتا ۔

خود بانیٔ سلطنت نیاکانگ کی طرح ، مرنے کے بعد ہر شلوک بادشاہ کا مقبرہ بنا کر اس کی پرستش کی جاتی ہے ۔ یہ مقبرہ جو ہمیشہ اس کی قبر پر اس گاؤں میں بنایا جاتا ہے ، جہاں وہ پیدا ہوا ہو ، نیاکانگ ہی کے مقبرے کی مانند چند جھونپڑیوں پر مشتمل ہوتا ہے ، جن کے گرد باڑ کھنچی ہوتی ہے ۔ ان میں ایک جھونپڑی کے اندر بادشاہ کی تربت ہوتی ہے اور باقی جھونپڑیوں میں مقبرے کے متولی رہتے ہیں ، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بادشاہوں کے مقبرے نیاکانگ کے مقبرے کے اس قدر مشابہ ہوتے ہیں کہ ان میں تمیز نہیں کی جا سکتی اور ان میں جو مذہبی رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ بھی یکساں ہوتی ہیں ، بہ جز فروعی اختلافات کے ، جن کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نیاکانگ کے

مقبرے کی حرمت اوروں سے بہت زیادہ ہے ۔ نیا کانگ کے مقبرے ہی کی طرح شاہی مقابر کی دیکھ بھال چند بوڑھوں یا بوڑھیوں کے ذمے ہوتی ہے جو عموماً متوفی بادشاہوں کی بیوگان یا خدام ہوتے ہیں ۔ ان کے مرنے پر تولیت ان کی اولاد کو منتقل ہو جاتی ہے ۔ نیز شاہی مقبروں کے لیے مویشی وقف کیے جاتے ہیں اور نیا کانگ کے مقبرے کی طرح ان پر قربانیاں کی جاتی ہیں ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہ حیثیت عمومی شلوک مذہب کا سب سے اہم عنصر بادشاہوں کی پرستش ہے ، خواہ وہ حیات ہوں یا انتقال کرگئے ہوں ۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ ان سب میں ایک ہی مقدس روح جاری و ساری ہے ، جو بانیٔ سلطنت کی نیم داستانی ، لیکن غالباً بنیادی طور پر تاریخی ہستی سے اس کے تمام جانشینوں میں آج تک منتقل ہوتی چلی آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ شلوک اپنے بادشاہوں کی ذات کو الوہیت کا ایک ایسا مظہر سمجھ کر جس پر انسان ، مویشی اور اناج کی سلامتی منحصر ہو ، ان کا بے حد احترام کرتے ہیں اور ان کی خبرگیری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے ۔ تاہم یہ معلوم کرکے آپ کو تعجب ہوگا کہ صحت کی خرابی یا قویٰ کے انحطاط کی علامت نمودار ہونے پر بادشاہ کو ٹھکانے لگانے کا یہ دستور براہ راست ان کے جذبۂ شاہ پرستی اور اس تردد پر مبنی ہے ، جو انہیں بادشاہ یا یوں کہیے کہ اس کی مقدس روح اور اس کی صحت و سلامتی کی طرف سے رہتا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاہ کشی اس بات کا بہترین ثبوت ہے کہ انہیں اپنے بادشاہوں کا ادب کس قدر ملحوظ ہے ۔ کیوں کہ ، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ، ان کے عقیدے کی رو سے بادشاہ کی زندگی یا روح کے ساتھ سارے ملک کی خوش حالی مشارکت کی بناء پر اس طرح وابستہ ہوتی ہے کہ اس کی علالت یا پیرانہ سالی سے مویشی بیمار ہو جائیں ، اور ان کی افزائش نسل کا سلسلہ منقطع ہو جائے ، اور آدمی وبا میں مبتلا ہو کر راہی ملک عدم ہو جائیں ۔ لہٰذا ان کی رائے میں ان آفتوں سے مفر کی صورت صرف یہی ہے کہ بادشاہ کو صحت و توانائی کی حالت میں مار دیا

جائے ، تاکہ وہ مقدس روح جو اسے اپنے پیش رو سے ورثے میں ملی ہو ، ناتوانی یا پیرانہ سالی سے متاثر ہونے سے پہلے چاق چوبند ان کے جانشین میں منتقل کی جا سکے ۔ اس سلسلے میں وہ خاص علامت جس سے عموماً بادشاہ کے پروانۂ موت پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے ، بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ جب وہ ضعف باہ کے سبب اپنی متعدد بیویوں کی تسکین نہ کر سکے ، دوسرے لفظوں میں وہ جزوی یا کلی طور پر توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رکھنے کے قابل نہ رہے ، تو اس کے مرنے اور کسی صحیح و توانا جانشین کے لیے جگہ خالی کرنے کا وقت آ جاتا ہے ۔ شاہ کشی کے جو دوسرے وجوہ بیان کیے جاتے ہیں ، ان کے ساتھ اس کے مذکورہ بالا سبب پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ، مویشی اور زمین کی قوت باروری ، مشارکت کی بناء پر بادشاہ کی مردمی پر اس حد تک منحصر سمجھی جاتی ہے کہ اگر بادشاہ کی یہ طاقت بالکل جاتی رہے تو اس کے نتیجے میں انسان ، مویشی اور نباتات کی قوت افزائش سلب ہو جائے اور انجام کار تھوڑی سی مدت میں ہر قسم کی انسانی ، حیوانی یا نباتی زندگی کا خاتمہ ہو جائے ۔ لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں جو شلوک ایسے خطرے کی صورت میں بادشاہ کو کسی عنوان طبیعی موت مرنے نہ دیتے ہوں ۔

بادشاہ کی موت کے بارے میں ان کے اس انداز احساس و فکر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس کے لیے موت یا مرنے کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں ۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ بادشاہ مر گیا ہے ، بلکہ محض یہ کہ وہ ''گزر گیا ہے ۔'' جس طرح ان کے دو اجداد نیاکانگ اور ڈاگ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مرے نہیں تھے بلکہ غائب ہو گئے تھے ۔ روم اور یوگانڈا جیسے دوسرے ملکوں کے ابتدائی بادشاہوں کے پر اسرار طور پر غائب ہونے کی کہانیوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں بھی بادشاہوں کو ان کی جان کی سلامتی کی خاطر قتل کرنے کا دستور تھا ۔

اگر دشت نیمی کے مذہبی بادشاہوں کے بارے میں میری رائے درست ہے تو ان سے متعلق عقائد و رسوم اور شلوکوں کے مقدس بادشاہوں سے

متعلق عقائد و رسوم میں بہ حیثیت مجموعی بڑی مطابقت پائی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ایسے مقدس بادشاہوں کے سلسلے ملتے ہیں، جن پر عام عقیدے کی رو سے انسانوں، جانوروں اور پودوں کی زندگی منحصر ہو اور جنھیں دو حریفوں کے مقابلے میں یا کسی اور صورت سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہو، تاکہ ان کی الٰہی روح چاق چوبند اور صحیح و توانا ان کے جانشینوں میں منتقل ہوتی رہے، کیوں کہ بادشاہ کے پجاریوں کے نزدیک اس کے جسمانی انحطاط کے سبب بنی نوع انسان، مویشی اور نباتات کی صحت و توانائی ختم ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں بعض نکات، خاص کر بادشاہوں کے ورثا میں ان کی مقدس روحوں کے انتقال کے طریقے پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ آئیے اب شاہ کشی کے عام دستور کی دوسری مثالوں کو دیکھا جائے۔

سفید نیل کی وادی میں آزاد قبائل پر مشتمل گلہ بانوں کی ایک قوم ڈنکا ہے، جو بڑی تن دہی سے اپنے کثیرالتعداد گائے بیلوں کی پرورش میں لگی رہتی ہے، اگرچہ اس قوم کے پاس بھیڑ بکریاں بھی ہیں اور اس کی عورتیں کچھ باجرے اور تیل کی بھی کاشت کر لیتی ہیں۔ اپنی فصلوں اور سب سے بڑھ کر اپنی چراگاہوں کے لیے ان لوگوں کا تمام تر دار و مدار بر وقت بارش پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ طویل خشک سالی میں ان کی زندگی بڑی عسرت اور تنگی میں گزرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بارش‌گر آج بھی بڑی اہم شخصیت ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے ارباب اقتدار، جنھیں سیاح سرداروں اور شیخوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں، اصل میں قبیلے یا برادری کے مینہ برسانے والے ساحر ہیں۔ ان میں ہر شخص کے متعلق یہ خیال ہے کہ اس کے جسم میں ایک عظیم جادوگر کی روح پھنکی ہوئی ہے، جو وراثتاً اس میں منتقل ہوئی ہے۔ اس روحانی وصف کی بدولت کامیاب بارش‌گر کو بڑی طاقت حاصل ہوتی ہے اور تمام اہم امور میں اس سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ تاہم اس عزت و تقدس کے باوجود، یا یوں کہیے کہ خود اس عزت و تقدس کے سبب، اسے کسی جسمانی عارضے سے یا عمر طبعی کو پہنچ کر مرنے نہیں دیا جاتا۔ ان ڈنکا لوگوں کا

عقیدہ ہے کہ اگر ایسا کوئی سانحہ پیش آ جائے تو سارے قبیلے میں بیماری پھیل جائے گی اور کال پڑ جائے گا ، اور ان کے ڈھوروں کے گلے بجے دینا چھوڑ دیں گے ۔ چناں چہ جب کوئی بارش‌کار ساحر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کمزور اور بوڑھا ہو گیا ہے تو اپنے بچوں سے کہہ دیتا ہے کہ وہ مرنا چاہتا ہے ۔ اگار ڈنکا نامی قبیلے میں یہ ہوتا ہے کہ مرنے والے ساحر کے لیے ایک لمبی لحد کھودی جاتی ہے ۔ اس میں وہ لیٹ جاتا ہے اور اس کے اقربا اور احباب اسے گھیر لیتے ہیں ۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر ان لوگوں کے آگے ماضی کے واقعات دہراتا ہے اور انھیں یاد دلاتا ہے کہ اس نے ان پر کس طرح حکومت کی اور کس طرح انھیں نیک مشورے دیے ۔ نیز انھیں بتاتا ہے کہ آئندہ ان کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے ۔ اپنا یہ وعظ ختم کر چکنے کے بعد وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ اس کی قبر ڈھانک دی جائے ۔ اس طرح اسے زندہ درگور کر دیا جاتا ہے ۔ سارے ڈنکا قبیلوں میں جزئی اختلافات کے ساتھ بارش‌گر کا اسی طور سے خاتمہ ہوتا ہے ۔ خورآدر نامی ڈنکاؤں نے ڈاکٹر سلیگمن کو بتایا کہ جب وہ اپنے بارش‌گر کی لحد کھود چکتے ہیں تو گھر ہی میں اس کا گلا گھونٹ ڈالتے ہیں ۔ سلیگمن کو جن لوگوں سے یہ حالات معلوم ہوئے تھے ، ان میں ایک شخص کا باپ اور چچا دونوں بارش‌گر رہ چکے تھے اور دونوں کو اسی باضابطہ اور مروجہ طریقے سے مارا گیا تھا ۔ اگر جسمانی عارضے سے کسی نوجوان بارش‌گر کے بھی مرنے کا امکان ہو تو اسے ہلاک کر دیا جائے گا ۔ نیز اس بات کی سخت احتیاط رکھی جاتی ہے کہ کوئی بارش‌گر کسی حادثے کا شکار ہو کر نہ مرنے پائے ، کیوں کہ اس کے اس طرح مرنے سے بھی ، جو اگرچہ اس کی طبعی موت کے برابر خطرناک نہیں ہوتا ، قبیلے میں بیماری پھوٹ پڑے گی ۔ خیال ہے کہ کسی بارش‌گر کے مرتے ہی اس کی بیش بہا روح اس کے کسی بیٹے یا قریبی رشتے‌دار میں جو اس کی وراثت کے لیے موزوں ہو ، منتقل ہو جاتی ہے ۔

وسطی افریقہ کی سلطنت بینورو میں چند سال پیشتر تک یہ دستور تھا کہ جوں ہی بادشاہ کسی مہلک مرض میں مبتلا ہوتا یا بڑھاپے

گے سبب اس کے قویٰ مضمحل ہونے شروع ہوتے ، اسے خود کشی کر لینی پڑتی ۔ ایک قدیم پیشین گوئی کے بموجب اگر بادشاہ اپنی موت مر جاتا تو حکم ران خاندان کے ہاتھ سے سلطنت کے نکل جانے کا اندیشہ تھا ۔ وہ زہر کا پیالہ پی کر خودکشی کرتا تھا ۔ اگر وہ ایسا کرتے ہوئے ہچکچاتا یا مرض کی شدت کے سبب پیالہ مانگنے کے قابل نہ ہوتا تو اس کی بیوی کا فرض تھا کہ اسے زہر دے ۔ دریائے کانگو کے بالائی علاقے کے شاہ کبانگا کی موت کا وقت قریب نظر آتا ہے تو جادوگر اس کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال دیتے ہیں اور اسے آہستہ آہستہ کستے جاتے ہیں ، تا آں کہ بادشاہ کا کام تمام ہو جاتا ہے ۔ اگر گنگرو کا بادشاہ جنگ میں زخمی ہو جائے تو اس کے ساتھی اسے مار ڈالتے ہیں یا اگر وہ ایسا نہ کر پائیں تو اس کے عزیز اسے ختم کر دیتے ہیں ، خواہ وہ رحم کے لیے کتنا ہی کیوں نہ گڑگڑائے ۔ انھی کے بیان کے بموجب یہ اس لیے کرنا پڑتا ہے کہ کہیں وہ دشمن کے ہاتھوں نہ مارا جائے ۔ نائی جر کے ایک بڑے معاون دریائے بینو کے نواح میں جوکو نامی ایک بت پرست قبیلہ ہے ، جس کے علاقے میں شہر گاتری پر ایک بادشاہ کی حکومت ہے ، جس کا اکابر شہر یوں انتخاب کرتے ہیں : ''جب وہ سمجھتے ہیں کہ بادشاہ کو عنان حکومت سنبھالے بہت مدت ہو گئی ہے تو یہ مشہور کر دیا جاتا ہے کہ ''بادشاہ علیل ہے ۔'' اس اعلان سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اکابر شہر بادشاہ کا کام تمام کرنے والے ہیں ، گو وہ کبھی اپنے ارادے کی صراحت نہیں کرتے ۔ پھر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آئندہ کون بادشاہ ہوگا ؟ اس کی میعاد حکومت کا تعین با اثر لوگوں کی ایک مجلس شوریٰ کرتی ہے ، جس میں ہر رکن ہر سال کے حساب سے ایک ایک چھوٹی سی لکڑی زمین پر پھینک کر یہ رائے دیتا ہے کہ اسے کتنے عرصے حکومت کرنی چاہیے ۔ پھر بادشاہ کو فیصلے سے آگاہ کر دیا جاتا ہے اور ایک بڑے جشن کا انتظام کیا جاتا ہے ، جس میں بادشاہ گنوی جو کی شراب پی کر مست ہو جاتا ہے ۔ اس کے بعد اسے بھالوں کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے ؛ اور وہ شخص ، جس کا انتخاب کیا گیا ہو اس کی جگہ بادشاہ بن جاتا ہے ۔ اس طرح جوکو

قوم کے ہر بادشاہ کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اسے صرف چند ہی سال جینا ہے ، اور اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا بھی وہی انجام ہوگا جو اس کے پیش رو کا ہوا تھا ۔ بااین ہمہ بادشاہت کے امیدوار اس بات سے قطعی نہیں ڈرتے ۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ کشی کا یہ دستور گاتری کی طرح کونڈے اور دکاری میں بھی جاری ہے ۔'' شالی نائی جیریا کی تین ہاوسا سلطنتوں گوبیر ، کاٹسی نا اور داورا میں جیسے ہی بادشاہ کی خرابیٔ صحت اور اضمحلال قویٰ کی علامتیں ظاہر ہوتیں ، ایک عہدہ دار جس کا لقب نسل کش تھا ، اس کے پاس پہنچتا اور اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالتا ۔

انگولا کے اندرونی علاقے کا ایک شہنشاہ ہے ، جو ماتیامو کہلاتا ہے ۔ اسی علاقے کے ایک بادشاہ نے پرتگالی سیاحوں سے ماتیامو کے آخری لمحات کی یہ روداد یوں بیان کی تھی : ''دستور کی رو سے ہمارے ماتیامو یا تو لڑائی میں اپنی جان دیتے ہیں یا مار دیے جاتے ہیں ، اور چوں کہ موجودہ ماتیامو طویل عرصے تک زندہ رہ چکا ہے ، اس لیے کہ اس کے وصول کردہ محاصل حد سے تجاوز کر گئے ہیں ، لہذا اس کا مارا جانا لازمی ہے ۔ جب ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے دن پورے ہو چکے ہیں اور اس کے مارنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو اس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دشمنوں سے جنگ کرے ، جس میں ہم سب اس کے ساتھ ہوتے ہیں اور ہمارے کچھ آدمی بھی کام آ جاتے ہیں ۔ اگر وہ جنگ سے صحیح و سلامت بچ نکلے تو ہم دوبارہ جنگ شروع کر دیتے ہیں اور تین چار دن تک لڑتے رہتے ہیں ۔ پھر اچانک اسے اپنے کنبے سمیت دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ آتے ہیں ۔ وہ اس طرح اپنے کو بے یار و مددگار پا کر وہاں اپنا تخت بچھواتا ہے اور اس پر بیٹھ کر اپنے اہل و عیال کو اپنے اردگرد جمع کر لیتا ہے ۔ پھر اپنی ماں کو پاس بلاتا ہے ، جو اس کے قدموں پر گھٹنوں کے بل جھک جاتی ہے اور وہ سب سے پہلے اس کی گردن مار دیتا ہے ۔ اس کے بعد ایک ایک کرکے اپنے بیٹوں ، پھر بیویوں اور قرابت داروں کا سر قلم کر دیتا ہے اور سب سے آخر میں اس کی چہیتی بیوی ملقب بہ انا کلوکی

باری آتی ہے ۔ اس خوں ریزی کے بعد ماتیامو اپنا خلعت فاخرہ زیب تن کیے خود اپنی موت کا انتظار کرنے لگتا ہے ۔ اسے فوراً ہمسایہ علاقے کے طاقت ور سردار کئی کوینہا اور ادکانیکا اپنے ایک عہدہ دار کے ہاتھوں ٹھکانے لگوا دیتے ہیں ۔ یہ عہدہ دار سب سے پہلے اس کے بازو اور ٹانگیں جوڑوں سے جدا کر دیتا ہے اور آخر میں سر اڑا دیتا ہے ، جس کے بعد خود اس عہدہ دار کی گردن مار دی جاتی ہے ۔ اس کے تابع سارے بادشاہ پڑاؤ سے دور چلے جاتے ہیں تاکہ اس کے قتل کا منظر نہ دیکھ سکیں ۔ یہ میرا فرض ہے کہ وہاں ٹھہرا رہوں ، اس کے قتل کا مشاہدہ اور اس جگہ کی نشان دہی کروں جہاں ماتیامو کے ان دشمن سرداروں نے اس کا سر اور بازو رکھے ہوں ۔ نیز وہ مقتول شہنشاہ اور اس کے اہل و عیال کے سارے مال و متاع پر قبضہ کر کے اسے اپنے گھر لے جاتے ہیں ۔ اس کے بعد میں ماتیامو کی کٹی ہوئی لاش کی تجہیز و تکفین کر کے دارالسلطنت پہنچتا ہوں اور نئی حکومت کے قیام کا اعلان کرتا ہوں ۔ پھر لوٹ کر اس جگہ آتا ہوں جہاں مقتول ماتیامو کا سر ، ٹانگیں اور بازو رکھے ہوں اور چالیس غلام بطور فدیہ لے کر انھیں متوفی شہنشاہ کے مال و جنس کے ساتھ نئے ماتیامو کے حوالے کر دیتا ہوں ۔ یہ تھی ماتیاموں کے انجام کی روداد اور یہی کچھ موجودہ ماتیامو کے ساتھ پیش آنے والا ہے ۔''

غالباً زولؤوں میں یہ دستور رہا تھا کہ بادشاہ کے چہرے پر جھریاں اور سفید بال نمودار ہوتے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا ۔ کم از کم حسب ذیل عبارت سے یہی کچھ ظاہر ہوتا ہے ۔ اس کا لکھنے والا ایک ایسا شخص ہے جو انیسویں صدی کے اوائل میں زولؤوں کے مشہور و معروف اور سفاک سردار چاکا کے دربار میں کچھ عرصہ رہ آیا تھا : ''مجھ پر بادشاہ کے غضب کا سبب ایک عطائی دوا ، یعنی ایک قسم کا سر کا تیل بنا ، جس کے متعلق مسٹر فیرویل نے اسے یہ باور کرا رکھا تھا کہ اس کے اثر سے بڑھاپے کی ساری علامتیں دور ہو جاتی ہیں ۔ جوں ہی اس نے یہ سنا کہ ایسی کوئی دوا دستیاب ہو سکتی ہے اسے اس کے حاصل کرنے کی فکر دامن گیر ہو گئی ۔ ہر موقع

پر وہ ہمیں یہ یاد دلاتا تھا کہ اسے اس تیل کا بڑا فکر ہے ، خاص کر جب ہم اس سے رخصت ہونے لگے تو اس نے اپنے احکام میں اس چیز کے متعلق خاص طور پر تاکید کی تھی ۔ زولا اپنے ایک وحشیانہ دستور کے بموجب بادشاہ کے انتخاب میں اس بات کا سخت خیال رکھتے ہیں کہ اس کے جھریاں اور سفید بال نہ ہوں ، کیوں کہ یہ دونوں علامتیں ان جیسی جنگ جو قوم کے بادشاہ کی نا اہلی کی خاص دلیل ہیں ۔ ساتھ ہی بادشاہ کے لیے اسی قدر ضروری ہے کہ وہ اپنی نا اہلی یا از کار رفتگی کی ان علامتوں کو ظاہر نہ ہونے دے ۔ لہذا ان کے نزدیک جب تک ہو سکے ان آثار پیری کا چھپائے رکھنا بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ چاکا کو سخت تشویش تھی کہ اس کا سن کہولت شروع ہونے والا ہے ، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اس جہان فانی سے اس کے رخصت ہونے کا وقت آ چکا ہے ، کیوں کہ آغاز کہولت کے بعد بادشاہ کی قضا آ جاتی تھی ۔'' سر کے تیل کے بارے میں اس سبق آموز قصے کے لیے ہم جس مصنف کے رہین منت ہیں اس نے اس چیز کی کوئی صراحت نہیں کی کہ سفید بالوں اور جھریوں کے ظاہر ہونے پر زولو سردار اس جہان فانی سے کس طرح رخصت ہوا کرتا تھا ، لیکن نظائر کی بناء پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسے مار دیا جاتا تھا ۔

دو صدی قبل کافروں کی سلطنت صوفالا میں یہ دستور تھا کہ بادشاہوں میں کسی جسمانی نقص کے پیدا ہوتے ہی انہیں ہلاک کر دیا جاتا تھا ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شاہان صوفالا کو ان کی قوم دیوتا سمجھتی تھی ، اور حسب ضرورت ان سے التجا کی جاتی تھی کہ وہ مینہ برسائیں یا دھوپ نکالیں ۔ تاہم ، جیسا کہ ایک پرتگالی مورخ کے مندرجہ ذیل بیان سے پتہ چلتا ہے ، ان میں سے کسی انسان دیوتا کے اندر ذرا سا جسمانی عیب پیدا ہو جانا ، مثلاً ایک دانت کا بھی جاتے رہنا ، اسے مار ڈالنے کے لیے کافی تھا : ''اگلے زمانے میں اس ملک کے بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے یا ان کے جسم میں کوئی قدرتی عیب پیدا ہو جاتا ، مثلاً رجولیت سے محروم ہو جاتے یا انہیں کوئی متعدی مرض لاحق ہو جاتا یا ان کا

اگلا دانت گر جاتا اور اس کی وجہ سے ان کی شکل مسخ ہو جاتی ، یا ان میں کوئی اور نقص یا تکلیف پیدا ہو جاتی تو وہ زہر کھا کر خود کشی کر لیتے تھے ۔ ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو مار ڈالتے تھے کہ بادشاہ کو ہر عیب سے پاک ہونا چاہیے ، ورنہ اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنی عزت کی خاطر مر جائے اور دوسرے عالم کی زندگی حاصل کرنے کی کوشش کرے ، جس میں وہ صحیح و سالم ہوگا ؛ اس لیے کہ وہاں ہر چیز کامل و بے نقص ہوتی ہے ۔ لیکن میری موجودگی میں وہاں جس خدیو کی حکومت تھی وہ بڑا ذی فہم آدمی تھا اور لوگ اس سے بہت مرعوب تھے ، اسے اپنے پیش روؤں کے اس دستور کی کوئی پروا نہیں تھی ۔ چناں چہ اس کا ایک اگلا دانت گر گیا تو اس نے اپنی قلم رو میں منادی کرا دی کہ لوگ سب خبردار ہو جائیں ، اس کا ایک اگلا دانت جاتا رہا ہے اور جب وہ اسے اس حالت میں دیکھیں تو پہچان لیں ۔ نیز اگر اس کے پیش رو اتنی سی بات پر خود کشی کر لیتے تھے تو وہ بڑے احمق تھے ، وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا ، بلکہ اس کے برعکس جب اس کی قضا آئے گی تو اسے بڑا رنج ہوگا ، اس لیے کہ اس کی زندگی سلطنت کے تحفظ و دفاع کے لیے ضروری ہے اور اس نے اپنے جانشینوں کو نصیحت کی کہ وہ اسی کے نقش قدم پر چلیں ۔'' صوفالا کا یہ بادشاہ ، جس نے اپنا دانت گرنے کے بعد زندہ رہنے کی جرأت کی تھی ، شاہ حبش ارگمنیس کی طرح بڑا دلیر مصلح تھا ۔ یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ صوفالی اور زولوی بادشاہوں کی طرح شاہان حبش کے قتل کی بناء بھی جسمانی نقص یا انحطاط کے آثار تھے اور اس ندائے غیب کا مطلب ، جسے آئمۂ مذہب بہ زعم خود قتل شاہی کا جواز قرار دیتے تھے ، یہ تھا کہ کسی ناقص الجسم بادشاہ کی حکومت کے سبب ملک پر آفتیں نازل ہو جائیں گی ۔ اس کی مثال بالکل اس غیبی آواز کی سی ہے ، جس نے اہل اسپارٹا کو ''لنگڑی حکومت'' یا شاہ لنگ کی حکومت کے خطرے سے متنبہ کیا تھا ۔ ہمارے اس قیاس کی تصدیق کسی حد تک اس امر سے ہوتی ہے کہ شاہان حبش کے قتل کا دستور ختم ہونے سے مدتوں

پیشتر تک انہیں جثے ، طاقت اور خوب صورتی کی بناء پر منتخب کیا جاتا تھا ۔ سلطان وادائی کے لیے آج بھی یہ ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے جسمانی عیب سے پاک ہو اور اگر شاہ انگوئے کے جسم میں خفیف سا نقص بھی ہو ، مثلاً اس کا کوئی دانت ٹوٹا یا گھسا ہوا ہو ، یا بدن پر کسی پرانے زخم کا داغ باقی رہ گیا ہو تو وہ سریر آرائے سلطنت نہیں ہو سکتا ۔ کتاب اکیل اور دوسرے بہت سے مستند شواہد کے بموجب ٹارا میں کوئی ناقص الجسم بادشاہ آئرستان پر حکومت نہیں کر سکتا تھا ، اسی لیے جب ایک حادثے میں وہاں کے جلیل القدر بادشاہ ماک میک آرٹ کی ایک آنکھ جاتی رہی تو وہ تخت و تاج سے دست بردار ہو گیا ۔

داہومی کے قدیم دارالسلطنت ابومی کے شمال مشرق میں کئی دن کے فاصلے پر سلطنت آیو واقع ہے ''آیو قوم پر ایک بادشاہ کی حکومت ہے جو داہومی کے بادشاہ سے کم مطلق العنان نہیں ۔ لیکن اس پر ایک ایسا ضابطہ عاید ہے جو شرم ناک بھی ہے اور عجیب بھی ؛ جب لوگ اس کی حکومت کے متعلق بری رائے قائم کر لیتے ہیں ، جو بعض وقت اس کے ناخوش وزیروں کی سازش کا نتیجہ ہوتی ہے تو وہ اس کی خدمت میں ایک وفد اور اس کے ہاتھ نشان توثیق کے طور پر طوطے کے انڈوں کی نذر بھیجتے ہیں تاکہ اس سے یہ گزارش کی جائے کہ سلطنت کے بارگراں نے اسے تھکا دیا ہوگا اور اس لیے اب ان کی رائے میں وقت آ چکا ہے کہ وہ تمام افکار سے آزاد ہو کر کچھ آرام فرما لے ۔ وہ اپنے آرام کی طرف رعایا کی اس توجہ کا شکریہ ادا کرکے اپنے حجرے میں اسی طرح چلا جاتا ہے جیسے سونا چاہتا ہو اور اس میں پہنچ کر اہل حرم کو حکم دیتا ہے کہ اسے پھانسی دے دی جائے ۔ اس کی فی الفور تعمیل کر دی جاتی ہے اور اس کا بیٹا انہی مقررہ شرائط پر کہ اس کی میعاد حکومت رعایا کی منظوری پر منحصر ہوگی ، چپ چاپ تخت و تاج سنبھال لیتا ہے ۔ ۱۷۷۴ء کے لگ بھگ اس سلطنت آیو کے ایک فرماں روا نے طوطے کے انڈوں کی پیش کش قبول کرنے سے یہ کہتے ہوئے صاف انکار کر دیا کہ وہ سونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ، بلکہ

اس کے برعکس اس نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنی رعیت کی خبرگیری کرتا رہے ۔ وزیروں نے جنھیں اس کی اس ہٹ دھرمی پر بڑا تعجب اور غصہ تھا ، علم بغاوت بلند کر دیا ۔ لیکن بادشاہ نے بڑے قتل و خون ریزی کے بعد انھیں شکست دی اور اس طرح اپنے دلیرانہ اجتہاد سے مشیروں کے جبر و استبداد سے چھٹکارا حاصل کرکے اپنے جانشینوں کے لیے ایک مثال قائم کر دی ۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دستور پر پھر عمل درآمد ہونے لگا اور وہ انیسویں صدی کے اواخر تک جاری رہا ۔ چناں چہ ۱۸۸۴ء میں ایک کیتھولک مبلغ نے لکھا تھا کہ یہ رواج اس وقت تک موجود تھا ۔ ایک اور مبلغ ۱۸۸۱ء میں مغربی افریقہ کی ایگبا اور یوریبا نامی قوموں کے دستور کا حال قلم بند کرتے ہوئے بیان کرتا ہے ۔ ''اس ملک کا ایک عجیب ترین دستور بلاشبہ وہ ہے جس کے بموجب بادشاہ کو سزا کا حکم سنایا جاتا اور اس کی تعمیل کی جاتی ہے ۔ اگر وہ اپنے حقوق سے تجاوز کرکے لوگوں کو ناراض کر دے تو اس کا ایک مشیر ، جس کے ذمے یہ ناگوار فرض ہوتا ہے ، اسے ہدایت کرتا ہے کہ وہ ''جا کر سو رہے'' جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ''زہر کھا کر مر جائے ۔'' اگر عین وقت پر بادشاہ کی ہمت جواب دے جائے تو اس کا کوئی دوست اس کی یہ آخری خدمت بجا لاتا ہے ۔ اس کے بعد اس راز کو ظاہر کیے بغیر بڑی خاموشی سے لوگوں کو بادشاہ کے انتقال کی خبر سنا دی جاتی ہے ۔ یوروبا میں اس کی صورت قدرے مختلف ہے ۔ شاہ اویو کے ہاں جب کوئی لڑکا پیدا ہوتا ہے تو چکنی مٹی میں اس کے پاؤں کی ایک شبیہ بنا کر اسے ایوان اکابر (اوگبونی) میں رکھ دیا جاتا ہے ۔ اگر بادشاہ ملک کے رسم و رواج سے انحراف کرے تو ایک قاصد اس کے پاس پہنچتا ہے اور منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر اسے بچے کا وہ قدم دکھا دیتا ہے ۔ بادشاہ سمجھ جاتا ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے اور زہر کھا کر سو رہتا ہے ۔ اگلے زمانے میں اہل پروشیاء کا ایک فرماں روا حاکم مطلق مانا جاتا تھا ، جو ان پر دیوتاؤں کے نام سے حکومت کرتا تھا اور جو ''دھن الٰہی'' کے لقب سے ملقب تھا ۔ جب اسے بیماری یا کم زوری کا احساس ہوتا اور اگر وہ یہ چاہتا

کہ مرنے کے بعد لوگ اسے اچھے نام سے یاد کریں تو گھاس پھوس اور خاردار جھاڑیوں کا انبار لگواتا اور اس پر چڑھ کر لوگوں کے آگے ایک طولانی خطبہ دیتا ، جس میں انھیں نصیحت کرتا کہ وہ دیوتاؤں کی بندگی کرتے رہیں اور ان سے وعدہ کرتا کہ دیوتاؤں کے پاس پہنچ کر وہ ان سے لوگوں کی سفارش کرے گا ۔ اس کے بعد اس آگ میں سے کچھ انگارے لے کر جو مقدس بلوط کے آگے سدا روشن رہتی ، گھاس پھوس کے اس تودے میں آگ لگا دیتا اور اس میں جل کر بھسم ہو جاتا ۔

## (۳) مقررہ میعاد کے اختتام پر بادشاہوں کا قتل—

اب تک شاہ کشی کی جو صورتیں بیان ہوئی ہیں ان میں یہ ہوتا ہے کہ جب تک کسی مقدس بادشاہ یا مذہبی پیشوا کا کوئی جسمانی عیب یا انحطاط کی علامت نمودار ہو کر اس کی قوم کو متنبہ نہ کر دے کہ وہ اپنے فرائض الوہی کا اہل نہیں رہا ہے ، اسے اپنے عہدے پر فائز رکھا جاتا ہے ، اور جب تک ایسی کوئی علامت ظاہر نہ ہو جائے اسے قتل نہیں کیا جاتا ۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ بعض قومیں بادشاہ کے طبعی انحطاط کے خفیف سے آثار کے نمودار ہونے تک بھی ٹھہرنا خطرناک سمجھتی رہی ہیں اور اسے صحت و توانائی ہی کی حالت میں قتل کر دینا مناسب خیال کرتی رہی ہیں ۔ چناں چہ انھوں نے بادشاہ کی حکومت کے لیے ایک خاص میعاد مقرر کر رکھی ہے ، جس کے اختتام پر اس کا مرنا ضروری ہے ۔ یہ میعاد اتنی مختصر رکھی جاتی ہے کہ اس کے دوران میں بادشاہ کے جسمانی انحطاط کا کوئی احتمال نہیں رہتا ۔ جنوبی ہند کے بعض حصوں میں یہ بارہ سال تک محدود تھی ۔ چناں چہ ایک قدیم سیاح کے بیان کے بموجب صوبہ کلاکیر میں ''ایک بت خانہ ہے ، جس میں ایک مقدس مورتی رکھی ہے ۔ ہر بارھویں سال اس کی ایک بڑی یاترا ہوتی ہے ، جس میں سارے شرفاء شریک ہوتے ہیں ۔ اس مندر کے لیے بڑی زمین اور محاصل وقف ہیں ۔ مذکورہ بالا صوبے پر ایک راجا کی حکومت ہے ، جس کے راج کی مدت بارہ سال ، یعنی ایک تیوہار سے دوسرے تیوہار تک مقرر ہے ۔ اس کی زندگی کی روداد یہ ہے کہ

جب بارہ سال گزر چکتے ہیں تو مذکورہ بالا تیوہار کے دن بے شمار لوگ جمع ہوتے ہیں اور برہمنوں کو کھانا کھلانے پر بڑا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے ۔ بادشاہ کے لیے سولی کا تختہ نصب کر دیا جاتا ہے ، جو ریشمی پھانسیوں سے ڈھکا ہوتا ہے ۔ اس دن وہ بڑی دھوم دھام اور باجے گاجے کے ساتھ تالاب پر اشنان کے لیے جاتا ہے ، پھر بت خانے آتا ہے، مورتی کی پوجا کرتا ہے اور اس کے بعد دار کے تختے پر چڑھ جاتا ہے اور مجمع کے سامنے تیز خنجر لے کر اپنی ناک ، پھر کان ، پھر ہونٹ اور اس طرح باری باری اور تمام اعضا کاٹنے لگتا ہے ۔ جسم کا گوشت چھانٹ چھانٹ کر جلدی جلدی پھینکتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جسم سے اتنا خون بہہ نکلتا ہے کہ اس پر غشی طاری ہونے لگتی ہے، اور اس لمحے وہ اپنے گلے پر چھری پھیر لیتا ہے ۔ اس صورت سے وہ اپنی جان اس بت پر سے قربان کر دیتا ہے اور اس شخص کو ، جو آئندہ بارہ سال تک حکومت اور بت کی محبت میں جام شہادت پینے کا متمنی ہو ، یہ منظر دیکھنے کے لیے وہاں حاضر رہنا پڑتا ہے ، اور یہیں سے اس کو راجا بنا کر لے جایا جاتا ہے ۔''

ساحل مالابار پر کالی کٹ کا راجا ملقب بہ سامورین یا ساموری ہے ۔ ''اس کا مرتبہ بزعم خود برہمنوں سے بھی بلند ہے اور ان دیکھے دیوتاؤں کے سوا کوئی اس سے برتر نہیں ۔ اس دعوے کو اس کی رعایا تسلیم کرتی ہے ۔ لیکن برہمن جن کے نزدیک اس کی حیثیت ایک شودر سے زیادہ نہیں ، اس کے اس دعوے پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اسے لغو سمجھتے ہیں ۔'' اس سامورین کو کبھی اپنے عہد حکومت کے بارہ سال ختم ہونے پر گلا کاٹ کر خود کشی کر لینی پڑتی تھی ، لیکن سترھویں صدی کے آخر میں اس دستور میں حسب ذیل ترمیم کی گئی : ''کبھی اس ملک میں بہت سے عجیب و غریب دستور جاری تھے اور بعض تو اب تک موجود ہیں ۔ قدیم دستور یہ تھا کہ سامورین صرف بارہ سال راج کرے اور بس ۔ اگر وہ اس میعاد کے اختتام سے پہلے مر جاتا تو اپنے آپ کو مجمع کے سامنے دار کے تختے پر ذبح کرنے کی اذیت سے بچ جاتا ، جو اس غرض سے خاص طور پر نصب

کیا جاتا تھا - وہ پہلے اپنے تمام عمائد و اشراف کی ضیافت کرتا ، جو کثیر تعداد میں ہیں - اس جشن کے بعد اپنے مہمانوں کو سلام کرتا اور دار کے تختے پر چڑھ کر مجمع کے سامنے بڑی صفائی سے گلا کاٹ لیتا - اس کے بعد اس کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھتا اور اس کے امراء یا ایک نیا سامورین منتخب کر لیتے - آیا اس رسم کی نوعیت مذہبی تھی سول ، مجھے خبر نہیں ، لیکن اب اسے ترک کر دیا گیا ہے اور سامورینوں نے اس کی جگہ ایک نیا دستور اختیار کر لیا ہے ، جو یہ ہے کہ بارہ سال گزرنے پر ساری قلم رو میں اس کی جوبلی کی منادی کرا دی جاتی ہے - راجا کے لیے وسیع میدان میں خیمہ نصب کر دیا جاتا ہے اور دس یا بارہ دن تک ایک بڑا جشن منایا جاتا ہے جس میں خوب داد عیش دی جاتی ہے اور رات دن بندوقیں داغی جاتی ہیں - پھر جشن کے اختتام پر ایسے چار مہانوں کو جو تخت و تاج حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ، جان کی بازی لگا کر سامورین کی تیس یا چالیس ہزار محافظ سپاہ میں سے لڑتے بھڑتے اس کے خیمے تک پہنچنا اور اسے قتل کرنا پڑتا ہے - اس میں جسے کامیابی ہوتی ہے وہ نیا سامورین بن جاتا ہے - ۱۶۹۵ء میں ایسی ایک جوبلی منائی گئی تھی - کالی کٹ کے جنوب میں کوئی پانچ فرسخ کے فاصلے پر راجا کی ایک بندرگاہ نپائی کے قریب خیمہ نصب کیا گیا - صرف تین من چلے جان پر کھیلنے کے لیے تیار ہوئے اور کیل کانٹے سے لیس ہو کر حافظ دستے میں گھس پڑے اور بہت سوں کو قتل اور زخمی کرنے کے بعدخود بھی مارے گئے - ان جان بازوں میں ایک شخص کا پندرہ یا سولہ سالہ ایک بھتیجا تھا ، جو اس حملے میں اس کے پیچھے لگا چلا جاتا تھا ؛ جب اس نے اپنے چچا کو گرتے ہوئے دیکھا تو سپاہیوں کی صفیں چیرتا ہوا خیمے میں گھس گیا اور جلالت مآب مہاراجا کے سر پر ایک وار ایسا کیا کہ اگر اس کے سر پر جلتا ہوا ایک پتلی چراغ بیچ میں نہ ہوتا تو مہاراجا کا کام تمام ہو جاتا ؛ لیکن قبل اس کے کہ وہ دوسری ضرب لگاتا ، پہرے کے سپاہیوں نے اسے قتل کر ڈالا - میرے خیال میں ابھی تک وہی سامورین راج کر رہا ہے - اس وقت میں اتفاق سے اس ساحل کے قریب جا نکلا تھا اور مجھے

دو یا تین دن تک شب و روز بندوقیں چلنے کا شور سنائی دیتا رہا تھا۔''

جس انگریز سیاح کے بیان کا یہ اقتباس میں نے پیش کیا ہے اس نے اس تیوہار کو بہ چشم خود نہیں دیکھا تھا ، اگرچہ اسے کچھ فاصلے سے بندوقوں کا شور سنائی دیا تھا۔ خوش قسمتی سے ان تیوہاروں کا صحیح حال اور مقتولوں کی صحیح تعداد کالی کٹ کے خاندان وادۂ شاہی کے محافظ خانے کی دستاویزات میں محفوظ ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں مسٹر ڈبلیو۔ لوگن نے ان دستاویزات کا معائنہ کیا تھا ، جس میں فرماں روائے وقت نے بہ نفس نفیس ان کی اعانت کی تھی۔ لوگن صاحب کی تصنیف کی روشنی میں اس الم ناک رسم اور اس خاص مقام کا صحیح نقشہ کھینچنا ممکن ہے ، جہاں وہ ۱۷۴۳ء تک ادا کی جاتی رہی اور جس کے بعد ترک کر دی گئی۔

وہ تیوہار جس میں کالی کٹ کا راجا لڑائی کے نتیجے پر اپنے تخت و تاج اور جان کی بازی لگا دیتا تھا ، ''بڑی قربانی'' کہلاتا تھا۔ ہر بارھویں سال جب مشتری بکرم کے مہینے میں برج سرطان میں رجعت کرتا تو یہ تیوہار منایا جاتا۔ یہ اٹھائیس دن جاری رہتا اور چاند کے آٹھویں نچھتر کے وقت ختم ہو جاتا۔ چوں کہ تیوہار کی تاریخ آسمان پر مشتری کی حالت کے لحاظ سے معین کی جاتی اور دو تیوہاروں کے درمیان بارہ سال کا وقفہ ہوتا ، جو آفتاب کے گرد مشتری کی تقریباً ایک گردش کے برابر ہے ، لہٰذا یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ یہ پر شکوہ میلہ خاص مفہوم میں راجا کی قسمت کا ستارہ متصور ہوتا تھا ، جس کی آسمان پر گردش زمین پر بادشاہ کے عہد حکومت سے مطابقت رکھتی تھی۔ بات خواہ کچھ ہی ہو ، یہ رسم دریائے پونانی کے شمالی کنارے پر ترنوائی کے مندر میں بڑی دھوم دھام سے ادا کی جاتی تھی۔ یہ جگہ موجودہ ریل کی پٹری سے قریب ہے اور دوڑتی ہوئی گاڑی میں سے اس مندر کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی ہے جسے درختوں کا ایک جھنڈ اپنے پیچھے چھپائے کھڑا ہے۔ مندر کے مغربی دروازے سے ایک سڑک نصف میل لمبی ، جس کی سطح آس پاس کے دھان کے کھیتوں کے برابر

ہے اور جس کی دونوں جانب درختوں کی قطاریں ہیں جو سیدھوں سیدھ ایک ماہی پشت ٹیلے تک چلی گئی ہے ، جس کا ایک پہلو بالکل ڈھلوان ہے ۔ اس پر تین یا چار چبوتروں کے نشان آج بھی ملتے ہیں ۔ انھی میں سب سے اونچے چبوترے پر راجا اس ہنگامے کے دن کھڑا ہوا کرتا تھا ۔ اس چبوترے سے بڑا دل کش منظر نظر آتا ہے ۔ دور دور تک دھان کے ہموار کھیت پھیلے ہوئے ہیں ، جن میں سے پونانی کا چوڑا پاٹ سکون کے ساتھ لہراتا چلا گیا ہے ۔ کھیتوں کی مشرق سمت سطح مرتفع کے نشیب و فراز نظر آتے ہیں ، جس کی نچلی ڈھلانوں پر بن چھائے ہوئے ہیں اور اس سے پرے جہاں تک نگاہ جاتی ہے ، کوہ نیل گری سپہر کبود سے ہم کنار ہے ۔

لیکن ظاہر ہے کہ اپنی زندگی کے ان نازک لمحات میں یہ دور کے نظارے راجا کے لیے کوئی کشش نہ رکھتے تھے ۔ اس کی توجہ کا مرکز تو وہ منظر تھا جو اس کے گرد و پیش نظر آتا تھا ۔ نیچے سارے میدان میں سپاہیوں کی گہما گہمی ہوتی جن کے پرچم سورج کی کرنوں میں لہراتے رہتے اور جن کے پڑاؤ کے سفید سفید خیمے دھان کے ہرے بھرے کھیتوں کے بالمقابل نمایاں نظر آتے ۔ چالیس ہزار یا اس سے بھی زائد سپاہیوں کی جمعیت راجا کی حفاظت کے لیے متعین ہوتی ۔ لیکن اگر میدان میں سپاہیوں کی ریل پیل رہتی تو سڑک پر جو اسے کاٹتی چلی گئی ہے ، بالکل سناٹا ہوتا اور ایک متنفس بھی حرکت کرتا نظر نہ آتا ۔ اس کی دونوں جانب جنگلا لگا تھا اور اس دو رویہ جنگلے پر سے سپاہی اپنے آہنی ہاتھوں میں سڑک کے اوپر نیزے اٹھائے کھڑے رہتے ، جن کی جگمگاتی انیاں مل کر اس پر فولاد کی ایک کمان سی چھادیتیں ۔ اس کے بعد گویا ہر چیز تیار تھی ۔ راجا اپنی تلوار گھما دیتا اور اسی لمحے راجا کے برابر ایک ہاتھی پر ایک بھاری زنجیر چڑھا دی جاتی ، جو ایک اشارہ تھا ۔ اس کے ساتھ ہی نصف میل دور مندر کے دروازے پر کچھ حرکت نظر آتی ۔ یہ چند تیغ زن ہیں جو بھبھوت ملے اور پھولوں میں لدے مجمع میں سے نکلے ہیں ۔ یہ ابھی ابھی اس عالم فانی میں اپنے آخری کھانے سے فارغ ہوئے ہیں اور اب دوستوں

اور قرابت داروں سے وداع ہو رہے ہیں ۔ لمحہ بھر کے بعد یہ نیزوں والی سڑک پر آتے ہیں اور دائیں بائیں داد شجاعت دیتے اور اپنے سپاہیانہ کمالات کا مظاہرہ کرتے آگے بڑھتے ہیں ؛ لیکن ان کی یہ جان بازیاں ان کے کچھ کام نہ آئیں ۔ وہ سب یکے بعد دیگرے کٹ کٹ کر گرتے جاتے ہیں ۔ کوئی راجا کے قریب پہنچ کر گرتا ہے ، کوئی دور ہی کھیت رہتا ہے ، لیکن وہ سب کے سب داعیٔ اجل کو بہ سکون قلب لبیک کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے دنیا پر اپنی جواں مردی اور سپاہیانہ مہارت ثابت کر دکھائی ۔ ہر تیوہار کے آخری دنوں میں بار بار اسی طرح شجاعت کا مظاہرہ کیا جاتا اور اسی طرح بے سود جانیں قربان کی جاتیں ۔ تاہم شاید ایسی کوئی قربانی بالکل رائگاں بھی نہیں جاتی جس سے یہ ثابت ہو کہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی نظر میں عزت و ناموس کے آگے زندگی کی کوئی وقعت نہیں ۔

ایک ہندوستانی مورخ کہتا ہے ''بنگال میں ایک انوکھا دستور یہ ہے کہ یہاں بادشاہت موروثی چیز نہیں ہے ، بلکہ جو بھی شخص فرماں روا کو قتل کر کے تخت و تاج پر قبضہ کر لے وہ بادشاہ تسلیم کر لیا جاتا ہے ۔ اس کے امیر ، وزیر ، سپاہی ، کسان ، سب فوراً اس کی اطاعت اسی طرح کرنے لگتے ہیں جس طرح سابق فرماں روا کی کیا کرتے ہوں اور اس کے احکام کی پوری پوری تعمیل کرتے ہیں ۔ بنگالیوں کا کہنا ہے کہ وہ گدی کے وفادار ہیں اور جو شخص بھی اس پر جلوس کرے اس کے سچے دل سے اطاعت گزار ہیں ۔'' سوماٹرا کے شمالی ساحل پر پاسیر کی چھوٹی سی سلطنت میں بھی کبھی ایسا ہی ایک دستور تھا ۔ قدیم پرتگالی مورخ ڈی باروس ، جس نے اس دستور کی کیفیت قلم بند کی ہے ، بڑے تعجب سے کہتا ہے کہ کوئی دانش مند آدمی شاہ پاسیر بننا پسند نہیں کرتا ، اس لیے کہ بادشاہوں کو ان کی رعیت زیادہ عرصہ زندہ رہنے نہیں دیتی ۔ وقتاً فوقتاً لوگ غضب ناک ہو کر شہر کے گلی کوچوں میں ''بادشاہ مردہ باد'' کے نعرے لگاتے نکلتے ہیں ۔ بادشاہ اس نعرۂ اجل کو سن کر سمجھ جاتا

ہے کہ اس کے دن پورے ہو چکے ۔ جو شخص اپنی ضرب کاری سے بادشاہ کو موت کے گھاٹ اتارتا وہ خانوادۂ شاہی کا ایک فرد ہوتا ۔ یہ خود اپنے ہاتھ بادشاہ کے خون میں رنگ کر تخت پر بیٹھ جاتا اور ملک کا جائز بادشاہ تسلیم کر لیا جاتا ۔ لیکن شرط یہ تھی کہ وہ اپنے حسن تدبیر سے ایک دن سکون کے ساتھ تخت پر قابض رہے ۔ تاہم اس میں بادشاہ کے قاتل کو ہمیشہ کام یابی نہیں ہوتی ۔ جب فرناؤ پیریس ڈانڈراڈا چین جاتے ہوئے جہاز پر گرم مسالہ لدوانے پاسیر میں رکا تھا تو دو بادشاہ نہایت سکون اور نظم و ضبط کے ساتھ قتل کیے گئے تھے ۔ اس موقع پر شہر میں ذرا سی بھی شورش نہ ہوئی اور سارے کام اسی طرح بہ دستور جاری رہے کہ گویا بادشاہ کا مارا جانا یا سولی پانا بھی روزمرہ کا ایک معمولی واقعہ تھا ۔ ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ تین بادشاہ اس خطرناک منصب عالی پر فائز اور ایک ہی دن میں یکے بعد دیگرے راہیٔ ملک عدم ہوئے ۔ لوگ اس دستور کو قابل تحسین بلکہ من جانب اللہ سمجھتے تھے اور اس کی حمایت میں یہ کہتے تھے کہ خدائے تعالیٰ بادشاہ جیسی جلیل القدر ہستی کو ، جو اس کے نائب کی حیثیت سے زمین پر حکومت کرتا ہے ، کبھی ہلاک نہیں ہونے دیتا ، جب تک کہ بادشاہ اپنے گناہوں کی وجہ سے اس سزا کا مستوجب نہ ہو ۔ اسی قسم کا ایک دستور سوماٹرا کے حاری جزیرے سے بہت دور ملاقیوں کے ہاں بھی پایا جاتا تھا ۔ جب گن اور جارمیرک نامی دو قیدیوں نے ملاقیوں کے بادشاہ اور ملکہ کو چالاکی سے قتل کرکے راہ فرار اختیار کی تو یہ وحشی ان کے پیچھے یوں چیختے ہوئے دوڑے کہ وہ لوٹ آئیں تو مقتول بادشاہ کی جگہ حکومت کرنے لگیں گے کیوں کہ قدیم قانون کی رو سے بادشاہ کا قاتل تخت و تاج کا وارث قرار پاتا ہے ، مگر مغرور قاتلوں نے ایک نہ سنی ۔ وہ ان باتوں کو دام تزویر سمجھ کر بھاگتے چلے گئے اور وحشیوں کے شور سے دور نکل گئے ۔

جب مقررہ میعاد کے انقضاء پر بادشاہوں کی خود کشی یا قتل لازمی تھا تو ان کے لیے اپنے فرض کا بارگراں مع چند شاہی حقوق

کے کسی قائم مقام کو سونپ کر اپنی بلا اس کے سر منڈھنے کی کوشش کرنا قدرتی بات تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس حکمت عملی سے مالابار کے بعض رؤسا کام لیتے رہے ہیں ۔ چناں چہ ایک معتبر ملکی مصنف اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہے : ''بعض مقامات پر انتظامی اور عدالتی اختیارات مقررہ میعاد کے لیے بادشاہ کی جانب سے دیس کے باشندوں کے سپرد کر دیے جاتے تھے ۔ اختیار حاصل کرنے کی یہ صورت ''صلۂ سرفروشی'' کہلاتی تھی ــــ یہ ایک عہدہ تھا جس کی میعاد پانچ سال تھی ۔ اس کے دوران میں عہدے کا حامل اپنے دائرۂ اختیار میں مطلق العنان ہوتا ۔ پانچ سال کے اختتام پر اس کی گردن مار دی جاتی اور سر دیہاتیوں کے مجمع میں اچھال دیا جاتا ، جس میں ہر شخص اسے دبوچنے کی کوشش کرتا اور جو اسے لپک لینے میں کام یاب ہو جاتا وہ آیندہ پانچ سال کے لیے مذکورہ بالا عہدے پر مقرر کر دیا جاتا ۔''

جب ایک دفعہ اس قسم کے میعادی بادشاہوں کو دوسروں کی وساطت سے مرنے کی ترکیب سوجھ گئی ہو تو وہ بھلا اسے عملی جامہ پہنانے میں کب چوکے ہوں گے ۔ اسی لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ، جو یہ حکمت عملی یا اس کے آثار بہت سے ملکوں میں پائے جائیں ۔ اسکینڈی نیویا کی روایت میں سویڈن کے قدیم بادشاہوں کی نو سالہ میعاد حکومت کے بارے میں اشارے ملتے ہیں ، جس کے بعد یا تو وہ خود ٹھکانے لگا دیے جاتے یا انھیں ان کی جگہ مرنے کے لیے کسی قائم مقام کو ڈھونڈنا پڑتا ۔ چناں چہ آن یا اون نامی شاہ سویڈن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اوڈن (شمالی یورپ کی دیومالا میں سب سے بڑا دیوتا اور خالق) کو مدتوں اپنے بیٹوں کی قربانی دیتا رہا ، جس پر اسے دیوتا کا جواب ملا کہ جب تک وہ ہر نویں سال اپنے ایک بیٹے کو بھینٹ چڑھاتا رہے گا ، زندہ رکھا جائے گا ۔ چناں چہ اس نے اپنے نو بیٹوں کو قربان کر دیا اور وہ دسویں بیٹے کو بھی اسی طرح بھینٹ چڑھا دیتا ، لیکن سویڈیوں نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا ۔ لہذا وہ مر گیا اور اپسالا میں خاک کے ایک تودے کے اندر دفن کیا گیا ۔ اسی قسم کی میعادی بادشاہت کے بارے میں ایک اشارہ اوڈن کی معزولی اور جلاوطنی کے عجیب و غریب قصے

میں ملتا ہے ، وہ یوں ہے کہ اوڈن کی بد اعمالیوں پر ناراض ہو کر دوسرے دیوتاؤں نے اسے باغی قرار دے دیا اور خارج البلد کر دیا ، اور اوسر نامی ایک عیار ساحر کو اس کا قائم مقام بنا دیا ۔ اسے انھوں نے شاہی اور خدائی دونوں کے نشانات امتیاز عطا کیے ۔ یہ قائم مقام فرماں روا اوڈن ہی کے لقب سے دس برس تک حکومت کرتا رہا ، جس کے بعد اصلی اوڈن بحال ہوا تو اسے تخت سے اتار دیا گیا ۔ پھر اوڈن کا یہ حریف ہزیمت اٹھا کر سویڈن چلا گیا اور کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش میں مارا گیا ۔ چوں کہ دیوتا انسان ہی ہیں ، جو روایت کی دھند میں فوق البشر دکھائی دیتے ہیں ، لہذا یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ اس ناروی قصے میں ان قدیم سویڈنی بادشاہوں کی ایک الجھی ہوئی سی سرگزشت محفوظ چلی آئی ہے ، جو مسلسل نو یا دس برس تک حکومت کیا کرتے اور پھر تخت و تاج سے دست بردار ہو کر ملک و ملت کی خاطر جان دینے کا امتیازی حق دوسروں کے سر منڈھ جاتے تھے ۔ بادشاہ یا اس کے نائب کو اس بڑے تیوہار کے موقع پر قتل کیا جاتا ہوگا ، جو ہر نویں سال منایا جاتا تھا ۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس تیوہار کی رسوم میں انسانی قربانیاں بھی شامل تھیں ۔

یونان قدیم کے بادشاہوں کے متعلق یہ تسلیم کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ ان کا عہد حکومت آٹھ سال تک محدود تھا ، یا کم از کم آٹھ آٹھ برس کے بعد ان کی تقدیس نو ضروری تصور کی جاتی تھی ، تاکہ وہ اپنے سول اور مذہبی فرائض انجام دینے کے قابل ہو سکیں ۔ چناں چہ اسپارٹا کے آئین کی رو سے ایفروں (اسپارٹا کے پانچ مجسٹریٹ جو بادشاہوں کی نگرانی پر مامور تھے) کے لیے یہ ضروری تھا کہ ایسی رات دیکھ کر ، جب مطلع صاف ہو اور چاند نکلا ہوا نہ ہو ، چپ چاپ بیٹھے آسمان کا مشاہدہ کریں ۔ اگر انھیں اپنی اس شب بیداری کے دوران میں آسمان پر کوئی ستارہ ٹوٹتا نظر آتا تو اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے کہ بادشاہ نے دیوتا کو ناراض کر دیا ہے اور دیوتا نے اسے معطل کر دیا ہے ۔ جب تک ڈیلفائی یا اولمپیائی ندائے غیب انھیں بحال نہیں کر دیتی ، وہ اسی طرح معطل رہتے ۔ اس دستور پر جس میں قدامت قدیمہ

کا رنگ بہ درجۂ اتم موجود ہے ، اسپارٹی ملوکیت کے آخری عہد میں بھی عمل در آمد ہوتا تھا ، اس لیے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں ایک بادشاہ کو جس نے اصلاحی پارٹی کو اپنی طرف سے بد دل کر دیا تھا، مختلف جھوٹے الزاموں کی بناء پر واقعی معزول کر دیا گیا تھا ۔ ان میں ایک نمایاں الزام یہ تھا کہ آسمان پر تارا ٹوٹتا دکھائی دیا تھا ۔

اگر اسپارٹا والوں کے ہاں شاہی منصب کی میعاد آٹھ سال تک محدود تھی تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی بادشاہ کی حکومت کے لیے ٹھیک یہی مدت کیوں مقرر تھی ؟ اس کا سبب غالباً وہ فلکی امور تھے جن کی بناء پر یونان کی ابتدائی تقویم کی تعیین ہوتی تھی ۔ قمری وقت سے شمسی وقت کی تطبیق کا مسئلہ ان مستقل معموں میں سے ایک ہے جن پر پستی سے ابھرنے والی قومیں سر کھپاتی رہی ہیں ۔ ایک ہشت سالہ دور وہ مختصر ترین مدت ہوتی ہے ، جس کے اختتام پر شمس و قمر کے وقت افراط و تفریط کے بعد ہم آہنگ ہوتے ہیں ۔ چناں چہ اس تمام عرصے میں فقط آٹھویں برس کہیں جا کر چاند کی چودھویں تاریخ سال کے سب سے لمبے یا سب سے چھوٹے دن پڑتی ہے ۔ اس زمانی توافق کا مشاہدہ ایک سیدھے سادے مقیاس کی مدد سے کیا جا سکتا ہے ، اور سب سے پہلے اسی مشاہدے کی بناء پر ایک ایسی تقویم مرتب کی جانی قدرتی بات ہے جس میں اگر ٹھیک ٹھیک نہیں تو خاصی حد تک شمسی اور قمری وقت میں تناسب قائم کیا جائے ۔ لیکن ایام جاہلیت میں تقویم کا مناسب تسویہ مذہبی امور میں شامل ہوتا ہے کیوں کہ اسی پر دیوتاؤں کی استہلال اور رضاجوئی کے صحیح ایام کا انحصار ہوتا ہے ، جن کا کرم اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے ناگزیر ہے ۔ لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں جو بادشاہ ، ریاست کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا یا خود دیوتا کی حیثیت سے ایک دور فلک کے گزرنے پر سزاوار معزولی یا قتل قرار پائے ۔ جب شمس و قمر ایک بلندی تک پہنچنے کے بعد عرصۂ گردوں پر پھر سے اپنی دوڑ شروع کرنے لگتے تو اس کے ساتھ یہ ضروری خیال کیا جاتا کہ بادشاہ اپنی الوہی قوتیں تازہ کر لے یا ثابت کر دکھائے کہ ان میں کوئی کمی نہیں

ہوئی ہے ۔ ورنہ کسی ایسے آدمی کے لیے جگہ خالی کر دے جو اس سے زیادہ قوی و توانا ہو ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنوبی ہند میں بادشاہ کی حکومت اور زندگی کے دن آفتاب کے گرد مشتری کا ایک چکر ختم ہونے پر پورے ہو جاتے تھے ۔ دوسری طرف یونان میں ہر آٹھویں سال کے اختتام پر بادشاہ کی جان جوکھوں میں رہتی ہوگی اور اس کی روح کا طائر پر تولے رہتا ہوگا کہ آسمان پر تارے کے ٹوٹتے ہی پرواز کر جائے ۔

اس ہشت سالہ دور کی اصل خواہ کچھ ہی رہی ہو ، اسپارٹا کے علاوہ یونان کے دوسرے حصوں میں بھی بادشاہت کی مقررہ میعاد اسی سے مطابقت رکھتی تھی ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کریٹ میں کنوسس کا بادشاہ مینوس (قصص و روایات کی رو سے کریٹ کا یہ بادشاہ زیوس اور اس کی فونیقی محبوبہ یورپا کا لڑکا تھا ۔ اس نے اپنی رعایا کو قوانین عطا کیے اور اس قدر عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی کہ مرنے کے بعد عالم ارواح کا میر عدل بن گیا ۔ لیکن دوسری طرف اس کے متعلق ایتھینی قصہ یہ بتاتا ہے کہ وہ بڑا ظالم و جابر حکم ران تھا ، اور جیسا کہ مصنف نے بیان کیا ہے ، اہل ایتھنز سے سات لڑکے اور سات لڑکیاں بہ طور خراج وصول کیا کرتا تھا ۔ وہ ڈیڈیلس نامی ایک ایتھینی انجینیر کے تعاقب میں ، جس نے اس کے حکم سے کریٹ کی مشہور بھول بھلیاں تعمیر کی تھی ، صقلیہ گیا اور وہاں کے بادشاہ کے ہاتھوں مارا گیا) جس کا عظیم‌الشان محل حال ہی میں برآمد کیا گیا ہے ، مسلسل آٹھ سال حکومت کرتا تھا ، جس کے اختتام پر کچھ عرصے کے لیے کوہ ایڈا کے غار ندا میں چلا جاتا اور وہاں اپنے آسمانی باپ زیوس سے مل کر گزشتہ سالوں کی حکومت کی روداد اس کے گوش گزار کرتا اور آئندہ سالوں کی حکومت کے بارے میں اس سے ہدایت حاصل کرتا ۔ اس روایت کا مطلب صاف یہ ہے کہ اس کے لیے ہر آٹھویں سال کے آخر میں دیوتا سے مل کر اپنی قوتوں کی تجدید ضروری تھی ، اور یہ کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے تخت و تاج سے ہاتھ دھونا پڑتا ۔ یہ قیاس بہ احتیاط مناسب بے جا نہ ہوگا کہ ایتھنز والے مینوس کو ہر آٹھویں سال کے

اختتام پر ، جو سات نوجوان اور سات کنواریاں بہ طور خراج پیش کرنے پر مجبور تھے ، اس کا قوت شاہی کے ہشت سالہ احیاء سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوگا۔ کریٹ پہنچنے کے بعد ان لڑکوں اور لڑکیوں کے انجام کے متعلق روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے ، لیکن عام خیال غالباً یہ تھا کہ انھیں بھول بھلیاں میں بند کر دیا جاتا تھا ، تاکہ مینوتور (یونانی صنمیات کی رو سے یہ ایک عجیب مخلوق تھی ، جس کا آدھا جسم آدمی کا تھا اور آدھا بیل کا) انھیں ہڑپ کر جائے یا کم از کم عمر بھر وہ اس بھول بھلیاں میں محبوس رہیں۔ شاید ان بد نصیبوں کو کانسی کی بنی ہوئی بیل یا بیل کے سر والے آدمی کی ایک مورتی میں زندہ بھون کر قربان کیا جاتا تھا ، تاکہ بادشاہ اور آفتاب کی قوتوں کی تجدید ہو سکے ، بادشاہ کی ذات جس کی مظہر تھی۔ بہر کیف یہ بات کانسی کے بنے ہوئے ایک آدمی تالوس کے قصے سے مترشح ہے ، جو لوگوں کو پکڑ کر سینے سے چمٹائے آگ میں کود پڑتا تھا اور وہ زندہ جل کر بھسم ہو جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تالوس کریٹ کی حفاظت کے لیے زیوس کی طرف سے یورپا یا ہیفیس ٹس کی طرف سے مینولس کو ملا تھا اور وہ دن میں تین مرتبہ اس جزیرے کا گشت لگایا کرتا تھا۔ ایک بیان کے بموجب وہ ایک بیل تھا اور ایک اور بیان کے بموجب آفتاب۔ غالباً تالوس اور مینوتور ایک ہی مخلوق کے دو مختلف نام تھے اور اس کی اساطیری خصوصیات سے قطع نظر وہ ایک گاؤ سر آدمی کی ہیئت میں آفتاب کی ایک مورتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس مورتی کے خالی جسم میں آدمیوں کو زندہ بھون دیا جاتا تھا ، یا انھیں اس کے جھکے ہوئے ہاتھوں میں رکھ کر اسے الاؤ میں لڑھکا دیا جاتا تھا ، تاکہ اس صورت سے اس مورتی پر انسانی بھینٹ چڑھا کر سورج کی آگ کو تازگی بخشی جائے۔ کارتھیج والے مولک (ایک کنعانی بت جس پر بچوں کو جلا کر بھینٹ چڑھایا جاتا تھا ؛ ملٹن کے جہنم میں یہ ابلیس کا ایک مشیر خاص نظر آتا ہے) کی مورتی پر اپنے بچوں کی بھینٹ چڑھنے میں یہی دوسرا طریقہ اختیار کرتے تھے۔ ان کے ہاں بچوں کو ایک کانسی کی ایسی مورتی کے ہاتھوں میں تھما دیا

جاتا تھا ، جس کا سر بچھڑے کا تھا ، اس کے ہاتھوں سے کھسک کر وہ ایک تنور میں جا گرتے اور اس دوران میں لوگ بانسریوں کی دھن اور طبلوں کی تھاپ پر رقص کرتے ، تاکہ اس شور میں بچوں کی چیخیں دب جائیں ۔ کریٹی روایات اور کارتھیجی دستور میں جو مطابقت پائی جاتی ہے ، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مینوس اور مینوتور کے ناموں سے منسوب اس طرز پرستش پر سامی بعل کی رسوم پرستش کا گہرا اثر پڑا ہوگا ۔ اگری جنٹم کے جابر حکمران فلارس اور اس کے پتلی بیل کی روایت شاید صقلیہ میں انھی رسوم کی محاکاتی صورت تھی ۔

صوبۂ لے گوس میں یورو بانسل کا ایجیبو قبیلہ دو شاخوں میں بٹا ہوا ہے ، جو علی الترتیب ایجیبواوڈ اور ایجیبوریمون کے نام سے موسوم ہیں ۔ مقدم الذکر پر ایک سردار کی حکومت ہے جس کا لقب اوجیل ہے اور جو بڑی پر اسرار ہستی ہے ۔ حال تک خود اس کی رعایا اس کی شکل نہیں دیکھ سکتی تھی اور اگر حالات سے مجبور ہو کر اسے لوگوں سے رابطہ قائم کرنا پڑتا تو وہ اپنے آگے پردہ ڈلوا لیتا تاکہ وہ کسی کو دکھائی نہ دے ۔ اس قبیلے کی دوسری شاخ موسوم بہ ریمون کا حاکم ایک سردار ہے ، جس کا مرتبہ اوجیل سے کم تر ہے ۔ مسٹر جان پارکنسن کو بتایا گیا تھا کہ اگلے زمانے میں یہ زبردست سردار تین سال حکومت کرنے کے بعد مار دیا جاتا تھا ۔ چوں کہ اب یہ علاقہ برطانیہ عظمیٰ کی حفاظت میں ہے ، اس لیے تین سال کے اختتام پر سردار کشی کے اس دستور کو ختم ہوئے عرصہ گزر گیا ، اور مسٹر پارکنسن اس موضوع پر مزید تفصیلات معلوم نہ کر سکے ۔

بابل میں تاریخی عہد کے آغاز کے بعد بھی یہ صورت رہی کہ بادشاہ اگرچہ عملاً عمر بھر سریر آرائے سلطنت رہتا ، لیکن نظری اعتبار سے اس کی حکومت کی مقررہ میعاد صرف ایک سال تھی ، اس لیے کہ عید زگ موک کے سالانہ تیوہار پر بادشاہ کو بابل میں مردوک (تطہیر وغیرہ کا دیوتا ۔ یہ نام اس کے شمسی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے) کے عظیم الشان ازاجیلی مندر میں اس کے بت کے ہاتھ پکڑ کر اپنی تقریب نو کی رسم ادا کرنی پڑتی تھی ۔ جب بابل میں اشوریوں کا

تسلط ہوا ہے تو اس وقت بھی اس ملک کے سلاطین کو بابل جانا پڑتا اور سال نو کے تیوہار پر یہ قدیم رسم ادا کرنی پڑتی ۔ ان سلاطین میں بعض کے لیے یہ فرض اس قدر دوبھر تھا کہ انہوں نے اسے بجا لانے کی بجائے اپنا لقب شاہی ترک کر دیا اور اپنے آپ کو صرف گورنر کہلوانے پر اکتفا کی ۔ نیز معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قبل از تاریخ میں شاہان بابل یا ان کے وحشی پیش رو سال پورا ہونے پر نہ صرف تخت و تاج سے محروم ہو جاتے بلکہ انہیں زندہ رہنے کا بھی حق نہ ہوتا ۔ کم از کم حسب ذیل شہادت سے کچھ یہی نتیجہ نکلتا ہے ۔ بیرو سس نامی مورخ بابل کے ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت سے اپنی وسیع معلومات کی بناء پر بیان کرتا ہے کہ بابل میں ہر سال ایک تیوہار منایا جاتا تھا ، جو سکایا کہلاتا تھا ۔ یہ ماہ لوس کے سولھویں دن شروع ہوتا اور پانچ دن تک جاری رہتا ، جس کے دوران میں آقا اور ان کے خادم اپنے اپنے فرائض منصبی کا تبادلہ کر لیتے ؛ خادم حکومت کرتے اور آقا اطاعت ۔ کسی ایسے قیدی کو ، جسے سزائے موت کا حکم سنایا گیا ہو ، خلعت سلطانی پہنا کر تخت پر بٹھا دیا جاتا اور اسے اس کی اجازت ہوتی کہ اپنی مرضی سے احکام صادر کرے ، کھائے پیے ، مزے اڑائے اور بادشاہ کی خواصوں کے ساتھ ہم بستر ہو ۔ اپنی اس پانچ دن کی بادشاہت میں وہ زوگانیس کے لقب سے ملقب ہوتا ۔ اس دستور کو محض ایک ایسی ستم ظریفی سے تعبیر کیا جاتا ہوگا جو ہنگام عیش و طرب میں کسی بد نصیب مجرم کے ساتھ کی جائے ۔ لیکن مضحک بادشاہ کو شاہی خواصوں کے ساتھ داد عیش دینے کی جو کھلی چھٹی مل جاتی تھی ، وہ اس دستور کا ایک ایسا پہلو ہے جو مندرجہ بالا توجیہ کے قطعی منافی ہے ۔ اس امر کے پیش نظر کہ مشرق کے جابر حکمران اپنے حرم کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتے تھے ، بلا خوف تردید یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں اور تو اور ایک گردن زدنی مجرم کی مداخلت بے جا کے روا رکھنے کا کوئی ناگزیر سبب ضرور ہوگا ۔ یہ سبب اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ اجل رسیدہ مجرم بادشاہ کی جگہ مارا جانے والا تھا ، اور بادشاہ کی

کا حقہ نیابت و نمائندگی کے لیے یہ ضروری تھا کہ اسے اپنے اس مختصر سے عہد حکومت میں تمام شاہی حقوق حاصل ہوں ۔ نیابت شاہی کے اس دستور میں کوئی امر باعث تعجب نہیں ۔ جس ضابطے کی رو سے جسمانی انحطاط کے آثار نمودار ہونے یا مقررہ میعاد ختم ہونے پر بادشاہ کا مارا جانا لازمی قرار پاتا ، اسے منسوخ کرنے کی بادشاہ دیر یا سویر لا محالہ کوشش کرتا ۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ حبشہ ، صوفالا اور آیو میں روشن خیال بادشاہوں نے اس ضابطے کو بڑی بے باکی سے ٹھکرا دیا تھا اور کالی کٹ میں بارہ سال کی مدت گزرنے پر راجا کی خودکشی کے دستور کی جگہ اس اذن عام نے لے لی تھی کہ بارہ سال کے ختم ہونے پر جو شخص چاہے راجا پر حملہ آور ہو اور راجا کے قتل ہونے کی صورت میں اس کی جگہ زمام حکومت سنبھال لے اور ساتھ ہی چوں کہ راجا فوج کو اپنی حفاظت کے لیے چوکس رکھتا ، لہذا یہ اذن عام بھی محض ایک رسمی چیز تھی ۔ شاہ کشی یا میعادی بادشاہت کے دستور کی ایک دوسری ترمیمی صورت مذکورہ بالا بابلی رواج تھا ۔ جب بادشاہ کے قتل کا وقت قریب آتا (بابل میں یہ وقت بادشاہ کے عہد حکومت میں ہر سال آتا) تو وہ کچھ دن کے لیے تخت و تاج سے دست بردار ہو جاتا اور اس دوران میں کوئی عارضی بادشاہ اس کی جگہ حکومت کرتا اور موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ۔ شروع شروع میں یہ عارضی بادشاہ کوئی بے گناہ شخص بنتا ہوگا ، ممکن ہے کہ شاہی خاندان ہی کا کوئی فرد اس طرح بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہو ، لیکن تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کسی بے گناہ کے خون کو عوام نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور اس کے پیش نظر گردن زدنی مجرم کو عارضی طور پر بادشاہ بنا کر مارا جانے لگا ۔ آگے چل کر کسی اجل رسیدہ دیوتا کی نمائندگی کرنے والے ایسے ہی کسی اجل رسیدہ مجرم کی مزید مثالیں ہماری نظر سے گزریں گی ، کیوں کہ اس ضمن میں ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ، جیسا شاہان شلوک کی مثال سے واضح ہے ، بادشاہ کو خدا یا نیم خدا کی حیثیت سے مارا جاتا ہے جس کی موت اور حیات نو غیر ترقی یافتہ لوگوں کے نزدیک الوہی زندگی کا سلسلہ برقرار رکھنے کا

واحد ذریعہ ہے اور اس لیے دنیا اور نوع انسان کی نجات کے لیے ناگزیر ۔

شاہ کشی کے سالانہ دستور کا ایک نقش اس تیوہار میں باقی رہ گیا تھا جو کبھی ہوائی میں ماکاہٹی کے نام سے سال کے آخری مہینے کے دوران میں منایا جاتا تھا ۔ کوئی سو سال ہوئے روس کے ایک بحری سیاح نے اس دستور کا حال یوں قلم بند کیا تھا : ''ماکاہٹی کی عید حرام ہمارے کرسمس کے تیوہار سے ملتی جاتی ہے ۔ وہ مہینہ بھر جاری رہتی ہے، جس کے دوران میں ناچ، کھیل تماشے اور طرح طرح کی مصنوعی لڑائیاں ہوتی ہیں ۔ اس کا افتتاح بادشاہ کو کرنا پڑتا ہے ، خواہ وہ کہیں ہو ۔ اس موقع پر جلالت مآب بادشاہ اپنی سب سے قیمتی عبا اور خود زیب تن کیے سیر کے لیے کشتی میں بیٹھتا ہے ، جسے ساحل کے ساتھ ساتھ کھینچتے ہوئے لے جایا جاتا ہے اور بعض وقت رعایا میں سے بہت سے لوگ اس کے جلو میں ہوتے ہیں ۔ وہ صبح سویرے کشتی میں سوار ہو جاتا ہے اور اس کے لیے سورج ڈوبتے وقت اپنی سیر ختم کرکے لوٹ آنا ضروری ہے ۔ سپاہیوں میں ایک سب سے قوی اور ماہر نیزہ باز کو کشتی پر سے اترتے وقت اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے منتخب کیا جاتا ہے ۔ یہ سپاہی لب ساحل کشتی کی راہ دیکھتا رہتا ہے اور جوں ہی بادشاہ ساحل پر قدم رکھ کر اپنی عبا اتار پھینکتا ہے ، وہ کوئی تیس قدم کے فاصلے سے اس پر اپنی برچھی چلاتا ہے ۔ بادشاہ یا تو اپنے ہاتھوں سے برچھی روکے یا زخم کھا لے ۔ یہ کھیل بالکل نہیں ہے ۔ پھر وہ برچھی کی نوک نیچے جھکائے اسے بغل میں دبا کر مندر یا ہیاوو جاتا ہے ۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی ، لوگ جو وہاں جمع ہوتے ہیں ، اپنی مصنوعی لڑائیاں شروع کر دیتے ہیں اور چشم زدن میں آسمان پر کند نیزوں کا ایک بادل چھا جاتا ہے جو خاص طور پر اس موقع کے لیے تیار کیے جاتے ہیں ۔ ہامیا (بادشاہ) کو بارہا یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اس مضحکہ خیز رسم کو ترک کر دے ، جس میں ہر سال اس کی جان کا خطرہ ہوتا ہے ، لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ وہ جزیرے کے بہترین نیزہ باز کا نیزہ روک سکتا ہے ، ماکاہیٹی کے دوران میں ملک بھر میں سزائیں معاف

کر دی جاتی ہیں اور اس مقام سے کوئی جا نہیں سکتا جہاں بادشاہ اس تیوہار کی رسم افتتاح ادا کرے ۔''

جب یہ پتہ چلتا ہے کہ آج بھی ایک سلطنت ایسی موجود ہے ، جس میں بادشاہ کی حکومت اور زندگی ایک دن تک محدود ہے تو بادشاہ کا باضابطہ ہر سال مارا جانا چنداں دور از قیاس نہیں رہتا ۔ کانگو کی قدیم سلطنت کی ریاست این گویو میں یہ دستور ہے کہ والئی ریاست کو دستار بندی کے بعد دوسری ہی رات قتل کر دیا جاتا ہے ۔ ولایت کا حق وراثت رئیس موسورونگو کو حاصل ہے ، لیکن اگر وہ اسے استعمال نہیں کرتا ہے اور گدی یوں ہی خالی پڑی رہتی ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ''این لویو کی گدی پر چند گھنٹے کے کر و فر کی خاطر کوئی شخص اپنی جان سے ہاتھ دھونا پسند نہیں کرتا ۔''

پچیسواں باب

# عارضی بادشاہ

بعض مقامات پر شاہ کشی کے قدیم دستور کی اس ترمیم شدہ صورت کو جو بابل میں رائج رہی ہوگی ، کچھ اور نرم کر دیا گیا ہے ۔ بادشاہ اب بھی مختصر سی مدت کے لیے راج پاٹ چھوڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ اس کے نام کا ایک بادشاہ لے لیتا ہے ، لیکن اس بادشاہ کو اس کے چند روزہ عہد حکومت کے اختتام پر مارا نہیں جاتا ، اگرچہ بعض صورتوں میں اس عہد کی یادگار جھوٹ موٹ کے قتل کی ایک نہ ایک رسم آج تک باقی رہ گئی ہے ، جب اس عارضی بادشاہ کو واقعی موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا ۔ مے آک (فروری) کے مہینے میں کمبوڈیا کا بادشاہ ہر سال تین دن کے لیے اپنا تخت و تاج چھوڑ دیتا تھا ۔ اس دوران میں وہ حکومت سے بالکل کنارہ کش رہتا ، شاہی مہروں کو چھوتا تک نہیں ، بلکہ اس سہ روزہ مدت کے جو محاصل واجب الوصول ہوتے ان سے بھی دست بردار ہو جاتا اور اس کی جگہ ایک عارضی بادشاہ ملقب بہ سداک مے آک ، یعنی شاہ فروری سریر آرائے سلطنت ہو جاتا ۔ یہ عارضی بادشاہت ایک خاندان کا موروثی منصب تھی ، جس کا خانوادۂ سلطانی سے دور پرے کا رشتہ تھا اور جس میں اصلی بادشاہت کے سلسلۂ وراثت کی طرح ، بیٹے باپ کے جانشین ہوتے اور چھوٹے بھائی بڑے بھائیوں کے ۔ نجومیوں کے مقرر کردہ کسی شبہ دن عمال کی پیشوائی میں اس عارضی بادشاہ کا جلوس نکالا جاتا ۔ وہ فیل خانۂ شاہی کے ایک ہاتھی

پر شاهی عماری میں سوار ہو کے نکلتا اور سپاہیوں کا ایک حفاظتی دستہ اس کے ہم رکاب ہوتا ، جو اپنی اپنی وردیوں میں سیام ، انام اور لاؤس وغیرہ کی نمائندگی کرتے ۔ وہ طلائی تاج کی جگہ ایک چھجے دار سفید ٹوپی پہنتا اور اس کا شاہی ساز و سامان مرصع سونے کی بجائے کھردری لکڑی کا ہوتا ۔ بادشاہ کے حضور عہد وفاداری کرنے کے بعد ، جو اسے سہ روزہ حکومت اور اس مدت کے سارے واجب الوصول محاصل عطا کرتا (گو اس عطائے محاصل والے دستور پر کچھ عرصے سے عمل درآمد رک گیا ہے) ، وہ جلوس کی صورت میں محل کے گرد اور راج دھانی کے گلی کوچوں میں گشت لگاتا ۔ حسب دستور جلوس کے بعد تیسرے دن عارضی بادشاہ یہ حکم صادر کرتا کہ ''چاول کے پہاڑ'' کو ہاتھی روند ڈالے ، جو بانس کی مچان کے گرد دھان کی پولیوں کے ڈھیر پر مشتمل ہوتا ۔ سب لوگ وہ چاول چن لیتے اور ہر شخص اس میں سے چند دانے اپنے گھر لے جاتا تاکہ اس کے ہاں فصل اچھی ہو اور اس کا کچھ حصہ بادشاہ کے پاس بھی لے جایا جاتا ، جو اسے پکوا کر راہبوں کو بانٹتا ۔

سیام میں چاند کے چھٹے مہینے کے چھٹے دن (اپریل کے آخر میں) ایک عارضی بادشاہ کا تقرر عمل میں آتا ہے ، جسے تین دن تک شاہی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور اس اثناء میں اصلی بادشاہ اپنے محل کے اندر بند رہتا ہے ۔ یہ عارضی بادشاہ اپنے کثیرالتعداد مصاحبوں کو ہر طرف روانہ کرتا ہے کہ انہیں بازار اور کھلی دکانوں میں جو کچھ ملے اسے ضبط کر لیں ، بلکہ اس سہ روزہ مدت کے دوران میں جو بھی جہاز یا چینی کشتی (ایک قسم کی کشتی ، جو بحیرۂ چین میں مستعمل ہے) بندرگاہ میں لنگر انداز ہوتی ہے ، بحق بادشاہ ضبط کر لی جاتی ہے اور اسے چھڑانے کے لیے تاوان بھرنا پڑتا ہے ۔ بادشاہ مذکور شہر کے وسط میں ایک کھیت پر پہنچتا ہے ، جہاں لوگ اس کے پاس ایک مطلا ہل لے کے جاتے ہیں ، جس میں سجے ہوئے بیل جتے ہوتے ہیں ۔ ہل پر روغن اور بیلوں پر بخورات کی مالش ہو چکنے کے بعد نقلی بادشاہ اس ہل سے کھیت میں نو ریگھاریاں بناتا ہے ، اور اس کے جلو میں

ل کی مسن خواتین فصل کا پہلا بیج بوتی چلتی ہیں۔ ان نو ریگھاریوں کے پورے ہوتے ہی، تماشائیوں کا ہجوم بوئے ہوئے بیج لوٹنے کے لیے کھیت پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ ان کے عقیدے کے بموجب اس بیج کو دھان کے ساتھ ملا کر بویا جائے تو اس سے چاول کی فصل وافر ہوگی۔ پھر بیلوں کا جوا اتار دیا جاتا ہے اور ان کے آگے چاول، مکئی، تیل، سابودانہ، کیلے، تربوز وغیرہ وغیرہ رکھ دیے جاتے ہیں۔ خیال ہے کہ یہ بیل ان میں سے جس چیز کو سب سے پہلے کھائیں گے وہ اگلے سال مہنگی ہوگی؛ اگرچہ بعض لوگ اس کا الٹا سگن لیتے ہیں۔ اس اثناء میں بادشاہ اپنا داہنا پاؤں بائیں گھٹنے پر رکھے ایک پیڑ کے سہارے کھڑا رہتا ہے۔ اس حالت میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے کے سبب عام لوگ اسے ''ہاپ شاہ'' کہتے ہیں، لیکن اس کا سرکاری لقب ''پھایا پھولا تیپ'' یعنی ''سردار لشکر آسمانی'' ہے۔ اس کی حیثیت ایک طرح وزیر زراعت کی سی ہے، زرعی اراضی اور چاول وغیرہ کے متعلق تمام قضیوں میں اسی سے رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک رسم اور بھی ہے، جس میں وہ بادشاہ کا روپ بھرتا ہے۔ یہ سال کے دوسرے مہینے (جو سردیوں میں آتا ہے) میں ادا کی جاتی ہے اور تین دن جاری رہتی ہے۔ اس میں نقلی بادشاہ کو مندر کے سامنے ایک کھلے مقام پر جاوس کی شکل میں لے جایا جاتا ہے، جہاں بیسا کھوں کے سے کئی کھمبے نصب ہوتے ہیں۔ ان پر برہمن جھولتے ہیں اور جب تک یہ جھولتے اور رقص کرتے رہتے ہیں، سردار لشکر آسمانی کو ایک خشتی چبوترے پر، جو ایک سفید چادر سے ڈھکا اور مشجر سے سجا ہوتا ہے، ایک ٹانگ اٹھائے کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ اس کے سہارے کے لیے ایک چوبی فریم بھی ہوتا ہے، جس پر ملمع چھتر چھا دیا جاتا ہے اور دو برہمن اس کے دونوں جانب کھڑے ہوتے ہیں۔ رقص کرنے والے برہمن بھینس کے سینگ لیے ان سے ایک تانبے کی دیگ میں سے پانی کھینچ کھینچ کر تماشائیوں پر چھڑکتے جاتے ہیں۔ خیال ہے کہ اس چھڑکاؤ کی برکت سے لوگوں کو امن و سکون اور صحت و خوش حالی نصیب ہوتی ہے۔ آسمانی سردار کے ایک ٹانگ

پر کھڑے ہونے کا مقررہ وقت تین گھنٹے ہے ۔ عام خیال کے بموجب اس عمل سے ''دیوتاؤں اور روحوں کی رضا معلوم ہوتی ہے ۔'' اگر وہ اپنا دوسرا پاؤں ٹیک دے تو ''اس کی جائیداد ضبط کی جا سکتی ہے اور بادشاہ اس کے کنبے کو اپنا غلام بنا سکتا ہے'' کیوں کہ اس حرکت سے برا شگن لیا جاتا ہے ، اور اسے ریاست کے برباد اور بادشاہت کی بنیاد متزلزل ہونے کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن اگر وہ ایک ٹانگ پر جا کھڑا رہا تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے خبیث روحوں کو زیر کر لیا ہے ۔ مزید برایں کم از کم بادی النظر میں وہ اس کا مجاز ہو جاتا ہے کہ اس کی سہ روزہ بادشاہت میں جو بھی جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہو ، اس میں داخل ہو اور اس پر لدے ہوئے مال و اسباب پر قبضہ کر لے ، نیز شہر کی کھلی ہوئی دکانوں میں پہنچ کر جو جی چاہے لے جائے ۔''

یہ تھے سیام کے شاہ ہاپ کے وہ حقوق و فرائض جو انیسویں صدی یا اس کے بعد تک باقی رہے ۔ پچھلے روشن خیال بادشاہ کی حکومت اس عجیب و غریب شخصیت کی شان و شوکت اور فرائض کے بوجھ دونوں میں کچھ کمی کر دی گئی ۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی برہمنوں کی پینگوں کا تماشا دیکھتا ہے ، جو نوے نوے فٹ لمبے کھمبوں کی جوڑیوں سے بندھی ہوتی ہیں ، لیکن اب اسے بیٹھنے کی اجازت ہے ، اور گو عام لوگ اب بھی اس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا رسم کے دوران میں وہ اپنا داہنا پاؤں بائیں گھٹنے پر رکھ کر کھڑا ہو ، لیکن اگر وہ لوگوں کی مرضی کے خلاف اپنی تھکی ہوئی ٹانگ زمین پر ٹیک دے تو قانون کی رو سے وہ کسی سزا کا مستوجب نہیں ہوتا ۔ اور بھی چیزیں ایسی ہیں جن سے مشرق پر مغربی خیالات اور تہذیب کی چھاپ نمایاں ہے ۔ وہ ساری شاہ راہیں جو اس تماشا گاہ تک جاتی ہیں ، گاڑیوں سے رک جاتی ہیں اور بجلی اور تار کے کھمبے جن سے شوقین تماشائی بندروں کی طرح چمٹے رہتے ہیں ، لوگوں کے جم غفیر پر سر نکالے کھڑے نظر آتے ہیں ، اور جہاں اگلے وقتوں کا ایک طائفہ زرد اور شنگرفی چیتھڑوں میں ملبوس اپنے دقیانوسی ڈھول اور ترم بجاتا رہتا

ہے ، وہاں برہنہ پا سپاہیوں کا جلوس زرق برق وردیوں میں جدید طرز کے فوجی بینڈ پر ''جارجیا میں بڑھے چلو'' والے رزمیہ نغمے کی گونج میں کوچ کرتا چلتا ہے ۔

سمرقند میں یہ ہوا کرتا تھا کہ چھٹے مہینے کی یکم کو ، جس سے سال نو کا آغاز ہوتا تھا ، وہاں کا بادشاہ اور لوگ اجلے کپڑے پہنتے اور داڑھی اور سر کے بال ترشواتے ، پھر دارالسلطنت کے قریب ایک جنگل میں پہنچ کر سات دن گھوڑوں پر سے ناوک افگنی کی مشق کرتے ۔ آخری دن ان کا ہدف ایک اشرفی ہوتی اور اس پر جس شخص کا نشانہ ٹھیک بیٹھتا ، اسے ایک دن کی بادشاہت کا حق حاصل ہو جاتا ۔ شمالی مصر میں قبطیوں کے حساب سے سال کے پہلے دن ، جو دس ستمبر کو پڑتا ہے اور جب عموماً دریائے نیل کی سطح انتہائی نقطے کو پہنچ جاتی ہے ، باضابطہ حکومت تین دن کے لیے معطل ہو جاتی ہے اور ہر شہر اپنا حکمران منتخب کر لیتا ہے ۔ شہر کا یہ عارضی والی سن کی لمبی سی داڑھی لگا لیتا ہے اور مسخروں کی سی ایک اونچی مثلث کلاہ اور ایک عجیب سا لبادہ اوڑھ لیتا ہے ۔ پھر حکومت کی زمام ہاتھ میں لیے کچھ آدمیوں کی معیت میں جو محرروں ، جلادوں وغیرہ کے بھیس میں ہوتے ہیں ، گورنر کے ایوان میں پہنچتا ہے ۔ گورنر اس کے ہاتھوں معزول ہو جاتا ہے اور یہ مضحک بادشاہ تخت پر بیٹھ کر اپنی عدالت کا اجلاس منعقد کرتا ہے ، جس کے فیصلوں کے آگے خود گورنر اور اس کے عہدہ داروں کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے ۔ تین دن کے بعد اس نقلی بادشاہ کو سزائے موت کا حکم سنا دیا جاتا ہے ۔ وہ لبادہ یا خول ، جو وہ اوڑھے ہوتا ہے ، نذر آتش کر دیا جاتا ہے اور اس کی راکھ میں سے فلاح (مزارع) رینگ نکلتا ہے ۔ یہ رسم غالباً کسی ایسے قدیم دستور کی طرف اشارہ کرتی ہے ، جس میں اصلی بادشاہ کو واقعی جلا دیا جاتا تھا ۔ یوگانڈا میں بادشاہ کے بھائیوں کو سچ مچ نذر آتش کر دیا جاتا تھا ، اس لیے کہ شاہی خون بہانا خلاف قانون تھا ۔

مراقش میں فیز کے مسلمان طالب علموں کو اپنا ایک سلطان

مقرر کرنے کی اجازت ہے جو ''سلطان الطلباء'' کے لقب سے چند ہفتے حکومت کرتا ہے ۔ اس چند روزہ منصب کا نیلام کیا جاتا اور اس میں اس کی قیمت جو سب سے زیادہ لگاتا وہ اسے سونپ دیا جاتا ۔ اس منصب کے ساتھ کچھ ٹھوس مراعات وابستہ ہیں ۔ چناں چہ اس کے حامل کو محصول معاف اور اصلی سلطان سے کسی مہربانی کی درخواست کا حق حاصل ہوتا ہے ، جو شاید ہی کبھی نامنظور کی جاتی ہو ۔ اس درخواست میں عموماً کسی قیدی کی رہائی کی استدعا کی جاتی ہے ۔ نیز طالب علم سلطان کے کارندے دکان داروں اور گھر والوں پر طرح طرح کے تمسخرانہ الزام لگا کر ان سے جرمانے وصول کرتے پھرتے ہیں ۔ اس عارضی سلطان کے دربار کی وہی شان ہوتی ہے جو کسی حقیقی بادشاہ کے دربار کی ہو اور وہ نغمہ و سرود اور نعروں کی گونج میں شاہی چتر لگائے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ بازار سے گزرتا ہے ۔ مذکورہ بالا جرمانوں اور تحفے تحائف پر اصلی سلطان اپنی طرف سے اشیائے خور و نوش کی بہت سی مقدار کا اور اضافہ کر دیتا ہے اور یہ سب چیزیں مل کر ان طلباء کے ہاتھ اتنا کچھ آ جاتا ہے کہ وہ ایک شان دار ضیافت کر سکتے ہیں ۔ وہ سب مل کر بڑے مزے اڑاتے ہیں اور طرح طرح کے کھیل تماشے کرتے ہیں ۔ پہلے سات دن نقلی سلطان کالج میں رہتا ہے ، پھر طلبا اور بہت سے شہریوں کے ساتھ شہر سے نکل کر میل بھر کے فاصلے پر دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالتا ہے ۔ شہر سے باہر اس کے قیام کے ساتویں دن اصلی سلطان اس کی ملاقات کو جاتا ہے اور اس کی درخواست منظور کرتا ہے ۔ نیز اس سے اس کی حکومت میں سات دن کی توسیع اور عطا کرتا ہے ۔ اس طرح سلطان الطلباء کی حکومت تین ہفتے جاری رہتی ہے ۔ لیکن جب تیسرے ہفتے کے چھ دن گزر چکتے ہیں تو وہ رات کے وقت شہر بھاگ جاتا ہے ۔ عارضی بادشاہت کا یہ زمانہ ہمیشہ آغاز اپریل کے لگ بھگ سردی کے موسم میں آتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس دستور کی بناء اس طرح پڑی تھی : جب مولائی رشید دوم ۱۶۶۴ یا ۱۶۶۵ میں اپنے تخت و تاج کے لیے مصروف پیکار تھا تو کوئی غاصب یہودی تازا پر قابض ہو گیا جو

سلطان کے زیر نگیں تھا ، لیکن طلبا کی وفاداری اور جاں نثاری کے سبب یہ بغاوت جلد فرو ہوگئی ۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے انھوں نے یہ ترکیب کی کہ ان چالیس صندوقوں میں بند ہو گئے جو غاصب یہودی کو بہ طور تحفہ ارسال کیے گئے تھے ۔ یہودی ان صندوقوں میں گھرا بے کھٹکے سو رہا تھا کہ آدھی رات گئے صندوقوں کے ڈھکنے اٹھے اور ان میں سے ان چالیس جان بازوں نے چپکے سے باہر نکل کر غاصب کو ٹھکانے لگا دیا اور سلطان کے نام سے شہر پر قبضہ کر لیا ۔ سلطان نے ضرورت کے وقت اپنی اس مدد کے شکریے کے طور پر طلباء کو یہ حق عطا فرما دیا کہ وہ ہر سال اپنا ایک سلطان مقرر کر لیا کریں ۔ یہ روایت محض ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے ، جو غالباً کسی ایسے قدیم دستور کی تاویل کے لیے گھڑی گئی ہے ، جس کے صحیح معنی اور اصلیت لوگوں کے ذہن سے محو ہو گئی ہو ۔

کارن وال میں لاسٹ و تھیل کے مقام پر ہر سال ایک نقلی بادشاہ کو مقرر کرنے کا دستور سولھویں صدی تک جاری تھا ۔ ''ایسٹر کے چھوٹے اتوار'' کو قصبے اور علاقے کے جاگیردار ایک اجتماع میں یا تو خود شریک ہوتے یا اپنے نمایندوں کو بھیج دیتے ۔ ان میں جس شخص کی باری ہوتی وہ زرق برق پوشاک میں ملبوس سر پر تاج رکھے ، ہاتھ میں ایک عصا لیے بڑی شان سے گھوڑے پر سوار ہو کے گرجے کی جانب روانہ ہوتا ۔ اس کے آگے آگے ایک تلوار لے جائی جاتی اور دوسرے سب لوگ خدام کی طرح اس کے ہم رکاب ہوتے ۔ پادری اپنی بہترین عبا پہنے گرجے کے قبرستان کے زینے پر اس کا استقبال کرتا اور اسے دعا سننے کے لیے گرجے میں لے جاتا ۔ گرجے سے رخصت ہو کر وہ اسی شان سے ایک گھر کا رخ کرتا ، جس میں اس کے خیر مقدم کا انتظار ہوتا ۔ یہاں اس کے اور اس کے خدم و حشم کے لیے محفل طعام کا بندوبست ہوتا اور جب وہ میز پر صدر نشین ہوتا ، لوگ ان تمام آداب و رسوم کے ساتھ جو کسی والیٔ ریاست کی شان کے شایاں ہوں ، اسے گھٹنوں کے بل جھک کر کھانا پیش کرتے ۔ یہ رسم ایک ڈنر پر ختم ہو جاتی اور اس کے بعد حاضرین محفل اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے ۔

بعض صورتوں میں عارضی بادشاہ ہر سال کی بجائے ہر نئے بادشاہ کے آغاز حکومت پر تخت نشین ہوتا ہے ۔ چناں چہ سوماٹرا کی سلطنت جامبی میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی نیا بادشاہ زمام حکومت سنبھالتا ہے تو عوام میں سے ایک فرد دن بھر کے لیے اختیارات شاہی کے ساتھ تخت پر جلوس کرتا ہے ۔ اس دستور کی توجیہ میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ کسی زمانے میں پانچ شہزادے تھے ۔ ان میں جو چار بڑے تھے وہ مختلف جسمانی عیوب کی بناء پر اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں تخت و تاج سے دست بردار ہو گئے ، لیکن سب سے بڑے بھائی نے ایک دن کے لیے تخت نشین ہو کر اپنی اولاد کے لیے ہر نئے بادشاہ کے آغاز حکومت پر یک روزہ حکومت کا حق محفوظ کر لیا ۔ اس طرح عارضی بادشاہت کا حق خان وادۂ شاہی کے رشتے کے ایک کنبے میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آیا ہے ۔ غالباً بلاسپور میں یہ دستور ہے کہ کسی راجا کی موت پر برہمن اس کے مردہ ہاتھ سے کھیر کھاتا ہے اور پھر سال بھر کے لیے راج گدی پر بیٹھ جاتا ہے ۔ سال کے ختم ہونے پر اسے نذریں پیش کی جاتی ہیں اور عمر بھر کے لیے ملک سے نکال دیا جاتا ہے ۔ ''اس کی پشت پر یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ راجا کی روح اس کے ہاتھ سے کھیر کھانے والے برہمن میں منتقل ہو جاتی ہے ، اس لیے کہ بہ ظاہر سال بھر برہمن کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے اور اسے جانے نہیں دیا جاتا ہے ۔ خیال ہے کہ یہی یا اسی قسم کا ایک دستور کانگڑے کی کہستانی ریاستوں میں جاری ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ متوفی بادشاہ کے برہمن نمائندے کو ملک سے نکالنے کی یہ ریت اس کے قتل کے دستور کی ترمیم شدہ صورت ہو ۔ والیٔ کارنتھیا (آسٹریا) کی مسند نشینی کے موقع پر یہ ہوا کرتا تھا کہ کوئی کسان جس کے خاندان میں یہ منصب وراثتاً چلا آتا تھا ، ایک وسیع وادی کے سبزہ زاروں میں رکھے ہوئے ایک سنگ مرمر پر متمکن ہو جاتا تھا ۔ اس کی دائیں جانب ایک گئو ماتا کھڑی ہوتی اور بائیں جانب ایک مریل سی گھوڑی ۔ اس کے چاروں طرف دیہاتیوں کی بھیڑ لگ جاتی ۔ پھر ریاست کا آئندہ والی گڈریے کا عصا ہاتھ میں لیے اہل دربار اور عمال کی

معیت میں اس کے پاس پہنچتا ۔ اسے آتا دیکھ کر مذکورہ بالا کسان آواز لگاتا ''یہ کون شخص ہے جو سینہ تانے چلا آتا ہے ؟'' لوگ جواب میں کہتے ''والیٔ ریاست'' پھر اس کسان کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا تھا کہ وہ ساتھ پنس ، گائے ، گھوڑی اور معافی محصول کے بدلے تخت مرمریں رئیس کے حوالے کر دے ۔ لیکن وہ اپنی جگہ چھوڑتے چھوڑتے رئیس کے ایک ہلکا سا طمانچہ رسید کر جاتا ۔

اس ضمن میں دوسرے شواہد پر غور کرنے سے پہلے مذکورہ بالا عارضی بادشاہوں کے متعلق چند نکات خاص طور پر محتاج توجہ ہیں ۔ سب سے پہلے یہ کہ ان بادشاہوں کی کمبوڈیائی اور سیامی مثالوں سے بالکل واضح ہے کہ بادشاہ کے جو فرائض اس کے قائم مقام کو تفویض کیے جاتے ہیں وہ بالخصوص اس کے الٰہی یا سحری فرائض ہوتے ہیں ۔ یہ بات اس عقیدے سے ظاہر ہوتی ہے کہ سیام کا عارضی بادشاہ اپنی ایک ٹانگ اٹھی رکھ کر خبیث روحوں کو زیر کر لیتا ہے ، اور برخلاف اس کے اگر وہ اسے ٹکا دے تو ریاست کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ ''چاول کے پہاڑ کو'' پامال کرنے کی کمبوڈیائی رسم اور جتائی اور بوائی کے افتتاح کی سیامی ریت وافر فصل پیدا کرنے کے سحری عمل ہیں ، جیسا کہ اس عقیدے سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے ہاں ، جو روندے ہوئے چاول یا بوئے ہوئے بیج تبرک کے طور پر گھر لے جائیں گے ، فصل اچھی ہوگی ۔ اس کے علاوہ جب سیامی بادشاہ کا قائم مقام ہل چلاتا ہے تو لوگ بڑے تردد سے اسے دیکھتے رہتے ہیں ۔ لیکن ان کی نظر اس پر نہیں ہوتی کہ وہ ہل سیدھا چلاتا ہے یا نہیں ، بلکہ ان کی توجہ کا مرکز آسمانی لشکر کے سردار کے چغے کا گراؤ ہوتا ہے ۔ اگر وہ اپنا چغہ گھٹنوں کے اوپر کھینچ لے تو آئندہ موسم میں زبردست بارش ہوگی اور فصل خراب ہو جائے گی ۔ اگر وہ چغہ کو اپنے ٹخنوں تک چھوڑ دے تو اس کا نتیجہ امساک باراں ہوگا ، لیکن اگر چغے کا کنارہ صرف آدھی آدھی پنڈلیوں تک لٹکتا رہے تو موسم اچھا اور فصل بھرپور ہوگی ۔ گویا فطرت کے عمل اور اس کے ساتھ قوم کی شادی یا غم کا تمام تر دار و مدار بادشاہ کے نمائندے

کی ایک خفیف سی حرکت پر تھا ۔ لیکن فصل اگوانے اور بڑھوانے کا کام جو اس صورت سے عارضی بادشاہوں کو تفویض ہوتا ہے ، ان سحری فرائض میں سے ایک ہے جو غیر ترقی یافتہ معاشرے میں جاہلی عقائد کی رو سے بادشاہوں کو انجام دینے پڑتے ہیں ۔ وہ دستور جس کے مطابق نقلی بادشاہ کو دھان کے کھیت میں چبوترے پر ایک ٹانگ اٹھائے کھڑا ہونا پڑتا ہے ، شروع شروع میں ایک ایسے جادو سے عبارت تھا ، جس کے اثر سے فصل کی مکمل نشو و نما مقصود ہو ۔ کم از کم اسی قسم کی ایک رسم کا مقصد یہی کچھ تھا جو اگلے زمانے میں پروشیا والوں کے ہاں جاری تھی ۔ اس میں سب سے بلند قامت لڑکی اپنے دامن میں کیک بھرے ، داہنے ہاتھ میں برانڈی کا پیالہ اور بائیں میں نارون کی چھال لیے ایک چبوترے یا تخت پر ایک ٹانگ اٹھائے کھڑی ہو جاتی اور ویزگان تھاس دیوتا سے پرارتھنا کرتی کہ سن بڑھ کر اتنا ہی اونچا ہو جائے جتنی وہ خود ہے ۔ پھر وہ برانڈی کا پیالہ چڑھا کر اسے دوبارہ بھرواتی اور دیوتا کی نذر کے طور پر اسے زمین پر انڈیلتی اور دیوتا کی خادم روحوں کے لیے کیک نیچے پھینک دیتی ۔ اگر وہ تمام وقت ایک ٹانگ پر جمی کھڑی رہتی تو یہ سگن لیا جاتا کہ سن خوب پیدا ہوگا اور جو وہ پیر زمین پر ٹیک دیتی تو فصل کے خراب ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ۔ شاید برھمنوں کے جھولنے کی اس رسم کا مطلب بھی یہی تھا ، جس کا تماشا کبھی آسامی لشکر کے سردار کو ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کے دیکھنا پڑتا تھا ۔ مثلی یا صوری سحر کے اصول کی بنا پر شاید خیال یہ تھا کہ پنڈت کی پینگ جتنی اونچی جائے گی ، اتنا ہی دھان بھی اونچا اگے گا ، کیوں کہ اس رسم کو فصلی تیوہار بتایا گیا ہے ۔ نیز جھولنے کا دستور روس کے لیتوں میں بھی جاری ہے ، جس سے صریحاً فصل کو متاثر کرنا مقصود ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ موسم بہار اور آغاز گرما میں ایسٹر اور حضرت یوحنا کے عرس (راس السر خان) کے درمیان ہر لیتی اپنی فرصت کے وقت جھولنے میں منہمک ہو جاتا ہے ، اس لیے کہ اس کے عقیدے کی رو سے وہ جتنی لمبی پینگ لے جائے گا اس کا سن اتنا ہی لمبا ہوگا ۔

متذکرہ بالا صورتوں میں عارضی بادشاہ کا تقرر ایک دستور کے بموجب باضابطہ ہر سال عمل میں آتا ہے، لیکن دوسری صورتوں میں اسے کسی ہنگامی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ مثلاً جب اصلی بادشاہ کسی مصیبت سے دوچار ہو، یا اسے کوئی خطرہ لاحق ہو تو اس کی بلا کسی قائم مقام کے سر منڈھنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو کچھ عرصے کے لیے اس کی جگہ تخت نشین ہو جاتا ہے۔ ایران کی تاریخ اس قسم کے ہنگامی قائم مقام بادشاہوں سے بھری پڑی ہے۔ شاہ عباس اعظم کو ۱۵۹۱ء میں نجومیوں نے متنبہ کیا کہ اسے ایک شدید خطرہ لاحق ہے۔ شاہ اس خطرے کو اپنے سر پر سے ٹالنے کے لیے تخت و تاج سے دست بردار ہو گیا اور اپنی جگہ یوسفی نامی کسی مشرک کو، جو غالباً عیسائی تھا، اپنی جگہ تخت پر بٹھا دیا۔ چناں چہ بادشاہ کے اس قائم مقام کی تاج پوشی کی گئی اور اگر ایرانی مورخوں کا اعتبار کیا جائے تو اسے نہ صرف شاہی لقب اور شان و شوکت حاصل رہی بلکہ شاہی اختیارات بھی۔ پھر اس مختصر سے عہد حکومت کے اختتام پر اسے قتل کر دیا گیا۔ اس قربانی سے اقتضائے نجوم پورا ہو گیا اور عباس کو جو ساعت سعید پر دوبارہ سریر آرائے سلطنت ہوا، نجومیوں نے یہ امید دلائی کہ وہ مدت مدید تک بڑی عظمت و جلال کے ساتھ حکومت کرتا رہے گا۔

چھبیسواں باب

# شاہزادے کی قربانی

پچھلے باب میں جن عارضی بادشاہوں کی کیفیت بیان ہوئی ہے، ان کے متعلق ایک نکتہ یہ غور طلب ہے کہ وہ ایسے گھرانوں کے افراد ہوتے تھے، جن کی شاہی خاندان سے قرابت ہو۔ ان عارضی بادشاہتوں کی ابتداء کے بارے میں جو رائے قائم کی گئی ہے اگر وہ درست ہے تو یہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں رہتا کہ بعض صورتوں میں بادشاہ کے قائم مقام کا شاہی نسل سے تعلق رکھنا کیوں ضروری ہے۔ جب پہلے پہل بادشاہ کو ایسا شخص مل گیا، جس کی بھینٹ اس کی جگہ قبول کر لی گئی ہو تو لامحالہ اس کو یہ ثابت کرنا پڑا کہ اس صدقے کے آدمی کے قتل سے وہی مقصد پورا ہو جائے گا جو خود اس کی قربانی سے پورا ہوتا ہو۔ بادشاہ کو دیوتا یا نیم دیوتا کی حیثیت سے جان دینی پڑتی تھی؛ لہذا اس شخص کو، جو بادشاہ پر سے قربان ہوتا، کم از کم اس موقع کے لیے الٰہی خصوصیات سے متصف کرنا ضروری تھا اور جیسا کہ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں، سیام اور کمبوڈیا کے عارضی بادشاہوں کے ساتھ یہی کچھ ہوا کرتا تھا۔ ان سے وہ مافوق‌الفطرت مناصب منسوب کیے جاتے تھے جو غیر مہذب معاشرے میں پہلے صرف بادشاہ کے لیے مخصوص تھے۔ لیکن الٰہی حیثیت میں بادشاہ کی نمائندگی کے لیے خود اس کے بیٹے سے بہتر کون ہو سکتا تھا، جسے لوگوں کی دانست میں اپنے باپ کا علم غیب حاصل ہو۔ لہذا بادشاہ اور اس کے واسطے سے ساری

قوم کی خاطر جان دینے کے لیے بھی شاہزادے سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہو سکتا تھا ۔

ہم دیکھ آئے ہیں کہ سویڈن کے اون یا آن نامی بادشاہ نے اپنی جان بخشوانے کی غرض سے اپسالا میں اوڈن پر اپنے نو بیٹے بھینٹ چڑھا دیے تھے ۔ جب یہ بادشاہ دوسرے لڑکے کی قربانی دے چکا تو ندا آئی کہ جب تک وہ ہر نویں سال اپنا ایک بیٹا دیوتا کی نذر کرتا رہے گا ، اس کی جان سلامت رہی گی ۔ ساتویں لڑکے کی قربانی کے بعد بھی وہ جیتا رہا ، لیکن اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اس سے چلا نہیں جاتا تھا اور کرسی پر بٹھا کر اسے لے جانا پڑتا تھا ۔ پھر اس نے اپنا آٹھواں بیٹا بھی دیوتا کو پیش کر دیا اور بستر پر پڑے پڑے نو برس اور جیتا رہا ۔ اس کے بعد نویں لڑکے کی باری آئی جس کی قربانی کے بعد مزید نو سال تک وہ زندہ تو رہا لیکن اس حال کو پہنچ گیا تھا کہ شیر خوار بچے کی طرح ایک سینگ نما نلکی کے ذریعے اس کے جسم میں غذا پہنچائی جاتی تھی ۔ اب اس کا صرف ایک بیٹا باقی رہ گیا تھا اور اسے بھی وہ اوڈن کی نذر کر دینا چاہتا تھا ، لیکن سویڈن کے لوگوں نے اسے ایسا نہ کرنے دیا ، چناں چہ اس نے قضا کی اور اپسالا میں ایک ٹیلے کے تلے دفن کیا گیا ۔

یونان قدیم کے قرون اولیٰ کے بادشاہوں میں کم از کم ایک خاندان ضرور ایسا رہا ہوگا ، جس میں بادشاہ کی جگہ اس کے سب سے بڑے لڑکے کو قربان کرنے کا دستور تھا ۔ جب زرکسیز (خشیارشا ، ایران کے ہخا منشی سلسلے کا جلیل القدر بادشاہ ۴۸۵ تا ۴۶۵ ق ۔ م) تھرموپیلے میں اہل اسپارٹا پر حملہ کرنے کے لیے اپنے لشکر جرار کے ساتھ تھیسلی سے کوچ کرتا ہوا شہر ایلس پہنچا تو یہاں اسے لافستیائی زیوس کا معبد دکھایا گیا ۔ اس کے متعلق شہنشاہ کے رہنماؤں نے اسے ایک عجیب کہانی سنائی ، جو کچھ اس طرح تھی : کسی زمانے میں اس ملک کے ایک بادشاہ موسوم بہ اتھاماس نے نیفلے نامی ایک عورت سے شادی کی ، جس کے بطن سے اس کے ہاں ایک لڑکا فریکسس اور ایک لڑکی ہیلے پیدا ہوئے ۔ اس کے بعد اس نے ایک اور عورت آئینو سے

شادی کی اور اس سے دو لڑکے لرکس اور میلے سرٹیس پیدا ہوئے۔ اس دوسری بیوی نے، جو اپنے سوتیلے بچوں سے بہت جلتی تھی، انہیں مروانے کی سازش کی اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے بڑے جال پھیلائے۔ سب سے پہلے تو اس نے یہ کیا کہ ملک کی عورتوں کو گانٹھ کر انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اگلی فصل کے اناج کے بیجوں کو بوائی سے پہلے چپکے سے بھون لیں۔ چناں چہ آئندہ سال کوئی فصل نہ ہوئی اور لوگ سب قحط سے مرنے لگے۔ پھر بادشاہ نے قحط سالی کا سبب معلوم کرنے کے لیے اپنا ایک قاصد ڈیلفائی کے غار ندا کو روانہ کیا، لیکن بد باطن سوتیلی ماں نے اسے بھی رشوت دے کر دیوتا کی طرف سے اس جواب کا اعلان کرنے کے لیے ہم وار کر لیا کہ جب تک اتھاماس اپنی پہلی بیوی کے دونوں بچے زیوس پر بھینٹ نہ چڑھا دے، قحط دور نہ ہوگا۔ اتھاماس نے یہ سنا تو اپنے بچوں کو بلوا بھیجا۔ یہ اس وقت اپنی بھیڑوں میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں ایک دنبے نے جس کی پشم سونے کی تھی، اپنی زبان کھولی اور انسان کی طرح بولتے ہوئے بچوں کو خطرے سے آگاہ کیا۔ وہ اس دنبے پر سوار ہو گئے اور راہ فرار اختیار کی۔ وہ بحر و بر پر سے اڑے جاتے تھے کہ راستے میں ایک جگہ سمندر پر لڑکی دنبے کی پیٹھ سے کھسک گئی اور پانی میں گر کر ڈوب گئی۔ لیکن اس کا بھائی فریکسس ملک کول کس پہنچ گیا، جہاں سورج دیوتا کے ایک بیٹے کی حکومت تھی۔ فریکسس نے اس بادشاہ کی لڑکی سے شادی کر لی، جس کے بطن سے اس کے ہاں ایک بیٹا سائی ٹی سورس پیدا ہوا۔ وہاں اس نے اس دنبے کو زیوس پناہی پر بھینٹ چڑھا دیا اور اس کی طلائی پشم اپنے خسر کی نذر کر دی۔ گو بعضوں کا خیال ہے کہ اس نے دنبے کو زیوس لافستیائی کی نذر کیا تھا۔ اس کے خسر نے پشم کو اریس (یونانی دیو مالا میں جنگ کا دیوتا جو زیوس اور ہیرا کا بیٹا تھا، اسی کا رومی نام مارس ہے) کے شجر زار کے ایک بلوط میں ٹھونک دیا، جس کا محافظ ایک اژدھا تھا، جو سدا جاگتا رہتا تھا۔ اس اثناء میں آدھر ندائے غیب نے یہ حکم دیا کہ ملک و ملت کی خاطر خود شاہ اتھاماس کر بہطور کفارہ قربان کر دیا جائے۔

چناں چہ لوگ اسے قربانی کے آدمی کی طرح ہار پہنا کر قربان گاہ لے گئے ۔ وہاں اسے ذبح کیا ہی جانے والا تھا کہ سائی ٹورس نے ، جو عین اس وقت کول کس سے پہنچا تھا ، اس کی جان بچا لی یا پھر ہرکلیز نے ، جو یہ خبر لے کے پہنچا تھا کہ بادشاہ کا لڑکا فریکسس ابھی زندہ ہے ۔ اس طرح اتھاماس بچ گیا ، لیکن بعد میں وہ دیوانہ ہو گیا اور اپنے بیٹے لرکس کو درندہ سمجھ کر تیر کا نشانہ بنا ڈالا ۔ پھر اس نے اپنے آخری لڑکے میلے سرٹیس کو قتل کرنے کی کوشش کی ، لیکن اس کی ماں آئی نو نے اسے بچا لیا ، جو دوڑتی ہوئی آئی اور بچے کو لے کر ایک اونچی چٹان پر سے سمندر میں چھلانگ لگا دی ۔ ماں اور بچہ دونوں بحری دیوی دیوتاؤں میں تبدیل ہو گئے ۔ بچے کو جزیرۂ ٹینے ڈوس میں بچوں کی بھینٹ کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا جانے لگا ۔ بد نصیب اتھاماس بیوی بچوں سے یوں محروم ہو کر اپنا دیس چھوڑ گیا اور ہاتف غیبی سے پوچھا کہ اس کے بعد وہ کہاں بسے ، جس کا جواب ملا کہ وہ کسی ایسی جگہ جا رہے جہاں درندے اس کی خاطر کریں ۔ چناں چہ چلتے چلتے راستے میں اسے بھیڑیوں کا ایک غول ملا جو ایک بھیڑ کو چیر پھاڑ رہا تھا ۔ جب ان درندوں نے اسے آتا دیکھا تو بھاگ کھڑے ہوئے اور اپنے منہ کا تازہ شکار اس کے لیے چھوڑ گئے ۔ اس صورت سے پیشین گوئی پوری ہو گئی ۔ لیکن چوں کہ شاہ اتھاماس کو ملک کے گناہوں کے کفارے کے طور پر قربان نہیں کیا گیا تھا ، لہذا دیوتا نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کے خاندان کی ہر پیڑی میں بڑا لڑکا جب کبھی ٹاؤن ہال میں قدم رکھے ، جہاں لافستیائی زیوس کو اسی کے گھرانے کا ایک فرد قربانیاں دیا کرتا تھا ، بھینٹ چڑھا دیا جائے ۔ زرکسیز کو یہ بتایا گیا کہ تباہی سے بچنے کے لیے اس کے خاندان کے بہت سے لوگ دوسرے ملکوں میں چلے گئے ، لیکن ان میں کچھ عرصۂ دراز کے بعد لوٹ آئے اور جب ٹاؤن ہال میں داخل ہوئے تو سنتریوں نے انھیں گرفتار کر لیا ۔ حسب دستور پھول پہنا کر ان کا جلوس نکالا گیا اور پھر انھیں قربان کر دیا گیا ۔'' ایسی مثالیں اگر بہ کثرت نہیں ملتیں تو مشہور ضرور ہیں ۔ ایک مکالمے کا لکھنے والا ،

جو افلاطون سے منسوب کیا جاتا ہے ، کارتھیجیوں کی انسانی قربانیوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ اس قسم کی رسموں سے اہل یونان نا آشنا نہیں تھے اور اس ضمن میں وہ بڑی نفرت سے ان قربانیوں کا حوالہ دیتا ہے ، جو کوہ لی کیئیس پر اور اتھاماس کی اولاد میں کی جاتی تھیں ۔

پلوٹارک کے عہد میں بیوشیا کے ایک قدیم شہر آرکومینس میں ، جو اس مورخ کی جنم بھومی (کیرونیا) سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھا ، انسانی قربانی کے ایک واقعے سے اس شک کو تقویت پہنچتی ہے کہ اہل یونان کے ہاں یہ جاہلی دستور اس کے بعد بھی ایک زمانے تک جاری رہا ہوگا۔ اس شہر میں ایک خاندان آباد تھا جس کے مردوں کو ''Psoloeis'' یعنی ''کلوٹے'' کہا جاتا تھا اور عورتوں کو ''Olea'' یعنی ''تباہ کار'' ۔ ہر سال ایگریونیا (اس لفظ سے ذہن زراعت کی طرف منتقل ہوتا ہے ، لیکن اس تیوہار کا فصل وغیرہ سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ ایگریونیا کے معنی اجتماع یا جلسے کے ہیں) کے تیوہار میں ڈایونائی سس کا پجاری ننگی تلوار لیے ان عورتوں کا تعاقب کرتا اور اگر وہ ان میں سے کسی کو جا لیتا تو اس کو قتل کرنے کا مجاز ہو جاتا ۔ پلوٹارک کی زندگی میں زائی لس نامی ایک پجاری نے اپنے اس اختیار سے کام لیا تھا ۔ اس گھرانے کے اسلاف ، جس کو اس طرح ہر سال اپنے کم از کم ایک فرد کی بھینٹ دینی پڑتی تھی ، بادشاہ گزر چکے تھے ، اس لیے کہ وہ اپنا سلسلۂ نسب شاہ منیاس سے ملاتے تھے ۔ یہ وہ قدیم بادشاہ تھا ، جس کی دولت کے افسانے مشہور تھے اور جس کے شان دار خزانے کے کھنڈر آج بھی اس جگہ کھڑے ہیں جو کوہ آرکومینس اور کوپائی میدان کا نقطۂ اتصال ہے ۔ روایت کے بموجب اس بادشاہ کی تین لڑکیاں تھیں جو مدتوں ملک کی دوسری عورتوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتی رہیں کیوں کہ مؤخرالذکر اپنے آپ پر باخوسی جذبہ (باخوس ، شراب وغیرہ کا یونانی دیوتا) طاری کر لیتی تھیں ۔ جب یہ عورتیں پھول پہنے اور ہوا میں بال بکھیرے وجد کی حالت میں ان خشک پہاڑیوں پر چڑھتیں جو آرکومینس کے بالمقابل کھڑی ہیں اور ان کے طنبوروں اور جھانجھوں کی آواز سنسان

پہاڑیوں میں گونجتی تو شہزادیاں بڑی حقارت سے محل میں اپنے راجھوں پر بیٹھی کام کرتی رہتیں ۔ لیکن کچھ عرصے بعد خود ان شاہزادیوں پر بھی دیوتا آگیا اور ان کا وہ سارا سکون ختم ہو گیا ۔ انسانی گوشت کی خواہش انھیں بری طرح ستانے لگی اور انھوں نے آپس میں قرعہ اندازی کی کہ کون اپنے بچے کی قربانی دے ۔ قرعہ لیوسی پے کے نام نکلا اور اس نے اپنے بیٹے ہپاسس کو پیش کر دیا ، جس کے ان تینوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ۔ ان گم راہ عورتوں کی کوکھ سے Olea اور Psoloeis نے جنم لیا جن میں مردوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا یہ نام اس لیے پڑ گیا کہ وہ سوگ میں سیاہ کپڑے پہنے رہتے تھے ۔

اب آرکومینس میں ایک شاہی خاندان کے اس دستور کی اہمیت اس لیے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ روایت کے بموجب سر زمین آرکومینس پر منیاس کے عہد سے بہت پہلے خود اتھاماس کی حکومت رہ چکی تھی ، نیز اس لیے کہ یہ شہر کوہ لافستیس کے دامن میں واقع تھا ، جس پر تھیسلی کے شہر ایلس کی طرح لافستیائی زیوس کی ایک عبادت گاہ تھی ، جہاں حسب روایت اتھاماس اپنے بچوں فریکسس اور ہیلے کی قربانی کرنا چاہتا تھا ۔ اتھاماس کے بارے میں جو روایات چلی آئی ہیں ان کا بہ حیثیت مجموعی اس کی اولاد سے متعلق اس دستور سے مقابلہ کیا جائے ، جس پر تاریخی زمانوں میں بھی عمل درآمد ہوتا رہا تھا تو ہمارے اس استنباط کا جواز نکل آتا ہے کہ تھیسلی اور غالباً بیوشیاء بھی کسی زمانے میں ایک ایسے سلسلۂ شاہی کے زیر نگیں رہ چکے تھے جس کے بادشاہوں کو ملک و ملت کی خاطر اس دیوتا پر بھینٹ چڑھنا پڑتا تھا جو لافستیائی زیوس کے نام سے موسوم تھا ۔ انھوں نے بڑی چالاکی سے اپنی یہ ذمہ داری اپنی اولاد کے سر منڈھ دی ، جن میں سب سے بڑا لڑکا باقاعدہ قربان گاہ کے لیے وقف ہونے لگا ۔ پھر زمانے کے ساتھ ساتھ ، اس دستور میں تبدیلیاں ہوتی گئیں ، یہاں تک کہ شاہزادے کے صدقے میں مینڈھا قبول کیا جانے لگا ۔ لیکن شرط ہمیشہ یہ رہی کہ شاہزادہ ٹاؤن ہال میں قدم نہ رکھے ،

جہاں اس کے گھرانے کا ایک فرد لا فستیانی زیوس کی قربانی کی رسمیں ادا کیا کرتا تھا ۔ لیکن اگر وہ اس شرط کو پس پشت ڈال کر اپنے مقتل میں قدم رکھ دیتا اور خود ہی اپنے آپ کو اس دیوتا کے آگے پیش کر دیتا جس نے از راہ تلطف خود اس کی جان کے بدلے مینڈھے کی قربانی سے چشم پوشی کر رکھی تھی تو قدیم دستور اپنی اصلی صورت میں پورے شد و مد کے ساتھ بروئے کار آ جاتا اور شاہزادے کے لیے مرنے کے سواء کوئی چارہ نہ ہوتا ۔ وہ روایت جس کے بموجب بادشاہ یا اس کی اولاد کی قربانی شدید قحط سالی کے ساتھ وابستہ تھی، صاف اس عام جاہلی عقیدے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بادشاہ موسم اور فصلوں کا ذمہ دار ہے اور اگر موسم یا فصل خراب ہو جائے تو اس کے کفارے کے طور پر بادشاہ کی قربانی جائز ہے ۔ غرض کہ اتھاماس اور ابنائے اتھاماس کے منصب میں سحری و مذہبی اور شاہی فرائض یک جا رہے ہوں گے ۔ اس رائے کی پر زور تائید اتھاماس کے بھائی سالموئیس کے ادعائے خدائی سے ہوتی ہے ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ گستاخ خاکی کا پتلا جس دیوتا کی خدائی کا مدعی تھا وہ خود زیوس تھا اور اسے بہ زعم خود برق و رعد پر قدرت تھی جن کی نقل وہ دیگوں کی کھنک اور مشعلوں کی چمک کے ذریعے کر کے گویا ان کا منہ چڑایا کرتا تھا ۔ اگر اس کی اس مصنوعی گرج چمک کو نظائر کی روشنی میں جانچا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ وہ سب کچھ نرا ڈھونگ نہ تھا ، بلکہ صوری افسوں تھا جس کے ذریعے جادوگر بادشاہ آسمان پر سچ مچ گھن گرج اور بجلی پیدا کرنے کی اپنی سی کوشش کیا کرتا تھا ۔

مغربی ایشیا کے سامیوں میں جب قوم کسی خطرے سے دو چار ہوتی تو بادشاہ بعض وقت ملک و ملت کی خاطر اپنے بیٹے کو قربان کر دیا کرتا تھا ۔ فلونے ببلسی (یا فلون آف ببلوس) یہودیوں پر اپنی تصنیف میں رقم طراز ہے : ''یہ دستور زمانۂ قدیم سے چلا آتا تھا کہ ہنگامی صورت حال میں کسی شہر یا قوم کے حکم ران کو قوم کی خاطر کینہ ور شیاطین کی نذر کے لیے اپنا چہیتا بیٹا پیش کر دینا پڑتا تھا ۔ چناں چہ جب کرونس ، جسے فونیقی اسرائیل کہتے تھے ، سریر آرائے

سلطنت تھا تو دشمن نے ملک پر چڑھائی کر دی ؛ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے موسوم بہ جیوڈ کو خلعت شاہی پہنا کر قربان کر دیا ۔'' جب بنی اسرائیل نے شاہ موآب کا محاصرہ کر لیا اور وہ بری طرح گھر گیا تو اس نے اپنے بڑے لڑکے کو جو ولی عہد تھا ، شہر پناہ پر سوختنی قربانی کے طور پر پیش کر دیا ۔

ستائیسواں باب

# روح کی وراثت

قرون اولیٰ میں غیر مہذب نسلوں کی میعادی بادشاہت اور شاہ کشی کے نظریے پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر اس قسم کا کوئی دستور واقعی جاری رہا ہوتا تو شاہی خاندان نیست و نابود ہو جاتے ۔ اس اعتراض کا ایک جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ بادشاہت اکثر و بیشتر کسی ایک خاندان تک محدود نہیں ہوتی ، بلکہ باری باری کئی خاندانوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے ۔ دوسرے یہ کہ اکثر صورتوں میں یہ منصب موروثی نہیں ہوتا اور اس پر کسی بھی خاندان کے افراد بلکہ وہ غیر ملکی بھی فائز ہو سکتے ہیں ، جو ضروری شرائط پوری کر سکیں ؛ جیسے کسی شاہزادی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا یا بادشاہ وقت کو میدان کارزار میں شکست دینی ۔ تیسرے یہ کہ اگر اس دستور سے خانوادۂ شاہی کے خاتمے کا امکان بھی تھا تو اس چیز کی آن لوگوں کی نظر میں کیا اہمیت ہو سکتی تھی ، جو ہماری طرح نہ عاقبت اندیش تھے اور نہ جن کی نظر میں انسانی زندگی کی وہ وقعت تھی جو ہماری نظر میں ہے ۔ بہت سے افراد کی طرح بہت سی نسلیں بھی ایسے رسم و رواج کی پابند رہی ہیں ، جن سے مآل کار ان کا صفحۂ ہستی سے مٹ جانا ناگزیر ہو ۔ چناں چہ پولینیشیائی غالباً اپنے بچوں کے ایک ثلث کو باضابطہ قتل کر دیا کرتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ مشرقی افریقہ کے بعض حصوں میں پیدائش پر بچوں کے قتل کا

یہی تناسب ہے اور صرف وہی بچے زندہ رہنے دیے جاتے ہیں ، جو خاص شکل و شباہت لے کے آئے ہوں ۔ انگولا کے ایک جارح و جنگ جو قبیلے جاگا کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں بلا کسی استثناء کے تمام بچے مار دیے جاتے تھے ، تاکہ کوچ کرتے وقت عورتوں پر ان کا بوجھ نہ رہے ۔ یہ جاگا تیرہ یا چودہ سال کے ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کو متبنیٰ کرکے اپنی جمعیت میں بھرتی کر لیا کرتے تھے ، جن کے ماں باپ کو وہ موت کے گھاٹ اتار کے کھا گئے ہوں ۔ جنوبی امریکہ کی ایم بایا قوم کی عورتیں آخری بچے یا اس بچے کے سوا ، جسے انھوں نے آخری سمجھ لیا ہو ، قتل کر دیتی تھیں ۔ اگر ان میں کسی عورت کے ہاں اس بچے کے بعد کوئی اور اولاد ہوتی ، تو وہ اسے بھی ٹھکانے لگا دیتی ۔ لہذا یہ امر چنداں باعث تعجب نہیں کہ مذکورہ بالا دستور کی وجہ سے اس قوم کی پوری ایک شاخ کا بیج مر گیا ، جس نے برسوں اہل ہسپانیہ کے دانت کھٹے کر رکھے تھے ۔ گر ان چاکو کے لنگواؤں کو عیسائی مبلغوں نے ایک ایسے دستور کا پابند پایا ، جو انھی کے الفاظ میں ''اسقاط حمل اور دوسری عورتوں سے طفل کشی کے ذریعے نسل کشی کا ایک سوچا سمجھا منظم طریقہ'' تھا ۔ لیکن وحشی قبیلے ایک طفل کشی ہی کے ذریعے خودکشی نہیں کرتے ، اس کا ایک اسی قدر مؤثر طریقہ بے گناہی کے ثبوت میں زہر خوری بھی ہے ۔ کچھ عرصہ ہوا ایک چھوٹا سا قبیلہ ، جس کا نام اویت تھا ، مغربی افریقہ میں اپنے پہاڑی علاقے سے اتر کر دریائے کالا بار کی بائیں جانب آباد ہو گیا ۔ جب مسیحی مبلغ چل پھر اس مقام پر پہنچے تو انھیں وہاں خاصی آبادی نظر آئی ، جو تین قریوں میں بٹی ہوئی تھی ۔ اس وقت سے متواتر آزمائشی زہر خوری کے سبب اب اس قبیلے کا قریب قریب خاتمہ ہو چکا ہے ۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ساری کی ساری آبادی نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے زہر کھا لیا ۔ اس میں سے آدھے آدمی اسی وقت مر گئے ۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ ان میں جو باقی رہ گئے ہیں ، وہ ابھی تک اس متوہمانہ دستور کے پابند چلے آتے ہیں اور جلد ہی ان کا بھی خاتمہ ہونے والا ہے ۔ ان مثالوں

کے پیش نظر ہمیں یہ مانتے ہوئے ہچکچانا نہیں چاہیے کہ جو دستور کسی ایک خاندان کے مٹنے کا موجب ہو ، اس کی پابندی متعدد قبیلے بے تامل یا بے جھجک کرتے رہے ۔ ایسے جاہلی رسم و رواج کے معاملے میں کسی قسم کے اخلاقی تذبذب کو وحشیوں سے منسوب کرنا انہیں یورپی تہذیب کے معیار پر جانچنا ہے اور یہ ایک ایسی عام غلطی ہے جو ہمیشہ دہرائی جاتی ہے ۔ اگر قارئین میں سے کسی کا یہ خیال رہا ہو کہ ساری انسانی نسلیں تعلیم یافتہ انگریزوں ہی کی طرح سوچتی اور عمل کرتی ہیں تو باطل عقائد اور متوہمانہ رسم و رواج کے متعلق اس کتاب میں جو شواہد یک جا کیے گئے ہیں ، ان سے اس کی یہ شدید غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے ۔

یہاں انسانی خداؤں کے قتل کے دستور کی جو توجیہ پیش کی گئی ہے ، اس میں یہ بات مسلّم ہے یا کم از کم اس سے ہم آہنگ ضرور ہے کہ وحشی کے خیال میں مقتول دیوتا کی روح اس کے جانشین میں منتقل ہو جاتی ہے ۔ روح کے انتقال کے اس تصور کی میرے پاس شلوکوں کی ایک مثال کے سوا کوئی اور صریحی شہادت موجود نہیں ، جن کے ہاں مقدس بادشاہ کے قتل کی ریت ایک مخصوص صورت میں ملتی ہے اور جن کا یہ جزو ایمان ہے کہ ان کے سلاطین کے سلسلے کے بانی دیوتا کی روح اس کے ہر مقتول جانشین کی ذات میں جاری و ساری رہتی ہے ۔ لیکن اگر اس قسم کے عقیدے کے ثبوت میں صرف یہی ایک حقیقی مثال پیش کی جا سکتی ہے تو نظائر کی بناء پر یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ دوسری صورتوں میں بھی عام خیال کے بموجب مقتول دیوتا کی روح اس کے جانشینوں میں اسی طرح منتقل ہوتی رہی ہے ، گو روح کے اس فرضی انتقال کی کوئی بین شہادت موجود نہیں ۔ چناں چہ کسی دیوتا کے ایک انسان کے روپ میں قضا کرنے کے بعد دوسرے انسان کی صورت میں تشکل و ظہور پر اعتقاد کی کیفیت پہلے ہی بیان کی جا چکی ہے ۔ اور اگر انسان دیوتا کی طبیعی موت کی صورت میں ایسا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں جو ہلاکت کی صورت میں بھی اسی طرح اس کا تناسخ واقع نہ ہو ۔ جاہل اقوام یقیناً انسان کے انتقال روحانی

کے اس تصور سے پوری طرح آشنا ہیں ۔ نیاس کے دستور کی رو سے سرداری کے منصب پر باپ کے بعد اس کا سب سے بڑا لڑکا فائز ہوتا ہے ، لیکن اگر وہ کسی ذہنی یا جسمانی نقص کے سبب سرداری کا اہل قرار نہ پائے تو باپ اپنی زندگی ہی میں کسی اور بیٹے کو اپنا جانشین نامزد کر دیتا ہے ۔ تاہم جس لڑکے کو باپ اس طرح منتخب کرے ، اسے لازم ہے کہ اپنا حق وراثت منوانے کے لیے باپ کے مرنے وقت اس کے آخری سانس اور آخری سانس کے ساتھ اس کی روح کو اپنے منہ یا کسی تھیلی میں پکڑ لے ، اس لیے کہ ہر وہ شخص جو سردار کے آخری سانس کو پکڑ لیتا ہے اس کے مقررہ جانشین کا ہم سر بن جاتا ہے ۔ اسی لیے اس نام زد وارث کے دوسرے بھائی ، بلکہ غیر لوگ بھی ، سردار کی روح کو قفس عنصری سے پرواز کرتے وقت پکڑنے کے لیے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں ۔ نیاس میں مکان ستونوں پر زمین سے اٹھا کر تعمیر کیے جاتے ہیں ۔ ایک مرتبہ اتفاق سے سردار دم نزع فرش پر اوندھا پڑا ہوا تھا ، ایک امیدوار نے جھٹ فرش میں چھید کرکے اس کے آخری سانس کو بانس کی نلکی کے ذریعے منہ میں کھینچ لیا ۔ اگر سردار کے کوئی لڑکا نہ ہو تو اس کی روح کو ایک تھیلی میں پکڑ لیا جاتا ہے ۔ یہ متوفی کی ایک مورتی سے باندھ دی جاتی ہے اور پھر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کی روح مورتی میں منتقل ہوگئی ہے ۔

بعض صورتوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اور اس کے پیش روؤں کے درمیان روحانی رشتہ مؤخرالذکر کے کسی نہ کسی ایسے جسمانی جزو کی بناء پر قائم ہوتا ہے ، جس پر بادشاہ کا قبضہ ہو ۔ جنوبی سیلیبز میں راج پاٹ کے لوازم عموماً متوفی راجاؤں کے اجزائے جسم پر مشتمل ہوتے ہیں ، جنھیں تبرکات کے طور پر بڑی حفاظت سے رکھا جاتا ہے اور انھی کی بدولت راجا گدی کا مستحق قرار پاتا ہے ۔ اسی طرح جنوبی مدغاسکر کے ساکالاؤں میں متوفی بادشاہ کا منکا ، ناخن اور بالوں کی ایک لٹ مگرمچھ کے دانت میں سلاطین سلف کے ایسے ہی دوسرے آثار کے ساتھ بڑی احتیاط سے ایک علیحدہ مکان میں رکھے

جاتے ہیں ۔ تخت و تاج کا استحقاق الٰہی تبرکات کے قبضے پر موقوف ہوتا ہے ۔ اگر سلطنت کا جائز وارث ان سے محروم ہو جائے تو رعایا پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہتا اور جو شخص انہیں ہتھیا لے ، وہ بے چون و چرا بادشاہ تسلیم کر لیا جاتا ہے ۔ مغربی افریقہ میں جب سلطنت ابیو کوٹا کا بادشاہ الیک قضا کرتا ہے تو وہاں کے سر بر آوردہ لوگ اس کا سر تن سے جدا کر دیتے ہیں اور اسے مٹی کے ایک کشادہ برتن میں رکھ کر نئے بادشاہ کے حوالے کرتے ہیں ۔ یہ سر بادشاہ کے لیے ایک متبرک فتیش کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ بعض صورتوں میں نئے بادشاہ کو اپنے پیش رو کے مردہ جسم کا کوئی حصہ کھانا پڑتا ہے ، جس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے اس کے اندر شاہی نسل کی سحری اور دوسری خصوصیات کے منتقل ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہے ۔ چناں چہ ابیو کوٹا میں نہ صرف متوفی بادشاہ کا سر اس کے جانشین کو پیش کیا جاتا ہے بلکہ اس کی زبان بھی کاٹ کر مؤخرالذکر کو دی جاتی ہے کہ وہ اسے کھا جائے ۔ اسی لیے جب اس ملک کے لوگوں کو یہ کہنا ہوتا ہے کہ بادشاہ حکومت کرتا ہے تو وہ اس بات کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں : ''اس نے بادشاہ کو کھا لیا ہے ۔'' اسی قسم کا ایک دستور مغربی افریقہ میں لاگوس کے ایک شہر ابادان میں آج تک جاری ہے ۔ جب یہاں کا فرماں روا مرتا ہے تو اس کا سر کاٹ کر ملک کے رسمی حاکم اعلیٰ اویو کے الافین کو بھیج دیا جاتا ہے ، جو سرزمین یوروبا کا شہنشاہ ہے ، لیکن اس کا دل اس کا وارث کہا جاتا ہے ۔ چند ہی سال ہوئے کہ نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے موقع پر یہ رسم ادا کی گئی تھی ۔

مندرجہ بالا تمام شواہد کے پیش نظر یہ فرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ جب مقدس بادشاہ یا مذہبی پیشوا کو قتل کیا جاتا ہے تو عام عقیدے کی رو سے اس کی روح اس کے جانشین میں منتقل ہو جاتی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ سفید نیل کے علاقے کے شلوکوں کے ہاں ، جو اپنے

تقدس مآب سلاطین کو باضابطہ قتل کیا کرتے ہیں ، ہر بادشاہ کو ایک رسم ادا کرنی پڑتی ہے ، جس کی غرض و غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ نئے بادشاہ میں اس کے پیش روؤں کی مقدس روح پھونک دی جائے۔

اٹھائیسواں باب

# شجری روح کا قتل

(۱) سفید تیوہار کے بہروپیے—اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مقدس بادشاہ یا مذہبی پیشوا کے قتل کے دستور سے ہماری تحقیق کے خاص موضوع پر کیا روشنی پڑتی ہے ۔ اس کتاب کے ابتدائی حصے میں کہیں ہمیں یہ فرض کرنے کی وجہ نظر آئی تھی کہ نیمی والے بن کے بادشاہ کو شجری یا نباتی روح کا ایک مظہر سمجھا جاتا تھا اور اس حیثیت سے وہ اپنے پرستاروں کے عقیدے کے بموجب درختوں کو بار ور کرنے اور فصلوں کو نمو بخشنے وغیرہ وغیرہ کا استدراج رکھتا ۔ اس وجہ سے ظاہر ہے کہ اس کے عقیدت مندوں کے نزدیک اس کی زندگی بڑی قیمت رکھتی ہوگی اور غالباً وہ انھی گوناگوں اور صبر آزما قیود و امتناعات پر مشتمل ایک مکمل ضابطۂ حیات کا پابند ہوگا جو اور بہت سے مقامات پر بھوت پریت اور ساحروں کی شرارت سے بچاؤ کے لیے انسان دیوتاؤں پر عاید ہوتے تھے ۔ لیکن ہم دیکھ آئے ہیں کہ انسان دیوتا کی زندگی کی جو قدر و قیمت ہوتی ہے وہی اس کی ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے ، اس لیے کہ عمر رواں کے ساتھ ساتھ قویٰ کے ناگزیر انحطاط سے اس کی زندگی کے بچاؤ کی کوئی اور صورت ہی نہیں ، سوائے اس کے کہ اسے ہلاک کر دیا جائے ۔ یہی دلیل بن کے بادشاہ پر صادق آتی ہے ۔ اس کا بھی مارا جانا اس لیے ضروری تھا کہ وہ مقدس روح ، جو اس کی صورت میں متشکل ہوئی ہو ، صحیح و سالم اس کے جانشین

کی ذات میں منتقل ہو جائے۔ کسی قوی تر شخص کے ہاتھوں اس کے قتل اور اس طرح اس کی بادشاہت کے خاتمے کے دستور سے شاید مقصود یہ تھا کہ اس کی قوت حیات تمام و کمال محفوظ رہے، اور جوں ہی اس الوہی قوت میں کمی واقع ہونے لگے، اسے کسی ایسے شخص میں منتقل کر دیا جائے جو اس کی جگہ بادشاہت کے لیے زیادہ موزوں ہو، اس لیے کہ جب تک وہ بہ زور بازو اپنے اس منصب کو سنبھالے رہتا، یہ سمجھ لیا جاتا ہوگا کہ اس کی طبعی قوت جوں کی توں ہے۔ برخلاف اس کے کسی اور شخص کے ہاتھوں اس کی شکست اور ہلاکت اس بات کی دلیل تھی کہ اس کے قویٰ جواب دینے لگے ہیں اور اس کی روح کے کسی ایسے تن خاکی میں انتقال کرنے کا وقت آ چکا ہے جو نسبتاً صحیح اور مضبوط ہو۔ اس توجیہ سے اور کچھ نہیں تو بن کے بادشاہ کے قتل کی یہ صورت قابل فہم ضرور ہو جاتی ہے۔ شلوکوں کے اعتقاد و عمل سے اس کی پر زور تائید ہوتی ہے جو اپنے مقدس سلاطین کو صحت کے انحطاط کے آثار نمودار ہوتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا کرتے تھے تاکہ اس کا اضمحلال انماج، مویشی اور انسان کی قوت حیات پر اثر انداز نہ ہونے پائے۔ چٹوبے والی نظیر بھی، جس کی زندگی پر بقائے عالم کو موقوف سمجھا جاتا تھا، اور اس لیے جوں ہی اس سے کوئی کم زوری ظاہر ہوتی اس کا جانشین اسے قتل کر ڈالتا، ہماری اس توجیہ کی تصدیق کرتی ہے۔ نیز بعد کے زمانے میں کالی کٹ کے راجا کے راج پاٹ اور نیمی والے بن کے بادشاہ کے منصب سے متعلق شرطیں ایک ہی جیسی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جہاں مؤخرالذکر پر بادشاہت کا کوئی امیدوار کسی وقت بھی حملہ کر سکتا تھا وہاں کالی کٹ کے راجا پر بارہ سال میں صرف ایک مرتبہ یورش ہو سکتی تھی۔ لیکن جس طرح کالی کٹ کے راجا کو یہ اجازت کہ جب تک وہ اپنے آپ کو تمام حملہ آوروں سے محفوظ رکھ سکے حکومت کرتا رہے، ایک قدیم دستور کی نرم شدہ صورت تھی، جس کے مطابق اس کی زندگی کے دن مقرر تھے، اسی طرح یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بن کے بادشاہ کو جس شرط پر راج کرنے کی اجازت تھی وہ بھی ایک ایسے

قدیم دستور کی نرم شدہ صورت تھی ، جس کے بموجب اسے ایک معینہ مدت کے اختتام پر مار دیا جاتا تھا ۔ ان دونوں صورتوں میں ترمیم شدہ دستور کی بناء پر انسان دیوتا کو جینے کا کم از کم ایک موقع ضرور مل جاتا تھا جس کی قدیم دستور میں کوئی گنجائش نہ تھی اور لوگوں نے غالباً یہ سوچ کر اس تبدیلی کو قبول کر لیا کہ جب تک انسان دیوتا بہ زور شمشیر اپنی حفاظت کر سکے ، اس کے طبعی انحطاط کی طرف سے اندیشے کی کوئی وجہ نہیں ۔

ہم نے یہ جو قیاس آرائی کی ہے کہ بن کے بادشاہ کو کسی زمانے میں اپنے بچاؤ کا کوئی موقع دیے بغیر ایک مقررہ مدت کے بعد قتل کر دیا جاتا تھا ، اس کی تصدیق شمالی یورپ کے ایک ایسے دستور کے شواہد کی بناء پر ہو جائے گی جس کے مطابق اس بادشاہ کے مماثل شجری روح کے انسانی نمائندے وقتاً فوقتاً قتل ہوا کرتے تھے اور جس کے نقوش آج بھی اس علاقے کے دیہاتی تیوہاروں میں صاف نظر آتے ہیں ۔ ان کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں :

نائی ڈرپورنگ ، جنوبی بویریا میں شجری روح کے سفید عید والے نمائندے کو جسے پفنگ اسٹل کہا جاتا تھا ، سر سے پاؤں تک پھول پتوں میں ملبوس کر دیا جاتا تھا ۔ اس کے سر پر ایک اونچی نکیلی ٹوپی اڑھا دی جاتی ، جس کے کنارے اس کے شانوں پر پڑے ہوتے اور جس میں صرف دو چھید آنکھوں کے پاس رہنے دیے جاتے ۔ یہ ٹوپی آبی پھولوں سے ڈھکی ہوتی ، جن کے اوپر شقائق نعمان کا ایک گلدستہ سجا دیا جاتا ۔ اس کے کوٹ کی آستینیں بھی آبی پودوں کی بنی ہوتیں اور باقی جسم پر آلدر (بید یا برچ کی قسم کا ایک درخت) اور ہیزل (ایک یورپی پودا) کے پتے لپیٹ دیے جاتے ۔ اس پفنگ اسٹل کے دائیں بائیں دو لڑکے اس کے کوٹ کی آستینیں اٹھائے چلتے ۔ ان دونوں لڑکوں اور جلوس کے دوسرے آدمیوں کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں ہوتیں ۔ یہ جلوس تحفے تحائف کی امید دل میں لیے ہر گھر پر رکتا ہوا چلتا اور لوگ چھپ چھپ کر اس برگ پوش لڑکے پر چھینٹے اڑاتے اور جب وہ بھیگ کر شرابور ہو جاتا تو سب لطف اندوز ہوتے ۔ آخر میں

وہ ایک نالے کے اندر اتر کر چلتا ہوا اس کے بیچوں بیچ پہنچتا اور ایک لڑکا جو پل پر کھڑا ہوتا اس پر جھوٹ موٹ اس طرح وار کرتا جیسے اس کی گردن مارتا ہو ۔ سوے بیا میں ورم لنگن کے مقام پر سفید پیر کو کوئی بیس نوجوان اجلی قمیصیں اور پاجامے پہن لیتے ہیں اور سفید گلوبند کمروں سے لپیٹ لیتے ہیں جن سے تلواریں لٹکی ہوتی ہیں ۔ یہ گھوڑوں پر سوار جنگل کی طرف جاتے ہیں اور ان کے آگے دو ترمچی ہوتے ہیں ، جو اپنے ترم بجاتے چلتے ہیں ۔ جنگل میں پہنچ کر وہ ہری بھری ڈالیاں کاٹتے ہیں اور اس سوار پر ، جو سب سے پیچھے گاؤں سے روانہ ہوتا ہے ، یہ ڈالیاں لپیٹ دیتے ہیں ، جس میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اس کی ٹانگوں کو الگ الگ ڈھانکا جائے تاکہ وہ گھوڑے پر سوار ہو سکے ۔ اس کے علاوہ اسے ایک لمبی مصنوعی گردن دے دی جاتی ہے ، جس پر ایک مصنوعی سر اور چہرہ لگا ہوتا ہے ۔ پھر ایک شجر بہار کاٹا جاتا ہے ، جو عام طور پر تقریباً دس فٹ اونچے سفیدے یا بیچ پر مشتمل ہوتا ہے ۔ اسے رنگا رنگ رومالوں اور ربنوں سے آراستہ کیا جاتا ہے اور ایک خاص ''بہار بردار'' کو تھما دیا جاتا ہے ۔ پھر سواروں کا یہ دستہ گاتا بجاتا گاؤں واپس آتا ہے ۔ اس جلوس کی نمایاں شخصیتوں میں ایک سیاہ رو موری تاج دار ہوتا ہے ، ایک ڈاکٹر آہن ریش ، ایک کارپورل اور ایک جلاد ۔ یہ سب گاؤں کے سبزہ زار پر رک جاتے ہیں اور ان میں سے ہر بہروپیا ایک منظوم تقریر کرتا ہے ۔ اس کے بعد جلاد یہ اعلان کرتا ہے کہ اس برگ پوش کو سزائے موت دی گئی ہے اور اس کا سر اڑا دیتا ہے ۔ پھر سب سوار شجر بہار کی طرف دوڑ لگاتے ہیں ، جو کچھ فاصلے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے ۔ ان میں سے جو شخص سب سے پہلے اسے جھپٹ لے جاتا ہے وہ اس شجر کو مع جملہ آرائش کے اپنے پاس رکھ لیتا ہے ۔ یہ رسم ہر دوسرے یا تیسرے سال ادا کی جاتی ہے ۔

سیکسونی اور تھورینگن میں سفید تیوہار (Whitsuntide) کی ایک رسم جاری ہے ، جو ''جنگلی آدمی کو جنگل سے رگید لانے'' یا ''جنگلی کو جنگل سے نکال لانے'' کے نام سے موسوم ہے ۔ اس میں ایک

نوجوان کو پتوں یا کائی میں لپیٹ دیا جاتا ہے اور اسے ''جنگلی آدمی'' کہا جاتا ہے ۔ یہ جنگل میں جا چھپتا ہے اور گاؤں کے دوسرے لڑکے اس کی تلاش میں نکلتے ہیں ۔ وہ اسے ڈھونڈ نکالتے ہیں اور قیدی بنا کر جنگل کے باہر لے آتے ہیں ، جہاں اسے خالی بندوقوں کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے ۔ وہ یوں بن کر زمین پر گر پڑتا ہے جیسے سچ مچ اسے گولی مار دی گئی ہو ۔ لیکن ڈاکٹر کے بھیس میں ایک لڑکا اس کی فصد کھولتا ہے اور وہ دوبارہ جی اٹھتا ہے جس پر سب خوش ہوتے ہیں اور اس کو ایک ویگن پر کس کر گاؤں لے جاتے ہیں ، جہاں لوگوں کو اس جنگلی آدمی کی گرفتاری کی روداد سنائی جاتی ہے اور ہر گھر پر ان لڑکوں کو ایک تحفہ ملتا ہے ۔ ارٹسگی برگے (جرمنی کا ایک پہاڑ) میں استغفار والے تیوہار پر (لینٹ یا ایسٹر سے پہلے چلے سے پہلے کے چند دن جو اعتراف گناہ کے لیے وقف ہیں) سترھویں صدی کے آغاز کے لگ بھگ حسب ذیل سالانہ دستور جاری تھا ۔ دو آدمی جنگل والوں کا روپ بھرتے ، ان میں سے ایک گھنی جھاڑی کی ڈالیوں یا کائی میں ملبوس ہوتا اور دوسرا پیال میں ۔ انھیں گلی کوچوں میں سے گھماتے ہوئے بازار لے جایا جاتا ، جہاں ان کو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر رگید کر بندوق کا نشانہ بنا دیا جاتا اور خنجر گھونپ دیا جاتا ۔ چوٹ کھا کر گرنے سے پہلے وہ کچھ عجیب طرح سے چکر کھاتے اور ان پھنکنوں سے جو ان کے پاس ہوتے لوگوں پر خون کے چھینٹے اڑاتے ۔ جب وہ گر پڑتے تو شکاری انھیں تختوں پر لاد کر شراب خانے کا رخ کرتے ۔ ان کے برابر کان کن اپنے اوزاروں کے ترم بجاتے اس طرح چلتے جیسے انھوں نے بڑا شکار مارا ہو ۔ اس سے ملتی جلتی اسی تیوہار کی ایک رسم بوہیمیا میں شلوکناؤ کے قریب آج تک ادا کی جاتی ہے ۔ جنگلی آدمی کے بھیس میں ایک شخص کو رگیدتے ہوئے ایک تنگ کوچے میں لے جایا جاتا ہے جس کے آر پار ایک ڈوری تنی ہوتی ہے ، اس سے ٹھوکرا کر وہ گر پڑتا ہے اور پیچھا کرنے والے اسے آ لیتے ہیں ۔ جلاد دوڑتا ہوا آتا ہے اور اس کے گلے میں لٹکے ہوئے ایک پھنکنے میں جو خون سے بھرا ہوتا ہے ، تلوار گھونپ دیتا ہے ۔ اس طرح گویا

وہ جنگلی آدمی مارا جاتا ہے اور پھنکنے سے خون کے فوارے چھوٹ کر زمین کو سرخ کر دیتے ہیں۔ اگلے دن اس کی ایک شبیہ جو بھس بھر کر تیار کی جاتی ہے، ڈولی میں ایک جوھڑ پر لے جائی جاتی ہے، جس کے ساتھ لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اور جلاد اس جوھڑ میں اسے پھینک دیتا ہے۔ اس رسم کو ''کارنیول کی تدفین یا جنازہ'' کہا جاتا ہے۔

سیمک (بوھیمیا) میں سفید پیر کو بادشاہ کے قتل کی ایک رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس میں نوجوان بھیس بدلے، چھال سے کمریں کسے اور ہاتھوں میں چوبی تلواریں لیے بید کی چھال کے سنکھ بجاتے ایک جمعیت کی صورت میں نکلتے ہیں۔ ان کا بادشاہ پھولوں سے آراستہ چھال کی عبا اور پھولوں اور ڈالیوں سے سجا چھال ہی کا ایک تاج پہنتا ہے۔ اس کے پاؤں میں فرن کی ڈالیاں لپٹی ہوتی ہیں، منہ پر ایک مصنوعی چہرہ لگا ہوتا ہے اور ہاتھ میں زمام کے طور پر ہاتھارن کی ایک چھڑی۔ ایک لڑکا اس کے پاؤں میں بندھی رسی پکڑے اسے گاؤں لے جاتا ہے اور باقی سب لوگ اس کے ارد گرد ناچتے سنکھ اور سیٹیاں بجاتے چلتے ہیں۔ ہر کھیت سے ملحق مکان میں پہنچ کر حجرے کے اندر اسے رگیدا جاتا ہے اور جمعیت میں سے ایک شخص لوگوں کے غل اور چیخوں میں بادشاہ کی چھال کی عبا پر تلوار کی ایک جھنجھناتی ہوئی ضرب لگاتا ہے۔ اس کے بعد دان مانگا جاتا ہے۔ بادشاہ کے قتل کی رسم کے نقش یہاں کچھ ہلکے پڑ گئے ہیں، لیکن اس کی جو صورتیں بوھیمیا کے دوسرے علاقوں میں ملتی ہیں، وہ نسبتاً اصلیت کے قرین ہیں۔ چناں چہ ضلع کونیگریٹس کے بعض قریوں میں سفید پیر کو لڑکیاں لائم کے ایک درخت کے نیچے جمع ہو جاتی ہیں اور اسی طرح نوجوان مرد ایک دوسرے درخت کے نیچے۔ یہ سب کے سب اپنا بہترین لباس زیب تن کیے ہوتے ہیں جسے ربنوں سے سجایا جاتا ہے۔ لڑکے ملکہ کے لیے اور لڑکیاں بادشاہ کے لیے ایک ہار گوندتے ہیں اور جب بادشاہ اور ملکہ منتخب کر لیے جاتے ہیں تو وہ سب جوڑیاں بنا کر جلوس کی شکل میں مے کدے پہنچتے ہیں جس کے بالا خانے سے نقیب شاہ و ملکہ

کے ناموں کا اعلان کرتا ہے ۔ پھر ان دونوں کو اپنے اپنے منصب کا نشان امتیاز ملتا ہے اور موسیقی کی گونج میں ان کے سہرے باندھے جاتے ہیں ۔ اس کے بعد کوئی شخص بنچ پر چڑھ کر بادشاہ پر مختلف الزام لگاتا ہے ، جن میں مویشی کے ساتھ بد سلوکی وغیرہ شامل ہوتے ہیں ۔ بادشاہ گواہوں سے استمداد کرتا ہے اور ایک مقدمہ شروع ہو جاتا ہے ، جس کے اختتام پر جج جس کے ہاتھ میں ایک سفید عصا بہ طور نشان امتیاز ہوتا ہے ، جرم کے اثبات یا عدم اثبات کا فیصلہ سناتا ہے ۔ اگر وہ مجرم قرار دے دیا جاتا ہے تو جج اپنا عصا توڑ ڈالتا ہے ۔ بادشاہ ایک سفید کپڑے پر گھٹنوں کے بل جھک جاتا ہے ، سب کی ٹوپیاں اتار لی جاتی ہیں اور ایک سپاہی بادشاہ سلامت کے سر پر اوپر تلے تین چار ٹوپیاں رکھ دیتا ہے ۔ پھر جج تین مرتبہ بہ آواز بلند لفظ ' مجرم' دھراتا ہے اور نقیب کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کی گردن مار دے ۔ نقیب اس حکم کی تعمیل میں اپنی چوبی تلوار سے بادشاہ کی ٹوپیاں اڑا دیتا ہے ۔

لیکن شاید گردن زنی کی ان نقلی رسموں میں سب سے زیادہ مفید مطلب حسب ذیل بوھیمیائی رسم ہے : ضلع پلسن (بوھیمیا) کے بعض حصوں میں سفید پیر کے دن بادشاہ کو چھال میں ملبوس کیا جاتا ہے ، جو پھولوں اور ربنوں سے سجی ہوتی ہے ۔ وہ طلائی ورق کا تاج پہنے ایک گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور اسے بھی پھولوں سے آراستہ کیا جاتا ہے ۔ ایک جج ، ایک جلاد اور دوسرے بہروپیوں کی معیت میں اور سواروں کا ایک دستہ جلو میں لیے وہ گاؤں کے چوک پر پہنچتا ہے ، جہاں شجر ہائے بہار کے نیچے ایک جھونپڑی یا ہری بھری ڈالیوں کا ایک منڈوا تیار ہوتا ہے ۔ یہ شجر چھلے ہوئے تازہ سرو ہوتے ہیں جنھیں پھولوں اور ربنوں سے سجایا جاتا ہے ۔ گاؤں کی عورتوں اور ناکت خدا لڑکیوں کے عیب گنوانے اور ایک مینڈکی کی گردن مارنے کے بعد سواروں کا یہ جلوس ایک سیدھی اور چوڑی گلی میں مقررہ مقام پر پہنچتا ہے ۔ یہاں وہ دو قطاروں میں صف آرا ہو جاتے ہیں ۔ بادشاہ کو بھاگ نکلنے کی تھوڑی سی مہلت دی جاتی

ہے اور وہ پوری رفتار سے گھوڑا دوڑاتا ہوا راہ فرار اختیار کرتا ہے ۔ باقی سب سوار اس کا پیچھا کرتے ہیں ۔ اگر وہ اسے پکڑ نہ پائیں تو اس کی بادشاہت سال بھر اور قائم رہتی ہے اور اس کے ساتھیوں کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ شام کو شراب خانے میں اس کا خرچ برداشت کریں ۔ لیکن اگر وہ پکڑ لیا جائے تو اسے ہیزل کی لکڑیوں یا چوبی تلواروں سے مارا جاتا ہے اور جبراً گھوڑے سے اتار دیا جاتا ہے ۔ پھر جلاد پوچھتا ہے ''کیا میں اس بادشاہ کی گردن مار دوں ؟'' اسے جواب ملتا ہے ''ہاں ، مار دو !'' اور جلاد یہ کہتے ہوئے اپنی کلہاڑی گھماتا ہے ''ایک ، دو ، تین ؛ بادشاہ کا اڑے سر !'' اور اس کا تاج اڑا دیتا ہے ۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی چیخوں میں بادشاہ زمین پر آ رہتا ہے اور اسے تابوت میں رکھ کر قریب ترین کھیت سے ملحق مکان میں لے جایا جاتا ہے ۔

ان سوانگوں میں جن بہروپیوں کو اس طرح قتل کیا جاتا ہے ، ان میں بیشتر ایسے ہیں جن میں شجری روح کے بہاری نمائندوں کے خد و خال بالکل صاف نظر آتے ہیں ۔ ان سوانگوں کا موسم اور چھال ، پتے اور پھول جن میں مذکورہ بالا اداکار ملبوس ہوتے ہیں ، سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نقلی بادشاہ بھی روح بہار کے ان نمائندوں کے زمرے میں آتے ہیں جو گھاس راجا ، شاہ بہار ، برگ پوش چیک وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں اور جن کے بارے میں ہم اس کتاب کے ابتدائی حصے میں کہیں چھان بین کر آئے ہیں ۔ مندرجہ بالا بعض مثالوں سے اس سلسلے میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ۔ چناں چہ ان میں سے دو مقتولوں کا شجر ہائے بہار سے براہ راست رابطہ نظر آتا ہے اور شجر ہائے بہار شجری روح کے غیر شخصی مظاہر سے عبارت ہیں ، جس طرح شاہ بہار ، گھاس راجا وغیرہم کی حیثیت اس کے شخصی نمائندوں کی ہے ۔ لہذا پفنگ اسٹل کو پانی میں بھگونا اور اس کا پانی میں چلتے ہوئے نالے کے بیچ میں جانا یقیناً اسی قسم کے بارشی افسوں ہیں جن کی کیفیت پہلے ہی قلم بند کی جا چکی ہے ۔

اگر یہ نقال بہار میں شجری روح کی نمائندگی کرتے ہیں اور بات

بلا شبہ یہی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں قتل کیوں کیا جاتا ہے ؟ شجری روح کو کسی وقت ، خاص کر ایام بہار میں جب کہ اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے ، کس مقصد سے مارا جاتا ہے ؟ اس سوال کا وہی ایک جواب قرین صحت معلوم ہوتا ہے ، جو ہم مقدس بادشاہ یا مذہبی پیشوا کے قتل کے دستور کی توجیہ میں تجویز کر آئے ہیں ۔ اس الٰہی روح میں ، جو کچھ عرصے کے لیے کسی انسان ضعیف البنیان کی صورت میں جلوہ گر ہو ، اپنے کالبد خاکی کے اضمحلال سے خرابی اور فساد پیدا ہو سکتا ہے ۔ لہذا عمر رواں کے ساتھ ساتھ اس کے انسانی مظہر کے طبعی انحطاط کے ناگزیر اثر سے اسے محفوظ رکھنا ہو تو یہ ضروری ہے کہ انحطاط کے آثار نمودار ہونے سے پہلے یا کم از کم اس کے ساتھ ہی اس روح کو جسم سے جدا کر دیا جائے تاکہ اسے کسی ایسے شخص میں منتقل کیا جا سکے جو نسبتاً صحیح و توانا ہو ۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے پرانے انسان دیوتا کو مار دیا جاتا ہے اور الٰہی روح کو کسی نئے بدن میں منتقل کر دیا جاتا ہے ۔ لہذا دیوتا ، یعنی اس کے انسانی نمائندے کا قتل اسے دوبارہ زندہ کرنے یا بہتر صورت میں جلانے کی ایک تدبیر ہے ۔ قتل سے الٰہی روح فنا ہرگز نہیں ہوتی ، بلکہ وہ اس روح کے پہلے سے زیادہ پاک اور توانا جسم میں ظہور نو کے آغاز سے عبارت ہے ۔ اگر یہ توجیہ بالعموم مقدس بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں کے قتل کے دستور پر منطبق ہوتی ہے تو اس سے کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ موسم بہار میں ہر سال شجری یا نباتی روح کے نمائندوں کے قتل پر صادق آتی ہے ، اس لیے کہ دور جاہلیت کا انسان پودوں کے اضمحلال کو نباتی روح کے ضعف پر محمول کر لیتا ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ روح نباتات ضعیف اور زار و نحیف ہو چکی ہے ، لہذا ضروری ہے کہ اسے مار کر اس کی تجدید کی جائے اور کسی تازہ اور جان دار شکل میں اسے نیا جنم دیا جائے ، کیوں کہ جاہلی عقیدے میں ہمیشہ (ہمیں فرض کرنا چاہیے) یہ مقدر ہوتا ہے کہ اس روح کی ہلاکت اس کی حیات یا ظہور نو سے وابستہ ہے اور بعض صورتوں میں اس چیز کی صراحت بھی کر دی جاتی

ہے ۔ چناں چہ سیکسنی اور تھورینگنی دستور میں جب جنگلی آدمی کو گولی مار دی جاتی ہے ، تو طبیب اسے دوبارہ زندہ کر دیتا ہے اور ورم لنگن والی رسم میں ایک نمایاں شخصیت ڈاکٹر آھن ریش کی ہے جو غالباً کبھی یہی حصہ ادا کرتا ہوگا ۔ ایک اور بہاری رسم میں جس کا ذکر آگے آتا ہے ۔ ڈاکٹر آھن ریش جھوٹ موٹ مردے کو جلا دیتا ہے ۔ دیوتا کے اس احیاء یا از سر نو جلائے جانے کی مزید کیفیت ابھی بیان کی جاتی ہے ۔

شمالی یورپ کے ان نقلی بادشاہوں اور نیمی والے بن کے بادشاہ یا پجاری کے درمیان ، جو ہماری تحقیق کا موضوع ہے ، مشابہت کے پہلو خاصے نمایاں ہیں ۔ ان شمالی ہیروپیوں کی صورت میں ہمیں ایسے بادشاہ نظر آتے ہیں ، جن کی چھال پتوں کی پوشاکیں ، نیز تازہ شاخوں کے وہ منڈولے اور سرو کے درخت جن کے نیچے وہ دربار کرتے ہیں ، صاف یہ بتاتے ہیں کہ اپنے اطالوی مماثل کی مانند ان کی حیثیت شاہان جنگل ہی کی ہے ۔ اُسی کی طرح یہ بھی مارے جاتے ہیں اور اُسی کی طرح انہیں بھی اپنی جسمانی قوت اور چستی سے جان بچانے کا موقع دیا جاتا ہے ، کیوں کہ ان شمالی سوانگوں میں بیشتر ایسے ہیں ، جن میں بادشاہ کا فرار اور تعاقب رسم کا ایک نمایاں حصہ ہے اور ایک صورت میں کم از کم بادشاہ اگر اپنا پیچھا کرنے والوں سے سبقت لے جائے تو اس کی جان بچ جاتی ہے اور بادشاہت مزید ایک سال قائم رہتی ہے ۔ اس آخری صورت میں بادشاہ فی‌الحقیقت اس شرط پر اپنے منصب پر فائز رہتا ہے کہ وہ سال میں ایک مرتبہ دوڑ کے مقابلے میں اپنی جان بچائے ، جس طرح بعد کے زمانے میں کالی کٹ کا راجا اس شرط پر برسر اقتدار رہتا کہ ہر بارھویں سال تمام حملہ آوروں سے اپنا بچاؤ کرے اور جس طرح نیمی کے پجاری کا اپنے عہدے پر فائز رہنا اس بات پر موقوف تھا کہ وہ حریف سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے ، جو کسی وقت بھی اس پر حملہ کر سکتا تھا ۔ ان تمام صورتوں میں انسان دیوتا کی درازیٔ عمر ، زور آزمائی یا دوڑ میں یہ ثابت کرنے پر منحصر ہے کہ اس کے جسمانی قویٰ برقرار ہیں اور یہ کہ اس کا ناگزیر قتل ملتوی کیا جا

سکتا ہے ۔ فرار کے سلسلے میں یہ امر قابل توجہ ہے کہ فرار بن کے بادشاہ سے متعلق قصے اور دستور دونوں کی ایک نمایاں چیز ہے ۔ اس کا دائمائی پرستش کے روایتی بانی آریسٹیز کے فرار کی یاد میں مفرور غلام ہونا ضروری تھا ۔ چناں چہ ایک قدیم مصنف کے بیان کے بموجب اس کے ہاتھ مضبوط اور پاؤں پھرتیلے ہوتے تھے ۔ اگر ہم کو اریشیائی شجر زار کی مذہبی رسموں کا مکمل علم ہوتا تو شاید یہ پتہ چلتا کہ اس بادشاہ کو اپنے بوھیمیائی مماثل کی طرح بھاگ کر جان بچانے کا ایک موقع ضرور ملتا تھا ۔ میں پہلے ہی قیاس آرائی کر چکا ہوں کہ روم کے مذہبی بادشاہ کے سالانہ فرار (فرار شاہی کی رسم) کی نوعیت شروع شروع میں یہی کچھ رہی ہوگی ۔ بہ الفاظ دیگر ابتداء میں وہ ان بادشاہوں میں سے ایک تھا ، جنھیں یا تو ایک مقررہ مدت کے بعد قتل کر دیا جاتا تھا یا انھیں دست و بازو کے زور یا پاؤں کی پھرتی سے یہ ثابت کرنے کا موقع دیا جاتا کہ ان کا جوہر الوھیت صحیح و سالم ہے ۔ اس اطالوی بادشاہ اور شمالی بہرویوں میں مماثلت کا ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے ۔ سیکسنی اور تھورینگن میں شجری روح کے نمائندے کے مارے جانے کے بعد ایک طبیب اسے جلا دیتا ہے ۔ قصے کی رو سے بعینہ یہی ماجرا بن کے پہلے بادشاہ ہپولیٹس یا وربیس کے ساتھ پیش آیا تھا ، جسے گھوڑوں نے گرا کر ہلاک کر ڈالا تھا ، جس کے بعد حکیم السیلپیس نے اس کو دوبارہ زندہ کر دیا ۔ یہ قصہ اس نظریے سے بڑی مطابقت رکھتا ہے جس کی رو سے بن کے بادشاہ کا قتل محض اس کے دوبارہ زندہ کرنے یا اس کے جانشین کی صورت میں دوبارہ جلائے جانے کی ایک تدبیر کی حیثیت رکھتا ہے ۔

(۲) کارنیول کا جنازہ — یہ تو تھی اس دستور کی توجیہ جس کے مطابق نیمی کا پجاری اپنے جانشین کے ہاتھوں ہلاک ہوا کرتا تھا ۔ یہ توجیہ نرا قیاس ہی قیاس ہے اور بس ۔ اس دستور اور اس کی تاریخ کے بارے میں ہمارا محدود علم اس سے زیادہ کچھ اور دعویٰ کرنے کی اجازت نہیں دیتا ۔ لیکن ہمارے قیاس میں متذکرہ دستور کے جو محرکات اور اس سے متعلق جو انداز فکر مقدر ہے ، اس کا

غیر ترقی یافتہ معاشرے سے جس حد تک ثبوت بہم پہنچے گا ، اسی قدر ہمارا یہ قیاس قرین صحت ہو جائے گا ۔ اب تک ہماری توجہ ایک شجری دیوتا کی موت اور حیات نو پر مرتکز رہی ہے ۔ لیکن اگر میں یہ ثابت کر سکوں کہ دیوتا کے قتل کا دستور اور اس کے از سر نو زندہ ہونے پر اعتقاد معاشرتی ارتقاء کے اس دور میں پیدا ہوا یا کم از کم اس دور میں موجود تھا جب انسان کا گزارا شکار اور مویشی پروری پر تھا اور جب دیوتا کی حیثیت سے کسی جانور کو مارا جاتا تھا اور یہ دستور اور اعتقاد زرعی دور تک باقی رہا ۔ جب مقتول دیوتا اناج یا اناج کے انسانی مظہر سے عبارت تھا تو مندرجہ بالا توجیہ بڑی حد تک قرین صحت ہو جائے گی ۔ یہ میں آگے چل کر ثابت کرنے کی کوشش کروں گا اور امید ہے کہ دوران بحث میں اس کے متعلق رہے سہے شبہات بھی دور ہو جائیں گے اور ان اعتراضات کا جواب بھی نکل آئے گا جو اس ضمن میں کسی قاری کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں ۔

خیر تو ہم یورپ کی بہاری رسموں پر غور کر رہے تھے ؛ آئیے اب پھر انھی سے بحث شروع کی جائے ۔ مذکورہ بالا رسموں کے علاوہ ایک ہی قسم کے دو دستور ایسے ملتے ہیں جن کی نمایاں خصوصیت کسی آلوہی یا مافوق ہستی کی موت کا سوانگ ہے ۔ اس قسم کے ایک دستور میں وہ ہستی جس کی موت کی تمثیل پیش کی جاتی ہے ، کارنیول (لینٹ سے پہلے کا ہفتہ جس میں رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں) کی مجازی صورت ہے اور دوسرے دستور میں خود موت کا خاکہ اڑایا جاتا ہے ۔ پہلا تیوہار قدرتی طور پر کارنیول کے آخر میں آتا ہے ، یا ہنگام عیش و طرب کے آخری دن ، یعنی استغفار والے منگل کو یا لینٹ کے پہلے دن ، یعنی روز رماد (ایش والا بدھ ، اس روز رومن کیتھولک تائبوں کے سر پر راکھ لگائی جاتی ہے) ۔ دوسرے تیوہار کی ، جسے عام طور پر دفع موت کہا جاتا ہے ، کوئی ایک تاریخ مقرر نہیں ۔ یہ عام طور پر لینٹ کے چوتھے اتوار کو منایا جاتا ہے ، جسے اسی مناسبت سے ''مردہ اتوار'' کہا جاتا ہے ۔ لیکن بعض مقامات پر یہ تیوہار اس سے ایک ہفتہ پہلے آتا ہے اور بعض دوسرے مقامات پر ، مثلاً بوہیمیا کے

چیکوں کے ہاں ہفتہ بھر بعد ، اور بوہیمیا کے جرمن آسے ایسٹر کے بعد پہلے اتوار کو مناتے ہیں ۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے ، شروع شروع میں اس کی کوئی تاریخ معین نہ تھی اور اس کا انحصار موسم کی پہلی ابابیل یا بہار کی کوئی اور علامت کے نظر آنے پر تھا ۔ بعض اہل قلم اس کو سلافی الاصل قرار دیتے ہیں ۔ گرم کا خیال ہے کہ یہ رسم قدیم سلافیوں کے ہاں نئے سال کے تیوہار کی حیثیت رکھتی تھی ، جن کا سال مارچ سے شروع ہوتا تھا ۔ پہلے کارنیول کی موت کے سوانگ والی رسم کی مثالوں کو لیجیے ، جو تقویم کے لحاظ سے اس دوسرے تیوہار سے پہلے پڑتی ہے ۔

لاطیم میں روم اور نیپلز کے درمیان فروسینوں کے مقام پر رادکا (Radica) کے نام سے کارنیول کے آخری دن ایک قدیم تیوہار منایا جاتا ہے جس سے اٹلی کی قصباتی زندگی کی اکتا دینے والی یک رنگی میں ایک خوش گوار تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے ۔ سہ پہر میں کوئی چار بجے کے قریب قصبے کے بینڈ بجانے والے اپنے طرب ناک راگ کی گونج میں لوگوں کا ایک ہجوم اپنے پیچھے لیے پیاٹسا ڈیل پلے بسی ٹو کی طرف روانہ ہوتے ہیں ، جہاں نائب پری فیکٹ (ایک سرکاری عہدہ دار) کی سرکاری قیام گاہ اور دوسری سرکاری عمارتیں ہیں ۔ یہاں چوک کے بیچ میں ہجوم کی پر شوق نگاہوں کے سامنے ہاروں سے آراستہ ایک نہایت وسیع گاڑی نمودار ہوتی ہے جسے چار گھوڑے کھینچتے ہیں ۔ اس گاڑی پر ایک بہت بڑی کرسی رکھی ہوتی ہے اور اس کرسی پر کارنیول کی عظیم الشان شبیہ متمکن ۔ یہ گچ کا کوئی نو فٹ اونچا سرخ و سفید اور مسکراتا ہوا مجسمہ ہوتا ہے ۔ لمبے چوڑے بوٹ ، اطالوی بحری افسروں کا سا ایک ٹین کا خود اور ایک عجیب سا مزین بوقلموں کوٹ اس کے زیب تن ہوتا ہے ۔ وہ اپنا بایاں ہاتھ کرسی کے بازو پر ٹیکے ، داہنے ہاتھ سے مجمع کو بڑی شائستگی کے ساتھ سلام کرتا جاتا ہے ، جس کے لیے ایک آدمی ایک تخت خدائی کے نیچے چھپا ڈوری کے ذریعے اسے حرکت دیتا رہتا ہے ۔ ہجوم ، جو اس منظر کو دیکھ کر فرط طرب سے چیختا چلاتا رہتا ہے اور جس کے اس غلغلے

میں ہلکی اور بے تکلف آوازیں شامل ہوتی ہیں ، اس گاڑی کے گرد بڑے جوش و خروش سے سال تاریلو (ایک اطالوی رقص) ناچنے لگتا ہے ۔ اس تیوہار کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہر شخص کو اپنے ہاتھ میں ایک رادکا (جڑی) رکھنی ضروری ہے ، جس سے ایلویا اگاڈ کا ایک بڑا سا پتا مراد ہے یا اس کے بدلے کم از کم وہ ایک لمبی لکڑی کی انی سے لگا یا گھاس کے بٹے ہوئے گچھے پر رکھا ایک کرم کلا ضرور لیے ہو ، ورنہ اسے دھکے دے کر مجمع سے نکال دیا جائے گا ۔ ہجوم ایک مختصر سا چکر کاٹ کر گاڑی کو گھیرے نائب پری فیکٹ کی قیام گاہ کے پھاٹک پر پہنچ کر رک جاتا ہے اور گاڑی ناہموار زمین پر دھچکے کھاتی اور کھڑکھڑاتی اس کے صحن میں داخل ہوتی ہے ۔ اب مجمع پر سکوت چھا جاتا ہے اور اس میں لوگوں کی دبی ہوئی آوازیں ، ایک شاہد عینی کے بیان کے بموجب جس نے یہ آوازیں سنی تھیں ، متلاطم سمندر کے دھیمے سروں کی طرح گونجتی رہتی ہیں ۔ سب کی نگاہیں نائب پری فیکٹ کے دروازے پر لگ جاتی ہیں ، جس سے اسے اور عدالت کے دوسرے نمائندوں کو برآمد ہو کر وقت کے اس سورما کو خراج عقیدت پیش کرنا ہوتا ہے ۔ بیم و رجا کے اس عالم میں چند لمحے گزرنے کے بعد تالیوں کی گونج میں اکابرین عدالت نمودار ہوتے ہیں اور ایک قطار میں زینوں سے اتر کر جلوس میں اپنی اپنی جگہ لے لیتے ہیں ۔ پھر کارنیول کے نغمے کا شور بلند ہوتا ہے ، جس کے بعد لوگ بے تحاشا چیختے چلاتے ایلو کے پتے اور کرم کلے بلا کسی رعایت کے داد گر اور بے داد گر حاکموں کے سروں پر اچھالتے ہیں جو آپس میں گتھم گتھا ہو کر اس جوش و خروش میں اضافہ کر دیتے ہیں ۔ جب یہ ابتدائی کارروائیاں خاطر خواہ ختم ہو چکتی ہیں تو جلوس روانہ ہوتا ہے ۔ سب کے آخر میں شراب کے خموں سے لدا ایک چھکڑا اور مانگنے والوں کو شراب پیش کرنے کے لیے پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں ۔ چھکڑے کے پیچھے سرکاری خرچ پر بادہ خواری کے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک کشمکش رہتی ہے ، جس میں چیخیں اور گالیاں سنائی دیتی ہیں اور گھونسے چلتے ہیں ۔ آخر میں جب جلوس اس شان سے بڑے بڑے کوچوں میں سے گزر چکتا ہے تو کارنیول کی شبیہ

کو چوک پر لے جا کر اس کی آرائش کی تمام چیزیں اتار لی جاتی ہیں اور لوگوں کی چیخ پکار میں نذر آتش کر دیا جاتا ہے ؛ جو ایک مرتبہ پھر اسی طرح گلے پھاڑ پھاڑ کر کارنیول والا نغمہ گاتے ہیں اور اپنی جڑیوں کو چتا پر پھینک پھینک کر پورے جوش و خروش سے رقص شروع کر دیتے ہیں ۔

ابروٹسی میں چار گورکن منہ میں پائپ لگائے اور شانوں سے شراب کی بوتلیں لٹکائے دفتی کا ایک کارنیول والا پتلا لے کر نکلتے ہیں ۔ ان کے آگے ماتمی لباس میں با چشم پر نم کارنیول کی بیوی ہوتی ہے ۔ یہ جماعت راستے میں جگہ جگہ رکتی چلتی ہے ، جہاں کارنیول کی بیوی درد مند تماشائیوں سے خطاب کرتی ہے اور اس دوران میں گورکن شراب کی چسکیاں لے کر تازہ دم ہو لیتے ہیں ۔ کھلے چوک میں اس مصنوعی لاش کو چتا پر لٹا دیا جاتا ہے اور طبلے کی ڈھم ڈھم ، عورتوں کی چیخوں اور مردوں کے شور و غوغے میں اسے آگ لگا دی جاتی ہے ۔ جس وقت تک یہ پتلا جلتا رہتا ہے ہجوم میں جوز پھینکے جاتے ہیں ۔ بعض وقت کارنیول کی شبیہ ایک بلی کی انی پر لگے ہوئے پیال کے پتلے پر مشتمل ہوتی ہے جسے لیے بہروپیوں کی ایک جماعت سہ پہر میں قصبے کے گلی کوچوں میں سے گزرتی ہے ۔ جب شام ہوتی ہے تو ان میں سے چار بہروپیے ایک توشک یا چادر تانے کھڑے ہو جاتے ہیں جس میں اس پتلے کو گرا دیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد جلوس پھر روانہ ہو جاتا ہے اور بہروپیے پیازی آنسو بہاتے ، کڑھائیاں اور ڈنر کی گھنٹیاں بجاتے اپنے شدید غم کا اظہار کرتے ہیں ۔ نیز بعض وقت ابروٹسی میں کوئی زندہ آدمی مردہ کارنیول کا روپ بھرتا ہے ، جو ایک تابوت میں لیٹ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور شخص پادری بنا ٹب میں سے لوگوں پر متبرک پانی ارزانی فرماتا ہے ۔

کیٹے لونیا (ہسپانیہ) کے شہر لے ریڈا میں ایک انگریز سیاح نے ۱۸۷۷ء میں کارنیول کے جنازے کا منظر دیکھا تھا ۔ کارنیول کے آخری اتوار کو پیادے ، سوار اور مختلف قسم کے بہروپیے ، جن میں کچھ گھوڑوں پر سوار تھے اور کچھ گاڑیوں میں ، کارنیول کی شبیہ موسوم بہ

''والا شان پاؤپی'' کی عظیم الشان رتھ کو لیے جلوس فتح کی شکل میں شہر کے بڑے بڑے کوچوں میں سے گزرے ۔ تین دن تک بڑی رنگ رلیاں منائی گئیں اور پھر کارنیول کے آخری دن یہی جلوس دوبارہ شہر کے گلی کوچوں کا چکر کاٹتا دکھائی دیا ۔ لیکن اب کی دفعہ اس کی صورت اور مقصد دونوں مختلف تھے ۔ جلوس فتح کی رتھ کی جگہ تابوت بردار گاڑی نے لے لی تھی ، جس کے اندر والا شان کی لاش رکھی تھی ۔ بھروپیوں کی ایک پلٹن ، جس نے پہلے جلوس میں پھبتیاں کستے اور ٹھٹھول کرتے مسخروں کا حصہ ادا کیا تھا ، اب پادریوں اور اسقفوں کی عبائیں پہنے تھی اور جلتی ہوئی موم بتیاں اٹھائے نوحہ خوانی کرتی آہستہ آہستہ چل رہی تھی ۔ سارے بھروپیے سیاہ ریشم میں ملبوس تھے اور تمام سواروں کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں تھیں ۔ یہ جلوس بہ صد رنج و اندوہ بڑی سڑک پر اونچے اونچے کئی کئی منزل کے چھجہ دار مکانوں کے بیچ میں سے گزرا ، جہاں ہر کھڑکی کے اندر ، ہر بالاخانے اور ہر چھت پر عجیب قسم کے زرق برق کپڑے پہنے تماشائیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ نظر آتے تھے ۔ اس منظر پر آمنے سامنے ہلتی ہوئی مشعلوں کی روشنی اور متحرک سائے پڑ رہے تھے ، سرخ اور نیلی ہوائیاں چھوٹتیں اور غائب ہو جاتیں ۔ گھوڑوں کی ٹاپوں اور مارچ کرتے ہوئے ہجوم کے جھجے تلے قدموں کی چاپوں میں نوحہ خواں پادریوں کی آوازیں گونج رہی تھیں اور ان کے ساتھ فوجی بینڈ کی ہلکی ہلکی ڈھم ڈھم ۔ بڑے چوک پر پہنچ کر یہ جلوس رک گیا اور پاؤپی کی میت پر ایک مضحک خطبہ پڑھا گیا ، روشنیاں گل کر دی گئیں ۔ دفعتاً ابلیس اور اس کے حلیف فرشتے مجمع میں سے نکلے اور میت کو لے کر چمپت ہو گئے ۔ مجمع نعرے لگاتا ، چیختا چلاتا اور تالیاں بجاتا ان کے پیچھے لپکا ۔ یہ شیاطین پکڑے گئے اور تتر بتر کر دیے گئے ۔ لاش کو ان کے پنجے سے چھڑا کر ایک قبر میں لٹا دیا گیا جو اسے لینے کے لیے منہ کھولے تیار تھی ۔ اس صورت سے لیڑا میں ۱۸۷۷ء والے کارنیول کا خاتمہ ہوا اور اسے سپرد خاک کیا گیا ۔

اسی قسم کی ایک رسم یوم الرماد (ایش والے بدھ) کو پرو وانس

میں ادا کی جاتی ہے ، جس میں ایک شبیہ کو ، جسے کارا مانتران کہا جاتا ہے ، عجیب سے کپڑے پہنا کر گاڑی یا ڈولی میں نکالا جاتا ہے ۔ اس کے ہم راہ مضحکہ خیز کپڑوں میں ملبوس لوگوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے ۔ یہ شراب سے بھری تونبیاں لے کے نکلتے ہیں جسے نشے کا ڈھونگ کرکے یا سچ مچ نشے کی حالت میں چڑھا جاتے ہیں ۔ جلوس کے آگے ججوں اور بیرسٹروں کے بھیس میں کچھ لوگ ہوتے ہیں اور ایک اونچا منحنی سا آدمی جو لینٹ کا سوانگ بھرتا ہے ۔ ان کے جلو میں ماتمی لباس پہنے مریل ٹٹوؤں پر نوجوان چلتے ہیں جو کارا مانتران کی بد نصیبی کا جھوٹ موٹ ماتم کرتے جاتے ہیں ۔ بڑے چوک پر پہنچ کر جلوس رک جاتا ہے ، یہاں ایک عدالت تشکیل پاتی ہے اور کارا مانتران کو کپڑے پر رکھ دیا جاتا ہے ۔ مقدمے کی رسمی سماعت کے بعد مجمع کی آہ و بکا میں اسے سزائے موت سنا دی جاتی ہے ۔ وہ بیرسٹر جو اس کی طرف سے صفائی پیش کرتا ہے ، اپنے مؤکل سے آخری مرتبہ بغل گیر ہوتا ہے ۔ پھر حکام فوج داری اپنا فرض بجا لاتے ہیں ۔ مجرم کو پشت کے سہارے دیوار سے لگا دیا جاتا ہے اور پتھراؤ کرکے ملک عدم پہنچا دیا جاتا ہے ، اور اس کے ٹکڑے سمندر یا دریا کی نذر کر دیے جاتے ہیں ۔ آرڈین (فرانس) میں قریب قریب ہر جگہ یوم الرماد کو کارنیول کی شبیہ جلانے کا دستور تھا ، یا اب تک چلا آتا ہے اور جب وہ جلتی رہتی ہے تو اس کے اطراف حسب حال اشعار گائے جاتے ہیں ۔ عموماً یہ شبیہ گاؤں کے کسی ایسے آدمی سے ملتی جلتی تیار کی جاتی ہے ، جو اپنی بیوی کے حق میں سب سے زیادہ بے وفا ثابت ہوا ہو ۔ شاید لوگوں کے حسب توقع ان نامساعد حالات میں ایسے شخص کو یوں شبیہ سازی کا نمونہ بنا کر عزت بخشنے سے اس کے گھریلو جھگڑوں کو کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ملتی ہوگی ؛ خاص کر جب کہ شبیہ کو اس بے وفا مرد کے گھر کے سامنے لے جا کر جلایا جاتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ بلیوں کی سی چیخیں، نالہ و شیون اور دوسری سریلی آوازیں بلند ہو کر اس کے ذاتی خصائل کے بارے میں پڑوسیوں اور دوست احباب کی رائے پر مہر تصدیق لگاتی ہوں ۔ آرڈین کے بعض گاؤں میں ایک جیتا جاگتا نوجوان پیال میں لپٹا توبہ کے

منگل کا سوانگ بھرا کرتا تھا ۔ اس بہروپیے کو عدالت کے رو بہ رو پیش کیا جاتا اور سزائے موت کا حکم سنانے کے بعد کسی کشتنی فوجی مجرم کی طرح دیوار سے لگا کر پشت کے سہارے کھڑا کر دیا جاتا اور خالی کارتوسوں کا نشانہ بنا دیا جاتا ۔ ورگ ناژبا میں ایسا ہی ایک بے چارا مسخرا تھاٹرے نامی اتفاقاً ایک ڈاٹ سے، جو نشانہ بازوں کی کسی بندوق میں رہ گیا تھا ، مارا گیا ۔ جب وہ غریب توبہ کے منگل کے بھیس میں بندوق چلنے پر گرا تو اس کے کمال اداکاری پر بڑے زور و شور سے نعرۂ تحسین بلند ہوا لیکن جب اس نے گر کر جنبش بھی نہ کی تو سب اس کی طرف دوڑے اور اسے مردہ پایا ۔ اس وقت سے آرڈین میں سزائے موت کا یہ کھیل ختم کر دیا گیا ۔

یوم الرماد (بدھ) کو نار منڈی میں توبہ کے منگل کے جنازے کے نام سے ایک تیوہار منایا جاتا تھا ۔ اس میں کسی روسیاہ پرانے پاپی کا چتھڑوں میں لپٹا ایک گھناونا پتلا نکالا جاتا جس کے ناپاک چہرے کو ایک ٹوٹی پھوٹی ٹوپی پہنچے رہتی اور پیٹ میں بھس بھرا ہوتا ۔ یہ گویا مصیبت کی طویل زندگی گزارنے کے بعد اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتنے کے لیے لایا جاتا ۔ اس شبیہ کو کسی گنوار کے شانوں پر رکھ دیا جاتا ، جو اسے اٹھائے گلی کوچوں میں اس طرح لڑکھڑاتا ہوا نکلتا جیسے اس پر منوں بوجھ لدا ہو ۔ لیکن کارنیول کے اس آخری سفر کا منظر جلوس فتح کے بالکل برعکس ہوتا ۔ یہ ٹمٹماتی مشعلوں کی روشنی اور بیلچوں اور دست پناہوں ، پتیلیوں اور برتنوں ، سینگوں اور کڑھاؤں کے بے پناہ شور میں نکلتی ، جس پر پھبتیاں ، آہیں اور سسکاریاں مستزاد ہوتیں ۔ اس کی پیشوائی ایک طبلچی کرتا اور اس کے ساتھ ساتھ شہر کے تمام لفنگے لونڈے ، بھڑبھونجے اور کمیرے فقرے چست کرتے چلتے ۔ وقتاً فوقتاً یہ جلوس رکتا جاتا اور ایک محتسب اس خستہ جاں گناہ گار پر ان تمام بے اعتدالیوں کا الزام لگاتا جن کا وہ مرتکب ہوا ہو اور جس کے لیے اب اسے زندہ جلایا جانے والا ہو ۔ مجرم اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکتا اور اسے اٹھا کر پیال میں پھینک دیا جاتا ۔ پھر اس ڈھیر میں ایک جلتی ہوئی مشعل لگا دی جاتی جس سے ایک شعلہ

بلند ہوتا ۔ بچے اسے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے اور اس کے گرد چیختے چلاتے ، اچھلتے کودتے کارنیول کی موت سے متعلق گھسے پٹے دقیانوسی اشعار الاپتے ۔ بعض وقت اس شبیہ کو جلانے سے پہلے پہاڑی پر سے لڑھکایا جاتا ۔ سینٹ ساں لو میں توبہ کے منگل کی شبیہ اپنی بیوی کو جلو میں لیے نکلتی تھی، جس کا سوانگ ایک تگڑا سا گنوار بھرتا اور جو دھاڑ دھاڑ کر آہ و فریاد کرتا چلتا ۔ یہ شبیہ ایک ڈولی میں گلی کوچوں سے گزرنے کے بعد دریائے ویر کی نذر کر دی جاتی ۔ مادام آکتیوفیولے نے اس کے آخری منظر کا ہو بہو نقشہ کھینچا ہے ، جو انھوں نے کوئی ساٹھ سال پہلے اپنے لڑکپن میں دیکھا تھا ۔ ''والد اور والدہ نے ژین کو لارڈ کی لاٹ سے جنازے کا جلوس دیکھنے کے لیے اپنے دوستوں کو مدعو کر رکھا تھا ۔ یہاں سے ہم نے لیمونیڈ کے گھونٹ لیتے ہوئے ـــــاس وقت روزے کی وجہ سے بس ایک اسی چیز کی اجازت تھی ـــ شام کو وہ منظر دیکھا ، جس کی جیتی جاگتی تصویر ہمیشہ میرے ذہن میں محفوظ رہے گی ۔ ہمارے پاؤں تلے ویر اپنے قدیم سنگی پل کے نیچے بہہ رہا تھا ۔ پل کے بیچوں بیچ توبہ کے منگل کی شبیہ پتوں کی ارتھی پر رکھی تھی، جس کے اردگرد بیسیوں . روپہے مشعلیں لیے رقصاں اور نغمہ سرا تھے ۔ کچھ اپنی بوقلموں پوشاکوں میں پل کی منڈیر کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے اور کچھ ستونوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے ۔ تھوڑی سی دیر میں رقص ختم ہو گیا ۔ بہروپیوں کی منڈلی میں سے کچھ آدمیوں نے ایک مشعل لے کر اسے آگ لگا دی اور پھر ایک مرتبہ اور پہلے سے بھی زیادہ ایک شور بلند ہوا اور اس کو ویر میں پھینک دیا گیا ۔ پیال کا یہ پتلا جس میں لاکھ جذب تھی ، جلتا ہوا ویر کے دھارے پر بہہ نکلا اور بہتے بہتے کنارے کے درختوں اور اس قدیم قلعے کی فصیل پر اپنی روشنی ڈالتا چلا گیا ، جس میں کبھی لوئی یازدھم اور فرانسس اول محو خواب رہے تھے ۔ جب دور وادی کے کنارے پر پہنچ کر وہ شہاب ثاقب کی طرح غائب ہو گیا تو بہروپیے اور مجمع کے سب لوگ وہاں سے چل دیے اور ہم بھی اپنے مہمانوں کے ساتھ اس لاٹ سے رخصت ہو گئے ۔''

ٹوبنگن کے گرد و نواح میں توبہ کے منگل کو پیال کا ایک پتلا تیار کیا جاتا ہے ، جو ''لینٹ والا ریچھ'' کہلاتا ہے - اسے پرانی سی ایک پتلون پہنا دی جاتی ہے اور اس کے گلے میں تازہ تازہ کالی پٹنگ یا خون سے بھری دو پچکاریاں ڈال دی جاتی ہیں - پھر رسمی طور پر سزائے موت کا فیصلہ سنانے کے بعد اس کی گردن مار دی جاتی ہے اور ایک تابوت میں رکھ دیا جاتا ہے - اگلے دن ، یعنی یوم الرماد کو اسے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا جاتا ہے - اس رسم کا نام کارنیول کی تدفین یا جنازہ ہے - ٹرانسلوینیا کے بعض سیکسنوں کے ہاں کارنیول کو پھانسی دی جاتی ہے - چناں چہ برالر میں بیت الرماد یا توبہ کے منگل کو دو سفید اور دو بھورے گھوڑے ایک سلیج کو کھینچتے ہوئے نکلتے ہیں ، جس پر پیال کا ایک پتلا سفید کپڑے میں لپیٹا رکھا ہوتا ہے اور اس پتلے کے برابر کسی گاڑی کا ایک پہیہ ہوتا ہے جو گھومتا رہتا ہے - سلیج کے پیچھے بوڑھوں کے بھیس میں دو لڑکے ہوتے ہیں اور باقی سب لڑکے ربنوں سے آراستہ اور گھوڑوں پر سوار جلوس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں ، جس کی پیشوائی ایک ویگن یا سلیج میں سدا بہار پتوں کے تاج پہنے دو لڑکیاں کرتی ہیں - ایک درخت کے نیچے مقدمے کی سماعت ہوتی ہے ، جس میں لڑکے سپاہیوں کے روپ میں سزائے موت کا حکم سناتے ہیں - بوڑھے پتلے کو بچانے اور لے بھاگنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں - وہ اسے لے کر درخت پر چڑھنا چاہتے ہیں ، لیکن پھسل پھسل کر نیچے آ رہتے ہیں - آخر تھک ہار کر وہ اپنے آپ کو زمین پر گرا دیتے ہیں اور اس پھانسی پانے والے آدمی کے لیے گریہ و زاری شروع کر دیتے ہیں - پھر ایک عہدے دار تقریر کرتا ہے ، جس میں وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ کارنیول کو سزائے موت دی گئی ہے ، کیوں کہ اس کی وجہ سے ان لوگوں کو نقصان پہنچا ہے ؛ ان کی جوتیاں گھس گئیں اور وہ تھک کر نڈھال ہو گئے ہیں - لیکرین کے مقام پر چار آدمی ایک شخص کو جو عورتوں کے سے سیاہ کپڑوں میں ملبوس ہوتا ہے ایک ارتھی پر لے کر نکلتے ہیں - کچھ اور آدمی سیاہ زنانہ لباس پہنے اس کا ماتم کرتے

ہیں ، پھر اسے گھورے کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور پانی میں بھگو کر شرابور کر دیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد اسے گھورے میں گاڑ کر اس پر پیال ڈال دی جاتی ہے ۔ توبہ کے منگل کی رات ایستھونیا والے پیال کا ایک پتلا تیار کرتے ہیں جسے ''روح جنگل'' کہا جاتا ہے ۔ اسے باری باری ایک سال مردوں کا کوٹ اور ٹوپ پہنایا جاتا ہے اور ایک سال ہڈ اور سایہ ۔ اس پتلے کو ایک لمبی سی بلی سے چسپاں کر دیا جاتا ہے اور چیختے چلاتے گاؤں کی سرحد کے پار لے جایا جاتا ہے جہاں اسے کسی درخت کی پھننگ سے باندھ دیا جاتا ہے ۔ خیال ہے کہ اس رسم سے تمام آفتوں کا سد باب ہو جاتا ہے ۔

بعض وقت ان سارے لینٹ والے تیوہاروں میں مردے کے دوبارہ زندہ ہونے کا سوانگ بھرا جاتا ہے ۔ چناں چہ سوییا کے بعض علاقوں میں توبہ کے منگل کو وہ شخص جو ڈاکٹر آہن ریش بنتا ہے بیمار کی فصد کھولنے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس پر بیمار زمین پر گر پڑتا ہے ۔ لیکن آخر میں ڈاکٹر ایک ٹیوب کے ذریعے اس میں ہوا پھونک کر اسے جلا دیتا ہے ۔ ہارٹس (جرمنی) کے پہاڑوں میں جب کارنیول ختم ہوتا ہے تو ایک آدمی کو کڑھاؤ میں رکھ کر نوحے پڑھتے ہوئے قبرتک لے جایا جاتا ہے ، لیکن قبر میں اس آدمی کی بجائے برانڈی کا ایک گلاس دفن کر دیا جاتا ہے ۔ پھر ایک تقریر ہوتی ہے ، جس کے بعد لوگ گاؤں کے سبزہ زار یا جلسہ گاہ واپس پہنچتے ہیں اور مٹی کے وہ لمبے لمبے پائپ پیتے ہیں جو اس قسم کے جنازوں کے جلوسوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں ۔ اگلے سال توبہ کے منگل کی صبح قبر کھود کر برانڈی نکال لی جاتی ہے اور تیوہار کی رسم افتتاح کے طور پر ہر شخص اس روح کو چکھتا ہے ، جو بہ قول ان کے دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے ۔

(۳) دفع موت ۔ ''موت کو دفع کرنے'' کی رسم کارنیول کے جنازے والی رسم سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ موت کو دفع کرنے کے بعد ، یا کم از کم اس کے ساتھ ساتھ گرمی ، بہار ، یا زندگی کی آمد کا اعلان کر دیا جاتا ہے ۔ چناں چہ بویریا کے

طرح شجری یا نباتی روح کا مظہر ہونا چاہیے ۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ گرمی والا شجر بعض صورتوں میں موت کی حیات نو سے عبارت ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان صورتوں میں اس شبیہ کو جسے موت کہا جاتا ہے ، نباتی یا شجری روح ہی کا ایک مظہر ہونا چاہیے ۔ اس استنباط کی تصدیق ایک تو اس عقیدے سے ہوتی ہے کہ موت کی شبیہ کے ٹکڑوں کی برکت سے نباتات اور حیوانات نئی زندگی پاتے ہیں اور ثمرور ہوتے ہیں اور جیسا کہ ہم اس کتاب میں پہلے ایک جگہ دیکھ چکے ہیں ، شجری روح کی یہ حیات بخش اور زرخیز قوت ایک امتیازی خصوصیت ہے ، دوسرے اس امر سے بھی کہ شبیہ کو بعض وقت پتوں سے سجایا جاتا ہے یا ڈالیوں ، شاخوں ، سن یا اناج کی جھڑی ہوئی بولیوں سے تیار کیا جاتا ہے ، نیز شجر بہار ، خاتون بہار اور شجر گرما اور اس سے منسلک گرمی کی گڑیا کی طرح اسے ایک چھوٹے سے درخت پر لٹکا کر لڑکیاں پیسے وصول کرتی پھرتی ہیں ۔ مختصر یہ کہ ہم کم از کم بعض صورتوں میں موت کے دفع کرنے اور گرمی کے واپس لانے کو بہار کی موت اور نباتات کی نئی زندگی کا ویسا ہی ایک سوانگ قرار دینے پر مجبور ہیں جو ہمیں 'جنگلی آدمی' کے مارے اور جلائے جانے کی رسم میں نظر آیا تھا ۔ کارنیول کے جنازے اور نئے جنم والی رسم بھی غالباً اسی تصور کے اظہار کی ایک دوسری صورت ہے ۔ اگر موت کی شبیہ کی مانند کارنیول سے بھی قوت حیات و افزائش منسوب کی جاتی ہو تو اس کا گھورے یا گوبر کے ڈھیر کے نیچے دبایا جانا ایک قدرتی بات ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ ایستھونیا والے جو حسب معمول توبہ کے منگل کو تنکوں کا ایک پتلا لے کر گاؤں میں نکلتے ہیں ، اسے کارنیول نہیں کہتے ، بلکہ جنگل کی روح (میٹسیک) کے نام سے موسوم کرتے ہیں ، اور وہ اس شبیہ کو بن میں ایک درخت کی پھننگ سے باندھ کر جنگل کی روح سے اس کی مماثلت کو صاف ظاہر کر دیتے ہیں ، جہاں وہ سال بھر لٹکی رہتی ہے اور تقریباً روز اس سے مویشی کے گلوں کی حفاظت کی پرارتھنا کی جاتی ہے ، اور اسی غرض سے اس پر نذریں چڑھائی جاتی ہیں ، کیوں کہ سچی شجری روح کی طرح میٹسیک

مویشی کی محافظ تصور کی جاتی ہے ۔ بعض وقت اس میٹسیک کو اناج کی پولیوں سے تیار کیا جاتا ہے ۔

بنا بریں یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ ان رسموں میں جو ابھی ہمارے زیر بحث رہی ہیں ، جن ہستیوں کی تمثیل یا تجسیم کی جاتی ہے ان کا کارنیول یا موت اور گرمی کے ناموں سے موسوم کیا جانا بعد کی چیز ہے اور ان ناموں سے ان کے خد و خال کما حقہ اجاگر نہیں ہوتے ۔ ان ناموں کی تجریدی خصوصیت ہی ان کے جدیدالاصل ہونے کی غماز ہے ، اس لیے کہ کارنیول اور گرمی جیسے زمانے اور موسم یا موت جیسے تجریدی تصور کو شخصی خصوصیات سے متصف کرنا یا ظاہری روپ دینا عہد جاہلیت کی چیز نہیں ۔ لیکن خود ان رسموں پر عہد عقیق کی چھاپ پڑی ہوئی ہے ۔ لہذا ہم یہ فرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ تصورات جو ان رسموں کی پشت پر تھے ابتدا میں سیدھے سادے اور ٹھوس یا مقرون تھے ۔ کسی درخت یا شاید کسی خاص قسم کے درخت (کیوں کہ بعض وحشی قوموں کے ہاں درختوں کے لیے کوئی اسم عام نہیں ملتا) یعنی کسی منفرد درخت کا تصور بھی اتنا مقرون ضرور ہوتا ہے کہ اس کی بناء پر تعمیم کے تجریدی عمل سے نباتی روح کے وسیع تر تصور تک پہنچا جا سکتا ہے ، لیکن روح نباتات کے اس عام تصور پر اس موسم کا مغالطہ ہو جاتا ہے یا یوں کہیے کہ یہ تصور بہآسانی اس موسم پر منطبق ہو جاتا ہے جس میں وہ رونما ہوئی ہو ۔ لہذا شجری یا نباتی روح کا بہار ، گرمی یا مئی میں بدل جانا آسان اور قدرتی چیز ہے ۔ نیز مرجھانے والے درخت یا نباتات کا سا مقترن تصور اسی عمل تعمیم سے بہ تدریج موت کے عام تصور کی جگہ لے لیتا ہے ؛ تا آں کہ بہار میں پژمردہ اور خشک نباتات کو ان کی نئی زندگی کی تمہید کے طور پر نکال پھینکنے کا دستور پھیل کر ایک زمانے میں گاؤں یا ضلع سے خود موت کو نکال باہر کرنے کی کوشش کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ اس نظریے کو مان ہارٹ جیسے بلند پایہ محقق کی تائید حاصل ہے کہ ان بہاری رسموں میں موت سے پہلے پہل مرجھانے والے یا خشک نباتات مراد تھے ۔ مان ہارٹ اس کی تصدیق

میں اناج کے لیے اسم موت کے استعمال کی نظیر پیش کرتا ہے ۔ عموماً پکے اناج کی روح کو مردہ نہیں بلکہ مسن تصور کیا جاتا ہے اور اس لیے اسے بوڑھا یا بڑھیا کہا جاتا ہے ۔ لیکن بعض مقامات پر کھیت کی وہ پولی جو آخر میں کاٹی جاتی ہے اور جسے عام طور پر اناج کی روح کا مرکز سمجھا جاتا ہے ، ''مرنے والے'' کے نام سے موسوم ہے ۔ بچوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اناج کے کھیتوں میں نہ جائیں ، کیوں کہ اناج میں موت بیٹھی ہوئی ہے اور ٹرانسلوینیا کے سیکسن بچوں کے ایک کھیل میں جو مکئی کی فصل کی کٹائی کے وقت کھیلا جاتا ہے ، موت کا روپ ایک بچہ بھرتا ہے ، جو سر سے پاؤں تک مکئی کے پتوں میں ڈھکا ہوتا ہے ۔

(ب) جاڑے اور گرمی کی لڑائی ۔ بعض وقت سردیوں میں نباتات کی قوتوں اور گرمیوں میں ان قوتوں کی بے داری کا تضاد دیہات کی عام رسموں میں گرمی اور جاڑے کا حصہ ادا کرنے والے کرداروں کے درمیان ایک ڈرامائی معرکے کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ چناں چہ سویڈن کے شہروں میں نوجوان سواروں کے دو دستے اس طرح ایک دوسرے کے مقابل آیا کرتے تھے جیسے ان میں گھمسان کا رن پڑنے والا ہو ۔ ان میں سے ایک دستے کی کمان سمور میں ملبوس ایک سرمائی بہروپیے کے ہاتھ میں ہوتی جو سردی کو طول دینے کی غرض سے برف کے گالے برساتا ۔ دوسرے دستے کی کمان پھول پتوں میں لدا گرمی کا ایک نمائندہ کرتا ۔ پھر ان دونوں دستوں کے درمیان مصنوعی جنگ ہوتی ، جس میں گرمی کی فوج غالب آتی اور یہ رسم ایک ضیافت پر ختم ہو جاتی ۔ نیز رمائن کے وسطی علاقے میں گرمی کا حصہ ادا کرنے والا عشق پیچاں میں لپٹا تنکوں یا کائی میں ملبوس سردی کے نمائندے سے نبرد آزما ہوتا ہے اور انجام کار اسے ہرا دیتا ہے ۔ مغلوب دشمن کو زمین پر پٹخ دیا جاتا ہے اور اس کا تنکوں والا لباس اتار کر اس کی دھجیاں بکھیر دی جاتی ہیں جس کے ساتھ ان دونوں سورماؤں کے نوجوان ساتھی گرمی پر جاڑے کی فتح کی خوشی میں ایک

گیت گاتے ہیں ۔ اس کے بعد وہ ایک گجرا یا درخت کی شاخ لیے گھر گھر جاتے ہیں اور انڈے اور سور کا گوشت وصول کرتے ہیں ۔ بعض وقت گرمی کا حامیتی پھول پتوں میں ملبوس ہوتا ہے اور اس کے سر پر سنہرا بندھا ہوتا ہے ۔ پالاٹینٹ میں یہ مصنوعی معرکہ لینٹ کے چوتھے اتوار کو ہوتا ہے ۔ بویریا بھر میں بھی اس دن یہی ڈرامہ کھیلا جاتا ہے اور بعض مقامات پر انیسویں صدی کے وسط یا اس کے بعد تک یہ رسم جاری تھی ۔ اس میں گرمی اپنے لاجوردی لباس میں لہراتے ہوئے ربنوں سے سجی ، ہاتھ میں ایک کلیائی ٹہنی یا چھوٹا سا درخت لیے نکلتی جس پر سیب اور ناشپاتیاں ٹنگی ہوتیں ۔ ادھر سردی سمور کی ٹوپی اور عبا میں ملبوس ہاتھ میں برف صاف کرنے کا بیلچہ یا سلارا لیے ہوتی ۔ اپنے اپنے خدم و حشم کے ساتھ ، جو مناسب لباس پہنے ہوتے یہ دونوں گاؤں کی گلیوں میں سے گزرتے اور ہر گھر پر رک رک کر دقیانوسی گیتوں کے بند الاپتے جس کے صلے میں انھیں روٹی انڈے اور پھل ملتے ۔ آخر مختصر سی کش مکش کے بعد گرمی جاڑے کو پیٹ دیتی اور اسے نعروں اور قہقہوں کی گونج میں گاؤں کے کنوئیں میں ڈبو دیا جاتا یا جنگل میں بھگا دیا جاتا ۔

جنوبی آسٹریا میں گوئیپ فرٹس کے مقام پر توبہ کے منگل کو دو آدمی گرمی اور جاڑے کا روپ دھارے گھر گھر پہنچا کرتے تھے اور بچے ہر جگہ خوشی خوشی ان کی آؤ بھگت کرتے ۔ ان میں گرمی کا نمائندہ سفید کپڑوں میں ملبوس اور ایک درانتی لیے نکلتا ۔ اس کا ساتھی جو سردی کا حصہ ادا کرتا ، سر پر سمور کی ٹوپی اوڑھے ٹانگوں اور بازؤں پر پیال لپیٹے اور ہاتھ میں ایک سلارا لیے ہوتا ۔ یہ دونوں ہر گھر پر پہنچتے اور باری باری شعر گاتے تھے ۔ برنزوک میں ڈروم لنگ کے مقام پر لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں ہر سال سفید عید پر اب بھی گرمی اور جاڑے کو مار بھگانے کے لیے گاتے ، چیختے چلاتے اور گھنٹیاں بجاتے گھر گھر دوڑتے پھرتے ہیں ۔ ان کے پیچھے لڑکیاں اپنے زرق برق لباس میں پھولوں اور ہاروں سے سجی ، آغاز بہار کی نمائندگی کرتی ، خراماں خراماں گاتی ہوئی آتی ہیں ۔ پہلے سردی کا حصہ پیال کا ایک پتلا ادا

کیا کرتا تھا ، اب سچ مچ ایک آدمی اس کا روپ بھرا کرتا ہے ۔

شمالی امریکہ کے وسطی علاقے کے اسکیموؤں کے ہاں گرمی اور جاڑے کے معرکے کی رسم جو یورپ میں مدت مدید سے ڈرامائی صورت اختیار کر چکی ہے ، اب تک ایک سحری عمل کے طور پر ادا کی جاتی ہے ، جس کا مقصد صریحاً موسم کو متاثر کرنا ہے ۔ خزاں میں جب طوفان قطب شمالی کی سردیوں کی آمد کا اعلان کرتے آتے ہیں تو یہ اسکیمو دو جماعتوں میں بٹ جاتے ہیں ، جنھیں علی الترتیب پتارمگن (ایک قسم کا پرندہ جس کے پر گرمیوں میں سیاہ یا بھورے اور سردیوں میں سفید ہو جاتے ہیں) اور بطیں کہا جاتا ہے ۔ پتارمگن ان تمام اشخاص پر مشتمل ہوتے ہیں ، جو جاڑوں میں پیدا ہوئے ہوں اور بطیں ان تمام اشخاص پر جنھوں نے گرمیوں میں جنم لیا ہو ۔ سیل (دریائی بچھڑا) کی پوست کا بٹا ہوا ایک لمبا سا رسا پھیلا دیا جاتا ہے جس کا ایک ایک سرا ان امریکنوں کی دونوں جماعتیں تھام لیتی ہیں اور پھر ان میں رسا کشی ہوتی ہے ۔ اس میں اگر پتارمگن ہار جائیں تو گرمی ختم ہو جاتی ہے اور سردی بھر اچھے موسم کی توقع کی جاتی ہے ۔

## (٦) کاسٹرو بونکو کی موت اور نیا جنم—روس میں

کارنیول کے جنازے یا دفع موت کی سی تجہیز و تکفین کی رسمیں موت یا کارنیول کے ناموں سے موسوم نہیں ، بلکہ یہاں وہ کاسٹرو بونکو ، کپالو ، کاستروما ، لاڈا اور ماریلا جیسے افسانوی کرداروں کے ناموں سے جاری ہیں ۔ یہ روسی رسمیں بہار اور وسط گرما دونوں میں ادا کی جاتی ہیں ۔ چناں چہ روس صغیر میں یہ دستور تھا کہ ایسٹر کے دنوں میں بہار کے دیوتا یا دیوی موسوم بہ کاسٹرو بونکو کی تجہیز و تکفین کی ایک رسم ادا کی جاتی تھی ۔ اس میں گویے حلقہ باندھ کر ایک لڑکی کے گرد گھومتے ، جو زمین پر اس طرح بنی پڑی رہتی جیسے مر گئی ہو اور یہ گاتے جاتے :

’مر گئی ، مر گئی ، کاسٹرو بونکو ہماری !
مر گئی ، مر گئی ، پیاری ہماری !‘‘

دفعتاً وہ لڑکی اٹھ بیٹھتی ، جس پر ان گویوں کا طائفہ چیخ اٹھتا :

’’جی اٹھی ، جی اٹھی ، کاسٹرو بونکو ہماری !
جی اٹھی ، جی اٹھی ، پیاری ہماری !‘‘

حضرت یوحنا کے عرس کی شب (چوبیس جون کی شب) کو پالو کے نام سے پیال کا ایک پتلا بنایا جاتا ہے اور اسے ’’زنانہ لباس ، ایک نیکلس اور پھولوں کا تاج پہنایا جاتا ہے ۔ پھر ایک درخت کاٹا جاتا ہے ، جسے ربنوں سے آراستہ کرکے کسی مقررہ مقام پر لے جا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے ۔ اس درخت کے قریب جسے مارینا (سرما یا موت) کہتے ہیں ، وہ پتلا اور ایک میز رکھ دی جاتی ہے ۔ اس میز پر شراب اور کھانے کی چیزیں رکھی ہوتی ہیں ۔ اس کے بعد ایک الاؤ روشن کیا جاتا ہے اور جوان لڑکے لڑکیوں کی جوڑیاں اس پتلے کو لیے اس پر سے چھلانگیں لگاتی ہیں ۔ اگلے دن اس درخت اور پتلے کو اتار لیا جاتا ہے اور دونوں کو ایک ندی میں پھینک دیا جاتا ہے ۔‘‘ ۲۹ جون کو سینٹ پیٹر کے عرس پر یا اس سے اگلے اتوار کو روس میں کاسٹروما ، لاڈا یا یاریلو کے ’’کریا کرم‘‘ کی رسم ادا کی جاتی ہے ۔ صوبہ جات پینزا اور سمبر سک میں اس کریا کرم کا ڈرامہ یوں کھیلا جاتا تھا : ۹ جون کو ایک الاؤ روشن کیا جاتا ۔ اس سے اگلے دن ناکتخدا لڑکیاں کاسٹروما کا حصہ ادا کرنے کے لیے اپنے میں سے کسی ایک کو منتخب کرتیں ۔ پھر سب اسے بڑے ادب سے کورنش بجا لاتیں اور ایک تخت پر بٹھا کر کسی ندی کے کنارے لے جاتیں ۔ یہاں وہ اسے نہلاتیں اور ان میں سب سے بڑی لڑکی لائم کے درخت کی چھال کی ایک ٹوکری بنا کر اسے ڈھول کی طرح پیٹتی جاتی ۔ پھر وہ گاؤں لوٹ کر جلسے جلوسوں اور ناچ کھیل میں دن گزار دیتیں ۔ ضلع موروم میں کاسٹروما کی شبیہ پیال کے ایک پتلے پر مشتمل ہوتی تھی ، جسے زنانہ لباس اور پھول پہنا دیے جاتے تھے ۔

اسے ایک ناند میں لٹا کر نغمہ و سرود کی گو میں کسی جھیل یا تالاب کے کنارے لے جایا جاتا ۔ یہاں لوگوں کا ہجوم دو مخالف جماعتوں میں بٹ جاتا ۔ ان میں سے ایک اس پتلے پر حملہ کرتی اور دوسری اس کا بچاؤ ۔ انجام کار میدان حملہ آوروں کے ہاتھ رہتا ۔ وہ اس کے کپڑے اور آرائش کا سارا ساز و سامان اتار کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے اور اس کی پیال کو روند کر بہتی ندی میں پھینک دیتے ۔ ادھر اس کا بچاؤ کرنے والے منہ پر ہاتھ رکھ کر جھوٹ موٹ کاسٹروما کی موت کا ماتم کرتے ۔ ضلع کاسٹروما میں یاریلو کے جنازے کا جلوس جون کی ۲۹ یا ۳۰ تاریخ کو نکلا کرتا تھا ۔ اس میں لوگ ایک سن رسیدہ آدمی کو چن کر اسے ایک چھوٹا سا تابوت دے دیتے ، جس میں پرانی ایپس (افزائش نسل اور ثمروری کا دیوتا ، جس کی پرستش کی رسم مشرق سے یونان اور اٹلی پہنچی تھی ۔ اس کا مجسمہ باغات اور مکانات کے پھاٹکوں پر رکھا رہتا تھا) کی شکل کی سی یاریلو کی ایک شبیہ رکھی ہوتی ۔ اسے لیے وہ بوڑھا شہر سے نکلتا اور اس کے پیچھے نوحہ خواں عورتیں مرثیے گاتی اور اپنے حرکات وسکنات سے شدید رنج و غم اور مایوسی کا اظہار کرتی جاتیں ۔ خالی کھیتوں میں ایک قبر کھودی جاتی ، جس کے اندر آہ و بکا کے شور میں اس شبیہ کو اتار دیا جاتا ۔ اس کے بعد کھیل تماشے اور ناچ رنگ شروع ہوتے ''جن سے ان ماتمی کھیل تماشوں کی یاد تازہ ہو جاتی ، جو قدیم زمانے میں بت پرست سلافیوں کے ہاں رائج تھے ۔'' روس صغیر میں بعد مغرب یاریلو کا پتلا ایک تابوت کے اندر گاؤں کے گلی کوچوں میں لے جایا جاتا تھا ، جسے مخمور عورتیں گھیرے سوگوار یہ دھراتی جاتیں : ''ہیہات وہ چل بسا ! ہیہات وہ چل بسا ! ۔'' مرد اس پتلے کو اٹھا کر اس طرح ہلاتے جیسے وہ اسے موت کی نیند سے جگانے کی کوشش کرتے ہوں ۔ پھر وہ ان عورتوں سے کہتے 'عورتو ، روؤ نہیں ! مجھے معلوم ہے کہ وہ چیز کیا ہے جو شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے ۔'' لیکن عورتیں برابر اسی طرح بین کیے جاتیں ، جس طرح وہ کسی کی موت پر کیا کرتی ہیں ''اس نے کیا خطا کی تھی؟ ہائے وہ کتنا اچھا تھا ! یہ اب کبھی نہیں جاگے گا ۔

ھائے ھم تجھے کیوں کر وداع کریں! تیرے بغیر جینا بے کار ھے! اور کچھ نہیں تو چند لمحوں ھی کے لیے بیدار ھو ج! لیکن ھائے وہ نہیں اٹھتا، نہیں اٹھتا!۔'' آخر کار یاریلو کو ایک قبر میں دفن کر دیا جاتا۔

(۷) نباتات کی موت اور نئی زندگی—ظاھر ھے کہ متذکرہ روسی رسموں اور ان رسموں کی نوعیت ایک ھی ھے جو آسٹریا اور جرمنی میں ''دفع موت'' کے نام سے موسوم ھیں۔ لہذا اگر مؤخرالذکر رسموں کی جو تعبیر کی گئی ھے وہ درست ھے تو روس والے کاسٹرو بونکو، یاریلو وغیرہ وغیرہ کی حیثیت بھی شروع شروع میں روح نباتات کے مظاھر ھی کی رھی ھوگی، اور ان کی موت حیات نو کا عنوان تصور کی جاتی ھوگی۔ موت کے نتیجے میں زندگی کا سوانگ مذکورہ بالا روسی رسموں میں پہلی رسم یعنی کاسٹرو بونکو کی موت اور احیاء میں بھرا جاتا ھے۔ ان میں سے بعض رسموں میں نباتات کی روح کی موت اور حیات نو کا تیوھار وسط گرما میں منانے کا سبب یہ ھو سکتا ھے کہ گرمی کا زوال چوبیس جون سے شروع ھو جاتا ھے، جس کے بعد دن چھوٹے ھوتے چلے جاتے ھیں اور آفتاب:

''ان تاریک غاروں کی طرف
جہاں جاڑے کا پالا پڑا ھوتا ھے''

اترنے لگتا ھے۔ سال کے اس نقطۂ تغیر کو، جب گرمی کے انحطاط کے ساتھ ساتھ جو اگرچہ ھنوز نہایت خفیف اور موھوم سا ھوتا ھے، عام خیال کے بموجب نباتات کا زوال شروع ھو جاتا ھو، غیر مہذب انسان کا اپنی ان سحری رسموں کے لیے موزوں قرار دینا بے جا نہ تھا، جن کے ذریعے وہ نباتات کے انحطاط کا انسداد یا کم از کم احیاء کی توقع رکھتا ھو۔

لیکن جہاں بہ ظاھر نباتات کی موت کا سوانگ ان ساری کی ساری رسموں اور ان کی نئی زندگی کا سوانگ ان میں سے چند ایک میں بھرا جاتا تھا، وھاں ان میں بعض رسموں کی کچھ خصوصیات ایسی بھی

ہیں جن کی توجیہ اس مفروضے کی بناء پر مشکل ہے ۔ جنازے کا سوگوار جلوس ، رونا پیٹنا اور ماتمی لباس ، جو بالعموم ان رسموں کی نمایاں خصوصیات ہیں ، یقیناً نباتات کی بابرکت روح کی موت سے مطابقت رکھتے ہیں ، لیکن جس مسرت و شادمانی کے ساتھ اکثر موت کی شبیہ نکالی جاتی ہے اس کی توجیہ کیا کی جائے ؟ اس پر جو لکڑیاں اور پتھر برسائے جاتے ہیں اور لعن طعن کیا جاتا ہے اس کے بارے میں کیا کہا جائے ؟ اس دہشت کا کیا سبب سمجھا جائے جو موت کی شبیہ کے اٹھانے والوں کی اس حرکت سے عیاں ہے کہ وہ اسے پھینکتے ہی الٹے پاؤں گھر بھاگ آتے ہیں ، نیز اس عقیدے سے کہ اس شبیہ کی نظر جس گھر میں پڑ جائے اس میں ضرور کوئی نہ کوئی موت واقع ہو جائے گی؟ شاید اس خوف و دہشت کی کچھ توجیہ یہ ہو سکے کہ ایک عقیدے کے بموجب نباتات کی مردہ روح میں ایک قسم کی تعدیت ہوتی ہے ، جس کی وجہ سے اس کا قرب خطرناک ہو جاتا ہے ۔ لیکن یہ توجیہ کچھ تاویل بے جا سی معلوم ہوتی ہے اور اس سے ان خوشیوں کا بھی کچھ انشراح نہیں ہوتا ، جو موت کو دفع کرنے کی رسم کے ساتھ ساتھ منائی جاتی ہیں ۔ لہذا ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان رسموں کی دو خصوصیات ایسی ہیں جو ایک دوسرے سے متبائن اور بہ ظاہر متضاد ہیں! یعنی ، ایک طرف موت کا رنج و غم ، اس کی محبت اور احترام اور دوسری طرف موت کا خوف ، اس سے نفرت اور اس کے دفع ہونے پر خوشی کا اظہار ۔ ان میں اول الذکر کی توجیہ کیا ہونی چاہیے ، اسے میں واضح کرنے کی کوشش کر چکا ہوں ؛ اس کے ساتھ یہ دوسرا خوف وغیرہ کا عنصر مذکورہ بالا رسموں میں کیسے شامل ہو گیا ؟ اس سوال کا جواب آگے دینے کی کوشش کی جائے گی ۔

## (۸) ہندوستانی رسموں کی نظیر ــ ہندوستان کے ضلع

کانگڑا میں جوان لڑکیاں ایک تیوہار مناتی ہیں ، جو یورپ کی مذکورہ بالا بہاری رسموں سے ملتا جلتا ہے ۔ اس تیوہار کو رالی کا میلا کہتے ہیں جو صرف لڑکیوں تک محدود رہتا ہے اور سارے ضلع کانگڑا

میں منایا جاتا ہے ۔ یہ میلا جیٹھ کے بیشتر ایام اور بیساکھ میں سنکرات تک جاری رہتا ہے ۔ مارچ کی ایک صبح گاؤں کی تمام لڑکیاں چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں دوب اور پھول لیے ایک مقررہ مقام پر پہنچتی ہیں اور یہاں ان کا ڈھیر لگا دیتی ہیں ۔ پھر اس ڈھیر کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور گانا گاتی ہیں ۔ اس کا سلسلہ روزانہ دس دن تک جاری رہتا ہے ، تا آں کہ گھاس اور پھولوں کا ڈھیر خاصا اونچا ہو جاتا ہے ۔ اس کے بعد وہ جنگل سے تین ٹہنیاں کاٹ کر لاتی ہیں جن کا ایک ایک سرا سہ شاخہ ہوتا ہے اور انہیں سہ شاخہ کی طرف سے ڈھیر پر لگا دیتی ہیں ، اس طرح کہ ان کی دو تپائیاں سی بن جائیں ۔ ان ٹہنیوں کے بالائی سروں پر وہ ایک کمہار سے مٹی کی دو مورتیاں بنواتی ہیں ۔ ایک شیوا کی اور دوسری پاروتی کی ۔ پھر ان لڑکیوں کی دو ٹولیاں بن جاتی ہیں ۔ ایک شیوا والیوں کی اور دوسری پاروتی والیوں کی ، جو جملہ رسوم کے ساتھ ان مورتیوں کا بیاہ رچاتی ہیں ۔ اس کے بعد کھانا ہوتا ہے ، جس کا خرچ ان چندوں سے پورا کیا جاتا ہے جو وہ ماں باپ سے مانگ کر لاتی ہیں ۔ پھر سنکرات (بیساکھ) کو سب مل کر دریا پر پہنچتی ہیں ، ان مورتیوں کو ایک گہرے گڑھے میں اٹھا پھینکتی ہیں ، اور وہاں اس طرح آنسو بہانے لگتی ہیں جیسے وہ کسی کا کریا کرم کر رہی ہوں ۔ جس وقت یہ لڑکیاں اس طرح روتی دھوتی رہتی ہیں ، گرد و نواح کے لڑکے اکثر انہیں چھیڑنے کے لیے ان مورتیوں کے پیچھے غوطہ لگا کر انہیں نکال لاتے ہیں اور ہلاتے پھرتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ اس میلے کا مقصد یہ ہے کہ لڑکیوں کو بر اچھے ملیں ۔

یہ بات کہ مذکورہ بالا ہندوستانی رسم میں دیوی ، دیوتا ، شیوا اور پاروتی نباتی روحیں متصور ہوتے ہیں ۔ ان کی مورتیوں کے گھاس اور پھولوں کے ڈھیر پر شاخوں کے اوپر رکھے جانے سے ثابت ہوتی ہے ۔ یورپ کی لوک ریتوں کی طرح اس رسم میں بھی نباتی خدا بہ یک وقت دو صورتوں میں سامنے آتے ہیں ، یعنی پودوں اور مورتیوں دونوں کے روپ میں ۔ بہار میں ان ہندی دیوی دیوتاؤں کا بیاہ یورپی رسموں سے مطابقت

رکھتا ہے ، جن میں نباتات کی بھاری روحوں کا بیاہ بہار کے شاہ و ملکہ اور دولہا دلہن وغیرہ وغیرہ کی صورتوں میں رچایا جاتا ہے ۔ مورتیوں کا پانی میں پھینکنا اور ان کے لیے رونا پیٹنا موت ، یاریلو کاسٹروما وغیرھم کے ناموں سے نباتات کی مردہ روح کو پانی کی نذر کرنے اور ان کے ماتم کی یورپی رسموں کے مماثل ہے ۔ نیز ہندوستان میں یہ رسم صرف عورتیں ادا کرتی ہیں ، جیسا کہ یورپ میں بھی اکثر ہوا کرتا ہے ۔ یہ خیال کہ اس رسم سے لڑکیوں کے لیے اچھے بر حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے ، اس عقیدے کی روشنی میں واضح ہو سکتا ہے جس کے بموجب روح نباتات انسان اور پودوں دونوں کو نئی زندگی بخشتی اور ثمرور کرتی ہے ۔

(۹) طلسمی بہار ــ ہم نے اپنی بحث کے دوران میں اس قسم کی رسموں کی جس توجیہ کو قبول کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی حیثیت در اصل ایسی سحری رسموں کی ہے یا تھی ، جن سے یہ یقین کرنا مقصود ہو کہ بہار میں فطرت کی روح بیدار ہو جائے ۔ خیال تھا کہ یہ مقصد نقل اور مشارکت کے ذریعے حاصل ہو جاتا ہے ۔ اشیاء کی حقیقی علتوں سے لاعلمی کی بناء پر غیر مہذب انسان نے یہ باور کر رکھا تھا کہ فطرت کے ان عظیم مظاہر کو وجود میں لانے کے لیے، جن پر اس کی زندگی موقوف ہو ، ان کی نقل کرنی کافی ہے اور وہ کسی صحرائی میدان یا پہاڑ کی گھاٹی ، دشت بے آب و گیاہ یا طوفانی ساحل پر جو چھوٹے چھوٹے ناٹک کھیلتا ہے ، وہ چپکے چپکے اپنا کام کر جاتے ہیں اور مشارکت یا کسی مخفی عمل کے سبب فطرت کے جلیل القدر اداکار اس کی دیکھا دیکھی اپنے وسیع تر اسٹیج پر وہی کھیل شروع کر دیتے ہیں ۔ اس نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ پھول پتوں کا بھیس بدل کر وہ ننگی دھرتی کو اپنا لاجوردی لباس پہننے میں مدد دیتا ہے اور جاڑے کی موت اور جنازے کا سوانگ بھر کر وہ اس المناک اور بے رونق موسم کو دفع کرتا ہے اور بہار کی واپسی کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے ۔ ہمارے لیے ذہن کی اس حالت کا تصور بھی مشکل سہی جس میں

یہ سب کچھ ممکن نظر آتا ہو ، لیکن جب وحشی نے پہلے پہل اپنی حیوانی احتیاجات سے بلند ہو کر اشیاء کے اسباب و علل پر غور کرنا شروع کیا ہوگا تو اسے فطرت کے ان ہمہ گیر اور غیر متغیر رجحانات کے انکشاف سے جو تردد پیدا ہوا ہوگا ، جنھیں ہم قوانین فطرت کے نام سے موسوم کرتے ہیں ، اس کا اندازہ لگانا ہمارے لیے چنداں دشوار نہیں ۔ جس باضابطگی اور یکسانیت کے ساتھ کائنات کے عظیم مظاہر یکے بعد دیگرے وجود میں آتے رہتے ہیں اس سے ہم چوں کہ مانوس ہو چکے ہیں اس لیے ہمیں کم از کم مستقبل قریب میں اس بات کے اندیشے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ عمل جو ان مظاہر کی پشت پر جاری ہے رک جائے گا اور ان کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا ۔ لیکن فطرت کے استحکام پر یہ اعتماد پیہم مشاہدے اور مدتوں کی روایت کا نتیجہ ہوتا ہے اور وحشی کے ہاں جس کے مشاہدے کا دائرہ تنگ اور روایات ناپائدار ہوتی ہیں ، تجربے کا وہی عنصر مفقود ہوتا ہے ، جس کے بغیر فطرت کے متواتر اور ہیبت ناک تغیرات کے آگے انسان کے اوسان بجا نہیں رہ سکتے ۔ لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں جو وہ چاند سورج کو گہناتا دیکھ کر سراسیمہ ہو جائے اور یہ خیال کرنے لگے کہ اگر وہ ان اجرام فلکی کو اس مہیب درندے سے بچانے کے لیے جو انھیں ہڑپ کرنے پر تلا ہوا ہو ، ہلڑ نہ مچائے اور فضا میں اپنے ننھے ننھے تیروں کی باڑھ نہ مارے تو وہ فنا ہو جائیں گے ۔ کوئی تعجب کی بات نہیں جو رات کی تاریکی میں اچانک کوئی تارا ٹوٹ جائے یا شمالی افق سے شہابی فوارے چھوٹ چھوٹ کر گنبد گردوں کی پہنائیوں میں نور کی ایک محراب بنا دیں اور اس کے ہوش اڑ جائیں ۔ بلکہ فطرت کے وہ واقعات بھی اس کے لیے باعث خوف و ہراس ہو سکتے ہیں ، جو مقررہ اور یکساں وقفوں سے ظہور میں آتے رہتے ہیں ، اور جن کی اس باضابطگی کا اسے ابھی شعور نہ ہو ۔ فطرت کے ان تغیرات کی متوالی یا دوری نوعیت سے انسان کا جلد یا بہ دیر واقف ہونا بڑی حد تک کسی خاص دور کی طوالت پر منحصر ہوگا ۔ مثلاً قطبی علاقوں کے سوا ، ہر جگہ شب و روز نہایت مختصر ہوتے ہیں اور اس لیے اس قدر جلدی جلدی آتے

ہیں کہ لوگوں کے دل سے کسی وقت ان کی گردش رک جانے کا اندیشہ بہت جلد دور ہو گیا ہوگا۔ اگرچہ مصر قدیم کے لوگ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، مشرق میں سورج کو واپس لانے کے لیے، جو مغرب کی پھولتی شفق میں غروب ہو جاتا تھا، روز جادو ٹونے کیا کرتے تھے۔ لیکن موسموں کے سالانہ دور کے ساتھ قصہ بالکل مختلف تھا۔ انسان کی چند روزہ زندگی کے پیش نظر کسی بھی آدمی کے لیے ایک سال کی مدت خاصی ہوتی ہے۔ وحشی کے لیے جس کا حافظہ کمزور اور جس کے وقت کے پیمانے ناقص ہوتے ہیں ایک سال کا عرصہ ضرور اتنا طویل ہوگا کہ کی اسے سال کے دوری یا متوالی پھلو کا سرے سے کوئی شعور ہی نہیں ہو پایا اور ارض و سما کے بدلتے ہوئے جون اسے مدام محو حیرت رکھتے ہوں گے۔ کبھی حرارت و روشنی اور حیوانی و نباتاتی زندگی میں تبدیلیاں اس کے آرام و آسائش میں مد ہو کر اس کے لیے باعث انبساط و شادمانی ہوتی ہوں گی اور کبھی اس کے وجود کے لیے خطرہ بن کر اسے ہراساں اور ملول کر دیتی ہوں گی۔ خزاں میں جب ہوا جھڑے ہوئے پتوں کو جنگل میں اڑائے لیے پھرتی ہوگی تو کیا ایسے میں درختوں کی ننگی شاخوں کو دیکھ کر وہ یہ یقین کر سکتا تھا کہ ان میں پھر کبھی تازہ کونپلیں پھوٹیں گی؟ جب آفتاب آسمان پر روز افزوں دور ہوتا نظر آتا ہوگا تو اسے یقین آ سکتا تھا کہ وہ اپنی شاہ راہ فلک پر دوبارہ مراجعت کرے گا؟ بلکہ افق مشرق پر اترتے چاند کے بے آب خنجر کو روز بہ روز گھٹتا دیکھ کر بھی اس کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہوگا کہ کہیں وہ غائب ہو کر دنیا کو اپنی روشنی سے بالکل محروم نہ کر دے۔

یہ اور ایسے ہی ہزاروں خدشے اس انسان کو پریشان رکھتے ہوں گے جس نے پہلے پہل عالم کے اسرار و رموز پر غور کرنا شروع کیا تھا اور جس کی فکر فردا مستقبل قریب تک مدود نہیں رہی تھی۔ ان خدشات و افکار کے ہجوم میں یہ قدرتی بات تھی کہ وہ شاخوں کو پھر سے سرسبز کرنے، جاڑوں کے رو بہ زوال آفتاب کو آسمان پر اس جگہ اٹھا کر واپس لے جانے جہاں وہ گرمی میں رہتا ہو، اور اترتے چاند

کی نقرئی قندیل کو پھر ماہ کامل بنانے کی مقدور بھر کوشش کرتا ۔ آپ کو شاید اس کی ان لاطائل مساعی پر ہنسی آتی ہو ، لیکن آدمی کو مدتوں کی مسلسل آزمائشوں کے بعد ہی ، جن میں چند ایک کا ناکام ہونا ناگزیر تھا ، اس بات کا تجربہ ہوا کہ اس کی آزمودہ تدبیروں میں بعض دور از کار تھیں اور بعض کارگر ۔ بہر کیف جادو ٹونے یا سحری رسمیں ایسی آزمائشوں یا تجربوں سے عبارت ہیں جو ناکام رہے ہوں اور جنھیں اس لیے دہرایا جاتا ہو کہ مذکورہ بالا اسباب کی بناء پر عامل کو ان کی ناکامی کا علم نہیں ہوتا ۔ علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ یا تو قطعاً ترک کر دیے جاتے ہیں یا ان کا بنیادی مقصد فراموش ہو چکنے کے بعد مدتوں محض عادتاً جاری رہتے ہیں ۔ جب سحری رسمیں اپنی ساکھ کھو دیتی ہیں اور جب یہ پتہ چل جاتا ہے کہ ان کی پابندی سے اجتماعی فلاح و بقا کا کوئی تعلق نہیں ، تو وہ ترے تماشوں ، سوانگوں اور سامان تفریح کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بالغ آدمی انھیں بالکل ترک کر دیتے ہیں اور کسی عہد کے داناؤں کا یہ اہم ترین مشغلہ بازیچۂ اطفال بن کر رہ جاتا ہے ۔ اپنے انحطاط کے اسی آخری مرحلے پر ہمارے یورپی اسلاف کی بیشتر رسمیں ابھی تک جاری ہیں اور اس حالت میں بھی ان بے شمار اخلاق ، عقلی اور عمرانی قوتوں کا بڑھتا ہوا سیلاب انھیں خس و خاشاک کی طرح بہائے دیتا ہے ، جو بنی نوع انسان کو ایک نامعلوم منزل کی طرف بڑھائے لیے چلی جاتی ہیں ۔ ہمیں ان عجیب و غریب رسموں اور دل فریب تیوہاروں کے مٹنے کا کچھ نہ کچھ قلق ہونا لازمی ہے ، جن کی بدولت ایک ایسے عہد میں ، جسے اکثر شعریت اور رنگینیوں سے عاری سمجھا جاتا ہے ، اگلے وقتوں کی شگفتگی اور عالم کے عنفوان شباب کی جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں ۔ لیکن اگر ہم یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ان حقیر کھیل تماشوں ، ان معصوم تفریحوں کی بنیاد جہالت اور اوہام پر ہے ، یہ کہ جہاں وہ انسان کی جد و جہد کی یادگار ہیں ، وہاں اس کی بے ثمر فطانت ، ان تھک محنت اور اُمیدوں کا مزار بھی ہیں اور اپنے سارے طمطراق ــــــ تزئین و آرائش اور نغمہ و سرود ــــــ کے

باوصف ان میں طربیہ سے کہیں زیادہ المیہ کا عنصر شامل ہے ، تو ان کے مٹنے پر ہمیں چنداں رنج نہ ہوگا ۔

میں نے ڈبلیو مان ہارٹ کے اتباع میں ان رسموں کی جو توضیح پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس پر تالیف ہذا کے تکمیل کو پہنچنے کے بعد اس انکشاف سے مہر تصدیق ثبت ہو گئی کہ وسطی آسٹریلیا کے قدیم باشندے اس موسم کی آمد پر ، جسے آسٹریلوی بہار کہا جا سکتا ہے ، فطرت کی خفیہ قوتوں کو بیدار کرنے کی غرض سے اب تک باضابطہ سحری رسمیں ادا کیا کرتے ہیں ۔ وسطی آسٹریلیا کے بیابانوں میں رت جس طرح یکایک بدل جاتی ہے اور موسموں کا تضاد جس طرح نمایاں ہوتا ہے ، اس کی مثال شاید ہی دنیا کے کسی اور خطے میں ملے ۔ یہاں کے سنگلاخ ریگستان میں جس پر موت کی سی خاموشی اور اداسی چھائی رہتی ہے ، طویل مدت کے بعد اچانک موسلا دھار بارش ہونے لگتی ہے ، اور دیکھتے ہی دیکھتے چند ہفتوں کے اندر اندر یہ دشت بے آب و گیاہ ایک سرسبز اور شاداب خطے میں بدل جاتا ہے جس میں بے شمار کیڑے ، پتنگے ، چھپکلیاں ، مینڈک اور چڑیاں نمودار ہو جاتی ہیں ۔ فطرت کے اس تعجب خیز تغیر کو اہل یورپ نے بھی ، جو اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں ، سحر کے اثر سے تشبیہ دی ہے ۔ پھر کیا تعجب جو وحشی اسے سچ مچ سحر ہی کا کرشمہ سمجھتا ہو ۔ چنانچہ عین اسی زمانے میں جب بہار کی آمد آمد ہو ، اس علاقے کے دیسی صریحاً ان پودوں اور جانوروں کی افزائش کے لیے سحری رسمیں ادا کیا کرتے ہیں جو ان کی خوراک ہیں ۔ لہذا یہ رسمیں نہ صرف اپنے موسم بلکہ غایت کے لحاظ سے بھی ہمارے یورپی کسانوں کے رسم و رواج سے قریبی مشابہت رکھتی ہیں ، اس لیے کہ بلاشبہ ان رسموں کی تہہ میں جو ہمارے غیر مہذب اسلاف نے موسم بہار میں نباتات کے احیاء کے عمل کو تقویت پہنچانے کی غرض سے اختراع کی تھیں ، کچھ گل ہائے نو بہار کو سونگھنے یا توڑنے یا ہوا کے جھونکوں میں نرگس مستانہ کا رقص دیکھنے کا جذبہ کارفرما نہ تھا بلکہ اس میں ان کے پیش نظر یہ ٹھوس اور عملی حقیقت تھی کہ انسان کی زندگی نباتات

کی زندگی پر موقوف ہے اور اگر نباتات فنا ہو جائیں تو انسان کا بھی سلسلۂ حیات منقطع ہو جائے۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے کوئی کلیہ مرتب نہیں کیا تھا۔ اور چوں کہ آسٹریلوی وحشی کے اپنی سحری رسموں کے مؤثر ہونے پر اعتقاد کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ اس عمل، یعنی حیوانات اور نباتات کی افزائش شروع ہونے سے پہلے ادا کی جاتی ہیں، جو ان جادو ٹونوں سے مقصود ہے، لہٰذا اگلے وقتوں کے فرنگی وحشیوں کے اعتقاد کے بارے میں بھی یہی کچھ فرض کیا جا سکتا ہے۔ بن میں ہری بھری جھاڑیوں کی تازگی، کائی کے فرش پر لب جو چٹکتی ہوئی کلیوں کا جوبن، دکن سے آنے والی ابابیلوں کی ٹکڑیوں اور آسمان پر آفتاب کے روز افزوں بلند ہونے کو وہ اس بات کی نمایاں دلیل سمجھ کر خوش ہوتے کہ ان کے جادو منتر واقعی اپنا اثر دکھانے لگے ہیں اور ان نظاروں سے ان میں یہ اعتماد پیدا ہو جاتا ہے کہ جس عالم کو وہ یوں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتے ہوں، اس میں کوئی خرابی نہیں۔ صرف خزاں میں جب گرمی کا شباب آہستہ آہستہ ڈھلنے لگتا اور انحطاط کے آثار نمودار ہو کر یہ ظاہر کر دیتے کہ ان کی وہ ساری تدبیریں کس قدر لاحاصل تھیں جو انہوں نے جاڑے اور موت کے سدباب کے لیے اختیار کی تھیں تو ان کے اس اعتماد کو شکوک اور خدشات متزلزل کر دیتے۔

# اشاریہ

مرتبہ : گوہر نوشاہی

## شخصیات


ا

آریسٹیز ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۹ ، ۲۱ ، ۳۳۴ ، ۵۹۳ -

آسٹریپیسیا ڈیز ۱۴۸ -

آکیشیا ۲۲ -

آگسٹائن ، سینٹ ۳۳۶ -

آگسٹس ۱۰۰ -

آلکمینا ۳۹ ، ۴۷۹ -

آئی سس ۵۱۵ ، ۵۱۶ ، ۵۱۷ ، ۵۱۸ -

اپوسم ۱۹۳ -

اپولو ۱۹۳ ، ۱۹۴ ، ۲۴۵ ، ۵۲۵ -

اپوڈی ریڈیوٹیز ۱۱۲ -

اپولیر ۳۸ -

اتوا ۱۹۲ -

اتھاماس ۵۷۱ -

اتوا ۱۹۲ -

اتیس ۱۵ ، ۱۸ -

اوکا نیکا ۵۳۷ -

ارتمیس ۱۷ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۳ ، ۲۴ ، ۲۵ ، ۲۴۵ -

ارساسی ۲۱۳ -

ارسٹافینز ۱۴۸ -

ارکتھو نیس ۱۸ -

ارگانیس ۵۲۷ -

ارسطو ۳۰۸ -

اروشام ۴۴ -

اروا ۲۰۱ -

اروھیا ۹۴ -

اریس ۵۷۲ -

اژدرا ۱۵ -

اساطیری وربیس ۲۵ -

اسپیک جان ھننگ ۳۹۴ -

اشوری ۵ -

افا ۵۰۹ -

افرو دیتی ۱۷ ، ۲۲ ، ۱۹۸ -

افلاطون ۵۷۴ -

اکیتو مینوے ۶۰۲ -

ال بی جن سیس ۲۰۷ -
الزبتھ ۱۸۳ -
السپیس ۵۹۴ -
القمر ۱۳۴
امریکہ چیروکی ۶۸ -
امیتھٹ ۴۶ -
امین پاشا ۳۹۶ -
اناکلو ۵۳۶ -
انٹی گونس ۱۹۷ -
اندمین ۱۳ ، ۱۵ ، ۱۷ -
انسر کار ۱۹۸ -
انطونیو ۱۳ -
انکا ۲۰۰ -
انگوئے ۵۴۵ -
انہوری ۵۲۵ -
اوجیل ۵۵۴ -
اوڈن ۵۷۱ ، ۵۴۹ -
اومائی رس ۱۱۱ -
اولڈن برگ ۱۳۱ ، ۱۳۵ -
اولڈ فیلڈ ۵۰۰ ، ۵۰۶ -
اوما یوسی ۵۱۱ -
اووڈ ۱۵ -
اویالو ۱۶۸ -
اویو کے الافین ۵۸۲ -
آئینو ۵۷۱ -
ایبز ۳۰۶ -
ایجیریا ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۸ ، ۳۰۹ -
ایڈورڈ سوم ۱۹۴ -
ایڈونس ۱۸ ، ۲۲ ، ۲۴ ، ۲۵ -
اے ایس گاڈ شیٹ ۵۰۷ -
ایستھونی ۳۱۲ -
ایسپیس ۱۷ ، ۳۸۲
ایمپیڈ وکلیس ۱۹۶ -
ایمفیٹیون ۳۱۴ -
این ۱۸۴ -
اینڈ و کالونی ۴۰۸ -
اینکس مارشیس ۳۲۱ -
ای وائلڈ ۲۳۱ -
اونتشا ۴۰۲ -

## ب

بابلی ۵۲۵ -
باخوس ۱۹۳ -
بادون ساچین ۲۰۲ -
بدھ ۱۵۹ ، ۲۰۲ ، ۲۰۹ ، ۴۷۰ -
براؤن ۱۷۳ -
بروک ۱۸۱ ، ۱۸۲ -
برہما ۱۱۱ -
بھسکرانند جی ۲۰۴ -
بطلمیوس روم ۵۲۷ -
بعلی اوتار ۱۳۸ -
بک نیم ھڈ ۳۵۳ -
بینن ۲۰۲ -
بھان متی ۱۲۴ -

بیرن الیگزنڈر ہوم بوئٹ ۲۱۲ -
بیرن مک لوکو میک لے ۳۹۷ -

پ

پاروتی ۶۲۸ -
پانڈا ۵۱۱ -
پائی تھان ۵۲۵ -
پالوم ۶۲ -
پائی تھا گورس ۹۷ ، ۹۸ ، ۳۸۵ ، ۵۲۵ -
پراسپرین ۲۲ ، ۱۹۸ -
پرائی ایپس ۶۲۵ -
برٹ شائر ۴۸۰ -
پرکناس ۳۲۷ -
پرجینا ۱۴۱ -
پروشیا ۵۶۸ -
پیفننگ ۵۸۶ -
پاوٹارک ۱۵ ، ۴۲ ، ۲۲۷ ، ۳۲۱ -
پلوٹو ۲۲ -
پلینی ۲۳ ، ۴۷۹ ، ۴۸۲ -
پوجان ۲۵۹ -
پورپا ۵۵۳ -
پوسائی دان ۱۷ ، ۲۲ ، ۱۹۸ ، ۴۸۵ -
پیٹرک ۱۸۳ -
پیرن ۳۲۶ -
پیلویس ۳۱۷ -

ت

تاتیس ۲۱۰ -
تارکوئین اکبر ۳۱۰ -
تالوس ۵۵۳ -
ترتولین ۲۰۶ -
تلس ہوستی لیس ۳۲۱ -
تیتیس ۳۲۱ -

تھ

تھاٹرے ۶۰۱ -
تھاکو مباؤ ۴۰۷ -
تھاؤز ۱۲ -
تھریسی ۵۱۵ -
تھیبس ۵۲۵ -
تھیسیوس ۱۷ -
تھیوڈیشیں اول ۴۳ -
تھیو فریسٹس ۳۰۵ -
تھیوکرٹیس ۹۵ -

ٹ

ٹاپو ۳۱۲ -
ٹائنگ ٹسانگ ٹائی اونگ ۳۴۹ -
ٹرنر ۹ -
ٹرنگ ۳۵۷ -
ٹسکولمی ایمپیریس لے ویس ۲۰ -
ٹوڈ ۱۵۱ -
ٹوئی ٹونگا ۳۱۵ -
ٹیلو ۱۳۹ -
ٹینیس ۱۵۷ -

## ج

جارج سوم ۱۰۱ -
جارج برگ ۵۴۸ -
جان پارکنسن ۵۵۴ -
جبریل ۴۸۲ -
جس کالیوی ۲۲۵ -
جسٹن ۳۹۳ -
جوترنا ۳۳۵ -
جولیس سیزر ۱۰۰ ، ۲۲۴ -
جولین ۲۲۴ -
جوئو ۳۰۶ ، ۳۳۵ -
جے ۲۱ -
جیروم ۲۴۱ -
جینا ۲۳۹ ، ۳۳۵ ، ۳۳۷ -
جینس ۳۳۵ ، ۳۳۷ ، ۳۳۹ -
جیمس میکڈانڈ ۴۶ ، ۱۸۴ -
جیوپیٹر ۱۷ ، ۳۰۵ ، ۳۰۶ ، ۳۰۹ ، ۳۱۸ ، ۳۲۰ ، ۳۲۳ ، ۳۲۵ ، ۳۳۳ ، ۳۳۷ ، ۳۳۹ ، ۳۵۳ -
جیوڈ ۵۷۷ -

## چ

چارلس اول ۱۸۳ -
چارلس دوم ۱۸۳ -
چاکا ۱۷۶ ، ۵۳۷ -
چائلڈبرٹ ۴۶۲ -
چوکٹا ۴۳۲ -
چٹیومبے ۳۴۵ ، ۳۴۶ ، ۳۴۷ -
چیلوٹ ۴۷۳ -

## ح

حورس درخشاں ۲۱۲ -

## د

داھومی ۳۴۹ ، ۳۵۰ ، ۴۰۱ -
دارفور ۴۱۲ -
دائنا ۳ ، ۶ ، ۹ ، ۱۰ ، ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۴ ، ۲۵ ، ۲۷ ، ۳۲۹ ، ۳۰۹ ، ۳۳۲ ، ۳۳۴ ، ۳۳۵ ، ۳۳۷ ، ۳۳۹ -
دلائی لاما ۲۱۰ ، ۳۸۳ -
دیزگان اقاس ۵۶۳ -

## ڈ

ڈافٹیس ۴۸۳ -
ڈرگ ۵۳۲ -
ڈانائی سس ۵۲۵ -
ڈائنس ۳۲۹ ، ۳۳۵ -
ڈائیس جووس ۳۲۶ -
ڈریون ۳۰۷ -
ڈایونائی ۳۰۷ ، ۳۳۵ ، ۵۷۴ -

ڈزائی دانا ۶۱۲ -
ڈوبریزهامز ۵۰۶ -
ڈونار یا تھونار ۲۲۶ -
ڈی باروس ۵۴۷ -
ڈیڈمیس ۵۵۲ -
ڈی روئیپ اسٹراف ۵۰۷ -
ڈیسہوئنا ۴۸۵ -
ڈیمیٹر ۲۲ ، ۱۹۸ -
ڈیمیٹریس ۱۹۸ -
ڈیمیٹریس پولیرسٹیر ۱۹۷ -
ڈینی رک والڈیمر ۱۸۳ -

ر

رشید دوم ۵۴۴ -
رع ۲۱۳ ، ۵۱۵ ، ۵۱۶ ، ۵۱۷ -
رملس ۲۲۷ ، ۳۲۰ -
رومی خورم ۳۳۲ -
روهنی ۱۴۵ -
رهائن ۲۲۴ -
ریکولڈ ۴۵۷ -
ریجبل ۸۳ -
زاپوٹیک ۳۴۶ -
زائی سس ۵۷۴ -
زرکیسز ۵۷۱ ، ۵۷۳ -
زینوفینز ۵۱۵ -
زیوس ۱۷ ، ۲۲ ، ۲۸ ، ۳۹ ، ۱۴۸ ، ۱۵۹ ، ۱۶۰ ، ۱۹۲ ، ۳۰۷ ، ۳۲۴ ، ۳۲۴ ، ۳۲۵ ، ۳۴۵ ، ۵۲۵ ، ۵۵۳ ، ۵۷۱ ، ۵۷۳ ، ۵۷۵ ، ۵۷۶ -

## س

ساٹرن ۱۲ -
سالمونین ۱۶۰ ، ۳۳۴ ، ۵۷۶ -
سارگن اول ۲۱۲ -
سامورین ۵۴۳ -
سائرینیلیا ۳۰۳ -
سائی ٹورس ۵۷۳ -
سبیلی ۱۲ ، ۱۵ ، ۱۸ ، ۲۵ -
سرٹیس ۵۷۳ -
سرولیم میک گریگر ۱۷۲ -
سرولیس تلیس ۱۸ ، ۲۴ ، ۳۱۰ ، ۳۱۲ -
سنگارمتی ۴۳۷ -
سوپاتر ۱۶۶ -
سوٹر ۱۹۸ -
سی ، جی ، سیلگمن ۲۱۹ ، ۲۲۸ -
سیچ ویو ۵۱۱ -
سے فی سس ۳۸۸ -
سیکروپس ۳۱۴ -
سیکسو گراماٹیکس ۳۱۶ -
سینٹ انجلو ۱۵۵ -
سینٹ پال ۱۵۸ -
سینٹ پیٹر ۱۵۸ -
سینٹ جارج ۲۴۴ -

سینٹ جیمس ۱۰۸ ، ۱۰۹ -
سینٹ ژرویس ۱۵۸ -
سینٹ ژین ۱۵۸ -
سینٹ سیکیر ۱۱۵ -
سینٹ فرانسس آف پالو ۱۵۴ -
سینٹ فرانسس آف اسیزی ۱۱۴ -
سینٹ کولمبیا ۲۰۷ -
سینٹ لوئی ۱۸۴ -

ش

شامن ۱۸۰ ، ۳۳۹ -
شیوا ۱۱۱ ، ۶۲۸ -

ع

عباس اعظم ۵۶۹ -
عیسیٰ ۲۰۷ -

غ

غوک زہردار ۱۰۵ ، ۱۵۱ -

ف

فارچونا ۳۱۲ -
فاؤنس ۴۸۵ -
فرعون ۳۵۲ -
فریزر ۷ -
فرنانڈوپو ۳۴۹ -
فرناؤ پیرلیس ۵۴۸ -
فریکیسس ۵۷۱ ، ۵۷۳ ، ۵۷۵ -
فلارس ۵۵۴ -
فلیمن ڈیالس ۳۰۷ ، ۴۵۵ ، ۴۷۰ ، ۴۷۵ ، ۴۷۶ ، ۴۸۶ -
فلمینیکا ۳۰۷ -
فیڈرا ۱۷ ، ۲۲ -

ک

کارا مانتران ۶۰۰ -
کارتھیج کے مولک ۲۰۶ ، ۵۵۳ -
کارینول ۶۱۹ -
کارڈ مانگ ۲۱۴ -
کالو ۲۰۱ -
کالی ۱۹۳ -
کالی جولا ۱۳ -
کامید تیور جی یونی ۳۳۲ -
کالمبا ۳۹۹ -
کائی کوتیا ۵۳۲ -
کٹاٹ ۳۹۰ -
کرشن ۲۰۶ -
کرونس ۵۷۶ -
کٹر کے ۳۲۴ -
کوچی ۱۷۰ -
کوتومو ۵۲۵ -
کورو ۱۹۳ -
کوکولو ۳۴۴ -
کلوٹیر ۴۶۴ -
کلوری ۱۴۸ -
کلوڑومیر ۴۶۴ -

کولمبس ۶۴ -
کیٹ لین ۱۷۹ -
کیتوئے اکبر ۱۹ ، ۲۰
کیران ۱۶ -

گ

گاتینوا ۳۶۱ -
گانیشیائی سینٹ ۳۲۶ -
گریٹ آرڈرا ۳۵۰ -
گیرم ۲۲۶ -
گن ۵۴۸ -
گن تتی ۲۰۵ -
گنگاؤں ۴۷۵ -
گنیش ۲۰۵ -

ل

لاریوپ ۳۸۸ -
لاق تاؤ ۵۰۸ -
بعید بن الاعصم ۱۸۴ -
لرکس ۵۷۲ ، ۵۷۳ -
لنگ وانگ ۵۳ -
لوسی نا ۴۷ -
لوشین ۵۱۴ -
لوگن ۵۴۵ -
لوانگا ۲۰۱ -
لوئی یاز دھم ۶۰۲ -
لیوسی پے ۵۷۵ -

م

مارسی لس ۴۳ -
مارکوپولو ۴۵۷ -
مافٹ ۱۷۶ -
ماک ۲۵۷ -
مان ھارٹ ۶۲۰ ، ۶۲۴ -
مبتلائی خان ۴۵۶ -
مردوک ۵۵۴ -
مرلن ۱۵۷ -
مرمراؤں ۱۳۵ ، ۱۳۶ -
مرواو برائن ۴۵۸ -
مریخ ۱۶۰ -
مس کنگسلے ۳۰۸ -
مقریزی ۱۳۴ -
منروا ۱۸ -
موا آب شا ۵۷۷ -
مورا باگو سائیں ۲۰۵ -
موض ۱۵ -
مونتزیما ۲۱۲ -
مہا دیو ۱۶۳ -
مولس ۳۱۰ -
مٹیسیک ۶۱۹ ، ۶۲۰ -
میرنرا ۲۱۳ -
میسپرو ۱۱۳ -
میکاہ ۱۰۹ -
میکاڈو ۴۲۳ -
میکائیل ۱۵۴ -
میلوٹین ۲۴۸ -
مینی رس ایجیریس ۲۰ -
مینی ڈیمس ۴۴۹ -

## ن

نام ولو رمو ۲۱۸ -
نایان ۴۵۶ -
نکل سین ۲۰۴ -
نو ما ۱۵ ، ۳۰۳ ، ۳۲۱ -
نیا کانگ ۵۲۸ ، ۵۳۲ -
نیفلے ۵۷۱ -
نیمی ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۵ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۴ ، ۲۵ ، ۲۶ ، ۲۷ ، ۲۱۷ ، ۳۲۰ ، ۳۲۹ ، ۳۳۳ ، ۳۳۴ ، ۳۳۹ -

## و

وادائی ۴۰۲ -
وارو ۳۳۵ -
واگانڈا ۴۳۳ -
والیریس سورانس ۵۱۸ -
وتوتا ۳۹۶ -
وربیس ۹ ، ۱۸ ، ۲۱ ، ۲۴ ، ۳۳۲ -
ورجل ۲۷ ، ۳۳۳ -
وریس ۱۶ ، ۵۹۴ -
وستا ۱۴ ، ۱۶ ، ۳۳۷ -
وشنو ۱۱۱ -
وکٹوریہ ۳۸۵ ، ۲۰۴ -
ولیم سوم ۱۸۴ -
ون فروبونی فیس ۳۲۶ -
وینس ۱۸ ، ۲۴ ، ۲۵ -

## ہ

ہاپ شاہ ۵۶۱ -
ہارٹ ۹۶ -
ہائم اسکرنگلا ۳۱۵ -
ہائی سٹی آئی بب ۵۲۴ -
ہپو ڈیمیا ۳۱۷ -
ہرکولیز ۳۹ ، ۴۷۹ -
ہرمٹ روڑ ۳۱۶ -
ہرموٹس کلے زومنے ۳۷۴ -
ہروکوپیس ۳۲۷ -
ہاسیا ۵۵۷ -
ہنٹن ۲۳۰ -
ہنری دوم ۲۲۵ -
ہومر ۱۸۲ ، ۳۰۶ -
ہیپولٹیس ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۳ ، ۲۴ ، ۵۹۴ -
ہیرا ۲۲ ، ۳۹ ، ۳۰۷ ، ۳۳۳ -
ہیرلڈ ۳۱۵ -
ہیفیس ٹس ۵۵۳ -
ہیلے ۵۷۱ ، ۵۷۵ -
ہیلیو پوس ۵۲۵ -

## ے

یاربلیو ۶۲۵ ، ۶۲۶ ، ۶۲۹ -
یان ۲۲۱ -
یحیٰ ۱۴۵ -

یوحنا ۲۴۹ ، ۳۱۳ ، ۶۲۴ -
یوری تومو ۳۵۷ -
یولئیس ۳۸۵ ، ۳۹۵ -
یولیسیز ۱۶۸ ، ۳۰۶ -

# مقامات

آتھ گالٹا ۳۱۵ -
آتھ میگھنے ۳۱۵ -
آٹ وا ۴۲۸ -
آرڈن بن ۲۲۵ -
آرڈیا ۱۹ -
آرڈین ۶۰۰ -
آرکونیس ۵۷۴ ، ۵۷۵ -
آرکڈیا ۱۵۹ ، ۳۲۳ ، ۴۸۵ -
آرگس ۱۹۲ -
آرگل شائر ۴۷۸ -
آسام ۱۵۰ ، ۴۲۴ ، ۴۹۴ -
آسٹریا ۲۳۱ ، ۶۲۲ ، ۶۲۶ -
آسٹریائی سی یشیا ۶۱۱ ، ۶۱۷ ، ۶۱۸ -
آسٹریلیا ۳۶، ۴۴ ، ۹۳ ، ۹۶ ، ۹۸ ، ۱۱۷ ، ۱۱۸ ، ۱۳۲ ، ۱۵۶ ، ۱۵۷ ، ۱۷۱ ، ۱۷۲ ، ۲۱۵ ، ۳۶۵ ، ۳۹۷ ، ۴۰۴ ، ۴۶۷ ، ۴۸۸ ، ۴۹۴ ، ۵۰۰ ، ۵۰۱ ، ۵۰۳ ، ۵۰۴ -
آش ۱۱۵ -
آکیا ۱۹۳ -
آگو ۳۴۵ -
آنگ ٹانگ ۳۹۶ -
آئرستان ۱۸۲ ، ۱۸۳ ، ۳۳۷ ، ۳۵۱ ، ۴۵۸ ، ۵۴۰ -
آئر لینڈ ۱۱۹ -
آئی ٹومانا ۳۶۵ -
آئی زی ناک ۶۱۳ -
اباوان ۵۸۲ -
ایجیریا ۲۵ ، ۱۹۳ -
ابنائے ٹوریس ۴۵ -
ابیو کوٹا ۵۸۲ -
ابیس ۵۷۵ -
اپسالا ۲۲۶ -
اتاوہ ۱۷۸ -
اٹریا ۳۰۵ -
اٹروریا ۲۲۵ -
اٹلی ۹ ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۸ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۶ ، ۲۷ ، ۵۰ ، ۲۱۷ ، ۲۲۳ ، ۳۲۳ ، ۳۳۴ ، ۴۸۰ ، ۶۲۵ -
ار ۲۱۲ -
ارٹسگ برگے ۵۸۸ -
ارلنگن ۶۰۵ -
اری زونا ۱۵۷ ، ۴۲۳ -
اریشیا ۳ ، ۵ ، ۶ ، ۱۰ ، ۱۲ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱۸ -

اڑیساہ ۲۰۴ -
از جبلی ۵۵۴ -
اسپاڑیا ۲۸ ، ۱۶۳ ، ۴۴۸ ، ۵۳۹ -
اسپیکن ڈراف ۶۱۷ -
اسٹیفنڈ ۷۹ ، ۱۳۵ -
اسکاچستان ۱۶۶ ، ۳۹۱ -
اسکنڈے نیویا ۳۱۳ ، ۵۴۹ -
اسکاٹ لینڈ ۳۶ ، ۴۶ ، ۱۱۸ ، ۱۱۹ ، ۳۱۶ ، ۴۵۱ ، ۴۶۸ -
اشانتی ۳۵۹ -
افغانستان ۳۹۶ -
افریقہ ۶ ، ۲۹ ، ۳۶ ، ۳۹ ، ۵۵ ، ۶۲ ، ۷۱ ، ۷۴ ، ۹۸ ، ۱۳۲ ، ۱۴۶ ، ۱۵۷ ، ۱۶۸ ، ۱۷۰ ، ۳۴۴ ، ۳۴۶ ، ۳۷۹ ، ۳۹۶ ، ۳۹۸ ، ۴۰۱ ، ۴۱۸ ، ۴۱۹ ، ۴۲۴ ، ۴۲۸ ، ۴۲۹ ، ۴۳۰ ، ۴۳۱ ، ۴۴۰ ، ۴۴۴ ، ۴۴۵ ، ۴۴۶ ، ۴۵۰ ، ۴۵۷ ، ۴۵۸ ، ۴۶۸ ، ۴۷۱ ، ۴۷۲ ، ۴۷۳ ، ۴۷۴ ، ۴۷۷ ، ۴۸۰ ، ۴۸۱ ، ۴۹۲ ، ۴۹۳ ، ۵۰۲ ، ۵۲۸ ، ۵۷۹ -
اگری جنٹم ۱۹۷ -
اگ لولیک ۱۶۴ -
الاسکا ۵۵ ، ۱۶۹ ، ۴۱۸ ، ۴۴۲ -
الائن ۴۶ -
البا ۹ ، ۱۰ ، ۳۰۵ ، ۳۰۶ ، ۳۳۳ -
البانیہ ۷۶ -
البرٹ ۱۷۵ -
البن ۳۰۵ -
الپ ۳۰۶ -
الجی ڈس ۳۰۵ ، ۳۳۴ -
السی ٹر ۳۵۱ -
الفور ۴۹۴ -
الفیوس ۲۲۵ -
المپونیا ۳۸۵ -
امبوئنا ۲۳۵ -
امریکہ ۳۶ ، ۵۲ ، ۱۶۹ ، ۱۸۰ ، ۲۱۲ ، ۳۶۵ ، ۳۶۷ ، ۳۷۶ ، ۳۸۵ ، ۴۱۸ ، ۴۲۳ ، ۴۲۵ ، ۴۳۱ ، ۴۳۲ ، ۴۵۶ ، ۴۷۳ ، ۴۸۷ ، ۵۰۳ ، ۵۰۴ ، ۵۰۸ ، ۶۲۳ -
انابیس ۱۹۶ -
انام ۴۴۵ -
انگلستان ۲۴۴ ، ۲۵۱ ، ۳۰۸ ، ۳۹۸ ، ۴۸۴ -
انگولا ۴۰۹ ، ۵۳۶ -
اوڈو ۳۳۹ -
اورے گون ۳۷۷ -
اورے گونیا ۵۰۷ -
اوری ویرا ۴۷۳ -
اوجریا ۳۲۲ -

اورینوکو ۶۴ ، ۶۶ ، ۱۴۸ ، ۱۵۱ -
اوسوکو ۱۷۷ -
اوگی ۴۷۰ -
اولمپیا ۳۲۲ ، ۳۲۴ -
اویا ۳۷۵ -
ایبنگڈن ۲۴۷ -
ایبنی نائن ۳۳۴ -
ایپی ڈارس ۲۳ -
ایپی نائیز ۳۰۶ -
ایتھنز ۲۷ ، ۲۸ ، ۱۹۷ ، ۱۹۸ ، ۲۱۷ ، ۲۱۸ ، ۳۰۷ ، ۳۰۸ ، ۳۲۴ -
ایجیریا ۱۹۳ ، ۳۰۸ -
ایڈا ۵۵۲ -
ایڈ لینڈ ۵۰۳ -
ایستھونیا ۴۵۱ ، ۴۵۷ ، ۶۰۴ ، ۶۱۹ ، ۱۶۶ ، ۱۶۷ -
ایسٹ کیپ ۵۱۳ -
ایشیا ۱۳ ، ۲۸ ، ۱۵۷ -
ایشیائے کوچک ۳۲۵ -
ایگ ٹی ٹس ۶۱۵ -
ایگ ھو ۱۳۷ -
ایلی پانرس تولیدوی ۲۰۷ -
ایلی پس ۲۲۷ -
ایمبونیا ۳۹۵ -
اینی آس ۱۳ ، ۱۸ ، ۲۷ -
این کاؤنٹر ۵۰۳ ، ۵۰۵ -
ایو ۵۴۰ -

## ب

بابل ۵ ، ۳۶ ، ۱۰۳ -
باتکی ۱۶۹ -
بارا ۳۹۰ -
بارام ۳۶۴ -
بارٹنک ۶۰ -
بارٹن ۱۵۷ -
باس ۸۹ -
باسوگا ۲۳۲ -
برازیل ۱۸۰ ، ۳۶۷ ، ۴۱۲ -
بریینا ۴۳ -
برٹین ۷۸ ، ۱۵۸ -
برما ۳۷۱ ، ۴۳۹ ، ۴۵۳ ، ۴۵۵ ، ۴۵۷ ، ۵۱۰ -
برنزوک ۶۲۲ -
برطانیہ ۲۲۴ -
بسمارک ۴۹۲ ، ۴۹۴ -
بک نیم ھڈ ۳۵۲ -
بلاسپور ۵۶۶ -
بمبئی ۲۰۶ ، ۳۷۰ ، ۴۷۸ -
بوووژ ۴۸۰ -
بوڈیا ۳۵۴ -
بورو ۴۹۷ -
بورنیو ۳۸ ، ۵۱ ، ۳۶۴ ، ۳۶۵ ، ۳۶۷ ، ۴۹۴ ، ۵۰۰ ، ۵۰۲ -
بوما ۲۱۸ -

بویریا ۶۶ ، ۹۳ ، ۳۷۹ ، ۵۸۶ ، ۶۲۲ -
بوھیمیا ۲۵۶ ، ۵۸۸ ، ۵۹۰ ، ۵۹ ، ۵۹۶ ، ۶۰۸ ، ۶۱۰ -
بوینمائی ۵۲۴ -
بیت‌المقدس ۴۵۰ -
بیرنگ ۴۴۱ -
بینک ۳۸۲ ، ۴۹۹ -
بینو ۵۳۵ -
بینکورو ۴ ، ۵۳۴ -
بیوشیا ۳۲۳ -

پ

پاٹے گونیا ۴۷۲ ، ۵۰۱ -
پارا گوئے ۵۰۶ -
پارینس ۳۲۴ -
پاسو ۴۹۴ -
پاسیر ۵۴۷ -
پالاٹینیٹ ۷۲۲ -
پروشیا ۳۱۶ ، ۳۵۴ ، ۵۴۱ -
پرو دانس ۶۰۰ -
پلس ۵۹۰ -
پلاٹے ۴۴۹ -
ھلپینی ۴۲ -
پلی ھائی ۳۹۵ -
پنجاب ۳۹۴ -
پنیزا ۶۲۴ -
پوستان ۴۵۱ -
پولکوٹس ۶۰۸ -
پونٹس ۴۰۳ -
پولیشیا ۴۶۰ -
پولینیشیا ۴۱۳ ، ۱۹۱ -
پیرس ۴۶۴ -
پی ، نیو ۴۳۱ ، ۴۵۵ -
پیرو ۱۶۰ ، ۱۶۴ ، ۱۷۹ ، ۲۱۱ ، ۲۱۴
پاینکے ۲۹ -

ت

تاھتی ۴۱۸ ، ۴۶۲ -
تبت ۲۱۰ ، ۲۱۱ ، ۲۱۲ -
ترنوائی ۵۴۵ -
تفاتا ۳۳۴ -
تمبے ویر ۲۱۹ -
تولوز ۲۰۷ -
تھرموپیلے ۵۷۱ -
تھورینگی ۵۸۷ - ۵۹۳ -
تھسیلی ۱۶ ، ۱۲۴ ، ۵۷۱ ، ۱۹۴ ، ۱۵۹ -

ٹ

ٹانٹن ۴۸۴ -
ٹانکنین ۳۵۷ -
ٹانگا ۳۷۰ -
ٹائی بر ۱۶ ، ۱۹ ، ۳۱۲ -

ٹائی کونوں ۳۵۷ -
ٹرانسلوینیا ۱۴۷ ، ۳۶۸ ، ۴۵۴ ، ۴۷۶ ، ۴۷۸ ، ۶۰۳ ، ۶۳۱ -
ٹروئے زن ۲۳ ، ۲۲ ، ۲۱ -
ٹروپاؤ ۶۱ -
ٹمیل ۳۸۰ -
ٹوآتھلیگھن ۳۵۱ -
ٹوبنگن ۶۰۳ -
ٹوریس ۴۹۸ -
ٹونگا ۱۸۴ ، ۳۵۸ ، ۴۰۹ ، ۴۶۲ -
ٹویر ۴۸۴ -
ٹوگو ۳۴۵ -
ٹے ۳۸۰ -
ٹی رل ۴۶۸ -
ٹیورک ۳۶۴ -
ٹیمور ۱۵۰ ، ۳۵۹ ، ۴۲۵ -
ٹرائے ۱۳ ، ۱۸ -
ٹسکولم ۱۹ -

## ج

جاپان ۱۰۳ ، ۱۵۱ ، ۱۶۰ ، ۲۱۲ ، ۳۴۶ ، ۳۵۷ ، ۵۰۲ -
جارجیا ۱۴۷ -
جاوا ۳۶۷ ، ۶۵ ، ۱۹۴ ، ۳۹۵ ، ۴۶۱ -
جاسن نیٹس ۶۰۹ -
جرمنی ۲۵۱ ، ۲۵۳ ، ۴۶۸ ، ۵۸۸ ، ۶۲۶ -
جوالامکھ ۳۴۸ -
جینوا ۳۳۷ -
جیوپیٹرلی بر ۴۵۰ -
جینی کوئم ۳۳۶ -
جنگ اشانتی ۶۲ -

## چ

چٹاگانگ ۴۷۸ -
چین ۲۸ ، ۲۱۰ ، ۱۶۷ ، ۳۷۱ ، ۳۸۳ -
چینچواد ۲۰۴ ، ۲۰۵ -

## ح

حالا بار ۵۴۳ -
حبشہ ۲۱۹ ، ۳۵۲ ، ۵۵۶ -

## خ

خزر ۴ -

## د

دریائے پو ۲۲۵ -
دوزیلا ۲۸ -

## ڈ

ڈالمیشیا ۲۲۹ -
ڈبلن ۳۵۱ -
ڈروڈون ۳۲۵ -

ڈلین ۱۵۸ -
ڈوپش و ٹس ۶۰۶ -
ڈوتھیر ۳۵۱ -
ڈوڈر ۳۵۱ -
ڈوریو ۲۳۲ -
ڈیرے مک ڈیرے ۳۵۲ -
ڈیلفائی ۵۲۵ ، ۵۵۰ -
ڈینارک ۷۴ ، ۹۷ -
ڈارلنگ ۸۴ -

ر

راٹی ۳۵۹ -
راکی ۵۰۳ -
ربابا ۳۴۹ -
روس ۴ ، ۱۴۷ ، ۱۶۰ ،
۴۸۳ ، ۴۸۴ ، ۶۲۵ ، ۶۲۶ -
روکوی ۳۵۰ -
روم ۱۱ ، ۱۳ ، ۱۵ ، ۱۶ ،
۲۷ ، ۲۸ ، ۶۳ ، ۱۰۳ ، ۱۶۰
۲۱۷ ، ۲۱۸ ، ۲۲۴ ، ۲۲۵ ،
۳۰۵ ، ۳۰۸ ، ۳۲۱ ، ۳۵۳ ،
۳۹۳ ، ۴۵۰ ، ۵۱۸ ، ۵۳۲ ،
۵۹۴ ، ۵۹۶ -
رونوک ۵۰۴ -
رھائن ۶۲۱ -
رھوڈز ۱۶۳ -
ری - اے ۴۶ -

ز

زاپوٹیکوں ۳۴۶ -
زینگ ۴۵۳ -

س

ساراوک ۴۰ ، ۱۸۱ -
ساڈل ۲۸۸ -
ساسمینیا ۵۰۲ -
ساکھالین ۵۰ ، ۴۷۸ -
سالسٹہ ۴۷۸ -
سالمن ۵۱۴ -
سائبیریا ۵۰۲ -
سائٹن ڈراف ۶۰۹ -
ساؤتھ ویلز ۳۸۵ -
سائی زیک ۴۵۰ -
سپارویا ۴۶ -
سپی ریز ۳۳۹ -
سٹینے ڈوس ۵۷۳ -
سرے ۲۲۴ -
سفید نیل ۵۲۸ ، ۵۸۲ -
سلووینیا ۲۳۳ ، ۲۳۴ -
سلیبیز ۴۵ ، ۵۱ ، ۷۴ ،
۱۴۶ ، ۱۸۱ ، ۱۹۳ ، ۳۶۴ ،
۳۶۶ ، ۳۷۷ ، ۴۲۶ ، ۴۷۶ ،
۴۸۸ ، ۴۹۴ ، ۴۹۷ ، ۵۸۱ -
سلیمان جزائر ۴۷۰ -
سلیوکوسٹ ۴۵۳ ، ۴۷۴ -
سمبرسک ۶۲۴ -
سمرقند ۳۷ ، ۵۶۳ -
سموا ۴۱۵ -

سمیک ۵۸۹ -
سن تانگ ۳۶۷ -
سنڈا ۴۹۸ -
سوازستان ۴۸۳ -
سوری نام ۳۳۸ -
سوسیبیا ۲۵۲ ، ۴۷۰ ، ۶۰۴ -
سوماٹرا ۱۵ ، ۳۷ ، ۵۱ ، ۶۵ ، ۸۸ ، ۱۶۹ ، ۳۵۷ ، ۳۶۶ ، ۳۷۲ ، ۴۷۸ -
سویڈن ۳۱۴ ، ۳۱۵ ، ۵۴۹ ، ۵۷۱ ، ۶۲۱ -
سیام ۱۵۳ ، ۳۹۰ ، ۴۳۸ ، ۴۵۶ ، ۴۶۰ ، ۵۶۰ ، ۵۷۰ -
سی ایرالیونے ۳۵۳ ، ۳۵۶ -
سیتھیا ۱۷۸ -
سیتھے رن ۳۰۷ -
سینٹ اندریوز ۴۸۴ -
سینٹ سان لو ۶۰۲ -
سینڈوچ ۱۹۱ ، ۴۱۴ -
سیکسن ۲۲۴ ، ۴۵۷ ، ۴۶۸ -
سیکسنی ۲۵۲ ، ۵۸۷ ، ۵۹۳ ، ۶۰۷ -
سی گھیس ۳۵۱ -
سیورا ۳۵۱ -
سیویج ۳۵۶ -
سی لیشیا ۶۱۲ -

## ش

شارپ پائنٹ ۳۴۴ -
شام ۱۶۶ -
شیا ۴۰۳ -
شپ ہوم ۴۳۸ -
شرق الہند ۳۶ ، ۵۱ ، ۳۵۹ ، ۴۷۶ ، ۴۷۷ ، ۴۹۱ -
شلوک ناؤ ۵۸۸ -
شیٹ لینڈ ۱۶۷ -

## ص

صقلیہ ۱۵۳ ، ۱۹۶ -
صوخالا ۵۳۸ -

## ط

طرابلس ۱۷۰ -

## ع

عرب ۱۰۳ ، ۳۸۴ ، ۴۰۳ -

## غ

غرب الہند ۶۴

## ف

فان چوس ۳۵۱
فاشووا ۵۲۹
فجی ۳۷۰ ، ۳۷۸ ، ۴۰۷ ، ۴۰۸ ، ۴۲۸
فتیش ۱۶۸ ، ۳۴۵ ، ۳۵۶
فرانس ۴۲ ، ۱۱۳ ، ۱۱۴ ، ۱۵۸ ،

فرنانڈوپو ۴۷۵ -
فروسینون ۵۹۴ -
فریجیا ۱۵ -
فریزر ۳۶۳ -
فزوقل ۳۹۰ ، ۵۲۸ -
فنستان ۶۶۱ -
فلپائن ۳۶۵ ، ۵۰۲ ، ۵۲۴ -
فلورسین ۳۵۹ -
فینش هیون ۴۹۲ -
فیلن ۱۶۷ -
فینیس ۲۲۵ -

## ق

قاف ۱۳۶ ، ۱۴۷ ، ۵۰۰ ، ۵۱۹ -
قسطنطنیه ۱۶۶ -
قسیس ۱۱۴ -
قطب شمالی ۴۴۲ -

## ک

کاڈیاک ۴۱۸ -
کاربیز ۶۴ -
کارپ ۸۱ -
کارپیتھین ۳۹ ، ۵۰ ، ۳۶۸ ، ۳۸۵ -
کارنتھیا ۵۶۶ -
کارنون ۱۹۳ -
کاس ۲۲۷ -
کالا بار ۵۷۹ -
کالی کٹ ۵۸۵ -
کانگڑا ۵۶۶ ، ۶۲۷ -
کانگو ۲۱۸ ، ۲۴۵ ، ۳۷۲ ، ۴۰۲ ، ۴۹۲ ، ۵۲۶ -
کانسی ۵۲۵ -
کاوی رونڈو ۴۳۱ -
کائی ۵۷ ، ۶۱ -
کبانگا ۵۳۵ -
کچانا ۴۹۴ -
کرواکن ۳۵۱ -
کروڈم ۶۱۰ -
کروینا ۵۷۴ -
کریٹ ۴۴۹ -
کریک ۴۲۳ -
کرے واز ۳۹۵ -
کسوف ۱۶۰ ، ۱۶۱ -
کلاکیر ۵۴۲ -
کلیسا ۳۱۳ -
کمبالوک ۴۵۷ -
کمپیگنا ۳۰۶ -
کمپینیا ۱۸ -
کناٹ ۳۵۱ -
کند رام ۴۵۰ -
کوالان ۳۵۱ -
کوچن چین ۴۴ -
کورا ۱۹ -
کوریا ۲۳۶ ، ۴۴۸ -
کول کس ۵۷۵ -

کولمبیا ۳۸۲ ، ۴۱۵ ، ۴۳۸ ،
۴۹۱ ، ۵۰۱ ، ۵۷۰ -
کوسٹاریکا ۴۱۸ -
کوئنز لینڈ ۸۷ ، ۵۰۳ -
کوئین شارلٹ ۶۴ -
کیپ ٹاؤن ۳۴۴ -
کیلز ۷۸ -
کیرولین ۸۷ ، ۴۳۶ ، ۴۶۴ -
کیلے فورنیا ۱۸۰ ، ۳۶۵ ،
۳۸۷ ، ۵۰۷ ، ۶۳۰ -
کیمبرج ۹۲ -
کیموڈیا ۳۶ ، ۱۹۴ ، ۲۲۰
۲۲۳ ، ۳۴۰ ، ۳۵۶ ، ۳۴۸ ، ۳۶۱ ،
۵۲۶ ، ۵۵۹ -
کینٹ ۲۲۴ -

## گ

گانری ۵۳۵ -
گازیلے ۴۹۹ -
گال ۳۲۵ -
گائسر ۳۲۶ -
گران چاکو ۵۴۹
گران چیکو ۱۶۹ ، ۱۸۰ -
گربالچ ۲۲۹ -
گروس اسڈے لٹز ۶۰۸ -
گرین کوسٹ ۱۷۷ -
گرین لینڈ ۱۱۸ ، ۱۶۶ -
گلاؤن ۲۹ ، ۲۰۱ -
گنی ۳۴۴ -
گولڈ کوسٹ ۲۴۲ -
گوئیپ فرٹس ۶۲۲ -
گھیرا کی کلائی ۵۱۰ -
گیانہ ۳۶۷ -
گیپ لینڈ ۴۹۴ -
گیر ۶۰۶ -
گیس کونی ۱۱۵ -

## ل

لاتوکا ۱۷۵ ، ۱۷۸ -
لاپ لینڈ ۱۶ ، ۴۴۳ -
لاڈن ۲۲۵ -
لارنیٹم ۱۹ -
لاجیم ۱۹ ، ۲۵ ، ۳۰۵ ، ۳۰۹ ،
۳۳۱ ، ۳۳۲ ، ۳۳۳ ، ۵۹۶ -
لالوبا ۱۷۵ -
لانوویم ۱۹ -
لاوینیم ۳۲۱ -
لائبیریا ۱۷۷ -
لاؤس ۵۱ ، ۴۳۸ -
لائی کوشورا ۴۸۵ -
لایلٹی ۳۷۵ -
لروک ۱۶۸ -
لکاتا ۱۵۵ -
لندن ۷ -
لوانگو ۱۷۷ ، ۳۴۹ ، ۳۰۱ ،
۳۰۲ ، ۳۰۵ ، ۳۷۵ -

لوسیشا ٦١٣ -
لوکوٹیا ١٧٥ -
لوگی ریٹ ٣٨٠ -
لیتھونیا ٢٢٦ ، ٢٥٧ ، ٣٢٧ ، ا
٣٥٣ -
لیٹ ریکا ٣٥١ -
لیرڈا ٥٩٩ -
لیشیا ٦٠٧ -
لے کے ایس ١٥٩ ، ٢٢٣ -
لیکرین ٦٠٣ -
لے مولے ١٥ -

م

مابیاگ ٣٣٦ -
مارکیساس ٣٦٥ -
مارسیٹ ٦٣ -
ماشونستان ٣٥٠ -
ماکساس ٥٥ -
ماگھ کوئلن ٣٥١ -
ماکھ میسٹین ٣٥١ -
ماگھ بریگھ ٣٥١ -
ماگھ گولبا ٣٥٢ -
مانی پور ١٥٧ -
ماوات ٣٣٦ -
ماھاکم ٣٩٥ -
مدراس ١٥١ ، ٣٣٥ -
مدغاسکر ٥٢ ، ٦١ ، ٢٨٣
٣٥٠ ، ٣٩٠ ، ٤٠٠ ، ٤٥٩ ، ٤٩١ ،
٥٠٢ ، ٥١٢ ، ٥١٣ -
مدورا ١٩٣ -
مڈل فرینکن ٦٠٥ -
مرزا پور ٣٣٧ -
مرے ٥٠١ -
مراقش ٣٥٢ ، ٥٦٣ -
مصر ٣٦ ، ٥٢ ، ١٦١ ،
١٦٦ ، ٢١١ ، ٣١ ، ٥١٥ ،
٥٢٥ ، ٥٦٣ ، ٦٣١ -
مقدونیہ ١٩٧ -
ملایا ٣٧ ، ٥١ ، ١٨١ ،
٣٦٣ ، ٣٦٤ ، ٣٧٠ ، ٣٧٣ ، ٣٨٠
٣٨٦ ، ٣٦١ -
ملینیشیا ٧٥ ، ٩٠ ، ٩٣
٣٧٠ ، ٣٩٩ -
منروا ١٨ -
منہاسا ١٣٦ ، ١٩٣ ، ٣٧٧ ،
٣٩٧ -
منگائیا ٣٥٨ ، ٣٨٦ -
منگولیا ٢١٠ -
موراویا ٦٠٩ -
موروم ٦٢٣ -
مولکا ٦ - ٣٧٦
میکاڈو ٣٥٧ -
میکسیکو ٣٩ ، ٥٥
١٦٣ ، ١٧٩ ، ٣١٢ ، ٣٢٣ -
میک لے ٣٩٧ -
میکو ٣١٦ -

میگنیشیا ۱۹۴ -
میلکن برگ ۹۲ ، ۴۷۸ -

ن

نارتھمبر لینڈ ۷۹ -
نارتھمپٹن شائر ۲۴۷ -
ناس ۳۸۲ -
ناسا ۱۷۸ -
نانومیا ۳۹۴ -
ناوارے ۱۵۸ -
نائی ڈرپورنگ ۵۸۶ -
نائی جر ۲۰۲ ، ۲۳۰ ، ۵۳۵ -
نائیجیریا ۴۷۴ -
نپائی ۵۴۴ -
نس ٹر ۳۵۱ -
نکوپار ۳۰۵ ، ۵۰۲ ، ۵۰۴ ، ۵۰۷ -
نکوشیا ۱۵۴ -
نوٹکاؤن ۳۶۳ -
نورمبرگ ۶۰۵ -
نوف گوراؤ ۳۲۶ -
نیاس ۴۵ ، ۳۶۵ ، ۴۳۷ ، ۴۸۹ -
نیانزا ۱۷۸ -
نیاوری ۳۵۰ -
نیبورو ۴۰۱ -
نیپال ۳۸۳ -
نیپلز ۵۹۶ -
نیل ۲۱۸ ، ۲۲۳ -
نیل گری ۵۴۶ -
نیلم ۱۷۴ -
نیمی ۱۰ ، ۱۲ -
نیوا ۲۱۲ -
نیوبرٹن ۱۳۳ ، ۱۵۷ ، ۱۷۳ ، ۳۹۳ ، ۴۹۹ -
نیوزی لینڈ ۴۵۹ ، ۴۶۶ ، ۴۶۸ ، ۴۷۳ -
نیوکیلے ڈونیا ۱۴۷ ، ۱۴۸ -
نیوگنی ۴۶ ، ۵۷ ، ۱۶۴ ، ۱۷۲ ، ۳۶۰ ، ۳۸۷ ، ۴۰۵ ، ۴۱۶ ، ۴۲۴ ، ۴۲۶ ، ۴۲۸ ، ۴۳۶ ، ۴۵۹ ، ۴۹۸ ، ۵۰۶ -
نیوھیبریڈیز ۹۴ ، ۴۰۵ -
نیوی ۱۷۸ -

و

وارک شائر ۲۲۵ -
واشنگٹن ۱۹۵ -
وانی گیلا ۴۲۶ -
ورٹمبرگ ۲۵۵ -
ورگ ناڑبا ۶۰۱ -
وکٹوریہ ۹۷ ، ۱۳۲ ، ۱۷۷ ، ۴۹۴ ، ۵۰۱ -
وندیسی ۴۲۷ -
ووٹر ۲۴۸ ، ۴۷۳ -
ووٹکستان ۴۷۸ -

وتیار ۳۸۳ -
ویلڈ ۲۲۳ -
ویورھم ۳۵۳ -

ہ

ھند ۲۰۶ ، ۳۵۵ ، ۳۹۷ ،
۵۰۲ ، ۵۵۲ -
ھاران ۲۳۳ -
ھارٹس ۹۲ ، ۲۵۰ -
ھالی وڈ ۱۸۳ -
ھائی لے ۱۹۳ -
ھندوستان ۳۶ ، ۱۱۳ ،
۱۱۸ ، ۱۵۱ ، ۱۸۲ ، ۲۰۳ ،
۲۰۳ ، ۲۳۷ ، ۲۹۸ ، ۳۸۳ -
ھڈسن ۵۰۱ -
ھرمینیا ۲۲۳ -
ھسپانیہ ۳۳۶ -
ھلاھیرا ۱۳۲ ۱۵۹ -
ھند چین ۲۲۰ -
ھنومان اسٹاڈ ۶۱۲ -
ھوائی ۳۸۰ -
ھیڈا ۶۳ ، ۳۶۵ -
ھمپشائر ۲۲۳ -
ھیپریڈیز ۲۱ -
ھمیٹیڈ ۲۲۵ -

ے

یپستان ۱۶۷ ، ۳۷۶ -
یمن ۳۰۳ -
یوپ آ ۳۳۶ -
یورپ ۶۵ ، ۶۹ ، ۱۱
۱۵۷ ، ۲۲۰ ، ۲۲۲ ، ۲۲۳ ،
۳۰۸ ، ۳۸۶ ، ۳۹۱ ، ۳۹۲ ،
۳۷۹ ، ۵۸۶ ، ۶۳۳ -
یوروبا ۵۳۱ ، ۵۸۲ -
یوکون ۳۸۹ -
یوگانڈا ۱۹۳ ، ۳۱۷ ، ۳۵۵ ،
۵۳۲ ، ۵۹۳ -
یونان ۱۱ ، ۱۳ ، ۱۶ ،
۲۱ ، ۲۷ ، ۲۸ ، ۳۶ ، ۴۰ ،
۴۲ ، ۹۷ ، ۹۸ ، ۱۰۳ ، ۱۸۲ ،
۱۹۱ ، ۱۹۲ ، ۱۹۳ ، ۱۹۴ ،
۲۱۷ ، ۳۱۴ ، ۳۲۳ ، ۳۳۱ ،
۳۸۶ ، ۴۳۴ ، ۵۱۴ ، ۶۲۵ -
یہودیہ ۱۶۳ -

# اقوام، قبائل، اھالیان

ا

آٹ داؤں ۳۲۸ ، ۳۲۹ -
آرو کینیائی ۳۸۹ -
آرول ۳۳۹ -
آریائی ۲۲۳ ، ۲۲۴ ، ۳۱۴ ،
۳۲۵ -

آسٹریلوی ۳۶۲ ، ۳۹۵ ، ۵۰۳ -
آنکڑوں ۳۶۵ -
آئرستانی ۳۳۴ -
آیو ۳۵۰ -
اپاچی ۴۲۳ -
اچی پونیوں ۵۰۶ -
اپالی ۳۹۵ -
اریشیائی ۲۲۳ ، ۳۳۲ -
اری کوئی ۲۲۹ -
اسکیمو ۵۰ ، ۱۶۴ ، ۳۶۳ ، ۳۸۹ ، ۴۳۱ ، ۴۴۲ ، ۴۵۴ ، ۴۸۷ ، ۶۲۲ -
اشوری ۵۱۹ ، ۵۵۴ -
اطالوی ۴۷۲ -
افریقی ۴۳۹ -
اکامبا ۵۰۲ -
اگارڈنکا ۵۲۳ ، ۵۳۴ -
اگنوروٹ ۲۳۶ -
البائی ۳۰۵ -
الجیدون ۲۱۹ -
السٹرا ۳۵۱ -
الفور ۱۹۳ ، ۳۶۶ ، ۳۷۷ ، ۴۹۷ -
امریکی ۲۶۳ ، ۴۳۲ ، ۴۹۱ ، ۵۰۴ -
انزیکوں ۴۶۸ -
انگوبنوں ۴۳۰ -
انگونی ۱۵۱ -
اواسیو ۴۵۰ -
اوٹ ڈانم ۳۹۴ -
اوجب وے ۱۶۰ ، ۴۲۲ -
اوماہا ۱۳۳ -
اوماؤں ۴۳۲ -
اویت ۵۷۹ -
ایتمنیائی لیبائیوں ۳۱۶ -
ایتھنز ۵۵۲ -
ایجیبو ۵۵۴ -
ایجیبواوڈ ۵۵۴ -
ایجیبوریم ۵۵۴ -
ایکس نومیو ۵۱۱ -
ایگیبا ۵۴۱ -
ایارا ۱۵۱ -
ایم بابا ۵۷۹ -
اینگلو سیکسن ۳۱۸ -
ایلیوٹو ۴۴۲ -
اینو ۵۰ ، ۵۰۲ -
اینولا ۱۲۵ -


## ب


باتک ۳۷۲ -
باتھونگا ۴۲۴ ، ۴۳۰ -
پاپیڈی ۴۲۰ ، ۴۲۴ ، ۴۳۰ -
بارونگا ۱۳۹ ، ۱۴۳ ، ۱۴۸ -
باری ۱۷۵ ، ۲۱۹ -
باریا ۲۱۹ -
باسنی ۳۹ -

باسو ۳۸۷ ، ۴۲۹ -
باکسیون ۴۵۴ -
باگیشو ۴۲۹ -
بانتو ۱۳۹ ، ۱۷۳ ، ۴۱۹ ، ۴۳۰ ، ۴۴۴ -
بانجر ۱۷۷ -
بانگلاؤن ۴۹۲ -
باھیا ۵۱۰ -
بان یورو ۱۷۵ -
بدھ ۳۸۳ -
برمی ۵۱۰ -
برورؤن ۳۶۷ -
برمی ۴۱۸ -
بسوتو ۸۵ -
بکوان ۱۵۰ ، ۳۹۸ -
بلغاری ۴۷۹ -
بلیک فورٹ انڈین ۵۲ ، ۵۳ -
بنی اسرائیل ۴۲۴ ، ۵۷۷ -
بنگالی ۵۴۷ -
بوبیون ۳۴۹ -
بورنیائی ۴۴۳ -
بیٹ سی لیو ۴۵۹ -
بیڈا ۶۴ -

پ

پاپوائیون ۴۹۲ -
پاٹانیون ۳۷۰ -
پالو ۴۲۶ -
پانیون ۴۵۰ -
پشاؤ ۱۴۶ -
پکٹون ۳۱۶ -
پکیہا ۴۱۱ -
پلانٹ گینٹ ۲۲۵ -
پولینیشیائی ۳۵۸ ، ۳۹۶ ، ۴۱۲ ، ۴۱۵ ، ۵۷۶ -
پونا پے ۴۶۴ -
پویا لوپ ۵۰۸ -
پیاگوا ۱۶۹ -
پیرا وائیون ۴۷۱ -

ت

تاتار ۵۰۲ -
تاتاری ۲۰۹ ، ۴۵۷ -
تاھیتی ۴۷۲ -
تگڑا ۴۱۱ -
تلنگون ۱۳۵ -
تنگوانی ۵۰۲ -
توریگ ۵۰۲ -
تورائی ۱۸۱ -
تولامپور ۴۸۸ -
توھو ۲۴۴ -
تھامپسن ۱۳۹ ، ۱۵۱ -
تھنکیٹ ۴۶۸ -
تھیوے ۱۸۰ -
تیوتانی ۲۸ -

ٹ

ڈاٹاتھی ۱۵۶ -

ٹاٹنگا لنگ ۹۶ -
ٹروجائی ۴۴۹ -
ٹسمتی ۱۳۸ -
ٹسو ۴۶۰ -
ٹمیس ۳۵۶ -
ٹوڈا ۲۰۳ ، ۵۰۲ -
ٹوراؤ جاؤں ۴۵ ، ۱۵۵ ، ۲۳۹ ، ۳۹۷ ، ۴۶۵ -
ٹومبولوہ ۴۷۶ ، ۴۷۸ -
ٹوموری ۲۳۸ -
ٹوناپو ۲۳۹ -
ٹونگا ساؤنڈ ۴۳۵ -
ٹونگائی ۴۰۹ -
ٹیبو ۴۸ ، ۵۲ ، ۳۴۸ ، ۴۰۸ ، ۴۱۰ ، ۴۱۹ ، ۴۳۷ ، ۴۳۹ ، ۴۴۰ ، ۴۴۱ ، ۴۴۲ ، ۴۴۷ ، ۴۴۸ ، ۴۵۴ ، ۴۵۵ ، ۴۵۶ ، ۴۶۲ ، ۴۶۴ ، ۴۶۶ ، ۴۶۸ ، ۴۷۶ ، ۵۱۳ -

ج

جاگا ۵۷۹ -
جالو ۴۳۱ -
جامبی ۵۶۶ -
جرمن ۲۲۴ -
جمبا ۴۶۸ -
جوکو ۵۳۵ -

چ

چاٹیوں ۴۶۵ -
چبچا ۲۱۳ -
چنوکوں ۵۰۸ -
چینی ۳۷۵ ، ۴۳۹ -

خ

خورد آور ۵۳۴ -

د

دارامنگا ۴۴ -
دائک ۱۸۱ ، ۳۶۹ ، ۴۷۶ ، ۴۹۴ -
داھومی ۵۰۱ ، ۵۰۹ -
دراوڑی ۵۰۹ -
دوسونو ۴۵۰ -

ڈ

ڈائری ۱۳۵ ، ۱۳۶ ، ۲۳۵ -
ڈڈے نے ۴۱۷ -
ڈوایڈٹر ۵۱۰ -

ر

ریڈ انڈین ۶۹ -
رومانوی ۴۵۴ -
رومی ۱۹ ، ۴۴۹ ، ۴۷۹ ، ۵۱۸ -

ز

زولا ۵۳ -
زولوے ۱۵۵ ، ۳۸۷ ، ۵۱۰ ، ۵۱۱ ، ۵۱۲ ، ۵۳۷ -

## س

ساپین ۳۲۰ ، ۴۴۹ -
ساکالاوی ۳۵۰ ، ۵۲۲ ، ۵۸۱ -
سالیش ۳۷۷ -
ساجن ۱۸۲ -
ساموائید ۵۰۲ -
سنگھلیوں ۴۵۲ -
سلافی ۴۹۳ -
سلافیوں ۳۲۶ ، ۵۴۸ -
سلکا ۴۹۳ -
سلوائی ۳۳۳ -
سلیوکوسٹ ۲۳۰ ، ۲۳۷ -
سلیووئی ۶۰۶ -
سموائی ۱۵۸ -
سورگ ۴۱۴ -
سوکیہ ۴۵۳ -
سیامی ۵۱۰ ، ۵۶۷ -
سیتھی ۲۱۳ -
سیڈانی ۶۸ -
سیکشن ۴۷۶ -

## ش

شامی ۴۸۰ -
شسواپوں ۱۶۵ ، ۳۸۵ ، ۴۱۵ -

## ف

فجی ۳۶۴ ، ۴۶۵ -
فرنگی ۱۶۹ ، ۶۳۴ -
فرنیک ۴۶۴ -
فین ۱۷۵ -

## ک

کاپویاریڈی ۱۵۲ -
کارکرغیزوں ۲۴۵ -
کاروباتکون ۳۷۵ ، ۴۶۵ -
کارینوں ۲۳۹ ، ۳۷۱ ، ۴۶۰ -
کارزمیے ۴۰۹ -
کامزوی ۴۴۴ -
کاین ۴۴۳ -
کرنائی ۳۸۵ -
کرنیمز ۳۱۷ ، ۴۹۶ -
کریمس ۵۱۹ -
کلٹوں ۳۲۵ -
کموڈیائی ۵۶۷ -
کواکٹل ۱۳۸ -
کوریاکون ۳۱۷ -
کوماناا ۲۱۹ -
کھونڈوں ۵۰۹ -
کیپوچی ۱۱۴ -
کیتھولک ۱۱۴ ، ۱۱۸ ، ۱۱۹ ، ۳۸۷ -
کیریر ۴۷ ، ۴۳۸ -
کیکاپو ۴۲۹ -
کیوا ۵۰۴ -
کیوسروں ۱۴۶ -

## گ

گارو ۱۵۰ -
گاکیٹی ۴۹۳ -
گائی کیورس ۱۶۹ -
گریبو ۳۵۳ -
گیلاری ۴۷ ، ۶۷ ، ۶۸ ، ۶۹ ، ۷۱ -
گواجر ۵۰۱ -
گوانچ ۱۵۵ -

## م

ماتو ۴۹۲ -
ماتومو ۳۸۷ -
مارکوئی سائی ۳۶۵ -
مارکیسائی ۴۶۱ ، ۴۶۲ ، ۴۶۷ -
ماسائی ۴۳۹ ، ۴۶۴ ، ۴۷۵ -
ماغاسکری ۴۳۵ -
ماکوکو ۴۶۹ ، ۴۷۲ -
مانڈا لنگوں ۴۷۸ -
مانڈونگو ۳۵۷ -
ماوری ۳۹۷ ، ۴۱۱ ، ۴۱۲ ، ۴۶۲ ، ۴۶۵ ، ۴۶۷ ، ۴۶۹ -
مصری ۴۷۵ ، ۴۸۹ ، ۴۹۲ -
مغل ۵۰۲ -
ملائی ۴۷ ، ۴۹۷ -
ملینیشیائی ۱۱۲ ، ۱۷۳ ، ۴۹۲ -
منانگ کبایوری ۳۶۶ -
منڈاری ۲۴۱ -
موزی نی یا ۴۰۳ -
موسائی ۴۳۹ -
موسیکا ۲۱۲ -
موکیون ۴۵۰ -
مونیو ۲۴۱ -
میاؤ کیا ۲۳۶ -
میڈو ۱۸۰ -
میسوری ۲۲۸ -
مینڈ لنگ ۲۳۸ -

## ن

نارن میری ۴۰۴ -
ناروی ۳۱۸ -
ناکیوم ۳۶۴ -
ناموسی ۳۶۵ -
ناندی ۴۲۹ ، ۴۳۰ ، ۵۰۲ -
نوبائی ۲۱۹ ، ۴۰۸ -
نوٹکا ۱۳۹ -
نوران ۲۳۱ -
نوفور ۴۹۸ -
نیچیزیوں ۲۳۱ -

## و

واجاگا ۴۷۴ -
واکل برا ۳۶۵ -
واکونڈیو ۱۵۷ -
واگوگو ۱۵۰ ، ۱۷۴ -

واگیا ۴۳۱ -
والگا ۲۲۸ -
وانڈور ویو ۴۳۹ -
واومبا ۱۵۷ -
وتاترو ۱۷۴ -
وستائی ۳۳۴ -
وکٹوریائی ۹۴ ، ۴۷۲ ، ۵۰۵ ، ۵۰۸ -
ولندیزی ۴۹۸ -
وورین جیری ۳۷۱ -
ویمبگوے ۱۵۰ ، ۱۷۳ -
وینڈ ۲۴۳ -

ہ

ہاٹن ٹاٹوں ۴۴۳ ، ۴۴۹ ، ۵۲۴ -
ہاس ۴۶ ، ۴۷۷ ، ۴۸۱ -
ہسپانوی ۳۹۵ ، ۵۲۴ -
ہندو ۳۶۵ -
ہندوستانی ۳۷۳ ، ۳۸۸ -
ہورانوں ۳۶۳ -
ہوکل ۵۵ ، ۷۳ -
ہیڈ انسا ۲۲۸ -
ہیوول ۴۶۸ -

ے

یاقوت ۱۶۵ -
ینگ لنگر ۳۱۵ -
یورپین ۲۲۰ ، ۳۹۰ -
یوروباؤں ۴۶۰ ، ۵۰۹ -
یوریبا ۵۴۱ -
یونامت ۴۴۱ -
یونانی ۳۷۴ ، ۳۸۸ ، ۴۳۳ ، ۴۳۹ ، ۴۸۵ -
یہودی ۵ ، ۴۵۰ ، ۴۵۶ -

# اصطلاحات و القابات

ا

آبی رسم ۳۱۲ -
آبی روحیں ۳۸۸ -
آتش مقدس ۳۵۳ -
آزاد گرھستنوں ۳۲۰ -
آسمانی دولہا ۳۰۷ -
آسمانی روح ۳۵۳ -
آسمان کا دیوتا ۳۰۷ -
آھن ریش ۵۹۳ -
ابئی اعظم ۳۵۴ -
ازدواج خارجی ۳۱۰ -
اعلیٰ گوالے ۳۵۵ -
آگ کا بادشاہ ۲۲۰ ، ۲۲۱ -
الفائی ۲۱۹ -
الوھی عظمت و جلال ۳۱۳ -

ایفرون ۵۵۰ -
این لویو ۵۵۸ -
ایوان اکابر ۵۳۱ -

ب

باپ ۳۳۵ -
بارش کار ۱۷۳ -
باشی افسوں ۳۲۳ -
بتارنوں ۱۷۳ -
بوڈیو ۱۷۷ -
برق پتھر ۳۲۶ -
برق مواجز (Insulators) ۳۴۸ -
بلوط کے دیوتا ۳۰۸ ، ۳۲۳ -
بلوطی پری ۳۰۸ -
بلوطی تاج ۳۰۵ -
بلوطی دیوی ۳۰۸ -
بن کا بادشاہ ۳۳۲ -

پ

پاپائے روم ۲۰۷ -
پانکو ۲۰۱ -
پانی کا بادشاہ ۲۲۰ ، ۲۲۱ -
پراسرار بادشاہ ۲۲۰ ، ۲۲۱ -
پراسرار موت ۳۲۰ -
پوجان ۱۷۹ -
پولیر سٹیز ۱۹۸ -
پھایا پھولا تیپ ۵۶۱ -
پیشوائے اعظم ۳۴۲ -

ت

تاریو ۵۹۷ -
تری ۱۱۱ -
تغاقب محبوب ۳۱۷ -
تورا ۱۹۲ -
تھرس ڈے ۳۲۶ -
تیشۂ جلاد ۳۵۷ -
تیغ حیرت انگیز ۲۲۲ -
تین طلسم ۲۲۲ -

ٹ

ٹیلی پیتھی ۵۳ -

ج

جینوا فورس ۳۳۷ -
جینوائی دروازہ ۳۳۷ -

خ

خاقان ۲۸ -
خدائے شجر زار ۳۳۲ -
خریفی نقطۂ اعتدال ۱۶۱ -
خط استوا ۳۸۵ -

د

دارالعدل ۳۱۹ -
دائنا کا آئینہ ۹ -
دفع موت ۶۲۶ -

ڈ

ڈلئی ؟ ۳۳۵ -

ڈبے کی چشم بد ۳۹۰ -

ر

رسالت مآب ۳۸۱ ، ۳۸۲ -
روحانی حکمران ۳۴۶ -
رومتہ الکبریٰ ۲۱۰ ، ۲۲۷ -
رویائے مرزا ۳۰۶ -

ز

زچگی کی دیوی ۳۳۲ -
زمین کا مالک ۳۶۰ -
زوگانیس ۵۵۵ -

س

سامبی ۲۰۱ -
سپہر کبود ۵۴۶ -
سحرمشارکت ۳۰ ، ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۵ ، ۴۴ ، ۴۷ ، ۴۸ ، ۸۳ ، ۹۸ ، ۱۰۵ ، ۱۱۷ ، ۱۱۸ ، ۴۲۴ -
سداک سے آک ۵۵۹ -
سنتری دیوتا ۳۳۸ -
سورج کی دیوی - ۳۴۲ -

ش

شاہان مظاہر فطرت ۲۱۸ ، ۲۲۳ -
شاہ بارش ۲۱۹ -
شاہ بہار ۳۱۰ -
شاہ سوم مقدسہ ۳۱۹ -
شاہ قربانی ۲۱۷ -
شاہی نسل کا سرچشمہ ۳۱۵ -
شجر زار ۳۲۵ -
شجری دیوتا ۳۰۸ -
شجری دیوی ۳۰۸ -
شجری معبود ۳۲۷ -
شقائق نعمان ۵۸۶ -
شلوک ۵۲۸ ، ۵۲۹ ، ۵۳۰ ، ۵۳۱ -
شیر خانۂ مقدس ۳۵۵ -
شیسوار فرشتے ۲۷۵ -

ع

عزاداران مسیح ۳۰۵ -
علاج بالمس ۱۸۴ -
علم الادویہ ۱۷۹ -
عمل تسبیب ۱۸۸ -
عہداوی ۳۰۵ -

ف

فلک آشیاں ۳۷۵ -

ک

کارنیول ۵۹۵ ، ۶۲۰ ، ۶۲۳ -
کانا لاما ۳۰۷ -
کلوٹے ۵۷۴ -
کومیشیم ۳۱۹ -
کویاکرم ۶۲۴ -

کھانے والے بھوت ۳۸۳ -
کیپوچی ۱۱۴ -
کیلاھوں ۳۶۰ -
کیمسٹری ۱۸۸ -
کیمیا ۱۸۸ -

گ

گل والے ۳۵۸ -

م

متبرک خلعت ۲۲۴ -
متبرک راکھ ۲۲۰ -
متبرک شجر زار ۳۴۰ -
متبرک گگروں ۳۵۵ -
متبرک منصب ۳۲۱ -
مثلی سحر ۳۰۸ ، ۳۲۰ -
مرد جاں باز ۳۱۵ -
مرئی بادشاہ ۳۴۹ -
مظہر الوھیت ۳۲۱ -
مقدس احاطہ ۳۰۵ -
مقدس بیاہ ۳۳۸ -
مقدس پاسبان ۳۳۸ -
مقدس پہاڑ ۳۰۶ -
مقدس تلوار ۲۲۲ -
مقدس جشن ۳۲۰ -
مقدس چشمے ۳۲۳ -
مقدس درخت ۳۳۹ -
مقدس سلاطین ۳۳۲ -
مقدس قابوں ۳۴۴ -
مقدس یونی ۳۹۸ -
ملکۂ بہار ۳۱۸ -
موسو رنگو ۵۵۸ -

ن

ناکتخدا ۳۲۰ -
نظام شمسی ۱۶۳ -
نیر اعظم ۱۶۱ -

و

وستائی آگ ۳۳۲ ، ۳۳۳ -

ہ

ہندو مت ۱۱۱ -
ہومیو پیتھک ۶۸ -

## سمندر

بحرالکاھل ۱۷۸ ، ۱۸۴ ، ۱۹۱ ، ۱۹۵ ، ۳۱۸ ، ۳۸۷ ، ۵۰۳ -
بحر جنوبی ۱۹۶ -
بحیرہ اخضر ۱۷۸ ، ۵۰۰ -
بحیرہ ارال ۱۷۸ -
بحیرہ اسود ۱۷۸ -
بحیرہ اوقیانوس ۳۸۷ -
بحیرہ جاوا ۳۹۸ -
بحیرہ روم ۳۶۴ -
بحیرہ قلزم ۲۰۶ -
بحیرہ کاربین ۶۴ -

بحیرہ مرجان ۱۷۸ -
بحیرہ ہند ۴۹۸ -

درخت

آکاس بیل ۳۲۵ -
آلڈر ۴۴۴ ، ۵۸۶ -
انگور ۳۰۸ -
اوک ۲۲۵ ، ۲۲۶ -
برچ ۲۴۹ ، ۵۸۶ -
بلوط ، ۲۲۵ ، ۲۲۶ ، ۳۰۵ ،
۳۲۳ ، ۳۳۳ -
بیچ ۲۴ -
بید ۴۴۴ ، ۵۸۶ -
ٹارو ۱۴۷ -
حنا ۳۰۵ ، ۳۰۶ -
دیودار ۱۹۳ -
ڈروڈ ۳۲۶ -
روٹ پھل ۵۸ -
زیتون ۲۳ -
سٹیکا سور ۲۴۷ -
سرو ۳۰۵ -
سیگے ٹیٹ ۴۳۰ -
سیمل ۲۲۸ -
صنوبر ۲۲ ، ۲۲۵ ، ۳۰۵ -
عود ۱۹۴ -
گزد رینا ۱۶۲ -
کفوی جو ۵۳۵ -
کیلا ۲۴۳ -
لارل ۱۹۳ ، ۳۰۵ ، ۳۰۶ -
لوبان ۱۵۴ -
لائم ۶۲۴ -
مرگوسا ۱۵۱ -
منگوسٹین ۲۳۲ -
میسی ۳۵۴ -
نارون ۳۲۵ -
یکا ۶۶ -

اوزار

بیلچہ ۶۲۲ -
پومرینگ ۱۷۰ -
تلوار ۶۲۲ -
درانتی ۶۲۲ -
ڈھول ۶۲۴ -
سلارا ۶۲۲ -
سوختہ دانی ۴۱۱ -

لباس

اپوسمی کھال ۳۷۱ -
پیال ۶۲۲ -
سمور ۶۲۱ ، ۶۲۲ -

جانور

ابابیل ۶۳۴ -
ایحو ۱۵۶ -
بط ۶۲۳ -
بکری ۱۹۳ -
بلی ۱۹۶ -

بیل ۱۹۳ ، ۳۵۱ -
پلاور ۴۲ -
ٹراؤٹ ۴۷ -
چڑیاں ۶۳۳ -
چھپکلی ۶۳۳ -
ڈالر ۱۴۹ -
ڈنک ۵۸ -
ڈوگانگ ۴۵ ، ۴۶ -
راتھ رائن ۳۵۱ -
روبن ۳۸۲ -
ساحن ۱۳۸ -
سانپ ۵۵ -
سفید کاکتوا ۴۴ -
سلاک ۴۷ -
سئور ۱۹۳ ، ۶۲۲ -
سیل ۶۲۳ -
شارک ۴۱۴ -
کتا ۱۹۶ -
گھوڑا ۳۵۱ -
مارٹین ۲۵۷ -
مینڈک ۶۳۳ -

## زیورات

نیکس ۶۲۴ -

## زبانیں

ایو ۲۳۰ ، ۳۴۹ ، ۳۹۹ -
نیمس ۲۲۶ -

## الفاظ

تھرا (بمعنی دروازہ) ۳۳۷ -
ٹوئر (بمعنی دروازہ) ۳۳۷ -
در (بمعنی دروازہ) ۳۳۷ -
ڈورس (بمعنی دروازہ) ۳۳۷ -
فورس (بمعنی دروازہ) ۳۳۷ -
کالار (بمعنی آگ) ۵۰۵ -

## کتابیں

الفلق ، سورۃ ۴۸۱ -
الناس ، سورۃ ۴۸۱ -
انجیل مقدس ۴۷۲ -
ایز یو لائک اٹ ۲۲۵ -
اینیڈ ۲۷ -
سانیٹ ۷۷ -
سروس ۱۴۵ -
سکوری والا گیت ۱۴۰ ، ۱۴۱ -
سجاوید ۱۴۰ -
مانوشاستر ۱۸۲ ، ۲۰۴ -

## امراض و ادویات

اینتھن ۴۱۱ -
بلائے شاھی ۱۸۳ -
پروشیائی تیزاب ۴۴۷ -
تشنج ۱۹۱ ، ۱۹۳ ، ۱۹۴ -
راج روگ ۴۱۰ -
طاعون ۳۵۲ -
قحط ۳۵۲ -

کنٹھ مالا ۱۸۳، ۱۸۴، ۳۰۹، ۳۱۰-
گیرو ۳۱۴-
ماریتا ۶۲۴-
مروڑ ۳۱۱-
وجع مفاصل ۱۶۷-
ہائڈرو سائنک ایسڈ ۳۴۷، ۳۸۱-

## موسم، تہوار، تقریبات اور ماہ و ایام

آسٹریلوی بہار ۶۳۳-
آئی وی پورو ۳۲۷-
ایسٹر ۶۲۳-
ایسڈ ۶۱۶-
ایگریونیا ۵۷۴-
ایلوشیانی ۵۱۴-
بدھ ۳۵۱، ۵۹۹، ۶۰۱-
بیساکھ ۶۲۸-
پیر ۳۵۱-
ٹرانسلو یفیائی ۶۱۴-
جشن بہار ۳۲۳-
جیٹھ ۶۲۸-
رادکل ۵۹۶-
راس امرخان ۵۶۸-
رامی کامیکھ ۶۶۷-
سفید عید ۳۱۱-
سکایا ۵۵۵-
عیدزگ موگ ۵۵۴-
کاستروما ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۹-
کاسٹرو بونکو ۶۲۳، ۶۲۴-
کپالو ۶۲۳-
کرسمس ۳۱۱-
گوپاریلیا ۳۱۰-
لاڈا ۶۳، ۶۲۴-
لوح لین ۳۵۱-
لوس ۵۵۵-
مارچ ۳۵۲، ۶۲۸-
ماریلا ۶۲۳-
معاکاھٹی ۵۵۷-
منگل ۳۵۱-
مے آک ۵۵۹-
مورادیائی ۶۱۶-
نومبر ۳۵۱-
ہولی ڈیز ۳۵۳-
یوم الرماد ۵۹۹، ۶۰۱-
یوم اولیا ۳۵۱-
یوم بہار ۳۵۱-
یوم گرما ۳۱۲-